شہرِ لازوال آباد ویرانے

بانو قدسیہ

شہرِ لازوال، آباد ویرانے

ناول

بانو قدسیہ

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393	Bano Qudsia Shehar-e Laazawaal, Abaad Weraanay/ Bano Qudsia.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2011. 576pp. 1. Urdu Literature - Novel. I. Title.

2011

نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2441-1
ISBN-13: 978-969-35-2441-3

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ ''کتب خانہ'' میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

اس ناول کی تھیم یہ ہے کہ لاہور شہر جو بے پناہ ناپاک لوگوں سے
آباد ہے، کیسے ابھی تک آباد ہے..... غالباً کچھ اللہ کے بھگت اس دھرتی پر آباد
ہیں جو اس کے لیے دعا گو ہیں۔

ترتیب

اہم کردار

ظفر کی بیوی رخشندہ:	رشو طوائف
ظفر:	رخشندہ کا شوہر
اکرام شاہ:	پیر ٹھرکی
ڈاکٹر فہیم:	Abortion کرانے والی ڈاکٹرنی
جنرل بختیار:	رخشندہ کا عاشق
جمال:	(جنرل کا بیٹا) رخشندہ کا عاشق

اُسے مینٹل ہسپتال سے آئے پورے سات سال ہو چکے تھے۔

''ٹی ٹم ٹی.....ٹی ٹم ٹی.....''

''ٹرا لا لا لا.....ٹرا لا لا لا.....ٹرا لا لا.....''

''او و جھوک میرے مولا آئی.....وسدی رہئی ذورو ے.....'' یہ گیت اُس کے ساتھ مینٹل ہسپتال سے آئے۔ اس کے ذہن میں کئی ملائم گیت' کئی تصویریں' کئی واقعات انگریزی شاعری کی ٹی ٹائی اردو تقطیع کی فاعلن مفاعلن بن کر گھوم پھر رہے تھے' لیکن وہ خود مکمل طور پر پتہ نہیں کون تھی؟ اُس کے جسم سے اتنی بار بجلی گزر چکی تھی کہ اُس کے جسم کا سارا کیمیائی ردِ عمل Decompose ہو چکا تھا۔ وہ سلفیورک ایسڈ' نائیٹرک اور ہائی ڈروکلورک ایسڈ کی طرح شدید تیزابی کیفیتوں کی مالک تھی۔ اُس میں اس قدر ایسڈ پیدا ہو چکا تھا کہ اب اگر وہ کسی مرد کو غلطی سے ہاتھ لگا دیتی تو مردی جنس کا نیلا تھس اس کے اندر بجز کیلے سرخ شعلے نکالنے لگتا۔

وہ اس وقت اپنے گلبرگ کے بنگلے میں اوپر والی منزل پر اُس بیڈ روم میں بیٹھی تھی جہاں اس کے شوہر ظفر کے باپ کا پُراسرار طریقے سے انتقال ہوا تھا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے ایک ایسی لنگری (Lingerie) میں ملبوس نشست فرما تھی جو عموماً مغربی فلموں کی ہیروئن باکس آفس کے نسخوں کے تحت پہنا کرتی ہیں۔ اس نائیلون کی لمبی عبا نما بغیر آستینوں کی کھلے گریبان والی فراک میں اُس کا جسم یوں نظر آ رہا تھا جیسے پانی کے بہتے جھرنے کے پیچھے کوئی آڑو کے پھولوں سے لدی شاخ ہلا رہا ہو۔

بالا خانے کے شیشوں کے سامنے گلبرگ کی مین سڑک نظر آ رہی تھی۔ ہوم اکنامکس کالج کو چھٹی ہونے والی تھی۔ ان گنت کاریں اُس کے پھاٹک کے سامنے کھڑی تھیں اور اکا دُکا لڑکیاں کھلے فلیپر اور لمبے سیدھے بال کندھوں پر بکھرائے پھاٹک کی طرف آنے لگی تھیں۔

اُس کی پشت پر وہ بڑا پلنگ تھا جہاں ظفر کا باپ اچانک رات کو ختم ہو گیا تھا۔ اُس کے سامنے ایک کالج تھا جس میں لڑکیاں حصولِ تعلیم کے لیے دُور دُور سے آتی تھیں.....وہ سوچ رہی تھی ان لڑکیوں میں شاید کوئی بہاولپور سے بھی آئی ہو.....شاید اُسے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں سے بڑی محبت ہو.....

سامنے کے منظر اور پشت پر پڑے ہوئے پلنگ تک علاقائی گجری کی طرح ان گنت گوناگوں واقعات بکھرے پڑے تھے اور وہ ایک ڈھیلی ڈھالی اکائی کی طرح ان سب میں پروئی ہوئی تھی۔

اگر انسان اپنے آپ کو خود واقعات کے سپرد کر دے تو غالباً وہ کبھی ایسڈ نہیں بنتا لیکن اگر واقعات اُسے ساحل

سے تھپیڑے مار مار کر اپنے آپ میں ملالیں تو اُس کا سارا لہو تیزابی ہو جاتا ہے.....

اس کے شوہر ظفر کے باپ کو کس نے قتل کیا؟

کیا اُس پورن بھگت نے خود اپنے باپ کی جان مٹھی میں لی اور پھر روٹھی ہوئی چڑیا کی طرح اُس کے وجود کو منی کی ہوا میں اس طرح چھوڑ دیا جیسے کسان گندم سے بھوسی علیحدہ کرتے ہیں۔

ظفر کے باپ کا کیس متعدد کئی اور مقدموں کی طرح بالآخر فائلوں کی نذر ہو گیا۔

وہ پورے چھ مہینے مینٹل ہسپتال رہ کر آئی تو اُسے معلوم ہوا کہ یہ کوٹھی ظفر نے اپنی بیوی کے نام کروا دی ہے۔ رشو نے ظفر کو بہت تلاش کیا لیکن کوٹھی اُس کے نام منتقل کروانے والا خدا جانے کہاں جا چکا تھا۔ یہاں اُس کے ہم شکل ہم مشرب بہت تھے لیکن ظفر کہیں نہ تھا۔

ان چار سالوں میں وہ ظفر کی مماثلت اور مشابہت تلاش کرتی بہت دُور نکل گئی تھی۔ جب گائے ایک کھونٹے سے بندھی نہ رہ سکی تو سارا جگ اُس کے لیے شاملات ہو گیا۔ جدھر ہری گھاس نظر آتی منہ اٹھا کر چل نکلتی۔

مینٹل ہسپتال سے لوٹے اُسے پورے سات سال گزر چکے تھے اور اب پہلی بار بہاولپور سے واپسی پر وہ خالی الذہن اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ غسل خانے سے Shanks کے بھرنے کی آواز آ رہی تھی اور وہ قدِ آدم آئینے کے سامنے بیٹھی سوچ رہی تھی.....

یہ..... یہ عورت جو آئینے میں نظر آ رہی ہے کون ہے؟

اس کے ابرو اس کی آنکھیں جن کو سٹیج پر کام کرنے والی رقاصاؤں کی طرح اتنا جلاد صفت کس نے بنا رکھا ہے۔

اس کے یاقوتی ہونٹ اس کی کھلی جلد یہ..... سب کیا ہے؟ کس کا ہے؟

میں کس علاقے کی رہنے والی ہوں؟ قراقرم کی بلند و بالا چوٹیوں پر یخ بستہ ہواؤں میں پروان چڑھی ہوں کہ پوٹھوہار کے لنکسار میں میری نمکین جڑیں ہیں۔ میں سندھ کی زیریں وادی کی آواز ہوں کہ..... کہ جنوبی مکران کی نیگرو نسل سے میرا تعلق ہے۔ میں ڈھاکہ شہر کی کرشن چوڑے تلے بیٹھی ہوئی اناس کاٹ کر بچوں کو کھلانے والی عورت ہوں کہ..... کہ میرا وجود بوڑھی گنگا پر بہنے والی نوکا کی طرح نرم رو ہے.....؟

میں کون ہوں.....؟

رخشندہ تو کون ہے؟

تیری آنکھیں' جلد کا رنگ' نتھنوں کی ساخت' پسینے کی مخصوص بو' کولہے کی ہڈی کا حجم یہ سب کس نسل کی طرف نشان دہی کرتی ہیں؟ کیا تو زرد فام منگول نسل کا فرد ہے؟ جو بحرالکاہل سے اٹھی اور برما' ملایا اور چین تک چھا گئی۔ کیا تو سفید فام (Caussic) کا کاکی ہے؟ جن کے آباؤ اجداد بحیرۂ روم سے اٹھے اور خوبصورت آبادیوں کی بنیادیں بن گئے۔ کیا تو آریائی ہے رخشندہ؟

کیا تو سامانی' ایرانی' یونانی' ترک ہے؟

انسان اپنی اصل کی تلاش میں کہاں نکلے؟ اسے تہذیب اور ناشائستگی کے جنگلوں میں کہاں کہاں بن باس کاٹنا

ہوگا؟ وہ نسلِ انسانی کے ارتقا کی کونسی کڑی ہے؟ یا اُس کا وجود محض اُس کھاد کی مانند ہے جو کیمیاوی مرکبات سے بنائی جاتی ہے.....؟

آہستہ آہستہ آنسو اُس کے گالوں سے اتر کر جھرنے جیسی لنگری پر گرنے لگے۔

راج شیکھر نویں صدی کے شاعر نے کہا تھا.....

ہم منتر تنتر کچھ نہیں جانتے
نہ گرو کر پا سے ہمیں کوئی گیان حاصل ہے
ہم لوگ شراب خوری اور زنا کرتے ہیں
اور ایسی پرستش کے وسیلے سے نجات حاصل کرتے ہیں

....

فاحشہ عورتوں کو تلقین کر کے
ہم ان سے شادی کر لیتے ہیں
ہم لوگ شراب پیتے اور گوشت کھاتے ہیں
بھکشا سے ملا ہوا اناج ہی ہماری معاش ہے
اور مرگ چھالا ہی ہمارا پلنگ ہے
ایسا کول دھرم کیسے پسند نہ آئے گا؟

رخشندہ کول دھرم کی پالن کرنے والی تھی۔ اُس کا نشان کسی خاص نسل کی کسی خاص جگہ میں دفن تھا۔ وہ تو راج شیکھر کی طرح بھکشا پر دن گزارتی تھی۔ دان دکشنا وصول کرنے والے ہاتھوں نے کئی ہزاروں کے چیک وصول کیئے ہیرے کی انگوٹھیاں پہنیں اور اس کول دھرم نے اُسے ثقافتی عصبیت، نسلی حمیت اور انفرادی عظمت سے بالکل پاک کر دیا۔ وہ اب اُس بادل کی مانند تھی جو ٹھنڈی ہواؤں کی تلاش میں اڑتا رہتا ہے۔ برس جائے تو رنج نہیں کرتا۔ لیچا کر نکل جائے تو تاسف نہیں کرتا۔ اُس کا کسی نسل، کسی خاندان، کسی مسلک، کسی مذہب سے کوئی مثبت تعلق باقی نہ رہا تھا۔ وہ ہر قسم کے تعصبات سے پاک زندگی بسر کر رہی تھی۔ وہ مائع کی طرح تھی جس کا اپنا کوئی ٹھوس وجود نہیں ہوتا۔ جس پیمانے میں ڈالو اُس کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اُس کے نظریات میں اتنی کشادگی یا کھوکھلا پن پیدا ہو چکا تھا کہ اب وہ گناہ اور ثواب سے یکساں پیار کرنے لگی تھی.....

اور اس کے باوجود جھنگ کے قیام نے اُس کے دل پر عجیب قسم کی بارش کر دی تھی، سا گودانے سے مشابہہ ننھی ننھی بارش.....جس کے ہر قطرے میں اس کے اصلی Genes کی طرف نشان دہی تھی۔ اگر ایک قطرے کا تجزیہ کیا جاتا تو کیمیکل رد و بدل کے بعد رخشندہ کی ساری سائیکی.....اس کے آباؤ اجداد سے وصول کیے ہوئے Chromosomes کی تشکیل، اُس کی نسلی رنگا رنگی کی وحدت، اُس کی جغرافیائی تبدیلیاں اور اصل قیام اس شام کی بارش سے وابستہ تھیں۔ جھنگ کی پچھلی شام وہ زندہ تھی.....

وہ تعصب میں پروئی ہوئی ایک اکائی تھی۔

وہ ایک حدود اربعہ میں بند تھی۔ وہ ایک مسلک کی پیرو تھی......

یہ تعصب' یہ حدود اربعہ' یہ مسلک اُس کے دل سے اٹھا اور گیس کی طرح اُس کے سارے وجود میں بھر گیا۔

اُس نے جیسے صدیوں کے بعد ظفر کو دیکھا۔ دیکھا...... اور پھر آنکھیں جھکا لیں۔ اس کے بعد اُسے ظفر کی طرف دیکھنے کی ضرورت تک محسوس نہ ہوئی۔

ایک تعصب نے اُسے بوم رینگ کی طرح شکار کر لیا۔ وہ جو اتنے سال مختلف لوگوں سے ذہنی' جسمانی اور قلبی محبت کر چکی تھی۔ اس تعصب کو محبت کے نام سے پکار نہ سکی۔

وہ جو کئی گھروں میں' کئی ہوٹلوں میں' کئی ڈبل بیڈ' کئی قالینوں پر آڑی ترچھی جلیبی کی مانند گاؤ تکیے کی طرح بوجھل سلوٹوں سے پاک شکنوں سے آراستہ وقت گزار چکی تھی...... ظفر کی ایک نظر کو گھر کے حدود اربعہ سے تعبیر نہ کر سکی۔

یہ کونسا مسلک تھا؟

اس بے نام مسلک نے برساتی ساگو دانے کی طرح اُس کے سارے وجود کو بھر دیا تھا اور وہ ہار سنگار کے درخت کی طرح بار آور ہو کر اپنے پرانے پرکھوں سے جا ملی تھی۔ اُس کی جڑیں پاتال تک گہری ہو گئیں۔

ظفر کا ماتھا ویسا ہی تھا۔

وہی زرد ہاتھی دانت میں کھبی ہوئی گہری لکیریں۔ وہی گالوں کے نشیب' وہی ہونٹوں کا روٹھا ہوا خم۔

سب کچھ وہی تھا لیکن چہرے پر ہاتھوں کے اشارے میں نشست کے خمیدہ انداز میں پیروں کے تھکے ہوئے طریقے سے وہ اتنا اندازہ لگا چکی تھی کہ پلوں کے نیچے سے بہت پانی گزر چکا ہے۔

بچپن میں جب کبھی بہاولپور میں کوئی شادی ہوتی اور لڑکیاں رات گئے تک ڈھولک بجا بجا کر تھگی ہو ہو کر گایا کرتیں تو وہ حیران پریشان ایک گانا سن کر ہمیشہ اپنے سے بڑی کسی لڑکی سے ضرور پوچھتی" باجی اس کا کیا مطلب ہے؟" لیکن بڑی لڑکیاں عموماً گانے میں یا سنورنے میں یا پھر نظر بازی میں اتنی مشغول ہوتیں کہ کوئی بھی اس کی بات کا جواب نہ دیتی۔ ظفر کو یوں صوفے پر آگے کو بیٹھے ہوئے دیکھ کر رخشندہ کا جی چاہا کہ آنکھیں بند کر کے اونچے اونچے گائے!

"تِچّن کتھاں گزاری آ رات وے
میرا جی وکیلاں دے وات وے
میں پانی دی مچھلی...... تو بگلا بن کے آ ڈراں......"

رخشندہ کا جی چاہتا تھا کہ ظفر اُسے پیس کر' قیمہ' بوٹیاں بنا کر کھا جائے۔ وہ اس کے وجود کے اندر اُس کے معدے میں' اُس کے لہو میں' اس کے سارے System میں جاری وساری ہو جائے اور اس کے بعد اس Cannibalsim کے بعد ظفر کے ساتھ من وتو کا کوئی جھگڑا نہ رہے......

اگر انسان کی پیدائش اس کرۂ ارض پر دس لاکھ سال پرانی ہے تو انسان کا رشتہ کشش ثقل سے بھی دس لاکھ سال پرانا ہی ہے۔ وہ فضاؤں میں چلا جائے۔ مریخ' زہرہ' مشتری کائنات کے ہر سیارے کو مسخر کر لے...... یہ کشش ثقل ہمیشہ

اُسے واپس بلائے گی۔

دنیا کا ہر ذی روح اسی کششِ ثقل سے بندھا ہے جو ہمیشہ بتیس فٹ فی سیکنڈ رہی ہے۔ صبح رات دو پہر..... ہر انسان جب بھی خلا میں معلق ہوتا ہے..... جب بھی اوپر اُٹھتا ہے یہ کششِ ثقل اُسے ماں کی گود بن کر واپس بلاتی ہے۔ ہر انسان کسی نہ کسی مرکز کی طرف لوٹتا ہے۔

رخشندہ نے آہستہ سے سوچا..... میں جو ہر قسم کے نظریات سے پاک ہو چکی ہوں..... میں خلا میں معلق ہوں..... مجھے اس دنیا سے جوڑنے والی کششِ ثقل کہاں گئی..... پھر اس نے ظفر کو ایک بار دیکھا..... اور شانت ہو گئی جیسے صبح کے وقت دریا کا کنارہ سورج کی پہلی کرنوں میں چپ ہوتا ہے۔

جھنگ میں اُس کا قیام صرف ایک دن کا تھا۔ وہ سید اکرام شاہ کی دعوت پر ایک دن کے لیے لاہور سے جھنگ گئی تھی۔ سید اکرام شاہ بڑی میٹھی بولی بولتے تھے۔ سائیں سائیں کہتے اور بچھے جاتے۔ جھنگ میں اُن کی دو کوٹھیاں تھیں لیکن وہ زیادہ تر اپنی آبائی زمینوں پر رہتے۔ ان کوٹھیوں میں اُن کے سول افسر قسم کے دوست، سیاسی ہم نظر، جلیس اور اعلیٰ قسم کی طوائفیں آ کر ٹکا کرتی تھیں۔

اس بار سید صاحب نے دوستوں کو اپنے گھوڑوں کے سنڈ دکھانے اور مرغابی، جل مرغی اور تیتر کے شکار پر لے جانے کے بجائے شہر میں قوالی اور مشاعرے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ شاہ صاحب بڑی گھیر دار لنگی تہمد باندھتے تھے۔ پیروں میں ان کا کھسا باریک تلے کی کڑھائی سے ڈھکا ہوتا۔ کھلی کلیوں والی قمیض کی جیبوں میں کئی ہزاروں کے نوٹ ہوتے۔ وہ اہلِ بیت کی ہر بات پر سر دھنتے، پنجتن پاک کی قسمیں کھاتے اور سعدی اور حافظ کے شعر بے تکان پڑھتے تھے۔

سید صاحب کی شخصیت کسی مزار کے غلاف کی طرح بڑی پُر کشش، مزمّی اور کڑھی ہوئی اور سبزہ سبز تھی۔

قوالی کے دوران وہ کئی بار اس شعر پر سسکیاں بھر بھر کے روئے۔

دولت صحبت آں شمع فروزندۂ من
باز گوئید کہ تا قسمت پروانہ کیست؟

جوں جوں اُن کی حالت غیر ہوئی جاتی تھی قوالوں کی منڈلی میں ایک پروانہ وار قسم کی وارفتگی بڑھتی جاتی تھی۔ وہ بار بار "دولت صحبت" کو "شمع فروزندۂ من" سے توڑتے جوڑتے اور پھر "قسمت پروانہ کیست" کی گرم سلاخ سے داغ داغ کریوں دہرائے جاتے جیسے فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں فوج کے گھوڑوں کو تمیز کرنے کے لیے داغا جاتا تھا۔ سید صاحب کے حواری ننگے پیر سیاہی بلیوں کی طرح دھمکی اور سودا لیے پھر رہے تھے لیکن سید صاحب "قسمت پروانہ کیست" کے نشے میں کچھ ایسے سرشار تھے کہ صبح تین بجے تک انہوں نے جتنی بھی پی دوستوں کے اصرار پر پی ورنہ وہ تو دولت صحبت سے ہی سرشار ہو چکے تھے۔

قوالی کے بعد مشاعرے کی ایک مخصوص نشست کوٹھی کی چھت پر منعقد کی گئی تھی۔ اسی مشاعرے میں اُس نے پورے چار سال چار صدیاں چار قرن کے بعد ظفر کو دیکھا۔ ظفر مقامی کالج میں پروفیسر تھا اور اپنی بیوی کے ساتھ اس محفل میں آیا تھا۔ اُس کی بیوی اُن باحیا بیویوں میں سے تھی جو نگاہ ملاتے بھی خوفزدہ ہو جایا کرتی ہیں۔ بڑے گول سے چاند

چہرے پر اُس کا دہن بہت چھوٹا تھا۔ ساری محفل کے دوران ایک بار اُس نے یہ دہن کھولا اور السلام علیکم کہہ کر یوں بیٹھ گئی جیسے نماز پڑھنے لگی ہو۔

"سائیں اساں کو ملو۔ یہ اساڈے بڑے مہربان ہیں پروفیسر ظفر صاحب..... کی تکلف کر دے او تسی بادشاہو؟"

سائیں اکرام شاہ نے رخشندہ کے کندھے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈال کر کہا۔

"خلش....."

"آپناں کو خلش آ ہئی اے علاقے دے ڈپٹی کمشنر نہ تھے۔ پروفیسر لگ دے نجے چھوراں دے....."

ساری محفل کلکاریاں مار کر ہنس دی۔ صرف رخشندہ ظفر کو دیکھتی رہی۔ وہی ماتھا' وہی ہونٹ' وہی پورن بھگت جیسی خوبصورت چپ.....

اس تنگ دہن والی عورت سے ظفر کیسی باتیں کرتا ہوگا؟

اس ننھی کلی جیسے منہ والی عورت نے اس چپ کے اندر..... اس اندھیری خاموشی کے اندر..... اس منجمد گراوٹ کی اتھاہ میں کس حد تک جھانک کر دیکھا ہوگا۔

اس کے بعد رخشندہ نے کسی شاعر کا کلام نہ سنا۔ وہ آنکھیں بند کر کے گاؤ تکیے پر بازو کا بوجھ ڈال کر یوں بیٹھی رہی جیسے کسی معبد کا بت ہو۔ جب اوس سے قالین اور گاؤ تکیے بھیگنے لگے اور سارے میں سبز چائے کی خوشبو آنے لگی تو رخشندہ نے محسوس کیا جیسے ظفر اُس کے پاس آ بیٹھا۔

بڑی آہستگی سے ظفر نے پوچھا "کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں....."

"سارے ملک میں تمہارے بہت چرچے ہیں....."

"ہونے دیں....."

"تمہیں ایسی زندگی سے خوف نہیں آتا؟"

"آتا ہے....."

"پھر..... پھر تم کسی سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

"شادی؟..... کس لیے؟..... کیا فرق پڑتا ہے شادی سے؟"

"ایک مرکز ہوتا ہے..... ایک حدود اربعہ..... ایک سمت ایک جہت....."

"جب تک دل قبول نہ کرے سب بیکار ہے۔

میں بادل کی طرح ہوں....."

"بادلوں کی بھی ایک سمت ہوتی ہے....."

"ہوتی ہوگی....."

"بچے؟....."

"میں ان کی دشمن نہیں ہوں۔ وہ فنا آباد میں خوش ہیں۔ یہاں انہیں لا کر کیا کروں گی۔ وہ..... وہ اس دارالمحن میں آ کر کیا کریں گے؟"

"کوئی سہارا؟"

مل جاتے ہیں سہارے جب بھی ضرورت ہوتی ہے..... میرے پروفیشن میں سہاروں کی کمی نہیں۔ جب تک مجھے کسی کی بیوی پر اعتراض نہ ہو شوہر مجھ سے متاثر رہتا ہے۔ کبھی کسی کا شوہر کبھی کسی کا' کبھی نابیاہا نوجوان بھی شادی سے پہلے تجربات کرنا چاہتا ہے اس کے لیے میں حاضر ہوں۔

"تم..... چاہتی کیا ہو رخشندہ؟"

"اپنے آپ سے رہائی....."

یہ گفتگو خدا جانے کب تک جاری رہتی اگر سید اکرام شاہ ایک بار اُس کے زانو کو دبا کر پھر اُسے گیسوں سے روشن چھت پر نہ لاتے۔

"بادشاہو تہانوں نیندر آ گئی اے تے لوک تہاڈے نال گلاں کرن دے مشتاق بیٹھے ہیں....."

رخشندہ نے نقلی پلکوں والی نگاہیں اٹھا کر ایک بار ظفر کی طرف دیکھا۔ وہ کتنا خوبصورت تھا۔ کتنا aloof تھا۔

اس کے چہرے پر چپ کا کتنا گڑا پہرا تھا۔ Dead Sea جیسی چپ۔

"کون مشتاق ہے ہم سے باتیں کرنے کا؟" رخشندہ نے دلربائی سے پوچھا۔

"ایہہ بادشاہو جناب غلام مشتاق صاحب۔ بی ڈی ممبر ہن ایس علاقے دے انہاں اپنیاں ساریاں زمیناں مزارعاں کو ونڈ چھوڑیاں ہن۔ ہن آپ ڈسن والی چھکی لگا کے گزارہ پئے کردے نیں۔ تساں کو غلام مشتاق صاحب اپنی رخشندہ ملک صاحب ہوراں دی تعریف سناواں۔ انہاں کو ویکھ کے بجلی مدھم ہو ویندی اے۔"

یکدم غلام مشتاق صاحب نے رخشندہ کو تمام تر متوجہ کر لیا۔ کچھ لوگ ابھی کشش ثقل سے بندھے ہیں۔ اپنی زمینیں مزارعوں کو بانٹ دینے والے کی طرف رخشندہ نے مکمل نیاز مندی سے دیکھا۔

"کیسے مزاج ہیں جناب کے؟"

"شکریہ....."

غلام مشتاق سفید کھدر کے پاجامہ قمیض میں ملبوس تھا۔ اس کا قد اتنا لمبا تھا کہ بیٹھے ہوئے لوگوں میں وہ قریباً گھٹنوں کے بل نظر آتا تھا۔ آنکھوں میں جانوروں جیسی چمک تھی اور بولنے میں ہلکی سی لکنت۔ اسی لکنت کی وجہ سے اُس کی بات میں اولیاء اللہ جیسی کشش پیدا ہو گئی تھی۔ مشاعرے کا رنگ ٹوٹ چکا تھا اور اب گفتگو سیاست کی طرف چل نکلی تھی۔ جیسا کہ مردوں کی محفل میں رواج ہے بالآخر باتوں کا دھارا اسی طرف کو ہو نکلتا ہے۔

"دراصل جناب پاکستان کو آج تک کوئی رہنما ہی نہ ملا۔ قائداعظم کے بعد نظر ڈالیے تو جناب..... کون..... کون..... تھا بھلا باگ ڈور سنبھالنے والا....."

"بادشاہو قائدِ ملت دی بڑی Serviceآ.....اوہ کلے آ جیہڑے نہرو نال نجھیٹے آ....."

"کیا کیا قائدِ ملت ہے؟ ہندوستان کے ساتھ.....ساتھ نمٹنے کے لیے کتنی تیاری کروائی انہوں نے قوم سے۔ فقط کلے کا نشان کافی نہیں ہوتا شاہ.....شاہ صاحب۔"

"آپ دیکھیں گے شاہ صاحب۔ اتنا لمبا مارشل لاء بالآخر رنگ لائے گا۔ ہمیں Democracy چاہیے۔"

ایک مقامی وکیل نے زوردار لہجے میں بات بڑھائی۔ "مارشل لاء جبر ہے تشدد ہے Fundamental Rights کی نفی ہے۔ ہماری تو آج تک کوئی Constitution نہیں بن سکی۔"

"بادشاہو تساں کوں Democracy درکار اے تے اساں کو اللہ دا ناں پیارا اے.....اسلامی نظام کرو چاہیدے....."

سید اکرام شاہ جھنگ کی اُن زوردار ہستیوں میں سے تھے جن کے ہاں علاقے کے تمام افسر چوکی بھرنے آتے تھے۔ کچھ رشوتوں کی گرم بازاری' کچھ گفتگو کا مسکا پالش' کچھ Good time کے بندھن ایسے تھے کہ کبھی اُن کی بات کو سولہ آنے سمجھتے تھے۔ جونہی انہوں نے اسلامی نظام کا نام لیا۔ کبھی طرف سے غوغائے لبیک بلند ہوا.....

"آپ کریں گے اسلامی نظام؟.....آپ مانگ رہے ہیں اسلام.....ان ان ان.....نظام.....؟"

"ہور ہینڈا اسلامی منگدا اے اسلامی نظام؟....."

"اسلامی نظام کا تقاضا نہ کریں شاہ صاحب.....یہ تو سوشلزم کیمونزم سے بھی آگے ہے۔ تن کے کپڑوں کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہے گا آپ کے پاس....."

کھٹ کھنا کھٹ ساری پارٹی دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ شاہ صاحب اور اُن کے حواریوں کی ٹولی کہنے لگی کہ اسلام میں ذاتی ملکیت کا تصور موجود ہے۔ غلام مشتاق اور اُن کے دو تین کمزور ہوں ہاں ملانے والوں نے دلائل دینے شروع کر دیئے کہ قرآن میں فقط "لیس للانسان الا ماسعی" کا فلسفہ ہے۔ یہاں کسی قسم کے استحصال کی گنجائش نہیں۔

ان ہی دو تین کمزور ہاں ملانے والوں میں ایک ظفر بھی تھا۔

صبح کی اذان کے ساتھ یہ محفل بغیر کسی فیصلے کے شیریں گفتگو اور باہمی good feeling کے ساتھ ختم ہو گئی۔

لیکن غلام مشتاق کی رُکی رُکی باتیں رخشندہ کو بہت دیر تک یاد رہیں۔

رخشندہ جس کا کوئی خاندان نہیں تھا۔

رخشندہ جس کا کوئی مذہب نہیں تھا۔

رخشندہ جس کا کوئی وطن نہیں تھا۔ جس کی کوئی جہت' کوئی حدود اربعہ نہیں تھا۔ کوئی شوہر کوئی بچے نہ تھے۔

غلام مشتاق کو دیکھ کر اُسے عجیب قسم کی خوشی ہوئی۔ ایسا بھی ایک انسان تھا جسے اپنے ملک کے لوگوں سے اتنا پیار تھا۔ مثبت قسم کا پیار' گوشت پوست کی طرح جاندار پیار.....اس پر طرہ یہ کہ وہ کسی خواب کے لیے زندہ تھا۔ ذنوں کو وہ ڈائریوں کی طرح ردی کی ٹوکری میں نہیں پھینک دیتا تھا۔

کچھ لوگ وطن کے تصور سے اس طرح بندھے تھے جیسے دنیا کا ہر ذی روح کششِ ثقل سے بندھا ہے۔

کتنے خوش نصیب تھے ایسے لوگ؟

رخشندہ جس کا اپنا کوئی مسلک نہیں تھا۔ جو اچھی یا بری ہر قدر کو وقتی سمجھتی تھی ایسی چٹان جیسی شخصیتوں کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔

سفید چادر کے برہنہ تھکا ہوا جسم ڈال کر وہ دیر تک سوچتی رہی۔

کیا کبھی نسل انسانی زر زن اور زمین کے استحصال سے فارغ ہو سکے گی؟

استحصال کا بھی عجب فلسفہ تھا۔ یہ دو رویہ سڑک تھی جس پر آنے جانے کی کوئی پابندی نہ تھی۔ مرد نے اپنی آسائش کے لیے ان تینوں کا بہت استحصال کیا تھا لیکن پلٹ کر ان تینوں نے بھی مرد کی ذات کو اُس کی انا کو اُس کی خوشیوں کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔

عورت اور دولت تو توام بہنیں بن گئی تھیں۔ انہوں نے آپس میں یوں یکجہتی پیدا کر لی تھی کہ روپے کی طرح گو ان کا چہرہ دونوں طرف سے مختلف تھا لیکن مصرف میں لاتے وقت دونوں کو اکٹھا استعمال کرنا پڑتا تھا۔

ان چار سالوں میں رخشندہ جیسے ماحول میں رہ رہی تھی کم از کم اس بالائی جیسے اوپر والے ماحول میں عورت اور روپیہ..... ان دونوں نے مل کر مرد کا خوب استحصال کیا تھا اور خود مرد کے استحصال کا نشانہ بنی تھی۔ جو معاشرے اپنی عورت سے روپے کا سا سلوک کرتے ہیں اور وہ بالآخر بڑے انتشار سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ پاکستان میں روپیہ عورت کی طرح پردے دار باحیا ہو گیا تھا۔ لاکرز میں بند بیرونی ممالک میں چھپا ہوا سونے چاندی کی شکل میں مقید روپیہ اپنی موت آپ مر رہا تھا اور عورت؟ کم از کم اُس سوسائٹی کی عورت جس میں رخشندہ رہتی تھی۔ یہاں کی عورت بے وقعت تھی۔ سر بازار منہ کھولے بال بکھرائے پھر رہی تھی اور کوئی اُسے مقید کرنے کو تیار نہ تھا۔ روپے نے عورت کے ساتھ اپنا رول بدل لیا تھا اور دونوں مجذوب تھے۔ روپے اور عورت کا کوئی مرکز' کوئی حدود اربعہ' کوئی جہت باقی نہ رہی تھی۔

''کی پئے سوچ دے او بادشاہو؟'' سید اکرام شاہ بینڈی کی پیالی ہاتھ میں لیے داخل ہوئے۔

''میں سوچ رہی تھی شاہ صاحب..... امیر آدمی کو عورت سے پیار نہیں ہوتا شاید.....''

''ہندا اے بادشاہو بڑا ہندا اے' پر کیک زنانی نال نہیں ہندا۔ ساریاں زنانیاں نال ہندا اے.....'' شاہ نے ہنس کر کہا۔

''شاہ صاحب! ایسا کیوں ہے؟''

''کی بادشاہو؟''

''جس سے آدمی پیار کرتا ہے اُسے..... اُسے مقید کرتا ہے' باندھتا ہے' چھپا کر رکھتا ہے..... امیر آدمی کو شاید.....''

''پر کوئی سزا دینی اے بادشاہو۔ تساں کناں پریشانیاں وچ پے گئے او؟..... تو چاہ پیئو چا..... زنانی نال بندا پیار کرے بھوئے آلا۔ بوہا ڈونگیاں گلاں وچ کدے نہ جاوے.....''

اُس کے ساتھ پلنگ میں لیٹتے ہوئے شاہ صاحب نے اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

بغیر مزاحمت کیے رخشندہ بولی "غلام مشتاق صاحب بڑے اونچے آدمی ہیں شاہ صاحب۔
جس آدمی کے پاس کوئی نہیں ہوتا ہے اس کی زندگی کتنی بامعنی ہوتی ہے۔"
"کون ایہہ اساڈا غلام مشتاق؟"
"کتنے high ideals ہیں ان کے۔کوئی بات ہے جس کے لیے وہ زندہ ہیں۔ ہماری طرح صرف دن پورے نہیں کر رہے۔"
شاہ صاحب ساتھ ساتھ اُس کے بازوؤں کو بوسے دیتے جاتے تھے اور ساتھ ساتھ غلام مشتاق کا نام لے کر ہنستے جاتے تھے۔ پتہ نہیں یہ رخشندہ کا کونسا عاشق تھا۔ ہوس کے معاملے میں بھی ایک ہے۔
"تساں بہوں بھولے او سرکار میری....."
"انہوں نے اپنی ساری زمینیں مزارعوں کو بانٹ نہیں دیں۔"
"شہدے دی زمین کوں کلر کھا گیا۔ دل وچ سوچیا پئی نکاری ساری زمین آئی۔ چلو ونڈ دیواں تے لیڈر بن جاواں علاقے دا.....مزارعاں کوں اُلو بناوندا اے غلام مشتاق۔"
"جی؟"
"تساں اپنے کوں ایڈا پریشان نہ کیتا کرو۔ ایہہ غلام مشتاق تھیوا اپنا دوست اے چنگا آدمی نہیں.....اس دا پیئو جیوں ہانے پنڈ وچوں اک مسلن نسا کے لیایا اے تے ایہہ.....ایس غلام مشتاق دیاں رگاں وچ مسلن والہو اے بادشاہو۔ نیچاں وچ بہہ کے اید ھا دل ٹھکانے آوندا اے.....سرکاری افسراں نوں رشوت ایہہ غلام مشتاق پہنچاوے۔ تے ڈاہڈی وڈھی کھاوے۔ ترے زنانیاں کرئی بیٹھا اے اللہ دے فضل نال۔ لوکاں اگے شراب نہ پیندا پر بے تکلفاں وچ بہہ کے کیسے ہورنوں چین نہ دیندا اے.....او بادشاہو اسی سارے گناہ گار آں.....کی پچھدے او اساڈیاں گلاں اللہ دی رحمت ساکوں معاف کری آپے۔"
رخشندہ نے آنکھیں بند کرلیں.....ایک چھوٹا سا آنسو اُس کی بائیں آنکھ کے کونے میں آ کر روٹھے ہوئے بچے کی طرح بیٹھ گیا۔
اس کے بعد اُس نے اکرام شاہ صاحب کی مہربانیوں کے خلاف کوئی مزاحمت نہ کی اور اُس وقت تک اوندھی لیٹی رہی جب وہ پہر کا چھوٹا سا تختہ سہ پہر کے قریب اُس کے پیروں پر کمبل بن کر نہ آ بیٹھا۔
اس وقت سید اکرام شاہ کی بیوی جسے سب شاہ جی کہتے تھے اور جس کا جسم حبشی حلوے جیسا چربیلا اور چپکیلا تھا اندر آئی۔ شاہ جی کا رنگ تانبے کی طرح تھا۔ کانوں میں بڑی بڑی سونے کی بالیاں تھیں جن میں چھوٹے چھوٹے ہیرے اور موتی بات کرنے پر پھڑ کنے لگتے تھے۔ وہ قد میں سید اکرام شاہ سے دو ایک انچ لمبی تھی۔ سرخ تہمد اور ململ کا تین گز اور پنڈا اوڑھے وہ کسی شاندار عمارت کی طرح نظر آ رہی تھی۔
رخشندہ شاہ جی کو دیکھ کر سمٹ گئی۔
رخشندہ کو کبھی کبھی ایسے لمحوں میں عجیب قسم کی کوفت ہوتی تھی جب شاہ جی اس سے بہنوں کا سا سلوک کرتی تھی۔

''کھنے ہوگے ہو۔ کتھے کھتے پیئے ہندے او سرکار۔'' شاہنی نے محبت سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''کوئی تکلیف تے نہ تھئی رات۔''

اُس نے ٹانگیں پھیلا کر آہستہ سے جواب دیا۔ ''رات کوذرا تکان ہوگئی تھی۔''

''میں اس چندری تیو کو آکھیا وت توں اولن نیمن گھٹ کے دودھ تپا چاتے جاکے مہمان بی بی کو دے آ۔ پر شوھدی کملی کوں نیندر ایس طرحاں آوندی اے جیئں ہنیری وچ تختہ ٹٹ کے جا چیندا اے...... بے تیو کم ذات...... تیو مر۔''

تیو اندر داخل ہوئی تو گویا ایک بار ہیر کی قبر سے عزت بی بی اٹھ کر اندر آ گئی۔ بقول وارث شاہ:

ہونٹھ سرخ یاقوت جیوں لعل اندر چمکن ٹھوڈی ولایتی سار وچوں
وچوں نک الف حسینی دا پیلا سی زلف ناگ خزانے دی بار وچوں
دند چنبے دی لڑی کہ ہنس موتی دانیں نکلے حسن بازار وچوں
لکھی چین کشمیر تصویر جٹی قد سرو بہشت گلزار وچوں
گردن کونج دی انگلیاں روانہ پھلیاں ہتھ کولڑے برگ چنار وچوں
باہاں ویلنیں ویلیاں گھنہ مکھن دیں چھاتی سنگ مرمر گنگ دھار وچوں

تیو کو دیکھ کر رخشندہ ٹھٹھر گئی۔

''اے! مر ونجیں ستاں گٹ اتھے بہہ کے مہمان بی بی دیاں تیں کوں رب جانے کدھر دیاں نیندراں لتھ چیندیاں نیں......

اسی ''قہرلی'' تمیار سے ٹانگیں دبوانے کا حوصلہ رخشندہ میں نہ پیدا ہو سکا۔

''ناں ناں ناں......'' رخشندہ نے پھر ہمت کر کہا۔

''اے شودھی سارا دن ایویں مچھر دی پھیر ندی اے تساں کج خیال نہ کرو۔ گھٹ تیو۔ تے رات تیکو اکھیا آئی جیئں اوول نیمن ہتھ چلا گھٹ ایناں کوتاں مر موئی ایں جاکے......''

''بس جی اب میں ٹھیک ہوں بالکل......''

''شاہ ہوراں کو گھنیدی اے ڈاہڈا اچھل ورگا چینڈا کر دیندی اے مشکری نہ مار تیو دودھ اکاں......'' شاہنی نے جوش سے کہا۔

تیو قتل باش جلاد کی طرح آگے بڑھی لیکن اب رخشندہ نے انکار کی شکل میں سارا بدن چادر میں لپیٹ لیا۔ سرمہ نجنی تیو دو قدم آگے بڑھ کر رک گئی۔

''بس مجھے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلا دیں تیو آپ۔'' رخشندہ نے آہستہ سے التجا کی لیکن جب تیو موتیوں والی جھالر کی جالی اٹھا کر رات والے جگ سے پانی نکال کر گلاس میں ڈالنے لگی تو شاہنی پھر بھڑ گئی۔

''اوے تیو۔ رنڈی تھیویں ایہہ گرم پانی پلاون لگی ایں اندروں پانی لیا جاکے فریج وچوں۔''

تیو اٹھک اٹھک سے بل کھاتی باہر نکل گئی۔

"آپ کو ڈر نہیں لگتا؟"

"کاہدا بادشاہو؟"

"اس.....تیو سے شاہ صاحب کے پیر دبواتے ہوئے.....آپ کو....."

تھوڑی دیر حبشی حلوے جیسا چربیلا جسم فنی کے ہلکورے کھاتا رہا۔ پھر شاہنی قدرے ناک سکوڑ کر بولی" تے ہور دلدار بی بی جا کھٹے سائیں نوں اوہدے اگی وچ پھولا آئی؟"

"لیکن اتنی خوبصورت لڑکی.....اور پھر شاہ صاحب جیسے آدمی....."

اب شاہنی اتنا فنی کہ اس کے کانوں کے ہیرے اور موتی پینگوں کی طرح جھولنے لگے۔

"تساں بھلوں بھولے او بادشاہو۔ تھکا ہویا سائیں تے اوس نوں آرام دیناں اے ناں؟ گھڑی دو چنڈے نوں آرام مل سی تے آپی پچھل ورگا ہو جاسی تہاڈے نال....."

"آپ کو مجھ سے.....تیو سے.....دوسری عورتوں سے خوف نہیں آتا؟"

"خوف؟.....کس گل دا بادشاہو؟"

"کوئی عورت ہم میں سے.....تیو.....میں یا کوئی اور آپ کے حق پر چھاپہ مار سکتی ہے۔"

"سب اپنا اپنا نصیب کھاوندے نیں بادشاہو.....جدوں تیکر ساڈا رب رسول راضی اے ساڈی تے کوئی ہوا وی نہ تک سکدا اے۔"

رخشندہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

کیا سان فرانسسکو کی امپائر بلڈنگ تھی شاہنی بھی.....ہر طرف انگارے دہک رہے تھے اونچی اونچی آتش بازی روشن تھی اور وہ توکل کا کھیس اوڑھے نواڑی چارپائی پر مزے کے ساتھ سو رہی تھی۔

تیو چاندی کے گلاس میں روح کیوڑہ ملا کر ٹھنڈا برف پانی لے آئی تو شاہنی رخشندہ کے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ایک سکن فوڈ کی شیشی اٹھا کر شاہنی نے پوچھا....."ایہ کی کریندے او تساں....."

"چہرے کا لوشن ہے جی....."

تیو کی نظر بھی شیشی کی طرف اٹھ گئی۔

"کاہدا لوشن اے؟"

"جلد ملائم رہتی ہے۔"

شاہنی نے اپنے دوپٹے کے پلے سے سو روپیہ کھولتے ہوئے کہا" تساں شہر وچ جا ہو رگھن لینا۔ ایدی قیمت میتھوں چا گھنو۔"

"نہیں جی پیسوں کی کیا بات ہے آپ رکھیں اسے۔"

"پیساں کوں تاں نہ کیتا کرو۔ دل برا ہو ویندا اے میرا....."

تھوڑی دیر سو کا نوٹ بکنے پر پڑا رہا۔ شاہنی لوشن کی بوتل اور پیو کو لے کر رخصت ہوگئی۔ پھر رخشندہ نے نوٹ اٹھایا۔ اس کی چار تہیں لگائیں اور اسے اپنی باڈس میں اڑس لیا۔

جھنگ سے واپسی پر وہ پورے دو دن سے اس کمرے میں بند تھی۔ نہ وہ کسی فنکشن پر گئی نہ اپنے کسی قدر دان عاشق سے ملی۔

بس اسی کمرے میں مقید وہ کئی بار زندہ ہوئی اور کئی بار مرگئی۔

کیا میں سر کے بال مونڈھ چادر اوڑھ کا صفایا کر کے کسی بڑے آدرش کی خاطر..... پاکستان کی خاطر، مذہب کی خاطر، بنی نوع انسان کے لیے باہر نکل جاؤں۔ Awake اور Tower بیچنے والی عورتوں کی طرح سائیکل پر سوار گلی گلی کوچہ بہ کوچہ پھروں؟ سر سید احمد خاں کی طرح اپنی قوم کی خاطر سائنٹفک سوسائٹی بناؤں، مسلم کانفرنس کی بنیاد رکھوں۔ مجھ میں سید احمد شہید کی روح اور نواب عبداللطیف کی روح آ بسے۔ میں..... میں کسی نصب العین سے خود بخود منسلک ہو جاؤں اور پھر زندگی اتنی بے معنی، اتنی بے ربط اور اتنی کھوکھلی نہ رہے.....

کبھی وہ سوچتی کاش! میں بھی شاہنی کی طرح توکل کی بغل مار سکتی۔ پھر ہر واقعہ، ہر حادثہ، ہر فعل بامعنی ہو جاتا۔ زندگی کے ساتھ کوئی جنگ باقی نہ رہتی۔

کبھی اُس کے جی میں آتا کہ وہ اپنا سارا سامان فرانسس اناطول کی تھائیس کی طرح کھلے ہاتھوں لٹا کر صرف تین کپڑوں میں جھنگ چلی جائے اور پروفیسر ظفر کے سامنے جا کر آنکھیں بند کر مرن برت رکھ کر ساری عمر گزار دے۔

لیکن اُس کے اندر کہیں بہت اندر کوئی آواز اُسے ایسا کرنے سے روکتی تھی۔ اس کتاب کو کھول کر مت دیکھنا۔ اگر اس کے سارے صفحے بھی سفید نکل آئے تو پھر کوئی ہدایت باقی نہ رہے گی.....

وہ.....آسانی سے جھنگ جا سکتی تھی۔ اُسے یوں لگتا تھا کہ وہاں ساری دنیا کی کشش ثقل کا مرکز ہے لیکن وہ اسے آزمانا نہیں چاہتی تھی۔

اگر ظفر بھی مڈل کلاس سوسائٹی کا فلسفہ لیے ہوئے ہوا تو؟

روز مرہ کی زندگی میں اگر ظفر نے بھی ٹکے ٹکے پر جان دی تو؟

ظفر بھی اگر تنگ دستی کے ہاتھوں فراخدلی نہ برت سکا تو.....

رخشندہ عجیب قسم کے گومگوں کے عالم میں تھی.....

ایک وقت وہ تھا کہ ظفر اُس کی نظروں سے اوجھل تھا۔ خدا جانے دیوار پار تھا کہ سات سمندر پار.....خدا جانے کسی سفید عورت کی نیلی آنکھوں کا اسیر تھا کہ کسی سانولی عورت کی زلفوں کا گرویدہ.....رخشندہ کے دل میں ایمان کی نور روشن تھی۔ جی کو ایک قرار تھا کہ جہاں بھی ہو ظفر ہو گا صرف اُس کا ہو گا۔ یہ خوش اعتقادی خدا کی دین تھی۔

اب وہ جانتی تھی کہ کبھی کبھی فاصلہ محبت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور کبھی کبھی محبوب اگر بازوؤں کی گرہ میں بندھا بھی ہو تو سات سمندر دور ہوتا ہے۔ دل کے قرار کی کنجی بھی خدا نے صرف اپنے ہاتھ میں چھپا رکھی تھی۔

کبھی کبھی تیرہ برس کی بیڑس کی ایک جھلک بہت کافی ہوتی ہے اور کبھی کبھی سولہ سو رانیاں بھی اندر کے بچھڑے

ہوئے انتشار کو رام نہیں کر سکتیں۔

سفید فام لوگ free love' swinger society اور group marriages کے باوجود بھی بالکل بے یار و مددگار اور تنہا رہتے ہیں۔ وہ بال بڑھا کر .L.S.D کے نشے میں مہینوں نہیں نہاتے اور بے مصرف گھومتے ہیں اور گھومتے چلے جاتے ہیں۔ سڑکوں پر شہروں میں' قریہ بہ قریہ۔ کو بہ کو..... اور نشاط سکون کسی دروازے کا کھل جا سم سم اُن کے ہونٹوں سے نہیں نکلتا۔

خدائے بزرگ و برتر نسلِ انسانی نے تیرا ایسا کونسا گناہ کیا ہے کہ تو اسے سکون کی دولت عطا نہیں کر سکتا۔ تیرے گھر تو کسی چیز کی کمی نہیں۔ پھر تو نے خوشی کو اپنے لوگوں پر اس قدر جزرسی سے کیوں بانٹا؟

تیرے لوگ کیا صرف تلاشِ معاش کے لیے زندہ رہیں؟

کیا وہ فقط افزائش نسل کے چکر میں پھنسے رہیں؟

کیا وہ آئینہ صورت لوگوں کو اپنے دل میں بسائیں اور پھر کرچی کرچی ہو جائیں؟ وہ بھی اور صورت بھی۔

تو نے انسان کو اتنے کشٹ کیوں دیئے؟

تجھے اپنے بنائے ہوئے پتلے سے اتنا بیر کیوں ہوا؟

اتنی ساری آزمائشیں سہہ کر اُسے کیا ملتا ہے اس جہان سے؟ بڑھاپا؟..... بیماری؟..... پچھتاوے؟..... وسوسے؟..... جدائی؟..... موت؟

تجھے تو ایک کُن کہنے کی ضرورت تھی۔ پھر یہ سارا انتشار قرار میں بدل جاتا۔ پھر اپنے عبد کے لیے تو نے ایسا کیوں نہ چاہا؟

کس رسّی کو پکڑ کر وہ اس بابِ انتشار سے گزرے یا ربّ العالمین؟

محبت کی رسّی؟

محبت جو دائمی نہیں ہوتی۔ وہ طوائف تھی اور اس حقیقت سے بخوبی واقف تھی۔

مذہب کا سونٹا ہاتھ میں لیے رکھے؟

مذہب جس کے ان گنت روپ ہیں۔

وطنیت کا چوتھا ہے ہوئے چلے؟

وطن جو نسلِ انسانی پر حد بندی سے حاصل ہوتا ہے۔

نسلِ انسانی کی بہتری کا خواب؟

نسلِ انسانی جو نیکی' اچھائی اور پیار کے پالنے میں شہزادہ گلفام کی طرح اوب جاتی ہے۔

یہ سوچ..... یہ خود کلامی کا موڈ رخشندہ پر کئی دن سوار رہا۔ وہ اختی اور اپنے وارڈ روب کے تمام کپڑے پلنگ پر' فرش پر' صوفوں پر پھینک دیتی۔ پھر سوائے لیموں پانی کے سارا سارا دن نہ کچھ کھاتی نہ کچھ پیتی..... پھر آدھی رات گئے وہ سارے کپڑے چوم چوم کر سینت سینت کر سنبھالتی اور بڑے آئینے کے سامنے پورا میک اپ کر کے پہروں بیٹھی رہتی۔

پہلے بھی کئی بار اُس کا پاؤں بھاری ہوا تھا اور اسقاطِ حمل کے لیے لیڈی ڈاکٹر فہیم کے پاس گئی تھی۔ لیکن اس بار جیسے یہ ہونے والا بچہ زندگی کے ساتھ اُس کا آخری رابطہ تھا۔ اُس نے پہروں اس بچے کے متعلق سوچا۔ خیال میں اُسے چوما' اُسے ساتھ لٹایا۔ پروان چڑھایا اور پھر خود ہی کسی شہید کی ماں کی طرح' اس طرح زندگی سے رخصت کر دیا گویا وہ ہمیشہ کی زندگی پا چکا ہو۔

حمل گرانے کا فیصلہ ہمیشہ اُس نے ایک آدھے گھنٹے کے اندر اندر کیا اور دو چار دن میں بھلی چنگی ہو کر وہ پھر وژ تکے مارنے کے قابل ہو گئی۔ اُس کی زندگی کو بچہ راس نہیں آتا تھا۔

لیکن اس بار؟

شاید اب اُس کی عمر زوال کی طرف مائل تھی..... زندگی کے کھوکھلے پن کا اُسے اس حد تک یقین آ چکا تھا کہ اب اُسے اپنی روح کے لیے کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔

عمرانیات کے ماہر کہتے ہیں کہ خاندان معاشرے کی جڑ ہے۔ اور بچہ قوم کی بنیاد ہے۔

وہ اس بات کو بھی آزمانا چاہتی تھی۔

لیکن پھر وہ خوفزدہ ہو کر سوچتی۔ میں اپنے بچے کو کس خاندان کی جڑ بتاؤں گی؟ وہ کس قوم کی بنیاد ہوگا؟ جب وہ بڑا ہو کر مجھ سے پوچھے گا کہ میرا باپ کون ہے تو میں اُسے کیا بتاؤں گی؟

نہ جانے اتنے سارے مردوں کے میل جول میں وہ بچہ کس کو اپنا باپ سمجھے گا۔

وہ بھرے پُرے خاندان میں کس قدر تن تنہا گھومے پھرے گا؟

وہ Cousin love کو ترسے گا۔ بڑے بوڑھوں کی شفقت کو تلاش کرے گا۔ بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ پاکستان میں خاندان کے بغیر بچے کو دنیا میں لانا اُس بچے کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ میں اُس کے لیے ٹب' اونی جرابیں' پلاسٹک کے کھلونے' نمڈل ہیڈ' نرسری' سکول' کالج..... سب کچھ مہیا کر دوں گی..... لیکن پھر ایک اور انسان ساری عمر تن تنہا اندر سے سوکھا باہر سے کلوروفل سے لدا پھندا درخت بن کر زندگی بسر کرتا رہے گا.....

وہ سولہ سوانیوں میں اکیلا رہے گا..... کیونکہ رخشندہ نے اُس کی جڑیں کاٹ دی تھیں۔ یہ منی پلانٹ ہمیشہ کمزور رہے گا۔ ہمیشہ محبت کا متلاشی..... ہمیشہ تنہا.....

اپنی تمام آرزوؤں کے باوجود اُس نے Abortion کا فیصلہ کر لیا۔ اُسے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ اپنی خوشی کی خاطر ایک ذی فہم روح کو ایسی دُنیا میں لے آئے۔

ڈاکٹر ساجدہ فہیم کی کلینک پر اُسے فیروزی شال میں ملبوس وہ پھول وتی ملی۔

ڈاکٹر فہیم کا کلینک بظاہر عورتوں کے خفیہ امراض کا کلینک تھا۔ یہاں وہ ماہواری اور حمل سے متعلق جو بے قاعدگیاں عمل میں آتی ہیں' ان کا علاج کرتی تھی لیکن دراصل وہ ایسی ماؤں کو رہائی اور خلاصی دلانے کا کام کرتی تھی جو بوجوہ ماں بننے کو تیار نہ ہوں۔

کسی نوجوان ترک کی طرح ڈاکٹر فہیم کے چہرے پر بھی سنہری مسیں بھیگی رہتی تھیں۔ اُس کا سانس چڑھے

ہوئے بلڈ پریشر کی طرح بڑے زیر و بم کے ساتھ آتا تھا۔ بات کرتے کرتے وہ یکدم رُک جاتی اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر سانس کو پانی کے گھونٹ کی طرح اندر کیا کرتی۔ ڈاکٹر فہیم بڑی زندہ دل' جواں سال اور راسپوٹین جیسی عورت تھی۔

کلینک کی آمدنی سے اُس نے چھ کوٹھیاں' بارہ مربعے اور ایک فلورمل بنائی تھی۔ اُس کا شوہر جو زیادہ تر ڈاکٹر فہیم کا شوہر کہلاتا تھا' چھوٹے قد کا پیچ ہی دانم قسم کا آدمی تھا۔ اس پر ہر کپڑا انڈے کا کپڑا لگا کرتا۔ وہ چاہے کتنا بھی ناراض کیوں نہ ہو اُس کا اصول تھا کہ بات ہمیشہ مسکرا کر ہی کرتا۔ ڈاکٹر فہیم کو وہ ہمیشہ بڑے مؤدب انداز میں ڈاکٹر صاحب پکارتا اور اُن کی ہر بات کے لیے جمع غائب کا صیغہ استعمال کرتا۔ سنا ہے ڈاکٹر فہیم دراصل ایم بی بی ایس نہیں تھی۔ شادی سے پہلے اُن کے شوہر نے اُن کے لیے کسی طرح ایم بی بی ایس کی جعلی ڈگری کا انتظام کیا تھا اور اسی مہربانی کے عوض ڈاکٹر ساجدہ فہیم نے مسٹر ڈاکٹر فہیم سے شادی کر لی تھی۔

ڈاکٹر ساجدہ فہیم کے گھر میں مکمل طور پر مادر سری قسم کا نظامِ خاندان رائج تھا۔ کھانے کی میز پر ہر ڈش پہلے ڈاکٹر صاحب تک آتی اور پھر مسٹر ڈاکٹر فہیم تک پہنچتی۔ یہاں بچے ہمیشہ ماموں جان' خالہ اور نانی اماں کا ذکر کرتے۔ مسٹر ڈاکٹر فہیم اور اُن کے بچے سب مل کر چچا' تایا' دادا ابا' دادی اماں اور پھوپھیوں کا خوب مذاق اڑاتے تھے۔ ہر انشورنس' بینک اکاؤنٹ' پراپرٹی ڈیل ڈاکٹر ساجدہ فہیم کے نام تھی۔ سفر ہو یا حضر سارے اہم فیصلے ڈاکٹر صاحب خود کرتی تھیں۔ بچوں کو سکول سے لانا' کوٹھیوں کے کرائے وصول کرنا' ٹیوب ویل کی مرمت اور فصلوں کی آمدنی کا حساب کتاب اور فلورمل میں البتہ Surprise Visit کرنا مسٹر ڈاکٹر فہیم کا کام تھا۔

سنا ہے ڈاکٹر فہیم ہمیشہ اپنی مریض عورتوں سے عین مشکل کے وقت یہ کہا کرتی تھیں..... "مجھے تو سمجھ نہیں آتی تم لوگ مردوں کے شکنجے میں پھنس کیسے جاتی ہو؟ مجھے دیکھو دس برس سے کام کر رہی ہوں۔ مجال ہے کوئی مرد میری ہوا کو بھی تک جائے۔" "مرد کو اُس کی جگہ پر بٹھا کر رکھتے ہیں ہاں۔"

جس وقت رخشندہ سفید ساڑھی اور سفید چادر میں ملبوس کلینک میں داخل ہوئی ڈاکٹر فہیم اپنے آپریشن تھیٹر قسم کے لیبر روم سے لوٹی ہی تھی۔

"ہیلو بیگم بختیار..... کیا حال ہے سویٹی؟"

"ٹھیک ہوں جی....." رخشندہ نے بجھے دل سے کہا۔

"پھر کچھ گڑبڑ ہوگئی.....؟ ہیں ڈارلنگ؟"

"ہاں ڈاکٹر صاحب....."

"جنرل صاحب کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہیں جی....."

یہاں کلینک پر سب اُسے جنرل بختیار کی بیوی سمجھتے تھے۔ گو یہاں کچھ سمجھنا یا نہ سمجھنا سبھی بیکار تھا۔ پھر بھی اُس کی لمبی سیاہ مرسڈیز کار کی وجہ سے ڈاکٹر فہیم اُسے بڑے لاڈ سے بلاتی تھی۔ جنرل بختیار کی بیوی سمجھنے کی بھی ایک خاص وجہ تھی۔ سب سے پہلے وہ جنرل صاحب کے ساتھ ہی اس کلینک میں آئی تھی۔

اُس کا وہ پہلا Abortion تھا اور وہ حمل گرانا نہیں چاہتی تھی۔ جنرل صاحب گو کئی جنگی اعزاز حاصل کر چکے تھے لیکن اس معاملے میں اُن کا دل بہت چھوٹا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایسا بچہ اُن کے کیریئر' شہرت اور ناموس اور خاندانی سالمیت کے لیے بہت بڑا اُٹھپلا ثابت ہو سکتا ہے۔ جس وقت رخشندہ جنرل صاحب کے ساتھ پہلی بار کلینک میں داخل ہوئی تو وہ چھما چھم رو رہی تھی۔

''خدا قسم جنرل صاحب! میں ساری عمر کسی کو نہیں بتاؤں گی کہ بچہ آپ کا ہے۔''

''بہت بچے ہوں گے۔ خواہ مخواہ ابھی کیوں اپنی جان پھنساتی ہو..... یہ کوئی عمر ہے بچے پالنے کی۔ Eat. sleep & be merry.....''

ڈاکٹر فہیم سے جنرل صاحب نے انگریزی میں گفت و شنید کی۔

پھر بھرپور ہاتھ رخشندہ کے کندھے پر مار کر بولے Chin up tuck in Tummy in.....جوان کا morale نہیں گرنا چاہیے۔''

رخشندہ نے بڑی کمزوری مسکراہٹ پیش کی تو جنرل صاحب نے ڈاکٹر فہیم سے کہا'' یہ ہماری Wife بڑی Silly ہے ڈاکٹر صاحب۔ دیکھئے اسے سمجھائیے۔ بچے کے بعد یہ اتنی Beautiful رہ جائے گی۔ سمجھائیے اسے.....''

''جب میں Beautiful نہیں رہنا چاہتی تو آپ مجھے کیوں مجبور کر رہے ہیں.....''

''آپ ڈریں نہیں بیگم صاحب؟ زیادہ تکلیف نہیں ہوگی.....'' ڈاکٹر فہیم نے تسلی دلائی۔

''میں تکلیف سے نہیں ڈرتی۔''

''Thats' the spirit.....wonderful.''

اس بار پھر رخشندہ اپنی Spirits میں نہیں تھی۔ لیکن جنرل بختیار اُس کے ساتھ نہیں تھے۔ گو اس کرم فرما سے اُس نے ناطہ نہیں توڑا تھا لیکن اب وہ جب بھی ضرورت پڑتی اکیلی ہی ڈاکٹر فہیم کے کلینک پر آیا کرتی تھی اور گو ڈاکٹر فہیم اب تک اُس کی Back- ground سے بخوبی واقف ہو چکی تھی لیکن رجسٹر میں وہ ہمیشہ رخشندہ کو جنرل بختیار کی بیوی ہی ظاہر کرتی۔

''بڑی دُبلی ہو رہی ہو سویٹی.....''

''کچھ دن سے بخار آ رہا ہے.....''

''ملٹی وٹامنز کھانا مت بھولا کرو۔ ہیلتھ کا خیال رکھنا چاہیے عورت کو۔ مرد کو Healthy عورت اچھی لگتی ہے۔ ووٹ کس کو دیا تم نے ڈارلنگ؟''

سر جھکا کر رخشندہ نے آہستہ سے کہا'' جماعت اسلامی کو.....''

''Why?.....پیپلز پارٹی کو کیوں نہیں؟''

''میں نے تو محض رسم پوری کی ہے ووٹ ڈالنے کی ورنہ ووٹ سے کیا بنتا ہے۔''

''بڑے Fair elections کروائے ہیں صدر یحییٰ نے.....'' ڈاکٹر بولی۔

''الیکشنوں سے کیا بنتا ہے ڈاکٹر صاحب؟''

''کیوں؟.....ہماری اپنی Constitution ہوگی۔ جمہوریت ہوگی' عام آدمی کے مسائل سلجھیں گے۔''

''ڈاکٹر صاحب ہوگا وہی جو بھارت چاہے گا۔ جو بڑی طاقتیں ہمارے حق میں فیصلہ کریں گی۔ ہر فیصلہ بڑی طاقتیں کیا کرتی ہیں۔''

''ہم کوئی چھوٹا ملک نہیں ہیں' ہم دنیا کا پانچواں بڑا ملک ہیں۔ بیگم بختیار۔ ہم کسی سے نہیں ڈرتے۔''

تجربے نے رخشندہ کو سکھایا تھا کہ جب رائے اپنے بہاؤ پر نہ ہو تو خاموشی اور رضا سے گوندھ کر جواب دیئے جاتے ہیں۔

''ہاں جی وہ تو ہے.....''

''آپ دیکھتی جائیں ہم نے سن پینسٹھ میں بھی بھارت کے دانت کھٹے کیے تھے اب بھی جو وقت پڑا تو ایسا ہی ہوگا۔''

کمزوری آواز میں اس نے جواب دیا' بالکل۔''

''کتنا ٹائم اوپر ہوگیا ہے۔'' فہیم نے سوال کیا۔

''دو مہینے اور چار دن.....''

اس وقت ایک دائی ڈاکٹر فہیم کو بلا کر لے گئی اور پہلی بار رخشندہ نے پھول وتی کی طرف دیکھا.....

●○●○●○

نازک پھول وتی حمل کی وجہ سے اُس شاخ کی طرح جھکی ہوئی تھی جو بارآور ہو کر زمین کی طرف جھک جاتی ہے۔
اُس کے دبلے پتلے کندھوں پر ہلکے فیروزی رنگ کی گرم شال تھی اور کانوں میں پلاسٹک کی بالیاں تھیں۔ وہ صوفے پر چپ چاپ بیٹھی اپنے تن سے اپنے بچے کے جدا ہونے کی گھڑیاں گن رہی تھی۔ دائیں آنکھ سے اُس کے رستے ہوئے آنسو کبھی کبھی ناک پر سے بہہ کر اُس کی ناک کے بائیں نتھنے پر آ گرتے اور ناک میں پڑا ہوا کوکا بھیگ جاتا۔
کچھ دیر کے بعد رخشندہ اپنے صوفے پر سے اٹھی اور پھول وتی کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ دونوں چپ تھیں۔ پھر رخشندہ نے اپنا چٹا گورا ہاتھ پھول وتی کے کندھے پر رکھا تو پھول وتی اُس سے لپٹ گئی۔
''باجی!.....خدا کے لیے آپ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں.....میں.....میں میرا ہے یہ بچہ.....مجھے بہت پیارا ہے.....اماں کب مانیں گی میری بات؟''
رخشندہ نے پھول وتی کے سر پر ہونٹ رکھ دیے۔ پتہ نہیں اُسے کیوں احساس ہوا کہ اُس کی چھوٹی بہن کی حدت اس سے رس کر اُس کے گلے مل رہی ہے۔
''وہ کویت سے ضرور آئے گا۔ میں نے اُسے خط لکھ دیا ہے باجی۔ وہ دس پندرہ دن میں آ جائے گا لیکن ماں نہیں مانتی ناں۔ وہ کہتی ہے ایسے وسب کرنے والے پردیس سے نہیں آتے۔ باجی.....آپ اماں کو سمجھا دیں.....میں.....جب تک وہ کویت سے نہیں آئے گا میں گاؤں چلی جاؤں گی اپنے ماموں کے پاس.....''
رخشندہ اُسے اپنے ساتھ لپٹائے ہولے ہولے تھپتھپاتی رہی۔
''میرا ماموں زاد بھائی ہے جی وہ.....ہم بچپن سے ایک گھر میں رہے ہیں۔ بڑا پیار ہے اُسے مجھ سے۔ وہ.....اُسے صبح ناشتے کے وقت مکئی کی باسی روٹی اور دہی کھانے کا بہت شوق ہے جی۔ میں منہ اندھیرے اُس کا ناشتہ لے جایا کرتی تھی۔ آپ اماں کو سمجھائیں میرا بچہ ضائع نہ کروائیں جی کیا فائدہ؟ میرے ماموں زاد کو تو کویت سے آ لینے دیں.....پھر فیصلہ کر لیں جی.....''
پھول وتی نے اپنا سر صوفے کی پشت سے لگا لیا اور آنسوں جھلار کی طرح اُس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔
''اماں کے دماغ میں بات ہی نہیں آتی۔ وہ کہتی ہیں منیر کوئی تم سے شادی تھوڑی کرے گا.....وہ تو جب بھی آئے گا ایسا ہی تحفہ تمہیں دے کر چلا جائے گا۔ بھلا بتائیے یہ کوئی اُس کی غلطی ہے؟
میں نے اپنا تن من دھن اُس کے سپرد کیا۔ وہ کوئی چور ہے؟ پتہ نہیں اماں کیوں نہیں سمجھتیں۔ منیر ایسا نہیں ہے۔ عام مردوں جیسا! ہاں سچ وہ مجھ سے بڑی محبت کرتا ہے۔ بہت زیادہ.....بڑی شدید خدا قسم وہ مر جائے میرے بنا.....''

پھول وتی بولتے ہوئے اپنا آنسوؤں بھرا ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

رخشندہ نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنا ہاتھ پھول وتی کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔

رخشندہ کے دل نے کہا..... پھول وتی! تو ٹھیک ہی سمجھتی ہوگی کہ منیر کو تجھ سے بڑی محبت ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے تیری ماں بھی ٹھیک ہی سمجھتی ہو..... کیونکہ ہر قیمتی چیز کی طرح محبت اتنی عام نہیں جتنا ہم سمجھتے ہیں۔ یہ تو ہیرے کی کان سے بھی زیادہ نایاب ہے۔ سچائی سے بھی کہیں زیادہ سولی پر چڑھائی جاتی ہے۔ اس کی توفیق تجھے، مجھے اور منیر کو کہاں پھول وتی!

ہم تو سیدھے سادے آدمی ہیں۔ بھول جانے والے بھٹک جانے والے۔ آزمائش میں اوندھے منہ گرنے والے..... چھوٹی سی خوشی پر اتنا بوجھ ڈالنے والے کہ وہ بوجھ سے ہی مسلی ہوئی تتلی کے پروں کی طرح دم توڑ دے۔

تو اور میں پھول وتی..... ہم تو فقط جسم سے صدا دیتے ہیں اور جسم کی بھول بھلیوں میں ہی کھوئے رہتے ہیں۔ ہمارے لیے محبت کیسی؟

رخشندہ کو آہستہ آہستہ پچھلے سات سالوں کے ان گنت واقعات یاد آ رہے تھے۔ جس روز ملک صاحب گلبرگ والی کوٹھی میں فوت ہوئے اور پولیس نے آ کر اس کوٹھی کا محاصرہ کیا جو ایس پی انکوائری کے لیے آیا تھا کتنا خوبصورت تھا۔ ہالی وڈ کے ایکٹروں کی طرح وجیہہ اور کمر کے گرد اس کی کسی ہوئی پیٹی۔

پتہ نہیں یہ پیٹی اُسے کیوں اب تک نہ بھولی تھی۔ کس طرح پھر خاموشی میں اس کا پیتل کا بکل کھلا..... پھر کس طرح وہ بلٹ کئی دن اُس کے پلنگ پر پڑی رہی اور مقدمے کی آخری ساعت تک وہ بری الذمہ رہی۔

رخشندہ نے جب بھی محبت کے لیے رفاقت کے لیے اپنی تنہائی کو کسی اور کی ذات میں مکمل طور پر ضم کرنے کے لیے بازو اٹھائے۔ جب بھی اُس کی روح چھوٹے بچے کی طرح زندگی کے اندھیرے سے 'یاس سے' خوف سے اپنے وجود' اپنی بقا کے کھوکھلے پن کا مفہوم سمجھنے کے لیے کسی کی جانب بازو اٹھائے اُس کا ایک ہی نتیجہ نکلا.....

پھول وتی.....! تو اور میں..... ہم صرف جسم کا بلاوا ہیں۔

میں نے جب بھی مدد کے لیے ہاتھ اٹھائے میرے چاہنے والوں نے مجھے اپنا عضوِ تناسل پکڑا دیا۔ مرد کے پاس ہمیں دینے کے لیے اور کچھ نہیں۔ مرد کی ذات بھی کس قدر تہی دست تھی کہ وہ اس سے زیادہ اور کچھ بھی کسی عورت کو نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے تو شوِلنگم کی پوجا عورتوں کا شعار رہی تاکہ مرد کی ذات کا جو حصہ ان کا ہے اس کو وہ اپنا دھرم بنالیں اور اس کی پرستش سے بالآخر اپنے رب سے جا ملیں۔ کیونکہ پرستش اور عبادت کے بغیر انسان اپنے خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔ مجاز سے حقیقت کی ایک راہ تھی اور جنوبی ہند کی عورت نے بہت پہلے اپنے راستے کو پہچان لیا تھا۔ میں نے جب بھی پیار' محبت' یکرنگی کی آرزو کی۔ میرے چاہنے والوں نے سمجھا میں دولت کی خواہش کررہی ہوں۔ وہ لاؤ پیار کو تحفوں سے عبارت کرتے رہے۔

مرد کے پاس غالباً عورت کے ساتھ Share کرنے کے لیے اور کچھ ہے بھی نہیں۔ تمہارا منیر جب بھی آئے گا وہ تمہارے پاس اسی قدر آ سکے گا جس قدر اس کا جسم تمہاری سیماؤں کو چھو سکتا ہے۔ پھر اُسے لوٹ جانا ہوگا۔ کسی کویت کی جانب..... اور یاد رکھو پھول وتی..... ہر شخص اور گمنام کا ایک کویت ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ اس کی جانب لوٹ جاتا ہے۔ مرد اور

عورت مکمل طور پر کسی کیمیائی ردعمل کے بعد بھی ایکCompound نہیں بنتے۔

ان کے مولی کیول(Molecule) آپس میں اس قدر ربط قائم نہیں کرتے کہ ایک ذات ہو کر ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے سوال کا جواب بن جائیں۔ اگر مجھے یقین ہوتا پھول وتی کہ ظفر ایک بار میری روح کو چھو سکتا ہے اگر میں جانتی کہ وہ میری سائیکی پر کسی قسم کا چھاپا رکھ سکتا ہے تو میں پہلی گاڑی سے جھنگ چلی جاتی اور مائی ہیر کی قبر پر بیٹھ کر اور لڑکوں کے کالج کو قطب نما بنا کر ساری عمر وہیں گزار دیتی۔

ڈاکٹر فہیم دستانے اتار رہی تھی کہ غسل خانے میں سے پھول وتی کی ماں داخل ہوئی۔ رخشندہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ بالکل وہی چہرہ وہی قد۔ وہی اماں جیسی آنکھیں۔ نووارد خاتون ماتھے سے لے کر پیروں کی انگلیوں تک خاندانی سیدانی تھی۔

ماں اور ڈاکٹرنی کو دیکھ کر پھول وتی سکڑ گئی۔

"بیگم بختیار! میں ابھی حاضر ہوئی" پھر اس نے زور سے اس کی پشت پر دھموکا مار کر کہا۔ "سویٹی Health کا خیال رکھا کرو۔ اگر تم اسی طرح Weak ہوتی گئیں تو جنرل صاحب کوئی Fresh لڑکی ڈھونڈ لیں گے۔"

"جاؤ بیٹا....." اماں نے پھول وتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

پھول وتی کا چہرہ باسی چائے کی طرح بدرنگ ہو گیا۔

"فکر مت کرو ڈیئر۔ صرف اندرونی معائنہ کرنا ہے۔" ڈاکٹر فہیم نے کھلم کھلا رخشندہ کو آنکھ مار کر کہا.....

"جاؤ بیٹا"

پھول وتی کھڑی تھی اور اس کے نتھنے کسی دام تلے آئے جانور کی طرح پھڑک رہے تھے۔

"جا بیٹی..... جا تجھے اپنے ماموں کی قسم جا....."

پھول وتی سر جھکا کر آہستہ آہستہ ڈاکٹرنی کے ساتھ چلی گئی۔

بڑی دیر اماں جی اس کے پاس بیٹھی ناک صاف کرتی اور روتی رہیں۔ رخشندہ دم بخود تھی۔ اپنی ماں کو کوئی کس طرح تسلی دے؟ کیسے سمجھائے کہ اماں بس یہی زندگی ہے..... اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں اوپر نیچے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

بڑی دیر کے بعد حوصلہ کر کے رخشندہ نے اماں جی کے زانو پر ہاتھ رکھ دیا تو ماں یوں بلبلا کر روئی کہ اس کا سارا انجر پنجر ڈھیلا ہو گیا۔ بڑی دیر سیدانی دوپٹے میں آنسوؤں کے بانجھ بیج بوتی رہی پھر خود بخود ان دونوں کے درمیاں گفتگو آسان ہو گئی۔

"آپ..... بڑا ظلم کر رہی ہیں۔ اماں جی..... منیر کو کویت سے آ لینے دیں۔ وہ خود بہتر فیصلہ کر سکتا ہے۔"

"میں منیر کا اعتبار کیسے کروں بیٹا۔ وہ بڑا غیرت والا جوان ہے۔ مر جائے گا وہ تو سیدھا..... اس سے کوئی برداشت ہو سکتی ہے یہ بات۔"

"آپ تھوڑی دیر کے لیے انہیں کسی گاؤں بھیج دیں..... اپنے ماموں کے پاس....."

قہر سے اماں نے رخشندہ کی طرف ایسے دیکھا کہ تھوڑی دیر کے لیے رخشندہ کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔

"بچپن کی منگنی ہے اس کی..... بڑا پیار ہے منیر کو اس سے....."

"جی مجھے بتا رہی تھی وہ....." رخشندہ نے محتاط طریقے سے کہا۔

"اس کی صحت خراب ہے کئی سالوں سے۔ سوچتی بہت ہے۔ دیکھا نہیں تم نے بچی کتنی نازک کلائیاں ہیں اس کی۔ چھپکلی جیسے پچکے ہاتھ پیر ہیں۔ میں نے سوچا منیر کے آنے سے پہلے اس کی صحت ٹھیک ہو جائے۔ کیا پتہ تھا مجھے کیا پتہ تھا مجھے....." بڑی دیر تک وہ کیا پتہ تھا کا ورد کرتی رہیں۔ جیسے اورگرد کھڑے فرشتوں سے گلہ کر رہی ہوں۔ پھر خود بخود انہوں نے بات کا رشتہ جوڑا..... "میں نے اسے گاؤں بھیج دیا اپنے ماموں کے پاس۔ بہت پیاری ہے یہ ماموں کی....."

"اُن ہی کے پاس پھر کیوں نہیں بھیج دیتیں..... جب تک منیر نہیں آئے؟"

رخشندہ نے بھولپن سے سوال کیا۔

"دفع دور..... لعنت۔ پھر اُسی ماموں کے پاس بھیج دوں جس کے پاس یہ منہ کالا کروا کے آئی ہے۔"

اب سیدانی پھر رونے لگیں اور دیر تک روتی رہیں....."میرا سگا بھائی۔ میرا اپنا سگا بھائی..... اُس کی اپنی سگی بھانجی..... اور..... کس بات کا اعتبار کریں بی بی۔ اب تو بتا منیر برداشت کرے گا اس بات کو..... یہ پاگل تو کہتی ہے کہ منیر کچھ نہیں کہے گا پر اسے کیا پتہ۔ پاگل بیوقوف!....."

رخشندہ کو یوں محسوس ہوا جیسے زمین اُس کے پیروں تلے سے Escalator کی طرح چلنے لگ پڑی۔

اس وقت ڈاکٹر فہیم چمڑے کے دستانے اتارتی ہوئی داخل ہوئیں۔

"بی بی آپ کی بچی کو تو دو چار دن کے لیے داخل کرنا پڑے گا یہاں۔ پہلے اُسے دو بوتلیں گلوکوز کی لگیں گی پھر کوئی کارروائی کی جائے گی....."

"دو چار دن....." ماں نے ہراساں ہو کر مدد کے لیے در و دیوار کی طرف دیکھا۔ "دو چار دن میں تو منیر آنے والا ہے....."

ڈاکٹر فہیم اب رخشندہ کی طرف متوجہ ہو گئی اور بڑی محبت سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُس نے پوچھا "یہ بتاؤ بچی..... پاکستان کے لیے کون بہتر ہے پیپلز پارٹی..... کہ جماعت اسلامی۔ ہمیں تو بھئی اس بات سے غرض ہے کہ پاکستان کی بہتری ہو۔ ہمیں کسی خاص لیڈر سے عشق تھوڑی ہے کیوں سویٹی؟....."

رخشندہ نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا لیکن اس وقت وہ کچھ کہنے سوچنے سے بہت دور نکل گئی تھی۔

•

اس بار وہ جنرل بختیار کے گھر بڑی مدت کے بعد گئی۔ کچھ اس کی وجہ صحت کی خرابی تھی اور کچھ ذہنی تساہل تھا جو کپڑے بدلنے' سینٹ لگائے بالوں کا سٹائل بدلنے اور معرکۃ الآراء لگنے سے روکے رکھتا۔

جب وہ جنرل بختیار کے گھر پہنچی تو حسب معمول اُس کی مڈبھیڑ پھر جمال سے ہو گئی۔ وہ کسی گلہری کی طرح بڑی تیزی سے مونگ پھلیاں کھا رہا تھا۔

رخشندہ کو دیکھتے ہی اُس نے ایک جست بھری اور رخشندہ کا ایک ہاتھ اپنے دو سخت اور مضبوط ہاتھوں میں پکڑ کر

چلایا..... ''ہیلو میڈم! اتنے دن کہاں رہیں تم.....؟''

''یہیں.....''

''No harm.....Commit yourself۔'' کہاں رہیں؟''

''میں چنڈی گئی ہوئی تھی.....''

''کنڈی مضبوط رہی کہ مچھلی بھاگ گئی؟.....'' جمال نے بڑی محبت سے آنکھ مار کر پوچھا۔

''فی الحال کنڈی مضبوط رہی.....''

جمال اُس کا ہاتھ پکڑ کر رنگدار چھتری تلے لان میں لے گیا۔

یہاں سے جنرل مختیار کی کوٹھی کسی Better homes & gardens کی تصویر لگتی تھی۔ دیواروں پر سدابہار بیلیں چڑھی تھیں۔ لمبی لمبی شیشوں والی کھڑکیاں اور اُن کے اندر نامعلوم رنگوں والے چمکنے والے رنگوں کے بھاری پردے۔ چمکدار موزیک کے فرش لان کے اردگرد تین طرف گلاب کی کیاریاں' گل چین کے درخت' ڈرائیو وے پر اونچے اونچے فانوس' پوپلر کے درخت جن میں نئی بہار نے پتوں کی ایک بالکل نرم و نازک کھیپ بسا دی تھی۔ اتنی خاموشی..... اتنا سکون..... اور بہار کی کرنوں کی بھیگی پھیلی گرمی۔

''پھر کیا ارادہ ہے تمہارا.....؟''

''کونسا ارادہ'' رخشندہ نے مونگ پھلی چھیلتے ہوئے پوچھا۔

''مجھ سے شادی کرنے کا؟.....''

رخشندہ ہنس دی۔

''خدا قسم میڈم! میں تمہارا Real husband ہوں۔ میں ساری زندگی تمہیں ایک بار سوال نہیں کروں گا کہ کل تم کہاں تھیں۔''

''یہی تو ڈر ہے.....''

''دیکھ لینا تم مجھ سے شادی کرو گی بالآخر..... میری intuition کہتی ہے۔''

''تمہاری intuition پہلے بھی بہت کچھ کہہ چکی ہے جمال.....''

''مثلاً؟''

''مثلاً تم کہتے تھے کہ ایوب خاں قوم کا نجات دہندہ ہے۔ کیا کیا ایوب نے ساری قوم کے ساتھ؟..... کس طریقے سے Indiscriminately industrialize کروایا سارے ملک کو..... ساری قوم کی جان بائیس گھرانوں کی مٹھی میں دے دی۔ اتنی ساری عقیدت' محبت اور ایمان نچھاور کیا تھا تمہاری چھٹی حس نے اُس پر.....''

جمال ہولے سے ہنسا اور پھر بڑے وثوق سے بولا ''اگر کبھی کبھی خواب جھوٹے نکل آتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی خواب دیکھنا ہی چھوڑ دے۔ خواب ایک انسان' ایک قوم..... ایک ملک کے لیے ناگزیر ہیں۔ ہندوستان کی طرف نہیں دیکھتی ہو میڈم کتنا بڑا خواب دیکھا ہے ہندوستان نے اکھنڈ بھارت کا..... اُس کے ہر فرد نے اسی خواب کے داؤ

پر اپنی ہر راحت قربان کر دی ہے۔ میں تھرڈ ورلڈ کے لیے اٹھوں گا..... توسیع پسندی کے خلاف آواز بلند کروں گا۔ میں جنس تعلیم آزادی محبت کے لیے نئی جہتیں مقرر کر دوں گا۔"

لمبے بالوں والا جمال ہمیشہ چمڑے کی جیکٹ پہنتا تھا۔ وہ سکول میں پریفکٹ اور یونیورسٹی میں یونین کا صدر رہ چکا تھا۔ پورے تین ایم اے کرنے کے بعد آج کل وہ نوجوانوں کی ایک ایسی پارٹی تشکیل دینے میں مشغول تھا جو مکمل طور پر سوشلزم سے Committed تھی۔ صدر ایوب کے زبردست حامیوں میں ایک وقت گزارنے کے بعد وہ ان جلوسوں کا سربراہ بھی رہ چکا تھا جنہوں نے ایوب راج کے خلاف لمبے چوڑے مظاہرے کیے۔ سڑکوں کی بتیاں توڑیں' لیبر باڈیز کا سامان ملیامیٹ کیا' بلڈنگیں جلائیں اور وائس چانسلروں کے لیے عذاب جان بنے۔

جنرل بختیار کے بڑے بیٹے جمال میں اپنی نئی پود کی طرح بہت زیادہ سیاسی جان تھی۔ وہ ایک فارغ البال گھرانے میں پلا تھا جہاں اُسے غم روزگار سے مکمل طور پر خلاصی تھی۔ غسل خانوں میں گرم پانی کے گیزر لگے تھے' باورچی خانوں میں کوکنگ رینج تھے۔ بیڈ روم میں ڈرن ٹیبل اور لیونگ روم میں ٹیلیویژن تھے۔

جنرل بختیار کے سب سے بڑے بیٹے جمال نے اس آرام دہ ماحول میں Conventional wisdom سے بغاوت کر لی تھی۔ وہ ہر قسم کے گوشواروں سے بھاگتا تھا۔ "Bitch goddess success" سے اسے اللہ واسطے کا بیر ہو گیا تھا۔ کپل وستو کے مہاتما بدھ کی طرح آسائش نے اس کے خوابوں کو جنم دیا۔ راحت کی زندگی اُس کی بغاوت کا خون اور نوجوانی کا ولولہ اُس کے ہر منصوبے کی جان تھی۔

آسودہ زندگی کے ساتھ کچھ خرابی اُس تعلیم کی بھی تھی جس نے اُس کی سوچ کو Acceleration بخش دی تھی۔ وہ صبح و شام ایسی خوبصورت کتابوں کی زد میں رہتا تھا جو یورپ اور امریکہ سے آتی تھیں جن میں جنس، سیاست، سائیکالوجی، سوشل سائیکالوجی، انتھروپولوجی، گھریلو آرائش و زیبائش، جدید فیشن اور فلم سے متعلق ایسے نظریات ہوتے تھے جو کا نئاتی تو نہیں تھے لیکن جن پر ایمان اسی طرح آ جاتا تھا گویا وہ ہر ملک، ہر ملت، ہر خطے، ہر عہد، ہر ذی روح کے لیے یہ سیاسی نظریات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اٹل ہوں۔

جمال کے والدین اُس فضا میں پلے تھے جہاں انگریزوں کی خاطر ہر ہندوستانی بھی دو انگلیاں اٹھا کر کہا کرتے تھے۔ ''وی فار وکٹری.....'' اور جمال نے سکول کالجوں میں ہی ووٹ کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا۔ گھر کے سینئر ممبرز کو اپنی ووٹ سے کس طرح زچ کیا جا سکتا ہے اور کالج میں پروفیسروں کی تقرری سے لے کر امتحانوں کی التوائی کارروائیوں تک ہر قدم پر ہر طریق سے ووٹ ایک بڑی اہم چیز تھی۔

Nuclear weapons کے discussion، ٹیلی ویژن پروگراموں کی باریکیاں، ویت نام کی جنگ، ماؤ کی تقریریں، free love اور مکمل آزادی جمال کی گفتگو کی عموماً بنیاد بنتے تھے۔

جنرل بختیار کا بیٹا جمال پڑھے لکھے، حساس، مجذوب صورت اور درویش صفت نوجوانوں کا نمائندہ تھا۔ وہ عبوری دور کا ایسا فرزند تھا جو صبر و تحمل کی فلاسفی سے بری طرح بدکتا تھا۔ وہ کھانے کی میز پر بری طرح کے مار مار کر کہا کرتا تھا۔

"What is right? Public opinion!"

ہم نے ایوب کی ہوا باندھی وہ دیوتا بن گیا۔ ہم نے پبلک کی رائے بدل دی وہ گیدڑ بن گیا۔ ہم صبر نہیں کر سکتے، ہم انتظار نہیں کر سکتے۔ ہمیں لوگوں کی رائے بدلنا ہو گی۔ ہمارا کلچر کیڑوں سے بھری ڈبل روٹی ہے جسے ہم شوق سے کھاتے ہیں۔ ہم Hopelessly Imperiatistro ہیں۔ Hopelessly corrupt ہیں۔ اس لیے اسی لیے، اسی لیے کہ پبلک opinion ان چیزوں کے خلاف نہیں ہے۔ لوگ بہت بڑی force ہوتے ہیں۔

جب تک بورژوا، Petty بورژوا، Capitalistic نظام باقی رہتا ہے۔ جب تک خلق خدا کسی رواج، کسی رسم، کسی ادارے، کسی Organization کے خلاف نہیں ہوتی اُس کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ کہاں سے آئی یہ رسم؟

بیٹیاں زندہ دفنانے کا رواج آج کہاں ہے؟ Pair marriage پر اس قدر ایمان کیوں لے آئے ہیں لوگ؟ جمہوریت کے بغیر لوگوں کا سانس کیوں اکھڑنے لگتا ہے..... سب پبلک Opinion کی باتیں..... آج بھی سکم کے لاپچا قبیلہ میں بیٹی کی شادی پر اگر کوئی گوشت پکانے کو نہ ملے تو ماں کو ذبح کر کے ضیافت تیار کی جاتی ہے۔ آج بھی برٹش امریکہ میں بیلا کولا ہندوستانی انسانوں کی قربانی کو افضل ترین شمار کرتے ہیں۔ اگر کسی کام کے خلاف guilt پیدا کرنی ہے تو پبلک کی رائے اُس کے خلاف کر دو۔ اور اگر لوگوں کی رائے ساتھ دے گی تو Polygamy' مشت زنی Polyandry' امرد پرستی incest' سب باتیں نارمل فعل لگیں گی۔ ہم پبلک کی رائے بدلیں گے Non-Committal ہو کر نہیں۔ اپنا لہو بہا کر۔ ہم نے..... ہماری جیسی Generations نے پہلے بھی نظام بدلے ہیں۔ پھر بھی بدلیں گے اور ہمیشہ بدلتے رہیں گے تاوقتیکہ انسانی فطرت کے ساتھ اپنی فطرت اور نیچر کے ساتھ دوسرے انسانوں کے ساتھ کوئی مستقل سمجھوتہ نہیں کر لیتا۔"

جمال کی Wave length اور اس کی Frequency کا عام طور پر گھر میں کوئی متحمل نہیں ہوتا تھا۔ اُس کے باقی بہن بھائی بڑے Philistine قسم کے تھے۔ وہ ماں باپ' استادوں اور حاکموں کے لیے بڑے ریڈی میڈ اور مناسب جواب رکھتے تھے۔ لیکن جمال بھی بیگم مختیار کا پہلوٹھی کا بچہ تھا اور پہلی شادی کی واحد نشانی تھا۔ وہ اپنے سوتیلے بہن بھائیوں کی Fad-influenced' indulgent زندگی سے بڑا متنفر رہا کرتا تھا۔

اس گھر میں رخشندہ جب بھی آتی اُس کے دل میں صرف جمال سے ملنے کی آرزو ہوا کرتی تھی۔

"پھر تمہاری پبلک Opinion کا کیا بنا؟"

"بدل رہی ہے..... بہت بڑے بڑے بت ہیں راہ میں۔ سومنات کے مندروں سے بھی بڑے' لات و منات سے بھی زیادہ قہرماں..... ماڈرن عہد کی بڑی خرابی یہ ہے کہ مذہب سے کہیں زیادہ سیاست ضروری ہو گئی ہے۔ یہاں پھر پبلک Opinion کا مسئلہ درپیش رہتا ہے۔ جب سارے کہہ رہے ہوں کہ ہمیں جمہوریت درکار ہے تو چند لوگ کیسے کہیں کہ ہمیں ایک حساس' فہیم اور خدا ترس بادشاہ درکار ہے۔"

"اس قدر مت سوچا کرو جمال....."

"تم بہت خوش قسمت ہو....."

"کیسے؟....." رخشندہ نے سوال کیا۔

"اگر تم دائرے میں گھومنا چاہو تو تمہاری اکیلی ذات بہت کافی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اگر عورت فیملی بنانا چاہے تو وہ اکیلی ایک فیملی raise کر سکتی ہے۔"

"بیج کے بغیر دھرتی کیسے بارآور ہو سکتی ہے۔"

"Insemination سے جیسے گائے بھینس گابھن کی جاتی ہیں لیکن آدمی کو اگر بچوں سے پیار ہو..... اگر وہ فیملی بنانا چاہے تو اُسے ہمیشہ عورت کو force کرنا پڑے گا۔ عورت کی Opinion ہموار کر کے اُسے شادی کی زنجیر پہنانا پڑے گی۔"

''بڑی الٹی باتیں کرتے ہو تم جمال..... شادی کی ضرورت تو عورت کو ہے اور عورت کو ہی رہے گی۔ وہ ہمیشہ محتاج رہے گی مرد کی۔''

''پھر یہ بھی پبلک Opinion کا کرشمہ ہے۔ صدیوں سے عورت کو ایسے mould کر دیا گیا ہے کہ اب اُسے اپنی چوڑیوں کی طرح شادی کی زنجیر سے بھی پیار ہو گیا ہے۔ دیکھ لینا میڈم! عورت پہلے بھی اس Institution کے خلاف بغاوت کر چکی ہے اور پھر بھی کرے گی۔ صدیوں سے وہ چکلوں کی شکل میں اس غلامی سے پرے زندگی بسر کر چکی ہے۔ She will do it again۔ اگر آدمی نے عورت کی Opinions کا احترام نہ کیا تو Soon enough۔

"He will have enough of sea but no home, no children & no family! maybe no love as well."

رخشندہ کو جمال کی باتیں بہت پسند تھیں۔ ان باتوں میں ہلکی سی ہکلاہٹ اور بڑی بچی قسم کی کشش ہوا کرتی تھی۔

''تم بڑی آزاد ہو..... اسی لیے میری آرزو رہتی ہے کہ میں تمہیں قید کر لوں۔ مجھے یوں لگتا ہے اس چھوٹے سے خوبصورت سر کے تمہاری ہر رائے مجھ سے مختلف ہے۔ یہ میرے لیے بہت بڑا چیلنج ہے..... میں تمہاری Opinions کو ہموار کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں صرف اچھے کپڑے پہننے والی گڑیا ہوں۔ میں اپنے دماغ سے کام نہیں لیتی۔''

''تم اپنے آپ کو بالکل Waste کر رہی ہو اور دیکھ لینا رخشندہ! وہ وقت دور نہیں جب یہ ساری خوش اعتمادی ختم ہو جائے گی۔ تم کو محبت کرنے کے لیے اندھیرے کی تلاش ہو گی۔ اگر کمرے میں ایک Rag-doll بھی ہوئی تو تم اُس سے compete نہ کر سکو گی۔ اُس وقت سے پہلے مجھ سے شادی کر لینا..... مجھے بچوں سے واقعی پیار ہے اور اگر تم نے ساتھ نہ دیا تو کہاں بچے اور کہاں پیار؟''

اس وقت جنرل بختیار کی سب سے چھوٹی بچی اپنے روسی کتے کے ساتھ باہر آئی۔ جمال نے قلانچ بھر کر اُسے بازوؤں میں بھر لیا اور بالکل بھول گیا کہ ابھی چند لمحے پہلے وہ رخشندہ کو propose کر رہا تھا۔

سن 1965ء کی جنگ کے بعد رخشندہ نے جنرل بختیار کو دو چار مرتبہ دیکھا تھا لیکن یہ ملاقاتیں سرسری اور اچٹتی ہوئی تھیں۔ رخشندہ جس سرکل میں آتی جاتی شیر و شکر رہتی تھی' اُس دائرے میں ایسی بہت سی جانی پہچانی صورتیں رہا کرتی تھیں جن سے چائے یا کافی کی پیالی پکڑ کر رسمی گفتگو ہوا کرتی تھی' لیکن جان پہچان ہمیشہ سطحی رہتی۔

سن 1965ء کی جنگ کے بعد رخشندہ نے دوستی کا ہاتھ جنرل بختیار کی طرف بڑھایا۔ جنگ نے اُس کے دل میں عجیب قسم کی امنگ پیدا کر دی تھی۔ مینٹل ہسپتال سے واپس آئے اسے تھوڑا عرصہ ہوا تھا اور ابھی تک وہ سائیکی کی ایسی حدوں میں پھرتی تھی جن کا نارمل آدمیوں کو ادراک نہیں ہے۔ سڑکوں پر سے جب جیپوں میں لدے سپاہی اور افسر گزرتے تو وہ زور زور سے بازو ہلا کر انہیں الوداع کہتی۔ چوری چوری وہ دو بوتلیں خون کی بھی بلڈ بینک میں جمع کروا چکی تھی۔ ان دنوں جو بھی آمدنی ہوتی وہ تمام کی تمام اُس نے ریلیف فنڈ میں جمع کروائی۔

حوصلے قومی ترانوں کی طرح بلند تھے۔ آرمی کا ہر فرد ہیرو تھا۔ ہر عورت کسی نہ کسی روپ میں ان فوجیوں کے لیے آنکھیں بچھائے ہوئے تھی۔ ان جیالوں نے پاکستان کے دفاع میں کتنی بے جگری سے جانیں دی تھیں۔ فضا میں سبز پوش فوج کے قصے اور ان گنت بہادری کے معجزے گھومتے پھر رہے تھے۔ اس سرخوشی اور گرمجوشی کے عالم میں رخشندہ کی ملاقات جنرل بختیار سے ہوئی۔ جنرل بختیار ان دنوں کرنل تھے اور چونڈہ کے فرنٹ سے لوٹے تھے۔

رخشندہ نے اپنا تن اور من کرنل صاحب کے سامنے یوں ارپن کیا جیسے فتح یاب فوج کی واپسی پر شہری اُن کے قدموں میں پھول بچھا رہے ہوں۔ کرنل صاحب نے رخشندہ کی عقیدت اور محبت کو پورے ملٹری اعزازات کے ساتھ قبول کیا۔ کچھ سال یہ رابطہ بڑی گرمجوشی اور گہما گہمی کا رہا۔ ان دنوں کرنل صاحب راولپنڈی میں مقیم تھے اور چین سے سامان حرب لانے والی کمپنیوں کے روح رواں ہوا کرتے تھے۔ پھر کچھ رخشندہ مصروف ہوگئی کچھ کرنل صاحب اور قسم کے کاموں میں پڑ گئے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اتنے بے ضرر ہو گئے جیسے مٹر کی پھلی کے اندر رہنے والے دو مٹر کے دانے۔

کرنل صاحب جو اب جنرل بختیار تھے سٹیڈیم کے قریب بہت خوبصورت بارہ کنال کی کوٹھی میں رہتے تھے۔ رخشندہ کا اُن کے گھر میں آنا جانا تھا۔ جنرل صاحب اُسے ہمیشہ بہن جی بلاتے تھے۔ عجیب بات تھی لیکن نہ تو جنرل صاحب اور نہ ہی رخشندہ کو کبھی خیال آتا کہ وہ ایک دوسرے کو کسی اور رشتے سے بھی جانتے تھے۔ بیگم بختیار رخشندہ کو اچار، مربے اور چٹنیاں بنانے کی مفید ترکیبیں بتایا کرتی تھیں۔ دونوں بیٹھ کر گھنٹوں اپنی جاننے والیوں کی برائیوں کا پوسٹ مارٹم کیا کرتی تھیں۔ رخشندہ بیگم صاحب کو Skin Pack استعمال کرنا' چہرے کے روئیں براؤن کرنا' بالوں کو سیدھا کرنے کے مختلف طریقے' خوشبو کو مردکی خواہشات کو اجاگر کرنے کے لیے ہتھیار بنانے کا صحیح استعمال بتایا کرتی تھی۔ بیگم بختیار کو جو بھی جنرل صاحب کی شکایت کرنا ہوتی وہ فوراً رخشندہ سے کرتی۔ اس وقت بھی جب رخشندہ پچھلے برآمدے میں پہنچی تو شتم پشتم بیگم بختیار جو ہمیشہ گرمیاں سردیاں سلیولیس بلاؤز پہنتی تھیں' ہاتھ لہرا کر بولی" آؤ بہن جی! کرو فیصلہ اور سمجھاؤ اپنے جنرل بھائی کو۔"

جنرل بختیار پوری وردی میں متمکن گھٹنوں پر چھوٹی سی چھڑی لیے بیٹھے تھے۔

"السلام علیکم....."

جنرل صاحب کے آباؤ اجداد میں شاید کہیں منگول اور پولی نیسین لہو کی آمیزش تھی۔ اس لیے ان کا طباق سا چہرہ' گہرے گھنے ابرو اور کھلے نتھنوں والی ناک دیکھ کر ویسے بھی ایک بار آدمی ٹھٹک جاتا۔

"کیا ہوا بھائی جان....."

"ان سے پوچھئے۔ یہ سندھ میں مربعے لے رہے ہیں....."

"تو لینے دیں آپ کا کیا جاتا ہے....." رخشندہ نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیسے لینے دوں؟..... بارڈر والی زمین کا کیا بنے گا....."

جنرل بختیار بڑی خاموشی سے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے Attack کا پلان بنا رہے تھے۔

"آپ کیا چاہتی ہیں؟....." رخشندہ نے سوال کیا۔

"چھوٹی والی سائیڈ پر زیادہ Safe ہے کیوں جی۔"

جنرل صاحب ابھی بھی بولے ہوئے مونچھوں کو مرغوا چڑھا رہے تھے۔

"Scattered جائیداد کا فائدہ بہن جی؟"

"آپ بھی تو کچھ بولئے جنرل بھائی؟"

"ان سے جونیئر لوگ .C.N.C ہو گئے۔ پتہ نہیں یہ اپنے Career سے اتنے غافل کیوں ہیں۔"

"میں پالیٹکس میں پڑنا نہیں چاہتا۔"

"C.N.C. بن جانا پالیٹکس میں پڑنا ہے' کمال ہے۔" بیگم بختیار نے اپنے بھاری سینے کی وی پر باریک زنجیر والے لاکٹ کو درست کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ پاکستان ہے پاکستان بی بی۔ یہاں ہر چوتھے سال تو ہوتا ہے۔ کئی رنگ کے مارشل لاء لگتے ہیں۔ تم ضرور مجھے کانٹوں کا تاج پہنانا چاہتی ہو۔ مزے کرتی ہو۔ First lady بننے کا شوق چھوڑ دو آرام سے رہو گی۔"

"خیر اگر اللہ نے بادشاہت آپ کے نام لکھی ہے تو....." بیگم بختیار ایسے مسکرائیں کہ ان کے سارے جبڑے کسی شہوانی کتیا کی طرح دور دور تک نظر آنے لگے۔

"اصلی مسئلہ کیا ہے۔ میں تو ابھی تک سمجھ نہیں پائی۔" رخشندہ نے سوال کیا۔

اب جنرل صاحب نے اپنے مرغوب ترین Topic کو جا پکڑا۔

جنرل صاحب اپنی Past history کو اپنے انداز میں بیان کرنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔ مسئلہ چاہے خشک سالی کا ہو' فارن ایکسچینج یا بھارت کی پاکستانی دشمنی کا درپیش ہو وہ اپنے گولڈن کیریئر کی طرف گفتگو کو ضرور لاتے تھے۔

"جناب میں کوئی .P.M.A کا تعلیم یافتہ آدمی نہیں ہوں۔ سینڈ ہرسٹ کا تعلیم یافتہ ہوں۔ Military strategy میں کوئی آدمی میرے ساتھ کا نکال کر دکھائیں آپ۔ ان سے اپنی بھابی سے پوچھیں کتنے سال میں نے Staffs college میں بسر کیے۔..Pakistan should be proud of me میرا باپ معمولی صوبیدار میجر تھا۔ ہم لوگ اتنے امیر نہیں تھے لیکن میرے باپ نے مجھے سینڈ ہرسٹ میں تعلیم دلوائی۔ میں نے Slow but sure ترقی کی ہے۔ پشاور میں چرچل کی تصویر کے ساتھ میری تصویر ٹنگی ہے۔ پاکستانی کبھی قبائلیوں کو میرے بغیر زیر دام لا ہی نہیں سکتے تھے.....ان سے پوچھیں۔ آج یہ پانچ کوٹھیوں کی مالک ہیں۔ دو باغ میں نے ملتان میں لگوائے ہیں۔ بارہ مربعے میں نے بارڈر پر آباد کیے ہیں۔ میں Sure footed سپاہی ہوں۔ دشمن کی پانچ Moves کا جواب میں پہلے سوچ لیتا ہوں۔"

"سندھ میں زمین کی کیا تک ہے۔ آپ کو پتہ ہی ہے سندھ والے تو پہلے ہی واویلا مچا رہے ہیں کہ آبادکاروں نے مقامیوں کے حقوق چھین رکھے ہیں۔ ہم جاہل ہو کر اتنی بات سمجھتے ہیں۔ آپ کا اتنا گولڈن کیریئر ہے۔ آپ اتنی بات نہیں سمجھ سکتے۔"

اپنی چھڑی کو سامنے والی تپائی پر مار کر جنرل صاحب نے آہستہ سے کہا" کون پیدا ہوا ہے سندھی' بلوچی' بنگالی'

پنجابی جو ملٹری Authority کے سامنے کھڑا ہو سکے۔ ہم Country کی Backbone ہیں۔ ہم نہ ہوتے تو 1965ء میں پاکستان بھارت کے پیروں تلے کچلا جاتا۔ ہمیں پاکستان کے ہر شہری کو Pamper کر کے رکھنا چاہیے۔ تم انہیں سمجھاؤ بہن جی! میں ریٹائر ہو گیا تو کون پوچھے گا انہیں۔ Now is the time۔ میں خود کیا کھاتا ہوں ایک گلاس نیبو پانی صبح بریک فاسٹ پر دو ہاف بوائل انڈے اور ایک کپ بلیک کافی۔ دوپہر کو ایک سٹیک اور ایک پلیٹ اُبلی سبزیاں۔ ایک کپ چائے فائیو او کلاک' ایک جنجر بسکٹ رات کو۔"

"اچھا جی.....اچھا....." بیگم بختیار نے موضوع بند کرنے کی غرض سے ہاتھ اٹھایا۔

"ان کی سکیورٹی کے لیے' بچوں کے شاندار مستقبل کے لیے' خاندان کی Prestige کے لیے سب کچھ ہے۔ کیوں بہن جی۔"

"بالکل....."

"پاکستان کی حیثیت کیا ہے بھارت کے سامنے۔ اتنے Handicaps ہیں۔ اس کے سامنے جو آدمی کچھ جاتا ہے وہی پریشان ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کتنے فارن پریشر ہیں یہاں۔ ہم منگلا بنائیں' تربیلا تعمیر کریں' گنڈ وار تو نسے نہریں نکالیں' بڈ نیئر.....is a hard fact تا شقند۔ Kashmir affronts us...is a sizzling fact بہن جی..... یہاں اتنی لاشیں نہیں جتنی گدھیں ہیں۔ آپ.....وقت آنے دیں آپ کہیں گی جنرل بھائی ٹھیک کہتے تھے۔ عقلمند آدمی کو اپنے مستقبل کی فکر کرنی چاہیے۔ اس ملک میں Security is most important.....ان کو کچھ سمجھائیں اپنی بھابی کو....."

جنرل بختیار تو اٹھ کر چلے گئے لیکن رخشندہ بھابی جان کو کچھ نہ سمجھا سکی۔ اب وہ دونوں بیٹھی تھیں۔ تمام مسائل ختم ہو چکے تھے اور ایک تیسری بیگم اختر چوہان زیر بحث آ چکی تھیں۔ خوب غیبت کا دور چل رہا تھا۔ ایک عورت کا قصہ ختم ہوتا تو کسی دوسری کے بخیے ادھیڑے جاتے۔

"سینئر کیمبرج تک تعلیم ہے.....لیکن تو بہ بات کسی کو کرنے نہیں دیتی....."

"کبھی عورتوں میں تو اسے بیٹھے نہیں دیکھا۔ جھٹ مردوں میں جا گھستی ہے۔ آخر اس میں ہے کیا؟" بیگم بختیار نے سوال کیا۔

"سیکس Attraction۔"

"نائیلون کے کپڑے پہنے ہوتے ہیں۔ ہمیشہ بغلوں سے بو اڑتی رہتی ہے۔ سو قسم کے کولون استعمال کرے کوئی چھپتی ہے یہ بو۔" بیگم بختیار۔

رخشندہ نے ہنس کر کہا "کمال کرتی ہیں بھابی جان ایسی تو اچھی لگتی ہے مردوں کو۔"

"کسی ڈش کی ذرا تعریف کر دیجئے فوراً کہے گی میں نے بنائی ہے اور بیگم صاحب نے باورچی خانے میں کبھی قدم رکھ کر نہیں دیکھا۔"

اب رخشندہ کو خواہ مخواہ بیگم چوہان پر ترس آنے لگا۔"

"ویسے ہے بڑی ہنس مکھ....."

"تیسرا خاوند ہے اس کا۔ ہنس مکھ تھی تو اتنے آدمی پھنسا لیے۔"

یہ وار خالی جاتا دیکھ کر رخشندہ نے پھر کنک بھیجی۔

"میں نے سنا ہے بھابی جان کہ اس نے اپنا سارا زیور جنگ میں ریلیف فنڈ میں دے دیا۔"

"اسے کیا پرواہ ہے زیور کی..... چاہے تو آدھا لاہور خرید لے۔"

رخشندہ کی عادت تھی بڑی گرمجوشی سے چغلی میٹنگ میں شامل ہو جاتی۔ دو چار چھرّ ڈھیلے کھینچ کر مارتی اور پھر آہستہ آہستہ اُس کا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا۔

"پچھلی اتوار ہم سب اکٹھے پکنک پر گئے تھے بلوکی۔ اُن کی فیملی اور ہماری فیملی..... پتہ ہے سارے راستے کیا باتیں کرتی رہی۔"

"کیا باتیں....."

"سارا وقت جنرل صاحب کے پاس بیٹھ کر کہتی رہی کہ مرد کی نیچر ہی ایسی ہے کہ وہ ایک عورت پر اکتفا نہیں کر سکتا۔ اُسے Variety کی ضرورت ہے۔ اُس کا Sex Function ہی ایسا ہے۔ جنرل صاحب تو تمہیں پتہ ہی ہے بھن جی! الا کھا اپنے لائن میں طاق ہوں پر بہت بھولے ہیں۔ بہت خوش ہوئے۔"

"جی ہاں بھولے تو وہ واقعی بہت ہیں۔"

"کہنے لگی عورتوں کو Large-Hearted ہونا چاہیے۔ اگر مرد دوسری عورتوں میں دلچسپی لے تو اُسے mind نہیں کرنا چاہیے۔ یہ مرد کی نیچر ہے۔"

رخشندہ چپ چاپ بیگم بختیار کا منہ تکتی رہی۔

"اور پتہ ہے چوہان صاحب کا کیا حشر کیا۔ ان کی بیوی نے۔"

"کیا؟"

"دس برس سے چھوٹے بچوں کا انہیں رنگ لیڈر بنا دیا ہے۔ منہ میں ان کے مالٹے کے چھلکے سے کاٹ کر دانت لگوا دیے اور سارا دن وہ بیچارے اُلٹے بوٹ پہن کر بچوں کے ساتھ ring a rivg roses کھیلتے رہے۔ وہ بیچارے میری بیٹیوں کے پاس آنے کو ترستے رہے لیکن بیگم چوہان کی بات تو تم سمجھ نہیں سکتیں۔ سارا وقت کہتی رہی انہیں تو بس بچوں میں دلچسپی ہے۔"

"اچھی رہیں بیگم چوہان..... بھی۔"

"چوہان صاحب بیچارے کیا کریں۔ جب میری لڑکیاں انکل انکل کہہ کر اُن سے لپٹتی ہیں تو بری حالت ہو جاتی ہے بیچارے کی۔ کاش اللہ میاں دل پر بھی سفید بال آ جایا کریں آدمی سمجھ تو جائے پھر....." بڑی دیر تک بیگم بختیار ہنستی رہیں اور رخشندہ خاموشی سے مینجی چلغوزے کھاتی رہی۔

"لیکن اب جب کبھی چوہان صاحب تمہارے جنرل بھائی کو اکیلے ملنے آئیں گے تو کبھی انہوں نے چھوٹے

بچوں کا نوٹس نہیں لیا۔ ساری ٹافیاں چاکلیٹ پھر وہ میری بیٹیوں منا اور نونی کو دیتے ہیں۔ ان کے بچوں کے سارے قصے، دوستوں کی ساری باتیں، Shopping، کتابیں، ٹیلیویژن کے پروگرام، کزن، کوئی بات نہیں جو وہ میری بیٹیوں سے Discuss نہ کرتے ہوں۔ کبھی کبھی تو مجھے یقین آ جاتا ہے کہ وہ Monthly dates بھی انکل کو بتا دیتی ہیں۔''

رخشندہ اور بھابی جان دیر تک بیگم اور چوہان صاحب کے متعلق باتیں کرتے رہے لیکن ہر بار ہر بات کے ساتھ ٹیپ کا بند یہی ہوتا۔ ''اب سب لوگ تمہارے جنرل بھائی کی طرح بھولے تھوڑی ہیں۔ ایسی ایسی جگہوں پر رہے، خدا قسم رشوت لے سکتے تھے ہر قسم کی۔ میس لائف کا آپ کو پتہ ہی ہے کتنی آزادی ہوتی ہے پر قسم کی بات ہے جنرل صاحب۔ جب سے شادی ہوئی ہے انھوں نے کبھی عام آدمیوں والا چھچھورا پن ہی نہیں کیا۔''

پتہ نہیں کیا بات تھی لیکن اب جب سے رخشندہ جنرل صاحب کی ذہنی، جسمانی اور روحانی بہن بن چکی تھی خود اُس کا خیال راسخ ہو چکا تھا کہ جنرل صاحب کی ذاتی زندگی بالکل بے داغ ہے۔ اُس کا اور بیگم بختیار کا ایمان عجیب تھا۔

غالباً انسان وہی بات جانتا ہے جسے ماننے پر اس کا جی مائل ہو۔ اوائل عشق میں کیسا یقین ہوتا ہے کہ اگر عاشق نے محبوب کو نہ دیکھا تو غالباً عاشق خودکشی کر لے گا۔ اگر معلوم بھی ہو جائے کہ عاشق ہرجائی بے وفا ہے تو بھی دل وہی کچھ مانتا رہتا ہے جو اُس کا دل چاہتا ہے اور عشق کی پتنگ نصف اعتبار ہوتی رہتی ہے۔ اعتبار کے معاملے عجیب ہیں۔ بیگم بختیار بھی غالباً بہت کچھ جانتی تھیں لیکن وہ باقاعدہ جنرل بختیار کو قریباً پچیس برس سے بھولا ہی سمجھے جا رہی تھیں۔

''میں آپ کے پاس ایک خاص کام کے سلسلے میں آئی تھی.....''

''کہیں بہن جی.....'' بیگم بختیار نے پوچھا۔

''میرا چوکیدار چودہ دن کی چھٹی پر سوات جا رہا ہے۔ اگر آپ اپنے اردلی کو بھیج دیں میری کوٹھی پر سونے کے لیے تو میں بہت احسان مند رہوں گی.....''

''لیں یہ بھی کوئی کام ہے.....جمال کو بھیج دوں آپ کے پاس؟''

''نہیں نہیں۔''

''پہنچ جائے گا اردلی.....رزاق.....رزاق.....''

رزاق بہت ہی کم گو آدمی تھا۔

سن 1965ء کی جنگ میں وہ توپچی تھا اور بڈیارہ بری سیکٹر پر اس نے بڑی اہم خدمات سرانجام دی تھیں۔ دشمن جہازوں کے ساتھ strafting کرتا جاتا لیکن اُس کی توپ کی آواز نکلنے بھر کو نہ رکتی۔ سیز فائر تک اُس کی خدمات مسلسل اور بے خوف تھیں۔

لیکن تیئس ستمبر 1965ء کی رات کا واقعہ ہے۔

آسمان پر بادل اور بجلی آپس میں شرط بد کر دھاڑ رہے تھے۔ شہر گو امن کی فضا میں تھے لیکن فوجی اپنی اپنی کمین گاہوں میں یوں چاک و چوبند بیٹھے تھے کہ پتے سرکنے کی آواز بھی اُن کے کانوں میں Amplify ہو کر آتی تھی۔ اس رات جب چوتھی بار دشمن نے Ceasefire کو توڑا اور چوری چوری اپنے قدم آگے جمانے کی کوشش کی تو رزاق گنر کی

بائیں ٹانگ میں سے چھ فائر پار ہو گئے۔ کئی مہینے رزاق ہسپتال میں رہا۔ پھر ڈیوٹی پر آ گیا۔

اب وہ جنرل صاحب کا اردلی تھا اور کبھی بیرکوں کی طرف جانے کی آرزو نہیں کرتا تھا۔ گو بظاہر وہ صحت مند تھا لیکن کبھی کبھی شبہ ہوتا جیسے بائیں ٹانگ اُسے اب بھی تکلیف دے رہی ہے۔

جب سے رزاق چوکیداری کی خدمات پر مامور ہوا تھا' رخشندہ پر عجیب قسم کا انفعال طاری تھا۔ جیسے کوئی چچا یا بھائی گھر میں آ گیا ہو۔ پہلے اُس نے رزاق کو اپنی ریشمی رضائی دی۔ پھر اپنا نیا جائے نماز عطا کر دیا۔ کوارٹر میں عرصے سے زیرو کا بلب لگا تھا۔ وہ اتروا کر سو کا بلب لگایا۔ شام کو وہ رزاق کو ٹیلیویژن لگا دیتی اور خوردرات کے لیے کپڑے نکالتی اور پیچ کرتی سوچتی رہتی۔ رزاق اُسے بہاولپور کے دنوں کی خواہ مخواہ یاد دلاتا تھا۔

اب وہ امیر لوگوں کی زندگی کا جزو ہو چکی تھی۔ یہ لوگ جو کبھی زیادہ ذہین نہیں ہوتے' ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی کہ ان کی ریڑھ کی ہڈی میں افسر شاہی نظام تھا۔ یہ بہرصورت ایک دوسرے کی بقاء کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ اعلیٰ قسم کے Manners اور بہت زیادہ اظہارِ دوستی کے باوجود ان کی صحبت میں آدمی کمربند کھول کر اپنا اصلی وجود پیش نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں کی اصلی Value یہ تھی کہ یہاں دراصل کوئی مثبت Value نہ تھی۔ ہر قسم کی بات چلتی تھی بشرطیکہ اُس کا کہنے والا امیر ہو۔ یہ لوگ مرغن کھانے کھا چکنے کے بعد خلال پھیرتے ہوئے اور پچھلے دانتوں سے ہاتھوں کی آڑ سے گوشت کے ریزے نکالتے ہوئے کبھی کبھار اپنے اصلی وجود کا سراغ دیتے تھے۔

ان سب میں شیروشکر ہوئے رخشندہ کو ایک عرصہ ہو چکا تھا۔ بلکہ اب اس میں ایک خاص قسم کی خود پسندی اور Conceit پیدا ہو چکی تھی۔

رخشندہ اتنے عرصے سے امیر مردوں کی منظورِ نظر تھی کہ اب وہ اپنے آپ کو شہر کا سب سے بڑا V.I.P. سمجھنے لگی تھی۔ اُس کی گدوزی اور بنسری بالکل ذہن کے کسی کونے میں چھپ کر شہر آشوب لکھنے میں مشغول تھی لیکن جس دن سے رزاق رات کو پچھلے پہر باہر ڈرائیو وے پر چلتا اور رخشندہ کا قیام اپنے گھر میں ہوتا تو اُس کی آنکھ کھل جاتی۔

رزاق کس لیے زندہ ہے؟ وہ سوچتی۔

Honour کے لیے؟

لیکن یہ تو ہارے ہوئے لوگوں کے لیے طفل تسلی ہے۔ جو اپنی ہار کا کوئی خاطر خواہ بدلہ نہ لے سکیں وہ ہمیشہ Honour کے لیے زندہ رہتے ہیں۔

پاکستان کے لیے؟ فوج کے لیے؟

لیکن اسے پاکستان نے کیا دیا؟ یہ تو دن میں دو وقت روکھی سوکھی ہی کھاتا تھا؟ اس کے لیے پاکستان نے کونسا Monument تعمیر کروا دیا۔ اسے تو جینے کے لیے سوشل Justice بھی نہیں ملتا۔ اس کی عزتِ نفس کے لیے تو کوئی ہاتھ سلام کو بھی نہیں اٹھتا۔

رزاق کس لیے زندہ ہے۔ وہ بڑی بڑی دیر سوچتی رہتی اور پھر اُسے خیال آتا۔ شاید یہ دنیا سوچنے والوں کی وجہ سے قائم نہیں ہے۔ اگر پیغمبر اور مفکر دنیا کو جینے کا جواز دے سکتے اور انسان یہ جواز قبول کر سکتا تو یہ دنیا کبھی کی سدھر جاتی۔

اس کی بقا شاید رزاق جیسے احمقوں کے سینے میں چھپی ہے جو کبھی نہیں سوچتے اور زندگی کو یوں پار کر جاتے ہیں جیسے تھری ناٹ تھری کی گولی۔

اُس رات وہ کلب سے بہت جلد لوٹ آئی تھی۔ جب بھی وہ Emerald کی انگوٹھی پہن لیتی تھی یہی کچھ ہوتا تھا اور یہ انگوٹھی اسے اس قدر زیادہ پیاری لگتی تھی کہ کبھی کبھار نتائج جاننے کے باوجود وہ یہ انگوٹھی پہنے بغیر رہ ہی نہ سکتی تھی۔ دراصل ایک نجومی نے بھی اُسے بتایا تھا کہ Emerald اُسے راس نہیں آسکتے اور گو بظاہر وہ ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتی تھی پھر بھی اب جب بھی وہ یہ نو ہزار کی انگوٹھی پہنتی کچھ نہ کچھ Unlucky واقعہ ضرور ہو جاتا۔

اول تو وہ جب کلب پہنچی نواب الہ یار جا چکے تھے۔ نواب صاحب گو اُس پر بہت مہربان تھے لیکن انتظار تو اچھے دنوں میں بھی انہوں نے وائسرائے تک کا نہ کیا تھا۔ وہ رخشندہ کی راہ کیسے دیکھتے۔ چھوٹا سا رقعہ بیرے نے اُسے پکڑا دیا جس پر مختصراً لکھا تھا ڈیئر آر۔ راہ دیکھی معذور ہوں آج ہی ڈھاکہ جا رہا ہوں ورنہ تمہیں ضرور ملتا۔ نیچے کوئی دستخط کوئی نشانی ان کی موجود نہ تھی۔ اگر وہ نواب صاحب کو مل پاتی تو یقیناً اُس کی بزنس کے حق میں یہ ملاقات بہت بارآور ہوتی۔ شاید اُسے ڈھاکہ جانے کا ہی موقع مل جاتا۔

نواب صاحب ستر کے پیٹے میں تھے۔ بڑے ہنس مکھ زندہ دل اور شوقین مزاج آدمی تھے۔ کسی کو بور کرنا اُن کی سرشت میں نہ تھا۔ Overgrown بچے کی طرح وہ ضرر سے بالکل پاک تھے۔ ہر بات کو "ہاں تو پھر......" سے شروع کرتے اور "So on & So forth" پر ختم کر دیتے۔ وہ رخشندہ سے کہا کرتے تھے "میری عمر کا آدمی بہت کارآمد ہوتا ہے۔ وہ نوجوان مردوں کی طرح کبھی اپنی دھن میں مگن نہیں ہوتا۔ جسم کی ساری جولانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ بس ایک ہوک سی باقی رہ جاتی ہے اور یاد رکھو تم بہت ضروری ہو میری عمر کے مرد کے لیے۔ جس قدر زیادہ تم میری جانثاری کرو گی میں ذہنی جذباتی اور جسمانی طور پر Potent ہوتا جاؤں گا۔ مجھے یقین آتا جائے گا کہ ابھی میں بالکل Fit ہوں۔ کیونکہ ایک نوجوان عورت مجھ پر مرتی ہے۔ ہم بڈھے اُس گھڑی کی طرح ہوتے ہیں جو کبھی وقت پر الارم نہیں بجاتی۔ لیکن اگر ہم سے الارم کی توقع نہ کی جائے تو ہم بالکل نوبرنو ہیں۔ Better than young men۔"

نواب صاحب ہمیشہ اُسے بیٹیوں کی طرح Pamper کرتے تھے۔ رولز رائس کار میں پیچھے اُس کے ساتھ بیٹھ جاتے اور سارے شہر کی ہر بار سیر کراتے۔ زیادہ سے زیادہ اپنا گول مول ہاتھ اُس کی ران پر رکھے رکھتے اور بس۔ جہاں کوئی کوکا کولا یا آئس کریم کی دکان نظر آتی فوراً پوچھتے کیوں بھئی کیا ارادہ ہے۔ ہو جائے پھر ایک چوکلیٹ۔ نواب صاحب کی صحبت میں اُسے چٹوری بلی بننے کا بہت شوق تھا۔ گو وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ ساری چیزیں سیدھی اُس کی کمر پر جا بیٹھیں گی اور رومال کے گھیرے میں آ جانے والی کمر کے حق میں یہ برا ہوگا۔ نواب صاحب کے سامنے چھوٹے بچے کی طرح ہاتھ جھلا جھلا کر اُسے بھوک بھوک کہنے کا بہت شوق تھا۔ کوئی کھانے کی چیز دیکھ کر وہ فوراً بے قابو ہو جاتی اور چاتی ہائے رس گلے۔ نواب صاحب میں تو بھوکی مر جاؤں گی۔ پلیز چاٹ لے دیں دو پلیٹیں۔ بڑی بھوک لگی ہے نواب صاحب۔ پلیز کباب خرید دیں۔

نواب صاحب ساتھ ساتھ ہنستے رہتے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے "پھوٹ ہو جاؤ گی کھا کھا کر...... کتنی خوش

نصیب ہے بد بخت کھاتی جاتی ہے اور کچھ نہیں ہوتا اسے..... ہم ایک تو س زیادہ کھالیں تو شوگر آنے لگتی ہے۔"

نواب صاحب کراچی میں ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہتے تھے۔ انہیں لاہور میں عموماً کوئی کام نہ ہوتا تھا۔ جب بھی وہ تشریف لاتے عموماً ان کی آشنائی انہیں لاہور کھینچ لاتی تھی اور وہ جتنے دن قیام رکھتے' ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں رہتے۔ جہاں ان کی کئی جواں سال ملنے والیاں آتی رہتیں۔ ایک روز زرخشندہ نے ان سے اعتراضاً کہا بھی تھا"اور نواب صاحب یہ ابھی جو یہاں سے گئی ہے جس نے اس قدر Loud make up کر رکھا ہے اس میں کیا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں ہے اس میں....." نواب صاحب نے ہمیشہ کی طرح خوش دلی سے کہا۔

"تو پھر اُسے کیوں زحمت دی تھی آپ نے....."

"بھائی ہماری صحت اب ایک لمبا مسئلہ ہے۔ Insulin کا ٹیکہ بھی لگواتے ہیں' دنا منز بھی کھاتے ہیں۔ گرم پانی کی بوتل بھی پیروں میں رکھتے ہیں۔ کوئی ایک منت سماجت کرتے ہیں ہم..... یہ سب بھی منت سماجت ہے۔ کبھی لمبی لڑکی کے منہ سے اپنی تعریف سنتے ہیں' کبھی گدرائی ہوئی کمر میں بازو ڈالتے ہیں' کبھی تم جیسی میڈونا سے کہتے ہیں کہ دیکھو جب تک ہم لاہور میں ہیں تم صرف ہماری ہو۔ ہماری انا یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ تم ہماری ذات پر کسی کو ترجیح دو۔ کیوں چتوری بلی۔ اتنا س پیو گی کہ گریپ فروٹ؟"

نواب صاحب کو دیکھ کر زرخشندہ کو ہمیشہ اپنے دادا ابا یاد آ جاتے تھے۔ کیا خوبصورت بڑھاپا تھا۔ نہ انہوں نے کبھی بچپن کے کھیل کود کے لیے ہاتھ ملے نہ کبھی جوانی کی رنگینیوں کے لیے تاسف کیا۔ کبھی کبھی کہا کرتے تھے۔"ہر منزل کے اپنے آرام اور اپنے مصائب ہیں۔ جو پچھلے سنگ میل کو روتا رہے وہ سفر کیا خاک کرے گا۔ جوانی گئی تو بہت رنج ہوا جیسے بچپن رخصت ہوا تو بہت تاسف ہوا۔ پر نہ اب ہم بچپن کی نقل کرتے ہیں نہ جوانی کا بہروپ بھرتے ہیں۔ ہم سیب کیلا دونوں چکھے ہوئے ہیں۔ اب بوڑھی نارنگی سے کیا ڈرنا..... یہ بھی ایک عہد ہے پچھلے جیسا سو گزر جائے گا۔ اس کے بھی آرام اور مصائب جداگانہ ہیں۔"

جب Emerald کی انگوٹھی پہن کر وہ کلب پہنچی تو نواب صاحب جا چکے تھے۔ یہ انگوٹھی اُسے نواب صاحب نے ہی دی تھی۔ کئی بار وہ اسے بدلوانے کے لیے جوہری کے پاس بھی لے گئی تھی لیکن وہ اُچکے ضرورت مند جان کر آدھی قیمت دینے پر بھی رضامند نہ ہوئے۔ کچھ تو نواب صاحب سے نہ ملنے کا رنج تھا۔ پھر فلاش کی میز پر بیٹھی تو پتے دغا دینے لگے۔ وہ ہمیشہ Bluff کھیلنے کی عادی تھی۔ پر اس رات ہر کھلاڑی نے Show کروایا اور وہ بیٹھے بٹھائے پونے دو ہزار ہار گئی۔ پھر اُس نے انگوٹھی اتار کر پرس میں ڈال لی اور گھر لوٹ آئی۔

جس وقت وہ اپنے کمرے میں گھسی رزاق گھر کے دروازے بھیڑ کر کنڈیاں چھپکے بند کر رہا تھا۔ عموماً یہ کام وہ بڑی خاموشی سے کیا کرتا۔ ہر کھڑکی کی کنڈی لگانے کے بعد وہ آہستہ سے اس پر بوجھ ڈال کر ضرور دیکھتا۔

آج خلاف معمول وہ زرخشندہ کو دیکھ کر رک گیا۔

"آپا..... جی آپ جلدی آ گئے آج....."

"ہاں رزاق۔"

"بس ذرا پہلے آ جاتے آپ ٹیلیویژن پر ایک پروگرام دیکھ لیتے۔"

دلچسپی سے رخشندہ وہیں جم گئی۔

"کونسا پروگرام؟"

"پروگرام انگریزی میں تھا آپا جی....." رزاق بولا۔

رخشندہ جی ہی جی میں مسکرائی کہ وہ ایسا کونسا اچھا پروگرام تھا جو انگریزی میں ہونے کے باوجود رزاق کو پسند آیا۔

"بعد میں خبروں میں بھی بتایا تھا جی....."

"کیا بتایا تھا؟"

"وہ.....محمد علی کہتا ہے کہ جو فریزر میرے سامنے کچھ نہیں ہے۔ میں انشاءاللہ ہوالعزیز فتح حاصل کروں گا۔ محمد علی کا فلم تھا ٹیلیویژن پر اللہ خوش رکھے محمد علی کو اسلام کا نام اونچا کر دیا شیر کے بچے نے۔"

رخشندہ نے آہستہ سے کہنا چاہا کہ ذرا پوچھو اپنے ہمسائے ملک سے کس طرح محمد علی کو Cassius Clay پکار پکار کر ہلکان ہوتا ہے۔ کیسے سفید امریکہ کے دل میں یہ کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔

"آپا جی ہم نے سو نفل منت مانی ہے۔ اگر محمد علی جیت جائے تو انشاءاللہ.....انشاءاللہ ہوالعزیز ہم سو نفل پڑھے گا اور پوری تنخواہ بانٹ دے گا فقیروں کو۔"

"اور بیوی بچے تمہارے کیا کریں گے....."

"وہ اتنے کافر نہیں ہیں کہ اسلام پر سے ایک مہینے کی تنخواہ نثار کر سکیں۔"

آج رزاق کی گالیں تمتمائی ہوئی تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی محاذ پر جنگ کر رہا ہے۔

"ہم تو سیدھا بات آپ کو سمجھا دے۔ اگر محمد علی جیت گیا جیسا کہ ہمارا یقین ہے ایمان ہے ہمارا آپا جی تو خدا قسم اسلام کی فتح ہوگی۔ یہ جو کافر ملک ہے ہمارے ساتھ یہ ہمارا بال بیکا نہیں کر سکے گا۔ پر اگر محمد علی نعوذ باللہ..... تو پھر.....ہم.....پھر ہم....."

یہ کہتا ہوا رزاق کھانے کے کمرے کی طرف مڑ گیا۔

جس روز محمد علی نے جو فریزر سے Boxing کے ring میں شکست کھائی اور ریڈیو پر اس کی شکست کا اعلان ہوا ٹھیک اس اعلان سے پورے پندرہ سیکنڈ بعد رزاق محمد علی الا اپنے والا اپنے رب سے جا ملا تھا.....

رزاق کس لیے زندہ تھا؟

محمد علی سے تو اس کی کوئی رشتے داری نہ تھی؟

اسلام نے تو اسے صرف توہم پرستی قبروں کے طواف اور گنڈے تعویذ دیئے تھے؟

پھر رزاق اتنے سال کیوں اتنی شان و شوکت سے زندہ رہا اور اتنی شان سے کیوں مر گیا؟

رزاق پر اس کا رب اتنا مہربان کیوں تھا کہ اس کی ساری زندگی حتیٰ کہ اس کی موت بھی اس نے کوہ طور

جیسی بنا دی تھی؟

رزاق نے اس لیے جان نہیں دی تھی کہ محمد علی کو جو فریزر کے خلاف شکست حاصل ہوگئی تھی بلکہ کہیں اُس کے اندر ایک ایسا مقیاس الاسلام لگا تھا جسے معلوم ہوگیا تھا کہ اب اسلام کی فتح نہیں ہو سکتی اور رزاق کو سب کچھ قبول تھا۔ اسلام کی شکست قبول نہ تھی۔

کئی دن رزاق کی موت رخشندہ کے دل پر تپتی رہی جیسے مقید پرندے پر اُس کے پنجرے کی تیلیاں.....

وہ سوچتی رہی کچھ لوگ بالکل صفر سے مشابہ ہوتے ہیں۔ چاہے لاکھوں کی رقم سے صفر کو ضرب دو حاصل صفر ہی آتا ہے۔ کچھ لوگ اتنے منفی اتنے زندگی سوز اتنے چھلنی نما ہوتے ہیں کہ ہرا بھرا آدمی اُن سے ملنے کے بعد اپنے آپ کو خالی محسوس کرنے لگتا ہے اور کچھ اللہ کے بندے ایک کے ہندسے سے مشابہ ہوتے ہیں۔ جس رقم سے ضرب کرو اسی قدر رقم میں بدل جاتا ہے۔ رزاق ایک کا ہندسہ تھا۔ محمد علی کو ٹیلیویژن پر دیکھا خود محمد علی ہوگیا اور جس روز اسے احساس ہوا کہ اُس کی اکائی دراصل صفر کا دوسرا روپ تھی اُس نے زندگی کو بالکل یوں چھوڑ دیا جیسے خوشبو مردہ پھول کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔

جس طبقے میں رشو گھومتی پھرتی تھی اُس میں زیادہ تر صفر قسم کی شخصیتیں ملا کرتی تھیں۔ یہاں دولت تھی۔ فراوانی تھی ہر قسم کے گجٹ تھے۔ مربعے' کوٹھیاں' بینک بیلنس' آپس میں امیر برادری کا گٹھ جوڑ' ایک طرح کی گفتگو' ایک قسم کی چغل خوری' وہی بیرون دریا محبت اور آشتی اور درون دریا آپس کا حسد..... یہاں وہ سب کچھ تھا جس کی آرزو میں غریب لوگ اوپر کی طرف چڑھنے کی آرزو رکھتے تھے اور یہاں پر اُس چیز کی بھی کمی نہ تھی جو اس ترقی کو صفر سے ضرب دے کر پھر صفر بنا دیتی تھی۔

رشو کتنی دیر اوپر والے کمرے میں بیٹھ کر سوچتی رہتی' یہ ہمارا ملک کس کا ملک ہے؟ کیا اسے سرسید احمد خان' سید احمد شہید' شاہ اسمٰعیل کی کوششوں نے بنایا تھا؟ کیا واقعی مسلمانوں نے اس مسکن کی آرزو کی تھی یا یہ ان بیروں کی طرح آنگن میں آ گرا جو بھرا آندھی میں ہمسائے کے درخت سے آ جھڑتے ہیں؟

کیا قرارداد پاکستان سے لے کر حصول پاکستان تک اور حصول پاکستان سے لے کر آج تک کوئی ایسی ٹکڑی پیدا ہو سکی جس نے اپنے ملک کے لیے رزاق کی طرح سوچا؟

جس قسم کے لوگوں میں وہ گھومتی پھرتی' چہکتی روتی' خراج وصول کرتی حسب توفیق زندگی کا ٹیکس ادا کرتی لٹو کی طرح' بیلے ڈانسر کی مانند' ٹرن ٹیبل کی disc بن کر وقت گزار رہی تھی۔ ان لوگوں کی زندگیاں عجیب قسم کی بھول بھلیوں میں گزرتی تھیں۔ یہ لوگ نیشنل ہوئے بغیر انٹرنیشنل قسم کی ہمدردیاں رکھتے تھے۔ یہ فیشن کے طور پر اپنے کلچر کا شیشوں جڑا کھلا کرتا پہنتے تھے اور اپنی برتری کے لفافے پر بیرونی ثقافت کا ٹکٹ لگاتے تھے۔ یہ لوگ یا فیوڈل لارڈ تھے یا بیوروکریٹ برادری کے اہم رکن یا سیاست کی بساط کے کہنہ مشق مہرے۔ ان سب کی Specific heat ایک سی تھی۔

ان سب کا Boiling point اور Freezing point ایک سا تھا۔ ان سب کی اگر Chemical equation لکھی جاتی تو ایک ہی طور پر لکھی جاتی۔ کیونکہ یہ سب جب دولت' فراوانی' علم' فراست' زیبائش و آرائش' تن آسانی کی گرمی میں پرورش پا کر باہر نکلتے تو ان سب کی شکلیں پی آئی اے shavers سے مشابہ ہو جاتیں اور ان سے قوم

ہو۔ قوم ثمود، حضرت لوط کے گم کردہ راہ اور بنی اسرائیل کے کج بحثوں کی سی خوشبو آتی۔

رخشندہ کس کی بیٹی تھی اس کا اسے علم نہ تھا۔

اُسے اس کی طوائف ماں والٹن کیمپ سے اس نیت پر لے گئی کہ وہ ایک بچی کو اپنے کارِخیر میں شامل کرے گی۔ اسے لکھائے گی پڑھائے گی اور پھر معاشرہ میں عزت کا مقام دلائے گی۔

طوائف ماں کی نیت اچھی تھی لیکن پھر نہ جانے کب اور کس رات اُس کے چوبارے پر آنے والے ایک گاہک نے اس کو طوائف زادی سمجھ کر اپنے تصرف میں لے لیا اور رخشندہ کا مستقبل طے ہو گیا۔

رخشندہ اس بات کو ہر وقت سوچتی رہتی کہ ساری توفیق تو اوپر والے کی دین ہے پھر انسان اپنی تجویز، فیصلے اور دعاؤں کو کیسے درست سمجھے۔ یہی تقدیر تھی اور اٹل تھی۔

تقدیر کے اٹل فیصلے کے تحت پہلے وہ جنرل صاحب کے تصرف میں چلی گئی۔ جنرل صاحب کو وہ کسی قیمت پر چھوڑنا نہ چاہتی تھی۔ یہ اس کی پہلی محبت تھی۔ اس نے جنرل صاحب کی بڑی منتیں کیں کہ وہ بچہ ضائع نہیں کرنا چاہتی لیکن جنرل بختیار نہ مانے۔

پھر اس کا فیصلہ بھی ہو گیا جب جنرل صاحب 1971ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان میں تھے۔ انہیں نوے ہزار قیدیوں میں اکٹھا کر کے قید کی ہوا کھانی پڑی۔ نہ اُس کی ماں کی نیت کام آئی نہ اُس کی۔

پھر بیگم بختیار نے اُسے جمال کی تحویل میں دیکھ کر بھی کوئی واویلا نہ مچایا۔

اس کے بعد تو ایک قطار لگ گئی۔ اُس نے بظاہر ظفر سے شادی بھی رچالی لیکن یہ سب کچھ بے معنی تھا۔

اس شہرِ لازوال میں جانے کتنے دیوانے' کتنے فرزانے' کتنے صاحب جمال دفن تھے اور سال بہ سال ان میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ قبروں کے اندر اور کبھی کبھی کسی عید شب برات کے موقع پر ان پر بھیڑ رہتی تھی..... لیکن اب رشو سوچتی تھی یہ اسی شہر میں کچھ ایسے باکمال بابے بھی دفن تھے جن کی تعلیمات نے' جن کی اللہ تک رسائی نے اس شہر کو لازوال بنا دیا تھا۔ وہ اس شہر کی اس کے بسنے والوں کی ایسے ہی نگرانی کرتے ہیں جیسے کوئی ذمہ دار ماں اپنے نوزائیدہ بچے کی طرف کرتی ہے۔

یہ بابے اپنی ماستا سے اللہ کو یوں پکارتے کہ اللہ جو ستر ماؤں کی طرح تھا ایک کن فیکون سے سارے شہر کو آباد رکھتا۔ یہاں آفتیں نہ آتیں حادثات ہوتے' ناگہانی مصیبتیں ادھر اُدھر چھاپے مارتیں' بسا اوقات اپنی زندگی کے مصائب سے تنگ آ کر کچھ افراد شرک اور تکبر میں بھی مبتلا ہو جاتے۔ انہیں بیجا غصہ اور طیش' بیجا ضد اور خوف کے بگولے گھیر لیتے لیکن پھر کہیں سے بابے اپنے ملکوتی نور سے بھری عبا لے کر اس شہر کو اللہ کے نور سے ملا دیتے۔ شہر ایسی توانائی' قوت صلاحیت اور قابلیت سے محنت کی طرف راغب ہو جاتا۔ سب اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں فخر محسوس کرتے۔ اس میں پھر اپنی برکتیں شامل کرتے اور شہرِ لازوال انگڑائی لے کر زندہ ہو جاتا!

●○●○●○

کاشف کی کہانی

کاشف صاحب نے کوٹھی کا گیٹ خود کھولا۔ میں نے شرمندگی محسوس کی کہ مسلسل ہارن کیوں بجائے گیا.....کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا۔"آئی ایم سوری کاشف صاحب! آپ خود گیٹ کھولنے آئے۔"

کاشف کے چہرے پر ملکوتی مسکراہٹ' نورانی ڈاڑھی اور ہاتھ میں رمبا تھا۔

"نہیں نہیں میں خود ہی پھاٹک کھولتا ہوں ہمیشہ۔"

اتنی خوبصورت کوٹھی کا دروازہ یہ صاحب خود کھولتے ہیں۔ میں نے دل میں سوچا۔

"میں گلاب کے پودوں کی نہلائی کر رہا تھا۔ آپ کے ہارن کی آواز آئی' پھاٹک کھول دیا۔ آیئے....."

"بڑا خوبصورت باغ ہے آپ کا....." میں نے ٹھٹک کر گلاب سے بھرے پودوں کو دیکھا۔

"جی جی.....دل لگا رہتا ہے۔ اب ذرا پاٹنگ کا درد نیچے بیٹھنے نہیں دیتا' گلائی کرتے تکلیف ہوتی ہے....."

"آپ کوئی مالی رکھ لیجئے؟....."

"ہاں رکھوں گا بلکہ رکھا تھا بلکہ رکھنا ہی چاہیے.....وہ بات یہ ہے سر! کہ مجھے کینیڈا میں اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی عادت ہوگئی ہے۔ ایک بار اپنے آپ کو مصروف کرنے اور رکھنے کی یہ عادت پڑ جائے تو پھر چھوٹتی نہیں.....چھوٹے بڑے سارے کام تو وہاں خود ہی کرنے ہوتے ہیں۔ آیئے ناں....."

کوٹھی کا لان پار کر کے ہم اندر چلے گئے۔ بڑے ہی آراستہ ڈرائنگ روم میں مجھے بٹھا کر کاشف نے کہا۔

"آپ ذرا ٹیلی ویژن پر کرکٹ میچ دیکھیں' میں ابھی ہاتھ منہ دھو کر آیا....."

میں نے ٹیلی ویژن نہ لگایا اور دیوار کے ساتھ لگی فیملی کی تصویریں دیکھنے لگا۔ ایک بڑی تصویر میں کاشف بغیر ڈاڑھی کے صوفے پر بیٹھے تھے۔ اس کے ساتھ ایک خاتون مائل بہ فربہی' گال پر بڑا سا تل' ہونٹوں پر گہرے رنگ کی لپ سٹک' کٹے ہوئے بال' بڑی Self-concious مسکراہٹ کے ساتھ گود میں ہاتھ لیے بیٹھی تھی۔ صوفے کے پیچھے دو نوعمر لڑکے اور صوفے کے بازو پر ایک دس بارہ برس کی لڑکی گول عینکیں لگائے بیٹھی تھی۔ تصویر بیرون ملک کسی ماہر فوٹوگرافر نے سٹوڈیو میں کھینچی تھی۔ اس کے سارے رنگ ابھرتے ہوئے نہ تھے بلکہ بادامی' براؤن' میرون آپس میں ملے ہوئے تھے۔ تصویر نے فیملی لائف کا ایسا لمحہ امر کر دیا تھا جس میں کبھی کبھی سارے چہروں پر محبت ہوتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد کاشف ہاتھ میں چاندی کا ٹرے لیے آ گیا۔

''آپ کو پسند آئی.....''

''بہت! فیملی فوٹوگراف ہے آپ کی۔''

''جی جی.....''

''کچھ سال اُدھر تو آپ بہت ہی ہینڈسم ہوں گے۔''

''کیا ڈاڑھی سے فرق پڑ گیا ہے؟'' وہ مسکرا کر بولا..... پھر وہی نورانی مسکراہٹ۔

''نہیں نہیں..... اب بھی ہینڈسم ہیں مگر.....''

کاشف نے جواب نہ دیا۔ وہ انہماک سے پیالی میں چائے انڈیلنے لگا.....

''یہ مگر بڑا خطرناک لفظ ہے..... پتہ ہے..... سائنس اسی ایک لفظ کے سہارے ریسرچ کرتی ہے..... لیبارٹری میں جاتی ہے۔ وقت ہے مگر..... عمل ہے مگر ردِ عمل بھی ہے..... خلا ہے مگر خلا سے باہر کیا ہے..... اس سائنس نے ہم پر بڑے احسانات کیے ہیں..... لیکن ایک نقصان بھی کیا ہے..... ہماری زندگی میں مگر داخل کر دیا ہے۔ اب ہم کسی چیز پر اندھا دھند آنکھیں بند کر کے ایمان نہیں لا سکتے۔ کتنی چینی حضور؟.....''

''آدھی چمچ.....''

''لوگوں نے تو پتھروں سے مرادیں حاصل کی ہیں۔ بہتے پانیوں پر چلے ہیں۔ بغیر اسلحہ کے جنگیں جیتی ہیں..... دماغی قوت سے matter کو ہرایا ہے لیکن اب اس سائنسی مگر نے سب کچھ تہس نہس کر دیا ہے..... محبت ہم کرنا چاہتے ہیں لیکن..... مگر ہمیں جنس کی تجربہ گاہ میں لے گیا اور ثابت کرنا چاہتا ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان جنس کے علاوہ کچھ نہیں۔ جس چیز کو ہم ٹیسٹ نہیں کر سکتے۔ اس پر ہمارا اعتبار نہیں رہتا۔ جس کی Definition جامع نہیں کر پاتے۔ اس کو سمجھ نہیں سکتے..... مجھے اس مگر نے بہت ستایا ہے۔ جانِ من! بلکہ یوں سمجھ لیجیے کہ میری زندگی کی ساری گردش، بے اطمینانی، نا سمجھی اسی مگر کے باعث ہوئی.....''

کاشف صاحب کے پاس میں رات گئے تک بیٹھا رہا۔ ان سے ایک ایسی خوشبو آ رہی تھی جس کا کسی قسم کے سینٹ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ کاشف صاحب نے ہولے ہولے مجھے اپنی رام کہانی سنائی۔

''حضور میں اسی آپ کے ماڈل ٹاؤن میں بیس برس پہلے تھانے میں ایس ایچ او تھا۔ آپ نے تھانہ دیکھا ہے ناں، سارے میں خودرو گھاس اور دھول اڑتی تھی۔ سپاہی اپنے بال اور مونچھیں تیل سے چمکدار بنائے وردیاں پہنے یوں پھرتے تھے جیسے حکومت کے سب سے اہم کارندے ہوں..... تھانے کے ہر آدمی کو کلف لگی ہوئی تھی۔ ہم جس سے ملتے اسے پہلی ملاقات میں مجرم ضرور سمجھتے۔ پتہ نہیں یہ پولیس کا پیشہ تھا کہ قانون کے ساتھ رہتے رہتے ہماری عادت بنی۔ ہم ہر وقت نکتہ چینی، قانونی موشگافیاں، لوگوں کو جانچنے پرکھنے رہنا اور جنسی مذاق بہت چلتا۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہر مرد اگر روپے پیسے کے معاملے میں بے راہرو نہیں تو جنسی اعتبار سے بے اعتباری ضرور ہوگا۔ اگر وہ ان دونوں معاملات میں بے قصور بھی ہو تو اس کے کچھ ایسے گناہ ضرور ہوں گے جو آگے چل کر اگر قانون کی گرفت میں نہ بھی آئیں، سوسائٹی کے حق میں ضرور قابل

نفرت ہوں گے۔ ہمارے پاس کہانیاں ہی کہانیاں تھیں۔ کسی چور کی تصویر کے گرد گولڈ فریم تھا اور کسی سادھ کو جنتر مارنے کو جی چاہتا تھا۔

اس روز میں ایس پی صاحب کو تھانے کے سامنے سلیوٹ کر رہا تھا کہ ایک آدمی تھانے میں داخل ہوا۔ اس شخص کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ہم دونوں اس درجہ مشابہ تھے کہ لوگ ہمیں جڑواں بھائی سمجھ سکتے تھے۔ صرف فرق اتنا تھا کہ اس نے سفید شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور میں وردی میں تھا۔

جونہی ایس پی صاحب رخصت ہوئے میں واپس تھانے میں لوٹ گیا۔ ایک سپاہی میرے ہمزاد کو دفتر میں داخل ہونے سے روک رہا تھا:

''کیا کام ہے سالے.....''

''مجھے تھانیدار صاحب سے ملنا ہے..... پلیز۔''

سپاہی شائستہ زبان کا عادی نہ تھا۔

''تیرا ان کا کیا رشتہ ہے' تیری بہن کا یار ہے تھانیدار.....؟''

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''جی ایک ذاتی کام ہے..... میں ایس ایچ او صاحب سے ہی ملوں گا۔''

بلاوجہ سپاہی نے نووارد کو گریبان سے پکڑ کر دو چار جھٹکے دیئے۔

''اوئے کنجر! سارے تیرے ذاتی کام نکال دوں گا۔ بول کدھر ڈکیتی کی ہے' کونسا گھر لوٹا ہے۔''

سپاہی کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ وہ جرم کے اس قدر قریب رہتا تھا کہ اس کی ساری شرم و حیا ختم ہو چکی تھی۔ اگر اس وقت میں آگے نہ بڑھتا تو شاید وہ میرے ہمشکل کی کچھ ٹھکائی بھی کر دیتا۔

''آیئے آیئے سر! کیا کام ہے؟''

وہ سر جھکائے میرے پیچھے پیچھے دفتر میں داخل ہوا۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھا اور اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کرسی کے بالکل آگے ہو کر ایسے بیٹھا جیسے واقعی مجرم ہو۔

سپاہی لیاقت بھی سرکتا سرکتا اس کی کرسی کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔ نوجوان نے پہلے میری طرف دیکھا' پھر خوفزدہ نظروں سے لیاقت کی طرف نظر کی۔

''جی میں کچھ علیحدگی میں عرض کرنا چاہتا ہوں.....''

''ہاں کرو..... تھانے میں کوئی راز نہیں ہوتے.....'' لیاقت بدتمیزی سے بولا۔

''تم ذرا باہر ٹھہرو.....''

لیاقت منہ بسورے ہلکا سا سلیوٹ کر کے باہر چلا گیا۔

''ہاں بھئی.....''

''سر میرا نام عبدالرحمٰن ہے۔ میری تعلیم بی اے تک ہے۔ میں ٹیلی فون کے محکمے میں ملازم ہوں..... یہ جو محکمہ

چوک کے پاس ٹیلی فون کا محکمہ ہے یہاں پر سر..... لائن مین ہوں میں۔"

میں نے اس کی آسانی کے لیے ایک بڑی سی مسکراہٹ پیش کی۔

"ہاں بھئی..... مشکل کیا در پیش آئی....."

میرے دماغ نے اب تک کئی قیافے لگا لیے تھے۔ شاید یہ سرکاری تار چرانے کا مرتکب ہوا ہے یا پھر اس نے کسی سینئر آفیسر کی کوئی ٹھکانہ چوری پکڑی ہے۔ ہوسکتا ہے کسی گھر میں ٹیلی فون لگانے گیا ہو اور وہاں اس نے جرائم میں ملوث کوئی گروہ پکڑ لیا ہو اور اب اس کی مخبری کرنے آیا ہو..... عین ممکن ہے محکمے میں ہی کوئی جھگڑا درپیش ہو جو نقص امن کا باعث بن جائے۔

"ہاں بھئی کیا ہوا بتاؤ ناں۔"

"جی کل شام میں ڈیوٹی کے بعد نہر کنارے پٹری پٹری جا رہا تھا۔ گھر کی جانب....."

میں نے فوراً قیافہ لگایا۔ موقع واردات پٹری کا کنارہ تھا!

"تھوڑا سا اندھیرا تھا سر! تھوڑی سی روشنی..... نہر کنارے بلب روشن ہو گئے تھے۔ میں سر! عموماً پٹری پٹری چل کر دھرم پورہ جاتا ہوں وہاں میرا گھر ہے....."

"اچھا عبدالرحمٰن صاحب آپ دھرم پورہ رہتے ہیں۔"

"جی سر..... اچانک میرے پاؤں کو کسی چیز کی ٹھوکر لگی....."

فوراً میں نے اندازہ لگایا کہ کسی حرامی بچے کو سڑک کنارے پھینک گئے ہوں گے!

میں نے جھک کر دیکھا تو سر ایک چھوٹی سی چیز تھی.....

پرس!

"میں نے اٹھایا سر..... چھوٹا سا لیدر کا لال بٹوا تھا۔ ایسا پرس سر! جس کے کنارے گولڈ کی پتری کے بنے ہوتے ہیں۔ یہ دیکھیے سر یہ پرس تھا....."

عبدالرحمٰن نے کرتے کی سائیڈ جیب سے لیدر کا سرخ پرس نکال کر میز پر رکھ دیا۔

"سر خدا گواہ ہے میں نے اس میں سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا۔ اپنی بیوی کو بھی نہیں بتایا سر! عجیب اتفاق ہے کل رات وہ پٹھان بھی آیا ہوا تھا زرگل خاں' میں نے اس سے چار ہزار روپیہ سود پر قرض لے رکھا ہے۔ میں اس بٹوے میں سے رقم ادا کر سکتا تھا سر! لیکن میں نے..... اللہ رسول ﷺ گواہ ہے۔ ایک پائی بھی نہیں نکالی۔ آپ گن لیجیے سر پورے بائیس ہزار ہیں۔"

میں نے عبدالرحمٰن کا چہرہ بغور دیکھا۔ وہ میرا ہم شکل لیکن مجھ سے بہت زیادہ ملکوتی تھا۔

"گن لیں سر..... بیچ میں کارڈ بھی ہے..... آپ یہ بٹوہ سر خود بحفاظت انھیں پہنچا دیں....."

"گننے کی ضرورت نہیں ہے عبدالرحمٰن۔ تم کہہ رہے ہو تو ایسا ہی ہوگا۔"

"اچھا جی اب میں چلتا ہوں۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''السلام علیکم سر......''

''وعلیکم السلام......''

وہ چند قدم چلنے کے بعد رک کر بولا..... ''سر ایک گزارش ہے۔''

''فرمایئے؟''

''جی آپ زحمت کر کے یہ پرس خود ہی دینے جایئے گا..... پولیس والوں کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔''

''تم فکر نہ کرو..... پرس اپنے مالک کے پاس پہنچ جائے گا.....''

وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ معاً میرے دل میں خیال آیا کہ اتنی بڑی نیکی کے بدلے اس شخص کو کیا ملا...... دو بول تعریف کے بھی نہیں۔

''عبدالرحمٰن صاحب......''

''جی سر......''

میں نے اپنی ہپ پاکٹ میں سے پرس نکال کر دو سو روپے نکالے۔

''یہ دیکھیے سر دست میرے پاس یہی کچھ ہے۔ آپ جیسے بڑے آدمی کو یہ رقم پیش کر کے میں احمق محسوس کر رہا ہوں لیکن پلیز قبول کر لیجیے......''

اس نے چند ثانیے مجھے دیکھا۔ ایک ضرورت مند کی مجبوری کے ساتھ اور پھر رقم میرے ہاتھ سے قبول کر لی۔

''شکریہ سر......''

دروازے کے پاس رک کر اس نے مجھے پلٹ کر دیکھا۔ ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور رخصت ہو گیا۔

تھانے میں بہت جلد ایک آدمی دوسرے کو Replace کرتا جاتا ہے۔ ایک بدلی کی جگہ دوسری حاضری کے لیے موجود ہوتی ہے..... ایک کہانی کی جگہ دوسرا افسانہ جگہ گھیر لیتا ہے۔ میں بھی کچھ ہی دیر بعد عبدالرحمٰن کو بھول گیا۔

کچھ عرصہ بعد سپاہی لیاقت بددلی سے میرے کمرے کی صفائی کر رہا تھا۔ میں ٹیلی فون کا چونگا کان سے لگائے ہیڈ آفس فون کرنے میں مشغول تھا اور اس کی حرکتیں بھی ساتھ ساتھ دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے فون رکھ دیا اور لیاقت کو غور سے دیکھنے لگا۔

وہ ذرا سا Self-consious ہو کر بولا...... ''سر! وہ عبدالرحمٰن تھا ناں..... وہ جو اس روز تھانے آیا تھا......''

کچھ دماغ پر زور دے کر مجھے عبدالرحمٰن یاد آ گیا۔

''ہاں کیا ہوا اسے؟''

''ہوا تو کچھ نہیں سر! میں اس کے پیچھے پیچھے اس کے گھر گیا تھا دھرم پورے۔''

''کیوں تمہارا وہاں کیا کام تھا......''

''سر! وہ پتہ رکھنا چاہیے..... ایک بار جو تھانے میں قدم رکھے اس کا گھر ماپ لینا چاہیے......''

''لیاقت!.....''

''جی سر.....''

''تمہارا خیال ہے دنیا میں شریف و دیانتدار لوگ نہیں ہوتے.....''

''ہوتے ہیں سر! ضرور ہوتے ہیں۔ ان ہی کے سر پر تو دنیا چلتی ہے.....''

''پھر تم جیسے دوزخی انہیں زندہ کیوں نہیں رہنے دیتے۔''

وہ میری بات کا جواب نہ دے سکا اور سوری کہہ کر چپ ہو گیا۔

ملک میں یہ الیکشنوں کا زمانہ تھا۔ چھوٹا بڑا پُر امید رویئے کے ساتھ اس ہما ہمی افراتفری میں شامل تھا۔ جلوس نکل رہے تھے۔ تقریریں ہو رہی تھیں۔ دونوں پارٹیاں عوام سے وعدے وعید کر رہی تھیں۔ موسم اس سرگرمی کی اعانت کر رہا تھا۔ نہ سردی تھی نہ گرمی۔ بس جھوٹ موٹھ کی گرمی تھی اور جھلی سی سردی..... اگر شدید گرمی ہوتی تو بھی الیکشنوں کا زور اس طرح واضح نہ ہوتا۔ ہر طرف پہیہ جام ہڑتال' جلسہ جلوس' گرفتاریاں تھیں۔ ہم لوگ بہت ہی مصروف تھے۔ رات گئے تک میری پیشی ہیڈ کوارٹر میں ہوتی۔ نئے احکامات ملتے' پرانے آرڈر منسوخ ہو جاتے۔ آدمیوں کی شناخت کرائی جاتی۔ نئی رپورٹیں لکھنے کو ملتیں۔ اپنی گارڈ کو ہر روز نئے سرے سے آرڈر دینے پڑتے۔ لڑائی جھگڑے بڑھتے چلے گئے۔ چھاپے مارے جاتے تھے۔ عوام الیکشن کو میلہ سمجھ کر گھروں سے نکل آئے تھے۔ میلے میں تفریح کم تھی بلڈ پریشر زیادہ تھا۔ ہر قسم کی افواہیں گرم تھیں۔ دھاندلی اور Rigging کا لفظ بات چیت کا ضروری حصہ تھا۔ اشتہار' پوسٹر' بینرز سیلاب صورت نظر آتے تھے۔ کہیں کہیں دونوں پارٹیوں کے درمیان جھڑپ کے وقت مجھے بھی پہنچنا پڑتا۔ دومن ورکرز کی سرگرمیاں بڑھ رہی تھیں اور ہم نے اپنے علاقے کی ان خواتین کی خفیہ لسٹ بنا رکھی تھی جو الیکشنوں میں مصروف عمل تھیں۔ نقص امن کی صورت میں ابھی سے اعلیٰ اتھارٹیوں کے احکامات مل رہے تھے۔ خاص خاص گھروں کی نشاندہی ہو چکی تھی۔ سول لباس میں دن رات ان گھروں کی مخبری کی جاتی۔ تھانے میں ہر وقت مقامی اور سرحد پار کی خبریں سنی جاتیں۔ اخبار کا مطالعہ بڑھ گیا تھا۔ ان خبروں میں مزید اضافہ کر کے دوسروں کو اشتعال دلانے کا عمل جاری تھا۔ ہر سپاہی اپنی انا بھر Alert تھا۔ تھانے میں ایسی زندگی در آئی تھی جیسے ہم ہی میں سے کوئی نمائندہ جیتنے والا تھا۔ کالجوں کے لڑکے پُر جوش نعروں کے ساتھ سڑکوں پر آ گئے تھے۔ سکول کے بچے چھوٹے چھوٹے جھنڈے اٹھائے پھرتے تھے۔ ان کی قمیضوں پر اپنے نمائندہ کا بلا نظر آتا تھا۔ گھروں میں بحث مباحثہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ لگتا بھائی بھائی سے قطع تعلق کرے گا۔

سیکرٹریٹ کی ان کیسرہائی پاور میٹنگ کے بعد ہم جیسے آفیسروں کو تحقیقاتی' مشاورتی امور کا باقاعدہ علم تو نہ ہوتا لیکن ان گنت Instructions ملتی رہتیں۔ میں اور میرا عملہ سارا دن بھدر بھدر ہیڈ آفس سے ماڈل ٹاؤن آتے جاتے رہتے۔ ایسی ہی ایک ملاقات کے دوران مجھے ایس پی صاحب کے دفتر میں جانا پڑا۔ وہ اپنی گھومنے والی کرسی پر بیٹھے تھے۔ کرسی کی پشت پر تولیہ پڑا تھا۔ پچھلی دیوار کی کھونٹی سے شلوار قمیض لٹک رہے تھے جو غالباً اس بات کو واضح کرنے کے لیے لٹکائے گئے تھے کہ وہ ایس پی ہونے کے ساتھ ساتھ نماز کے بھی پابند ہیں۔ میز کے دائیں بائیں تین چار وڈیرے قسم کے لوگ بیٹھے تھے۔ انہوں نے کھلے کرتے' کھڑ کھڑاتی شلواریں' ویلکس پہن رکھی تھیں۔ چہرے پر نخوت تھی جس کو انہوں نے

برسوں کی ٹریننگ کے تحت خوشامد اور حلم میں چھپا رکھا تھا۔ ان کے علاوہ کمشنر صاحب بھی موجود تھے۔

میں سیلوٹ کر کے مؤدب ہو گیا۔

''ماڈل ٹاؤن کا کیا حال ہے؟''

''ٹھیک ہے سر......''

''کوئی واردات؟''

''جی نہیں سر۔''

''کاشف آپ کے علاقے میں آپ ضامن ہیں۔''

''آپ بے فکر رہیں سر..... میرے ہوتے ہوئے کوئی دھاندلی نہیں ہو گی۔''

کمشنر صاحب مسکرائے۔

وڈیرے پتھر کے بتوں کی طرح ساکت رہے۔

''بالکل..... مجھے آپ پر بہت اعتماد ہے بلکہ میں گورنر صاحب کو بھی بتا چکا ہوں کہ ہمارے لاہور میں آپ جیسا دیانتدار آفیسر موجود ہے۔''

''تھینک یو سر۔''

ایک بزرگ وڈیرے نے جس کے چہرے پر کھچڑی پکی داڑھی تھی اٹھتے ہوئے کہا۔

''لیس جی..... اب اجازت دیں.....''

سارے معززین کھڑے ہو گئے۔ جاگیرداروں نے ایس پی صاحب اور کمشنر صاحب سے معانقہ کیا اور میرے سلام کا جواب دیئے بغیر چپڑاسی کو دعائیں دیتے رخصت ہو گئے۔

''ہاں تو کاشف صاحب آیئے بیٹھیے.....''

''سر میں ٹھیک ہوں.....''

''ٹھیک تو آپ ہیں' لیکن بیٹھ جایئے۔''

میں ایس پی صاحب کے سامنے میز کی دوسری جانب کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''آپ کے علاقے میں آپ کی نگرانی تلے ووٹ ڈالے جائیں گے۔ لڑکوں کا سکول اور لڑکیوں کا کالج..... ان دونوں درسگاہوں کے سامنے نمائندوں کے ٹینٹ ہوں گے۔ آپ کا کام یہ ہے کہ پہلے تو آپ حبیب صاحب کے ٹینٹ پر چھاپہ مار کر انہیں بدول کر دیں۔ کرنا کرانا کچھ نہیں صرف چیکنگ کرنی ہے اور ان کے ورکرز کا Morale کمزور کرنا ہے۔ پھر سارا دن وقفے وقفے کے بعد انہیں ہراساں کرتے رہیں۔ چار ریٹرننگ آفیسر اپنے فائدے کو سمجھ کر ہمارے ساتھ کوآپریٹ کر رہے ہیں لیکن ایک پروفیسرنی اور ایک ریٹرننگ آفیسر کی طرف سے تسلی نہیں ہے۔ آپ کا کام ہے کہ ان دس بارہ دنوں میں ان دونوں کو ہراساں کر دیں۔ پولیس کا ان کے گھر میں پھیرا تو رہنا چاہیے۔ جیسے باقی معاملہ ووٹنگ سے دو چار دن پہلے طے ہو جائے گا..... ووٹ بہر کیف حبیب صاحب کو نہیں پڑنے چاہئیں۔''

پتہ نہیں کیوں میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"لیکن سر! یہ تو ظلم ہے ہم لوگ تو قانون کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

کمشنر صاحب نے لمبا سا سگار منہ سے نکالا اور بولے...... "دیکھو کاشف صاحب! حکومت قانون بناتی ہے...... اپنے تحفظ کے لیے رعایا کی سہولت کے لیے...... ہم لوگ اسی قانون کی حفاظت کرتے ہیں' جو ہم تک حکم کی صورت میں آتا ہے۔اب سنٹر سے یہ احکامات آئے ہیں ہم لوگ پیروی کرنے والے ہیں۔حکومت کو نیک و بد سمجھانے والے نہیں۔"

"لیکن سر یہ تو دھاندلی ہے...... ووٹ ہر شہری کا حق ہے' اسے آزادانہ استعمال کرنے کے راستے میں کوئی حائل نہیں ہوسکتا......"

"دیکھو کاشف! مجھے معلوم تھا کہ تم ایسی کوئی Idealist احمقانہ بات کرو گے...... تمہارے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ تم دیانت کو تھانیداری کے ساتھ ساتھ استعمال کرنا چاہتے ہو حالانکہ ان دونوں کو کبھی کبھی تنہا بھی چھوڑ دینا چاہیے۔"

کمشنر اور آئی جی صاحب مل کر ہنسے...... میں خاموش رہا۔

"کاشف صاحب نوکری کی وردی جس روز پہن لیں ناں تو ضمیر کا انڈرویئر اسی روز اتار لیں۔اب آپ جا سکتے ہیں اور خیال رکھیں...... جو جلوس حبیب صاحب کے Favour میں نکلے اسے Disperse کرنا آپ کا فرض ہے۔ آنسو گیس لاٹھی چارج جیسے بھی ہو' اپنے علاقے میں امن رکھیں اور جو اوپر سے آرڈر آرہے ہیں' اس کی تعمیل کریں۔باقی آپ کون ہیں؟ آپ کا ضمیر کیا کہتا ہے' کیا ٹھیک ہے' غلط ہے اس کی پرواہ نہ کریں۔السلام علیکم......"

تھانے میں پہنچ کر میری طبیعت پر عجیب قسم کا بوجھ تھا۔جن دنوں پاکستان بنا میں نوجوان تھا اور نوجوان انسان کی طرح میں نے پاکستان سے بڑی محبت کی تھی۔میرا اپنا خیال تھا کہ یہ ارض زمین وقت کے ساتھ ساتھ ایسی بن جائے گی جہاں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پئیں گے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ فقط قائداعظم کا خواب تھا۔وہ ہمیں بے غیرتی' بدحالی' بے ضمیری سے نکالنا چاہتے تھے۔ان کے تمام رفقاء اس خواب سے متاثر ضرور تھے لیکن اس خواب کو خود دیکھنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔آدرشوں کے لیے بڑی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ایمان' آدرش' کسی خاص سمت کا سفر قربانی' ایثار' زجر کے بغیر ممکن نہیں۔جو قومیں اپنی آزادی کے لیے خود جدوجہد نہیں کرتیں' انہیں آزادی راس نہیں آتی۔وہ اس آزادی کا تحفظ نہیں کرسکتیں...... ہم نے سن سینتالیس میں ایسی قربانیاں دیں جو ہم پر مسلط کی گئی تھیں۔ان کا ہمارے اپنے خوابوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔

ہولے ہولے برصغیر کے مسلمان اسی بے ضمیری کی طرف لوٹ رہے تھے جہاں سے ہماری بے ضمیری کا سفر شروع ہوا تھا۔ہم نے پاکستان کا مطلب وہ نہیں سمجھا تھا جس کا ہم نعرہ لگاتے رہے تھے۔سوائے اللہ کے اس سرزمین کے اور کئی مطلب بھی تھے۔

مکھی مارتے مکھیاں مارتے ہوئے میں سوچتا رہا کہ کیا اس دنیا میں انسان صرف خوشی اور کامیابی کے حصول کے لیے آتا ہے...... کیا وہ لوگ جو بظاہر کامیاب نہیں ہوتے اور جن کا خوشی سے رشتہ نہیں بن سکتا' ان کی زندگیاں اکارت جاتی ہیں؟

کیا آنسو بیکار ہیں؟
کیا دکھ کا انسانی روح کی جلا سے کوئی رشتہ نہیں؟
کیا سخت زندگی کا اگر بیرونی طور پر کوئی فائدہ نہ بھی ہو تو کیا یہ شخصیت پر اپنی خوبصورت چھاپ نہیں لگاتی؟
کیا خوشی کے ساتھ ساتھ غم کا بھی روح کی بالیدگی میں حصہ تو نہیں؟
کہیں ایسا تو نہیں کہ دکھ بھی اپنے مقام پر سست نما ہو سکتا ہے۔ خواہشات کا پورا ہونا اہم سہی لیکن ان کا قابو میں رہنا کسی اور سفر کی ضروری اور اہم شق ہو؟

میں بڑی الجھن کا شکار تھا۔ جس وقت سپاہی لیاقت میرے روبرو عبدالرحمٰن کو پکڑ کر لایا۔ عبدالرحمٰن خطرناک حد تک میرا ہم شکل تھا۔ ہم دونوں قد میں بھی برابر تھے۔ اس وقت سپاہی لیاقت نے اس کی کلائی پر ہتھکڑی چڑھا رکھی تھی اور اس کی شکل پر اعصابی کمزوری' مجبوری اور گہرا انفعال تھا۔ میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ اس نے سر کے اشارے سے مجھے سلام کیا۔

''بیٹھیے عبدالرحمٰن.....''

وہ جھجکا کر بیٹھنے ہی والا تھا کہ سپاہی لیاقت نے اس کی کمر میں دھموکا مار کر اسے کھڑا کر دیا۔

''یہ اس قابل نہیں سرکار کہ آپ کے سامنے بیٹھ سکے۔''

''پھر بھی تم انہیں بیٹھنے دو لیاقت.....''

''اس کی وہ بیٹھے ہوئے سرکار تصویر چھپی تھی اخبار میں.....میں تو اس کے گھر گیا تھا سر۔ ہم تھانے والے پورا پورا علم رکھتے ہیں سرکار.....کو مجھے پنڈ میں اس کا گھر ہے.....ہم سے کیا چھپے گا سرکار زبد معاش ہے سر بدمعاش۔''

''اچھا اچھا.....''

''میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں سر! میں صاف صاف آپ کو سب کچھ بتاؤں گا۔ صرف آپ اس سے کہیں میری ہتھکڑی اتار دے.....''

میرے کہنے پر لیاقت نے ہتھکڑی اتاری اور دھمکی آمیز نظروں سے عبدالرحمٰن کو دیکھتے ہوئے چلا گیا۔

''سر! آپ کے پاس کچھ وقت ہے' میں اعتراف کرنا چاہتا ہوں.....آپ کو یاد ہے میں آپ کے پاس ایک پرس لے کر آیا تھا.....''

''ہاں مجھے یاد ہے' اس پرس میں کافی رقم تھی۔''

''جی..... پورے بائیس ہزار.....سر! آپ کو معلوم ہے کہ میں نے سارے پیسے آپ کو دے دیئے تھے۔ حالانکہ مجھے خود ان پیسوں کی بڑی ضرورت تھی۔ میں نے ایک سود خور سے رقم لے رکھی تھی سود پر۔ سر یہ درست ہے میں نے بیوہ زرینہ کو قتل کیا اور اس کے دو لاکھ روپے چرائے۔ یہ بھی درست ہے سر! کہ زرینہ اور اس کی بیٹی کے میرے ساتھ تعلقات تھے.....لیکن سر۔''

''لیکن تم تو شادی شدہ ہو اور پچھلی بار جب میں تمہیں ملا تھا تو مجھے شبہ بھی نہیں تھا کہ تمہیں اپنی گھریلو زندگی سے

کوئی تکلیف تھی.....''

''مجھے تو اب بھی کوئی تکلیف نہیں ہے سر..... یہ سب اس منحوس پرس کی وجہ سے ہوا سر۔ یا یوں کہیے کہ میں نے خدا کی نعمت سے انکار کیا..... سر میں سمجھ نہیں پایا کہ نیکی سے بدی کی طرف سفر کب' کیسے اور کیونکر شروع ہوتا ہے۔ مجھے پتہ نہیں چلتا کہ میں کون ہوں' کیا میں اتنا اچھا ہوں کہ سڑک کنارے پڑے پرس کو لوٹا سکتا ہوں اور کیا میں اتنا خبیث' رذیل' کمینہ ہوں کہ..... ایک بیوہ کے ساتھ ایسے کر سکتا ہوں.....''

''اس بیوہ سے کیا تعلق تھا تمہارا.....''

''یہ بھی ایک لمبی کہانی ہے سر..... بیوہ زرینہ کی بیٹی میری بیوی کی سہیلی ہے سر۔ بڑے سالوں سے وہ ہمارے گھر مشین پر کپڑے سینے آتی رہی ہے لیکن میرے گھر آنے سے پہلے وہ چلی جایا کرتی تھی۔ کبھی کبھار اگر ملاقات ہو بھی جاتی تو میں کبھی اس سے بات نہ کرتا۔ نہ ہی وہ مجھے بلاتی۔ جب میں آپ کو پرس واپس کر کے گیا سر! تو ہمارے حالات بہت خراب تھے۔ میری ماں کی بیماری پر مسلسل روپیہ لگ رہا تھا۔ وہ نہ ٹھیک ہوتی نہ مرتی۔ بس پرس واپس کرنے کے بعد میں عجیب خیالوں میں گھر گیا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی روپے پیسے کے متعلق نہ سوچا تھا لیکن اس روز کے بعد میں سارا سارا دن زیادہ کمانے کے بارے میں سوچتا رہتا۔ میرے دل و دماغ پر روپے نے گھیرا ڈال لیا تھا۔ یا میں روپے کے متعلق سوچتا یا پھر کھانے کے متعلق..... انواع و اقسام کے کھانے ہوں اور میں ہوں..... کھانے بیٹھتا تو آٹھ نو روٹیاں کھا کر اٹھتا۔ میری بیوی حیران رہ جاتی۔ سر میرے دو بچے ہیں۔ کبھی کبھی ان کی پلیٹوں سے بھی اچک کر کھا لیتا۔ کسی اور کے کھانے کی مجھے پرواہ نہ رہی۔ اول تو ہمارے کھانے کے لیے تھا ہی کیا؟ لیکن وہ بھی میری بھوک کی نذر ہو جاتا۔ پہلے میں نے بازار سے خرید کر کچھ نہ کھایا تھا' اب کبھی کبھی سموسے' دہی بھلے' نہاری' پائے کھانے لگا..... میں آپ کو بتاؤں سر! ساری بدی انسان میں اس کے پیٹ کے راستے سے داخل ہوتی ہے۔ جو لوگ صرف کھانے پر کنٹرول رکھتے ہیں۔ وہ اپنی ساری خواہشات کو قابو میں رکھ سکتے ہیں۔ پہلے آدمی کا معدہ جاگتا ہے پھر..... اس کی آنکھ ہوس کا شکار ہوتی ہے..... جب آنکھ قابو میں نہیں رہتی تو پھر جنس حملہ آور ہوتی ہے۔''

''لیکن بیوہ کے ساتھ تمہارے تعلقات کیسے ہوئے؟''

''او سر جی! پہلے اس کے ساتھ کب تعلق بنا۔ پہلے تو اس کی بیٹی نے راستہ روکا۔ وہ غریب ہماری مشین پر کپڑے سیتی تھی۔ ایک روز اسے دیر ہو گئی' کسی سے وعدہ کیا ہوا تھا کپڑے دینے کا۔ دیر تک مشین چلاتی رہی۔ میری بیوی نے از راہِ ہمدردی کہا کہ رات زیادہ ہو گئی ہے آپ زاہدہ کو چھوڑ آئیں.....''

''اچھا..... اور تم نے بیوی کے اعتبار کا یہ صلہ دیا.....''

''بس جی راستے میں ایک حلوائی کی دکان پڑتی تھی..... اور صرف وہی کھلی تھی۔ میں نے آدھ آدھ پاؤ گاجر کا حلوہ لیا اور سنسان گلی میں حلوائی کی دکان کے سامنے بیٹھ کر ہم دونوں نے حلوہ کھایا۔ پتہ نہیں حلوے کی تاثیر تھی۔ رات بارہ بجے کی خاموشی تھی۔ اندھیرا تھا کہ کیا تھا؟ ہم دونوں نے گلی میں چلتے چلتے پتہ نہیں کیوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ زاہدہ کے ہاتھ میں لرزش اور میرے ہاتھ میں دلیری تھی۔ گلی اتنی خاموش تھی سر! کہ لگتا تھا موت پھر گئی ہے۔ گھر کے دروازے پر

رک کر ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ نہ اس کا دل اندر جانے کو چاہ رہا تھا نہ میں لوٹنے کے موڈ میں تھا۔ ساری زندگی میں نے نشے کو ہاتھ نہیں لگایا سر! مجھے معلوم نہیں دماغ کو کوئی چیز چڑھ بھی جاتی ہے۔ آدمی کسی طاقت کے سامنے بے بس بھی ہو سکتا ہے لیکن میں ایک قدم پیچھے اٹھانے پر بھی قادر نہ تھا۔ کوئی آواز مجھے اندر ہی اندر بتا رہی تھی کہ یہی وہ لمحہ ہے جب میں بھاگ سکتا ہوں' یہی وہ فیصلہ کن گھڑی ہے جب فرار ممکن ہے..... لیکن زرینہ کے سانس کی خوشبو نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ نومبر کی رات خنک تھی۔ جسم میں ایک قدرتی لرزہ تھا اور زرینہ کے ہاتھ گرم تھے.....

بس اسی ساعت نے سب کچھ روند ڈالا۔

میں روز صبح دفتر جانے سے پہلے زرینہ کے گھر جاتا۔ زرینہ کی ماں نائب تحصیلدار کی بیوہ تھی' ان کا گھر پکا اور صاف ستھرا تھا۔ دونوں ماں بیٹی بڑی منتظم تھیں۔ صبح میں ان ہی کے گھر ناشتہ کرنے لگا۔ وہاں مجھے بڑے مان آدر کے ساتھ رنگ رنگ کے ناشتے ملتے۔ نہاری' سری پائے' انڈے پراٹھے' پتہ نہیں کیا کیا تیاریاں وہاں ہوتیں۔

شام کو دفتر سے واپسی پر بھی پہلا پڑاؤ زرینہ کے گھر ہوتا۔ میں نے آپ کو بتایا ناں سر! کہ وہ دونوں بڑی اچھی گھر دار تھیں۔ ہاتھی کے انڈے سے لے کر چوہے کی مینگن تک اس گھر سے نکل آتی۔ باتیں بھی خوب مزے مزے کی کرتیں اور کبھی اُن کا نہ تو موڈ خراب ہوتا نہ ہی کسی کے سر درد ہوتی۔ ہنستے کھلکھلاتے چہرے' سریلی آوازیں' ماننے والا رویہ' ان ہونی کو ہونی میں بدلنے والی طبیعتیں۔ مجھے تو جیسے جنت مل گئی..... زرینہ کا خیال تھا کہ میں اس سے شادی کرلوں گا۔ اس کی ماں شگفتہ بھی یہی سمجھتی تھی کہ کچھ ہی دنوں میں نکاح درپیش ہے۔ اس لیے کبھی وہ مجھے زرینہ کا جہیز دکھاتی۔ کبھی اپنی خاندانی وجاہت کا رعب ڈالتی۔ ایسے ہی ایک دن وہ شیخی کے موڈ میں تھی۔ ہم تینوں بیٹھے رات کا کھانا کھا رہے تھے۔

''یہ گوبھی گوشت تو کمال کا ہے.....'' میں نے کہا۔

''اللہ بخشے جس رات شیخ صاحب فوت ہوئے ہیں۔ اس دن بھی گوبھی گوشت ہی پکا تھا۔ پھر انہیں گیس ہوگئی..... بیچارے شپٹا گئے' پاس بلا کر کہا..... یہ دو لاکھ روپے ہیں۔ ساری عمر کی کمائی' رکھ لو کام آئیں گے.....''

پتہ نہیں سر! میرے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا۔

''اور وہ دو لاکھ؟..... وہ کہاں ہیں۔'' میں نے دریافت کیا۔

''میرے پاس ہیں۔'' نائب تحصیلدار کی بیوہ بولی.....

''یہاں گھر پر.....''

مجھے سر تھوڑی سی کرید کے بعد پتہ چلا کہ دونوں عورتیں احمق بھی ہیں۔ چند دن سمجھانے کے بعد میں نے انہیں اس رقم سے خاص سرٹیفکیٹ خریدنے پر آمادہ کر لیا۔ بیوہ مان تو گئی لیکن سر! وہ رقم مجھے پکڑانے پر تیار نہ تھی۔ اب یہ لمبے بکھیڑے کی بات ہے۔ مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ شگفتہ اپنی تنہا زندگی سے اُکتا چکی ہے۔ اسے شیشے میں اتارنا کچھ مشکل نہ تھا۔ اس کے ساتھ تعلقات استوار کر کے میں نے دو لاکھ کے سرٹیفکیٹ ضرور خریدے لیکن اپنے نام سے..... سرٹیفکیٹ میں نے اپنی بیوی کا منہ بند کرنے کے لیے خریدے تھے' خدا کے لیے یہ سمجھنے کی کوشش کیجیے سر! کہ مجھے ہرگز ہرگز روپے کی طمع نہ تھی یا اس وقت مجھے علم نہ تھا کہ کس طرح ایک جھوٹ دوسرے جھوٹ کے دروازے کھولتا چلا جاتا ہے۔ دو لاکھ کے

سرٹیفکیٹ پکڑتے ہی میری بیوی کی کایا پلٹ گئی۔ اب اس نے مجھے پوچھنا چھوڑ دیا کہ میں صبح و شام کہاں غائب رہتا ہوں۔ شاید معاملہ بے نقاب نہ ہوتا۔ پھر کسی طرح زرینہ کو شک پڑ گیا کہ میری توجہ شگفتہ پر بھی ہے۔ وہ میری بیوی سے تو حسد نہ کرتی تھی لیکن ماں بیٹی میں جھڑپیں ہونے لگیں..... ان لڑائیوں نے مجھے ایک جہنم میں دھکیل دیا کیونکہ شگفتہ ہر وقت اپنے دو لاکھ مانگتی تھی۔ ان حالات کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں بالآخر شگفتہ کو ختم کرنے کے متعلق سوچنے لگا کیونکہ نہ تو میری بیوی رقم لوٹاتی تھی اور نہ ہی زرینہ ایک لمحے کے لیے اپنی ماں کے ساتھ رہنے کو تیار تھی۔

پھر اچانک سر! ایک رات میں نے گلا دبا کے شگفتہ کو ختم کر دیا..... جو آخری جملہ اس نے بولا سر! ابھی بھی میرا تعاقب کرتا ہے..... جب اس کا سانس اکھڑ رہا تھا' وہ کہے جا رہی تھی..... مجھے چھوڑ کے نہ جانا عبدالرحمٰن..... مجھے چھوڑنا نہیں..... سر آپ مانیں گے نہیں میں نے کسی کو نہیں پکڑا نہ اپنی بیوی کو..... نہ زرینہ کو نہ شگفتہ کو..... کوئی درندہ میرے اندر تھا..... مقفل..... میں نے غلطی سے تالا کھلا چھوڑ دیا..... اگر آپ کا سپاہی لیاقت مجھے پکڑنے نہ آتا تو بھی میں اپنی گرفتاری دے دیتا سر..... میں نے شگفتہ نائب تحصیلدار کی بیوہ کو مارا ہے..... میں نے زرینہ کو دغا دیا..... میں میں..... قاتل بھی ہوں اور نوسرباز بھی..... مجھے سزا ملنی چاہیے..... لیکن سر! مجھے حوالات میں بند کرنے سے پہلے ایک لمحے کے لیے سمجھائیے کہ نیکی کیا ہے..... اس کی عمارت ایک اینٹ نکالنے سے ساری کی ساری کیوں ڈھے جاتی ہے..... ایک غلط خیال' ایک بے خیالی میں کیا ہوا غلط عمل ساری نیکی میں خمیر کی طرح کیوں لگ جاتی ہے.....

سر آپ کو مجھے سمجھانا پڑے گا..... بتانا پڑے گا..... میں سزا سے نہیں ڈرتا بلکہ میں سزا کو ویلکم کہتا ہوں لیکن آپ میرا اندر شانت کر دیجئے..... نیکی کیا ہے' اس کے ڈھکے چھپے روپ کتنے ہیں۔ اسے کیوں زنگ لگ جاتا ہے۔ کیا چیز جو ہمیں نیک رہنے نہیں دیتی..... نیکی کافی کیوں نہیں سر..... کسی انسان کے لیے اس کے سہارے..... فقط نیکی کے سہارے زندہ رہنا ممکن کیوں نہیں؟"

میرا ہم زاد ہم شکل میرے سامنے بیٹھا تھا اور میری طرح ہی پریشان تھا۔ کچھ دیر اپنے دماغ پر زور دے کر میں بولا..... "عبدالرحمٰن! میں زیادہ تو نہیں جانتا اور نیکی کو قریب سے جاننے کا موقع بھی نہیں ملا لیکن تھانے کی نوکری ایسی ہے کہ برائی بہت دیکھی ہے..... میں تو اتنا جان سکا ہوں کہ جو لوگ اللہ کی خاطر نیکی کرتے ہیں اور اسے اپنے آپ سے منسوب نہیں کرتے اور صرف احکامات کی پیروی کرتے ہیں' نیکی ان کی انا کو مضبوط نہیں کرتی۔ انہیں کبھی خیال نہیں آتا ہے وہ نیک ہیں اور وہ بچے رہتے ہیں ورنہ عبادت گزار' خلق خدمت کرنے والا سب کی انا پھن اٹھاتی ہے..... اور کسی نہ کسی مقام پر..... یہی انا..... آدمی کو بدی کے تالاب میں بھی تیرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ انا جو ہوئی' حب جاہ کے علاوہ اور کیا چاہے گی....."

عبدالرحمٰن میری بات سمجھا کہ نہیں لیکن میری سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ مجھے الیکشن سے پہلے پہلے ملک سے رخصت ہونا ہے۔

میرا بھائی ٹورنٹو میں ڈاکٹر تھا۔ وہ ڈان ملز کے علاقے میں رہتا اور ڈاؤن ٹاؤن میں بلور کی سڑک پر اس کا کلینک تھا۔ کئی بار اس نے مجھے کینیڈا آنے کی دعوت دی تھی۔ یہ ہماری فیملی تصویر آپ دیکھ رہے ہیں۔ میری بیوی دونوں بیٹے اور بنی ایک ہفتے کے اندر اندر کینیڈا میں تھے۔ اس سے پہلے استعفیٰ دینے پر کوئی چیز ابھار نہ سکتی تھی لیکن میں جان گیا تھا کہ میں

اس پروفیشن میں رہ کر سال ہا سال نوکری کرنے کے بعد نیک نہ رہ سکوں گا۔ مجھے نیکی کا کوئی ایسا شوق بھی نہ تھا لیکن مجھ میں بدی کر کے سزا بھگتنے کی ہمت بھی نہ تھی..... کینیڈا پہنچ کر مجھے پولیٹیکل امان لے کر وہیں رہتا بستا تھا۔ کینیڈا جانے سے ایک شام پہلے میں اپنی ماں سے ملنے گیا.....

میری ماں چنبیلی تھی۔ اس نے ساری عمر اندھی چوہی کی طرح دیوار کے ساتھ چل چل کر بسر کی تھی۔ پہلے وہ باپ کی تحویل میں تھی۔ ابھی اسے اپنے جسمانی تغیرات کا علم بھی نہ ہوا جب اس کی شادی ہو گئی۔ میرے ابا کی عمر شادی کے وقت چالیس کے قریب تھی۔ میری ماں فقط چودہ برس کی تھی لیکن ابا نے ساری عمر میری ماں سے بڑی محبت کی۔ یہ اور بات ہے کہ ماں کا حوصلہ ہی نہ کھلا۔ ابا اعظم کلاتھ مارکیٹ میں پردے صوفے کے کپڑے کا بیوپار کرتے تھے۔ انہوں نے دُکان کی کمائی سے شاہ عالم کے پچھواڑے دو منزلہ پختہ مکان ماں کے نام میں بنوایا تھا۔ ماں کے پاس بڑا زیور اپنے مائیکے اور سسرالی گھر کا تھا۔ وہ خود کانوں میں تین تین بالیاں، دس دس تولے کے کڑے ہمیشہ پہنتی تھی۔ ماں پر کوئی سوتن، جٹھانی، ساس، نند حاکم نہ تھی۔

وہ شروع دن سے خود مختار تھی..... لیکن محبت نے ہمیشہ اسے محکوم رکھا۔ پہلے اسے باپ سے محبت تھی۔ اتنی محبت کہ شادی سے پہلے وہ باپ سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ اس کا شوہر کیسا ہے۔ وہ اپنے باپ پر اتنا اندھا اعتبار کرتی تھی کہ اسے کبھی وہم ہی نہیں ہوا کہ کوئی اس کے لیے غلط فیصلہ بھی کر سکتا ہے۔

بیاہ پر ماں کو شیخ صاحب سے بھی ویسی ہی محبت ہو گئی جیسی ابا سے تھی۔ سارے گھر کی عملداری میں وہ اس طرح راج کرتی جیسے گھر اس کا نہ ہو وہ فقط خلیفہ تھی اور ساری زمین اللہ کی امانت۔ شیخ صاحب کے فوت ہو جانے کے بعد اماں اب میرے بڑے بھائی کے ساتھ رہتی تھی۔ ابا کے چالیسویں کے دن ہی مکان کو ہم تینوں بھائیوں کے نام منتقل کر دیا تھا۔ اب وہ اس گھر میں مہمان کی طرح رہتی جس کا گھر والوں سے محبت کا رشتہ ہو.....

گیٹ کے سامنے کچھ پانی کھڑا تھا۔

اندر ٹیوب سے فرش دھونے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ گیٹ کے اندر سے بھابھی نے پوچھا.....

''کون ہے جی؟''

''میں ہوں کاشف.....''

بھابھی نے ٹیوب ہاتھ سے چھوڑی، سر ڈھانپا اور پھاٹک کا دروازہ کھول دیا۔

''بوا جی صحن میں نماز پڑھ رہی ہیں۔''

میں وردی میں تھا اور بھابھی ہر وردی والے آدمی سے ڈرتی تھی۔ اس کا خیال تھا چونکہ وردی والے آدمی کے پاس طاقت ہوتی ہے اس لیے وہ ہمیشہ اس طاقت کا استعمال غلط کرتا ہے۔ میں صاف گیلی گلی میں دبے دبے قدم دھرتا اندر چلا گیا۔ اماں تخت پوش پر بیٹھی نماز پڑھ رہی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میری آہٹ سے ان کو میری آمد کا پتہ چل گیا۔ انہوں نے جلدی سے التحیات پڑھی۔ سلام پھیرا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ اس مسکراہٹ میں چنبیلی کی خوشبو تھی۔ ماں جس برتن، کپڑے، بستر کو ہاتھ لگا دیتی معطر ہو جاتا۔ جدھر دیکھتی اُدھر سے ہلکی ہلکی روشنی آنے لگتی.....

قیدی تھی۔ اس کی ساری عمر چھپکلی کی طرح دیواروں پر رینگ کر گزری تھی۔ اندھی چوہی کی طرح وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلی۔

لیکن ماں صرف محبت کی قید میں تھی۔ کوئی بے جان چیز اس پر قبضہ نہ کر سکی۔ وہ روپے پیسے اشیا معاملات لین دین دنیاداری سے آزاد تھی..... پہلے وہ باپ کی قید میں رہی پھر شوہر کے بندی خانے میں خوش رہی۔ اب اس کے نزدیک ساری کائنات کا مرکز ہم تینوں بھائی تھے۔

میں آپ کو شاید اپنے معنی سمجھا نہیں سکا۔ آپ کو لگتا ہوگا کہ ماں مظلوم بیچاری اور نادار تھی۔ ایسی بات نہیں..... اس کی طاقت کا سرچشمہ اور تھا۔ وہ دنیا سے طاقت حاصل نہیں کرتی تھی۔ اس کے لیے اللہ اور رسولؐ زندہ حقیقتیں تھیں۔ ایمان اس کی ساری زندگی میں پٹڑی کی طرح بچھا تھا جس پر اس کا انجن کبھی تیز کبھی ہولے ہولے چلتا..... لیکن رکتا نہیں تھا۔ وہ اپنے فیصلے تیزی دوراندیشی ممکنات کو چھان پھٹک کر نہ کرتی تھی بلکہ ہر مقام پر کہیں سے محبت آ کر اس کے کان میں صحیح فیصلہ پھونک دیتی۔ کبھی کبھی برسوں اس کے فیصلے غلط لگتے۔ پھر اچانک پتہ چلتا کہ ماں ٹھیک کہتی تھی۔ اسے اپنے لیے کچھ درکار نہ تھا۔ اسے صرف اپنے پیاروں کے لیے دنیا چاہیے تھی..... وہ فقیرنی تھی جو اللہ کے حضور صرف اپنوں کے لیے چوری چوری چپکے چپکے نہ جانے کیا کیا مانگتی رہتی تھی..... مشکل کے وقت وہ دنیا اور اپنے پیاروں کے درمیان ڈھال کی طرح سخت اور اچھے دنوں میں پانی کی طرح بہتی تھی..... ماں کو اپنی مشکلات کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ ہاں کسی پیارے کے سوئی بھی چبھ جاتی تو اظہار کیے بغیر وہ تڑپتی نظر آتی..... پیار کے معاملے میں بھی اس نے کبھی ذخیرہ اندوزی نہ کی..... ان گنت سہیلیاں رشتہ دار ملنے ملانے والیوں سے وہ اجتناب کرتی۔

پہلے وہ اپنے باپ کے لیے زندہ تھی۔

پھر اس نے شوہر کے لیے سانس لیے۔

اب اس کی نظر میں ہم تین بھائی تھے۔

اس کے اردگرد سب کچھ ماں کے لیے سراب تھا اور اس نے کبھی سراب کے پیچھے بھاگ کر نہیں دیکھا..... وہ چمکدار چیزوں مزیدار کھانوں لذت سے بھرے لمسوں سے دور بھاگتی تھی اور سب سے بڑی بات یہی تھی کہ جس طرح وہ اپنے رسول کا نام لیتے ہچکچاتی تھی ایسے ہی اس دور بھاگنے سے بھی اجتناب کو ضروری سمجھتی تھی۔

میں اماں کے قریب تخت پوش پر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے نہ ہاتھ لگایا نہ چوما۔

''السلام علیکم اماں.....''

''وعلیکم السلام..... بڑے دنوں بعد آئے کاشف۔''

''الیکشنوں کی تیاری ہے وقت نہیں ملتا.....''

''اچھا.....''

وہ الیکشن کا نام تو شاید جانتی تھی لیکن لوگوں کے نمائندے کس طرح لوگوں پر راج کرتے ہیں اس کے متعلق اس کی معلومات کم تھیں یا شاید تھیں ہی نہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد اماں اٹھی۔ اندر باورچی خانے میں گئی اور معمولی برتنوں میں کچھ مٹھائی اور دودھ پتی بنا کر لے آئی۔ میرے پاس تخت پوش پر پڑے رکھ کر اماں نے کہا..... "تم فکرمند لگتے ہو کاشف! کیا بات ہے؟" میں نے اماں کو کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اسی طرح ہمیشہ کی طرح وہ ہمارے چہرے پڑھ سکتی تھی۔

"کیا بات ہے؟....."

"میں تنویر بھائی کے پاس کینیڈا جا رہا ہوں....."

ماں کے چہرے پر اداسی کی ردا سی پھیل گئی۔

"تم بھی کاشف....."

"جی..... میں بھی....."

میں نے ماں کو ساری تفصیلات تو نہ بتائیں۔ صرف یہ ضرور ان کے علم میں لایا کہ اگر میں یہیں رہا تو حکومت کا عتاب کبھی بھی میرا گھیراؤ کر سکتا ہے.....

تھوڑی دیر بعد بھابھی دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی اندر آئی۔ پلاسٹک کی کرسی کھینچ کر ہمارے پاس بیٹھی اور میرے گھر والوں کی خیر خیریت پوچھنے لگی.....

"بھابھی! بچے ٹھیک ہیں۔"

"جی رات فون آیا تھا' ٹھیک ٹھاک خوش ہیں۔"

"چائے پی لو کاشف' ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

اماں نے کہا تو مجھے بھول گیا کہ میں ایس ایچ او ہوں..... پورے دبدبے والا۔

"بھابھی! کل میں سامان بھیجوں گا کسی جگہ رکھ لیجیے گا۔ فریج فرنیچر سب استعمال میں رکھیں..... چابیاں بھی آپ کو دے جاؤں گا۔"

"آپ اماں کو چابیاں دے جائیں....." بھابھی نے تکلفاً کہا۔

"ناں بھائی..... میرا کیا بھروسہ....." اس سے آگے ماں کچھ نہ بولی..... اسے اپنا تو بھروسہ تھا لیکن تنویر اور کاشف کے لوٹنے پر بھروسہ نہ تھا۔

"آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں اماں....."

"وعدہ' کیسا وعدہ....."

"سترہ سال سے تنویر بھائی کینیڈا بلا رہے ہیں لیکن آپ نہیں گئیں..... میرے پاس آپ کو آنا پڑے گا۔"

ماں نے میری بات کا جواب نہ دیا۔

"ایک بار آپ مجھے وہاں سیٹل ہو جانے دیں' پھر میں آپ کو یہاں نہیں چھوڑوں گا لاہور میں۔"

ماں نے میرے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ جب بھی وہ تذبذب میں ہوتی' اسی طرح نظریں چرا کر گزارہ کرتی۔

"میں تو ماں جی کو کہیں نہیں جانے دوں گی منجھلے بھائی۔ وہ اس گھر سے دور کہیں نہیں رہ سکتیں۔"

ماں نے ٹاپے کے دسویں حصے میں بھابھی فردوس کی جانب دیکھا.....

"اگر ہم یہ مکان بیچ دیں اور بھائی قادر بھی کینیڈا آ جائیں تو پھر....."

بھابھی فردوس کا مائیکہ ایک گلی پیچھے تھا۔ وہ دن میں کئی چکر ماں کے گھر لگا آتی تھی۔

"ایسے بھلا اپنوں کو چھوڑا جا سکتا ہے؟"

ماں نے سوالیہ نظروں سے بھابھی فردوس کو دیکھا۔ "جب ہم تینوں بھائی کینیڈا میں ہوں گے تو پھر یہاں کون سے اپنے رہ جاتے ہیں؟" لیکن ماں منہ سے نہیں بولی۔

کچھ دیر مٹھائی کھانے کے بعد میں نے چائے پی اور رخصت چاہی۔ جب بھی ہم تینوں میں سے کوئی ماں سے بچھڑتا اس پر قیامت گزر جاتی لیکن وہ ان قیامتوں کا ذکر کسی سے کرتی نہیں تھی۔ وہ محبت کی قیدی تھی..... اور چونکہ یہ قید اس نے خود قبول کی تھی اس کی اپنی پسند سے تھی اس لیے اس کا بوجھ اس کی طبیعت پر نہ تھا۔ تعجب کی بات ہے ابا کی زندگی میں لگا کرتا جیسے وہ اس قید سے بڑی خوش ہیں۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ گیٹ تک میرے ساتھ آئی۔ ہم دونوں کے پیچھے پیچھے بھابھی فردوس سلیپر گھسیٹتی آ رہی تھی۔ گیٹ کھول کر میں نے پوچھا..... "ماں..... ایک سوال پوچھوں۔"

"پوچھ.....؟"

"اگر آپ کو ایک اور زندگی ملے..... جینے کا ایک اور چانس تو آپ کیا کریں؟"

اس نے سر پر دوپٹہ ٹھیک کیا اور آہستہ سے بولی..... "بیٹا! میں تو پھر یہی زندگی مانگوں جو میں بتا آئی ہوں۔ وہی ابا جی..... وہی شیخ صاحب..... قادر تم اور تنویر..... یہی تین بہوئیں..... فاطمہ سفینہ اور فردوس..... مجھے تو کسی گھڑی کو بدلنے کی خواہش نہیں..... بس یہی لوگ دوبارہ مل جائیں۔ ان کے ساتھ وقت کٹے....."

"ماں..... لیکن ابا جی تو فوت ہو گئے۔ آپ کے ابا بھی اب دنیا میں نہیں ہیں..... میں اور تنویر بھی کینیڈا میں ہوں گے..... صرف قادر بھائی پاس ہوں گے..... کیا جو موجود نہیں ہوتے ان کی یادیں تنگ نہیں کرتیں دکھ نہیں دیتیں۔"

"ہاں دکھ بھی دیتی ہیں لیکن دور رہنے والوں کے لیے دعا بھی تو بڑھ جاتی ہے۔ ان کی یاد بھی تو زیادہ ہو جاتی ہے....."

ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے.....

"تجھے رونا اچھا لگتا ہے ماں کہ ہنسنا....."

"دونوں ہی اچھے لگتے ہیں۔ آنسوؤں سے کبھی کبھی دل کی کدورت دور ہو جاتی ہے..... دونوں ضروری ہیں اپنی اپنی جگہ۔"

میں پتہ نہیں کیوں اپنے آپ میں چھوٹا کا محسوس کر رہا تھا۔

"ماں میرے لیے دعا کرتی رہنا....."

ماں نے میری بات کا جواب نہ دیا۔

میں نے ماں سے زور کی جپھی ڈالی اور اپنا سر اس کے کندھوں پر رکھ دیا۔ پتہ نہیں کیوں اتنے بڑے مونچھ داڑھی والے تھانیدار کا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔ ماں نے ہولے سے میرا سر چوما اور پھر مجھے اپنے سے علیحدہ کر دیا۔

''ہم دونوں رات کو آئیں گے بچوں کے ساتھ۔'' فردوس بھابھی بولیں۔

''ضرور......''

''فلائٹ کب ہے؟''

''کل صبح دس بجے...... کراچی' فرینکفرٹ' ٹورنٹو......''

''تنویر بھائی کو اطلاع دے دی ہے......'' قدرے پریشان ہو کر بھابھی نے پوچھا۔

''جی...... وہ آ جائیں گے ایئر پورٹ پر......''

ماں محبت کی اسیر تھی۔ اس قید میں جو بھی موسم آئے گئے' سب اس کے مرغوب تھے۔ بس اسے رہائی منظور نہیں تھی۔ مجھ سے بچھڑنے کا لمحہ اس پر بیت گیا جیسے کئی اور بچھڑن سے اس پر گزر گئے تھے' وہ پہاڑوں کی طرح ثابت قدم کھڑی تھی۔ دھوپ کی منتظر' بادلوں سے گلے ملنے والی بارشوں سے آشنا' برفوں سے لد جانے والی...... ہر موسم میں اس کے قدم محبت کی زمین میں گہرے جمے ہوئے تھے۔ اسے اس جگہ سے کوئی ہلانے والا نہیں تھا......

جونہی میں ماں کو چھوڑ کر سرکلر روڈ پر پہنچا۔ میرے جی میں پتہ نہیں کیوں آئی کہ میں امین سے مل لوں۔ جانے کب ملاقات ہو۔ لاہور میں رہتے ہوئے قریباً بارہ سال سے میں نے اس کی شکل نہ دیکھی تھی۔ امین میرا پھوپھی زاد بھائی تھا۔ بچپن میں ہم دونوں بڑے دوست تھے۔ پھر وہ لکھنے پڑھنے میں مجھ سے آگے نکل گیا۔ میں نے پولیس جوائن کر لی...... ایک اور وجہ بھی تھی۔ میری خالہ زاد بہن سفینہ کی اس سے شادی ہو گئی۔ سفینہ کی وجہ سے ہم دونوں اور بھی دور ہو گئے لیکن اب جب سفینہ کینیڈا میں بیٹھی میرے تین بچوں کی دیکھ بھال کر رہی تھی' مجھے امین یاد آ گیا۔ ہم دونوں مل کر سارا سارا دن پتنگیں اڑایا کرتے تھے۔ میں ہوا میں گڈی اچھی طرح چڑھا لیتا تھا۔ اسے پیچ لڑا کر لطف ملتا۔ پہلے میں گڈی چڑھاتا' پھر ڈور امین کے ہاتھ میں دے کر چرخی سنبھال لیتا...... بہت کم ایسا اتفاق ہوتا کہ کوئی اور اس کی گڈی بوکاٹا کر دیتا۔

بھگوان سٹریٹ میں اس کا گھر گلی میں کافی آگے تھا۔

گلی خاموش تھی۔ سیڑھیوں پر بچے بالکل ویسے ہی بیٹھے تھے جیسے میرے بچپن میں ہم بھائی اور ہمارے کزن بیٹھا کرتے تھے۔ تب ابا بھی اسی گلی میں رہا کرتے تھے اور سفینہ کی امی بھی...... امین کی والدہ اور میری پھوپھی کا گھر بھی یہیں تھا۔ ساری گلی ہماری تھی...... سارے گھر اپنے تھے...... کہیں کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ سفینہ کی شادی کے بعد پھوپھی اور پھوپھا سمن آباد چلے گئے اور پھر میں نے گھر چھوڑ دیا۔ میں امین کے گھر میں سفینہ کو دیکھ کر پتہ نہیں کیوں تڑپ جایا کرتا تھا۔ میرے جانے کے بعد تنویر نے کینیڈا کا رخ کیا۔ پھر ابا نے یہ گھر چھوڑا اور اعظم کلاتھ مارکیٹ میں صوفہ کلاتھ کی دکان ڈال لی۔

مجھے معلوم نہیں امین اور سفینہ کے درمیان کیا تھا' کیا نہیں تھا۔ بچپن میں یہ دونوں کزن میرے دوست تھے۔ ہم مالٹے کی پھانکیں تین حصوں میں بانٹ کر کھاتے۔ کیلے کو تین حصوں میں تقسیم کیا کرتے۔ ایک ہی چیز کو برتنوں راصرار ...

بیٹھتے۔ ایک دوسرے کا ہوم ورک کاپی کرتے۔ ساتھ سکول جاتے۔ واپسی پر اکٹھے گھر آتے..... لیکن دلوں کا حال میں کبھی معلوم نہیں کر سکا۔ پہلے سفینہ نے امین کو پسند کیا' پھر طلاق لی اور مجھ سے شادی کر لی..... اب وہ کینیڈا میں بیٹھی بچوں کے تعلیمی مسائل حل کر رہی تھی۔ نہ میں نے کبھی اس سے امین کے بارے میں تفتیش کی نہ ہی مجھے کبھی علم ہو سکا کہ وہ مجھے امین پر کیوں ترجیح دیتی ہے.....؟

ہم سارے کزن اور ہمارے بزرگ بھگوان سٹریٹ میں رہا کرتے تھے۔ خاندان کی شکل ایک ٹہنی کی سی تھی جس میں چھوٹے بڑے پتے لگے تھے۔ اب صرف امین کا چھوٹا سا گھر اس گلی میں رہ گیا تھا۔ باقی گھروں کی صرف یادیں تھیں۔ تین سیڑھیاں چڑھ کر میں نے امین کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازے کے ساتھ ہی چھوٹے سے جالیدار پوسٹ بکس میں دو تین خط اور رسالے پڑے تھے۔ دروازے پر دستک دی تو امین وارد ہوا۔ اس نے پہلے تھوڑا سا دروازہ کھولا اور پھر حیرانی سے مجھے دیکھا۔ امین زیادہ بوڑھا نہ تھا لیکن چالیس کے قریب ہی پہنچ کر اس کے قریباً سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ وہ گرے رنگ کے شلوار قمیض میں ملبوس تھا اور چہرے پر موٹے شیشوں کی عینک تھی۔

''آئیں آئیں.....''

امین میرے لیے سراپا خوش آمدید تھا۔

اس کے سارے جسم سے ظاہر تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر بچپن میں چلا گیا تھا۔

گھر میں اس کے سوائے کوئی نہ تھا۔ ترتیب بھری بے ترتیبی سے ماحول بھرا ہوا تھا۔ اس گھر کو دیکھ کر فوراً پتہ چل جاتا تھا کہ یہاں کوئی عورت نہیں رہتی اور اس گھر کو ایک مرد چلا رہا ہے۔ امین نے میرے لیے چائے بنائی۔ پھر ایسے ٹرنک سے بسکٹ اور نمکین کاجو لے کر آیا جس میں فینائل میں لپٹے ہوئے گرم کپڑے بھی تھے۔ چائے مزیدار تھی۔ ہم دونوں بید کی کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ بڑی دیر تک ہونے والے الیکشنوں پر بات ہوتی رہی۔ پھر پاکستان کی موجودہ حالت زیر بحث رہی۔

''میں پاکستان چھوڑ کر کینیڈا جا رہا ہوں.....''

امین نے میری طرف دیکھا..... ہم دونوں میں بے شمار ان کہی باتیں سمجھی جا سکتی تھیں۔ بڑے خاموش وقفے کے بعد اس نے پوچھا..... ''ہمیشہ کے لیے؟.....''

''میں..... چاہتا تھا کہ اپنے ملک میں رہ کر پولیس سروس کرتا۔ اس شعبے میں نیک نامی' سچائی اور دیانت کی ایک روایت مجھ سے وابستہ ہوتی۔ عام شہری' غریب لوگ مجھے دیکھ کر خوفزدہ نہ ہوتے بلکہ طاقتور لوگوں سے میں انہیں پناہ دے سکتا لیکن یہ ساری سوچ Idealist ہے..... میں اس قدر مضبوط آدمی نہیں ہوں کہ اپنے آدرشوں کی قیمت ادا کر سکوں.....''

''کوئی بھی مضبوط نہیں ہوتا کاشف۔ سبھی بزدل ہوتے ہیں۔ خاص کر تھرڈ ورلڈ کے..... ہمیں اپنی عزت اتنی پیاری ہوتی ہے کہ اس کے خوف سے ہم لوگوں کے ہاتھوں میں بک جاتے ہیں۔ عجیب سی مصیبت ہے..... ہمیں عزت کا شوق ہوتا ہے اور ہماری عزت کا ہمارے عمل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا..... اس کا سارا تعلق دوسرے لوگوں کی رائے سے

کیوں؟.....لوگ چاہیں تو مجھے اچھا آدمی سمجھیں' نہ چاہیں تو مجھے رد کر دیں.....ایسا کیوں؟ میں لوگوں کا محتاج کیوں رہتا ہوں جبکہ میرا عمل میرا ذاتی فعل ہے؟.....یہ ہر معاملے میں دوسرے لوگ کہاں سے آ جاتے ہیں.....کیوں آ جاتے ہیں۔ کیا میں کبھی آزاد رہ سکتا ہوں۔ مجھے اتنی سزا ملے جس قدر میرا جرم ہے....."

مشرقی ممالک میں Extended Family سے لوگ طاقت اخذ کرتے ہیں۔ جو انسان اپنی لڑائی خود نہیں لڑ سکتا' وہ سارے خاندان کو لے کر حملہ آور ہوتا ہے۔ صدیوں سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔ برادری' خاندان' قبیلہ' جاگیرداری نظام ان سب کی بنیادوں میں وہ طاقت کی اینٹیں لگی ہیں جو پشت در پشت سے چلی آ رہی ہیں۔ مضبوط خاندان اس وقت ظالم بنتا ہے جب کسی کمزور کو خاندان سے طاقت کی جگہ محبت درکار ہوتی ہے۔ رحم اور ترس کا متلاشی جب کسی مقام پر گرتا ہے تو پھر خاندان بر چھی کلہاڑے لے کر بت کو توڑ ڈالتے ہیں جس میں خاندانی روایت کو توڑنے کا حوصلہ تھا۔

"اچھا تو میں چلوں امین....."

"سب جا رہے ہیں؟....." امین اپنی سابقہ بیوی کا نام لیتے لیتے رک گیا۔

"سفینہ اور میرے بچے تو ایک ہفتہ ہوا ٹورنٹو چلے گئے تھے' میں کل جا رہا ہوں....."

"آپ.....استعفیٰ دیں گے کاشف بھائی....."

امین کے منہ سے کاشف بھائی سن کر مجھے عجیب لگا' وہ مجھ سے چار سال بڑا تھا۔

"مجھے استعفیٰ دینا ہی پڑے گا.....میں کچھ غلط کام کرتا رہا ہوں.....لیکن اب مجھے پاکستان سے پیار ہے.....اور اب وقت بدل گیا ہے۔ میں اب ظلم کا زیادہ ساتھ نہیں دے سکتا۔ کالا آدمی بغاوت پر آمادہ ہے' عورتیں مردوں کی بالادستی سے تھک گئی ہیں۔ نوجوان امیر بننے کی قیمت ادا نہیں کرنا چاہتے۔ شریف آدمی بازار کا حصہ بننے سے انکار کر رہا ہے۔ اولاد والدین کی دوہری اقدار سے تھک گئے ہیں.....وقت بدل گیا ہے امین! ہر انسان کی خواہش ہے کہ اسے صرف اسی قدر سزا ملے جتنا اس کا جرم ہے۔"

امین نے ایک لمبی آہ بھری۔

خاموشی کا وقفہ سارے Stale گھر میں سسکنے لگا۔

"آپ ابھی بھی پبلک لائبریری میں ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"جی.....اب تو میں وہاں چیف لائبریرین ہوں.....کتابوں اور جانوروں کا ساتھ بھی عجیب ہے.....یہ بڑے پیارے ساتھی ہیں۔ کبھی ہمارے ظلم کے خلاف احتجاج نہیں کرتے۔ شاید اسی لیے مغرب والوں نے انہیں دوست بنا لیا ہے.....نہ بے وفائی' نہ احتجاج' نہ زیادتی....."

"اچھا امین میں چلتا ہوں....."

ہم دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ امین کے ہاتھ میں گرمی تھی جو مجھے برسوں بعد ملی.....

ہم دونوں ہاتھ پکڑے مین دروازے تک آ گئے.....

امین کچھ کہنا چاہتا تھا.....

"کوئی پیغام....." بڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ میں نے پوچھا.....

"پیغام نہیں.....صرف معافی.....سفینہ کو میں نے چار سال اس کی مرضی کے خلاف اپنے گھر میں رکھا۔"

"مرضی کے خلاف' وہ کیسے....."

"میں نے بہت کتابیں پڑھی ہیں۔ کہیں سے اس بات کا جواب نہیں مل سکا....."

وہ اپنے سے باتیں کرنے لگا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے خود ہی سکوت توڑا...." سفینہ کو میں نے چار سال بڑی سزا.....دی..... محض اس بات کی سزا کہ اس نے کیوں مجھ سے شادی کی' خاص کر اپنی مرضی سے..... بھلا شادی سے پہلے کوئی clear بھی کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ محبت کرتا بھی ہے یا نہیں....."

اب وہ اٹک اٹک کر بولے جا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے.....شادی سے پہلے اسے میں پسند تھا۔ اس نے اپنی ماں سے لڑ جھگڑ کر مجھ سے شادی کی.....لیکن مجھے چار سال تک اسے اس بات کی سزا نہیں دینی چاہیے تھی۔ وہ تو ہفتے کے بعد ہی ہاتھ جوڑنے لگی تھی..... بار بار کہتی تھی' امین مجھے جانے دو۔ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے.....میں نے غلط فیصلہ کیا۔ میں تم سے کبھی محبت نہیں کر سکتی.....تم بہت اچھے آدمی ہو لیکن میری ٹائپ کے نہیں ہو.....کاش! بھلا شادی کے تجربے کے بغیر کیسے پتہ چل سکتا ہے کہ کوئی آپ سے واقعی محبت کرتا ہے۔ شادی لیبارٹری جو ہوئی۔ اس میں گھسے بغیر پتہ نہیں لگتا بھائی.....شادی ٹیسٹ ہے..... ٹسں پیپر ہے.....تجربہ گاہ....."

وہ چند لمحے چپ رہ کر بولا۔

"سفینہ خوش ہے....."

"بظاہر....."

"کبھی روتی تو نہیں؟"

"میں نے کبھی روتے تو نہیں دیکھا....."

"خوش ہی ہوگی.....انشاءاللہ....."

ہم دونوں چپ ہوگئے۔

ہماری خاموشی باتوں سے بڑی تھی۔

"علی کیسا ہے؟"

ہمارے بڑے بیٹے علی کا باپ امین میرے سامنے کھڑا تھا۔

"اسے سکول میں داخل مل گیا ہے.....وہاں.....کالج کو سکول کہتے ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہوگا فریش مین ہے ہمارا علی....."

لمبی سی آہ بھر کر امین نے اپنے آپ سے گلہ کیا....."ہمارا علی....."

"کس پر ہے؟"

''کسی پر نہیں۔ اپنے پر ہے..... شکل عادات سب میں.....''

''زیادہ تنگ تو نہیں کرتا تمہیں؟.....'' لجاجت سے امین نے پوچھا۔

''میرے تینوں بچوں میں سے وہ سب سے زیادہ سعادت مند اور خوبصورت ہے.....''

امین کی آنکھوں میں ہلکے سے آنسو تیر گئے۔

''شکر ہے..... میں کبھی کبھی سوچتا تھا کہ کہیں تم پر بوجھ نہ ہو اس کا.....''

ہم دونوں ایسی برف پر چل رہے تھے جس کے نیچے پانی ہوا کرتا ہے۔

''تم نے شادی نہیں کی امین..... شادی اچھی چیز ہے۔''

''ہاں اب میرا ارادہ ہے۔ کرلوں گا..... پتہ نہیں کیا بات ہے۔ بڑھاپے میں باتیں کرنے کو بہت دل چاہتا ہے..... اور گھر پر کوئی نہیں ہوتا.....''

وہ مجھے خدا حافظ کہے بغیر پلٹ گیا۔ میں نے آہستہ سے اس کی کمر کو خدا حافظ کہا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

ٹورنٹو ایئرپورٹ تک امین میرے ساتھ رہا۔

ان دنوں ٹورنٹو سے لاہور سیدھی فلائٹ تھی۔ صرف راستے میں فرینکفرٹ پر ایک گھنٹہ کے لیے طیارے نے قیام کیا۔ ہم ساری سواریاں باہر نکلیں ایئرپورٹ پر ذرا چل پھر کر سیدھی کی۔ وقت کی تبدیلی نے جسم کو حیران کر رکھا تھا۔ پچھلی رات یا پچھلے دن سفر کے دوران ہوائی جہاز میں مسافروں نے ''فری ولی'' کی فلم دیکھی تھی جس میں ایک وہیل مچھلی جال میں پھنسی اور پھر رہا کر دی گئی..... پتہ نہیں اس فلم میں کیا بات تھی کہ مجھے بار بار سفینہ اور امین یاد آتے رہے..... ان دونوں میں سے کون وہیل مچھلی تھا..... سفینہ کہ امین؟ رہائی سفینہ کو ملی کہ امین کو؟ انسان بھی کیا مجبور جاندار ہے۔ اسے ٹھیک سے کبھی بھی علم نہیں ہوسکتا کہ اصلیت کیا ہے؟ نیک سے نیک شخص کو معلوم نہیں ہوسکتا کہ اصل نیکی کتنی گہری اور کتنی بچی ہے..... حادث انسان کو کبھی وثوق سے اپنی حقیقت کا علم نہیں ہوسکتا۔ برائی کی تہہ میں کبھی کبھی نیکی کا چمکدار موتی مل جاتا ہے اور نیکی کی تجوری میں سے بل کھاتا بدی کا کوبرا پھن اٹھائے کھڑا ملتا ہے..... ہمیشہ flex میں رہنے والا انسان اپنے آپ سے کیا توقع رکھے..... کیا دوسروں کے آئینے میں شکل دیکھ کر اپنے پر ایمان لائے کہ اپنے زعم میں اپنے متعلق رائے قائم کرے؟ کیا کوئی شخص کسی مضمون میں سارے نمبر لے جانے کے بعد یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنے مضمون سے پوری واقفیت رکھتا ہے؟ میں کچھ تو استعفیٰ دینے پر اداس تھا۔ کچھ پردیس میں نئی زندگی' نئے امکانات' نئی مشکلات کا سامنا تھا۔ امین کی ملاقات نے میری شادی شدہ زندگی میں مدھانی پھیر دی تھی۔ اسی موڈ میں تھا جب ٹورنٹو آ گیا۔

ٹنل میں تو موسم کا احساس نہ ہوا لیکن جب میں بیگیج لینے کے لیے نیچے گیا تو مجھے لگا کہ شاید باہر سردی ہو۔ کالے پورٹر کی مدد سے سامان لے کر میں باہر گیا۔ میں اس تلاش میں تھا کہ کہیں مجھے قادر اور سفینہ نظر آ جائیں۔ ایک آدھ چکر لگایا لیکن کوئی نظر نہ آیا۔

میں سراسیمہ سا کھڑا تھا۔ کسی نئے اجنبی ایئرپورٹ پر یوں بے سروپا کھڑے ہونے کا میرا یہ پہلا تجربہ تھا۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ کسی ٹیلی فون بوتھ سے گھر فون کروں۔ جب دو لڑکیاں میری جانب بڑھیں۔

یہ خالص امریکن لڑکیاں تھیں۔ چھوٹے ہاتھی کی طرح پلی ہوئی۔ ان کے چہرے معصوم، جسم فربہ اور چال تیز تھی۔ دونوں لڑکیاں تیرہ چودہ برس سے بڑی نہ تھیں لیکن دور سے چونتیس پینتیس برس کی معلوم ہوتی تھیں۔ دونوں لڑکیوں نے جینز کے کپڑوں کی نیکروں، پاؤں میں جوگرز اور جسم پر بنیان پہن رکھی تھی۔ ان کی کلائیوں پر پلاسٹک کی رنگین گھڑیاں بندھی تھیں اور ایک نے ناک چھدوا رکھا تھا۔ وہ دونوں میرے پاس آ کر رک گئیں۔

نک چھدی نے پوچھا..... "کیا آپ میری مدد کریں گے؟"

"مدد کیسی؟....."

دوسری معصوم کبوتری نے وضاحت کی..... "یہ دیکھیے ہمارے پاس یہ تصویریں ہیں۔ ماریا ہاف چینی کی..... انہوں نے پہلی بار پلے بوائے کے لیے نیوڈ تصویریں کھنچوائی ہیں اور ہمیں یہ تصویریں آٹوگراف کر کے دی ہیں۔ ہم..... خود ماریا ہاف چینی کے پاس گئے تھے۔ اس نے خود آٹوگراف کی ہیں تصویریں..... یہ دیکھیے....."

دوسری لڑکی نے میرے سامنے جلدی جلدی ماریا ہاف چینی کی ننگی تصویریں کر دیں۔ "دیکھیے آج کل ماریا کا Craze ہے سب کو۔ وہ اتنی Cool ہے جہاں بھی اس کا میوزیکل شو ہوتا ہے ٹکٹ نہیں ملتی..... ہمارے پاس پانچ تصویریں تھیں، بس یہ رہ گئی ہیں۔"

میں ابھی تک کچھ نہ سمجھا تھا۔

"آپ چاہتی ہیں میں یہ تصویریں خرید لوں....."

"ساری نہیں..... ایک یا دو....." نک چھدی نے کہا..... "ساری تو آپ Afford نہیں کر سکتے کبھی بھی....."

میں اتنی کم سن معصوم لڑکیاں کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں ماریا کی تصویروں کو لے کر کیا کروں گا۔ زیادہ سے زیادہ سفینہ میری اس حرکت سے ناخوش ہو جائے گی۔

لال گھڑی والی نے کہا..... "ماریا نے ہمارے ساتھ بہت Co-operate کیا ہے سر۔ دیکھیے ناں ہم Charity جمع کر رہے ہیں۔ Asian Immigrants کے لیے سکول بن رہا ہے۔ وہ سکول صرف لڑکیوں کے لیے ہے..... ماریا بھی چاہتی ہے کہ ایسے سکول زیادہ ہوں جن میں صرف لڑکیاں پڑھیں۔ ہم خیرات اکٹھی کر رہے ہیں۔ امید ہے آپ ایک تصویر تو لے ہی لیں گے....."

میں جو دل ہی دل میں ایک پورٹر کو چار ڈالر دینے پر تلملا رہا تھا، میں نے پانچ ڈالر میں مشہور ماریا ہاف چینی گلوکارہ کی نیوڈ تصویر خرید لی۔ اس ماریا کی جو خود نیوڈ تصویروں کی ماڈل تھی اور مشرقی لڑکیوں کے لیے علیحدہ سکول بنانے کے لیے اپنے آٹوگراف بیچتی تھی!

میں نے ان لڑکیوں سے تصویر خریدی جو ایک اچھے Cause کے لیے برے Means استعمال کر رہی تھیں۔ جنہیں یہ علم نہیں تھا..... کہ ان دونوں چیزوں میں کوئی باہمی ربط ضرور ہوتا ہے۔ کیا ابن بد سچائی پر تھا؟ طوائف بن کر روزی کمانا اور پھر اس روزی کو کسی یتیم کی تعلیم پر خرچ کرنا کسی بیچارے انسان پر ترس کھا کر اسے جھوٹے اظہار محبت سے زندگی عطا کرنے کی کوشش ہمسائے کے کتے کو اس نیت سے زہر کھلانا کہ وہ محلے کے لوگوں کو بے آرام کرتا ہے؟ کسی بیمار کو موت کا

ٹیکہ لگا کر ہمیشہ کے لیے سلا دیتا کہ وہ بیماری کے ہاتھوں عاجز ہے۔ خلق کے فائدے کے لیے ایسی جان لیوا تحریکیں چلاتا جو لوگوں کی موت کا باعث ہوں؟ اپنے مسلک یا مذہب کے لیے ایسی شدت اور تیزی اختیار کرتا کہ دوسرے مسلک اور مذاہب خطرے میں پڑ جائیں۔ کیا انسان کی یہ بھی فطرت ہے کہ وہ ہر مسئلے کو سلجھاتا سلجھاتا الجھا دیتا ہے۔ اس کے ہاتھوں نیکی کا انجام عموماً بدی میں منتج ہو جاتا ہے؟

میں نیکی کی اصلیت کے متعلق سوچتا ہوا اس کی بنیادی خصوصیات کی تلاش میں سفینہ اور اپنے بھائی سے جا ملا۔ وہ ٹورنٹو ایئرپورٹ پر باہر والے لاؤنج میں میرے منتظر تھے۔ علی فرید اور ثانیہ اپنے اپنے سکول گئے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ مجھے لینے ایئرپورٹ پر نہ آئے۔

ٹورنٹو میں تنویر بھائی ڈان ملز کے علاقے میں مین بلیوارڈ سے ہٹ کر رہتا ہے۔ اس کے گھر کے آگے ایش کے درختوں میں سرخ سرخ پلاسٹک کے دانوں سے مشابہ پھلوں کے گچھے لگے تھے۔ گھر کے سامنے لان میں سفید پلاسٹک کی کرسیاں اور چھوٹے برآمدے میں صوفہ پڑا تھا۔ تنویر ایک امیر ڈاکٹر تھا اور اس کے گھر میں پانچ بیڈ روم اور دو ڈرائنگ روم تھے۔ جب وہ اماں کے ساتھ لاہور رہتا تھا تو اسے ایک کمرہ بھی رہنے کو نصیب نہ تھا اور وہ گلی میں جس ڈاکٹر صاحب کا اسسٹنٹ تھا، وہ اسے مریض کو صرف اسی وقت دیکھنے دیتے تھے جس روز رش ہوتا۔ ورنہ عموماً وہ خود مریض کو دیکھتے اور تنویر ڈسپنسر کی طرح نسخے لکھتا رہتا۔

آبادویرانے
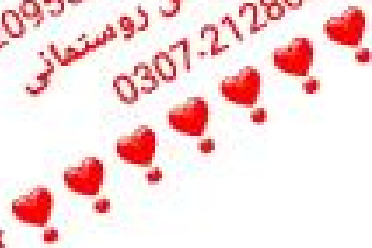
پہلا عہد

بس ہولے ہولے یوں چڑھائی چڑھ رہی تھی جیسے کوئی ہانپتا ہانپتا ہوا کمر پر لادے سامان سمیت پہاڑ پر چڑھ رہا ہو۔

بڑے ابا نے بس کی کھڑکی سے نگاہ ترائی کی جانب ڈالی..... ہر طرف درختوں پر نئے پتے آ رہے تھے۔ نازک' ہلکے سبز رنگ کے پتے جن پر بھرپور بہاری ابھی چھاپ نہ تھی۔ ہوا میں خنکی تھی' مسافروں نے سویٹر پہن رکھے تھے اور ایک دوسرے کے وجود سے انھیں گرمی نہیں لگ رہی تھی۔

بڑے ابا نے سوچا..... انسان کبھی بھی کسی کے اتنے قریب نہیں ہوتا کہ اپنے سارے موسم اپنے وجود سے اتار کر اُسے دکھا سکے۔ بیتے موسموں کے رنگ' خوشبو' محسوسات' کیفیات' احساسات سب کچھ جو اہم ہو کر غیر اہم ہو گیا اس کے دل پر بادلوں کی طرح آیا اور از گیا..... اتنا سب کچھ وہ کیسے کسی کو دکھا سکتا ہے' سمجھا سکتا ہے؟ کسی اور کو سمجھا نہ سکنا' دکھا نہ سکنا' منوا نہ سکنا کتنا بڑا کرب تھا' کیسی تنہائی!

ان کا ڈاکٹر بیٹا سامنے والی سیٹ پر بیٹھا آہستہ آہستہ اپنی بیوی کو کچھ سمجھانے میں مشغول تھا۔ بڑے ابا جانتے تھے کہ ان کی بہو ساجدہ اتنی دور آنے پر رضامند نہ تھی۔ وہ ہتھیلی جیسی سپاٹ زمین کی عادی تھی لیکن ان کا ڈاکٹر بیٹا ویانا میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد پہاڑوں کا عاشق ہو چکا تھا اور چاہتا تھا کہ اس کی نیلی پہاڑوں کو سمجھنا' وہاں رہنا' اس کے موسم میں جینے کو خوشی سے قبول کرے..... وہ آہستہ آہستہ ساجدہ سے کہہ رہا تھا..... ''یقیناً پہاڑوں میں تمہاری زندگی مختلف ہوگی۔ یہ جگہ ضلع کا دارالخلافہ نہیں ہے لیکن وہاں ہی ڈپٹی کمشنر رہتا ہے..... سول سرجن ہاؤس' سینما گھر' ہائی سکول بھی وہیں ہیں۔ وہ کوئی اجاڑ برباد قسم کا شہر نہیں ہے۔ پکی سڑکیں' بجلی' پانی ہر قسم کی سہولت ہے..... میں نے معلوم کر لیا ہے ہمارے گھر سے کوتوالی بازار بھی کچھ ایسا دور نہیں..... تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی..... مسلم آبادی اگرچہ کم ہے لیکن یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ بھیڈی خانے کی جانب کچھ مسلم گھرانے ایسے آباد ہیں جن سے بہت جلد تمہاری دوستی ہو جائے گی.....''

ساجدہ گم سم تھی۔ بھاری جسم اور سفید جلد کی ساجدہ نئی رُت میں اپنوں سے بچھڑ کر چڑھائیوں کے سفر میں اسے ساری زندگی ہی رائیگاں نظر آئی۔ ڈاکٹر صاحب پہلے جھنگ میں ملازم رہے پھر پچھلے پانچ سال امرتسر میں سول سرجن تھے..... ساجدہ نے ڈپٹی کمشنر کی بیگم' آئی جی پولیس کی شریمتی جی' لیڈی ڈاکٹر' ہیڈ مسٹریس اور شہر کی چند معزز خواتین کے ساتھ مل کر ایک کلب کھول رکھی تھی..... یہاں وہ اپنے دونوں بچے لے کر ہر شام چلی جاتی اور ڈاکٹر صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر ملکی سیاست پر باتیں کرتے رہتے تھے.....

ایک دھچکے کے ساتھ بس رُکی اور سواریاں اتر کر چھوٹے سے پہاڑی کھوکھے سے چائے پینے لگیں۔ سڑک کی گولائی پر یہاں چھوٹا سا بازار تھا۔ سڑک پر پہاڑی چشمے کا پانی پھوار ڈال رہا تھا اور ہیچ اں پر سیلن' ٹھنڈک اور ایک باسی پن تھا۔ یہاں چائے کو پھونکیں مار کر ٹھنڈا کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ چشمے سے آنے والی ہلکی ہوا کے جھونکے کے ساتھ ہر چائے کا کپ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ سارا بازار قریب قریب سُونا اور بے آباد تھا۔ دُکانوں کے اندر بڑی کم مالیت کا سامان اور بڑے ہی کم زخوں کی چیزیں دھری تھیں..... ساجدہ نے دل میں سوچا' پتہ نہیں ان پہاڑوں میں لوگ کیسے جیتے ہیں؟ جہاں نہ چیزیں خشک ہیں نہ آوازیں اونچی' ڈھلی ڈھلی مری آوازیں ہیں..... یہاں تو چائے بھی ایسے لگتی ہے جیسے کئی دن پہلے بنائی گئی ہو۔ ساجدہ نے اپنے اردگرد شال کو اور بڑی سختی سے لپیٹا اور عینک پر گرے آنسو کو گرم شال سے پونچھنے لگی۔

"دیکھو بچے کتنے خوش ہیں۔ ان کا دل یہاں خوب لگے گا....."

کھڈ کی جانب بنی منڈیر پر دونوں بچے بیٹھے نیچے کی طرف بہنے والے چشمے کو دیکھ رہے تھے اور پکوڑے کھانے میں مشغول تھے۔ انہیں ایک چھوٹی سی تتلی کی اڑانوں نے مسحور کر رکھا تھا۔ چشمے کے ساتھ اُگے ہوئے چھوٹے چھوٹے پودوں پر یہ تتلی نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔

ڈاکٹر سرفراز مغل عجیب قسم کی خفت محسوس کر رہا تھا۔ اپنی بیوی کا دل لگانے کے لیے اتنی باتیں آج تک اس نے کبھی نہ کی تھیں۔

"دیکھو ساجدہ! کانگڑہ کی بہت پرانی تہذیب ہے۔ یہ علاقہ اپنی جغرافیائی نوعیت کی وجہ سے قریب قریب ناقابلِ تسخیر رہا ہے۔ اس علاقے میں زیادہ تر راجپوت لوگ آباد ہیں۔ ان کے خاندان صدیوں سے یہاں رہتے ہیں۔ اب تو ان میں زیادہ تر کھیتی باڑی کرتے ہیں لیکن مغلوں کے زمانے میں یہاں ٹھاکر اور رانے مونچھوں پر تاؤ دے کر پھرا کرتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے راجواڑوں کے رانے راجا کہلاتے تھے۔ منڈی سوکیت' کلو' ترلوک ناتھ' سانگراؤں کے رانے بہت مشہور ہیں۔ ان کے ولی عہد آج بھی ٹکا کہلاتے ہیں اور جب بھی کوئی رانا دوسرے رانا سے ملتا ہے تو جیئے دیو کہتا ہے..... گو اب صرف رام رام کہنے کا رواج عام ہو رہا ہے۔"

ساجدہ کو پرانی تہذیب میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ اگر آبادی اسی طرح کم ہوتی گئی تو اس کا کیا بنے گا؟ شام گئے وہ کیا کرے گی؟

ڈاکٹر سرفراز کہتا گیا.....

"چمبہ کے ایک رجواڑے پانگی میں بیچو نالہ بہتا ہے۔ اس چشمے کے کنارے ایک کتبہ لگا ہے جس پر راجہ للت ورما کے نام کی تختی لگی ہے۔ اس خاندان کا آخری راجہ رانا بھاگ تھا۔ یہ راجپوت بڑی شان بان اور آن والا تھا اور اردگرد کے رانا اور ٹھاکر اس سے خوفزدہ تھے۔ کچھ راجواڑوں کے رانا باہم مل گئے اور ایک برہمن سبہ نامی کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ رانا بھاگ کو ختم کر دے۔ برہمن سبہ نے رشوت میں بھاری رقم وصول کی اور چونکہ رانا بھاگ کو اس پر کلی اعتماد تھا' اس لیے اس نے پانگی کے رانے کو اپنے گھر مدعو کیا۔

اب یہاں سے لیڈی میکبتھ کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ برہمن کی بیوی نے بھاگ رانا کو ختم کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔

جب رانا کھانا کھانے میں اور باہمنی کھانا پروسنے میں مگن تھی ۔ برہمن زادی نے خنجر کا ایسا بھرپور وار کیا کہ رانا بھاگ جو بڑا جابر مشہور تھا' بلبلاتا ہوا برہمن کے گھر سے بھاگا..... ہیلور کے مقام پر رانا بھاگ کو اپنی بیوی مل گئی ۔ اس نے یہ خنجر سینے سے نکالا ۔ رانا بھاگ نے کچھ پانی پیا اور ایک پتھر پر لیٹ کر اپنی جان دے دی..... ابھی تک ہیلور میں یہ پتھر موجود ہے اور مقامی لوگ اسے دکھاتے ہیں ۔ رانا بھاگ کے وارث اب کھیتی باڑی کرتے ہیں اور سالمی میں رہتے ہیں۔'' ساجدہ! یہ جو ہم سمجھتے ہیں کہ عورت ظالم نہیں ہوتی' کسی کو مار نہیں سکتی تو ہسٹری میں تو کئی لیڈی میکبتھیں ملتی ہیں ۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

ٹھنڈے پکوڑے کو بنچ پتھر کی بنچ کے نیچے پھینک کر ساجدہ نے اوپر چڑھتے بادلوں کو دیکھا..... فی الحال اسے تپ آ رہی تھی اور اس کا کسی قسم کا بھی کوئی خیال نہ تھا ۔

تین دن پہلے ڈاکٹر سرفراز نے چالیسویں سال میں قدم رکھا ۔ پچھلے سال جب اس نے اپنی بیٹی راحیلہ کی گیارہویں سالگرہ منائی تو یکدم اس کے دل میں احساس جاگا کہ اب وہ امرتسر میں نہیں رہ سکے گا ۔ وہ جب ویانا میں پڑھتا تھا تو اس نے دل میں تہیہ کیا تھا کہ وہ ساری عمر پہاڑوں پر رہے گا اور انسان دوستی اس کا شعار ہوگی ۔ اس میں شاید جلال الدین اکبر کی روح تھی ۔ وہ سمجھتا تھا کہ ماتھے پر قشقہ کھینچے اور گرو تمام مذاہب کے دانشور اکٹھے کر کے اگر راجپوت مہارانیاں گھر بسالی جائیں تو ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں کوئی شے حائل نہیں ہو سکتی..... ڈاکٹر تو وہ پیدائشی تھا لیکن زندگی فقط علاج طلب نہ تھی ۔ اس کے کچھ اور بھی تقاضے تھے ۔ امرتسر میں اس کے اندر اور باہر بڑے اختلافات جنم لینے لگے تھے ۔ ڈاکٹر سرفراز چونکہ ساری عمر مریضوں میں رہا اور علاج ہی کرتا رہا ۔ اس لیے اس نے سوچا کہ شاید اندر کی بے چینی پہاڑوں سے دوری ہے ۔ نیچر سے علیحدگی ہے ۔ وہ پہاڑ جن سے دور نہ رہنے کی قسم اس نے ویانا میں کھائی تھی..... لیکن اس بے چینی کو ابھارنے اور اختلافات پر بھرپور روشنی ڈالنے والے دادا ابا کو وہ پہاڑوں پر بھی ساتھ لے گیا ۔ جس قدر ڈاکٹر سرفراز لبرل ہونے کی کوشش کرتا ۔ انسان دوستی کو شرف سمجھتا' صلح کل ہوتا اسی قدر بڑے ابا اس کے دل میں شک و شبہ کے بیج بوتے ۔

بڑے ابا دین الٰہی کے حق میں نہ تھے ۔ ان کے نزدیک وفاداری کی ایک ہی شرط تھی اور وہ استواری تھی ۔ وہ کہا کرتے..... '' سرفراز! انسان سے نفرت واقعی جائز نہیں..... لیکن اپنے مسلک کو چھوڑنا بھی رواداری نہیں ہے ۔ انسان اپنے مذہب سے کٹ کر' اپنے ماحول سے بیگانہ ہو کر' دوسروں کو اپنوں پر ترجیح دے کر بے انصافی کا مرتکب ہوتا ہے ۔ جس کو تم تعصب کہتے ہو' یہ تحفظ کا دوسرا نام ہے ۔ تم موقع دیتے ہو لیکن زبان سے..... ایک دن تم سمجھو گے جو انسان اپنے وطن سے محبت کیے بغیر اپنے مذہب سے گھبرا کر' محسوس کیے بنا' مسلے رٹی کو سمجھے بغیر اپنوں کو تحفظ نہ دیتے ہوئے انسان دوست بن جاتا ہے' جو مرکز کے بغیر دائرے میں گھومنا شروع کر دیتا ہے' وہ عموماً دھوبی کے کتے کی زندگی بسر کرتا ہے ۔ پھر نہ وہ گھر کا ہوتا ہے نہ گھاٹ کا..... اس سے کسی کا بھلا ہوتا ہے نہ اپنا ۔ عہد ضروری ہے' عہد زندگی کی اولین شرط ہے ۔''

ڈاکٹر سرفراز برہم ہو کر جواب دیتے..... '' اباجی..... مذہب کے نام پر جس قدر مظالم ہوئے ہیں ۔ اتنے مظالم تو وحشی درندوں نے بھی نہ کیے ہوں گے ۔ خون کی ندیاں بہی ہیں مذہب کے نام پر..... کیا یہ ضروری ہے کہ ہم مذہب کی تلوار کو ہمیشہ اختلاف کی نیام میں رکھیں؟ کیا انسانیت کے لیے انسان پرستی کافی نہیں..... چلیے آپ مذہب ضرور رکھنا چاہتے ہیں تو کیا رواداری بہتر علاج نہیں ۔ آپ رام رام کہیے' مجھے بھی نمس تمس کی اجازت ہونی چاہیے.....''

"میں تمہیں میں میں کی اجازت اسی وقت دے سکتا ہوں اگر میری رام رام میں خلل واقع نہ ہو ورنہ تم صرف دل میں میں میں کیا کرو......"

"ابا! آپ رتی بھر فراخ دل نہیں ہیں۔ چہرے پر اتنی بڑی محراب پڑی ہے۔ اسلام کا اتنا دم بھرتے ہیں اور کسی اور کو سوچنے کا موقع نہیں دیتے...... سنا ہے اسلام دین میں اکراہ کی اجازت نہیں دیتا۔"

"میں موقعہ دیتا ہوں لیکن دل میں...... تم میاں! جو کچھ سوچتے ہو دل میں سوچو...... بچوں پر ایسی باتوں کا غلط اثر پڑتا ہے۔ تم دل میں دہریے رہو مجھے کوئی اعتراض نہیں......"

"لیکن اباجی! یہ آپ کی بے انصافی ہے' میں دہریہ نہیں ہوں......"

"سرفراز...... جس کی سرحدیں اس قدر کھلی ہوں...... جو انسان دوستی میں یوں بڑھا ہوا ہو کہ اپنے پرائے کی تخصیص نہ ہو وہ ہمیشہ دہریہ ہوتا ہے...... ہم بھی علی گڑھ میں پڑھے' پر اس قدر اسلام سے دور نہ ہوئے۔"

"اباجی!......"

"ویسے بھی میں نے تم میں مسلمان ہونے کے کوئی آثار نہیں دیکھے......"

اس طرح کی لاتعداد بحثیں ہوا کرتی تھیں لیکن جب سے ڈاکٹر سرفراز کو اپنی تبدیلی کا سرکاری لفافہ ملا تھا۔ اس نے اپنے والد سے بحث مباحثہ چھوڑ دیا تھا۔ اس کے دل میں ایک عجیب سی خوشی تھی۔ کسی خواب کو پا لینے کی امید...... جس وقت ڈاکٹر سرفراز کو تبدیلی کا پروانہ ملا۔ وہ گولڈن ٹیمپل کے آگے سورن سنگھ سے باتیں کر رہا تھا۔ سورن سنگھ امرتسر کے ہر مندر کے آگے کنگھیاں بیچا کرتا تھا۔ اس کے پاس لمبی صندلی کنگھیاں' ہاتھی کی کمر جیسی گول اور آبنوسی دستوں جڑی کنگھیوں کا ایک بکسا تھا جس میں سے اس نے ایک لمبی موتیوں جڑی کنگھی ڈاکٹر سرفراز کو بھی دی تھی۔ اس وقت سورن سنگھ ڈاکٹر صاحب کو اپنی طبیعت کا بتا رہا تھا۔ چپڑاسی نے آ کر خاکی لفافہ پکڑایا۔

"مہاراج پیٹ کا اپھارہ تو ٹھیک ہو گیا' پر جی کھانے کو جی نہیں چاہتا۔"

سورن سنگھ کے مضبوط کندھے پر ہاتھ رکھ کر ڈاکٹر سرفراز نے کہا...... "رفتہ رفتہ کھانے پر بھی طبیعت مائل ہو جائے گی' فکر نہ کرو......"

"ہرورش کور کا دودھ پھر کم ہو گیا ہے مہاراج۔ ساری رات کلونتا روتا رہتا ہے......" سورن سنگھ نے ہاتھ باندھ لیے۔

"سردارنی کو دودھ پلاؤ' دہی ہونے کی کھیر کھلاؤ۔ وہ تگڑی ہو گئی تو کلونتا خود ہی پیٹ بھرے گا......"

"ہاں جی یہی میری ماں بھی کہتی ہے...... ان عورتوں کو عقل مت نہیں ہوتی پر کہتی یہ ٹھیک ہیں۔"

جب ڈاکٹر سرفراز آگے بڑھنے لگا تو سورن نے بڑے سیدھے لہجے میں پوچھا...... "ڈاکٹر صاب! خیریت کا خط ہے ناں...... کوئی بچھڑنے کی بات تو نہیں؟"

"ہاں خیریت کا خط ہی ہے۔ میری تبدیلی ہو گئی ہے......"

"کہاں کی [illegible]؟"

''پہاڑوں کی.....''

سورن سنگھ نے سر جھکالیا۔ جیسے اسے کنگھیوں کے بیوپار میں گھاٹا پڑ گیا ہو۔ ڈاکٹر سرفراز مغل نے نگاہیں اٹھا کر ہرمندر کے سنہیلے عکس کو دیکھا۔ اس میں لاکھوں یاتری جوتیاں اتار کر خاص قسم کی لمبی جرابیں پہن کر اندر جاتے ہیں۔ سکھ یاتری عموماً ننگے پاؤں ہی اندر جایا کرتے لیکن مسلمانوں کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ یکدم ڈاکٹر سرفراز کو تعجب ہوا کہ اتنے سال ہرمندر کے پاس رہنے کے باوجود وہ کبھی اندر نہ گیا تھا.....

''کیا سوچ رہے ہیں مہاراج.....'' سورن سنگھ نے پوچھا.....

''کچھ نہیں کچھ نہیں..... بس یہ مذہب کے اجارہ دار کچھ اچھا نہیں کرتے..... خواہ مخواہ انسان پر دروازے بند کر دیتے ہیں۔''

شام کو جب آنگن میں بورے کی انگیٹھی پر کشمیری چائے پک رہی تھی تب ڈاکٹر سرفراز نے اپنی تبدیلی کا ذکر سب سے کیا..... اس تبدیلی پر بہت لے دے ہوئی۔

دادا ابا نے پہلا سوال کیا..... ''آبادی کتنی ہے وہاں کی؟.....''

''کچھ کہتے ہیں آٹھ ہزار ہے۔ کچھ کہتے ہیں پانچ کے قریب ہوگی.....''

''اور مسلمان کتنے ہیں؟''

اب ڈاکٹر سرفراز مغل سٹپٹا گیا..... وہ صرف انسان پرست تھا۔ اس نے علی گڑھ میں نہیں ویانا میں ڈاکٹری کی تعلیم ختم کی تھی۔

''آپ کو تو بس مسلمانوں کی پڑی رہتی ہے۔ ہوں یا نہ ہوں' ہمیں اس سے مطلب؟''

بڑے ابا اس بیان پر بہت حیران ہوئے۔ پہلے انہوں نے سرفراز کو دو تین مرتبہ یوں دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ پھر کڑک کر بولے..... ''کیا مطلب؟ ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ پیدائش سے لے کر لحد تک مطلب ہوتا ہے۔ جو وہاں عیدگاہ ہی نہ ہوئی تو عید پڑھنے کہاں جائیں گے؟ جو وہاں کوئی کلمہ گو ہی نہ ہو تو ہمارا بھائی چارہ کس سے ہوگا؟ راحیلہ' شوکت کس سے کھیلیں گے' تمہاری بیوی کا کیا بنے گا؟''

''اگر ایسا ہی آپ کو خیال ہے تو آپ یہاں رہ جائیے امرتسر میں۔''

''خیر یہ تو تم جانتے ہو سرفراز بیٹا! میں اکیلا یہاں نہ رہ پاؤں گا..... اب میری زندگی میں تمہارے بچوں کے علاوہ اور کچھ باقی نہیں رہا..... اللہ لے جانے سے پہلے سارے ابرن اتار لیتا ہے۔''

''تو پھر بوریا بستر باندھ لیجیے۔ کچھ مسلمان وہاں بدقسمتی سے ضرور مل جائیں گے۔''

دادا ابا نے اپنے سفید ابرو چڑھائے لیکن خاموش رہے۔ انہیں معلوم تھا کہ سرفراز مغل ایک حد تک ان کے ساتھ چل سکتا ہے۔ بڑے ابا کے بعد امی کی باری تھی۔ یہاں امرتسر میں ایک لمبی چوڑی کلچرل لائف تھی۔ گل گلے کلچے' کشمیریوں کے کھانے' عورتوں کا کمپنی باغ تھا۔ عید' شب برات' میلاد' محرم سب تہوار زندہ تھے۔ گھروں میں عید کریمہ ہوتا تو سوا لاکھ کھجوری گٹھلیاں فٹ پڑھی جاتیں..... ایک گھر میں میلاد ہوتا تو ساری گلی میں اگربتی' گلاب کے عرق کی خوشبو پھیل جاتی۔

"کیسی جگہ ہے جی.....؟"

امی ساجدہ نے اپنے آنسو روکتے ہوئے پوچھا..... "بہت اچھی جگہ ہے۔ کہتے ہیں کانگڑہ ویلی سوئٹزرلینڈ سے بھی خوبصورت ہے۔ وہاں سے دھولی دھار نظر آتا ہے۔"

ساجدہ کو دھولی دھار سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

"اور.....اور ڈاکٹر صاحب۔"

"اور وہاں.....اتنی بارش ہوتی ہے اتنی بارش ہوتی ہے کہ پندرہ پندرہ دن سورج نظر نہیں آتا۔ چراپونجی کے بعد دھرمسالہ کا نمبر آتا ہے بارش میں۔"

اب تو ساجدہ امی کا دل اور بھی بجھ گیا۔

"سارا علاقہ خوبصورت ہے' تم فکر نہ کرو۔ لمبی سیروں کو جایا کریں گے.....تنہائی ہو تو فیملی لائف بہتر ہو جاتی ہے۔ آدمی ڈھنگ کے کام کرنے لگتا ہے۔"

ساجدہ امی چپ ہو گئی۔ ساری عمر ڈاکٹر سرفراز مغل نے ہسپتال اور انسان دوستی میں کاٹنے تھے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ گھر پر اور گھر والوں کی زندگی کیسی ہے اور وہ اپنے شب و روز کیسے بسر کرتے ہیں۔ اس وعدۂ فردا سے ساجدہ امی کا دل اور بھی بجھ سا گیا۔

دونوں بچے شام سے اضطراب کا شکار تھے۔ وہ نہ تین میں تھے نہ تیرہ میں لیکن جب خاطر خواہ خاموشی ہو گئی تو انہوں نے بڑی خوشی سے سوال کیا۔ "ابو جی ٹرین کا سفر ہو گا ناں۔"

"ہاں بھئی پٹھان کوٹ تک تو ٹرین میں ہی جائیں گے....."

"پھر وہاں سے!.....وہاں سے ابا جی؟"

ساجدہ نے گھور کر بچوں کو دیکھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ راحیلہ اور شوکت سفر کے نام پر اس قدر خوش کیوں ہیں.....بھلا سب سے بچھڑ کر زندگی بسر کیونکر ہو گی۔

"وہاں سے بس لیں گے.....سرین بس.....بڑی اچھی سروس ہے دھرمسالہ' اپر دھرمسالہ' نگروٹہ' کانگڑہ' پالم پور' کلو ہر طرف سرین والوں کی بسیں چلتی ہیں۔ میں نے معلوم کر لیا ہے....."

"ہائے توبہ....." ساجدہ نے جھڑکا۔

لیکن اس کے باوجود بچے اپنے اندر نئے سفر کی تیاری کرتے رہے۔ بچے آزاد تھے۔ ان پر کسی قسم کی ذمہ داری نہ تھی اور جب انسان پر کسی قسم کی ذمہ داری نہ ہو تو وہ خوش رہتا ہے۔ سفر میں بھی اور حضر میں بھی.....

☆☆☆

بس کوتوالی بازار میں اڈے پر رکی تو سب سے پہلے ٹھاکر چندر سین سے ڈاکٹر سرفراز کی ملاقات ہوئی۔ ٹھاکر صاحب سی ایل مہرہ کی فیشنی دوکان میں کھڑے تھے۔ بس رکتے دیکھ کر اس نے کوتوالی بازار کی سڑک کراس کی اور اڈے پر آ گیا۔ فرنٹ سیٹ کے پیچھے بڑے ابا اداس سی نظروں سے پہاڑی بازار کو دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے جس شہ

میں مسلمانوں کی کل آبادی دو سو بائیس ہے۔ وہاں ہم لوگ کیسے خوش رہ سکتے ہیں۔

جب ڈاکٹر سرفراز فرنٹ سیٹ کا چوں چراں کرتا دروازہ کھول کر باہر نکلا تو ٹھاکر سڑک کراس کر چکے تھے۔ کھدر کا اچکن نما کُرتا' نیچے دھوتی' پاؤں میں بند جوتی' کندھے پر تہہ کی ہوئی گرم پشمینے کی چادر' نہرو جیکٹ اور کیپ اور گول چہرے پر گول عینک..... ٹھاکر چندر سین اور ڈاکٹر سرفراز کی محبت پہلی نظر کی تھی۔

مقناطیس اور لوہا ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔

ٹھاکر نے ہاتھ جوڑ کر کہا..... "مہاراج آداب! آپ ڈاکٹر سرفراز ہیں؟"

سرفراز نے اپنا تعارف کرایا تو ٹھاکر چندر سین بولا..... "پندرہ دن ہوئے ڈاکٹر ڈگل کا خط مجھے ملا تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ آپ کو ہسپتال کے پاس ہی کوٹھی تلاش کر دوں کیونکہ آپ سول سرجن ہاؤس میں رہنا نہیں چاہتے لیکن وہاں تو قینچی موڑ تک کوئی ایسی کوٹھی ہی نہیں جو کرائے پر ہو۔ بھگوان کی کرپا سے کل ہی پائین والا خالی ہوا ہے۔ ساتھ ساتھ تین کوٹھیاں ہیں۔ روز کاٹیج' سنی ہاؤس اور پائین والا..... آپ کا سیوک سنی ہاؤس میں رہتا ہے۔ من چاہے تو آپ ہمارے پڑوسی ہی بن رہیے..... تینوں کوٹھیوں کا ڈنگا ایک ہے۔ سڑک ایک ہے۔ ویسے اور کوئی چیز سانجھی نہیں۔" دونوں بے ساختہ ہنس دیئے۔

امی سفر سے نڈھال تھیں۔ بڑے ابا کھوں کھوں کر کے ہلکا ہلکا کھانستے سب سے الگ تھلگ چل رہے تھے۔

کوتوالی بازار ختم ہوتے ہی یہ سڑک تین حصوں میں بٹ گئی۔ ایک پکی سڑک تو اپر دھر مسالہ کو جاتی ہے اور ایک طرح سے اس کی حیثیت جرنیلی سڑک کی تھی۔ اس پر ڈوگرا فوجوں سے لدے پھندے ٹرک اور انگریز بٹالین مارچ کرتی اپر دھر مسالہ کو جاتی نظر آتی تھی۔ سڑک کے ترشول کا دوسرا راستہ سینما گھر کے اوپر سے ہو کر گھنیارا کی طرف جاتا۔ اسی سڑک کے کنارے شمشان بھومی بھی تھی۔ جب کوئی ہندو فوت ہو جاتا تو ارتھی اٹھائے رام نام ست ہے کہتے لوگ گھنیارا روڈ پر چلتے نظر آتے تھے۔

تیسری پکی سڑک یکدم چڑھائی چڑھتی تھی اور اس کا نام میکلیوڈ روڈ تھا۔ یہ سڑک کوتوالی بازار سے سیدھی مانگ کی طرح نکلتی تھی۔ اس کے ایک جانب نشیب میں گھنیارا روڈ نظر آتی اور دوسری طرف جنگل سے اٹا ہوا پہاڑ اور سڑک کے ساتھ ساتھ بہنے والی کُول تھی۔ اس چشمے میں سارا سال شفاف پانی بہتا رہتا۔ اس سڑک کے کنارے چیپ ہاؤس' ڈی سی کی کوٹھی اور زنانہ کلب کے علاوہ وہ تین کوٹھیاں بھی تھیں جن کا ذکر ٹھاکر چندر سین نے کیا تھا۔ پانچ گدی پیٹھ پر سامان لادے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور بالکل خاموش تھے..... گدی لوگ سنتے زیادہ اور بولتے کم تھے۔

پائین والا روز کاٹیج اور سنی ہاؤس سے پہلے آتا تھا۔ اس کی چھت دھلی دھلائی سلیٹوں کی بنی تھی۔ گھر کے ساتھ ہی قینچھ کے درختوں کا جنگل تھا جو اس وقت آڑو کے پھولوں کی طرح سفید شگوفوں سے لدے ہوئے تھے۔

گھر کا بڑا دروازہ کھول کر ٹھاکر جی بولے..... "مہاراج! ادھر مسلمانوں کا کوئی خاندان نہیں۔ بھیڈی خانے میں کچھ خاندان اور اپر دھر مسالہ میں بھی کچھ مسلمان آباد ہیں۔ پر آپ فکر نہ کریں۔ ہم اچھے ہمسائے ہیں۔ آپ کو ہم سے کوئی شکایت نہ ہوگی..... ہم ہندو ضرور ہیں لیکن لبرل ہندو۔"

دادا ابا کچھ کہنے والے تھے لیکن ڈاکٹر سرفراز نے کھانس کر انہیں خاموش کرا دیا۔

گدی مزدوروں نے سامان برآمدے میں اتارنا شروع کیا۔ امی ایک بستر بند پر بیٹھ کر پائین ولا کو دیکھنے لگی۔ دادا ابا' راحیلہ اور شوکت کو لے کر ڈنگے کی طرف چلے گئے۔

ٹھاکر نے کہا..... "مہاراج! میں تو بالکل کٹر نہیں ہوں۔ ماس بھی کھا لیتا ہوں۔ گنڈا پیاز بھی بھلا لگتا ہے لیکن میری استری وشنو ہے.....اور آپ کو پتہ ہے استری کو منانا کچھ آسان کام نہیں۔"

ڈاکٹر سرفراز میں جلال الدین اکبری روح' برٹرینڈ رسل کے خواب' لوئی پاسچر کا جذبہ اور لنکن کی رواداری تھی۔ اس کا خیال تھا کہ غار میں بسنے والوں سے لے کر نیویارک کے سکائی سکیپر میں رہنے والوں تک میں کوئی ایسی ایک خوبی موجود تھی جس نے ساری بنی نوع انسان کو ایک رسی میں پرو رکھا تھا۔ یہ خوبی ایٹمی قوت سے مشابہ تھی۔ یہ ساری دنیا کو توڑ بھی سکتی تھی اور جوڑ بھی سکتی تھی۔ ابھی تک اس رسی اور خوبی کا پتہ نہیں چل سکا تھا۔ گو پیغمبروں نے اس کا نام محبت تجویز کیا لیکن ڈاکٹر سرفراز کا خیال تھا کہ ابھی اس دھاگے کا صحیح طور پر سراغ نہ ملا تھا۔ اسی لیے اختلاف نے اس قدر افراتفری مچا رکھی تھی۔

"کھانا پینا تو ذاتی پسند کا معاملہ ہے ٹھاکر جی..... آج کل تو ہر ملک' ہر مذہب میں ویجی ٹیرین لوگ موجود ہیں۔ اس میں گھبرانے کی کیا بات؟"

ٹھاکر بڑے دھیرج سے مسکرائے اور بولے..... "یہ تو ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! پر تو ایک بات میں ضرور کہوں گا کہ استریوں کے من میں کرودھ بہت ہوتا ہے.....تلوار طمنچہ تو ناری نہیں پکڑتی۔ پر بھیتر میں بہت کٹر ہوتی ہے.....کوئی دھرم کے پالن میں ماس کھانا چھوڑ دے تو اور بات ہے۔ پر جب کرودھ' دھتائی یا ضد سے ایسا کرے تو پھر بھلا نہیں ہوتا۔ نہ اپنا نہ دوسروں کا....."

ڈاکٹر سرفراز نے محسوس کیا کہ وہ اور ٹھاکر چندر سین جلدی سے ایک دوسرے کی طرف سفر کر رہے ہیں۔

"کبھی آپ نے دیکھا کہ ناری کے من میں اشانتی بہت ہے۔ اسی لیے یہ کسی سے پریم کرے تو ٹھیک رہتی ہے ورنہ جو پریم نہ ہو تو سوچتی سمجھتی کچھ نہیں۔ بڑے کشٹ اٹھائے گی پریم کی چنتا میں' پریم کی خاطر ستی ہو جائے گی..... جہاں پریم نہ ہوگا وہاں اشانت ہو جائے گی۔ خود بھی اشانت رہے گی اور دوجے کو بھی اشانتی دے گی۔ کبھی ماں کے روپ میں دیکھیے اسے پریم ہوتا ہے اپنے بچوں سے تو کیا کچھ نہیں کرتی.....اور دیکھیے اسے سوتیلی ماں کے روپ میں کٹھورتا اور انیائے کی تصویر ہوتی ہے..... اسی لیے تو مہاراج یہ دوواں نہیں ہوتی..... آپ کی دھرم پتنی جی کو میری گاکری سے مل کر خوشی نہ ہوئی تو یہی وجہ ہوگی۔ پریم کے بنا دونوں استریاں ایک دوجے کو سمجھ نہ پائیں گی جیسا کہ ہم دونوں میں ممکن ہے۔ ہم میں پریم ہو نہ ہو ہم ایک دوجے کو سمجھ جائیں گے۔"

ڈاکٹر سرفراز نے ٹھاکر چندر سین کی جانب دیکھا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے محبت نہ کرتے ہوئے بھی باہمی رضامندی سے ایک دوسرے کو قبول کر لیا تھا۔ اب بڑے ابا کو چھوڑ کر دونوں بچے ادھر بھاگ آئے۔

"انکل وہاں چیری کا بوٹا لگا ہے.....لگا ہے ناں دیکھیے....."

ٹھاکر نے گردن گھما کر دیکھا۔ جنگلی چیری جسے مقامی لوگ بیٹے کہتے تھے' گہنے کی طرح پھل سے لدی تھی۔

سب آگے پیچھے چڑھائی چڑھ رہے تھے۔

ٹھاکر نے پوچھا..... "کیا نام ہے تمہارا؟....."

"راحیلہ.....راحیلہ مغل....."

"اور تمہارا بیٹے....."

شوکت نے ذرا ساتن کر کہا..... "شوکت سرفراز مغل۔"

"او ہو نام تو آپ نے ڈاکٹر صاحب بڑے مشکل رکھے ہیں بھئی۔ ہماری تو زبان ہی بل کھا جائے گی ان کو لیتے لیتے۔"

بڑے ابا بھی آہستہ آہستہ سرک آئے تھے۔ "نام بامعنی ہونا چاہیے ٹھاکر جی.....اور صوتی اعتبار سے بھی مانوس لگے تو بات بنتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ نام میں عوامی رنگ نہ ہو..... جب ہرایرے غیرے کا ایک ہی نام ہو تو بچے کو شروع سے غیر اہم ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔"

ڈاکٹر سرفراز نے ترچھی نظروں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ اسے گھر ان دیکھے ہی پسند آ چکا تھا۔

"کرایہ کتنا ہے؟"

"پہلے اس میں انکم ٹیکس آفیسر رہتا تھا۔ وہ تو تیس روپے دیتا تھا لیکن اب مالک مکان کہہ رہا ہے کہ وہ چالیس سے کم نہیں لے گا۔"

"دیکھ لو سرفراز پھر....." دادا ابا چڑ کر بولے۔

"سامنے کا منظر ہی چالیس روپے ماہوار کا ہے۔ دھولی دھار نظر آتا ہے۔ سامنے دو ناور ہیں۔ پیچھے دو بیڈ روم' ڈرائنگ روم' ڈائننگ روم.....گودام' باورچی خانہ' برآمدہ....."

ڈاکٹر سرفراز نے اپنی نگاہ ڈھلنے سے نیچے ڈالی۔ ترائی میں گھنیارا کی سڑک سنسان پڑی تھی۔ اس سے پرے دور تک وادی پر ایک نیلی سی ردا یوں تعطل سے رکی ہوئی تھی جیسے بادلوں کے ہاتھوں سے نیلی اوڑھنی چھوٹ گئی ہو اور سارا منظر شل ہو کر تصویر میں منجمد ہو جائے۔

☆☆☆

ہمالیہ کے شمال میں جغرافیائی ضرورتوں کے تحت ریاستوں اور راجواڑوں کی ایک کائنات آباد تھی۔ مغرب میں کشمیر' وسط میں ڈوگر یا جموں کی ریاستیں تھیں' جو بہت سے چھوٹے چھوٹے راجواڑوں کا مجموعہ تھیں۔ کشمیر کا علاقہ دریائے سندھ اور جہلم کے درمیان تھا۔ جہلم اور راوی کے درمیان کی ریاستیں جموں کی تھیں۔ راوی اور ستلج کے درمیان کی قدرتی بانٹ کا نام جالندھر ترگارتا یا کانگڑہ کہلاتا تھا۔ یہ بانٹ پندرہویں صدی تک موجود تھی۔ کلو کا علاقہ ترگارتا سے علیحدہ تھا لیکن کانگڑہ کی ریاست میں ہی شمار ہوتا تھا۔ کانگڑہ کی ریاست تمام شمالی ریاستوں سے پرانی ہے اور قبل مسیح میں بھی اس کی تہذیبی حیثیت اور ریاستی خودمختاری کا سراغ ملتا ہے۔ کانگڑہ کا دارالخلافہ نگر کوٹ کہلاتا تھا اور کلو کا صدر مقام نگر تھا۔ محسوس ہوتا ہے کہ پراچین زمانے میں شہروں کو نگری بلایا جاتا رہا۔ مغلیہ عہد تک کانگڑہ' کولز' کوٹلہ' جسوان' سیبا' داتا پور' نور پور' چمبہ

سوکیت' منڈی' کلو' کھلیر' بنگاہال تمام تر ی گارتا ہی کی ریاستیں تھیں اور ان میں کٹوچ' جسوال' سوکیتا' بنگاہالیہ' دوال' گولیر اور اسی نوعیت کے راجپوت آباد تھے۔ صرف ایک شاہ پور کی ریاست ایسی تھی جو مغلیہ دور میں عروج کو پہنچی اور اس میں پٹھانیا لوگ آباد ہوئے۔

اس ریاست کی تاریخ قبل مسیح سے بھی ملتی ہے۔ اس کی بنیاد راجہ سیرام چندر نے ڈالی اور مہا بھارت میں اس کا ذکر آیا ہے۔ وہ کوروؤں کے ساتھ مل کر پانڈوؤں سے لڑا تھا۔ جب ہوان سیانگ کشمیر سے قنوج کی جانب سفر کر رہا تھا تو وہ راجہ اتیتو کا مہمان رہا۔ محمود غزنوی نے پہلے پہل کانگڑے کے قلعہ کو سر کیا۔ اس کے بعد قلعہ ہاتھ بدلتا رہا۔ کبھی یہ مقامی راجہ کی ملکیت بن جاتا اور کبھی مغلیہ سلطنت کا حصہ لیکن جہانگیر کے عہد حکومت میں یہاں پر باقاعدہ فوج تعینات تھی۔ جب مغلیہ سلطنت کا زوال واقع ہوا تو یہ قلعہ سکھوں نے فتح کر لیا لیکن تین سال کے بعد کانگڑے کے راجہ کو پھر لوٹا دیا۔ 1828ء میں کانگڑہ ریاست کو لاہور کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ مغلیہ عہد حکومت میں یہاں کا دارالخلافہ نداؤں تھا۔ انگریزوں نے جب تک اسے لاہور میں مدغم نہیں کیا' یہی صدر مقام رہا۔ کانگڑہ ریاستوں کی اپنی اپنی تاریخ رہی ہے۔ کبھی یہ کشمیر کا حصہ اور کبھی کانگڑہ کی مرکزی حکومت لیکن زیادہ تر ریاستیں خود مختار بھی رہی ہیں۔ جسوال' گولیر' سیبا اور داتا پور تو مرکزی تر ی گارتا ہی کی شاخیں رہیں۔ گو ان کے راجے راجپوت تھے اور مرکز کا رعب ماننے کو تیار نہ تھے۔ اس طرح منڈی' سوکیت اور چیبہ سکھوں کی دستبرد سے بھی محفوظ رہے اور انگریز کے زمانے میں بھی ان کو ریاستوں کا درجہ حاصل تھا اور ان میں کانگڑہ ریاست کا اہم ترین علاقہ سمجھا جاتا تھا۔

کلو کی ریاست میں بیاس کی ساری شمالی وادی اور لاہول کا علاقہ تھا۔ کلو غالباً مشرقی ریاستوں میں سب سے پرانی تھی۔ وشنو پرانا میں بھی یہاں کے آباد لوگوں کا ذکر ہے اور انہیں اولاتا یا کولاتو کہا جاتا ہے۔ ہوان سیانگ نے بھی اپنے سفرنامے میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اس علاقے کا نام کیولوتو ہے۔ سب سے پہلے یہاں کا دارالخلافہ جگ سکھ کہلاتا تھا۔ پھر نگر میں منتقل ہوا اور آخر میں سلطان پور مقرر ہوا۔ اس علاقے کے حسن کا ذکر رامائن میں بھی آیا ہے۔ نور پور ریاست کا دارالخلافہ ایک وقت میں پٹھان کوٹ ہوا کرتا تھا اور پٹھان کوٹ کا اصلی نام پرتھانہ تھا۔ اسی لیے یہاں کے لوگ آہستہ آہستہ پٹھانیا کہلانے لگے۔ ان کا کوئی تعلق صوبہ سرحد کے پٹھانوں سے نہیں۔ چکی اور راوی کے درمیانی علاقے میں رہنے والے راجہ جگت سنگھ نے اسلام قبول کر لیا اور شاہ پور کی ریاست وقوعہ میں آئی ہے۔ اس میں زیادہ آبادی مسلمان پٹھانیا قوم کی تھی۔

چیبہ ریاست میں سورج بنسی راجپوت آباد تھے لیکن باقی تمام ریاستوں میں چندر بنسی راجاؤں کا راج تھا۔ یہ لوگ اپنے نام کے ساتھ' چندر' دیو' سنیا' ورمن پالا یا سنگھ لگاتے۔ پرانے راجپوت گھرانوں میں جو چوتڑ سے وابستہ تھے' سیہ یا ہی لگانے کا رواج تھا۔ ورمن سے مراد ڈھال ہے اور پالا تحفظ کے معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ دیو یا دیوی کا لفظ بھی اپنے نام کے ساتھ لگانے کا رواج رہا اور جب دو راجے باہم ملتے تو آپس میں جیئے دیو کہہ کر ایک دوسرے کا سواگت کرتے۔ اگر راجوں کا سٹیٹس برابر نہ ہوتا تو عام طور پر رام رام کہہ کر گزر جانے کا رواج تھا۔ ذات پات کی پابندی کا بڑی سختی سے خیال رکھا جاتا تھا اور نیچ ذاتوں کے سواگت کا جواب دینا معیوب بات خیال کی جاتی تھی۔ پرانے زمانے کے کانسی کے

کتبوں پر راجہ کے لیے یوراج کا لقب استعمال ہوتا رہا۔ انگریز کے زمانے تک ریاست کے ولی عہد کا خطاب ٹکا تھا۔ اس سے چھوٹے بھائیوں کو دوتھیاں، ترتھیاں، چوتھیاں وغیرہ لقب دیا جاتا تھا۔ البتہ انگریز کے زمانے میں راجکمار کا لفظ بطور لقب استعمال ہونے لگا۔

شمالی ریاستوں کی بغاوتوں کے پیش نظر جہانگیر نے پنجاب کی شمالی ریاستوں کے بائیس گھرانوں کے شہزادے بطور یرغمال دہلی کے دربار میں رکھے۔ وہ ان شہزادوں کو نظر میں رکھتا تھا اور اس طرح شمالی ریاستوں کو قابو میں رکھنا آسان بھی تھا۔ رفتہ رفتہ ان بائیس گھرانوں کی وجہ سے میاں ایک لقب بن گیا۔ جب راجپوتوں کے یہ گھرانے استداد زمانہ اور مستقل جنگوں کی وجہ سے شہزادے نہ رہے تو یہ لقب بھی راندۂ درگاہ ہو گیا اور پھر عام راجپوتوں کو بھی میاں کہہ کر پکارا جانے لگا۔

جب ابھی راجپوت شہزادوں کی کچھ وقعت تھی اور وہ آن بان اور غیرت کے پتلے تھے۔ تب مغلیہ دور میں ان پر ان شرائط کا اطلاق ہوتا تھا۔ وہ کبھی ہل کو ہاتھ نہ لگائیں۔ اپنی بیٹی کو اپنے سے نیچے گھرانے میں نہ بیاہیں۔ خود بھی ایسے خاندان میں شادی نہ کریں جو حیثیتِ عرفی میں کم ہو اور بیٹی کا رشتہ کرتے وقت کبھی کوئی رقم وصول نہ کریں اور گھرانے کی عورتیں پردے میں رہیں اور عام لوگوں سے تال میل نہ بڑھائیں۔ انگریز کے عہدِ حکومت تک یہ شرائط نرم پڑ چکی تھیں لیکن راجپوت گھرانوں کی عورتوں میں گو برقعے کا رواج نہ تھا لیکن خواتین بھاری چادریں اوڑھتی تھیں اور بازار، عوامی میلے ٹھیلے اور لوگوں سے تال میل میں اجتناب برتتی تھیں۔

ان دشوار گزار پہاڑیوں میں ریاستی جنگیں عام تھیں۔ رجواڑے چھوٹے تھے لیکن جنگوں کا ذکر پہاڑی راجپوت ایسے کرتے تھے گویا کوئی سکندرِ اعظم جنگ لڑ رہا ہو۔ کانگڑہ میں راجہ سنسار چند بہت مشہور ہو گزرا ہے۔ اسی کے ہاتھوں چمبہ کا راجہ راج سنگھ مارا گیا۔ حالانکہ راجہ راج سنگھ بھی اپنے وقت کا رستمِ زماں تھا۔ اسی لیے چمبہ کے لوگ کانگڑہ اور جموں کا نام نہیں لیتے اور ان علاقوں کے ذکر پر لا ملک کہہ کر کرتے ہیں اور نور پور کو سبز والا پکارتے ہیں۔

ہر ریاست کا راجہ مذہبی، ذاتی اور گروہی اقتدار رکھتا تھا۔ کچھ ریاستوں میں راجہ کی پرستش ہوتی تھی لیکن عموماً ریاست خدا کی ملکیت سمجھی جاتی تھی اور وہی اس کا کرتا دھرتا شمار ہوتا۔ راجہ خدا کے نائب کی حیثیت سے ریاست پر حکمرانی کرتا تھا۔ کسی جرم کی پاداش میں وہ حقہ پانی بند کر دیتا۔ ایسے میں کئی غیرت مند خفا کر اور راناجوگ لے لیتے۔ پہاڑوں میں نکل جاتے اور برسوں سمادھی میں بیٹھ کر گیان دھیان میں مصروف رہتے۔ کچھ مجرموں کو معافی مل جاتی۔ ایسے میں برادری میں داخل ہونا مشکل ہوتا۔ پھر دھرم شاستروں کے مطابق برہمن رسومات کرتے اور مجرم دوبارہ اپنے لوگوں میں مل جاتا۔

ریاست کی تمام زمین راجہ کی تھی۔ کھیتی باڑی کرنے والا مالک نہیں فقط وارث تھا۔ تمام ایسی اراضی جس پر کھیتی باڑی نہ ہوتی 'شاملات' کہلاتی۔ ان میں اگر گائے بکریاں چرائی جاتیں، ندیوں میں مچھلی پکڑی جاتی، پہاڑوں سے باز شاہین زیرِ دام لائے جاتے، گھراٹوں پر آٹا پسایا جاتا۔ غرضیکہ چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے جو بھی زمین استعمال کی جاتی راجہ کی ملکیت تصور کی جاتی.....وزیر با تدبیر سے لے کر گاؤں کے نمبردار تک سب راجہ جی کے ملازم تھے اور خود راجہ کو ٹیکس جمع کر کے دیتے تھے۔ کھیتی باڑی نہ کرنے والے لوگ راجہ کے باغیچے رکھتے تھے جنہیں لاہری باسی کہا جاتا تھا۔ یہ بھی

اپنا ٹیکس گاؤں کے نمبردار کے بجائے سید ھا بادشاہ کو ہی ادا کرتے تھے۔ جنگلات کا کچھ حصہ رکھ کہلاتا جس میں شکار کھیلنے کی سہولتیں تھیں۔ شاملات کی کوئی زمین راجہ کے پٹے کے بغیر کھیتی باڑی کے لیے استعمال نہ کی جاسکتی۔ کوئی بھی جاگیر کسی وقت بھی راجہ واپس لے سکتا تھا۔ راجہ کے خلاف کسی قسم کی اپیل نہیں کی جاسکتی تھی۔ کھیتی باڑی کے علاوہ جنگ کے لیے بھرتی اور بیگار بھی رعایا کے فرائض میں شامل تھی۔ راجہ کے نیچے ٹھاکر اور رانا تھے جو اپنی جاگیر راجہ سے لیتے تھے۔ پرانے کانسی اور پیتل کے کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ راجہ کے چاکر کہلاتے تھے اور راجہ کو چرنگزا ادا کرتے تھے۔ چاکری میں فصل کی ادائیگی، لکڑی کی کٹائی، گھاس کھدوائی، شادی بیاہ کی رسومات کے خرچے بھی شامل تھے۔ ان تمام وسائل کے باوجود راجہ کو زیادہ رقم وصول نہیں ہوتی تھی۔ سترہویں صدی میں چمبہ کی آمدنی قریباً چھ لاکھ تھی لیکن چھوٹی ریاستوں میں تو اس سے بہت کم حاصل ہوتا تھا۔ راجہ سنسار چند کا بہت تہلکہ تھا۔ اس کی بہادری اور دولت کے چرچے عام تھے۔ اسے اپنے تمام وسائل سے قریباً پینتیس لاکھ روپیہ آمدن ہوتی تھی۔

راجہ سنسار چند کانگڑہ کا سب سے مشہور نامی گرامی راجہ ہو گزرا ہے۔ اس کا نام مقامی لوک گانوں میں سنا جاتا ہے۔

راجہ سنسار چند کوٹھے تے آؤنا
نبض میری دیکھنا چلتی اے کہ بند

یہ راجہ جری اور بے حد ambitious تھا۔ وہ ایک وشال کانگڑہ دیس بنانا چاہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ راجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں جب یہ تخت پر بیٹھا تو کانگڑے کا قلعہ ایک مغل کے قبضے میں تھا۔ راجہ سنسار چند نے بہت کوشش کی لیکن مغل زادہ وہ پسپا نہ ہو سکا۔ اب راجہ سنسار چند نے ساز باز کر کے سکھ سردار گوربخش سنگھ کے ساتھ مل کر کانگڑے کے قلعے پر چڑھائی کی۔ قلعہ سر ہو گیا۔ مغل منصب دار نے گوربخش سنگھ کے سامنے ہتھیار ڈالے۔ اس بات کا سنسار چند کو دکھ تھا۔

ایک اور بیان کے مطابق کانگڑے کے قلعے کا جب محاصرہ ہوا تو راجہ سنسار چند کی عمر صرف دس برس تھی اور اس کا مغل نواب بوڑھا ہو چکا تھا۔ جے سنگھ نے کانگڑے کا قلعہ فتح کر لیا اور قرین قیاس ہے کہ جوان ہونے پر اردگرد کے راجواڑوں کی مدد لے کر سکھوں سے اس قلعہ کو چھڑایا اور قریباً 166 برس بعد مغلوں کے ہاتھ سے نکل کر راجہ سنسار سنگھ کانگڑے کے تخت و تاج کا وارث ہوا۔ اب تو راجہ جی کی ہر طرف تعریف و توصیف ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ وہ پوری گیارہ ریاستوں کا راجہ بن گیا اور وہ تمام راجواڑے اور زمینیں چھڑا لیں جن سے مغل سلطنت کو آمدن ہوتی تھی۔ وہ قریباً بیس سال، سکھوں اور مغلوں کی مداخلت کے بغیر کانگڑے کا واحد راجہ رہا لیکن جب کامیابی کان میں جاہ طلبی کی بنسری بجاتی ہے تو انسان عقل کی لگام چھوڑ کر سرپٹ گھوڑے دوڑانے لگتا ہے۔ راجہ سنسار چند کے ساتھ بھی ایسے ہی ہوا۔ دھیرے دھیرے وشال کانگڑے کا خواب پھیلنے لگا۔ اب بیس راجواڑے کافی نہ تھے۔ اس نے اپنی فوج آراستہ کی اور جالندھر دوآب پر حملہ کر دیا لیکن راجہ رنجیت سنگھ بھی کوئی کچی گولیاں نہ کھیلا تھا۔ اس شدت سے پسپا کیا کہ راجہ سنسار چند کچھ عرصہ قلعہ بند رہ کر اپنے زخم سہلاتا رہا لیکن کامیابی نے اس کے کان میں بھی وہی راگ پھونک رکھا تھا جو سکندر اعظم، نپولین اور چنگیز خاں سن کر دیوانے ہو چکے تھے۔ تازہ دم ہوتے ہی کالہر یا سال پور کی ریاست پر حملہ کیا اور ستلج کے بائیں طرف کا علاقہ ہتھیا لیا۔

لیکن بسال پور کا راجہ چپ بیٹھنے والا نہ تھا۔ اس نے ارد گرد کے راجواڑوں میں پیغام بھجوائے‘ ساز باز کی لیکن چھوٹی ریاستوں کے راجے خوفزدہ تھے۔ مغلیہ سلطنت زوال پذیر تھی۔ نیپال میں گورکھے پورے زور پر تھے اور مغربی ہمالیہ کی تمام ریاستوں کو ہتھیانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ بسال پور کے راجہ نے تمام راجواڑوں کی مدد سے گورکھا سپہ سالار امر سنگھ تھاپا کو پیغام بھیجا کہ وہ کانگڑے کے قلعہ پر حملہ کرے۔ جونہی امر سنگھ تھاپا نے ستلج دریا پار کیا‘ ہر طرف سے پہاڑی راجے اس کی فوج میں ملنے لگے اور بڑی جمعیت کے ساتھ راجہ امر سنگھ نے کانگڑے کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ پورے چار سال محاصرہ قائم رہا لیکن سنسار چند کی قوت اور جنگی شدھ بدھ کے آگے کسی کی کچھ نہ چلی۔ گورکھا فوج نے اس قدر تباہی مچائی کہ سارا ملک تاراج کر دیا۔ رعایا گھروں سے بھاگ نکلی۔ گلیوں میں دن دیہاڑے جنگلی جانور مٹ مارتے پھرتے۔ کھیتوں میں جڑی بوٹیاں اُگ آئیں۔ ڈنگے ڈھے گئے۔ راستوں میں برساتی نالے بہنے لگے۔ بالآخر راجہ سنسار چند نے محسوس کیا کہ وہ اب گورکھا فوجوں سے کانگڑے کا قلعہ چھڑا نہیں سکتا۔ اس نے اپنے بھائی کو راجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں روانہ کیا۔ راجہ رنجیت سنگھ بھی کانگڑہ ریاست کے متعلق کچھ عزائم رکھتا تھا۔ اُس نے فوجوں کو لیس کیا اور پہاڑوں کی جانب روانہ ہوا۔ راجہ سنسار چند نے بھیس بدلا۔ ایک چور راستے سے جوالا مکھی پہنچا۔ یہاں راجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ اس کا معاہدہ ہوا۔ اب راجہ رنجیت سنگھ نے گورکھا فوجوں کو شکست دی اور ستلج پار بھگا دیا۔ معاہدے کے مطابق قلعے پر راجہ رنجیت سنگھ قابض ہو گیا۔ کانگڑہ کی وادی کے چھیاسٹھ گاؤں سکھ حکومت کی ملکیت ہو گئے اور باقی ریاست راجہ سنسار چند کو دے دی گئی۔ بظاہر وہ راجہ رہا لیکن دراصل اُس کی حیثیت راجہ رنجیت سنگھ کے جاگیردار کی ہو گئی۔ قلعہ میں سکھ فوجیں قیام پذیر ہو گئیں۔ راجہ سنسار سنگھ کا جھنڈا اتار لیا گیا اور دلیا سنگھ مجیٹھا کانگڑہ کی پہاڑیوں کا ناظم مقرر ہو گیا۔

☆☆☆

ولیم مور کرافٹ جب تیرہ سجان پور اور ناداؤں کو دیکھنے گیا تو اس کی ملاقات راجہ سنسار چند سے ہوئی تھی۔ ولیم کہتا تھا کہ راجہ سنسار چند بجھا ہوا اور غریب تھا۔ راجہ سنسار چند کی موت کے بعد انورودھ چند گدی پر بیٹھا۔ ایک مرتبہ جب انورودھ چند لاہور گیا تو راجہ رنجیت سنگھ نے راجہ ہیرا سنگھ کے لیے اس کی بہن کا رشتہ مانگا۔ راجہ انورودھ سنگھ نے تیاریوں کے لیے مہلت مانگی۔ تیرہ سجان پور پہنچا۔ جو بھی مال و دولت اکٹھی کر سکا‘ کر لی۔ بہنوں کو ساتھ لیا اور ستلج کے راستے انگریزوں کی مملکت میں چلا گیا۔

اس نے اس بات کا خوب خیال رکھا کہ حیثیت میں اپنے سے نیچے خاندان میں بہن یا بیٹی کا رشتہ نہ کیا جائے..... اس آن بان اور غیرت کی خاطر گھر بار چھوڑا..... حکومت چھوڑی۔ کانگڑہ کی پہاڑیوں کو الوداع کہا..... انورودھ سنگھ کا خیال تھا کہ وہ ابن راجہ ابن راجہ ہے جبکہ ہیرا سنگھ کو راجہ رنجیت سنگھ کی مہربانی نے راجہ بنایا تھا۔ راجپوتوں کے نزدیک غیرت کے مقابلے میں دنیا کی ہر نعمت ہیچ تھی۔

یوں ہولے ہولے کانگڑہ کی ریاست سسک سسک کر ختم ہو گئی..... راجے جھونپڑیوں میں رہنے لگے..... اب وہ لوگوں کو وہ خط دکھاتے تھے جو ولیم مور کرافٹ نے راجہ سنسار چند کو لکھے تھے۔ اس طرح کانگڑہ کی ریاست راجہ سنسار چند کے ہاتھوں ہی ختم ہو گئی۔ وہ پہاڑی لوگ جو راجہ کے گیت بناتے اور گاتے تھے سوچتے رہ گئے کہ ان پہاڑوں کو تو مغل

بادشاہ بھی سر نہ کر پائے تھے' پھر یہ کانگڑہ دیس کیسے ختم ہو گیا۔ کیسے کلو' منڈی' چمبہ' سوکیت' نور پور' بسوہلی کھسکتے کھسکتے سکھ بادشاہت میں گم ہو گئیں اور یہاں کے آن بان والے راجے اپنی ہی ریاستوں میں فقط جاگیر دار رہ گئے.....جن کی شان کا یہ عالم تھا کہ کبھی کبھی سردیوں میں ان کے گھروں کے آگے دروازے بھی نہ ہوتے تھے۔ یہ وہی راجے تھے جن کا حسب نسب قبل از مسیح تک پہنچتا تھا۔ یہ لوگ راجپوتانے کے جیالے راجپوتوں سے بھی پرانے تھے اور ان کی تاریخ غیرت کی کہانیوں سے اٹی پڑی تھی۔

یوں ہی بڑے بڑے ملک' آن بان والے بادشاہ' دلیر سپاہی' اور جانے پہچانے بڑے لوگ اپنے انجام کو پہنچ جاتے ہیں.....بلاوجہ.....بلا اقدام.....بلا امتیاز.....دریا سمندر کی طرف بڑھتے رہتے ہیں اور زمانے کے بڑے پانیوں میں عہد کے چھوٹے پانی ملتے رہتے ہیں.....رہے.....تو رہے نام اللہ کا!

مسلمانوں کی آمد سے پہلے قریباً گیارھویں صدی میں کانگڑہ کی ریاست خوب پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں کلو تو شامل نہیں تھا لیکن راوی اور ستلج کے درمیان کا علاقہ جس میں جالندھر کا دوآبہ بھی شامل تھا' اس وقت جالندھر یہاں کا دارالخلافہ اور نگرکوٹ یا کانگڑہ کو ثانوی قائم مقام کی حیثیت حاصل تھی۔ کلو سوکیت اور منڈی قریب قریب خود مختار تھے۔ جب محمود غزنوی کے حملے شروع ہوئے تو میدانی علاقہ یعنی جالندھر کا دوآب ریاست کے ہاتھوں سے جاتا رہا اور نگرکوٹ ہی دارالخلافہ بن گیا۔ ونساولی (جو کہ جنم پتریوں کی طرح تاریخ حالات کا تھا) چمبہ اور دوسرے شہروں سے ملی ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ کانسی اور پیتل کے کتبوں سے بھی اس ریاست کے حالات پتہ چلتے ہیں۔

کچھ مورخوں کا خیال ہے کہ چونکہ راوی' بیاس اور ستلج اس وادی سے گزرتے ہیں' اس لیے اس کا نام تری گارتا پڑ گیا لیکن کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ بیاس میں تین ندیاں ملتی ہیں جن کا نام بن گنگا' کورالی اور بنا نگل ہے۔ یہ تینوں ندیاں ہری پور کے مقام پر مل کر بیاس میں سوکیت کے قلعہ کے مقابل گرتی ہیں اور اسی لیے اس مقام کو تری گڑھ کہا گیا ہے۔ تری گارتا کا نام مہابھارت اور پران میں بھی ملتا ہے۔ جس راجہ کا سب سے پہلے نام ونساولی میں آتا ہے وہ بھومی چند ہے۔ ہیوان سیانگ کے زمانے میں کانگڑہ کو تری گڑھ اور تری گر بھی بلایا جاتا ہے۔ البیرونی نے جب قنوج سے کشمیر تک کا سفر کیا تو اس نے نور پور کو تری گڑھ کا صدر مقام بتایا۔ تری گارتا کو کنوچ بھی کہا گیا ہے۔ مور کرافٹ نے اس ریاست کے متعلق 1820ء میں لکھا ہے کہ اس میں تین صوبے ہیں۔ کنوچ' چھنگا راور پالم پور۔

کانگڑہ قلعہ کی شکل کان جیسی ہے اور کہتے ہیں کہ اس دھرتی کے نیچے جالندھر نامی جن کا کان دفن ہے۔ کچھ لوگ اس علاقے کو سسرام پور بھی کہتے ہیں کیونکہ کانگڑہ کے راجے اس کی اولاد ہیں جس کا ذکر مہابھارت میں آیا۔ کانگڑے کے قلعے کے علاوہ یہاں دُرگا کا مندر بھی ہے جس کا ذکر 1611ء میں فنچ نے کیا۔ کہتے ہیں کہ یہ مندر بڑا کراماتی تھا۔ یہاں آ کر لوگ بھانت بھانت کی قربانیاں دیتے تھے جس میں ذات کی قربانی بہت عام تھی۔ لوگ اپنی زبان کاٹ کر مائی دُرگا کی بھینٹ دیتے اور درگا دیوی کی دعا سے دوسرے دن ہی زبان ٹھیک ہو جاتی۔ گردن کاٹتے اور جڑ جاتی۔ بازو توڑتے اور ٹھیک ہو جاتا۔ جس قدر کوئی شخص مقدس ہو گا' اتنی جلدی ہی صحت یاب ہو گا۔ دولت' محبت' اولاد' حب جاہ انسان کی خواہشات اسے اس در پر لے آتی ہیں۔ وہ خواہش کے مقابلے میں جسم کا کوئی حصہ کاٹ کر پھینک دینے کو بھی نقصان نہیں سمجھتا۔

ابن آدم ابن آدم ابن آدم!

مانجھی اور بن گنگا دریاؤں کے درمیان ایک تنگ سی پہاڑی جو ترشول صورت ہے' اس پر کانگڑہ کا قلعہ بنایا گیا ہے۔ بن گنگا سے قلعے کی جانب قریباً 300 فٹ کی عمودی چڑھائی ہے جس پر چڑھنا ناممکن ہے۔ دوسری جانب جدھر شہر آباد ہے' رستہ دشوار گزار اور بہت تنگ ہے۔ پہاڑی کی چوٹی پر محل' اس سے نیچے پتھروں سے بنے ہوئے لکشمی نارائن اور امبیکا دیوی کے مندر ہیں اور ایک چھوٹا سا مندر جین مت کے ماننے والوں کا بھی۔ مندروں کے آگے درشنی دروازہ ہے اور محلوں کی جانب جانے والے دروازے کو محلوں کا دروازہ کہتے ہیں۔ مندر کے بعد ایک لمبی گلی نما راستہ آتا ہے جس کو اندھیری یا ہندولی دروازہ کہا جاتا ہے اور قلعہ کی چڑھائی پر پہلا دروازہ جہانگیری کہلاتا ہے۔ یہی قلعہ کا صدر دروازہ ہے۔ ہندو راجہ اس دروازے کو کیا کہتے تھے اب کوئی نہیں جانتا۔ اس کے علاوہ آہنی دروازہ اور امیری دروازہ بھی مغلیہ عہد کی یادگاریں ہیں۔ کل ملا کر سات دروازے ہیں اور سارا قلعہ قریباً ایک کوس کے قطر میں واقع ہے۔

قلعہ اتنی اونچائی پر اور اس درجہ مضبوط اور خوبصورت ہے کہ اسے فتح کرنا قریب قریب ناممکن رہا۔ جلال الدین اکبر جب سارے ہندوستان کا بادشاہ بنا تو اس کے دل میں تسخیر کانگڑہ کی امنگ نے بھی سر اٹھایا۔ باون مرتبہ اس نے یہاں اپنے جری جرنیل بھیجے لیکن قلعہ تسخیر نہ ہو سکا۔ خان قلی خان ترکمان جس کا لقب خان جہاں تھا' اپنے عہد کا بے مثل سپہ سالار تھا۔ وہ بنگالے کا گورنر بھی رہ چکا تھا۔ بے پناہ فوج کے ساتھ اس نے کانگڑے کے قلعے کو سر کرنا چاہا لیکن بے سود..... جہانگیر کے عہد میں پہلی مرتبہ کانگڑے کا قلعہ زیر دام آیا اور یہ بھی کچھ عقلمندی کی وجہ یا سپہ گری کی بہتر تکنیک نہ تھی بلکہ جہانگیر کے طالع خوش بخت نے ناقابل تسخیر قلعے کو اس کی گرفت میں لا پھینکا۔

محمود غزنوی نے اس قلعہ کو تاراج کیا اور اس کی ساری دولت کو جو بہت کثیر تھی' لے کر غزنی لوٹ گیا۔ کہتے ہیں محمود غزنوی نے یہاں سے سات سو من سونے کی پلیٹیں' دو سو من پانسے کا سونا' دو ہزار من چاندی' بیس من قیمتی ہیرے جواہرات اور قریباً ستر لاکھ پونڈ مالیت کا سونے کا سکہ موجود تھا' حاصل ہوا۔ یہاں سے محمود غزنوی کو اس درجہ دولت ملی کہ وہ اسے اونٹوں پر لادنے سے بھی قاصر تھا۔ اس قدر دولت دنیا کے کسی بادشاہ کے خزانے میں کبھی اکٹھی نہیں ہو سکی۔ یہ دولت ساٹھ بادشاہوں نے مسلسل جمع کی تھی۔ محمود غزنوی کو یہاں کی تہذیبی دولت سے کوئی غرض نہ تھی' وہ واپس غزنی چلا گیا۔ جگدیش چندر جو راجہ بھرام کا 202 واں وارث تھا' اس وقت راجہ تھا۔

1043ء میں دہلی کا راجہ راجپوت تھا۔ اس نے کانگڑہ کی دولت کے چرچے سن رکھے تھے۔ ایک روز اس نے کہا کہ رات مجھے خواب میں امبیکا دیوی کے درشن ہوئے ہیں۔ یہ بت محمود غزنوی اپنے ساتھ غزنی لے گیا تھا۔ خواب میں امبیکا نے کہا کہ اگر تم کانگڑہ کا قلعہ ختم کر لو گے تو میں تمہیں قلعے میں ملوں گی۔ یہ بات سنتے ہی راجپوت جوق در جوق دلی میں جمع ہونے لگے۔ جلد ہی راجہ کے پاس اتنی فوج جمع ہو گئی کہ وہ خود حیران رہ گیا۔ دیوی امبیکا کی رکھشا کے لیے کوچ پر کوچ کرتا اس نے کانگڑے کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ پورے چار ماہ کے محاصرے کے بعد قلعہ میں رسد کی کمی ہوئی اور قلعہ تسخیر کر لیا گیا۔ اب چوری چھپے ایک رات امبیکا کا بالکل ویسا بت بنایا گیا جیسا غزنی چلا گیا تھا۔ اسے مندر کے متصل باغ میں پھینک دیا۔ جب لوگوں نے اسے دیکھا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ پھر بہت احترام اور خوشی کے ساتھ اسے دوبارہ مندر

میں لے جایا گیا اور اس کی پوجا دوبارہ شروع ہوگئی۔ کہتے ہیں جلد ہی دیوی کی پوجا میں دوبارہ اسی قدر دولت جمع ہوگئی جو محمود غزنوی لے گیا تھا۔

امبیکا ماتا کے مندر کے علاوہ جوالا مکھی بھی زائرین کے لیے بڑا مقدس مقام تھا۔ یہاں ٹھنڈے پانیوں میں یکدم شعلے بھڑک لگتے اور منتیں ماننے والوں کو یہی اشارہ کافی ہوتا۔

جب ڈاکٹر سرفراز ان کے والد، ساجدہ اور ان کے دونوں بچے پائین ولا میں رہنے بسنے لگے تو ہر صبح دودھ والے سے لے کر شام گئے تک ملنے ملانے والوں تک لوگ انہیں یہاں کی مقامی روایتیں، تاریخ کے مختلف باب، کلو، کانگڑہ، پالم پور وغیرہ کے فاصلے مختلف قوموں کی بنیادی خصوصیات، دھولی دھار کے کرشمے، موسموں کی اونچ نیچ سمجھاتے رہتے۔ ڈاکٹر سرفراز میں حیرت کا جذبہ بہت تھا۔ وہ یہ باتیں غور اور شوق سے سنتا اور کئی موسم، کئی عہد اور کئی قسم کے لوگوں کو دیکھ لیتا لیکن دادا ابا گو خود علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے لیکن انہیں ان پہاڑوں سے جاہل جذبے، توہم پرستی اور انمل بے جوڑ روایتوں کا سراغ ملتا..... وہ جنگل کو کاٹ چھانٹ کر رستے بنانے کے خواہش مند تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ انسان کسی طرح اسلام کی سادگی اور میانہ روی اختیار کرے اور اپنے اصلی تشخص کو پہنچے..... انہیں یہ کہانیاں، تاریخ، چھوٹی چھوٹی رسم و رواج سے بھری زندگیاں یوں لگتیں جیسے دریا میں جھاڑیاں، جڑی بوٹیاں، کنول کے ڈنٹھل اس طرح اُگ آئے ہوں کہ انہوں نے دریا کا بہاؤ روک دیا ہو۔

☆☆☆

تینوں کوٹھیاں ساتھ ساتھ ایک ہی ڈھگے پر بنی تھیں۔ ان کوٹھیوں سے نیچے گھنیارا کی سڑک اور دور تک وادی نظر آتی تھی۔ دوسری جنگ عظیم میں جب یہاں پول کیمپ آباد ہوا تو شام پڑتے ہی یہاں پر روشنی ہی روشنی ہو جاتی اور ان کوٹھیوں سے لگتا جیسے وادی میں پریوں نے مشعلیں روشن کر کے پڑاؤ ڈال دیا ہے۔

سنی ولا میں ٹھاکر چندر سین آباد تھے۔ اس سارے گھرانے کا رنگ لیڈر پاشی بہن جی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں اپنی بیوگی کا ایک ہنٹر تھا جسے ہر وقت وہ دوسروں کے ننگے جذبات پر اگر مارتی نہیں تھیں تو چھڑکاتی ضرور تھیں۔ ٹھاکر چندر سین اپنی بیوی کے سامنے پاشی بہن جی کے لیے مجرم محسوس کرتے۔ بچوں کا خیال تھا کہ پاشی بہن جی کو بیوہ کرنے میں ان کا ضرور کوئی ہاتھ ہے۔ ٹھاکر جی کے گھر میں پاشی بہن جی کسی رشی کا سراپ تھیں۔ پاشی بہن جی ننی تال میں سلگنے والا جوالا مکھی اور فصلوں پر منڈلانے والا ٹڈی دل تھیں۔ ماتا جی ان سے بہت ڈرتی تھیں۔ بڑے لالہ جی کھنکار کر بات کیا کرتے۔ سرسوتی بہن جی اور شیل کانت بہن جی یوں پھرتیں جیسے چڑیاں ہوں۔ ہاں جی ملا کر بات کو جلد زِپ بٹن کی طرح بند کر دیتیں۔ جدھر پاشی بہن جی کا چہرہ ہوتا ان کی دونوں چھوٹی بہنیں اپنے چندرماں سے چہرے اُدھر ہی کر کے آنکھیں جھپکانے لگتیں۔

بدقسمتی سے پاشی بہن جی اپنے شوہر سورگباشی لالہ امی چند کے ساتھ ستی نہ ہو سکیں۔ اگر ستی کا زمانہ بھی ہوتا تو بھی وہ لالہ امی چند کی ارتھی میں لیٹ کر بھسم ہونا پسند نہ کرتیں اور پیش از وقت اپنی کپال کریا نہ کروا سکتیں۔ پاشی بہن جی کو صفائی کا روگ تھا۔ ہر چار گھنٹے کے بعد وہ اپنی دھوتی چمبرا اتار کر پہلے سے بدرنگ دھوتی چمبر پہن لیتیں لیکن انہیں کبھی چٹی کوٹ یا نچلے کپڑے بدلنے کا خیال نہ آتا۔ اس چٹی کوٹ پر نیلے سوت کے ساتھ راج ہنس اور بڑے بڑے گلاب کے پھول

بنے ہوئے تھے۔ ایک دھوتی سے دوسری دھوتی کے وقفے تک وہ گردن پر چھوٹا سا جوڑا کس کر کانسی کی لٹیا اور پیتل کی بلٹوہی کے ساتھ مورتیوں کو اشنان کراتیں۔ سیڑھیوں پر پانی چلاتیں' باورچی خانے میں گائے کے پیشاب کے چھینٹے اڑاتیں۔ ان مشغلوں کے علاوہ انہیں گھر کے بچوں' اپنی چھوٹی بہنوں' نوکروں' دکانداروں کی تربیت کا بہت شوق تھا۔ وہ ہر انسان کا جھوٹ پکڑتیں اور پھر اسے نتھارتیں رہتیں۔ جب ان کی اپنی پہیلیاں اور صفائیاں ختم ہو جاتیں تو وہ سارے جھوٹ اٹھا کر چندر سین کے کورٹ میں لے جاتیں۔ پھر اگر فیصلہ ٹھاکر جی ملزم کے خلاف ہو جاتے تو پاشی بہن جی فوراً ملزم کی طرف یہ کہہ کر ہو جاتیں کہ چلو بھول ہو گئی اور اگر ٹھاکر چندر سین سزا نہ دیتے اور معاف کرنے پر آمادہ ہوتے تو پاشی بہن کی ستیہ آتما کا تقاضا ہوتا کہ سزا تو ملنی چاہیے۔ پھر کان اینٹھنے' دانت کچکچانے' بانہہ مروڑنے' ٹھسی مارنے' چانٹا لگانے کے خود روپ ہو جاتیں۔

چھوٹی بہنوں کو اٹھک بیٹھک کرانے اور بھگوان سے ڈرانے کے علاوہ وہ سرسوتی بہن جی اور شیتل کانت بہن جی کے کردار پر بھی کڑی نظر رکھتی تھیں۔ ان لڑکیوں کی جوانی میں آنچ کی کمی تھی۔ انہوں نے کبھی انڈہ اور ماس نہیں کھایا تھا۔ کبھی جیسے سفید رنگ' ربڑ کی گیند جیسے جسم کہ انگلی لگاؤ تو اندر دھنس جائے' نکالو تو گیند گول کی گول۔ چندرماں جیسے شیتل شیتل مکھڑے' بھی بھی ہنسی' نرل نرل سی آوازیں۔ بچاری شادی کی تیاریوں میں ڈھیر ہوئی رہتیں لیکن ابھی تک کوئی بر نہیں ملا تھا۔ کراس ٹچ کے پھول میز پوشوں پر بنا بنا کر وہ خود کراس آئیڈ ہو گئی تھیں۔ کروشیے کی لیسوں سے ٹرنک بھر گئے تھے لیکن ابھی تک منگنی نہ ہوئی تھی۔ شادی کے لیے مناسب بر ابھی تک نہ جانے کہاں تھے۔ رسوئی بنانا' جھاڑو بہارو' ماتا جی کی آگیا کا پالن اتنے سارے کاموں کے علاوہ ادھر سورج پہاڑوں کی اوٹ میں جاتا اور شفق کی آگ دھولی دھار کی سفید برف پر انگارے بن کر دہکتی تو پاشی بہن کے سر میں درد کی پہلی ٹیس اٹھتی..... اب وہ جمائیں کھولے ساڑھی کا پلو کمر پر اڑسے برآمدے میں ٹہلتیں۔ دخانی جہاز جیسی لمبی لمبی آہیں ان کے انجن سے وجود سے نکلتیں۔ درد کی یہ پہلی چڑھائی ہوتی۔ تھوڑی دیر بعد سرسوتی بہن جی اور شیتل کانت بہن جی بہلا پھسلا کر منا منا کر پلنگ پر لے جاتیں۔ بھگوان کرشن جی کے واسطے دے کر لٹاتیں اور پھر سرہانے بیٹھ جاتیں۔ یہ وقت چھوٹی بہنوں کی تپسیا کا وقت تھا۔ دباو دبا کر دونوں بہنوں کے ہاتھ گڑھل کے پھول جیسے سرخ ہو جاتے' پر پاشی بہن جی کا اصرار ہوتا ابھی کچھ دیر اور..... تھوڑی دیر آرام پر انہیں نیند آ جاتی۔ خراٹے لبوں پر سے یوں نکلتے جیسے پچنے سلنسر کی آواز..... پر جونہی چھوٹی بہنیں کھسک جانا چاہتیں' پاشی بہن جی ہولے سے کہتیں

''اوں ہوں۔''

لالہ جی اپنی اولاد میں سب سے زیادہ پیار پاشی بہن جی سے کرتے تھے۔ وہ ہر شام کوتوالی بازار سے لوٹتے ہوئے چھوٹے سے دونے میں اپنی پہلی اولاد کے لیے قلاقند یا برفی لاتے۔ جونہی ان کا پاؤں گھر میں پڑتا۔ پاشی بہن جی پلنگ کے ساتھ کمر لگا کر بیٹھ جاتیں۔ دونوں بہنوں کو حکم ملتا کہ وہ چلی جائیں۔ پلنگ کے پاس پڑی میز پر مٹھائی کا دونا رکھ دیتے۔

''پھر درد ہے کیا؟''

پاشی بہن جی سر پر پلو لے کر چنگلی سے آنکھ پونچھتیں' جھک کر پالاگن کرتیں۔

''لیٹی رہو' لیٹی رہو۔ سر درد کیسا ہے؟''

"کیا بتاؤں لالہ جی..... مجھ کمری کے تو ہمیشہ ہی درد رہتا ہے۔ آپ فکر نہ کریں..... بھگوان کی سوگند آرام ہے۔"

اس کے بعد وہ سرسوتی اور شیل کانت کو آواز دیتیں..... "ارے آؤ کوئی سرسوتی' شیل کانت..... یہ دیکھو پتا جی قلاقند لائے ہیں....."

کوئی بھی اُدھر نہ آتا تو لالہ جی حیرانی سے کہتے..... "یہ سب کے سب تمہیں اکیلے پڑا رہنے دیتے ہیں۔ پرماتما بھلا کرے۔ بڑی اچرج بات ہے۔"

"کام ہوتے ہیں جی.....اور پھر سدا کے روگی سنگ کون بیٹھے۔"

"ساتھ والی کوٹھی میں سول سرجن آیا ہے۔ تم میرے ساتھ چلنا شاید وہی کوئی اُپائے بتائے.....کل شام تیار رہنا' میں تمہیں ساتھ لے چلوں گا۔"

"وہ کیسے لوگ ہیں پتا جی؟....."

"ہم کو لوگوں سے کیا لینا ہے پتری جی۔ ہم تو تمہیں دکھائیں گے اور گھر آ جائیں گے۔"

دو سال ہوئے ٹھاکر چندر سین کے بھائی بزنس کے سلسلے میں برما گئے ہوئے تھے اور ان کے دو بچے اوما اور روی ماتا جی کے پاس رہتے تھے۔

دوسری شام لالہ جی کے ساتھ پاشی بہن جی اور اوما بھی ڈاکٹر سرفراز کے گھر چلے گئے۔

اوما پاشی بہن جی کا دُم چھلا تھا۔ وہ بھگوان سے ڈرنے اور پاشی بہن جی کو چیزیں پکڑانے' بھاگ بھاگ کر چھوٹے موٹے کام کرنے پر مامور تھی۔ یہ پہلی شام تھی جب اوما ڈاون ٹیمپل روڈ سے نکل کر ٹیمپل روڈ میں داخل ہوئی اور یوں راحیلہ' اوما اور شوکت قسمت کے ہاتھوں ایک نئے چکر میں داخل ہو گئے۔ راحیلہ اور شوکت کو پہاڑ کی زندگی سے اوما نے متعارف کیا.....اسی نے راحیلہ کو بتایا کہ کانگڑہ کے پہاڑوں پر چیری کا درخت نہیں لگتا بلکہ جنگلی چیری کی ایک قسم لگتی ہے جسے یہاں کے لوگ بیئے کہتے ہیں۔ ان کا مزہ قدرے کسیلا' ترش اور میٹھا ہوتا ہے۔ جب ان کے خوشے درختوں پر لگتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے گلابی' زرد اور سرخ گچھوں سے درختوں کو سجا دیا گیا ہو۔ اس کڑوی کھٹاس کا کچھ ایسا مزہ پڑ جاتا ہے۔ بچے تو اسے کھاتے تھکتے ہی نہیں۔

"چلغوزے بھی یہاں لگتے ہیں؟" شوکت نے سوال کیا۔

"کہاں؟..... پاشی بہن جی کے لیے لالہ جی چلغوزے پٹھان کوٹ سے لاتے ہیں۔ جب تم سکول جایا کرو گے تو سڑک پر تمہیں چھوٹے چھوٹے بیج گرے ہوئے ملیں گے۔ ان کے بالکل چھوٹے چھوٹے کاغذی پر لگے ہوتے ہیں۔ یہ جنگلی چلغوزے ہیں۔ مزہ تو ان کا چلغوزوں جیسا ہوتا ہے لیکن..... شکل ویسی نہیں ہوتی..... آؤ میں تمہیں آکھے کی جھاڑیاں دکھاؤں۔ وہ دیکھو کھڈ کے پاس.....آج کل ان میں نارنجی آکھے لگے ہیں۔ بڑے مزیدار کھٹے میٹھے....."

"میں دادا ابا سے پوچھ کر آتی ہوں۔" راحیلہ نے کہا.....لیکن شوکت اور اوما چھلانگیں مارتے اچھلتے کودتے ڈنگے سے نیچے بھاگ گئے۔

بچوں میں بہت جلد دوستی ہو گئی۔ راحیلہ اور اوما دونوں آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھیں۔ شوکت چھٹی میں۔ دودھ میں پانی ملانا بہت آسان ہے لیکن تیل حل کرنا ممکن نہیں۔ تیل انسانی تعصبات کی وہ شکل ہے جو انسان کے کٹو نظریات سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ تیل نہ ماں کے دودھ میں حل ہوتا ہے نہ زندگی کے شفاف' گدلے میلے پانیوں میں..... یہ تینوں بچے دو ایسے خاندانوں کے بچے تھے جن کے اعتقادات جمع کے نشان کی مانند ایک دوسرے کو کاٹتے سیدھے کھڑے تھے۔ ان میں ذرا بھی خم نہ تھا۔ بچوں کی زندگی میں تعصبات در تو ضرور آئے تھے لیکن ابھی تک وہ ان تعصبات کے لیے نہ لڑ جھگڑ سکتے تھے نہ انہیں جزو ایمان بنا سکتے تھے۔ وہ تینوں گل بیاں ڈالے آکھے کی جھاڑیوں میں سے چن چن کر چھوٹی چھوٹی رس بھری کھاتے رہتے' ہنستے' رُتجتے' گاتے رہتے۔

☆☆☆

''یہ اندر کون گیا ہے راحیلہ؟.....''

''اوما گئی ہے دادا ابا..... اوما کسم نانی۔''

''اوما؟ کون اوما.....''

''ٹھاکر چندر سین کے بھائی کی بیٹی۔ ان کے ابا برما گئے ہوئے ہیں۔''

''اوما کسم نانی..... جیسے کسی برامظم کا نام ہو.....'' دادا ابا کھیج کر بولے۔

بھلا اوما میں اوپرے والی کون سی بات تھی۔ راحیلہ نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔

سارے جہاں میں ایک ہی تو اوما تھی۔ بھلا اس میں اچنبھے کی کون سی بات تھی۔

ابھی راحیلہ اس اچنبھے کے متعلق سوچ ہی رہی تھی کہ دادا ابا نے کھنکار کر پوچھا۔ ''کیوں آئی تھی اوما؟.....''

راحیلہ نے منہ پرے کر لیا اور اس غیر ضروری سوال کا جواب دیئے بغیر اپنی گڑیا سلانے لگی۔

''بھلا کیوں آئی ہے اوما؟.....''

''پتہ نہیں دادا ابا.....''

اب دادا ابا دیر تک ناخوشی کا اظہار کرتے رہے۔ جب بھی دادا ابا کو کوئی بات ناپسند ہوتی اور حالات ان کے حسب منشا نہ ہوتے تو وہ اپنے ابروؤں کے بال انگشت شہادت اور انگوٹھے کی چٹکی بنا کر پکڑ لیتے اور کھینچتے رہتے۔ بھوؤں کے یہ لمبے لمبے بال جیسے حالات کا وہ عدم تعاون تھا جس کے کان وہ مروڑتے تھے۔

''کیسا دیس ہے؟..... کیسی نگری ہے۔ کسی کلمہ گو کی صورت ہی نظر نہیں آتی۔ صبح و شام وہی ٹھاکر چندر سین..... وہی دھوتیاں' وہی رام رام..... لاحول ولا.....''

''مجھ سے کچھ کہا..... دادا ابا.....''

وہ پھر بال کھینچنے میں مصروف ہو گئے۔

''ہم تم سے کیا کہیں گے۔ تمہارا باپ بہت اپ ٹو ڈیٹ بنا پھرتا ہے..... سول سرجن کو لامذہبیت کی سوجھی ہے۔ خطا کھائے جائے گا خطا..... اولاد کے تمام راستے گم کر دے گا آخر؟''

راحیلہ کو دادا ابا کا فلسفہ تو سمجھ میں نہ آیا لیکن اتنی بات وہ ضرور جانتی تھی کہ جب یوں ابروؤں کے بال کھینچے جائیں تو دادا ابا ناخوش ہوتے ہیں اور وہ انہیں ناخوش نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ گڑیا کو رضائی اوڑھا کر وہ ان کے پلنگ پر چلی گئی اور آہستہ سے بولی..... ''کیا بات ہے دادا ابا۔''

''میں نے تمہارے باپ سے پہلے کہا تھا کہ بھائی ہم اتنے پختہ دین دار نہیں ہیں کہ ہندوؤں کی بستی میں جا رہیں۔ ہم لوگ تو جلد اثر قبول کر لیتے ہیں۔ ہو سکے تو بچوں کے ایمان کو بچالو..... پر تمہارا باپ تو پیسے لگانے لگا ہے۔ وہ کسی کی کب مانتا ہے۔''

''ہندو کون جی؟..... '' راحیلہ نے سوال کیا۔

''ٹھاکر چندر سین کا گھرانہ..... ایک پتھر اٹھاؤ تو دس سنپو لیے نکلتے ہیں۔''

راحیلہ نے حیرانی سے بڑے ابا کی طرف دیکھا۔ ٹھاکر چندر سین تو چاچا جی تھے۔ اوما اس کی سہیلی تھی۔ بھلا وہاں ہندو کون تھا..... شاید پاشی بہن جی ہندو ہوں؟

دادا ابا میں شاید سرسید احمد خاں کی روح تو نہ تھی لیکن وہ مسلمانوں کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے آئیڈیل کے لیے مرمٹنے کا عزم تو نہ کر سکتے تھے لیکن مسلمانوں کی حالت پر ان کا دل ہر وقت کڑھتا رہتا تھا۔

تسبیح دانے پھیرتے ہوئے انہوں نے راحیلہ سے کہا..... ''یہاں ہمارا کیا بنے گا۔ ہم کس سے ملیں گے؟ ہمارا پرسان حال کون ہوگا؟.....''

''میں بڑے ابو..... میں؟.....''

''دیکھو بیٹا..... ہمارا اپنا گھر ہے..... چھ کینال کی کوٹھی ہے گورداسپور میں سول لائنز میں۔ میں نے مانا میرا سارا خاندان پلیگ میں مارا گیا۔ وہاں بھی سارے لوگ اجنبی ہوں گے لیکن جب آدمی اپنے جیسوں میں رہے اپنے رسم و رواج اپنائے..... اپنے مسلک پر چلتا جائے تو بڑی عافیت ہوتی ہے لیکن حکیم ابراہیم مغل کی کس نے سنی..... ہم مغلوں کو تو بس ایک فکر رہی ہے کہ دین میں جبر نہیں ہے..... تم کو تمہارا دین ہم کو ہمارا دین مبارک تو کیا بنا مغلیہ سلطنت کا؟..... راجپوتوں کو مناتے رہے۔ ہندوؤں کو مراعات دیتے رہے..... جڑیں کھوکھلی کر لیں اپنے مذہب کی..... سلطنت کی..... اور کیا کہلائے۔ تلوار سے مذہب پھیلانے والے..... کوئی جو چار دن تلوار چلا دیتے مذہب کی خاطر تو آج یہاں ایک ہندو نہ ہوتا برصغیر میں.....''

راحیلہ ابھی یہ باتیں نہ سمجھتی تھی لیکن اتنا وہ ضرور سمجھ گئی کہ دادا ابا ناراض تھے۔

''تمہارے باپ کو علم نہیں..... وہ پورا انگریز ہو گیا ہے..... لیکن کاش! اسے خیال آ جائے کہ ہم اگر گورداسپور لوٹ جائیں تو بچے بچ سکتے ہیں۔''

لیکن راحیلہ اب کسی اور جگہ جانا نہ چاہتی تھی۔ ان پہاڑوں میں اس کا دل خوب لگ گیا تھا۔

☆☆☆

اوما اور راحیلہ تو قریباً ہم عمر تھیں لیکن شوکت ان دونوں سے دو سال چھوٹا تھا۔ بڑوں کے سامنے تو وہ چپ چاپ

نظریں جھکائے رہتا لیکن جونہی بڑے آنکھوں سے اوجھل ہوتے اس میں کسی بندر کی روح آ جاتی۔ وہ کوئی ورزشی قسم کا بندر نہ تھا کہ اِدھر سے کود اُدھر ہو جاتا۔ قلابازیاں لگاتا اور خواہ مخواہ اپنے انگ جوڑ ڈھیلے کرتا۔ وہ تو ایسی ذہنی پٹخنیاں دیتا تھا کہ اوما اور راحیلہ کی گردنیں ٹوٹ ٹوٹ جاتیں۔ تینوں ڈگے سے نیچے پہنچے تو یکدم اس نے انہیں اشارہ کر کے چپ کرا دیا.....

''دھوبی چڑیا بھاگ جائے گی.....ابھی وہ کینتھ کے درخت پر بیٹھی ہے.....سب چپ.....''

''دھوبن چڑیا؟.....''

''دھوبن چڑیا کپڑے دھوتی ہے۔ گڑیا کے کپڑوں کی گٹھڑی باندھ کر رکھ دو..... یہ کپڑے اٹھا کر لے جائے گی اور دھو دے گی.....''

اوما اور راحیلہ دونوں کے منہ کھلے رہ گئے۔ برسات نے گڑیا کے کپڑوں میں پھپھوندی لگا دی تھی۔ دونوں نے بامعنی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''اگر ہم اپنی گڑیا کے کپڑے اس سیاہ پتھر پر رکھ دیں تو کیا دھوبن چڑیا دھو دے گی؟''

''اور چار آنے بھی.....اور صابن بھی..... ہاں.....''

وہ دونوں بھاگ کر اوپر گئیں۔ چار آنے کی بچت مشکل سے ہوئی تھی۔ ان پیسوں کا آم پاپڑ خریدنا تھا لیکن دھوبن چڑیا کا معاملہ سر پر چڑھ چکا تھا۔ وہ دونوں کپڑے لے کر لوٹیں تو شوکت کھڈ کے بڑے پتھر پر بیٹھا جھلمل پانی میں پاؤں لٹکائے سیٹی بجا رہا تھا۔

''آئی کر نہیں! ہم کپڑے لے آئے ہیں۔'' راحیلہ بولی۔

''تو بڑی بدتمیز ہے آپا۔ اتنی اونچی بولتی ہے پنجابیوں کی طرح۔ پکڑ کے دھوبن چڑیا اڑا دی۔ اب مجھے پھر جادو کرنا پڑے گا۔''

شوکی کے سامنے والے پتھر پر گڑیا کے کپڑے چونی اور صابن رکھ کر واپس لوٹیں تو شوکت نے تاکید سے کہا.....''اگر تم نے پلٹ کر دیکھا تو پتھر کی ہو جاؤ گی.....''

اوما اور راحیلہ کو پتھر بننے کا خوف تو ضرور تھا لیکن شاید تجسس اس سے بھی جان لیوا تھا۔ کچھ راستہ چڑھائی چڑھنے کے بعد اوما ڈرتے ڈرتے بولی.....''پلٹ کر نہ دیکھیں کہ دھوبن چڑیا کیسے کپڑے دھوتی ہے۔''

''ہاں کہ.....''

وہ دونوں بڑے سے ناشپاتی کے درخت کے پیچھے چھپ گئیں۔ ترائی میں بڑے پتھر پر بیٹھا شوکی گڑیا کے سارے کپڑے بڑی بے دردی سے دھو رہا تھا۔

☆☆☆

دادا ابا نے کھونٹی سے اپنا سیاہ کوٹ اتارا۔

وہ جب بھی گھر سے باہر جاتے تھے ہمیشہ کلف لگی تیس گز کی ململ کی پگڑی اور سفید شلوار قمیض پر سیاہ کوٹ پہنتے تھے۔

ان کے پیروں میں پشاوری چپل ہوتا۔ ہاتھ میں اخروٹ کی لکڑی اور پیتل کے گولے والی چھڑی ہوتی۔ لمبی ترشی ہوئی سفید داڑھی کو وہ ہلکا سا بادام روغن لگا کر ایسے چمکا لیتے کہ سورج کی روشنی میں یہ چاندی کے تاروں کی بنی لگتی۔ بڑے ابا کے پاس دو عینکیں تھیں۔ ایک گھریلو استعمال کے لیے کالے فریم کی عینک تھی۔ اس کا فریم زخمی ہو چکا تھا اور بڑے ابا پہننے سے پہلے اس کی ڈاکٹری کرتے رہتے تھے۔ دوسری عینک گلابی مائل براؤن فریم والی تھی۔ اس عینک کو وہ اپنے کوٹ کی اوپر والی جیب میں رکھتے۔ کسی کو کوٹ چھونے کی اجازت نہ تھی۔ یہ ہمیشہ پگڑی کے ساتھ والی کھونٹی پر ہمت ہارے لٹکا رہتا۔ اسی کی جیب میں ایک عدد دھلا ہوا سفید رومال' چھوٹا سا چاقو' ایک عدد ماچس اور وہ چرمی بٹوہ رہتا جس میں کبھی پچاس سے اوپر روپے نہ ہوتے۔ وضع داری سے تیار ہونے کے بعد بڑے ابا ہمیشہ اپنی بہو ساجدہ کے پاس جاتے۔ ان دونوں نے کبھی آنکھیں چار کر کے بات نہ کی تھی۔ بڑے ابا دروازے میں کھڑے ہو کر کھنگارتے..... "ہاں تو ساجدہ....." ساجدہ ان کی آواز سنتے ہی جھٹ سر پر دوپٹہ لے لیتی جیسے قرآن شریف پڑھنے لگی ہو۔ نگاہیں دونوں کی جھکی رہتیں.....

"میں ذرا باہر جا رہا ہوں' کچھ منگوانا تو نہیں....."

بڑے ابا چاہے دن میں بیس مرتبہ باہر جاتے' یہ جملہ ضرور بولتے۔

"نہیں جی..... ابھی تو کچھ نہیں چاہیے....." ساجدہ ماں کا بھی عموماً یہی جواب ہوتا۔

ساجدہ نے کبھی کبھی اپنے سسر سے فرمائش کر کے کچھ نہیں منگوایا تھا۔ سسر پوچھتا ضرور تھا۔ بہو منگواتی کچھ نہیں تھی' پھر بھی سوال و جواب جاری تھا۔

"میں دوپہر کے کھانے تک آ جاؤں گا....."

"اچھا جی....."

بڑے ابا کے جاتے ہی ساجدہ نے سر سے دوپٹہ اتار دیا اور پورے جوش سے شوکت اور راحیلہ کو جھڑکنا شروع کر دیا۔

"کم بختو تمہارے باپ کے کچھ مربعے فیکٹریاں نہیں تھیں۔ پڑھ لکھ کر کچھ بن جاؤ ورنہ ساری عمر ہندوؤں کے غلام بنے رہنا..... اس راحیلہ کو تو کسی کے پلے باندھ ہی دوں گی' وہاں بڑی بھانڈے مانجے گی لیکن تو..... تو شوکی سارا دن پہاڑی بندر بننے سے باز آ جا..... سارا دن سیر' سارا دن سیر..... میں تمہیں کہاں کہاں تلاش کروں؟....."

ایک دن دادا ابا پہلے تو کوتوالی بازار اترے۔ یہاں انہوں نے لاریوں کے اڈے پر سے اخبار خریدا۔ پھر ایک عدد چائے کی پیالی لی اور پھر بائیں جانب مڑنے والی اس سڑک پر پڑ گئے جو کوتوالی بازار سے اوپر دھر سالے کو جاتی تھی..... یہ سڑک چونکہ چھاؤنی کی طرف جاتی تھی' اس لیے سیسہ پلائی کشادہ اور بڑی صاف تھی۔ اوپر پہاڑ کی جانب وہ بیرکیں تھیں جن میں گورکھا پلاٹونوں کے بیمانہ آباد تھے۔ انگریزوں نے ان بیرکوں کا نام بیمانہ رکھا ہوا تھا جہاں پر فوجی کی بیوی آباد ہو۔ ان بیرکوں کے آگے گورکھا عورتوں کے چھوٹے چھوٹے جھمبر اور لمبے لمبے سارنگ نما سکرٹ لٹکے ہوتے۔ بیرکوں کے ارد گرد ٹلی مارے ناکوں والے بچے خاکی نیکر اور پی کیپ پہنے پھرتے' گھسیں گھسیں کرتے تھری منز گوں میں گورکھا فوجی رائفلوں پر ہاتھ دھرے بالکل چپ اپر دھر سالہ جا رہے تھے۔ گورکھا فوجی نے چپ رہنا انگریز سے سیکھا تھا۔

وہ اپنی چندری آنکھوں سے ماحول اور دشمن کو دیکھتا رہتا۔ کہتا کچھ نہیں' صرف وقت پر ایکشن لیتا۔ نیچے دور بیاس دریا کا خاص تھا۔ دھوپ تیز تھی اور بہت دور چمکتی ریت اور پانی نظر آ رہے تھے۔ کوتوالی بازار سے قریباً ڈیڑھ میل دور جا کر بڑے ابا سڑک کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ ساتھ ہی پکی کول میں پانی چل رہا تھا اور پہاڑوں کی خوبصورت خاموشی میں کول میں بہنے والے پانی کی آواز بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

اس روز کچھ دیر کے بعد دادا ابا کی نظر موسیٰ پر پڑی۔

وہ مضبوط جسم کا تبتی تھا اور اپنے کندھوں پر ایک بوری باندھے کول کنارے بھاری پتھر پر ہی بیٹھا تھا۔

"مولوی صاحب السلام علیکم..... ہمارا نام موسیٰ ہے۔" موسیٰ نے مسکرا کر کہا۔

بڑے ابا بھی گفتگو کے رسیا تھے۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے وہ موسیٰ کے قریبی پتھر پر جا بیٹھے اور موسیٰ جو بوجھ اٹھائے ستا رہا تھا' پتہ نہیں کیوں بولنے لگا۔ شاید وہ بھی ایک عرصہ سے گفتگو کی بھوک میں مبتلا تھا۔

"ادھر لاسا میں ہمارا باپ رہتا ہے۔ بڑا امیر ہے ہمارا باپ..... لیکن ہم نے تبت چھوڑ دیا۔ ہم منڈی' سکیت' گھروناسب میں رہا ہے۔"

"ادھر تمہیں ڈھنگ کا کام نہیں ملا.....؟" بوجھ کو دیکھ کر بڑے ابا نے کہا.....

"ہمارے اُدھر لاسا میں جب ایک لڑکا دس گیارہ برس کا ہو جاتا ہے تو امیر ماں باپ اس کو لاما بنانے کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ ملا نہیں ہوتا مسجد کا۔ اسی طرح بودھ مذہب کا لاما ہوتا ہے ملا....."

"اچھا تو..... پھر؟"

"میرے باپ نے مجھے بھی لاما بننے کے لیے بھیجا۔ ایک سونا' ایک لکڑی کا کٹورا تساما پینے کے لیے اور کچھ چائے بس..... اور جدائی..... گھر سے....."

"تساما کیا ہوتا ہے موسیٰ؟"

"ایک طرح کا ستو ہوتا ہے ستو..... میں ساری رات چلتا چلتا..... صبح عبادت گاہ پہنچا۔ وہاں ہزاروں لاما رہتے ہیں۔ لاما بڑے پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ مولوی جی! پڑھتے لکھتے ہیں۔ پڑھاتے ہیں۔ عورت عبادت گاہ کے اندر نہیں جا سکتی۔ بڑی دیر میں عبادت گاہ کے دروازے پر بیٹھا رہا۔ بڑی سردی تھی۔ ایک بوڑھا لاما باہر نکلا۔ اس کے سر پر استرا پھرا ہوا تھا۔ مجھے اس سے بڑا خوف آیا۔ میرا نام پوچھے بغیر اس نے مجھ سے کہا..... سنو دیوا اگر رات تک بغیر ہلے جلے مہاتما بدھ کی طرح بیٹھو گے تو ہم تمہیں اندر لے جائیں گے اور لاما بنائیں گے ورنہ جہاں سے آئے ہو وہیں لوٹ جانا ہوگا....."

میں نے زمین پر سر ٹیک کر پوچھا..... "بدھ کی طرح بیٹھنا کیا ہوتا ہے؟" اس بوڑھے لامے نے جلدی سے آلتی پالتی ماری۔ بدھ کی طرح بیٹھ گیا..... "مولوی صاحب آپ بدھ کو جانتے ہو؟....."

"ہاں مہاتما بدھ کو بھی جانتا ہوں اور پھول آسن کا بھی علم رکھتا ہوں..... تمہارا نام دیو ہے؟ موسیٰ؟....."

"ہاں مولوی جی تب میرا یہی نام تھا۔ میں دوپہر تک ویسے ہی بیٹھا رہا لیکن پھر میرے پیروں میں سوئیاں چبھنے لگیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ٹانگیں لکڑیاں بن گئی تھیں۔ بھوک پیاس کی وجہ سے عجیب عجیب رنگ نظر آنے لگے۔ مجھے پتہ نہیں

مولوی جی میں کب سو گیا۔ جب شام کو سورج ڈوبا تو بوڑھا لاما باہر نکلا۔ میں ریت کے ڈھیر پر سو رہا تھا جی۔ میرے ہی سونے سے مجھے جھنجھکار کر بولا...... دیو جاؤ کوئی بیوپار کرو...... کھیتی باڑی کرو...... لاما بننا تمہارے بس کی بات نہیں۔ میں مولوی صاحب واپس نہیں جا سکتا تھا...... میرا باپ مجھے جان سے مار دیتا...... میں بھٹکتا پھرتا تھا پہاڑوں میں مولوی صاحب۔ مجھے ہندوستان کا ایک قافلہ مل گیا۔ اس میں آپ کی صورت کا ایک آدمی تھا۔ ایک رات اس نے مجھے آواز دی۔ بولا...... موسیٰ یہ رسی لو اور کمر سے باندھو...... جب سامان اٹھاؤ تو اسے کمر سے کھول لینا...... اور اس میں سامان باندھ لینا...... یہ...... یہ وہی رسی ہے مولوی جی...... دیکھو...... ہم منڈی' گمرو' سنکیت بڑے ملک پھرا' پر وہ کبھی ہم سے بھولا نہیں...... اس کا شکل بالکل آپ جیسا تھا۔ پچھلے سال ہم ادھر آ گیا۔ اس کے ساتھ لاری اڈہ پر ہم دونوں سامان ڈھوتے تھے۔ وہ مجھے ہمیشہ موسیٰ کہہ کر بلاتا تھا۔ پرسوں رات اس نے مجھے بلایا اور کہا...... موسیٰ! ہم اپنے وطن واپس جا رہا ہے۔ تم ہمت نہ ہارنا...... یہ ہمارا تسبیح اور جانماز ہے ہمارے پاس اور کوئی وراثت نہیں یہ ہم تم کو دیتا ہے اگر دل چاہے تو رکھ لینا نہیں تو کسی مسجد میں پہنچا دینا...... مولوی جی وہ مر گیا اسی روز۔ دو دن سے ہم اسی پر نماز پڑھتا ہے۔ حالانکہ ہم کو نماز پڑھنا نہیں آتا۔''

موسیٰ کی ساری زندگی پہاڑوں کو دیکھتے گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں برف پوش پہاڑوں کی سی اونچائی تھی۔ اسے بنی نوع سے بیر کرنے کا سبق پہاڑوں نے ہی بھلا دیا تھا۔ وہ بہت بوجھ اٹھا سکتا تھا۔ بہت ساری باتیں بھلا سکتا۔ اس کے پاؤں سخت زمین پر تھے لیکن ماتھا اڑنے والے بادلوں کو محسوس کر سکتا تھا۔ پتہ نہیں کب اس نے کمر پر اپنے بوجھ کو سیدھا کیا اور بھاری قدموں سے چڑھائی چڑھنے لگا۔ بڑے ابا نے اوپر چڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور آہستہ آہستہ گھر کی طرف لوٹنے لگے۔

☆☆☆

سکول سے واپسی پر اوما' راحیلہ' روبی اور شوکت کے ساتھ کچھ اور بچے بھی آیا کرتے تھے لیکن پوسٹ آفس کے کچھ بعد سڑک دو حصوں میں بٹ جاتی۔ زیادہ لڑکیاں نچلی سڑک پر ہو لیتیں اور کچھ چھوٹا سا معتبر ٹولا اوپر والی سڑک پر بستے جھلاتا روانہ ہو جاتا۔ شوکت کی عمر کے چند لڑکے ابھی زنانہ گورنمنٹ سکول میں ہی پڑھتے تھے۔ ساتویں جماعت کے بعد انہیں اس سکول میں پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ پتہ نہیں کیا وجہ تھی لیکن زیادہ چڑھائی والی ہسپتال کے پاس سے گزرنے والی سڑک جرنیلی شمار ہوتی تھی اور نچلی سڑک جو گوردوارے اور بازار سے گزرتی کوتوالی بازار کے نشیب سے ملتی معمولی شاہراہ شمار ہوتی تھی۔ حالانکہ اوپر والا رستہ لمبا بھی تھا۔ شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ اس پر فوجیوں کے ٹرک سول افسروں کی اکا دکا گاڑیاں جاتی تھیں۔ نچلی سڑک گو تھی تو پکی لیکن کوتوالی بازار کے نشیب پر پہنچ کر اس پر کار نہ چل سکتی تھی۔

سڑک کے کنارے کینتھ' چیڑ اور ایسے اخروٹ کے درخت لگے تھے جن پر کبھی پھل نہ لگتا تھا۔ ڈی ایف او کے بنگلے کے بالکل سامنے بھرا بھرا جنگل تھا جس میں نیلی بیریز کی جھاڑیاں' سرونت کے بوٹے' جنگلی سٹرو بیریز اور آکھے لگتے تھے۔ برسات کے دنوں کے علاوہ بچوں کی ٹولی ہمیشہ یہاں رکتی اور جنگلی پھل کھاتی۔ اس ٹولی کی چودھراہٹ اوما کے ہاتھوں میں تھی۔ کوشش تو کرشنا کی بھی رہتی کہ سب اس کی بات مانیں لیکن اوما کی آنکھوں میں کوئی ایسی بات تھی جو ان پانچ بچوں کو حکم ماننے پر مجبور کرتی۔ اوما میں لیڈر کی صفات تھیں۔ وہ کبھی شرارت میں خود حصہ نہ لیتی' باقی سب سے پہلے خود جھاڑیوں میں لگا تے'

ڈھکنے چڑھتے' پھل توڑتے' شیشوں میں سے اندر جھانکتے لیکن اوما صرف سکیم سب کے سامنے رکھتی اور پھر الگ تھلگ ہو جاتی۔ اسی لیے چندر کرشنا' شوکت' راحیلہ اور روی زیادہ سے زیادہ Opposition کی بنچیں بھر سکتے تھے اور بندروں کی طرح اچھلتے رہتے تھے۔ اصلی طاقت صرف اوما کے پاس تھی..... شوکی داؤ پیچ لگاتا تھا لیکن ہمیشہ اوما کے ہاتھوں پکڑا جاتا اور سزا پاتا۔ اس روز جب ساری پارٹی قینچی موڑ کے پاس پہنچی تو روی نے اوما کی قمیض پیچھے سے کھینچی اور منہ پر انگلی رکھ کے اسے اپنی طرف مخاطب کرنے لگا۔

''کتا..... کتا..... شیشے کا کتا.....'' اوما اسے لے کر ایک اخروٹ کے گھنے پیڑ کے پیچھے چلی گئی۔ روی چھ برس کا چھوٹا سا بیمار صورت لڑکا تھا اور پاشی بہن جی کے بعد مکمل طور پر اوما کی تحویل میں تھا۔

''ہاں کیا ہوا کتے کو.....''

''کتا اور خرگوش دونوں.....''

''کیا ہوئے.....؟'' روی سے اوما نے پوچھا۔

''شوکی نے لے لیے.....''

''کیسے؟ کیوں؟.....''

''اس کے پاس ایک ربڑ کا چوزہ ہے نا.....''

''ہاں ہے تو اس کے پاس ایک بھینگا سا چوزا.....''

''شوکت کہتا تھا کہ بڑے چیز حد کے درخت میں بونے رہتے ہیں۔ وہ کھلونوں میں جان ڈالتے ہیں۔ اس نے اپنے چوزے کو کھوہ میں ڈالا اور جیتا جاگتا چوزا نکالا۔ میں نے بھی اپنا شیشے کا کتا اور خرگوش دونوں شوکی کو دے دیے لیکن چیز حد کی کھوہ میں سے کچھ نہیں نکلا۔ شوکی کہتا ہے کہ جادو ختم ہو گیا ہے.....''

''اچھا تم روؤ نہیں۔ تمہیں تمہارا کتا اور خرگوش مل جائیں گے۔''

''کب؟.....''

''بہت جلد..... بہت جلد..... لیکن کسی سے بات نہ کرنا اچھا۔''

چندر کرشنا اور دھرمیندر ٹھیکیدار سورن سنگھ کے بچے تھے اور لال کوٹھی میں رہتے تھے۔ ٹھیکیدار صاحب نے داڑھی اور کیس منڈا رکھے تھے کیونکہ وہ مونے سکھ تھے۔ ہاں کبھی کبھی ان کے بازو پر کڑا ضرور نظر آتا۔ واپسی پر سب سے پہلے ٹھیکیدار صاحب کا گھر آتا۔ اس وقت ٹھیکیدار صاحب کی بیوی پریم دیوی ہارمونیم بجایا کرتی تھی۔ آدھی آستینوں کا بلاؤز اور پورے لمبے باغ کی کڑھائی والا چینی کوٹ پہنے وہ باہر والے چھوٹے برآمدے میں بیٹھی گھونگھرو والی پنوں سے جوڑا اٹکائے ہارمونیم کا شغل کرتی نظر آتی۔ ٹپکا ٹپکا جسم' ماتھے پر چونی برابر سیندور کا تلک' چلتی تو بطخ کی طرح بھد بھد کرتی۔ چیونٹے راہ چھوڑ کر الگ ہو جاتے۔ ایک دن ایک مینڈک پاؤں تلے آ گیا تو ساری شام وہ رو رو کر ہولے ہولے کہتی رہیں ''ہائے ہائے مہا پاپ مہا پاپ.....'' شام کو دھوپ سامگری جلا کر انہوں نے کئی گھنٹے جپ تپ بھی کیا۔ ویسے بھی پریم دیوی کو سندھیا کا بہت شوق تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ ٹھیکیدار کی ساری آمدنی اسی کے پرتاپ سے تھی۔ اسی کی دعا برکت سے گھر میں ایک

گاڑیاں اڈے پر چار لاریاں اور اپنی ایک ذاتی کوٹھی تھی۔ وہ ہر منگل کے روز مندر بھی جاتی اور صبح و شام آرتی اتارنے کے لیے ذاتی مندر بھی تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی الماری تھی جس میں پورسلین کے چھوٹے چھوٹے بت پڑے تھے۔ ماسی رام دئی کی اس الماری کی چابی ان کے پیٹی کوٹ کے ازار بند سے بندھی رہتی تھی۔ کبھی جو ازار بند ڈھلک جاتا تو چابیوں کا گچھا ان کے گھٹنوں سے بجنے لگتا۔ الماری میں گنیش مہاراج کا بت، مہارانی سیتا اور رام چندر جی کی مورتیاں، زبان نکالے کالی ماتا کا کیلنڈر اور شیو جی اور پاروتی کے چھوٹے چھوٹے بت تھے۔ رومال میں لپٹا ہوا ایک سنکھ بھی تھا جسے چوری چوری ایک دن شوکی نے بجانے کی کوشش بھی کی تھی۔ پریم دئی نے اس الماری کے آگے سیس نوا کر بہت سی من کی مرادیں پائی تھیں۔ الماری کے نیچے تلسی کے تین گملے تھے جن کو روز پریم دئی پرنام کرنے کے بعد پانی کے چھینٹے دیتی تھی۔

بڑے ابا کو معلوم نہ تھا کہ شوکت اور راحیلہ گھر آنے سے پہلے ٹھیکیدار صاحب کے گھر بھی جاتے ہیں۔ ہر روز ماسی پریم دئی ہارمونیم پر گا رہی ہوتی۔

''شگن بن گگن پون چلت پروائی.....''

عجیب بات ہے کہ وہ ایک عرصے سے یہی گیت گائے چلی جا رہی تھی۔ کبھی لے ٹوٹ جاتی کبھی ماترے گننے میں بھول ہو جاتی۔ کبھی انہیں اپنا سُر بھول جاتا۔

مین سڑک سے اتر کر جب بچے زنانہ کلب والی سڑک پر آتے تو پریم دئی کی آواز انہیں سڑک پر ملتی۔ پھر یہ سارے بچے مل کر گانے لگے..... ''شاگن بان گک گک بن.....شاگن بن.....''

چندر کرشنا بھی اپنی ماں پر گئی تھی۔ گلے میں سُر نہ تھے صرف تیج تیج کر سُروں کا تعاقب کرتا آتا تھا۔ ماسٹر جی سمجھاتے..... ''بیٹی شگن بن کے تمام سُر کومل ہیں اور باقی تمام تیور..... ذرا سوچ کر سُر اٹھایا کرو.....'' پریم دئی کا خیال تھا کہ اگر چندر کرشنا گانا نہیں سیکھے گی تو بھجن کیسے گائے گی اور اگر بھجن نہیں سیکھے گی تو پھر بھگوان کیسے پرسن ہوں گے۔

اس روز وہ سب شگن بن گاتے ٹھیکیدار صاحب کی لال کوٹھی میں داخل ہوئے تو ہارمونیم کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ وہ سب کے سب اندر گئے تو ماسی پریم دئی کی الماری کھلی تھی۔

اوما نے یکدم ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ اس کے دیکھا دیکھی سب ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ راحیلہ نے ہاتھ تو باندھے پر دل ہی دل میں اللہ میاں سے معافی بھی مانگنے لگی۔ تب اوما نے آنکھیں بند کر کے کہا.....

''اوم بھور بھئے سواہا..... خرگوش اور کتا واپس کر دو..... اوم بھور بھئے سواہا..... تت ست سوتر..... شیشے کا خرگوش اور کتا واپس کر دو.....''

شوکی نے ایک دم ہاتھ چھوڑ دیے..... وہ شیشے کے کھلونے شاید واپس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''مہاراج رام جی..... آپ کی جے..... آپ بھگوان کے لیے روی کے کھلونے پرگٹ کر دیں..... ورنہ اسے موسی رام دئی سے بڑی مار پڑے گی..... مہاراج! آپ کو سیتا جی کی سوگند کھلونے پرگٹ کر دیں.....'' اوما رام چندر جی سے اُپاسنا کیے جا رہی تھی لیکن نظر اس کی شوکی پر تھی۔ کنکھیوں سے وہ اندازہ لگا رہی تھی کہ شوکت پر اس کی منتوں کا کیا اثر ہو رہا ہے.....

''اے چندر کرشنا ماسٹر جی آ ئے بیٹھے ہیں آ کر گانا سیکھو.....''

باقی بچے تو الماری کے سامنے کھڑے رہے لیکن چندر کرشنا کو جانا پڑا.....

''ابھی آ جاؤں گی ابھی..... '' وہ سرکتے ہوئے بولی۔

برآمدے میں ماسٹر جی ہارمونیم لیے بیٹھے تھے۔ کڑھائی سے پھولدار چھینٹ کوٹ میں رام دئی کھڑی ترائی کی جانب سے اٹھنے والی دھند کو دیکھ رہی تھی۔ اندر والے کمرے میں روی ابھی تک شیشے کے کھلونوں کے لیے پریشان کھڑا تھا۔

''اب چلو..... مہاراج رام چندر نے ہماری بات مان لی ہے.....''

راحیلہ کو بڑی حیرانی ہوئی کہ آخر اوما کو کیسے پتہ چلا۔ بچوں کے گروہ میں راحیلہ سیدھی سادھی تھی۔ اس لیے اس نے اپنے ذہن پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا اور سب کے پیچھے پیچھے باہر نکل گئی..... ان سب بچوں نے ایک کھیل ایجاد کر رکھا تھا۔ جب پول کیمپ کی جانب سے بڑی گھٹا اٹھتی اور باہر کھیلنا ممکن نہ ہوتا تو یہ لوگ کئی قسم کی ان ڈور گیمز ایجاد کر لیتے۔ ان میں سے ایک کھیل انوکھے لفظ کا دوہرانا تھا۔ شوکی اور اوما کے پاس کئی پیٹنٹ لفظ تھے جنہیں کوئی اور بول نہ سکتا تھا۔ اوما بار بار مزے لے لے کر کہتی رہتی۔ ''بسی تا کی بسی تا کی'' لیکن کوئی اور بسی تا کی نہ کہہ سکتا۔ شوکی نے جغرافیہ پڑھتے ہوئے تانگا نیکا چھپا لیا تھا۔ اب باقی بچے اس لفظ کو چھپانا چاہتے تھے لیکن یہ شوکی کی ملکیت تھے..... بچاری راحیلہ نے بھی بہت سوچ سوچ کر ''شیل چپل شیل چپل راچو راچو..... '' بنا لیا تھا لیکن روی بہت چھوٹا تھا۔ اسے نادر الفاظ نہیں ملتے تھے اور ہار کر اس نے صرف ''ماتا جی ماتا جی..... '' کو اپنا کوڈ ورڈ بنا لیا تھا۔

ڈنگے کے پاس جہاں آ ڑو کی بہت سی جھاڑیاں تھیں اوما' شوکی اور راحیلہ پتھروں پر بیٹھ گئے اور اپنے اپنے کوڈ ورڈ بولنے لگے۔

''تانگا نیکا تانگا نیکا..... آ ہا جی جھیل تانگا نیکا.....''

شیل چپل شیل چپل راچو راچو.....''

بسی تا کی بسی تا کی..... واہ جی واہ بسی تا کی.....''

تھوڑی دیر جب یہ غل غپاڑہ مچا رہا تو شوکی نے اوما سے کہا' تم مجھے دس دفعہ بسی تا کی کہنے کی اجازت دو تو میں تمہیں تین دفعہ تانگا نیکا کہنے دوں گا۔ راحیلہ کے لفظوں میں بھی بڑا ترنم تھا اور اس کی بھی بہت مانگ تھی۔ صرف روی کو ماتا جی ماتا جی اکیلے ہی پکارے جانا پڑتا اور نہ تو اس سے کوئی یہ الفاظ مانگتا اور نہ ہی اپنے الفاظ استعمال کرنے کی اجازت دیتا۔

یہ شور جاری تھا جب شوکی نے اپنی مٹھی بند کی اور چھوٹی انگلی اٹھا کر کہا..... ''نمبر ون.....''

جب اس گروہ میں سے کسی کو چھوٹا آتا تو وہ اسی طرح چھنگلی اٹھا کر اپنی ضرورت ظاہر کرتا۔ بڑے کام کے لیے انگوٹھی کے ساتھ والی دو انگلیاں کھڑی کرنا پڑتیں اور نمبر ٹو کہا ایسے کہا جاتا کہ سب چپ ہو جاتے۔ برآمدے میں سے چندر کرشنا گلا پھلا پھلا کر گا رہی تھی۔

''شکن بن مگن پون چلت پروائی.....''

پروائی کی جگہ آج نچلی وادی سے بہت کالے بادل اٹھتے آ رہے تھے۔ بہت جلد اوما نے محسوس کیا کہ اگر وہ

تھوڑی دیر میں گھر نہ پہنچے تو سارے بستے بھیگ جائیں گے۔

''سارے چلو..... چلو بارش آ رہی ہے۔'' اس نے اونچی آواز میں پکارا۔

روی نے اس کا دوپٹہ کھینچ کر پوچھا..... ''اور میرے کھلونے..... وہ.....؟.....''

''مل جائیں گے مل جائیں گے روندو..... کبھی بھگوان پر وشواس بھی کرتے ہیں۔''

''نمستے ماتا جی..... نمستے موسی جی..... نمستے پاپا جی نمستے.....''

''چرنجیو رہو..... چرنجیو رہو.....''

رام دیئی نے اونچے اونچے جواب دیئے۔ ٹھیکیدار سورن سنگھ کو بچوں کا یہ گروہ بہت پیارا لگتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ان کے آنے کا منتظر رہتا لیکن اپنی بیوی سے اس نے کبھی اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا کیونکہ رام دیئی ہمیشہ کہتی.....

''اے ری کرشنا یہ تو کیا سارا اسکول ساتھ لے آتی ہے۔ ان کو سڑک پر ہی چھوڑ آیا کر۔ سارے فرش گندے کر جاتے ہیں.....''

شوکی نمبرون سے فارغ ہو کر کوتوالی بازار کی مین سڑک پر کھڑا تھا۔ باقی گروہ نمستے نمستے کہتا گزر گیا تو اوما تھوڑی دیر کے لیے الماری کے پاس رکی۔ روی کے دونوں کھلونے مہاراج رام چندر جی کے پاس پڑے تھے۔

اوما کو معلوم تھا کہ شوکی نے کس وقت یہ کھلونے واپس رکھ دیئے اور کیسے وہ نمبرون کا بہانہ کر کے باہر گیا..... اوما اور شوکی میں دراصل لیڈر شپ کا جھگڑا تھا۔ چندر کرشنا' راحیلہ اور روی تو لوگڑ کے بنے ہوئے باؤلے تھے لیکن اوما اور شوکی میں ٹھنی رہتی تھی۔ وہ دونوں ایسی گیندیں تھیں جو ٹھپا کھانے پر اونچی اٹھتی ہیں.....

شوکی نے بھی دیکھ لیا تھا کہ چھوٹے مندر کی الماری کھول کر اوما نے کھلونے اٹھا لیے ہیں لیکن نہ تو اوما نے جتایا' نہ شوکی نے پوچھا۔ وہ دونوں اپنے اپنے وقت کے انتظار میں تھے۔

☆☆☆

شوکی اور راحیلہ نے بڑے ابا کے کمرے سے گزر کر جانا چاہا لیکن بڑے ابا اتنی آسانی سے کسی کو بھی اپنے کمرے سے نکل جانے نہیں دیتے تھے۔ وہ ہلکا سا براؤن چارخانے کا کمبل لیے آنکھیں بند کیے لیٹے ہوئے تھے۔ ذرا سی آنکھ کھول کر بولے۔

''کون ہے؟.....''

''ہم ہیں جی.....''

''ہم سے کیا مراد ہے؟.....'' بڑے ابا نے سوال کیا۔

''ہم جی..... راحیلہ اور میں.....'' محتاط انداز میں شوکت بولا۔

بڑے ابا نے کمبل سینے سے اتارا اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ چھ فٹ لمبے بڑے ابا کا جسم ابھی تک سرو کی طرح سیدھا تھا۔

''..... [illegible]''

راحیلہ اپنے بھائی کی کمک کے لیے پہنچی۔ وہ جانتی تھی کہ بڑے ابا کو باتیں کرنے کا بہت شوق ہے اور گھر پر جو بھی آتا ہے وہ اسی طرح کھڑے کھڑے اسے پاس بٹھا لیتے ہیں۔

''بڑے ابا! آج دیر سے چھٹی ہوئی۔ ہماری آٹھویں جماعت کی ایک نئی مس آئی تھیں۔ انہوں نے دیر کرادی۔ پھر ہم قینچی موڑ کی طرف سے ہو کر کلب کے پیچھے سے ہو کر گھر آئے۔ اسی لیے دیر ہوئی۔''

بڑے ابا نے چہرے پر عینک لگالی......

''اور راستے میں اس لٹیرے سورن سنگھ کے گھر بھی ٹھہرے ہو گے جو گورکھا پلٹن کو دودھ سپلائی کرتا ہے۔''

شوکی نے خوفزدہ ہو کر راحیلہ کی طرف دیکھا اور کمزور سا سر نفی میں ہلادیا۔

''بیٹھ جاؤ......''

''بڑے ابا بھوک لگی ہے......'' شوکی نے منمنا کر کہا۔

بڑے ابا کا خیال تھا کہ ساجدہ اپنے بچوں کی تربیت میں ناکافی ہے۔ ویسے بھی ان کے حساب سے عورتیں ناقص العقل تھیں اور بچوں کو کسی علم کا صحیح ادراک دینے کے نااہل۔

''بھوک لگی ہے اور تم تھوڑی دیر اگر کھانا نہیں کھاؤ گے تو کچھ نہیں ہوگا برخوردار...... تمہارے اسلاف میں وہ لوگ تھے جو اپنی بھوک پیاس پر قادر تھے۔ یاد رکھو مسلمان کا یہی کام ہے کہ وہ ہوس کو ترک کرے......اور کبھی لذت اور شہوت کو اپنے پر غالب نہ آنے دے......''

شوکی نے حیران ہو کر راحیلہ کی جانب دیکھا۔ آج ہی تو سائنس کی مس کہہ رہی تھی کہ کوئی ذی روح ہوا کو ترک نہیں کر سکتا...... پھر اس نے اپنے کان کو چھوا وہ شہوت لفظ سے بھی ناآشنا تھا۔ دل میں خیال آیا کہ شاید بڑے ابا کی مراد شہتوت ہو اور ان کے منہ سے شہوت نکلا ہو......

''بیٹھ جاؤ اور غور سے سنو......''

دونوں اپنے اپنے بستے میز پر رکھ کر چپ چاپ بڑے ابا کے پاس بیٹھ گئے۔

''ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک فقیر نے معرفت سے جانا کہ فلاں صحرا میں ایک حبشی بھوکا پیاسا بیٹھا ہے اور کئی دن سے فاقے میں ہے تو اس فقیر نے کچھ کھانے کے لیے جمع کیا اور اس صحرا کا قصد کیا۔ چلتا چلتا...... چلتا چلتا ایک ایسی جگہ پہنچا راحیلہ کہ سارے صحرا میں نیلے ہی نیلے پھیلے تھے اور ایک جھاڑی کے قریب وہ حبشی بیٹھا ذکر میں مشغول تھا......''

شوکی پوچھنا چاہتا تھا کہ دادا ابا کس کا ذکر؟ لیکن وہ چپ رہا کیونکہ اب اسے واقعی بہت بھوک لگی تھی۔

''فقیر پاس پہنچا اور تھیلے میں سے کھجوریں، سرکہ، شہد اور ستو نکال کر پیش کیے۔ حبشی مسکرایا اور اردگرد ٹیلوں پر نظر کی...... فقیر نے بھی اردگرد دیکھا تو سارے ٹیلے سونے کے بنے ہوئے تھے۔ حبشی نے آہستہ سے کہا جب میری ایک نظر میں یہ کرامت ہے تو کیا میں پیٹ بھر کھانا نہیں کھا سکتا؟ میں تو چاہتا ہوں کہ یہ کرامت زائل ہو اور اس کی رضا مل جائے......''

راحیلہ اور شوکی کو بالکل تعجب نہ ہوا کیونکہ انہیں اوما نے بتا رکھا تھا کہ کچھ منتر پڑھنے سے پہاڑ چیسٹری اور ان گنت

چاکلیٹ بن سکتے ہیں۔

''یاد رکھو شوکی بیٹا کہ تمام ہواؤں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہوا لذت اور شہوت کی اور دوسری ہوا مخلوقات کے مرتبہ اور ریاست کی۔ جو لذت کی ہوا کے تابع ہوتا ہے خرابات میں ہوتا ہے اور مخلوق اس کے فتنے سے بے خوف ہوتی ہے لیکن وہ جو مخلوقات کے مرتبے اور ریاست کی ہوا میں ہوتا ہے وہ گرجوں مسجدوں میں بھی فتنے کا باعث ہوتا ہے۔ اس سے ساری مخلوق کو آزار ملتا ہے۔''

ساجدہ ماں کو باورچی خانے سے بچوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سکول صبح نو سے شام تین بجے تک لگتے ہیں اور قریباً ڈھائی میل پیدل چلنے سے بچوں کو بہت بھوک لگ جاتی ہے..... اور وہ یہ بھی جانتی تھی باتوں کی راہداری دیئے بغیر وہ بڑے ابا سے چھٹ نہیں سکتے۔

''راحیلہ..... شوکی.....''

''بلالو..... بلالو..... ایک اس احمق نے لا کر یہاں بسا دیا ہے جہاں کلمہ گو آگے ہی کم ہیں۔ اوپر سے بہو ایسی مل گئی جو کچھ بتانے نہیں دیتی۔ عارف دنیا سے کیا توقع؟..... جاؤ جاؤ پیٹ بھر کھاؤ..... بڑے ہو کر دوسروں کے حصے کا بھی کھا جانا۔ جاؤ.....''

راحیلہ اور شوکی لمبے چہرے اور بھاری بستے اٹھا کر اندر کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ رات کو ٹین کی چھت پر ہلکی ہلکی بارش بجنے لگی۔ وہ دونوں پاس پاس پلنگوں پر لیٹے ہوئے تھے۔

''آپا.....''

''ہوں.....'' راحیلہ کو ٹین کی چھت پر پڑنے والی بوندوں سے ڈر نہیں آتا تھا لیکن شوکی دلیر بننے کے باوجود اس لگاتار شور سے پریشان ضرور ہوتا تھا۔

''آپا! حبشی کے اردگرد سونے کے ٹیلے کیسے بن گئے تھے.....؟''

''احمق سو جاؤ بن جاتے ہیں ٹیلے.....''

''آپا کیسے؟.....''

''تمہیں اوما نے کہانی نہیں سنائی تھی ریتا پسکا..... ریتا پسکا..... ایک مشین ہوتی تھی جب اسے کہا جائے ریتا پسکا تو اس میں سے نمک نکلنے لگتا تھا۔ ایک بار جب یہ مشین بیچ سمندر میں لے گئے تو انہیں مشین کو بند کرنا ہی یاد نہ رہا۔ ریتا پسکا ریتا پسکا چلتی رہی اور سارا سمندر نمکین ہو گیا۔''

''تو ریتا پسکا میرا.....''

''تم ایسے نہیں کر سکتے شوکی ریتا پسکا میرا لفظ ہے..... جس روز اوما نے کہانی سنائی تھی اسی روز میں نے اس لفظ کو مل لیا تھا.....''

شوکی پھر اداس ہو گیا اور چند لمحے ٹین کی چھت پر پڑنے والی بوندوں کو غور سے سننے لگا۔

''آپا..... ہوا کیا ہوتی ہے؟''

"ہوا.....؟ لو ہوا کا بھی تمہیں پتہ نہیں۔ جس میں درخت ہلتے ہیں، سردی لگتی ہے۔"

"لیکن دادا ابا تو کچھ اور کہہ رہے تھے۔ ان کی بات مجھے سمجھ نہیں آئی....."

"چپ کرو اور سو جاؤ۔ اتنی باتیں کرو گے تو نیند نہیں آئے گی۔"

اب بارش بہت تیز ہو گئی تھی اور نیچے ترائی کی جانب کھڈ میں بہنے والے پانی کا شور آنے لگا تھا۔ شوکی نے دل میں سوچا کہ اوما اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتی ہے اسے نیچا دکھانا چاہیے لیکن ایسے کیونکر ہو گا۔ اس کی اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

"اوما ناک میں کیوں بولتی ہے آپا....."

"کوئی نہیں بولتی ناک میں..... سو جاؤ۔"

"بولتی ہے بولتی..... ناک میں بولتی ہے اور بو بھی مارتی ہے۔"

"چپ گندے....."

راحیلہ نے منہ موڑا اور سو گئی..... لیکن شیشے کے خرگوش اور کتے کی یاد پتہ نہیں اسے اوما کے خلاف کیا کچھ کہنے پر اکسا رہی تھی۔

☆☆☆

ٹھاکر چندر سین کے گھر میں وِدھوا پاشی بہن جی کا راج تھا۔ ابھی ان کی عمر کل بائیس سال کی تھی لیکن انہیں بیوہ ہوئے پورے چار سال ہو چکے تھے۔ ان کی دونوں چھوٹی بہنیں بھی بیاہنے جوگی ہو چکی تھیں لیکن پاشی بہن جی کا دل لگانے آنسو پونچھنے میں اس قدر وقت لگ جاتا تھا کہ کوئی سرسوتی اور شیلی کانت کے متعلق سنجیدگی سے سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ اوپر سے ٹھاکر چندر سین کے بھائی برما چلے گئے اور اپنے دو چھوٹے بچوں کو ان کی امانت بنا دیا۔ گاتری ماتا گو ان بچوں کی چچی تھیں لیکن اوما اور روی بھی انہیں گاتری ماتا ہی کہتے تھے۔ ان دونوں بچوں کو کبھی جیب خرچ نہ ملا لیکن گھر پر کھانے پینے کی کوئی کمی نہ تھی۔ گاتری ماتا جی کسی حلوائی سے کم نہ تھیں۔ ہر وقت کڑھائی چڑھی رہتی۔ کبھی وہی بھلے بن رہے ہیں۔ کبھی گرم گرم جلیبیاں اتر رہی ہیں۔ ٹھاکر چندر سین کو وہ صبح پرنام کر کے پاؤں چھو کر باورچی خانے میں جاتی تھیں۔ رات بھی ٹھاکر جی کی آرتی اتار کر سوتیں لیکن جب سے انہوں نے ڈاکٹر سرفراز کو ساتھ والی پائین ولا میں لا بسایا تھا' ان کی جان بڑی مشکل میں پڑ گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی ساجدہ بیگم پھوہڑ تھیں۔ شلغم گوبھی کریلے خشک کرنے کے لیے بار پروتیں اور سیزن گزرنے پر انہیں پھینک پھانک دیتیں۔ اچار ڈالنے کا بھی بہت شوق تھا لیکن جونہی اچار کھانے کی میز پر آیا سب کو تنبیہ ہوتی خبردار گلا خراب ہو جائے گا۔

گاتری ماتا جی نے ساری عمر ٹھاکر چندر سین کو نہ کبھی جواب دیا نہ ہی گستاخی کی لیکن باورچی خانے کی پوتر تا کا مسئلہ تھا۔ ایک روز پھٹ پڑیں....."ٹھاکر جی! اب آپ کے یہ ڈاکٹر صاحب تو کچھ سمجھتے نہیں۔ ان کی بیوی میرے پاس پیڑھی گھسیٹ کر آ بیٹھتی ہیں اور ترکیبیں پوچھتی ہیں۔ بھلا ان کو کوئی کیسے سمجھائے کہ میرا دھرم بھرشٹ ہوتا ہے۔ وہ ٹھہریں مسلمان ملیچھ..... ان کے جانے کے بعد مجھے گئو ماتا کا پیشاب ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ پھر ساری رسوئی کا فرش دھو کر پیشاب سے اشنان کرانا پڑتا ہے۔ اوپر سے چندرہ چندرہ دن کی جھڑی سورج نکلتا نہیں' فرش گیلا رہتا ہے۔ آپ انہیں جیسے کیسے سمجھا دیں

کہ ایسے نہیں چلے گا۔ کسی کی رسوئی میں کیوں گھسی آتی ہیں۔ میں انہیں پاؤ بڑیاں سب سمجھا دوں گی پر ان کے گھر جا کر..... اپنی رسوئی میں نہیں....."

ٹھاکر چندرسین اکبر بادشاہ کی طرح اکھنڈ بھارت کا ویژن رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا جن قوموں میں مل کر کھانے پینے اور شادی بیاہ کی ریت نہ ہو وہ آپس میں اکٹھی رہ نہیں سکتیں وہ چاہتے تھے کہ بس اور کچھ نہیں تو کھانے کی خاطر ہی ہندوستان کی اکثریت یہ دو کام کرے..... ہولے ہولے تمام اقلیتیں شدھی کی طرف مائل ہو جائیں گی اور پھر ہندو دھرم تو اتنا وسیع ہے کہ اس میں ایک خدا..... ہزاروں بت بھی کچھ سما سکتا ہے۔ صرف تھوڑی سی عقل درکار ہے۔

پاشی بہن جی دھرم ریت پر تو نہیں چلتی تھیں لیکن انہیں راحیلہ کھٹکتی تھی۔ جب کبھی اوما کے گل بیاں ڈال ان کے گھر آ جاتی تو پاشی بہن جی کو اس لمبی لڑکی سے وحشت ہونے لگتی..... گورا رنگ' شربتی مغلئی آنکھیں' ریشمی براؤن بال..... راحیلہ تو واقعی مغل شہزادی لگتی۔ پاشی بہن جی کو راحیلہ دیکھ کر اپنا شوہر امی چند یاد آنے لگتا..... ہائے رام بالکل ایسا ہی تھا راحیلہ جیسا..... سنہری سنہری..... براؤن براؤن اور مرنے کی اسے کتنی جلدی تھی..... ایک ہفتے میں ٹائیفائیڈ سے مر گیا..... لو بھلا کوئی اتنی معمولی بیماری سے بھی مرتا ہے.....

بڑی شدت کی بارشیں اس سال ہوئی تھیں اور پاشی بہن جی نے زیادہ وقت کھڑکی سے بارش برستے دیکھی تھی۔ چراپونجی کے بعد دھرمسالہ میں سب سے زیادہ بارش ہوتی تھی۔ کبھی کبھی پندرہ پندرہ دن مسلسل بارش ہوئے چلی جاتی۔ پہاڑ پر بسنے والے گدی لوگوں کا خیال تھا کہ اونچے پہاڑوں پر بن کے درختوں میں کرلا کرلی ان ہی برساتوں میں انڈے دیتے ہیں۔ کرلا کرلی کو کسی شخص نے نہیں دیکھا تھا۔ کچھ لوگ بیان کرتے کہ ان کے سارے پر سفید لیکن چونچ لال ہوتی ہے۔ کچھ گدی کہتے تھے کہ ان کے سارے پر بن کے سرخ پھولوں کی طرح سرخ اور صرف چونچ سفید ہوا کرتی ہے۔ یہ پرندے بھی عنقا کی طرح روایتی اور افسانوی تھے اور ان کے متعلق بہت سی کہانیاں مشہور ہو چکی تھیں۔ جب انڈے دے دیئے جاتے تو سنا ہے کہ کرلی کا جسم اتنا گرم ہو جاتا ہے کہ مسلسل پندرہ دن کی بارش میں بھیگ کر نارمل ہوتا۔ یہ پہلے پندرہ دن کرلی انڈے سیتی اور گھونسلے میں بیٹھی رہتی۔ حضرت کرلا اپنے دوستوں کے ساتھ بارش میں بھیگتے اڑتے دانہ دنکا تلاش کرتے..... پھر جھڑی ٹوٹ جاتی اور کرلی انگڑائی لے کر گھونسلے سے اٹھتی اور کرلا صاحب انڈے سینے بیٹھ جاتے۔ اب ان کے جسم میں ایسی تپش سماتی کہ پورے پندرہ دن کی مسلسل بارش پھر ہونے لگتی۔ کرلا کرلی کے انڈے سینے کے درمیان کبھی کبھی تین مہینے گزر جاتے اور دھوپ برائے نام نکلتی۔ جونہی سورج دیوتا پورا چہرہ دکھاتے' لوگ باگ اپنے گھر کا گیلا' پھپھوندی لگا نم آلود سامان باہر نکال کر سکھانے لگتے۔

پاشی بہن جی نے ایسی ہی ایک دوپہر کو جب دھوپ میں روشنی اور گرمی دونوں تھیں' اپنی شادی کا سامان نکال کر چارپائیوں پر ڈھیر کیا۔ سرسوتی اور شیل کانت بہن بھاگ بھاگ کر بنارسی ساڑھیاں' کمخواب کے بلاؤز' کڑھائیوں سے لدے پٹی کوٹ اندر سے لا رہی تھیں۔ راحیلہ اور اوما لٹکتی مچلتی آ وارد ہوئیں۔

"ہم بھی ہیلپ کر سکتی ہیں....."

"تم اس روی کو ساتھ لو اور ڈاکٹر صاحب کے گھر بھاگ جاؤ..... بچوں کا یہاں کوئی کام نہیں..... ہاں

بھاگو.....'' پاشی بہن جی غرائیں۔

ایک تو ان دونوں کو یہ بڑا رنج تھا کہ قد ان کے پورے تھے اور بھتے سب انہیں بچے ہی تھے۔ پھر جگہ جگہ سے بھگائے جانا' کتے کی طرح روز روز جیسا سلوک ان کی قسمت میں تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے گھر ساجدہ اماں ہاتھ کے اشارے سے دور کر دیتیں۔ یہاں پاشی بہن جی نکلنے نہ دیتی تھیں۔

وہ دونوں کھسیانی سی پائیں والا پہنچیں۔

اماں ساجدہ بھی پاشی بہن جی کی طرح سامان کو دھوپ دکھانے میں مشغول تھیں..... کپڑے رضائیاں' کھیس' جوتے' قالین' پرانی کتابیں' پیتل کے سوز روئی بھرے خرگوش' تصویریں نہ جانے کیا کیا الم غلم اندر سے نکلتا آ رہا تھا۔

شوکت یہاں بہت مصروف اور اہم نظر آ رہا تھا۔ اُس نے ڈاکٹر صاحب کی ایک پرانی فلٹ ہیٹ سر پر اوڑھ رکھی تھی۔ دادا ابا کی وہ عینک جس کا ایک شیشہ ٹوٹ چکا تھا' چہرے پر تھی۔ اس سنہری فریم کی عینک میں شوکی بڑا بزا نظر آتا تھا۔ اس نے پرانی طب کی خستہ حال کتاب کھول رکھی تھی۔

''آ جاؤ آ جاؤ..... دھوپ بس تھوڑی دیر کو آئی ہے۔ آ کر مدد کرو۔'' ساجدہ ماں بولیں۔ یہ تینوں کچھ تو سامان اندر سے لاتے' کچھ دیر چیزوں کا معائنہ کرتے۔ تھوڑی دیر کے بعد اوما کو سامان میں سے ایک کموتا مل گیا۔ اس سرخ کموتا پر کالے نیچے ریشم سے بڑے بڑے ڈریگن بنے ہوئے تھے۔ اوما نے فوراً سر کے بال جوڑے کی شکل میں سر پر اکٹھے کر لیے اور کموتا اوڑھ لیا۔ ہاتھ میں گول مٹھی نما دستے والی چھتری پکڑی اور گھوم گھوم کر گانے لگی۔

''بندے ماترم..... بندے ماترم..... جے لام شکھ لام.....''

اس وقت جب راحیلہ کونے سے لدا درپنہ اوڑھے پاؤں میں اونی جوتے شلوار پر چینٹ چڑھائے مشین کے پرانے ڈبے پر ڈھولک بجا رہی تھی اور پھٹی آواز میں گانے میں مشغول تھی..... ''جیوے بنزا عمراں ساریاں.....'' اس وقت دادا ابا اندر سے برآمد ہوئے۔ دادا ابا ہمیشہ سفید شلوار قمیض پر کالا کوٹ پہنتے تھے۔ سفید براق پگڑی' لمبی سفید ڈاڑھی اور چھ فٹ اونچا قد..... انہیں دیکھتے ہی بچوں کی سِٹی گم ہو جاتی۔

''کیا ہو رہا ہے.....''

شوکی نے چہرے پر سے ٹوٹی عینک فوراً اتار کر کہا.....''امی ہمیں سامان کی رکھوالی بٹھا گئی ہیں..... کہیں کوئی کام کی چیزیں نہ اٹھالے جائے.....''

دادا نے ایک پرانا ٹین اٹھایا اور اسے دور نیچے کھڈ میں پھینک دیا۔ پھر چند پرانے عینکوں کے کیس ڈھکنے کے ٹیچے ٹین کے ساتھ وفان کیے..... اب وہ آہستہ آہستہ چیزیں دیکھتے اور واپس رکھتے ہوئے کہتے جاتے..... ''ابن آدم ابن آدم ابن آدم.....''

کچھ دیر کے بعد وہ خستہ حال کتابوں کو دیکھنے میں مشغول ہو گئے.....''انسان بھی کتنا جاہل ہے۔ سامان جمع کرتا جاتا ہے اور پل بھر کی خبر نہیں۔ سب یہیں رہ جائے گا..... اچھا اور برا..... شاندار اور پھپھوندی لدا..... سنو راحیلہ' شوکت صاحب کمال ہو..... صاحب کمال..... اگر چوری بھی کرو تو تم جیسا چور سارے علاقے میں نہ ہو..... لوگ صرف صاحب کمال کو یاد رکھتے ہیں..... باقی سب تمہاری ماں میری بہو کا سامان ہے..... ہو تو بوجھ نہ ہو تو ملال.....'' ایک پرانی جوتی جو کبھی کی سوکھ چکی تھی' دادا ابا

نے اٹھائی اور گھما کر اس زور سے کھڈ میں پھینکی کہ تینوں تو کھلکھلا کر ہنسے ہی تھے چار سال کا روی بھی ہنسنے لگا۔

''تم لوگ جاؤ' میں یہاں سامان کے پاس بیٹھا ہوں۔''

دولابانے ایک پرانی سی کتاب اٹھائی اور ساجدہ وہاں کے شادی کے فوارے کے پاس چارپائی پر بیٹھ کر پڑھنے لگے.....

یہاں بھی ان لڑکی نما بچیوں کی کوئی جگہ نہ تھی۔ ہر مقام پر یہ ٹولا فالتو تھا۔

وہ چاروں بے مصرف پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ لمبی برساتوں کی وجہ سے ساری پہاڑی پر جنگلی گھاس اُگ آئی تھی۔ سلیٹی رنگ کے پتھروں پر کائی جمی تھی۔ درخت جھاڑیاں دھلے ہوئے تھے اور درختوں کے پتے تازہ دھوپ میں Emeralds کی طرح چمک رہے تھے۔ گھاس جہاں اونچی نہ تھی وہاں سفید کھمبیوں نے سر نکال لیے تھے۔ چاروں گڈے گڈی کے بیاہ کی باتوں میں مشغول تھے۔ کچھ جنگلی تکر ستے توڑ کر شوکت نے روی کو پکڑا دیے۔

''روی کے پکڑ نا۔ بارات کے پاس چھاتے بھی ہونے چاہئیں.....''

اوما گڈے کی ماں تھی اور ہمیشہ کی طرح شادی کے دن دولہے کی ماں سیانی ہوتی ہے۔

''اب دو چار دن بارش نہیں آئے گی دیکھ لینا..... پاشی بہن جی کہتی تھیں.....''

ایک اوما دوسرے پاشی بہن جی فوراً ہی یقین آ گیا۔

روی نے اپنی مٹھی سے کھمبیاں چھوڑ دیں اور دوسرے ہاتھ میں پکڑی بیر بہوٹیاں دکھا کر کہا..... ''اوما بہن جی میں نے بارات کے لیے لال ٹمن لے لی ہے..... دیکھیں میری بیر بہوٹیاں.....''

شوکت ان لڑکیوں میں پھنس گیا تھا۔ یہ زیادہ سے زیادہ گھر گھر کھیلنا چاہتی تھیں۔ بہت ہوتا تو گڈے گڈی کا بیاہ رچا لیتیں.....کوئی انہیں باورچی خانے یا رسوم کے قریب تو آنے نہیں دیتا تھا لیکن یہ بھی باز کب آتی تھیں۔ اینٹوں کے چولہے بنا کر اپنی ہنڈکلیا میں مگن رہتیں۔ کبھی کبھی شوکت کو لگتا راحیلہ اور اوما دو لڑکیاں نہیں تھیں۔ ایک ہی لڑکی کے دو جسم تھے کیونکہ ان دونوں میں کبھی لڑائی نہ ہوتی.....اسے یہ سارے کھیل ناپسند تھے.....گھر گھر' گڈے گڈی کا بیاہ' ہنڈکلیا' بیمار مریض اور ڈاکٹر.....لیکن کیا کرتا ان مرداروں کے علاوہ اور کوئی قریب ہی نہ تھا۔ شوکت نے گڈے گڈی کے بیاہ میں نیا پن کا اضافہ کیا.....

''میں تو دولہا دلہن کی سلامی دوں گا۔ جس وقت پھیرے ہوں گے میں ڈیڈی کی گن سے گیارہ فائر کروں گا.....''

''گیارہ بار نہیں بھیا صرف دو بار۔ مجھے ڈیڈی گن کا شور اچھا نہیں لگتا.....'' روی بولا۔

''نہیں بھیا گیارہ بار سلامی ہوگی.....گنڈا ملٹری میں جو ہوا۔ سرسوتی بہن جی کے منگیتر کی طرح.....''

کہاں سرسوتی بہن جی کا چھو فارام سروپ اور کہاں انگ جوڑ سے ڈھیلا گنڈا صاحب اس کی تو آنکھ جنگ میں کام آئی ہے..... بازو ٹانگیں ویسی ڈھیلی تھیں.....

راحیلہ بولی۔ ''ایسے گڈے کے لیے چار فائر ہی بہت ہیں۔''

اوما کو راحیلہ کی بات بری لگی لیکن وہ چپ رہی۔ وہ جواب کے لیے اچھے موقع کی تلاش میں رہنا جانتی تھی۔

''سریندر سے کہا تھا وہ گڈے کی سواری کے لیے اپنا کتا لے آئے.....''

''میں جا کر لے آؤں.....'' روی نے بھولپن سے پوچھا۔

"اکیلے؟.....کمال ہے....."

کئی دن گڈے گڈی کے بیاہ کی تیاریوں میں لگ چکے تھے لیکن برساتوں کی وجہ سے شبھ لگن کی مہورت نہ آئی تھی۔ سب اس انتظار میں تھے کہ خوب کھلی ہوئی دھوپ ہو۔ خیر منڈپ تیار ہوا۔ جوں توں رسوئی اور باورچی خانے سے کھانا چرایا گیا۔ سارا انتظام مرغیوں کے ڈربے کے پاس کیا گیا تھا۔ مرغیاں بھی جی دولہن کو دیکھ کر بڑا تجسس دکھلا رہی تھیں۔ اوما اور روی نے جو کچھ رسوئی سے پایا تھا انہیں چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں سجا کر اوپر کیلے کا بڑا سا پتہ دے کر سب کچھ ڈھانپ دیا تھا۔ ایک کٹوری میں آدھا پاپڑ' تھوڑی سی دال' اچار' بوندی کا لڈو' چند جلیبیاں تھیں۔ جنہیں آنکھ بچا کر بھی کبھی روی کھانے کی کوشش کرتا۔

راحیلہ باورچی خانے سے آدھا پراٹھا' مرق کی ایک ٹانگ' کچھ چنے کھانے اور اخروٹ لائی تھی۔ ساری شادی تیار تھی لیکن ابھی تک سریندر کتا لے کر نہ پہنچا تھا۔ اب چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہونے لگی تھیں۔ جیسے صاحب صدر کے نہ آنے پر حاضرین میں بے قراری پھیل جاتی ہے.....

"پہلے نکاح ہوگا اور پھر پھیرے۔"

"لو ہمارے پاس کون سے مولوی صاحب ہیں جو نکاح پڑھاویں گے۔"

"شوکت مولوی بن جائے گا....."

"یہ گڈے گڈی کا بیاہ ہے.....نکاح تو ایسے روکھی پھیکی رسم ہے' ہم پھیرے کریں گے ہاں....."

"میں مولوی بن جاؤں گا....." روی بولا۔

"مجھے مولوی صاحب نہیں بننا۔ جب چھوہارے بٹیں گے' میں سلامی دوں گا گیارہ قائز کی....."

"پھیرے ہوں گے....." اوما بولی۔

"نکاح بھی ہوگا.....پھیرے بعد میں....."

"صرف پھیرے میرا گڈا ہے.....اور گڈے والے کبھی کسی کی نہیں سنتے!" یہ موقع تھا اپنی برتری جتانے کا۔

"نکاح ضروری ہے اوما' میں گڈی نہیں دے سکتی نکاح کے بغیر....."

"کچھ بھی نہ کرو نہ پھیرے نہ نکاح صرف سلامی.....گیارہ قائز....."

شاید بات بہت بڑھ جاتی لیکن اس وقت سریندر اپنا چھوٹا سا سفید روی کتا لے کر آ گیا۔

☆☆☆

اوما کے لیے بڑا ایک بوجھ تھا۔ ابھی وہ اتنی بڑی نہ ہوئی تھی کہ ایک بچے کو ممتا سے پال سکتی۔ اوپر سے پاشی بہن جی کی ڈانٹ ڈپٹ.....سرسوتی اور شیلا وتی کچھ کہتی نہ تھیں لیکن انہیں اپنے برما والے چاچا جی تھا کر مدن سن کے یہ بچے اضافی فرد لگتے۔ اوما نے آہستہ آہستہ روی کی مجبوری کو قبول کر لیا تھا لیکن جب بھی وہ روی کو تنہائی میں شرارت کرتے دیکھ پاتی تو چٹکی بھی کاٹ لیتی۔ ہاں کسی کے سامنے اس میں ایسا کرنے کی جرأت نہ تھی۔ قسمت نے اس کے لیے بزدلی کا رول تو نہیں چنا تھا لیکن وہ موقع ڈھونڈے بغیر اپنی رائے کا اظہار نہ کر سکتی تھی۔

اوما اور روی میں بنیادی فرق تو جنس کا تھا لیکن روی کے سنہری بال اور نیلی آنکھوں نے اسے اوما پر برتری بخش رکھی تھی۔ اجنبی لوگ بھی اسے پیار کیے بغیر نہ رہتے۔ اس کی گالوں پر اچانک بوسے ثبت کیے جاتے۔ اس کے سر کو بلایا جاتا۔ ساتھ لگایا جاتا۔ سانولی اوما جس کی ناک بھی عقاب جیسی تھی' الگ تھلگ انگوٹھے سے زمین کریدتی انگلیوں کے کڑاکے نکالتی رہ جاتی..... لیکن وہ بلا کی ذہین تھی اور اپنے آپ کو منوانے کے موقعے کی تلاش میں رہتی تھی..... جلد ہی اس نے اندازہ لگایا کہ دوسروں کا حکم ماننے والا اور اپنے آپ کو دوسروں کی مرضی پر چلانے والا بڑا اہم ہو جاتا ہے..... ابھی وہ سمجھ تو نہ سکی لیکن ذمہ اٹھانا اور نبھانا اس کے خاص فن بن گئے۔ گائتری ماتا رسوئی میں ہوتیں تو وہ بھاگ بھاگ کر اچک اچک کر برتن مسالے پکڑاتی۔ ٹھاکر چاچا کی عینک گم ہو جاتی تو سارے گھر سے ڈھونڈ نکالتی۔ پاشی بہن کی چابیوں کا دھیان کرتی۔ سرسوتی اور شیل کانت کے لمبے لمبے بالوں میں تیل لگاتی اور سب سے بڑی بات کہ اپنے کپڑوں کو بھی گندا نہ کرتی۔ صاف ستھری رہتی..... روی کو اجنبی' ملاقاتی تو بہت پیار کرتے تھے لیکن اوما نے ٹھاکر چندر سین کے گھر میں بڑی اہم جگہ بنالی تھی اور اس مقام کی اب وہ ایسے نگرانی کرتی تھی جیسے خزانے کا سانپ پھن اٹھائے بیٹھا ہو..... اوما محبت کے معاملے میں بڑی ضدی تھی۔ اپنے اصلی ماں باپ سے بچھڑ کر اب وہ سمجھنے لگی تھی کہ محبت اس کا پیدائشی حق ہے اور کوئی شخص اس حق کو غصب نہیں کر سکتا۔ جب وہ کسی شخص کو اپنی گرفت میں کر لیتی تو پھر یہ گرفت کنکھجورے کی طرح پیوست ہی ہو جاتی۔ وہ گائتری ماتا کی آنکھ کا تارا' ٹھاکر چاچا کے دل کا آرام تھی اور ہولے ہولے اس نے روی کو بھی اپنے ہاتھوں پر چڑھا رکھا تھا۔ وہی روی کو نہلاتی دھلاتی' اس کے کپڑے بدلتی' رات سوتے وقت جرابیں اتارتی' بوٹ پالش کرتی اور صبح گڈا سا تیار کر کے سکول لے جاتی۔ روی تو مسکراتا ہوا سلولائیڈ کا باوا تھا' جو یدی ویدی کہتا اپنی بانہیں پھیلا دیتا اور اوما جھک کر اس کے تسمے باندھتی ہوئی سوچتی ہائے رام کب بروی سیانا ہوگا؟ کب اپنی جرابیں خود پہنے گا' خود نہائے گا؟..... کب ماتا جی برما سے لوٹیں گی؟ کب رہائی ملے گی' کب کب؟

اس بھرے گھر میں جب اوما اور روی پہلے پہل آئے تو گائتری ماتا کے پیار کے باوجود اوما سہم گئی۔ ماتا جی ہر وقت اسے کچھ نہ کچھ کھانے کو دیتی لیکن پھر بھی اس کی گالوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور عقابی ناک بہت کھنچا ہوا لگتا تھا۔ گردن بہت پتلی ہو گئی اور اس پر پڑا ہوا ایک کالا تل نمایاں نظر آنے لگا تھا۔ اوما کو جب وقت ملتا وہ بستہ کھول کر بیٹھ جاتی۔ وہ جانتی تھی کہ اچھے بچے کبھی فیل نہیں ہوتے اور اپنا ہوم ورک خود کرتے ہیں۔ برما جانے سے پہلے ماتا جی نے کہا تھا.....

''سنو اوما سسم تائی! جونہی پتا جی کا بزنس جم گیا' ہم تم دونوں کو بلا لیں گے لیکن تب تک تمہیں ٹھاکر چاچا کے گھر اچھے بچے بن کر رہنا ہے۔ دیکھو مجھے کوئی الہانا نہ آئے.....''

گورداسپور میں وہ سول لائنز میں رہتے تھے۔ بڑی کوٹھی تھی لیکن پتاجی ٹھاکر گوپال سین سیلانی طبیعت کے مالک تھے۔ وہ شادی کے بعد کئی بزنس کر چکے تھے اور اب برما فرنٹ پر فوج کو پھل سپلائی کرنے کے سلسلے میں چلے گئے تھے۔ وہ جب اپنے گھر سے بچھڑ کر ریل کے ڈبے میں بیٹھی تو جہاں اسے گائتری ماتا نے بٹھا دیا وہیں پٹھان کوٹ تک بیٹھی رہی۔ گائتری ماں جو کھانے کو دیتیں چپکے سے کھا لیتی..... روی نے البتہ امرتسر کے سٹیشن پر پیڑے کھانے کے لیے آنسو بہائے تھے لیکن وہ تیجا بڑی والے کی طرف ایک نظر ڈالنے کے بعد چپکی ہو رہی تھی۔ اس کی گم سم عادتوں کو دیکھ کر ٹھاکر چندر سین کی

جان جاتی۔ کبھی کبھی وہ اپنی پتی سے کہتے..... ''بھائی یہ مہاں پاپ ہے۔ گائتری! تم اس ہرنی کے بچے کو کیسے خوش کروگی۔ گوپال چند کی بھی مت ماری گئی ہے۔ اچھا بھلا گھر بار۔ چلو ٹھیکیداری ہی کرتا تھی تو یہاں آ جاتا..... یوں کیمپ میں ہزاروں اطالوی قید ہیں۔ لوگ پھل فروٹ گوشت مکھن جانے کیا کچھ سپلائی کر رہے ہیں۔ سنا ہے ایک سینما گھر کا ٹینڈر بھی مانگ رہے ہیں۔ یہاں کچھ کر لیتا..... پر اس کو تو تاپ چڑھ جاتا ہے بلکہ سنتاپ..... مہاں پاپ..... مہاں پاپ.....''

''جو کچھ ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اولاد کے لیے ناں..... اب گھر پر چوڑیاں پہن کر بیٹھ جائیں۔ کو مین دینے سے جو تاپ ٹوٹے تو وہ پاپ ہے کیا' بولیے..... اور یہاں بچوں کو کونسا دکھ ہے۔ پہاڑی مقام..... اچھا سکول آپ جیسا چاچا.....''

''اولاد کو دولت ہی کا سکھ نہیں چاہیے گائتری! کئی ایسے سکھ بھی ہوتے ہیں جو مایا سے نہیں ملتے ہاں۔''

گائتری ماتا خاموش ہو گئیں۔ وہ پرانے زمانے کی دھرم پالن والی پتی تھی۔ کبھی ٹھاکر جی کے ساتھ انہوں نے ماتھا چھوڑ کر بحث نہ کی لیکن ایک رات ماتا جی بھی لرز گئیں۔ ماتا جی لڑکیوں کے کمرے کا دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں سوتی تھیں۔ تین جوان لڑکیاں اور اب اوما اور روی بھی ساتھ والے کمرے میں سویا کرتے تھے۔ اس رات گائتری ماتا نے کچھ کھانا زیادہ کھا لیا تھا اور ان کے پیٹ میں گیس کی تکلیف تھی۔ آدھی رات کو سسکیوں کی آواز سن کر وہ لڑکیوں کے کمرے میں گئیں۔ ٹھاکر جی اونچے اونچے خراٹے لے رہے تھے۔ انہوں نے نہ دیکھا کہ گائتری ساتھ والے پلنگ پر نہیں ہے۔ اوما تکیہ منہ پر اوڑھے سسک رہی تھی۔ گائتری ماں کانپ گئی۔

''ارے ری پگلی کیا ہوا تجھے؟..... ادھر آ..... سردی لگ رہی ہے کیا؟''

جب گائتری ماں نے اپنی موگدی بانہہ پر اوما کا سر ٹکا لیا اور سرگوشی میں پوچھا..... ''کیا پاشی نے کچھ کہا..... شیل وتی نے زبان چلائی.....''

''گھر یاد آتا ہے.....'' سسک کر اوما بولی۔

''لے ابھی پرسوں تو پتر آیا ہے ماد ھوری کا..... سب ٹھیک ہیں۔ کام چل جائے گا' بلا لیں گے تجھے..... لے بھلا میں اتنی بری ہوں..... جو تیرے دل میں برے برے خیال آتے ہیں؟''

''نہیں گائتری ماں! آپ تو بہت ہی اچھی ہیں۔ ماتا جی سے بھی اچھی۔''

''تو پھر روتی کیوں ہے پگلی..... تیرے دہیج کے لیے روپیہ کمانے گئے ہیں..... پگلی..... تھوڑی دیر تو من مار..... ماں باپ کوئی ایسے سنتان کو چھوڑتے ہیں.....''

اب اوما نے ایک اور سبق سیکھ لیا۔ پہلے تو وہ سیکھی کہ اچھی بچی کیسے بنے۔ پھر اس نے سیکھا کہ من کیسے مارتے ہیں۔ لیکن یہ سبق اوما کے لیے آسان نہ تھا۔ جیسے جوالا مکھی دھرتی کے اندر رہ نہیں سکتی' اسے باہر نکلنے کا شوق رہتا ہے۔ ایسے ہی اوما اندر سے نہ شانت تھی۔ نہ ہی اس کے چھوٹے سے دل میں خواہشیں ختم ہوتی تھیں..... لیکن لوگوں پر اپنا Impression ڈالنے کے لیے اس نے اوپر سے ایک چھولداری ڈال رکھی تھی۔

اوما نے اپنے ماحول میں تو بڑی خوبی سے جگہ بنالی تھی لیکن ڈاکٹر سرفراز کے گھر میں ابھی وہ جمی نہ تھی۔ راحیلہ تو

جلد ہی اس کا دم چھلا بن گئی لیکن شوکت ایک مختلف انسان تھا۔ اس میں حکیم ابراہیم مغل..... ڈاکٹر سرفراز مغل اور نہ جانے کون کون سے مغل شہزادوں کے نہ ماننے والے جرثومے تھے۔ وہ مان کر بھی کبھی نہ ہارتا۔ ویسے بھی اسے اپنی بڑی بہن کی دوست لمبی سانولی ناک میں بے رام کہنے والی کچھ ایسی پسند نہ تھی۔ وہ علانیہ اپنی ناخوشی کا اظہار کر دیتا اور راحیلہ سے جھڑکیاں کھاتا۔ شوکت کو تعجب تو اس بات پر تھا کہ دادا ابا کو بھی اوما نے ہولے ہولے رام کر لیا تھا۔ دادا ابا کہتے..... "ہاں کلمہ گو تو نہیں ہے لیکن اطوار اس کے سارے کلمہ گو لوگوں جیسے ہیں..... اللہ اس کو راہ راست دکھائے، اچھی لڑکی ہے....."

ایسے ہی جملے تھے جنہوں نے شوکت مغل کو اوما کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے نہ دیا۔ جب تک شوکت کسی چیز پر اپنا تسلط قائم نہ کر لیتا اسے سب سے علیحدہ کر کے اپنی ذاتی ملکیت نہ بنا لیتا۔ وہ کبھی اپنی پسندیدگی کا اظہار نہ کرتا۔ اسی گروپ میں ایک طرح سے دو لیڈر تھے ایک تو اوما تھی جو راج نیتی کو مہاراج چانکیہ سے بھی جان پڑتی تھی اور دوسرا اسکندر بادشاہ تھا جو سب کچھ اپنی فوج کے ادنیٰ سپاہی کو بھی بتا دیتا۔ شوکت اوما سے دو سال چھوٹا تھا اور اس عمر میں لڑکے جھڑکیاں کھانے کے عادی بھی ہوا کرتے تھے لیکن سارا گروہ ایک پروگرام بناتا اور شوکت دوسری سمت میں چل نکلتا۔ کئی بار تو اوما' راحیلہ' زوبی اور تھکیدار سورن سنگھ کی کرشنا اور دھرمیندر نہ مان کر چلتے جاتے لیکن شوکت میں کچھ ایسی ذہنی کھینچ تھی کہ پھر ان کو ہی واپس لوٹنا پڑتا۔

ایک روز دادا ابا سے سیر کی اجازت لے کر وہ سب زنانہ کلب جانے والے تھے۔ وہاں بڑے مزیدار جھولے اور پرانی وضع کی سلائیڈیں تھیں۔ دادا ابا راحیلہ کو ویسے بھی زنانہ کلب سے پرے کہیں اور جانے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ جس وقت یہ سارا ٹولہ اوپر والی سڑک پر پہنچا تو شوکت نے رپھڑ ڈال دیا۔

"میں تو پائین ولا کے نیچے کھڈ کی طرف جا رہا ہوں۔ چلنا ہے؟"

"لیکن دادا ابا نے تو زنانہ کلب تک جانے کی اجازت دے دی ہے....."

"وہ دیکھ رہے ہیں؟..... بتاؤ وہ دیکھتے پڑے ہیں۔" شوکت نے راحیلہ سے پوچھا۔ ماں ساجدہ کے اصرار کے باوجود شوکت نے کبھی راحیلہ کو آپا نہ کہا تھا۔

شوکت کی بات کسی نے نہ مانی اور سب زنانہ کلب کی چڑھائی چڑھنے لگے لیکن وہ پھدکتا دوڑتا ترائی کی طرف کھڈ کی سمت جانے لگا۔

کھڈ برساتوں میں برساتی نالے کی صورت اختیار کر لیتا اور اسے عبور کر کے دوسری جانب جانا آسان نہ تھا لیکن جونہی برسات اتر جاتی تیزی سے اترتا شور مچاتا یہ برساتی نالہ بھی سوکھنے اور اترنے لگتا۔ کھڈ میں لڑھک آنے والے بڑے بڑے پتھر نظر آتے۔ ان پر چرواہے بیٹھ کر بانسریاں بجاتے' گدی عورتیں اپنے کپڑے سکھاتیں' چھوٹے چھوٹے بچے پتھروں پر لیٹ کر آسمان دیکھتے۔ سنی ولا' پائین ولا اور روز کاٹیج کے ڈنگے بالکل ساتھ ساتھ تھے اور بیس بائیس فٹ پہاڑی سے اونچے تھے۔ ان تینوں کوٹھیوں سے مضبوط چوکور پتھروں کی سیڑھیاں اتر کر گہری کھڈ کی طرف جاتی تھیں۔ برساتی نالہ ان کوٹھیوں کے نشیب میں بہتا نیچے بھنڈی خانے کی طرف چلا جاتا تھا اور جہاں اس کھڈ نے چھوٹے سے تال کی شکل اختیار کر لی تھی وہاں گدی لوگوں نے سڈول پتھر جما کر پہاڑی کی دوسری جانب جانے کا راستہ بنا لیا تھا۔ دس بارہ فٹ

کے اس نال کی گہرائی بمشکل فٹ ڈیڑھ فٹ تھی لیکن نال سے آگے بڑی گہری کھڈ تھی۔ اس لیے کوٹھی والوں نے اپنے بچوں کو اس پتھروں پر سے گزر کر پہاڑی کی دوسری جانب کھیلنے سے منع کر رکھا تھا۔ بچے عام طور پر بڑے بڑے پتھروں پر گھر گھر کھیل کر واپس لوٹ جاتے۔

شوکت اپنے ٹولے کو چھوڑ کر سیدھا کھڈ کی جانب بھاگ گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ پتھروں پر قدم جماتا ہوشیاری اور عقلمندی کے ساتھ پہاڑی کی دوسری طرف جائے گا اور یوں کولمبس بن کر دیکھے گا کہ جس طرف کھیلنے سے باپ دادا منع کرتے ہیں، وہاں کیا کچھ ہے؟ لیکن اس روز وہ پہاڑی کی دوسری طرف نہ جا سکا۔ ہاں اس روز اس نے سریندر کو ضرور تلاش کر لیا۔ جس وقت شوکی کھڈ تک پہنچا اس نے سریندر کو چکنے گرے پتھر پر ملٹس فور پہنے سر پر ہیری ٹوپی پہنے چیک کے کوٹ میں ملبوس مچھلیاں پکڑنے والی کنڈی لٹکائے بیٹھا تھا۔

اوما، ہوزا، راحیلہ اور شوکت کے علاوہ اس گروہ میں ٹھیکیدار صاحب کی بیٹی بھی شامل تھی۔ چند بچے وقتی Visitor تھے لیکن سریندر اچانک متعارف ہوا اور پھر اس ٹولے کا مستقل ممبر بن گیا۔

سریندر کا محل نما گھر پہاڑی کی دوسری جانب تھا۔ درمیان میں کھڈ آتی تھی۔ برسات کے موسم میں برساتی نالہ اس قدر تیز بہتا کہ کھڈ چھوٹی سی ندی بن جاتی اور پہاڑی دو حصوں میں بٹ جاتی۔ ایک طرف اوما اور راحیلہ کے بنگلے تھے اور دوسری جانب سریندر کا محل تھا لیکن برسات کے اترتے ہی کھڈ سوکھ جاتی۔ اس میں پڑے ہوئے بڑے بڑے پتھر چکنے اور ملائم نظر آتے اور مقامی لوگ پہاڑی کی دوسری جانب جانے کے لیے پانی میں ایسے پتھر جما دیتے جن پر پاؤں ٹکا کر دوسری جانب جانا آسان تھا۔

سریندر کئی سالوں سے تنہا ہی کھیلتا آیا تھا۔ اس کے نہ تو بہن بھائی تھے نہ سکولی دوست۔ اس کی ماتا جی اس زرد زرد بلے پتلے لڑکے کو کسی کے گھر بھی نہ جانے دیتی تھیں۔ سریندر لڑکیوں کی طرح شرمیلا اور کم گو تھا۔ وہ درختوں، پھولوں اور بہتے پانیوں سے ایسی محبت کرتا تھا جیسے شاعر کیا کرتے تھے۔ اس نے ساری پہاڑی پر اگنے والے درخت گنے ہوئے تھے۔ آلوچے کے باغ کا خفیہ راستہ جانتا' کھڈ کی دونوں جانب کہاں کہاں سرونت کی جھاڑیاں اور آکھے کے جھاڑ تھے اسے اچھی طرح سے ان کا ٹھکانہ یاد ہے۔ بانس کی چھڑی چھیل کر وہ مچھلی پکڑنے کی بنسی بناتا اور چھوٹے گنڈوئے کنڈی میں پھنسا کر وہ کھڈ کے پتھروں پر بیٹھا رہتا۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ کھڈ کے تیز پانیوں میں کوئی مچھلی نہ تھی لیکن پھر بھی اس نے اپنا شغل جاری رکھا۔

شوکت کو پہلی نظر میں ہی سریندر سے پیار ہو گیا اور شاید یہی وہ وجہ تھی جس نے اوما کو شوکت کی لیڈری ماننے پر مجبور کیا۔

''کتنی مچھلیاں پکڑیں.....''

''ابھی تو کوئی نہیں آئی لیکن آ جائیں گی.....''

''کہاں آ جائیں گی۔ اتنے تیز پانی میں مچھلی کہاں ٹھہر سکتی ہے۔'' اوما نے ناک سکوڑ کر کہا۔

''آ ؤ اوپر چلیں راحیلہ.....''

''آؤ سریندر میں تمہیں اپنی تتلیاں دکھاؤں۔ میں نے پورا ایک ڈبہ جمع کیا ہے.....''

''زندہ ہیں.....؟''معصومیت سے سریندر نے پوچھا۔

''نہیں موئی ہوئی ہیں۔ میں نے پریس کر لی ہیں۔ میرے ساتھ چلو میں تمہیں پھول بھی دکھاؤں گا بن کے پھول..... بجوزی، گل مہر، سویٹ پیز کے پھول..... پھر ہم راجہ رانی کھیلیں گے۔ اوما میری کوئی بات نہیں مانتی..... تم ہمارے گروپ میں آ گئے تو ہم طاقتور ہو جائیں گے۔'' شوکی یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ طاقتور ہو جائے گا..... اور واقعی سریندر کے آنے سے اوما دب گئی..... لیکن اوما سپرنگ تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے دب جاتی اور جب اس پر سے وزن اٹھتا' وہ یکبارگی پوری ابھر آتی۔

پہاڑوں پر خزاں آ گئی تھی۔ گھاس کا رنگ کملاتے کملاتے گندم گوں ہو گیا تھا۔ سرسراتی ہوا سارا دن درختوں کے پتے گراتی' گھماتی اڑائے پھرتی۔ سڑکوں پر پتوں کے بھنور سے پڑتے رہتے۔ کئی بار شوکت' اوما' راحیلہ' سریندر اور بجو ان پتوں کے تعاقب میں دیر تک بھاگتے رہتے۔ کسی ایک پتے کو پکڑنے کی خواہش میں پہاڑ کے نشیب میں اتر جاتے۔ کبھی کبھی من چاہا پتہ کول کے پانیوں میں اتر جاتا اور پانی کے بہاؤ پر ڈولتا ڈولتا اتنی دور نکل جاتا کہ اسے پکڑنا ممکن نہ رہتا۔ کینتھ کے پتوں میں خزاں کے موسم میں بھی جان رہتی اور وہ ہاتھوں میں ملنے پر چرمرنہ ہوتے لیکن اوئی کے پتے اس کے پھول بڑے نازک تھے' ہلکے بادامی رنگ کے پھولوں سے ایسی خوابناک خوشبو اڑتی کہ ہوائیں معطر ہو جاتیں لیکن خزاں موسم میں اوئی کا درخت بہت جلد پتوں سے خالی ہو جاتا۔ اگر کسی خشک پتے کو ہاتھ میں لیتے تو فوراً برادہ بن جاتا۔ گلابزی کی جھاڑیاں بھی جھونجھو کر رہ جاتیں اور بیچے جو جنگلی چیری کی قسم کے تھے' ننگے بچے اترتے پتوں کو تاکتے رہ جاتے۔ پہاڑوں پر خزاں کا موسم پھوجر اماں ساجدہ کی شخصیت سے ملتا جلتا تھا۔ اماں ساجدہ کا صفائی کا موڈ..... صفائی نہیں ہوتی تو ہفتوں گزر جاتے۔ صفائی کا بھوت سوار ہوتا تو فرش دھل رہے ہیں۔ پردے اتارے جاتے' جالے صاف کیے جاتے..... مصروفیت مصروفیت۔

خزاں کی ہواؤں کا مزاج اماں ساجدہ کا سا تھا۔ کوئی کسی کی نہیں سنتا..... کوئی کسی کی نہیں مانتا..... ننھے درختوں کی جان پر بن جاتی۔ تیز ہواؤں میں جھولتے چلے جاتے..... رنجیت سنگھ کی حکومت' امی کا مزاج..... خزاں کی ہوا..... سب کو ایک نظر سے دیکھتی۔

خزاں کی ہوا ایک طرح سے انتشار کا موسم تھا۔ گویا ذہن میں کوئی لفظ گھوم رہا ہو اور ہونٹوں پر نہ آ پائے۔ انتشاری ہوائیں شاید موت کا لفظ ڈھونڈنے اڑتی پھرتی تھیں۔ گھر میں داخل ہونے والوں کے لباس پر خشک پتے' کھڈ کے پانیوں میں گہرے کیسری براؤن پیلے پتے' بچوں کے بستوں کے اندر باہر پتے' سڑکوں پر سسکتے' سرسراتے چھوٹے بڑے خشک پتے' تاروں پر ٹنگے ہوئے گیلے کپڑوں سے چپکے لٹکے پتے' کھڑکیوں کی جالیوں میں اٹکے پتے..... جابجا پتوں کی سرسراتی آوازیں رات کے وقت کھلے برآمدوں میں مدھم ہواؤں میں گھسنے والے یہ پتے ٹین کی چھتوں پر ایسی مخلوق کا سراغ دیتے جو روشنی میں نظر نہیں آتی..... چھتا کا موسم..... ہراساں سی کیفیت..... شفق کے رنگ گہرے ہوتے ہیں۔ بادلوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ان کا بھی ایک رنگ آتا اور ایک جاتا ہے۔ بہار میں شگوفے اور کلیاں فطرت میں تسلسل پیدا کرتی

ہیں۔ بات سے بات چلتی ہے۔ سردیوں میں بھی برف باری ایک تواتر کا باعث ہوتی ہے۔ برساتیں چھاجوں برسیں یا کن من کی صورت میں ہوں' ہر یاول ہر طرف بکھرتی جاتی ہے..... لیکن خزاں سب موسموں سے کٹا ہوا موسم..... اس میں حزن و ملال..... یاس اور خوف کی کیفیت غالب رہتی ہے......

ہم نوبالغ بچوں کے لیے خزاں کا موسم عجیب سا تھا۔ شام کی محفلیں برخاست۔ دن کو پہاڑیوں پر اچھل کود کرنا منع۔ ابھی سے زکام کھانسی کا ڈر..... سویٹریں حاضر..... جرابیں چڑھا کر جوتے پہننے پر اصرار۔

شوکت اور راحیلہ کو کمرہ نصیب نہ تھا۔ یہ دونوں بڑے خانہ بدوش قسم کے مسافر تھے۔ جس کمرے میں کم لوگ دیکھتے وہیں بسیرا کر لیتے۔ موسم کے مطابق کبھی برآمدے میں کھیلتے' کبھی امی ابا کی خوابگاہ میں ٹھکانہ بنا لیتے۔ کبھی اگر دادا ابا کی اجازت ہوتی تو ان کے کمرے میں تہلکہ مچا دیتے۔ کہنے کو تو ساجدہ اماں نے ایک کمرہ عنایت کر رکھا تھا لیکن اس حجرے کا ذکر بھی امی کی شرمساری کا باعث ہوتا اور ان کی ناک پر ہلکا ہلکا پسینہ آنے لگتا۔ یہ کوٹھڑی کسی تپسوی کے لیے اچھی رہتی جو ایک جگہ آسن جما' آنکھیں موندھے بھگوان سے لو لگائے رہتا لیکن ہمارے لیے تو یہ الہ دین کی غار تھی۔ دو قدم بھی چلنے پاتے کسی نہ کسی چیز سے ٹکرانا ممکن ہی نہ تھا۔

گھر کے پچھواڑے دادا ابا کے صاف ستھرے کمرے کے پیچھے یہ سیلی بغیر کھڑکیوں والی دیواروں کا ایک کوٹھا تھا۔ کمرے میں کوئی روشن دان نہ تھا۔ ایک مریل سی کھڑکی تھی ضرور لیکن اس کے آگے ایک گز کے فاصلے پر ڈنکا تھا۔ جس کے اوپر سے وہ سڑک گزرتی جس پر ہم آتے جاتے تھے۔ دروازے میں ایسی کنڈی تھی کہ لگتا اپنی نوعیت کی پہلی اور آخری ایجاد ہے۔ کبھی تو ہوا کے خفیف جھونکے سے کھل جاتی اور کواڑوں کے آگے پتھر رکھنا پڑتے۔ کبھی کنڈی میں خود بخود ایسی جکڑ پیدا ہو جاتی کہ شوکت ہتھوڑی پلاس سے بھی نہ کھول سکتا اور باہر سے کندھے کا پور زور دے کر سوہن سنگھ مالی انہی بھینچے کواڑوں کو کھولتا۔ کواڑ اپنی مرضی کے مالک تھے۔ جس طرح کسٹر آئل کی شیشی دیکھ کر راحیلہ اور شوکت دانت بھینچا کرتے تھے۔

اماں کی اجازت سے یہ سیلا اندھیرا ان مل بے جوڑ چیزوں سے لدا کمرہ بچوں کا تھا۔ پہلے یہ کمرہ بالکل خالی تھا۔ اس میں ایک چھوٹی میز اور دو چار پائیاں بچھائی گئی تھیں لیکن اماں ساجدہ کا مزاج شاید جمہوریت پسند تھا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے شوکت سے پوچھ کر اس میں لحافوں والا ٹرنک رکھا۔ پھر دھوبی والے گندے کپڑوں کی ڈولی آ ئی۔ یہ بچوں کو دل سے پسند تھی۔ آنکھ مچولی کے دوران وہ اس ڈولی میں گھس کر چھپ جاتے تو کوئی ڈھونڈ نہ سکتا۔ کچھ عرصہ بعد شلغم اور کریلوں کے ہار کھڑکی کے سامنے پردوں والے ڈنڈے پر لٹکائے گئے۔ اس سے بند کوٹھڑی کی خوشبو اور بھی تیز اور ہو گئی۔ آہستہ آہستہ اماں ساجدہ کو پتہ چل گیا کہ نالائق رعایا کی طرح بچے اپنے حقوق سے آگاہ نہیں تو پھر پرانی کرسیاں' بوسیدہ کتابیں' استعمال میں نہ آنے والے برتن' جوتیاں' ٹوپیاں' برساتیاں' چھتریاں' چار پائیوں کے نیچے رول کیے ہوئے قالین کے ٹکڑے' دریاں' موم جامے' انگیٹھی کا ٹکڑیاں سرکتی سرکتی آ گئیں۔ وہی کوٹھڑی جو پہلے کافی کشادہ کمرہ تھا' ایک ایسے گیراج کی شکل اختیار کر گئی جس میں سوائے کار کے سبھی سامان رکھا جاتا ہے لیکن جس دن ڈاکٹر صاحب کا پرانا سائیکل بھی اماں ساجدہ نے رکھنا چاہا' اس دن راحیلہ اور شوکت بلبلا اٹھائے۔ اپنے اپنے بستر تک تو وہ کسی طرح پہنچ ہی جاتے تھے لیکن

سائیکل کی وجہ سے کھلونوں والی الماری تک پہنچنا محال تھا۔ دادا ابا نے بچوں کے آنسو دیکھ کر بڑے زور سفارش کی۔ نتیجے میں نہ صرف سائیکل ہی نکال دیا گیا بلکہ کچھ راستے میں پڑے قالین بھی اٹھوا دیے گئے۔

اس کمرے کی الاٹ منٹ ضرور ان دونوں بالغوں کے نام تھی لیکن افسوس اس شاملات کا قبضہ انہیں کبھی نہ ملا۔ جونہی شوکت اور راحیلہ اندر داخل ہوتے' بڑوں میں سے کسی نہ کسی کی آواز آتی۔

''بچو اندھیرے میں کیا کر رہے ہو؟''

کوئی بڑوں سے پوچھے بھلا جب آپ ہمارے لیے اندھیرا ہی منتخب کر چکے ہیں تو بتائیے بچے کیسے اسے اُجال کرلیں۔

''کیا ہو رہا ہے؟.....'' اماں کمرے میں گردن تک چہرہ نکال کر پوچھتیں۔

یوں سمجھیے کہ سارا دن کھلونے اٹھائے یہ دونوں کمروں میں گھومتے پھرتے۔ خانہ بدوشوں سے بھی بدتر ان کی حالت تھی۔ کم از کم جن جگہوں میں وہ بسیرا کرتے ہیں۔ وہیں چین سے رہ سکتے ہیں۔ ادھر ذرا وہ بات کرتے تو کمرے سے آواز آتی..... ''شی! شور مت مچاؤ.....''

اگر باورچی خانے کے آگے کھڈی کی جانب کھیلتے تو ہر دو منٹ بعد اماں ساجدہ کی آواز آتی..... ''ذرا یہ کفگیر پکڑانا راحیلہ..... یہ ڈبہ اونچی جگہ دھرا ہے..... شوکت کرسی پر چڑھ کر اتار دے ذرا.....''

جس ٹکڑے پر ٹرین چل رہی ہوتی' وہ کئی بار سٹیشن سے نکل جاتی' ہار کر بچوں کو ٹرین ڈبے میں بند کر کے کہیں اور کارخ کرنا پڑتا۔ ڈاکٹر سرفراز سے دونوں بھی ذرا سے خوفزدہ تھے کیونکہ ڈاکٹر صاحب مطالعے کے رسیا تھے۔ جونہی ان کے ٹاور روم میں روشن کھڑکیوں کے آگے وہ ٹرین کی پٹڑی لگاتے ڈاکٹر صاحب پہلے تو تنبیہ کے طور پر کھانستے رہتے۔ پھر کھنکورے مارتے۔ پھر وہ اماں ساجدہ کو آوازیں دیتے..... قصور وہی پرانا نکلتا کہ بچے شور بہت مچاتے ہیں' انہیں بات بے بات ہنسی آتی ہے۔ خواہ مخواہ ٹھوسیاں مارتے پھرتے ہیں۔

دادا ابا بھی بے قصور تھے۔ ساجدہ ماں سارا دن گھریلو پالیسیاں بنانے میں مصروف رہتیں۔ مالی' خانساماں' نوکرانی' جمعدارنی..... ایک پلٹن کو کاموں پر مامور کرنے سے کم از کم وہ ہر وقت اپنی مصروفیت کا چرچا اور اپنی تھکاوٹ کا رونا روتی رہتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب صبح سول سرجنی' شام کو کلب اور فراغت کے لمحوں میں مطالعہ کے شوقین تھے۔ ان کی زبان بات کرنے کو ترستی تھی۔ اگر بچے ان کو نظر آ جاتے تو دادا ابا کی آواز آتی..... ''راحیلہ شوکت ادھر آؤ..... ہم تمہیں کہانی سنائیں۔''

یہ دونوں دادا ابا کی کہانیوں سے گھبراتے تھے۔

بڑے بڑے عربی نام' ان میں معرکے کی لڑائیاں' نصیحت آموز نتائج' عظیم الشان کارنامے اور ایسی ایسی محیر العقول باتیں کہ راحیلہ اور شوکت حیران رہ جاتے۔ اصل میں یہ کہانیاں مزیدار تھیں' وہ سننا بھی چاہتے تھے لیکن دادا ابا کہانی سنانے کے بڑے دام لیتے۔ کہانی کے گھیرے میں لا کر بڑے کام بتائے جاتے۔ نصیحتیں کی جاتیں' نقلی دانت دھلائے جاتے۔ تختی لکھوائی جاتی' پہاڑے یاد کرائے جاتے۔ وہ باتوں باتوں میں مونٹیسوری طریقے پر بچوں کا اخلاق اور

ان کی تربیت بھی کرنا چاہتے تھے۔ شوکت اور راحیلہ کو اسی Trickfulness سے چڑ تھی۔

پھر یوں چاہیے جن کا نہ گھر ہو نہ کمرہ..... نہ افراد خانہ ہوں نہ مشاغل سلجھے ہوں۔ وہ دونوں اگر اوما کے گھر گھسے رہتے تو ان کا قصور؟ اگر وہ سارا دن پہاڑوں میں گھومتے پھرتے تو پھر ان کا دوش؟

لیکن چھٹیاں ختم ہوتے ہی ساری روٹین اتھل پتھل ہو گئی تھی۔

اب صبح سویرے اٹھنا پڑتا۔ جب صبح بستر گرم ہوتا اور باہر کی ٹھنڈی ہوا جسم میں سوئیاں بن کر لگتی۔ تقاضا ہوتا کہ جلدی اٹھو پہلے ساجدہ ماں اٹھانے آتیں۔ پھر دادا ابا کی آوازیں مسلسل ہو جاتیں..... ستم پر ستم یہ کہ اٹھ کر نہاؤ' پھر پیدل لاد کر دو میل پیدل اترائی کی طرف سکول تھا۔ دونوں بچے سوچتے بڑے ہیں کہ قصائی..... کبھی الارم بجتا کبھی آواز آتی..... "اٹھو راحیلہ دیکھو سورج نکلنے والا ہے..... نماز بھی پڑھنا ہے....."

ہر بار آنکھ کی جھری سے راحیلہ باہر دیکھتی۔ شیشوں پر رات کی کہرآلود فضا چھائی ہوتی۔ راحیلہ سوچتی پتہ نہیں کس معتبر نے ہوائی اڑائی ہے کہ جو لوگ جلد سوتے اور جلد اٹھتے ہیں وہ صحت مند' دولت مند اور عقل مند ہوتے ہیں۔ مشرق میں صبح اٹھنے کی بیماری ہے۔ تڑکے مندروں کے گھڑیال بجتے ہیں اور اذانیں بلند ہوتی ہیں اور صحت اور دولت کا فقدان ہے..... اور صحت دولت کے بغیر کسی کی عقل کو کون مانتا ہے؟

لیکن اوما اور روی صبح صبح بستہ لٹکائے آ جاتے۔ پھر وہ راحیلہ کا لحاف الٹ کر اسے جگاتی۔ ادھر لحاف اترتا اور سورج دیوتا جگمگاتے نظر آتے۔ شوکت پھر بھی جلدی تیار ہو کر ناشتہ کر لیا کرتا تھا لیکن راحیلہ سستیلی تھی۔ کبھی راحیلہ غسلخانہ کی طرف بھاگتی' کبھی ناشتے کی طرف..... ہمیشہ کی طرح کچھ ہوم ورک بھی آخری لمحے کرنا ہوتا..... جیسے سب مل ملا کر کرتے اور اس طرح یہ چھوٹا سا قافلہ سکول کی طرف روانہ ہوتا۔ راستے میں سب سے پہلے پڑاؤ پر ٹھیکیدار صاحب کی کرشنا ملتی۔ پھر آہستہ آہستہ دوسرے بچے شامل ہوتے جاتے اور سکول پہنچنے پر اچھا خاصا دس بارہ بچوں کا غول بڑے پھاٹک سے اندر داخل ہوتا۔

سکول جاتے وقت تو اتنی لمبی چوڑی باتیں نہ ہوتیں لیکن واپسی پر لڑائی جھگڑے' کہانیاں' استانیوں کی نقلوں کے ساتھ ساتھ لطیفے گھریلو واقعات بھی سنائے جاتے۔ ماں باپ شاید لڑکے لڑکیوں کے اس میل جول کو پسند نہ کرتے تھے لیکن مجبوری یہ تھی کہ اس سارے شہر میں ساتویں جماعت تک ایک ہی مخلوط سکول تھا۔ پھر آٹھویں میں لڑکے دوسرے سکول میں چلے جاتے اور لڑکیاں اسی گورنمنٹ کے سکول میں دسویں کرنے کے لیے رہ جاتیں۔

اوما' سریندر اور شوکت تینوں ساتویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ہونا تو اوما کو نویں میں چاہیے تھا لیکن وہ اپنے والدین سے بچھڑ کر سال بھر تعلیم حاصل نہ کر سکی۔ جب سے سریندر ان کے گروپ میں شامل ہوا وہ اور شوکت پاس پاس ڈیسکوں پر بیٹھنے لگے تھے۔ اوما ان دونوں کے ساتھ دوستی کرنا چاہتی تھی لیکن ان دنوں کے سیاسی معاہدوں کی طرح وہ بہت جلد وعدہ توڑ دیتی۔

چھوٹی سی زندگی..... بڑی سست رفتاری..... وہی رونے دھونے ہنسی مذاق..... سادگی سے بھری باتیں لیکن دادا ابا کو سریندر کا آنا ایک پل اچھا نہ لگا۔ انہیں اعتراض تھا کہ سریندر سکول کی حد تک تو درست ہے لیکن گھر پر نہیں آ سکتا۔ نہ ہی

بچے روز کانچ میں کھیلنے جا سکتے ہیں جہاں سریندر رہتا ہے۔

☆☆☆

دادا ابا نے جس وقت ساجدہ ماں کو بلایا دونوں بچے اپنے کمرے میں بیٹھے ہوم ورک کر رہے تھے۔

''ساجدہ یہ کون لڑکا ہے جو ابھی اندر گیا ہے؟''

''یہ..... یہ سریندر جی..... وکیل کھوسلا کا بیٹا ہے ابا جی سب سے چھوٹا.....''

''یہ کیوں گھسا رہتا ہے ہر وقت.....''

''ہم جماعت ہیں اگلے سال لڑکوں کے سکول چلا جائے گا.....''

''میں تو اس مخلوط تعلیم کا نہ حامی ہوں نہ عادی..... سکول کی حد تک تو درست ہے لیکن.....''

اسی وقت سریندر کہیں سے بستہ لے کر وارد ہو گیا اور بہت یتیم سا بن کر دادا ابا سے بولا..... ''اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو مجھے شیخ سعدی کی کہانی سمجھا دیجئے۔ بڑی مشکل فارسی ہے.....''

''تم کو فارسی کی کیا مصیبت پڑی ہے سریندر.....'' دادا ابا نے مسکرا کر کہا۔

''بس جی پتا جی کہتے ہیں۔ فارسی آنی چاہیے۔ سکول میں تو نہیں پڑھاتے جی..... بس یونہی پتا جی کو شوق ہے۔''

''لو بہو یہ کائستھ لوگ ہم سے اچھے..... شوق کی وجہ سے بچوں کو فارسی پڑھاتے ہیں اور ایک ہم ہیں ہماری اولاد عربی بھی نہیں پڑھتی.....''

دادا ابا کو سریندر پر بہت اعتراض تھا لیکن کیا کیا جائے ہر شخص اپنی اہمیت کے چکر میں آ کر بہت کچھ معاف کر دیتا ہے۔ ایسے ہی سریندر کو ڈاکٹر سرفراز کے گھر میں ویزا مل گیا۔

سریندر کی اپنے گھر میں کوئی جگہ نہ تھی۔ روز کانچ ہر وقت مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا رہتا تھا۔ گھر کا فرنیچر ڈھیلا، بوسیدہ اور بے نور ہو چکا تھا کیونکہ ساری چیزیں پبلک کی تھیں اور جو چیز پبلک کی ہوتی ہے وہ عموماً کسی کی نہیں ہوتی۔ سریندر سے بڑی جوان کئی بہنیں اور کئی بھائی تھے۔ پھر ان بہن جیز (Jis) اور بھابیوں کے کئی کزن تھے اور پھر ملنے ملانے والے دوست احباب..... اس گھر میں نوجوان پود کا سیلاب سا آیا رہتا۔ پھر ایک پود آدھے بوڑھوں کی تھی جن کی فرمائشیں، نصیحتیں، نسخے کوئی نہیں سنتا تھا۔ اس سارے میلے میں سریندر اور اس کی ڈھائی سال کی چھوٹی بہن آرتی گم ہو گئے تھے۔ آرتی کا سب سے اہم مشغلہ یہ تھا کہ کسی ڈھیلے سے نواڑی پلنگ کے نیچے گھس جاتی۔ پھر نواڑ کا رسہ نکال کر اپنا جھولا بنا لیتی اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر یوں جھولتی کہ دنیا و مافیہا کی فکر نہ رہتی۔ ساری نوجوان بہن جیز (Jis) کا گلا پھول پھول جاتا لیکن آرتی گڑیا برآمد نہ ہوتی۔

اس ساری مخلوق میں سریندر کی کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ کیا کرتا ہے کیوں اور کیسے کرتا ہے۔ اس کی کسی کو پروا نہ تھی۔ جواں سالوں کو کھلونے کی ضرورت ہوتی تو آرتی سے محبت کر لی جاتی۔ بہن جیز کی ممتا جاگتی تو آرتی کو کئی لڑکیاں غسل دے ڈالتیں۔ فراک بدلتیں، بالوں میں ربن ڈالتیں اور پھر بھابیاں جیز اسے گود میں اچھالتے پھرتے۔ ان لوگوں کا اپنا کوئی پروگرام بن جاتا تو پھر ''گڑیا'' پلنگ کے نیچے گھس کر جھولا جھولنے لگتی۔

سریندر کی ماتا جی کو فوت ہوئے کئی سال گزر چکے تھے۔ اس کی بیوہ پھوپھی گھر کا نظام چلاتی تھیں جو ان کی گرفت سے باہر ہو چکا تھا۔ گھر کے نوجوان لڑکے لڑکیاں پڑھنے لکھنے کے شوقین نہ تھے۔ ان بچوں میں سریندر کی نوجوان چار بہنیں اور تین بھائی بھی تھے اور بی جی کے بھی بچے تھے..... ایسے سیلاب کے سامنے وکیل کھوسلا صاحب ہتھیار ڈال چکے تھے۔ کھوسلا صاحب وکالت اور کلب کو ترجیح دیتے تھے لیکن بڑے کھوسلا صاحب کو اس غول بیابانی کو دیکھ کر وحشت ہوتی۔ بھگوان نے امرتسر کے مضافات میں بہت زمین دے رکھی تھی۔ ہر ربیع و خریف کی فصل پر کھوسلا صاحب سال بھر کا اناج اور خرچ لے کر آ جاتے اور پھر سارا انتظام بی جی کے سپرد کر دیتے۔

لیکن بڑے کھوسلا صاحب اس مستقبل پلٹن کو دیکھ کر لمبے لمبے سانس کھینچنے پر مجبور تھے۔ وہ اپنی دھوتی کے بل ٹھیک کرتے رہتے اور بار بار کہتے..... "ہاں جی..... لیکن تاپ کے؟ تاپ کے....." ان کا سارا فلسفہ حیات اس تاپ کے میں ڈوب کر جذب ہو گیا تھا۔ اتنے تاسف..... یہ ڈھیر سارے پچھتاوے..... ان گنت سوچیں بے انت خیال.....

جب وہ روز کالج پہنچتے تو گھر کے افراد کا ردعمل ہمیشہ مختلف ہوتا۔ بی جی صرف ایک ہی جملہ بولتی تھیں.....

"لے بھئی سریندر! تیرے دوست تجھے لینے آئے ہیں۔" گو ان کا ارادہ کھوسلا صاحب کی بڑی سی کوٹھی میں وقت گزارنے کا ہوتا..... بی جی پہلے سے تھکی ہوئی تھیں۔ انہیں اب ہجوم کا شوق لوگوں کی چاہ نہ رہی تھی۔ اسی لیے وہ جلد از جلد سریندر کو ہمارے ساتھ روانہ کر دیتیں۔

اگر بہن جیز کا غول مل جاتا تو روی کی شامت آ جاتی۔ اس کی سفید رنگت اور نیلی آنکھوں کی وجہ سے چوماچاٹی کے کئی سین پیش آتے۔

"ہائے کیسے پیارے بال ہیں روی کے۔"

"بالکل انگریزی باوا....."

"ٹونکل ٹونکل لٹل سٹار آتا ہے؟"

"سناؤ سناؤ....."

"لو بھئی سنو سنو....."

ساری بہن جیز آپس میں باتیں کرتی سنتی چلی جاتیں۔

شوکت' اوما' راحیلہ اور سریندر چپ چاپ دیکھتے رہتے اور ایک ایک اپنی طرز کا الو محسوس کرتا۔ بھاپا جیز اگر قریب ہوتے تو ان تینوں کا Viva شروع ہو جاتا۔

"کیوں اوما! ماسی جی اچھی ہیں۔" ایک بھاپا جی پوچھتے۔

"شوکت کس جماعت میں ہو بھئی۔" دوسرے بھاپا جی بے تو جہی سے پوچھتے ضرور لیکن جواب کا انتظار نہ کرتے۔

"کیوں راحیلہ! ابھی تک برقعہ نہیں پہنا؟ تمہارے دادا جی کیسے برداشت کرتے ہیں۔"

اس پر سارے بھاپا جیز قہقہے لگاتے۔ جیسے برقعہ پہننا کوئی مذاق کی بات ہو۔

راحیلہ تو پہلے ہی کم گو اور شرمیلی تھی۔ اسے سریندر کے گھر سے اس کی بہن جیز اور بھاپا جی سے وحشت تھی لیکن

جب ہر بار وہ اس کے لیے برقعے کا ٹاپک شروع کر دیتے تو وہ پسینہ پسینہ ہو جاتی۔

بھاپا جیز کو بچوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن ہم چاروں ان کے ذوق طبع کے لیے اچھے خاصے کارٹون تھے.....

"لو بھئی..... آج ضرور جمعرات ہے....." ایک بھاپا جی چلاتے۔

"کیوں..... کیسے اندازہ لگایا کہ آج شنی وار ہے....."

"بھئی فقیروں کا ٹولہ آ جائے تو کیا جمعرات نہیں ہوتا۔"

ایسی باتوں سے راحیلہ بہت بدکتی تھی۔ اسی لیے وہ روز کالج جانے پر رضامند نہ ہوتی۔ سریندر کی لاچاری کا یہ عالم تھا کہ وہ پہلے تو روز کالج لے جانے پر اصرار کرتا اور آخر میں رونے لگتا۔ وہ اس قدر کومل اور نرمل تھا کہ راحیلہ کو بھی ترس آ جاتا۔

اس روز یہ بچے ڈرامہ کر رہے تھے۔ شوکت نے ماتھے پر صندل کا ٹھیکہ' لمبا کرتا' ہاتھ میں مالا' پیروں میں کھڑاویں' شوکت کو کنشی پوجا کرانے والے پنڈت جی کا روپ دھارنا تھا۔ سریندر چور بنا ہوا تھا اور ایک آنکھ پر اندھیاری پہن کر ایک بڑا سا گال پر بنا رہا تھا۔ ان دونوں لڑکوں نے بڑی محنت سے روز کالج کے ایک برآمدے کے آگے رسیاں باندھ کر پردے لٹکائے تھے۔ سامنے ناظرین کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ جن میں زیادہ تر بہن جیز اور بھاپا جیز تھے۔ جو آپس میں ہنسی مذاق کرتے نہ تھکتے تھے۔ گراموفون پر سہگل کا گیت "کہو ناں آس نراس بھئی" چل رہا تھا۔ شوکت کو ڈر تھا کہ کہیں دیوٹ بجھ گئے تو مندر کا سین خراب ہو جائے گا لیکن ابھی تک اوما اور راحیلہ کا پتہ نہ تھا۔ وہ دونوں اپنا اپنا ڈریس لے کر بی جی کے باتھ روم میں گئی تھیں اور ابھی تک نہ لوٹی تھیں۔ شوکت نے سریندر کو لڑکیاں تلاش کرنے کے لیے کہا اور خود سٹیج کے دونوں پردوں میں سے گردن بھر نکال کر کہا..... "حاضرین ہم نے یہ ڈرامہ خود لکھا ہے۔ اس کا نام ہے چوروں کو پڑ گئے مور..... اس ڈرامے میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ایک چور لڑکی اغوا کر کے لاتا ہے اور پنڈت جی اسے راہِ راست پر لاتے ہیں۔"

چوتھی بار حاضرین نے وہی اناؤنسمنٹ سنی اور بددلی سے تالیاں بجائیں۔ ایک بھاپا جی نے اونچی آواز میں کہا..... "بھئی ہم کوئی اسلامی کلچر کا ڈرامہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہر بار تم ہمیں دیئے جلا کر دکھا دیتے ہو۔ کوئی قوالی ہو مجرا ہو۔"

"ہاں بھئی اگلی دفعہ کوئی اسلامی تاریخ کا ڈرامہ....." ایک بہن جی بولیں۔

"ان کی کونسی تاریخ ہے بیچاروں کی..... جنگ جدل لڑائی بھڑائی..... یا پھر نمازیں..... خوشی میں نمازیں..... غم میں نمازیں....." ایک بھاپا جی بولے.....

"ہاؤ مین....." اودھ موئی سی کاسنی کپڑوں والی بہن جی نے آنکھ مار کر کہا۔

"کہاں ہے ڈرامہ..... کیا دکھائیں آپ کو یہ بچے لوگ....."

"یہ کیوں نہیں کربلائے معلی کے واقعات کچھ کم ڈرامائی ہیں۔"

"مسلم کلچر قوالی اور مجرا..... واہ واہ..... اگلی بار ہم ڈرامہ کریں گے۔"

اس کے بعد وہ سب مل کر قوالی کرنے لگے اور لڑکیاں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے رنگ بھاؤ بتانے لگیں.....

پہلی بار شوکت کا دل چاہا کہ وہ کھڑاویں دھوتی اتار کر بھاگ جائے لیکن پتہ نہیں کیوں اس سے بھاگا نہ گیا۔ غصے میں آ کر اس نے سارے دیئے پھونکوں سے بجھا دیئے۔

سریندر کو دونوں لڑکیاں بی جی کے بیڈروم میں ملیں۔ دونوں نے دوپٹوں سے گھاگرے بنائے ہوئے تھے۔ بہن جیز کے کھلے بلاؤز پہن رکھے تھے اور لال رنگ کی لپ سٹک ہونٹوں اور گالوں پر لگا رکھی تھی۔ اس وقت وہ ایک دوسرے کے بالوں میں پھولوں کے ہار گوندھ رہی تھی۔

''مجھے استانی پر بھاوتی بہت بری لگتی ہیں۔'' اوما بولی۔

''ہائے کیوں اچھی ہیں غریب سی۔''

''آدھی اندھی ہیں اور سلائی کی کلاس لیتی ہیں۔ سر میں سرسوں کا تیل لگاتی ہیں اور منہ سے ویسے ہی بو آتی ہے۔ کچھ بتاتی ہی نہیں اگر قمیض کا کپڑا لے جاؤ تو بلاؤز کاٹ کر دے دیتی ہیں۔ اس دفعہ تو حد ہو گئی' چاچی جی نے اتنا کھلا کپڑا دیا تھا۔ کہنے لگیں اب اس میں سے کس بچے کا فراک کاٹوں.....''

''جلدی چلیں دیر ہو رہی ہے.....'' چور سریندر دروازے میں سے بولا۔

''پھر تم نے کیا کہا پر بھاوتی سے؟''

''میں نے کہا استانی جی پہلے دن کا بچے کا فراک کاٹ دیجیے.....''

''اچھا..... اچھا اوما تم نے یوں کہا۔'' راحیلہ بولی۔

''ساری کلاس ہنسنے لگی۔ مجھے کہنے لگیں گٹ آؤٹ آف دی کلاس۔ ہیں پر بھاوتی بڑی الو۔ میرے جاتے ہی پریتم اٹھی کہنے لگی ہاتھ دھو آؤں جی..... پھر شکر اٹھی بولی نمبر ون کر آؤں جی..... اسی طرح باری باری اجازت لیتی ساری باہر آ گئیں۔''

''سب انتظار کر رہے ہیں۔ پلیز آ جائیں۔'' دروازے سے چار قدم آگے ہو کر سریندر نے کہا۔

''وہ مس ریاض بڑی اچھی ہیں۔'' راحیلہ نے لنگ دار مس ریاض کو یاد کر کے کہا۔

''کونسی مس ریاض وہ جو نئی آئی ہیں' وہ وہ.....'' اوما بھی نرم پڑ کر بولی۔

''سنا ہے ہماری انگلش کی کلاس لیں گی۔ پتہ ہے جس روز وہ پہلے دن سکول آئی ہیں ناں میں پھاٹک کے پاس کھڑی تھی' وہ کار سے اتریں..... جوڑے کو ٹھیک کرتی میرے پاس آ گئیں۔''

''تمہارے پاس؟..... کتنی پاس؟.....'' اوما کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

مس ریاض کے حسن و جمال پر قریباً ساری کلاس کو دل کے دورے پڑ رہے تھے۔

''پوچھنے لگیں ہیڈ مسٹریس کہاں ہوں گی میں تمہاری نئی ٹیچر ہوں انگلش کی.....''

''پھر پھر تم نے کیا کہا.....؟''

''کہنا کیا تھا انہیں دفتر میں لے گئی.....''

''تم خود.....''

''کرشن کال ہوگئی ہے چوتھی بار اب چلی چلو.....'' سریندران کے پاس آ کر بولا۔

لیکن جب وہ تینوں واپس سٹیج پر پہنچے تو شوکت غائب تھا۔ باہر کرسیوں پر بیٹھی بہن جیز اور بھا پا جی تالیاں بجا بجا کر کہہ رہے تھے..... ''ہم قوالی سنیں گے..... مجرا دیکھیں گے..... مسلم کلچر زندہ باد..... مسلم کلچر پائندہ باد.....''

وہ بہن جی جن کی آنکھیں ناریل کے چھوٹے نشانوں جیسی تھیں اٹھ کر ناچنے بھی لگی تھیں۔ بی جی ان میں ملکہ وکٹوریہ کے مجسمے سی بے جان بیٹھی تھیں۔ یہ گرہست یہ ہلڑ بازی ان کے بس کی نہ تھی۔ بظاہر وہ کروشیا بُن رہی تھیں۔ بہ باطن وہ اپنے نصیبوں کو کوس رہی تھیں۔ گو ہندو کلچر میں کزن لوگ آپس میں بہن بھائی ہوتے ہیں اور ان کی شادی ممکن نہیں لیکن اب تک سارے بھا پا جیز سرکس کے شیر بن چکے تھے اور بہن جیز کے ہاتھوں میں ہنٹر تھے۔ سارے بھا پا جیز غراتے بد کتے منہ بناتے لیکن کرتے وہی کچھ جو بہن جیز چاہتی تھیں..... یہاں کزن کا رشتہ دوستی سے زیادہ اور عاشقی سے قدرے کم تھا..... وہ سارے اپنے میں خوش تھے لیکن بچوں کو یوں لگا کہ سب ان پر ہنس رہے ہیں۔ روی تو پہلے ہی اغوا شدہ بچے کی طرح رو رہا تھا۔ اب یہ تینوں بھی آنسو گرانے لگے۔

باہر نانا فرنولیس کی بھتیجیاں اور رضیہ سلطانہ کی بھانجیاں اونچے اونچے ہنس رہی تھیں۔ شوکت کا پتہ نہیں تھا کہ کہاں گیا..... کسی نے دیوٹ جلانے یا شوکت کو تلاش کرنے کی کوشش نہ کی۔

پھر وکیل کھوسلا صاحب کی گرجدار آواز آئی۔ ''اس گھر میں کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ میں تم سب لڑکوں کو ملٹری میں جبری بھرتی میں دے دوں گا..... انگریز تمہیں سیدھا کرے گا اور ان ساری کنیاؤں کو فوجی افسروں سے بیاہوں گا..... اگر دولت بغیر ہمت کے ملتی ہے تو اس کے یہ معنی تو نہیں کہ گھر میں سیواجی مرہٹہ کی حکومت قائم ہو جائے..... چلو..... اٹھو۔ اگر پڑھ نہیں سکتے تو کچھ کام کاج کرو ڈھنگ کا اٹھنا بیٹھنا سیکھو بھاگو.....''

سارے لڑکے لڑکیاں کھسک گئے اور اکیلی بی جی ایک پچھلی کرسی پر بیٹھی کروشیا بُنتی رہ گئیں.....

●○●○●○

دوسرا عہد

(الف)

پتہ نہیں یہ اوما کی طرفداریاں تھیں یا پھر واقعی ملیریا کا حملہ تھا۔ شوکت کو گھر پہنچتے پہنچتے لرزا لرزا کر بخار چڑھ آیا۔ دادا ابا روز مسجد سے دم کروا کے پانی لاتے۔ مسجد بھی خاصی دو میل دور تھی اور اتنا چل کر دادا ابا کا سانس اکھڑ جاتا۔ کہاں تو اماں ساجدہ وسارا دن کاموں میں ابھی سلام کا جواب بھی دینے کو تیار نہ ملتیں۔ کہاں اب شوکی بھیا کے سرہانے بیٹھ کر کبھی سر دباتیں کبھی قرآن پڑھتیں۔ کبھی یونہی ہوا میں دیکھنے لگتیں۔ شوکت مغل کے پلنگ پر ٹرین کے انجن' ڈبے' کیلنڈوڈیزی گن' ان گنت پرانے بیٹری کے سیل پڑے رہتے۔ کسی کھلونے کو چھونے کا حکم نہ تھا۔ کروٹ لینے پر کوئی چیز نیچے گر جاتی تو اماں فوراً حکم دیتیں" راحیلہ اوپر رکھو کھلونے۔"

جب بخار کم ہوتا تو شوکی بھیا کی آنکھوں میں ان ہی کھلونوں کو دیکھ کر چمک آ جاتی لیکن ہر دوسرے تیسرے پھر دھڑنے کا بخار چڑھتا۔ وہ پہروں ٹھٹھرتے۔ رضائیاں' کمبل' گرم پانی کی بوتلیں آتی جاتی رہتیں لیکن شوکت کا لرزہ کم نہ ہوتا۔ پھر اوما بار کر ان کے ساتھ لیٹ جاتیں اور ہاتھ پاؤں مساج کر کے گرم کرنے کی سعی کرتیں۔ شوکی کے دانت ایسے وقت یوں کٹکٹاتے کہ لگتا ٹائپ رائٹر چل رہا ہے۔ آنکھوں کی پتلیاں پھیل جاتیں اور گھٹنے پیٹ کے ساتھ لگ جاتے۔ جوں جوں بخار چڑھتا' شوکی کی آنکھیں بیر بہوٹی سی سرخ ہو جاتیں اور لب کے کونے یوں لٹک جاتے گویا اندر دانت نہ ہوں۔

بخار کے ساتھ ساتھ اماں ساجدہ کا پارہ بھی چڑھتا۔ راحیلہ اور اوما کو حکم ملتا کہیں اور جا کر منہ کالا کریں۔ راحیلہ تو خیر بڑی بہن تھی' کچھ دیر کو غائب بھی ہو جاتی تو پھر کھسکتی کھسکتی ادھر ہی آ نکلتی لیکن اوما بھی اپنے گھر بیٹھ نہ سکتی تھی۔ سر سوتی بہن جی کو جل دے کر شوکت کے پلنگ پر جا لگتی۔ پھر اپنے نازک ہاتھوں سے شوکت کا سر دباتی۔ شوکت کی طبیعت پوچھنے کبھی آئے۔ ایک نہ پہنچا تو سریندر۔ اوما نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جو سریندر سے بولے گا' وہ گئو ماتا کھائے۔

"رام رام ایسی بات تو سوچنی بھی نہ چاہیے اوما بہن جی....." روی بولا۔

لیکن اوما تو جب غصے میں آتی دریا کی طغیانی بن جاتی۔

اماں ساجدہ کے لیے یہ وقت آزمائش کا تھا۔ وہ شاخِ نبات کہ اردگرد مصری لپٹی ہے اور خود خشک پھیکی۔ شاید ہمیشہ وہ ایسے نہ تھیں۔ سنا ہے شروع جوانی میں وہ بڑی ملنسار تھیں۔ سارے محلے کی عورتوں سے ان کی دوستی تھی۔ سب ان

کے گن گاتی تھیں۔ نانا نانی نے انہیں ایسے پالا تھا گویا وہ کوئی شہزادی ہوں اور سارا جہاں ان کی رعایا۔ ان کا کمرہ علیحدہ تھا جس میں اطلس پروئے پھولوں سے سجے گلدان کروشیے کے میز پوش اور کتابیں تھیں۔ اکلوتی ہونے کے ناطے کوئی کام یا بے آرامی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ سارا دن اردو فارسی کی کتابوں میں وقت گزرتا۔ حافظ کی کئی غزلیں' سعدی کی ان گنت حکایتیں انہیں زبانی یاد تھیں۔ ''پھول'' اور ''غنچہ'' رسالے تو کافی عرصہ آتے رہے۔ پھر جب امی ساجدہ سسرال رخصت ہوئیں تو اس کے بعد ''حور'' اور ''ہمایوں'' رسالے آتے رہے..... چار سال امی ہنستی کھیلتی رہیں۔ پھر ہم دونوں کو اماں ساجدہ کا ساتھی بنا کر ڈاکٹر سرفراز انگلستان پڑھنے چلے گئے۔ چھ سال ڈاکٹر صاحب نے گھر کا رخ نہ کیا۔ ان ہی دنوں اماں ساجدہ شاخ نبات بن گئیں کہ ارد گرد ساری مصری لپٹی تھی لیکن وہ خود سوکھی پھیکی۔ حافظ کی غزلیں سوختہ جاں اماں کے اندر سوکھ گئیں اور ان کے دہرانے کی نوبت نہ آئی۔ خطوں کی راہ دیکھنے والی آنکھیں کتابوں کا مطالعہ بھول گئیں۔ ہولے ہولے ایسی ان پڑھ ہو گئیں گویا پوری جاہل۔

چھ سال کا لمبا وقفہ۔ اس دوران اماں ساجدہ کے اندر کیسے کیسے لاوے نہ ابلے ہوں گے۔ کیسی ہیجان پرور کیفیات نے دم نہ توڑا ہوگا۔ اس بیراگ کے عہد کا انہوں نے کبھی کسی سے ذکر نہ کیا۔ ان کے چہرے پر کبھی شگفتگی نہ آئی۔ آنکھوں تلے مستقل حلقے پڑ گئے اور ہونٹوں کی کمان ٹھوڑی کی جانب جھک گئی۔ ڈاکٹر سرفراز جب لندن سے آئے تو ان کی وجاہت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ لمبے چیسٹر پر سرخ مفلر گلے کے گرد لپیٹے فرانسیسی عینک لگائے جب وہ ٹرین سے برآمد ہوئے تو اماں ساجدہ ایک بار پھر گھائل ہو گئیں۔ ایسے انگریز سے بھلا کیسا جھگڑا۔ ادھر ڈاکٹر سرفراز بھی ''سوری'' کہنے اور اپنی غلطی مان کر پھر اپنی ہی کرنے کا فن سیکھ آئے تھے۔ عارضی سمجھوتے اور ڈپلومیٹک گفتگو بھی انہیں آ گئی تھی۔ آتے ہی صلح کا سفید جھنڈا لہرا کر گرہست میں شامل ہو گئے۔ کئی انہونی شرائط بھی مان گئے اور لارڈ کرپس جیسی صورت بنا کر اپنا گھر بسا لیا۔ البتہ ان کے ڈریسنگ ٹیبل پر ایک فرانسیسی عورت کی تصویر برسوں رہی۔ ڈاکٹر سرفراز کہتے تھے کہ اس محسن عورت نے ان کی جان بچائی تھی۔ کیوں؟ کب اور کیسے کا جواب وہ ایسے ہی دیتے جیسے انگریز جس سے متعارف نہ ہوں' اس کی بات کا جواب دیتے ہیں۔ اس فرانسیسی عورت کی تصویر وقت گزرنے پر بھی جواں رہی۔ اس کے برعکس اماں کا چہرہ سہارن پوری سنترے ایسا ہو گیا۔ تصویر کا یہ انجانی طلسم تھا کہ وہ خود امر ہو کر ایک فانی عورت سے مقابلہ کرتی رہی..... بالوں میں ان گنت سفید بال اور دل میں حافظ کی کئی ساکت غزلیں اٹھائے اماں ساجدہ کاموں میں مصروف رہتی تھیں لیکن اس روز شوکت کے بخار نے انہیں بولا دیا یا پھر لاوا خود بخود پھوٹا۔

ڈاکٹر سرفراز شوکت کو دیکھنے اس کے کمرے میں گئے۔ اسٹیتھو سکوپ لگا کر سینہ چیک کیا۔ بیٹری جلا کر حلق میں جھانکا۔ نبض دیکھی۔ تھرمامیٹر نکالا تو چہرہ متوحش ہو گیا۔

''بخار پھر تیز ہے۔ برف کی پٹیاں لگانا پڑیں گی.....''

''میں آپ سے کبھی کی کہہ رہی ہوں آپ مجھے گورداسپور بھجوا دیجئے۔ پتہ نہیں یہ کیسی آسیب زدہ جگہ ہے۔ یہاں جب سے آئے ہیں ایک پل آرام کا نہیں ملا.....''

''پہاڑ خوبصورت بھی ہیں اور یہاں پُرسکون زندگی بھی ہے.....وہاں آپ اکیلی کیا کریں گی؟''

''جو کچھ تب کیا کرتی تھی، جب آپ لندن میں تھے.....''

دونوں جانب سرد خاموشی طاری ہوگئی۔

''بیٹا بیمار ہے، ٹھیک ہو جائے گا..... ملیریا بھی کبھی اسی طرح تنگ کرتا ہے.....''

''آپ کے ابا جی ٹھیک کہتے ہیں۔ اس ضلع میں تو مسلمان دیکھنے کو نہیں ملتے۔ بھیڑی خانے کی طرف کچھ گھرانے ہیں یا پھر ریلوے کی طرف..... سیاسی موسم ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب آپ مانیں نہ مانیں ہمیں خواہ مخواہ اکثریت کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت نہیں۔''

''تم ساجدہ بیگم تنگ نظر ہو..... یہاں کے لوگ شائستہ، تعلیم یافتہ اور مہذب ہیں۔ یہ کبھی زیادتی کرنے والے نہیں..... انہیں معلوم ہے بادشاہت مغلوں سے کس چالاکی سے چھینی گئی اور کون اس ملک کا وارث رہا ہے۔''

''ابھی کل زنانہ کلب میں عورتیں باتیں کر رہی تھیں کہ جیسے انگریز حملہ آور ویسے لودھی، پٹھان، مغل حملہ آور سب اپنے اپنے دیسوں کو لوٹ جائیں۔ رہنا ہے تو اقلیت کے روپ میں رہیں ورنہ Quit India۔''

''پھر آپ نے کیا جواب دیا۔''

''لیجیے میرے سامنے تھوڑی کہا..... میرے پہنچنے پر تو سب کی سب چپ ہو گئیں جیسے سانپ سونگھ گیا۔ اپنا تو مجھے فکر نہیں رہتا..... یہ شوکت اور راحیلہ بیچارے باتیں سنتے ہوں گے..... ان کو کیا پتہ اندر کیا چل رہی ہے؟''

''انہیں اپنے سے مختلف لوگوں کا نکتہ نظر سمجھنا چاہیے۔ ان کے ساتھ رہنا آنا چاہیے.....''

لبرل ڈاکٹر سرفراز بولے۔

''ہاں جی..... آپ تو لوگوں کو ٹریننگ ہی دینے کے لیے آئے ہیں اس جہاں میں۔''

پہلی بار اماں ساجدہ کے چہرے پر آنسو امڈ آئے۔ وہ اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ ڈاکٹر سرفراز کو یکدم احساس ہوا کہ کبھی کبھی لبرل لوگ بھی ظالم ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد دادا ابا تشریف لائے۔ ان کی سفید پشمینے کی شال کندھوں سے ڈھلک کر بازوؤں پر پڑی تھی اور وہ ضبط کے باوجود پریشان لگتے تھے۔

''ساجدہ بہو! کیا حال ہے کاکے کا؟''

''ابھی ڈاکٹر صاحب ٹیکہ لگا کر گئے ہیں۔ بخار تو ٹلنے کا نام ہی نہیں لیتا.....''

''اللہ بہتر کرے گا، بہتر ہوگا..... '' دم کیے ہوئے پانی کے گلاس کو تپائی پر رکھ کر دادا ابا بولے۔

''اب کیا بہتری جی بچہ ہلکان ہو گیا ہے..... '' اماں بولیں۔

''علاج ہو رہا ہے، دعا ہو رہی ہے۔ تمہیں کیا پتہ صاحبزادی! اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ یہ پانی ضرور پلا دینا۔ بھئی اگلے زمانے میں سوئیاں چبھونے کا رواج نہیں تھا۔ جڑی بوٹی پلاتے تھے۔ حکیم لوگوں کی جونکیں لگوا کر صحت ہو جاتی تھی..... اعتقاد تھا اعتقاد..... تم دیکھتی جاؤ اعتقاد ہوگا تو مسلمان قوم کے لیے بھی بہتری کی صورت بن جائے گی۔ حضرت موسیٰ ساری قوم کو ہانک کر لے گئے تھے ناں..... پرانے زمانے کے لوگ اعتقاد کے دھنی تھے۔''

قریب بیٹھی راحیلہ نے سوال کیا..... ''دھنی؟ کیا معنی دادا ابا..... یعنی دھن والے۔''
''تمہارا بھی اللہ ہی مالک ہے۔ سکول میں ہندی پڑھتی ہو۔ سکول کے بعد ہنود کے ساتھ پھرتی ہو۔ تبھی تمہیں دھنی کے معنی دھن والے ہی سمجھ آئیں گے ناں.....''
''اس بیچاری کا کیا قصور..... یہاں آپ کے ڈاکٹر صاحب نے لا کر بٹھا دیا ہے۔ ان کا تو ہر فیصلہ ہی نرالا ہوتا ہے.....''
دادا ابا نے کچھ برا مان کر کہا..... ''شی آنکھ لگی ہے شوکت کی۔ آہستہ بولو..... '' پھر خود ہی سرگوشی میں گویا ہوئے۔
''سنو پہلے لیموں کاٹ کر اس پر نمک اور کالی مرچ ڈال دینا۔ پھر تھوڑی دیر کے لیے توے پر رکھ کر پکانا..... کھانسی نہیں آئے گی۔ پھر قطرہ قطرہ شوکت کے حلق میں ٹپکانا..... ملیریا میں معدہ خراب ہو جاتا ہے۔ لیموں اکسیر ہے اکسیر.....''
دادا ابا اٹھے۔ اپنے کندھے سفید چادر سے لپیٹے اور چلتے چلتے کہا..... '' کچھ اس کے برقعے کا انتظام کرو ساجدہ بہو۔ یا اب بچی نہیں ہے.....''
دادا ابا کے جاتے ہی او ما دارد ہو گئی۔ اسے مغل بچے کا فکر کھائے جاتا تھا۔ پہلے تو وہ مسمی شکل لے کر بیٹھی رہی۔ پھر جب اماں ساجدہ سوپ لینے گئیں تو اس نے اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھ شوکت کے گالوں پر رکھ دیے۔
شوکت نے ہولے ہولے آنکھیں کھولیں اور تھرتھری لے کر مسکرایا۔
''سکول میں ایک نیا لڑکا آیا ہے پنجاب سے' بالکل گنوار ہے گنوار۔''
راحیلہ بھی پاس گھس بیٹھی..... ''اچھا کون؟.....''
''بیچارہ کسی معمولی سکول سے آیا ہے۔ ذرا انگریزی نہیں جانتا' ہاں سچ..... تم تو کل سکول نہیں آئی تھیں راحیلہ..... کل کی بات ہے۔ مس ریاض حاضری لے رہی تھیں۔ میرے بعد رنجیت کی آواز آئی۔ جب مس ریاض نے کہا رنجیت تو پتہ ہے کیا بولا.....''
''کیا کیا کیا..... '' شوکی بھی کہنی کے بل ہو گیا۔
''سب کہہ رہے تھے پریذنٹ پلیز اور اس نے کہا نائم ہیں..... ساری کلاس ہنسنے لگی اور پتہ ہے راحیلہ! رنجیت رونے لگا..... آج وہ سکول بھی نہیں آیا.....''
شوکت نے آنکھیں بند کر لیں اور تکیے پر سر رکھ کر بولا..... ''کسی پر ہنسنا نہیں چاہیے..... پتہ نہیں ہم لوگ دوسروں پر کیوں ہنستے ہیں۔''
اوما لڑکی تھی لیکن گروہ میں سب سے بہادر۔
''دوسروں کی ہنسی کا مقابلہ کرنا چاہیے.....''
''کبھی کبھی وہ تعداد میں زیادہ بھی ہوتے ہیں ہنسنے والے پھر.....''
''اور کبھی کبھی ہاتھی کو چیونٹی ختم کر دیتی ہے.....''
''ہاں لیکن کبھی کبھی ہمیشہ نہیں.....''

اس وقت اماں ساجدہ سوپ لے کر داخل ہوئیں۔
"ارے ارے رے کیا اوپر چڑھ کر بیٹھی ہو کسی اور جگہ جا کر کھیلو۔"
"ٹھیک ہے امی کھیلنے دیں یہیں....." شوکت بولا۔
اس وقت ڈاکٹر سرفراز پھر داخل ہوئے اور شوکت کا ماتھا چھو کر بولے....." کیسے ہو بیٹا۔"
"ٹھیک ہوں ابی جی....."
"وہ وکیل کھوسلا کی فیملی کے لوگ شوکت میاں کی طبیعت پوچھنے آئے ہیں۔"
کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب امی سے ایسے بات کرتے کہ ان کا لہجہ خاص دھیما ہوتا جیسے تلافی کر رہے ہوں۔ ان گئے سالوں کا کفارہ ادا کر رہے ہوں جو انہوں نے مغرب میں گزارے۔ امی یوں سنتی جیسے ریڈیو کی وہ بد مزہ خبریں ہوں جو جنگ سے متعلق گھڑی گھڑی نشر کی جاتی تھیں اور جن کا ان کی اپنی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ امی ابی اس بے تعلقی اور اکٹھے پن سے رہتے تھے کہ بچے سمجھ نہ سکتے ان کا رابطہ سطحی ہے یا گہرا..... اس میں کون بیزار ہے اور کون محبت کا دعویدار.....
"ان کو بھی ابھی آنا تھا۔ بخار چڑھ رہا ہے....."
"ساتھ والے کمرے میں ہیں سب آہستہ بولیں....."
شوکت نے آنکھ کی جھری سے دیکھ کر کہا....." سریندر بھی آیا ہے امی....."
وکیل کھوسلا کے گھر سے ایوننگ ان پیرس کی خوشبو میں بسی عورتیں آئیں تو اسپرٹ کی بو میں مل جل گئیں۔
سب سے آخر میں لبوں پر زبان پھیرتا سریندر داخل ہوا۔
اوما کو نہ جانے اس مرن ہارے سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ راحیلہ کے کان میں بولی" مجھے یہ لڑکا زہر لگتا ہے بیمار سا..... زہریلا سا....."
"نمستے نمستے..... جے رام جی کی....."
سب نے ہاتھ جوڑ دیئے حتیٰ کہ ساجدہ ماں اور راحیلہ نے بھی اکثریت کا ساتھ دیا اور ہاتھ جوڑ کر نمستے نمستے کہا۔
کمرے میں رنگ و بو اور باتوں کا طوفان آ گیا۔ جس کو جہاں جگہ ملی بیٹھ گیا۔ صرف سریندر کھسکتا کھسکتا شوکت کے سرہانے آ پہنچا۔ باتوں کا نہ کوئی سرا تھا نہ کوئی دھارا۔ چلغوزے مونگ پھلی کے چھلکوں کی طرح ادھر اُدھر ڈھیر ہوئی جاتی تھیں..... سرخ لپ سٹک والے دہن دم توڑتے جگنو جیسی چمکتی آنکھیں بھاپا جیز کے لطیفے' بے جی کی قہر بھری آنکھیں..... اماں ساجدہ کی خوفزدہ آنکھیں سب کچھ مل جل کر ایک فلمی فضا بن رہی تھی۔
جب گفتگو دیکتے کوئلوں کی طرح بھڑک رہی تھی۔ سریندر نے آہستہ سے شوکت کے پاس ہو کر کہا....." میں رشی جی کے پاس گیا تھا۔ انہوں نے یہ تین پتے دیئے ہیں۔ بس تین دن پی لینا' کبھی بخار نہ ہوگا۔"
"تین پتے؟" شوکت نے بھی آواز میں پوچھا۔
"ہاں تین پتے..... ایک تلسی کا ہے' ایک کینتھ کا اور ایک یوکلپٹس کا۔ ملا کر پینے سے ملیریا شمشان بھومی پہنچ جاتا ہے۔"

اوما نے قہر بھری نظروں سے سریندر کو دیکھا۔ بھلا شوکت مغل سے اس سے زیادہ ہمدردی کیسے ہو سکتی تھی۔

''بھئی اٹھیے..... آج ہمالیہ ٹاکیز میں کنگن فلم کا آخری شو ہے.....'' رنگ و بو کا سیلاب اٹھا۔

''اوما راحیلہ چلو گی ہمارے ساتھ؟ ہم واپسی پر چھوڑ جائیں گی۔'' ایک بہن جی بولیں۔

''انھیں جی سرسوتی بہن جی صرف میٹنی شو دیکھنے دیتی ہیں.....''

''اور تم راحیلہ؟''

''اس کا تو بھائی بیمار ہے.....'' ساجدہ اماں بولیں۔

''ہم تو شوکت کو بھی لینے آئے تھے۔ آپ نے ملیریا بخار کا ہوا بنا لیا ہے..... اٹھو میاں شوکت چلو تمھیں لیلا چٹنس دکھلائیں..... سارا بخار ختم ہو جائے گا.....'' ایک بھایا جی بولے۔ پھر سرخ ہونٹ چمکتے دانت کھلکھلائے۔ ساری بہن جیز نے اپنے آپ کو لیلا چٹنس سمجھا۔

''بھائی شوکت صاحب تمہارے قائد اعظم تو کانگریس کو لوہے کے چنے چبوا رہے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ negotiate کرنا ہے تو مسلم لیگ سے کرو۔ ہم کانگریس کو سارے وطن کی جماعت ہی نہیں سمجھتے اور تم جناب مریل سے پڑے ہو بستر پر..... ایسے لیڈر کو ماننے والے تو بستر میں نہیں ہوتے!''

''لو ڈاکٹر سرفراز کا گھرانہ کب مانتا ہے قائد اعظم کو۔ یہ تو پکے کانگریسی ہیں پکے.....''

''لیٹے رہو..... ہم لوگ تو اس لیڈر کو پوجتے ہیں جس کے تن پر پورا کپڑا ابھی نہیں ہوتا۔ جو چلتا ہے تو ڈنڈے کے سہارے۔''

پتہ نہیں اب کیوں فرمائشی قہقہہ پڑا.....

کسی بہن جی کسی بھایا جی کو پروا نہ تھی کہ وہ کہاں کھڑے ہیں۔ اکثریت اپنے زور میں تھی۔

''الگ ملک مانگتے ہیں بہن جی..... پتہ ہے کیا کریں گے الگ ملک سے.....سیانے سارا کچھ کھا پی جائیں گے باقی خانقاہوں میں جا بسیں گے اللہ اللہ کرنے.....''

ایک اور قہقہہ.....

''یہ تم نے کیسے کہا.....؟'' ایک بہن جی بولیں۔

''پورا ہندوستان تھا ان کے پاس..... ہم تو رعایا تھے مغلوں کی' پھر کیا کیا؟ کھا پی گئے..... قوالی سنی اور مجرا دیکھا۔ حرم بسائے اور کھاتے رہے۔ مٹھی بھر انگریزوں نے سارا ہندوستان ہتھیا لیا..... اب پھر وہی کچھ کریں گے..... مسلمان کھائے پئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کا پیٹ ہی اس کا دوزخ ہے.....''

بی بی ہمسائی جلدی سے ہاتھ جوڑ کر بولیں..... ''بہن جی! پرماتما بیٹے کو جلد صحت دے۔ بھئی وہ کنگن فلم میں انٹرول ہوگا' جب ہم پہنچیں گے..... چلو چلو چلو.....''

نمستے' پرنام میں بہن جیز اور بھایا جیز رخصت ہو گئے..... ان کے جانے کے بعد شوکت کا بخار اچانک نارمل ہو گیا..... اسے سمجھ آ گئی تھی کہ وہ بیمار رہ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ان کے جاتے ہی اوما نے بڑے رسان سے کہا..... ''راحیلہ!

جب ہم بڑی ہو جائیں گی تو ہم بھی ساڑھیاں پہن کر لپ سٹک لگایا کریں گی۔ کانوں میں بندے' ناخنوں پر کیوٹکس..... ہائے کتنا مزہ آئے گا.....''

ان کو نوجوان' خوبصورت اور خودسر ہونے کا کتنا شوق تھا!

کسی تحریک کسی انسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس طرح یکدم بچپن سے بلوغت کو پہنچ جاتی ہے..... ہمارے گروہ کے تمام افراد اپنے اپنے طور پر نوجوانی کی دہلیز پر جا پہنچے۔ ہر ایک کا تجربہ مختلف تھا۔ ہاں ایک بات سب میں عمومی تھی اور وہ تھی حیرت..... ہم سب اپنی اپنی تبدیلی پر ہراساں تھے اور محجوب بھی۔

اسی طرح کانگریس سے پھٹ کر مسلم لیگ کو یکدم احساس ہوا کہ وہ کسی اور میں مدغم ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی.....فرد بھی اپنی بلوغت کا احساس خود ہی کر سکتا ہے۔ یکدم اسے بھی احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں واحد ہے اور ساتھ ساتھ یہ وحدت دوئی کی کس قدر خواستگار ہوتی ہے.....

مسلم لیگ کو بھی اس وقت کانگریس کی اعانت اس کے اشیرباد کی ایسی ہی ضرورت تھی۔

فرد کو سب سے پہلے انفرادیت کا احساس بڑے sublte طریقے سے ہوتا ہے۔ بلوغت سے پہلے فرد کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ ہندو ہے کہ مسلمان..... ساتھ کھیلنے والی لڑکی ہے کہ لڑکا۔ گروہ میں کون امیر ہے اور کون غریب۔ آگہی کا پہلا چھینٹا کس کھڑکی سے کس طور پر گرتا ہے' اس کا تعین ہوا میں اڑتے پولن کی طرح راز ہے.....

☆☆☆

کچھ دنوں سے اوما میں ایک مختلف خاصیت نے جنم لیا تھا۔ جب ساری توجہ اس پر نہ ہوتی تو وہ روٹھ سی جاتی۔ اپنی ذات کو ان کا نکتہ بنانے کے لیے اسے کچھ الٹا سیدھا بھی کرنا پڑتا تو وہ بے دریغ کرتی۔ اچانک ہی اس کی رنگت نکھر آئی تھی۔ بال چمکیلے اور لمبے ہو گئے تھے اور قد پاشی بہن جی سے دو انچ ہی کم رہ گیا تھا۔ چہرے پر ابھی بھی بچوں کا سا بھولپن تھا لیکن اندر کہیں وہ تیزی سے بدل رہی تھی۔

''جب کھال اتارو گے نا' شوکی بھیا! تو یہ مجھے دے دینا۔'' ہو نے کہا۔

سب ٹوکری پر جھکے تھے۔ صرف اوما نے نہ تو ہو کی استدعا پر کان دھرا نہ ہی ٹوکری میں دیکھنے کی کوئی کوشش کی۔

''پاشی بہن جی کہتی ہیں جیو ہتیا مہا پاپ ہے.....'' اوما نے سب کو چونکانے کے لیے کہا۔

''اور پاشی بہن جی یہ بھی تو کہتی ہیں کہ مسلمان ملیچھ ہیں اور ان کے ساتھ ملنے جلنے والا بھرشٹ ہو جاتا ہے.....''

''یہ تو بہن جی نے کبھی نہیں کہا.....''

''کہہ نہیں رہی تھیں پرسوں..... جب جب۔'' ہو کچھ انکشافات کرنے والا تھا۔

اوما یکدم بدک گئی۔

''جس کو ڈاکٹر ڈاکٹر کھیلنا ہو' کھیلے نہیں تو میں جاتی ہوں۔ مجھے ہوم ورک کرنا ہے۔''

سب شاید منال کی ٹوکری' اس کے مصنوعی بالوں میں مصروف ہو جاتے لیکن اوما کے الٹی میٹم نے فوراً ٹوکری بند کروادی۔ روی کے لیے اسٹیتھو سکوپ نئی چیز تھی۔ ویسے بھی وہ طبعاً اشیا کو اپنی تحویل میں رکھنے کا شوقین تھا۔

کھیل جاری ہوا تو روی فوراً کمپاؤنڈر بن گیا اور اسٹیتھو سکوپ اپنی ملکیت میں لے لیا۔ جب وہ مریض بنا تو سارا وقت اسٹیتھو سکوپ اس کے ہاتھوں میں رہا لیکن جب وارڈ گلی بن کر بھی اسے اپنے پاس رکھنا چاہا تو یکدم اوما بپھر گئی۔

"لاؤ ادھر دو میری باری ہے..... میں ڈاکٹر ہوں۔"

"لیکن دوائیاں، سرنج اور اسٹیتھو سکوپ میرے پاس ہونا چاہیے۔ میں کمپاؤنڈر ہوں۔" شوکت بولا۔

"کیوں میں ڈاکٹر صاحب کا سامان اٹھاؤں گا، میں وارڈ گلی ہوں....." روی چلایا۔

"تو ڈاکٹر کس لیے بلایا ہے..... ڈاکٹر کے پاس اپنا بیگ ہونا چاہیے۔ میں سارا سامان لے کر آ ؤں گی خود ہی۔"

"ڈاکٹر اپنا بیگ تھوڑی اٹھاتا ہے....." روی بپھرا۔

"ہاں اور کیا؟ کمپاؤنڈر کس لیے ہوتا ہے۔"

"یہ وارڈ گلی کا کام ہے....."

"میں لنگڑی لولی نہیں ہوں، اپنا بیگ میں خود اٹھاؤں گی۔"

لڑائی معمولی تھی لیکن فساد کی شکل اختیار کر گئی۔ اس وقت سب چپ ہوئے جب ڈنگے کی طرف سے ڈاکٹر سرفراز اترتے نظر آئے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ راحیلہ یا شوکت کو کوئی سبق سکھانے آ رہے ہیں۔

پہاڑوں پر بسنے والے گو اختلافات سے آگاہ تھے، وکیل کھوسلا' ڈاکٹر سرفراز' حاجی صاحب' ٹھیکیدار برج موہن.....اور سرخ چھتوں والی کوٹھیوں میں رہنے والے اور اختلافات کے ساتھ ساتھ سماجی' معاشرتی' طبقاتی افراط و تفریط کے ساتھ ساتھ ایک نئے لرزے میں مبتلا تھے، وہ یکدم سیاسی طور پر بھی آ گہی کی بلوغت کو چھو رہے تھے۔

اس گروہ میں سب سے پہلے فردیت کا احساس سریندر کو ہوا۔

ان سب نے مل جل کر کھڈ کے بڑے پتھر پر ڈسپنسری بنائی تھی۔ ننھی منی شیشیوں میں متعدد دوائیاں سجائی جا چکی تھیں۔ ایک چھوٹا سا تختہ اسٹیچر کا کام دے رہا تھا۔ وارڈ گلی جب اس پر مریض کو لٹا کر پتھر تک لاتے تو واقعی مریض کو جان کا خطرہ لاحق ہوتا۔ ایک باریک سرکنڈے کو چھیل کر اس میں سوئی پھنسائی تھی اور یہی سرنج کا کام دے رہی تھی۔ بڑی مشکل سے راحیلہ دوپٹے میں چھپا کر اسٹیتھو سکوپ لائی۔ شوکت ڈاکٹر تھا۔ راحیلہ اور بجو وارڈ گلی اور اوما مریض.....اوما کو ویسے بھی ایکٹنگ کا بڑا شوق تھا۔ وہ ہر بار لرزہ میں کانپتی' ہائے اوئی سے ایسا منظر بناتی کہ شوکت بوکھلا جاتا اور اچھی طرح تشخیص نہ کر سکتا کہ ملیریا ہے یا نمونیہ!

مشکل ساری اسٹیتھو سکوپ نے ڈال رکھی تھی۔ اس آلے کا سبھی کو شوق تھا۔ کچھ دیر کو سب نے صبر کیا۔ پھر ڈاکٹر بننے کے لیے جھگڑنے لگے۔ چونکہ راحیلہ چوری کر کے لائی تھی اس لیے اس کا حق فائق تھا۔

"پہلے میری باری..... پہلے میری باری..... پہلے میں....."

جب سبھی دل کی حرکت دیکھنے پر بضد تھے تو اس وقت ہم نے روی کو کھڈ کی جانب آتے دیکھا۔ وہ نیلی نیکر اور نیلی ہی جرسی پہنے ہاتھ میں ایک ٹوکری لیے ہمارے گھر کی جانب جا رہا تھا..... سب کھیلنے میں اس درجہ مصروف تھے کہ کسی نے بھی اسے بلانے کی کوشش نہ کی لیکن شوکت نے پتھروں پر چھلانگیں لگا کر ڈنگے کی جانب بڑھتے ہوئے روی کو پکارا.....

''رودی.....رودی ہم سب یہاں ہیں.....کھنڈ کی طرف.....ادھر آ جاؤ.....''

رودی ٹوکری سنبھالتا ہماری جانب آ گیا۔

''اس ٹوکری میں کیا ہے.....؟'' نیلی آنکھوں والے ہونے سوال کیا۔

''منال ہیں۔ باپو کہہ رہے تھے ذبح کیے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں استعمال نہیں کر سکتے۔ ساجدہ واماں پکا لیں گی۔''

ہم سب ٹوکری پر جھک گئے۔ ٹوکری میں خوبصورت پروں والی دو جنگلی مرغیاں ذبح شدہ موجود تھیں۔ کچھ خون ان کی ادھ کٹی گردنوں سے بہہ کر پروں پر بھی اتر آیا تھا۔ منال مرغی سے مشابہ ایک پہاڑی پرندہ ہے۔ اس کی مشابہت اس درجہ ہے کہ عام لوگ اسے پہاڑی مرغی ہی سمجھتے ہیں۔ اس کی کلغی بڑی خوبصورت اور واضح گہرے سبز سنہری اور فیروزی پر بڑے چمکدار ہوتے ہیں۔ اتنے چمکدار کہ مصنوعی دکھائی دیتے ہیں۔

ان سب سے بچھڑ کر سریندر زندگی کی بھیڑ میں گم ہو گیا.....سب نے اسے بہت آوازیں دیں لیکن زندگی نگل لیتی ہے۔ بس سموچا اپنے اندر سمو لیتی ہے۔ پھر کوئی صدا نہیں آتی۔

سریندر بڑے دنوں بعد شوکت کے گھر آیا تھا۔ یوں تو یہ گروپ پھیلنے کو پھیلتا تو آ تمیا' آلوکا' پرم بہاری' رضیہ' کئی لڑکیاں لڑکے اس میں شامل ہو جاتے۔ سکڑتا تو بس یہی پانچ رہ جاتے۔ ہیڈو ما' شوکت' راحیلہ اور رودی.....کبھی کبھی سریندر دائرے کے مرکز میں داخل ہو جاتا اور کبھی دائرے کی لکیر پر گھومتا رہتا۔

بھاپا جیز اور بہن جیز کے جانے کے بعد وہ بہت کم آتا اور اگر آ بھی جاتا تو بہت کم بولتا۔ بڑے دنوں بعد وہ آیا تو اس کے چہرے پر عینک تھی۔

''ارے رے عینک کب لگوائی تم نے؟'' راحیلہ نے پوچھا۔

سریندر نے پرنام کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر کہا.....''بس تھوڑی دیر ہوئی ہے۔''

''عینک کے بغیر چہرہ اچھا لگتا تھا.....ہے ناں.....''

''ہاں.....ماتا جی کہتی ہیں کہ آہستہ آہستہ عینک بھی جچنے لگے گی.....''

''ہاں یہ بڑے لوگ جو بات بھی منوانی ہو ایسے ہی کہا کرتے ہیں۔''

''میں پوچھنے آیا تھا کہ البتہ کے کیا معنی ہیں۔''

''البتہ..... ہاں وہ البتہ.....دادا ابا سے پوچھ لیں.....''

''نہیں بھئی.....''

سریندر نے ذرا سا مسکرا کر کہا.....''ہمارا ماسٹر ہری پرکاش ہے ناں جیومیٹری کا ٹیچر.....جو سوال اسے نہیں آتا چند لمحے سوچ کر کہا کرتا ہے.....البتہ.....''

''البتہ.....؟''

''یہ کیا بکواس ہے.....یہ پڑھائی.....کتابیں.....زندگی ویسے کچھ کم پھانس ہے کہ اس میں کتابیں بھی شامل کر دی گئی ہیں.....''

''پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟''

''بس.....ایویں ہی ہے۔''

اس کی بات راحیلہ سے زیادہ کون سمجھ سکتا تھا؟ کتاب دیکھ کر ہی راحیلہ کا سانس بند ہونے لگتا۔ کاپیوں پر جھک کر وہ اس کافر کو بیہوں کوسا کرتی جس نے پہلے پہل سکول کھولا' علم کو عام کرنے کی سوچی۔ راحیلہ سوچتی بھلا اگر کوئی انسان کہے کہ ایک نالی ایک حوض کو دو گھنٹے میں پُر کرتی ہے اور دوسری نالی اسے چار گھنٹوں میں خالی کر سکتی ہے اور اگر دونوں نالیاں حوض کو خالی اور پُر کریں تو نتیجہ کیا ہوگا؟ راحیلہ سوچا کرتی کہ آخر وہ شریف انسان تجربہ کر کے دیکھ کیوں نہیں لیتا۔ مفت میں لوگوں سے کیوں پوچھتا پھرتا ہے۔ استانی جی کو شوق ہے تو وہ خود بیٹھ کر سوال نکالیں۔ ایک ادھر بادشاہوں کی قطار تھی کہ مر کے بھی مرنہ چکتے تھے۔ ہر بادشاہ کی کچھ اندرونی اور کچھ بیرونی پالیسیاں تھیں..... کچھ لڑائیاں تھیں۔ بے مقصد بلا وجہ..... بابر کون تھا؟ بھئی تھا ایک بادشاہ..... ہمارا تمہارا خدا بادشاہ اور سنتے ہیں کہ مرے ہوؤں کا نام زیادہ لیں تو وہ قبروں میں کروٹیں لیتے ہیں لیکن سنتا کون ہے سکول میں۔ تاریخ کی ٹیچر پوچھتی ہی جاتی ہے کہ نور جہاں کون تھی..... مس صاحب.....کون سی نور جہاں؟ لڑکیاں تو تمام کی تمام اس نور جہاں کو جانتی ہیں جو ٹھیک ٹھیک کر گاتی ہے۔ سونیا دیساں وچوں دیس پنجاب نی سیئے!..... لیجیے اب کہیں پنجاب کے جغرافیے کے متعلق نہ پوچھنے بیٹھ جائیے..... ویسے بھی راحیلہ اتنی کودن تھی کہ کئی بار اس کے جواب سن کر ساری کلاس کھی کھی کر کے ہنس دیتی۔

سریندر سارے گروپ سے مختلف تھا۔ وہ اب بڑے سکول جاتا تھا لیکن راہ میں ان ساروں سے بھینٹ ہو جاتی تھی.....اسے نہ تو پڑھائی پسند تھی نہ ہی سکول لیکن اس نے کبھی احتجاج نہ کیا تھا بلکہ الٹا پڑھائی کی شو باندھا کرتا۔ سکول جاتے ہوئے کتاب کھول کر چلتا۔ دوستوں میں بیٹھ کر کتاب نکال لیتا لیکن یہ کتابیں ہمیشہ شاعری کی ہوتیں۔

''بتاؤ ناں پڑھائی کیسی چل رہی ہے.....'' راحیلہ نے سوال کیا۔

''راحیلہ.....''

''ہاں ہاں بتاؤ؟.....''

''سب کہاں ہیں؟.....''

''سب؟.....اوما کے گھر.....آج جنم اشٹمی ہے ناں۔''

''وہ.....تم جانتی ہو.....کویتا.....''

''وہ کیا ہوتی ہے.....''

''شاعری.....شعر.....میرا بائی نے کہا تھا۔ جگ ہے گھنگھرو.....

چھن چھن

ہر دم

باجے سدا گھنگھرو.....''

''اچھا یہ میرا بائی نے کہا تھا.....'' راحیلہ نے سوال کیا۔

"ہاں.....او نہیں.....میرا مطلب ہے وہ.....یعنی میرا بائی اس طرح سوچ سکتی تھیں؟"

"بھلا پھر کس نے کہا ہے؟....."

شرمساری سے اس نے کرشن کنہیا کے انداز میں ایک پاؤں اٹھا کر دوسرے پاؤں کے پرے پنجہ جمالیا.....وہ پینٹ اور عینک کی وجہ سے کچھ اوپرا سا محسوس ہوتا تھا۔ ٹیڈروں کے دن زمانے کے بہاؤ میں کہیں دور نکل گئے تھے۔

"میں نے راحیلہ.....میں نے یہ کویتا لکھی ہے۔"

"تم نے....."

نام سے بھی کتنا فرق پڑتا ہے۔ راحیلہ نے سوچا۔ ابھی چند لمحے جب یہ بند میرا بائی سے منسوب تھے تو مہان لگے تھے اور اب یہ کویتا بے جان سی نظر آئی۔

"اچھے ہیں یعنی اچھے شعر ہیں۔ ہائے سدا گنگناؤ....."

"کل میں شمشان بھومی گیا تھا....."

"وہ کیوں.....؟"

"بس چراں کھنڈ کی طرف گیا تو شمشان بھومی بھی گیا۔ ابھی ایک ارتھی جل رہی تھی....."

"اچھا تمہیں ڈر نہیں لگا سریندر....."

"اب مجھے ڈر نہیں لگتا راحیلہ۔ میرے سارے خوف کویتا میں ڈھل جاتے ہیں۔ اور.....اور پھر ایک بار آدمی آخری ڈر سے مل لے.....تو باقی سارے خوف مکڑی کے جالے بن جاتے ہیں....."

پتہ نہیں کیوں راحیلہ کو وہ سہ پہر یاد آ گئی جب اس نے اوما کے ساتھ روز گارڈن کا رخ کیا تھا اور وہاں سریندر کو ایک بہن جی کا ہاتھ چومتے دیکھا تھا.....شاید اس دن سریندر نے خوف کی آخری سرحد کو چھوا تھا۔

"سنو میں نے شمشان بھومی میں کویتا کہی تھی.....

اس شمشان بھومی میں بہت سے گیت گونجے ہیں

کہ جب جلتی ہے ارتھی ہر طرف پھول گونجے ہیں۔"

راحیلہ ہکا بکا رہ گئی۔

"سنو کسی کو بتانا نہیں۔ پتہ نہیں میں نے تمہیں کیوں بتا دیا....."

وہ چلنے لگا اور چند قدم چل کر پھر رکا....."سنو راحیلہ دیدی کسی کو بتانا نہیں.....لوگ ہنستے ہیں۔ خاص کر بہن جیز.....پر یہ بھاؤ نا مجھے جیتے جی چھوڑے گی نہیں....."

راحیلہ کے پیٹ میں اس راز سے کھد بد ہونے لگی۔ اس کے دل میں بھی امنگ اٹھی کہ وہ بھی شاعری کرے۔ بھلا سریندر جیسا Dull لڑکا شمشان بھومی میں کھڑا ہو کر اتنی پیاری بات سوچ سکتا تھا تو راحیلہ ایسا کیوں نہیں کر سکتی۔ اس رات جب شوکت بھیا گہری نیند سو گیا تو دیر تک راحیلہ کاپی پر الفاظ جوڑتی رہی۔ پھر اس نے شوکت بھیا کو جگا دیا....."بھیا میں نے کویتا کہی ہے....."

''خدا قسم راحیلہ ڈیڈی کی گن سے اڑا دوں گا ایسی میٹھی نیند آئی ہے.....''

''سنو تو سہی پھر سو جانا۔ آج جب میں گلابوں کی جھاڑیوں کے پاس بیٹھی تھی ناں تو ایک تتلی ادھر سے گزری.....میں نے فوراً شعر کہا.....تتلی کتلے سے آرہی ہے

تتلی کتلے کو جارہی ہے.....''

شوکت نے آنکھیں مچکائیں اور حیرانی سے بولا.....''ارے بھائی یہ کتلے کیا بلا ہے.....''

''روبی کہتا ہے.....کہ جو چیز وزن میں آتی اسے شاعر بدل دیتے ہیں۔ میں نے بھی زبان ایجاد کی ہے' کتلے یعنی دور سے.....''

''بکواس بند کرو.....''شوکت نے سر پر رضائی لی اور سو گیا۔

اگر اس روز شوکت بھیا نے تحیر کے ساتھ میری بات سنی ہوتی تو راحیلہ کے اندر بھی شاعری کا چشمہ نہ سوکھتا۔ انسان کے پاس سب سے قیمتی چیز تو جذبہ ہی تو ہوتی ہے جو وہ کسی دوسرے شخص کو پلیٹ میں سجا کر دے سکتا ہے لیکن شوکت کے پاس تحیر بھری توجہ تو دور کی بات ہے۔ بالکل معمولی کمر ٹھونکنے کی صورت بھی نہ تھی۔

''کہاں جارہی ہو راحیلہ بی بی.....''

''دادا ابا روز کالج جارہی ہوں پڑھنے.....''

''بیٹی اب تم سیانی ہو چکی ہو.....گھر بیٹھا کرو.....اور خود پڑھا کرو.....اکیلے.....''دادا ابا کی بات ٹھیک تھی لیکن راحیلہ اتنی جلدی بچپن کیسے چھوڑ سکتی تھی۔

''جلدی آجاؤں گی دادا ابا.....''

سریندر کی کویتاؤں نے راحیلہ کے دل میں ایک کھد بد پیدا کر دی۔ وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ کیا شاعری ابھی جاری ہے کہ اس کا جوش بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔

سریندر کی روز کالج ذرا بلندی پر تھی۔ کالج سے نیچے ڈھلوان پر ناشپاتیوں کا باغیچہ تھا۔ ان درختوں پر بے شمار ناشپاتیاں لگتیں لیکن روبی غریب کو حکم نہ تھا کہ ایک پھل توڑ کھائے یا اپنے کسی دوست کی تواضع کرے۔ اسی لیے پھل چرا کر کھانے کی ہوس بہت تیز تھی۔ اندر ہی اندر ماتا جی کے عتاب کا بھی ڈر تھا۔ سریندر کئی بار دل ہی دل میں درختوں کے پھل گنتا اور آرزو کرتا کہ تیز آندھی چلے اور پھل آپ ہی آپ گر جائیں۔ ماتا جی خود ناشپاتیاں تڑوا کر بانٹتیں.....لیکن خود توڑنے کا ارمان سریندر کبھی پورا نہ کر سکا.....وہ ایک خوفزدہ روح تھی۔ سریندر کی زندگی میں شعر نے کیوں جنم لیا؟ اس کی ہمدردی ان بے بس لوگوں کے ساتھ کیوں ہو گئی جو اپنی خواہش کے سامنے لاچار تھے اور جن کا ضمیر بھی اس قدر جابر تھا کہ وہ چوری چھپے اپنی خواہش پوری نہ کر سکتے۔ سریندر بڑا سنجیدہ لڑکا تھا۔ جو شاعرانہ باتیں سوچ کر اندر ہی اندر بہت سی باتیں سلجھا لیتا۔ اسے شوکت بھائی کی طرح نہ تو کبھی شکار کا شوق ہوا نہ ہی مشینری کا۔ نہ اس نے روبی کی طرح فیکٹری اور کاروں کے خواب دیکھے۔ اس کا جسم بھی نازک تھا لیکن اسے خیال نہ آیا کہ وہ کسرت کے ساتھ یا Chest Expander کی مدد سے مضبوط کرے۔ اسے ڈنڈ پیلنے کی بھی خواہش نہ ہوئی۔ جب سے اس نے چینٹ پہننا شروع کی تھی اس کی سوکھی پنڈلیاں اور

تیز ہے سے گھٹنے چپ گئے تھے۔ زردی مائل چپٹی رنگت تیکھی نظروں سے دیکھنے والی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سامنے سے کشادہ تھیں لیکن چہرے پر بجلی لگتی تھیں۔ کان کی لو کے نیچے پیدائشی ایک کنکھجورے جیسا نشان تھا۔

سریندر اس قدر خاموش' گم سم لڑکا تھا کہ دادا ابا بھی پوچھتے رہتے" بھئی اس لونڈے کو کیا ہے..... کیا کرتا ہے یہ۔" کبھی خبر لگتی کہ سریندر کو جکشوؤں کا لباس پہنے کسی نے دیکھا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ خبر گئی کہ روی کسی خفیہ پارٹی کا رکن ہے جو ملک معظم کا تختہ حکومت الٹ دینے کے در پے ہے۔ اوما کا خیال تھا وہ سوشلسٹ ہو چکا ہے اور پریت لڑی پڑھتا ہے۔ شوکت نے بتایا کہ سکول کے ایک معتبر لڑکے نے اسے سیوا سنگت والوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ آخری تیز ترین افواہ تھی کہ سریندر بمبئی ٹاکیز جا کر ایکٹر بننا چاہتا ہے۔

راحیلہ کسی کو بتا نہ سکتی تھی کہ جو شخص ایک ننھی منی سوسائٹی میں ایکٹ نہیں کر سکتا' وہ کیسے اتنا بڑا اسر درد مول لے سکتا ہے۔ ایک ابھرتے اندر تے شاعر کے لیے ابھی اپنے زخم دوسروں کو دکھانا ممکن نہ تھا۔ ناشپاتی کے درختوں میں سے گزرتی راحیلہ سوچتی گئی۔ سریندر کے بارے میں..... اس کے پُر اسرار رونے کے بارے میں.....

برآمدے میں جوتھیکا رائے کی آواز آ رہی تھی۔ درختوں کا بور راحیلہ کی ناک میں گھس رہا تھا۔

"آچھیں..... آچھیں....."

گراموفون کی آواز بند ہو گئی اور آواز آئی۔

"آؤ راحیلہ....."

"آچھیں....."

"اچھا فارغ ہو تو عرض کرو....."

"آچھیں....."

جب سے روی شاعر بن گیا تھا۔ اکیلے میں اسے ملنا راحیلہ کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ اس حجاب پر قابو پا کر وہ بولی....." میں..... آچھیں..... میں تم سے ملنے آئی تھی....."

"مجھ سے....." حیرت سے سریندر نے پوچھا۔

"آچھیں....."

"مجھے تم سے ایک کام تھا راحیلہ....."

ایک بار پھر حجاب کی ہلکی سی ناآشنا دھن دونوں کے درمیان آ گئی۔ سریندر پریشان لگتا تھا اور راحیلہ اس پریشانی سے ڈرتی تھی۔

"کہو کوئی اور کویتا لکھی ہے....."

"لکھی تو ہے لیکن فی الحال وہ پریشانی نہیں ہے....."

"پھر....."

"تمہارے پاس پچاس روپے ہوں گے۔ اوگی ننھی....."

راحیلہ کے سانس ہموار ہوئے اور اس نے دلیری سے پوچھا..... ''وہ کیوں بھئی؟''

''بس درکار ہیں.....''

''اگر تم بمبئی جاؤ اور بند حسن جیسی فلم میں کام کرو اور اشوک کمار جیسے پوز بناؤ تو تمہاری مدد کی جاسکتی ہے۔ میں امی سے پیسے مانگ سکتی ہوں۔''

''اور اگر میں ایسا نہ کرسکا..... تو..... تم مجھے روپے نہیں دو گی۔''

''دے تو دوں سریندر! پر خدا قسم میرے پاس اتنی بڑی رقم ہے ہی نہیں.....'' راحیلہ نے کہا۔

روی نراش ہو کر ایک بچی کرسی میں بیٹھ گیا۔ شام ہو رہی تھی۔ راحیلہ کو پہلی بار خوف سا آیا۔ کیسی مضحکہ خیز بات تھی کہ یہی سریندر سارا دن ان کے گھر گھسا رہتا تھا لیکن ذرا قد بڑھ جانے کی برکات ملاحظہ ہوں۔ اسی سریندر سے خوف آنے لگا۔

''تو تم کچھ نہیں کرسکتیں راحیلہ.....'' اندھے لہجے میں سریندر بولا۔

''ہاں کر تو سکتی ہوں۔ دس روپے اوما کے ہیں۔ پندرہ شوکت بھیا نے میرے پاس رکھوائے ہیں۔ یہ ہو گئے پچیس اور پندرہ میرے اپنے ہیں کتنے ہوئے.....''

''صرف چالیس.....''

''تمہیں تو پچاس درکار ہیں نا ہے ناں.....''

''تم چالیس ہی لے آنا..... میں کھنڈ کے سفید پتھر پر انتظار کروں گا۔ کل شام اسی وقت۔'' وہ گہری چپ کے حوالے ہو گیا۔

راحیلہ چند قدم چلی' پھر رک کر بولی..... ''سریندر کیا تم کمیونسٹ ہو؟.....''

''نہیں تو' لیکن تم سے کس نے کہا؟''

''اوہ اچھا' میں نے سنا تھا۔''

''اور کیا کیا سنا تھا میرے بارے میں راحیلہ؟.....''

''سنا تھا تم بھکشو بننے والے ہو..... تمہیں کسی نے گیروے کپڑے پہنے دیکھا ہے۔''

سریندر ہنسنے لگا..... ''اچھا اور.....؟''

''ہماری کلاس کی بملا کہتی ہے..... تم سوشلسٹ ہو..... اور بم بناتے ہو چراں کھنڈ والے مندر کے پیچھے اور مہا سبھائی تمہاری جان کے دشمن ہیں.....''

سریندر ہنسنے لگا۔ وہ جب بھی ہنستا' بہت ہی بھلا لگتا۔

''ارے بھائی میں ہرگز کوئی خطرناک چیز نہیں ہوں راحیلہ۔ صرف میری خاموشی نے یہ افواہیں اڑائی ہیں۔ تمہیں تو میں بتا چکا ہوں راحیلہ۔ میں لکھتا ہوں' گیت بناتا ہوں۔ میرے جی میں ہے انہیں چھپواؤں۔ ایک بار میں نے تمہیں اپنی کویتا سنائی تھی۔ اب انہیں سنانے دنیا کی اور نکلنا چاہتا ہوں۔ اس قصباتی شہر میں تو نہ کوئی اخبار

نکلتا ہے نہ رسالہ......"

"سنو سریندر راقم جو لکھتے ہو۔ وہ میرا بائی کے بھجنوں جیسے گیت ہیں کہ اختر شیرانی جیسی غزلیں....."

"شیلے کی طرح بھیگے بھیگے خیال..... غالب جیسی غزلیں اور کالی داس جیسے بول....." وہ اپنے متعلق کتنا بھروسہ رکھتا تھا!

"اچھا میں کوشش کروں گی..... لیکن وعدہ نہیں ہے....." راحیلہ بولی۔

"میں تمہاری راہ دیکھوں گا..... کل شام اسی وقت۔"

سریندر کی ملاقات رات بھر راحیلہ کے ساتھ رہی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ شوکت بھیا کا کندھا جھنجوڑ کر اسے بتائے کہ روی ساری دنیا کو اپنی کویتائیں سنانے جا رہا ہے..... لیکن پھر کوئی چیز اسے منع کر رہی تھی کہ شاید شوکت روپے دینے پر رضامند نہ ہو۔ اسے کچھ فلمیں' چھرے اور کیمرے کے لیے ایک گراری خریدنا تھی۔ ویسے بھی شوکت اگر کسی کو بتا دے کہ سریندر جا رہا ہے تو کافی مصیبت پڑ سکتی ہے۔

ساری رات کے سوچ بچار کے بعد راحیلہ نے وعدہ توڑنے کا ارادہ کیا لیکن فجر کے قریب اس نے ایک بڑا بھیانک خواب دیکھا کہ سریندر لاہور میں سڑکوں پر ننگے پاؤں پھر رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کتابیں تھیں' نہرو ٹوپی میں پیوند اور پاجامہ پھٹا ہوا تھا۔ وہ ہر ایک کے سامنے جا کر پوچھتا....."میری کویتا خریدیں گے..... یہ دیکھیے میری کتاب؟"

شاید اس خواب کی وجہ دادا ابا کی وہ کہانیاں تھیں جو وہ ہمیں سناتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر شاعر' مصور' آرٹسٹ بھوکوں مرتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد لوگ اس کی یاد کو ہار پہناتے ہیں۔ سریندر کے اس المیہ انجام کو سوچ کر راحیلہ اداس ہو گئی..... ہائے سریندر سڑکوں پر اپنی کتاب لے کر پھرے گا اور کوئی اس کی ایک کاپی بھی نہ خریدے گا؟ مہا کوی جو ہوا..... ماتا جی سے لے کر گڑیا تک سب پیٹ پیٹ کر روئیں گے۔ ایک کہرام مچ جائے گا..... ہائے کوی سریندر کمار......

راحیلہ کے جی میں یہ بھی آئی کہ جا کر روز کالج میں بھانڈا پھوڑ دے کہ سریندر مجھ سے چالیس روپے لے کر جا رہا ہے ہمیشہ کے لیے..... ایک خواب کے تعاقب..... لیکن پھر خیال آیا کہ یہ سریندر کے ساتھ بے ایمانی ہوگی..... سکول جانے سے پہلے راحیلہ تقویت پکڑ چکی تھی اور اس کا ارادہ شام تک سریندر کو پچاس روپے دینے کا تھا۔

بستہ اٹھائے جب وہ ڈاکٹر سرفراز کے پاس پہنچی تو وہ بھی جنرل ہسپتال جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

"آؤ آؤ..... واہ ہماری بیٹی تو ماں جتنی لمبی ہو گئی ہے کیوں بھئی گیدڑ کی بولی آ گئی کہ ابھی نہیں....."

راحیلہ شرما گئی۔ کئی سالوں سے ڈاکٹر صاحب بچوں سے یہ پوچھتے آ رہے تھے کہ وہ گیدڑ کی بولی سیکھ چکے کہ نہیں۔

"ابی جی دس روپے درکار ہیں....."

"اکٹھے دس روپے..... جانتی ہو دس روپے کتنے ہوتے ہیں۔"

راحیلہ نے سر جھکا لیا۔

"اکٹھے دس روپے!..... بھائی کیوں درکار ہیں؟"

''ساری لڑکیاں پالم پور جا رہی ہیں ابی جی۔ جوگندر نگر کا پاور ہاؤس دیکھنے.....''

''تو امی سے کہو.....''

''وہ ابی جی دراصل اوما کو ماسی کرشنا نے پیسے نہیں دیئے۔ اوما کہتی ہے اگلے مہینے وہ مجھے اپنی پاکٹ منی دے دے گی بس۔''

ابی جی نے روپے تو دے دیئے لیکن ایسا چہرہ بنایا جیسے انہیں راحیلہ کی باتوں پر اعتبار نہ تھا۔

شام کو پورے پچاس روپے مٹھی میں دبائے راحیلہ گھر سے نکلی تو پہلی منزل پر پکڑی گئی۔

''کہاں جا رہی ہو راحیلہ.....''

''جی وہ ذرا اوما کے گھر تک جاتی ہوں.....''

''کیوں کیا کام ہے؟''

''سکول کا کام ہے دادا ابا.....''

''اچھا ابھی شوکت کو آ لینے دو.....وہ ساتھ چلا جائے گا۔''

''دادا جی میں گئی اور آئی.....آپ سوچتے رہ گئے بس۔''

''اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔ بہت ضروری ہے تو میں چلتا ہوں۔'' دادا ابا بولے۔

''آپ چلیں گے.....'' راحیلہ حیرت سے بولی۔

''ہاں تو اور کیا شام ہونے والی ہے.....''

''نہیں جی.....پھر سہی.....''

وہ چپ چاپ کتاب لے کر بیٹھ گئی لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب دادا ابا برآمدے سے گئے تو راحیلہ دبے پاؤں ڈنگے کی طرف گئی اور سانس روک کر سیڑھیاں اترنے لگی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یہ اس کی پہلی چوری تھی اور اس کے نزدیک اتنی سنگین تھی کہ اسے پکا یقین تھا کہ واپسی پر راحیلہ کے لیے اس گھر میں کوئی جگہ نہ ہوگی۔ ابی' دادا ابا' شوکت بھائی ملازم سب برآمدے میں موجود ہوں گے اور ایک مقدمہ بنا ہوا ہوگا۔

چوروں کی طرح ادھر اُدھر دیکھتی راحیلہ سفید پتھر کے پاس انگریزی جو کی جھاڑی کے پیچھے سے برآمد ہوئی..... ''بہت دیر لگا دی تم نے؟''

''ہاں کچھ ہو ہی گئی ہے۔ عینک لگنے والی ہے مجھے بھی.....'' ہاتھ سے پچاس روپے بُڑ مُڑ حالت میں نکال کر اس نے کہا۔

''اس دنیا میں سبھی اندھے ہیں راحیلہ۔ بھگوان نے کیا سیدھے سادے راستے بنائے تھے۔ پھر لوگوں نے پگڈنڈیاں بنالیں۔ غاروں میں اترنے والی کھائیوں کی طرف جانے والی۔ بھگوان نے راہ سجھانے کو آنکھیں دی تھیں۔ ہم نے ان پر غلاف چڑھا لیے.....جب ہم پگڈنڈیوں پر راستہ کھو بیٹھتے ہیں تو پھر ہمیں بھگوان پر غصہ آتا ہے.....دراصل ہم سب جنم جنم کے اندھے ہیں راحیلہ.....''

راحیلہ اس کی بات یوں سننے لگی جیسے سقراط سامنے ہو۔

''گن لو..... پورے پچاس ہیں۔''

''تمہیں کچھ جلدی ہے کیا؟.....''

''ہاں کچھ..... دراصل اب گھر سے شام کے وقت کوئی نکلنے نہیں دیتا۔''

''جانتی ہو یہ میری آخری شام ہے یہاں..... ابھی..... تھوڑی دیر میں آخری بس لے کر میں پٹھان کوٹ چلا جاؤں گا.....''

''آخری شام.....'' راحیلہ خوفزدہ ہو گئی۔ یکدم اسے احساس ہوا کہ اس نے پچاس روپے سریندر کو دے کر روز کالج والوں کے ساتھ بڑا ظلم کیا۔

''شوکت بھائی سے نہیں ملو گے؟.....''

''کسی سے بھی نہیں..... شاید لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں جنگلوں کے لیے پیدا ہوا ہوں..... درختوں کے پتے کھانے والا سریندر.....''

''لوگ بکواس کرتے ہیں.....''

''بکواس..... ہاں بکواس' اندھے لوگوں کی بکواس باتیں..... یہاں سیانے سے سیانا آدمی ہمیشہ پگڈنڈی پر اتر جاتا ہے۔ آگے کھائیاں اور غاریں ملتی ہیں۔ راستہ تو سیدھا تھا' نہ کوئی موڑ نہ کوئی پتھر..... پر ہمیں دکھائی بھی تو دے۔''

راحیلہ نے سریندر سے پوچھنا چاہا کہ وہ بھی کیوں پگڈنڈی اختیار کرنے پر مجبور ہے۔ لیکن..... وہ پوچھ نہ سکی۔

''جلدی سے جلدی تمہاری رقم لوٹا دوں گا راحیلہ.....'' اس نے ایک کارڈ راحیلہ کی جانب بڑھایا۔ گہری شام میں ڈاکٹر سرفراز کا نام بمشکل پڑھا جاتا تھا۔

''یہی ایڈریس ہے ناں تمہارا.....''

''ہاں یہی ہے.....''

''اچھا خدا حافظ سریندر..... اللہ کرے تم مہا کوی بن جاؤ..... گھر گھر لوگ تمہاری نظمیں پڑھیں.....''

سریندر کی آنکھوں میں ایک نئی چمک آ گئی۔ اس نے چہرہ دوسری جانب کیا اور چلنے لگا۔ یوں زندگی کی بھیڑ میں سریندر بھی گم ہو گیا۔ سریندر کے جاتے ہی کئی دن سورج نہ نکلا اور بادل نہ تو برسے نہ گرجے۔ بس وادی پر چھائے رہے۔ سارے گاؤں میں یہی خبر پھیل گئی کہ اچانک وکیل چاچا کا اکلوتا بیٹا لاپتہ ہو گیا۔ دوسرے دن اس کے کمرے سے ایک رقعہ دستیاب ہوا جس پر ایک روایتی سا الوداعی پیام تھا اور التجا کی گئی تھی کہ اسے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ اس نے یہ پگڈنڈی خود اختیار کی ہے۔ راحیلہ' اوما اور باقی گروپ کے کسی نوبالغ میں یہ جرأت نہ تھی کہ وہ روز کالج جا کر وہاں کے باسیوں سے بات کر سکتا..... کئی بار راحیلہ کا جی چاہا کہ اوما سے کہے..... ''گھبراؤ نہیں اوما' کسم تائی' سریندر لاہور گیا ہے۔ وہاں وہ بہت بڑا شاعر بنے گا۔ اس کی کویتائیں رسالوں میں چھپیں گی۔ پھر وہ مشہور ہو جائے گا۔ ایشیا کے بڑے بڑے لیڈر اسے ملنے آئیں گے.....''

لیکن سریندر کی بات ہمیشہ اس کے گلے میں اٹک جاتی۔ یوں سریندر کے متعلق بڑی افواہیں پھیل گئیں اور وکیل چاچا وقت سے بہت پہلے بوڑھے ہو گئے۔

☆☆☆

وہ سبق آخر کو یہی نکلا کہ شوکت جب سے بیمار ہوا تھا اسے سردی سے بچانے کے لیے زیادہ دیر گھر پر ہی رہنا پڑتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سارا گروپ ڈاکٹر صاحب کے گھر میں گھسا رہتا۔ دادا ابا کو اس آمد و رفت پر اعتراض تھا لیکن ڈاکٹر صاحب لبرل مسلمان تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نا ممکن ہے۔

پہاڑوں پر اچانک بادل آ جاتے ہیں اور سارے میں دھندلکا چھانے لگتی ہے۔

''ارے بھئی شوکت مغل صاحب! آپ سے کہا ہے کہ بارش سے پہلے پہلے گھر آ جایا کریں۔ وہ نہ ہو دوبارہ بخار آنے لگے.....''

''ہم تو آ رہے تھے ابو..... یہ مثال بھیجے ہیں روی کے باپو جی نے.....''

سارے نوبالغ ڈسپنسری کی چیزیں اور مثال والی ٹوکری اٹھا کر چڑھائی کی طرف بھاگنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے کھنڈ پاری اور ہسپتال چلے گئے۔ ابھی وہ برآمدے میں پہنچے تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔ ایسی بارش کہ آدھے گھنٹے میں کھنڈ کے وہ سارے پتھر جن پر ڈسپنسری بنی تھی برساتی نالے کے پانیوں میں ڈوب گئے۔ روی نے سب کو بتایا کہ جب ایسی بارش ہو اور بعد میں سورج نکل آئے تو دھنک نکلتی ہے۔ جہاں سے قوسِ قزح شروع ہو وہاں سونے کی کان ہوتی ہے۔ بس ایک دو فٹ کھودو اور سونے کی اینٹیں ہی اینٹیں۔

ادھر بادل گرجتے دھڑکتے بج بجاتے وادی میں برس رہے تھے۔ ادھر سب نادروالے کمرے میں کھڑکیوں سے ناکیں لگائے بارش دیکھنے میں مشغول تھے۔ دیکھتے دیکھتے پول کیمپ کی جانب کوندا۔ بادلوں نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پہاڑوں کو گلے لگایا اور چھن چھن بوندیں اترنے لگیں جیسے اس ملاپ کی تاب نہ لا سکی ہوں۔ ہو ان سب میں چھوٹا تھا اور بادل کی کڑک چمک سے اس کی آنکھوں میں خوف در آیا تھا۔ شوکت موقع غنیمت جان کر وہ ساری سائنسی حقیقتیں بیان کر رہا تھا جو بجلی کے متعلق اسے معلوم تھیں۔ ان باتوں نے سب پر جادو سا کر رکھا تھا۔

''جانتے ہو روی جوگندر نگر میں جو پاور ہاؤس ہے۔ وہاں اوہل ندی کا پانی بس سوئی برابر جگہ پر اترتا ہے۔ بس وہاں کرنٹ پیدا ہوتا ہے اور پھر گھر گھر یہ بجلی پہنچتی ہے.....''

''اوہل ندی کا پانی تالاب کی شکل میں جمع کرتے ہیں ناں شوکت بھیا.....'' ہو نے سوال کیا۔ اس نے ابھی جوگندر نگر نہیں دیکھا تھا۔ علم تو شوکت کا بھی شنیدی تھا کیونکہ اس نے بھی جوگندر نگر کا پاور ہاؤس نہیں دیکھا تھا۔ اس سوال پر شوکت سیٹیاں بجا کر بادلوں کو دیکھنے لگا اور اوما نے ایک بار پھر کرشن مہاراج اور کنس کی کہانی شروع کر دی۔ اوما یہ آتما کتھا اتنی بار سنا چکی تھی کہ ساروں کو یہ زبانی حفظ تھی لیکن جب بھی ہلکی سی بارش شروع ہوتی اوما کے منہ سے یہ کہانی خود بخود بہنے لگتی گویا اس کا گہرا تعلق ہو۔

دادا نے اندر سے آواز دی..... ''راحیلہ، شوکت اندر آ جاؤ۔ ژالہ باری ہونے والی ہے۔'' سب نے سنی ان سنی کر دی۔

پہاڑوں کے بے وفا بادلوں نے جلدی جلدی دھوئیں دھار پہاڑ کا رخ کر لیا اور وادی میں نہ صرف بارش رک گئی بلکہ سورج کی ٹکیہ بھی چھدرے بادلوں سے جھانکنے لگی۔

''آ جاجی آ جا گیدڑ گیدڑی کا بیاہ!'' ہبو نے خوشی سے تالیاں بجا کر کہا۔

''ہاں سورج نکلا ہے پر بوندیں تھوڑا پڑ رہی ہیں۔'' راحیلہ نے ٹوکا۔

''پڑ رہی ہیں ویدی پڑ رہی ہیں۔'' کھڑکی کھول کر ہبو نے انگور کی بیل بلور کر کہا۔ بارش تھوڑی دیر بھی برسے تو بیل پر سے دیر تک بوندیں جڑتی رہتی تھیں۔

''چلو آؤ سونا ڈھونڈنے چلیں..... '' روی بولا۔

''پر دھنک تو ابھی نکلی نہیں۔''

''بھئی چلو تو سہی وہ بھی نکل آئے گی۔''

جب سارے چلنے پر آمادہ ہو گئے تو ہبو کو پتہ نہیں کیوں سریندر یاد آ گیا۔ ''اور سریندر..... اسے نہیں ساتھ لینا؟.....''

''ہاں بھئی اگر سونا نکل آیا تو وہ کہے گا.....''

''کیا کہے گا ہمیں سریندر کو ساتھ نہیں لینا..... '' اوما بولی۔

''اور امی سے اجازت نہیں لینی..... '' راحیلہ بولی۔

''تم جاؤ..... '' اوما نے کہنی مار کر کہا۔

''اچھا میں ڈیزی گن لے آؤں اور امی سے بھی پوچھ آؤں۔ تم سب چلو لیفٹ رائٹ..... لیفٹ رائٹ.....''

ساجدہ ماں سے چھٹی لینا ان دنوں ایک مرحلہ بن گیا تھا لیکن جب سے شوکت کو بخار آیا اس نے امی کو خوش کرنے کے کئی نسخے ایجاد کر لیے۔ ادھر شوکت اپنی بانہیں ماں کے گلے میں ڈالتا' ادھر جھڑکیاں تو ملتیں لیکن ساتھ ہی اجازت بھی ضرور ہی مل جاتی۔ جب شوکت باہر نکلا تو دو سویٹریں اور ایک کوٹ سے لدا ہوا تھا۔ بغل میں ڈیزی گن' وہ پورا فورسٹ آفیسر پر بھوویال لگ رہا تھا۔ جو گرمیاں' سردیاں بستر بند کی طرح کپڑوں سے لدا رہتا تھا۔

ڈنگے سے نیچے کھڈ کی جانب اترنے والی سیڑھیاں گیلی گیلی تھیں۔ ان میں جا بجا خودرو فرن کے میڈن ہیئر کے بوٹے نکل آئے تھے۔ بارش چونکہ ابھی ابھی تھمی تھی' ابھی اترائی کی جانب پانی چھوٹے چھوٹے پرنالوں کی شکل میں کھڈ کی طرف رواں تھا۔ درختوں سے بچتے بچاتے وہ نیچے تک آئے تو ہبو سوں سوں کرنے لگا۔

''بھائی ہبو زکام نہ کروا لینا..... پاشی بہن جی میرے کان اینٹھیں گی.....''

''کوئی نہیں ہوتا زکام شکام..... '' ہبو غرایا۔

کھڈ کراس کرتے ہی ایک بار پھر ہبو کا ضمیر جاگ گیا..... ''تو کیا سریندر کو ساتھ نہیں لے جانا؟''

''جاؤ راحیلہ تم اور اوما بلا لاؤ.....''

''تم کیوں نہیں چلتے ڈیزی ماسٹر..... ہم دونوں نے کوئی ٹھیکہ لیا ہے۔''

"بھئی وہاں درجن بھر بہن جیز اور کوئی ڈیڑھ درجن بھاپا جیز ہیں۔ دھنک نکل کر چلی بھی جائے گی اور ہم واپس نہ آ سکیں گے....."

لڑکے ٹھیک ہی جھینپتے تھے۔ ادھر وہ روز کاٹیج میں نازل ہوئے۔ ادھر بہن جی نے ان کے گرد گھیرا ڈالا۔ ہر قسم کا مذاق اٹھتے چلتے سوالات پوچھے جا رہے ہیں۔ پھر اگر جواب مل رہے ہیں تو کوئی سنتا نہیں۔ البتہ ہر بات پر پھبتیاں شیام گھاٹ مذاق چل رہا ہے۔

لڑکے اس زنانہ پلٹن سے گھبراتے تھے۔

راحیلہ اور اوما اس لیے روز کاٹیج جانا نہیں چاہتی تھیں کہ سارے نوجوان لڑکے ان دونوں کو آرتی سمان چھوٹا سا سمجھتے تھے۔ ان کے دل میں بھی خواہش تھی کہ بھاپا جی انہیں خصوصی توجہ دیں لیکن ادھر گالوں پر چٹکی بیچ بیچ کرکے پیار اور چھوٹے موٹے کام تھما دینا سارے بھاپا جیز کا شغل تھا۔ کوئی گندا تولیہ پکڑا دیتا۔ کوئی سیفٹی ریزر دھونے کے لیے کہتا' کوئی کشن اٹھا کر لانے کو کہتا۔

"ہم نہیں جاتے روز کاٹیج..... ہم آرتی نہیں ہیں..... ہماری بھی کوئی حیثیت ہے۔"

"اچھا تو سریندر کو ناراض کس نے کیا تھا؟ لڑکوں نے کہ تم نے اوما؟....."

شوکت نے سوال کیا۔

"اچھا ہم چلتے ہیں۔ تم لوگ گھنیارے والی سڑک پر چلو ہم آ جائیں گے..... شمشان بھومی سے آگے نہ جانا' مجھے ڈر لگتا ہے....."

ابھی دھنک نہ نکلی تھی۔ سورج بھی بادلوں میں بھی بادلوں سے باہر نکل کر دلیری سے چمکنے لگتا۔ سریندر کے گھر تک پہنچتے پہنچتے سارا راستہ ان دونوں نے مس ریاض کی باتیں کیں۔ مس ریاض لاہور کے کسی طرحدار سکول سے پڑھاتی آئی تھیں۔ وہ ساڑھی پہنتی تھیں۔ بالوں کے جوڑے میں پھول ہوتا۔ چہرے پر لپ سٹک..... ہاں ایک بات ضرور ہے کہ وہ بوسکی کا برقعہ پہن کر سکول آتی تھیں اور ظہر کے وقت لڑکیوں نے انہیں سٹاف روم میں نماز بھی پڑھتے دیکھا تھا۔ راحیلہ اور اوما دونوں کے خوابوں میں علیحدہ علیحدہ مرکزی کردار ادا کر رہی تھیں۔ مشکل صرف یہ تھی کہ ان دنوں راحیلہ اور اوما کے درمیان یہی مس ریاض ایک اندھے شیشے کا کام بھی کر رہی تھیں..... دونوں سارا وقت مس ریاض کی باتیں ہی کرنا چاہتی تھیں لیکن ایک مشکل مقام پر آ کر وہ دونوں ہی اعتراف سے گریز کر جاتیں۔

روز کاٹیج بارش میں دھل کر بڑا خوبصورت لگ رہا تھا۔ سورج کی تازہ روشنی میں اس کی سرخ چھت تازہ پینٹ کی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ترائی تک گلاب کی جھاڑیاں اور ان کے درمیان چڑھتی چوڑی پگڈنڈی پر سیلن تھی اور ابھی بھی کہیں کہیں پانی چھوٹے سے پرنالے کی شکل میں اتر رہے تھے۔

روز کاٹیج میں بالکل خاموشی تھی۔ کہیں بھی بہن جیز اور بھاپا جیز کا کراؤڈ نہ تھا۔ وکیل کھوسلا صاحب تو گھر پر بھی ہوتے ہی نہ تھے۔ یا تو وہ لوئر دھرمسالہ کی کچہریوں میں ہوتے یا پھر شام کو کلب میں مل سکتے تھے۔ ماتا جی اور آرتی کا بھی کہیں سراغ نہ تھا۔ باورچی خانے کی جانب سے بھی کوئی آواز نہ آ رہی تھی..... یوں لگتا تھا جیسے وہ لوگ بھی سونے کی تلاش

میں جاچکے تھے۔ اوما اور راحیلہ کمروں میں بھٹکنے لگیں۔ ایک کمرے میں دو بہن جیز رضائی اوڑھے' بال کھولے بے سدھ سو رہی تھیں۔ ان کے اونگھتے سوتے وجود ڈریسنگ ٹیبل کے شیشوں میں منعکس ہو رہے تھے۔ ہلکی ہوا کے باعث کھڑکی کے جالی دار پردے بڑے شائستگی سے ہلکورے لے رہے تھے۔ وہ دونوں اس کمرے سے دبے پاؤں لوٹ گئیں.....

''ادھر دیکھ لیں ساوتری دیدی کے کمرے میں؟.....'' اوما نے پوچھا۔

اوما کا بازو راحیلہ کی کمر میں حائل تھا اور راحیلہ نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر جما رکھا تھا۔ اس طرح وہ دونوں ایک مرضی ایک رائے تلے چل رہی تھیں۔

ساوتری دیدی بہن جیز کے گروپ میں پوری رینو کا دیوی لگتی تھیں۔ ویسی ہی نازک' خوش اندام' دھلی دھلائی' ان کے کمرے میں پورا دربار لگتا تھا لیکن آج دیدی کے کمرے کی جانب خاموشی تھی۔ بڑا پلنگ' صوفے' قدِ آدم آئینے' سنگار میز جاپانی ریشمی پردے' مخملی گدیاں' پھولدان' سب کے سب چپ تھے..... دوپہر کی خاموش فضا میں دیدی پلنگ پر پوری سلیپنگ بیوٹی بنی سو رہی تھیں۔ ملکۂ معظمہ کے جسم پر کمبل تھا لیکن ایک کبوتر سا پاؤں اور بازو کمبل سے باہر تھے۔ دیدی کا سنگ مرمر میں تراشا ہوا بازو کہنی سے اوپر تک ننگا تھا اور تین سرخ چوڑیاں اس رنگت پر اور بھی نکھر آئی تھیں۔ دور کہیں شہد پینے والی چڑیا نے بڑے ترنم سے سیٹی بجائی۔

اوما اور راحیلہ کے قدم پردے کے پاس ہی رک گئے۔

قالین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر سریندر دیدی ساوتری کے پاؤں چوم رہا تھا اور اوما کو یہ بھی شبہ ہوا کہ اس نے سریندر کی گال پر اٹکا ہوا آنسو بہتے دیکھا ہے.....

سریندر اس عقیدت کے اظہار کے ساتھ ہی گویا اس گروپ سے نکل گیا..... اس نے گروپ سے نکل کر فرد کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ایسا فرد جس کے اپنے راز اپنی پہیلیاں ہوتی ہیں۔ بلوغت کی آگہی نے بڑے چپت انداز سے اس پر حملہ کر دیا تھا اور اب وہ بچہ نہیں رہا تھا۔ لڑکپن بھی کہیں دور تھا..... اس ایک بوسے کی شہادت نے ان دونوں کو بھی چور بنا دیا۔ ابھی وہ بازو ہاتھ گتھم گتھا آئی تھیں' اب وہ الگ الگ نظریں چرا کر چلنے لگیں۔

سورج بادلوں میں چھپ گیا اور ایک بار پھر بوندا باندی ہونے لگی..... شمشان بھومی تک پہنچتے پہنچتے وہ آپس میں بھی نہ بولی تھیں..... پہلی بار ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ احساس ہوا کہ پہاڑوں میں پرندوں اور ہریالی کے علاوہ اور بھی کئی خطرے ہو سکتے ہیں۔ انہیں اپنی ذات کا احساس اس کے کانچ ہونے پر حیرت ہوئی اور وہ اپنے اپنے دل میں زندگی سے پہلی بار خوفزدہ ہو کر رہ گئیں۔

اوما اور راحیلہ منانے گئی تھیں لیکن ایسی پشیمان لوٹیں کہ سب کے پوچھنے کے باوجود نہ تو کچھ جواب بن پڑا اور نہ ہی دوبارہ روز کا نیچ جانے کی ہمت ہوئی۔ برساتیں نکل جانے پر سکول کھل گئے۔ سیر پاٹے کے لیے آئے ہوئے پنجابی مسافر واپس لوٹنے لگے۔ روی' شوکت اور سریندر لڑکوں کے سکول میں چلے گئے لیکن ہوا بھی جونیئر سکول میں ہی تھا۔ ساری فضا یکدم نکھر گئی تھی۔ خنکی اور خفند نے ڈیرے ڈالنا شروع کر دیے۔ گو لڑکوں نے سکول بدل لیا تھا لیکن راحیلہ اور اوما ابھی بھی اپنے گروپ کے ساتھ سکول جاتی تھیں..... وہاں جہاں بانس کے جھنڈ شروع ہوتے تھے اور بڑا چوراہا تھا وہاں پہنچ کر

روی اور شوکت مین سڑک پر کچہریوں کالج کی طرف چلے جاتے لیکن اوما' راحیلہ اور ببو بائیں ہاتھ مڑ کر زنانہ سکول کی جانب رواں ہو جاتے۔

شوکت نے سکول میں ٹیلی فون کی ایجاد پر کافی انفرمیشن حاصل کر لی۔ گھر پر شوکت اور ہریش نے مل کر ٹیلی فون ایجاد کیا۔ ماچس کی ڈبیاں لے کر اس میں دھاگے پروئے جاتے۔ پھر الگ الگ کمروں میں بیٹھ کر فون پر بات کی جاتی.....

اس روز راحیلہ اوما کے گھر دادا ابا سے چھپ کر گئی تھی۔ وہاں اس نے سرسوتی بہن سے ساڑھی مانگنا تھی۔ سکول میں نل دمنتی کا ڈرامہ ہو رہا تھا اور راحیلہ کو دمنتی کا رول ادا کرنا تھا۔ جب وہ اوما کے گھر پہنچی تو گھر میں سرسوتی بہن تھیں۔ باقی سب بھاگو ناتھ کے مندر میں ماتھا ٹیکنے گئے ہوئے۔

بھاگو ناتھ ایک طرح سے پکنک سپاٹ بھی تھا اور مذہبی عقیدت کا مرکز بھی۔ یہاں بہت خوبصورت دو تالاب تھے جہاں پتھروں کے شیر ایستادہ تھے۔ ان شیروں کے منہ سے پانی پہلے اوپر والے تالاب میں اور پھر نچلے تالاب میں بھرتا تھا۔ کچھ اوپر سڑک پار کر کے ایک مندر تھا۔ سنتے تھے کہ یہاں کے مہنت کسی غیر مذہب کے آدمی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ایک بار لڑکیوں کا بڑا ٹولہ یہاں پکنک منانے گیا تھا۔ راحیلہ کے ماتھے پر اوما نے یہ بڑا سا سیندور کا ٹیکہ لگا دیا تھا۔ اس کے باوجود جب سب مندر میں داخل ہونے لگے تو مہنت جی نے راحیلہ کو روک کر کہا۔

''بی بی آپ اندر نہیں جا سکتیں.....''

ساری لڑکیاں حیران رہ گئیں.....

''کیوں جی.....؟''

''تم کون ہو ست وتی؟.....'' مہنت جی نے پوچھا۔

''میں جی.....''

''مسلمان ہو ناں.....''

''جی !.....''

''پھر تم باہر ہی رہو.....'' راحیلہ مندر کی دیوار چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

اس دن کے بعد راحیلہ نے نہ تو بھاگو ناتھ کا نام لیا نہ کبھی ادھر جانے کا ارادہ ہی ظاہر کیا۔ سرسوتی بہن جی کے کمرے میں ریڈیو پر خبریں ہو رہی تھیں اور وہ دری پر بیٹھی جھنڈیاں کاٹنے میں مشغول تھیں۔

''آؤ آؤ.....راحیلہ.....''

راحیلہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر کے بعد راحیلہ نے سرسوتی بہن جی سے ساڑھی مانگی۔

''اماں کے پاس بنارسی ساڑھیاں تو ہیں لیکن مس ریاض کو ایک بھی پسند نہیں آئی۔''

''اچھا ہوا تو اس وقت آئی۔ دیکھ میں تجھے ایک ایسی ساڑھی دیتی ہوں جو بنارسی تو نہیں لیکن سٹیج پر بہت دمکے گی۔''

سرسوتی بہن جی ایک آتشی گلابی جارجٹ کی ساڑھی لے کر آئیں جس پر سارے ستارے ٹکے تھے۔ پھر انہوں

نے خوش ہو کر کہا..... "راحیلہ چنی کوٹ بلاؤز پہن کر دیکھ لو۔ تمہیں کھلے تو نہیں۔"

ہولے ہولے سرسوتی بہن جی نے اسے ساڑھی پہننا سکھائی۔ پلّا درستی سے کندھے پر جمایا۔ میک اپ کیا اور پھر سیندھور کا ٹیکہ ماتھے پر لگا کر بولیں..... "لو بھئی اب تو تم واقعی مہارانی دیکھتی لگ رہی ہو۔ گھر جا کر آپا ساجدہ کو دکھا کر ساڑھی اتارنا....."

"مجھے شرم آتی ہے سرسوتی بہن جی....."

"کیسی شرم.....؟"

"میں نے کبھی ساڑھی پہنی نہیں، مجھے اسے سنبھالنا نہیں آتا....."

"اسی طرح آتا ہے سنبھالنا، جاؤ آرام سے....."

"اور اگر کسی نے دیکھ لیا تو.....؟"

"پھر کیا..... تم دھیان ہی نہ دھرنا....."

پہلی بار راحیلہ نے اپنے آپ کو ڈریسنگ ٹیبل کے قدِ آدم آئینے میں دیکھا۔ آتشی گلابی ساڑھی اس کا گورا سفید رنگ اور ماتھے پر چمکتی سیندھوری بندیا..... وہ اپنے وجود کی حیرت ناک خوبصورتی سے شرما گئی۔ اپنی ذات کی آگہی کا اچانک شعور اسے عجیب سا لگا۔ اس دن سے پہلے اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس کا جسم اس کی شکل کچھ معنی رکھتی ہے۔

فرد کو اپنی فردیت کا احساس ہو گیا تھا اور اب وہ لوٹ کر بچپن میں نہیں جا سکتی تھی۔ اس کے بعد بھی وہ کس کر چٹیا کرتی رہی۔ فلیٹ فٹ اور فلیٹ جوتے پہن کر سکول جاتی رہی۔ لیکن اچانک آئینہ اس کی زندگی میں داخل ہو گیا تھا..... اپنی ذات کے حصار میں داخل ہونے سے پہلے ایک بار بھی اس نے اپنے بچپن کو خدا حافظ کہنے کی زحمت گوارا نہ کی اور مڑ کر دیکھنے اور پتھر کی بن جانے کے خوف سے مستقبل کی طرف بھاگنے لگی۔

ساڑھی کی وجہ سے کھڈ کے پتھروں کو بڑی احتیاط سے پار کرتی جب وہ دوسری جانب پہنچی تو اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ دوسری جانب ایک بڑی پلیٹ جیسے پتھر پر سریندر تنہا بیٹھا تھا۔ اس نے پینٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر بیری ٹوپی تھی اور تھوڑے دنوں میں اس نے کئی انچ قد میں اضافہ کر لیا تھا۔

پاس پہنچ کر راحیلہ پہلی بار جھینپ گئی۔

"ارے آپ؟....." تم کے بجائے راحیلہ نے کہا۔

"گھر چلیں شوکت بھائی نے ٹیلی فون بنایا ہے۔ سب کھیل رہے ہیں۔ بونے ایک گلہری پالی ہے....." پہلی بار شوکت کے ساتھ بھائی کا لفظ اس کے منہ سے نکلا۔

"میں کہیں نہیں جا سکتا راحیلہ..... بس۔"

عام دن ہوتے تو وہ بلاتکلف پتھر پر سریندر کے پاس بیٹھ جاتی لیکن اپنی خوبصورت ذات کے نوزائیدہ شعور نے اسے ایسے نہ کرنے دیا۔ وہ بے حد Self-consious محسوس کر رہی تھی۔

"کیوں....."

''میں بہت دکھی ہوں.....'' وہ لمبی آہ دبا کر بولا۔

''کیوں؟.....کس نے تمہیں دکھی کیا ہے؟ کون ہے وہ؟'' دل ہی دل میں ظالم شخص پر لعنت بھیجتے ہوئے راحیلہ بولی.....

''ہے کوئی.....دکھ بھی دیتا ہے اور.....اور.....''

''دکھ دیتا ہے تو گولی مار دو ایسے شخص کو دفع کرو.....''

اس نے ایک چھوٹی سی کنکر بہتے پانیوں میں مار کر کہا.....''یہی تو مشکل ہے۔ نہ گولی مار سکتا ہوں نہ دفع کر سکتا ہوں.....''

''چلو آج سب نے کوّل کے انڈے چرانے کا پروگرام بنایا ہے.....اوئی کے درخت کے اوپر گھونسلا ہے کوّل کا' اوما نے بتایا ہے۔''

''کسی پرندے کے انڈے چرانا مہاپاپ ہے راحیلہ.....''

وہ بھی آگہی کی ایک نئی جہت کو چھو رہا تھا جہاں کسی کو دکھ دینا اپنے دکھ میں اضافہ کر دیتا ہے۔

''ہم ایسی باتیں مانتے ہی نہیں.....تم چلو تو سہی۔''

''مجھے کہیں نہیں جانا.....''

''پر کیوں..... پر کیوں.....'' اسے لگ رہا تھا کہ ساڑھی کمر کی جانب پیٹی کوٹ سے نکل گئی۔ یکدم سریندر کے سارے بند ٹوٹ گئے .....اس کا لمبا قد سر پر ہیری ٹوپی اور جسم پر نئی پینٹ بھی ضبط پر آمادہ نہ کر سکے۔ وہ گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگا..... ''یہ گرمیوں کی چھٹیاں کیوں آ جاتی ہیں۔ کیوں یہ سارے بھاپا جی اور بہن جیز لوگ ہمارے گھر آ جاتے ہیں.....پھر جب انہیں چلے جانا ہی ہوتا ہے تو آنے سے فائدہ.....وہ جا رہی ہیں.....وہ سب اور.....وہ ساوتری بہن جی.....''

راحیلہ کی نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب اچانک ایک مندر میں داخل ہو گئی تھی جہاں ساوتری بہن جی کے سفید بازو میں سفید چوڑیاں چمک رہی تھیں۔ اس گپت دیوی کے پاؤں ایک پجاری چوم رہا تھا۔ راحیلہ نے سوچا کہ کاش اسے مندر میں گھسنے سے بھی کوئی روک دیتا۔

☆☆☆

ساڑھی کو پیٹ میں اڑستی بڑے ہی Self-consious انداز میں راحیلہ برآمدے میں پہنچی۔ ایک جانب تخت پوش پر دادا ابا بیٹھے قلم تراشنے میں مشغول تھے اور تخت پوش سے ہٹ کر نیچی کرسی پر اماں ساجدہ بیٹھی پرات میں اچار کا مسالہ چکھ رہی تھیں۔

دونوں راحیلہ کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

''یہ کیا بنی پھر رہی ہے تو.....''

''وہ جی.....میں وہ ڈرامے سکول میں.....ریہرسل سے آئی ہوں.....''

یہ راحیلہ کا پہلا جھوٹ تھا جو اس نے اپنی ذات کو بچانے کے لیے بولا۔

"اس کا حلیہ دیکھیو ساجدہ بی بی..... ماتھے پر یہ بندی..... تن پر یہ ساڑھی..... تمہاری آزادی نے یہ دن دکھائے..... کب سے کہہ رہا ہوں اسے اتنی آزادی نہ دو..... نہ دو۔ آج ماتھے پر تلک لگایا ہے کل کو دیئے جلا کر مندر جانے لگی تو..... میل جول ہی ساری چیز ہے۔ جو آدمی چوروں سے ملتا ہے آہستہ آہستہ چوری اس کے نزدیک برا فعل نہیں رہتا..... فاحشہ عورتوں سے میل جول حیا ختم کر دیتا ہے..... جھوٹے کی صحبت جھوٹ سکھاتی ہے..... تم کو یقین نہیں تو دیکھتی جاؤ..... دیکھتی جاؤ....."

راحیلہ جلدی سے بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی گئی..... اس نے نوچ نوچ کر ساڑھی اتاری۔ منہ دھو دھو کر سرخ کر لیا اور پھر اوندھی پڑ کر پہلے روتی رہی۔ پھر بسورتی رہی اور آخر کو ماں باپ' دادا سب کو کوستی ہوئی سو گئی..... اب اس کا ارادہ سکول کے ڈرامے میں دمینتی کا پارٹ کرنے کا نہیں رہا تھا۔ وہ بار بار ایک ہی جملہ دل میں دہراتی..... دادا ابا خوش ہو لیں ہماری خیر!

اس سے پہلے بھی غصے اور رنج کا اتنا لمبا موڈ بھی نہیں چلا تھا..... ساڑھی پہن کر ایک بار سنگھار میز کے آئینے میں دیکھنے سے جو ذات کی آگہی نے جنم لیا تھا۔ جس طرح اسے احساسِ حسن نے اپنا پھن اٹھانے پر مجبور کیا اس کو برے کو دوبارہ ٹوکری میں بند کرنا اب اس کے بس کی بات نہ تھی..... اب اسے اپنے حسن کے لیے اس کی داد کے لیے تماشائی' تالی بجانے والے' واہ واہ کرنے والے درکار تھے۔ گو یہ خواہش ابھی شعوری نہ تھی لیکن راحیلہ مغل زادی کو اس روز کے بعد چوری چھپے آئینے دیکھنے کی عادت پڑ گئی۔ وہ اپنی صورت پر جیسے خود ہی فریفتہ ہو گئی..... اسے یہ بھی خیال رہنے لگا کہ واقعی اس سے خوبصورت لڑکی ساری کلاس میں نہیں.....

راج ہنس پانیوں پر گردن اٹھا کر چلنے کے لیے تیار تھا۔

راحیلہ کے جاتے ہی دادا ابا کے ابرو جڑ گئے۔ انہوں نے قلم اور قلم تراش کو سمیٹ کر ایک طرف رکھا اور درشت لہجے میں کہا..... "ٹھیک ہے..... تم ٹھیک کہتی ہو لباس..... لباس ہوتا ہے۔ جسم ڈھانپنے کے کام آتا ہے اور اگر پوری ستر پوشی کرے تو کوئی بھی لباس اسلامی ہے..... بادی النظر تمہارا کہنا درست ہے۔ عام انسان ایسے ہی سوچتا ہے لیکن ہر لباس کی تاریخ ہوتی ہے' جغرافیہ ہوتا ہے۔ لباس کوئی ایک دن میں ساخت نہیں ہوتے۔ ہر وہ لوگ جو ایک سا پہناوا پہنتے ہیں' ایک گروہ سمجھے جاتے ہیں۔ لباس کا لوگوں کے مذہب' ان کے رہن سہن' ان کی صدیوں کی سوچ کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے ساجدہ بہو..... صدیوں کسی خاص قسم کا لباس ارتقا کی قینچی سہتا ہے تو پھر ایک خاص شکل اختیار کرتا ہے..... ملٹری والوں کا یونیفارم' ڈاکٹروں کے کوٹ' ہندو لڑکیوں کی ساڑھی' صاحب کا کوٹ پتلون..... افریقہ کے باشندوں کا پہناوا' چینی لوگوں کے کمونے..... میں نام لیتا جاتا ہوں تمہاری آنکھوں میں پوری کی پوری قومیں اور گروہ آتے جائیں گے..... لباس شناخت ہے..... بیرونی شناخت کسی خاص قبیلے' گروہ' جماعت' ملت کی..... جو لوگ آسانی سے پہناوا بدلتے ہیں' وہ آسانی سے اپنی شناخت بھی بھول جاتے ہیں۔"

"اچھا خیر مسلمان عورتوں نے تو بہت کم اسکرٹ پہنے..... یہ خیر سے آپ مردوں پر بھوت سوار ہے پتلون کوٹ کا....."

''یہ بھی مجبوری ہے مسلمان کی..... حاکم کے محکوم ہوئے احساس کمتری نے گھیرا۔ انگریز کی صفات تو سیکھ نہ پائے مجبوراً شکل ویسی بنالی ہے..... ہاں عورت ہماری ابھی محفوظ ہے۔ جو یہ بھی مغربی عورتوں سے میل جول رکھے گی تو شاید اس کا لباس بھی بدل جائے گا۔''

''ایک تو یہ مشکل ہے اباجی آپ کی..... آپ کو چھوٹی چھوٹی باتوں سے اتنا خوف آتا ہے کہ ارد گرد قیامت برپا کر دیتے ہیں۔ ایک ساڑھی کبھی کبھار پہن لینے سے اتنا لمبا لیکچر وجود میں نہیں آنا چاہیے.....''

''کاش چھوٹی باتوں کا نوٹس لے لیا کرو ساجدہ بہو..... ایک تو تمہارے میاں کو گھر کی تربیت کا کبھی خیال نہیں آیا..... ارے مسلمان عورت کو پردے میں رکھنے کا حکم ہے تو تم کو بھی اس کی کفالت کا شعور ہونا چاہیے۔ بھائی ڈاکٹر سرفراز صاحب کفالت صرف پیسے کی نہیں ہوتی تربیت اور ہوش مندی سکھانا بھی کفالت ہے..... ایسے اکیلا عورت کو چھوڑ دو گے تو پھر تو جہالت بڑھے گی..... نہ سیاسی بصیرت' نہ علمی ادبی بصارت' نہ مذہبی سوجھ بوجھ پھر کفالت کیسی..... بازار سے سودے سلف عورت نہیں لاتی کہ ادھر اُدھر سے کان پڑی سن لے۔ پھر کہتے ہیں۔ کانگریس آگے بڑھ رہی ہے' لیگ کی باتیں کوئی سمجھتا نہیں۔''

ساجدہ ماں نے پرات اٹھائی اور چلنے پر آمادہ ہوئی۔ وہ جب بھی دادا ابا کے پاس آتی' ایسی ہی تفصیلی گفتگو سے پالا پڑتا۔

''اوہو ساجدہ بہو سنو تو سہی۔ میں تو تمہیں امیر دین کی بات بتا رہا تھا.....''

''کہاں جی آپ تو بتا رہے تھے لباس کے متعلق اس کے نفع نقصان.....''

''ناں ناں بہو جی..... اصل میں بات میرو کی ہو رہی۔ تمہارے بیرسٹر کا کوچوان تھا امیر دین۔ نہ تو ایسا بانکا کوچوان تھا سارے امرتسر میں نہ ہی تانگہ۔ تو بھائی میرو سارے امرتسر میں فٹن چلاتا..... لوگ راستہ چھوڑ دیتے۔ جدھر سے میرو گزرتا۔''

''اباجی میرو کی ٹانگ میں نقص تھا شاید..... شروع سے تھا کہ کبھی اس کی ٹانگیں ٹھیک بھی تھیں۔''

دادا ابا اب راحیلہ اور ساڑھی بندی کو بھول چکے تھے۔ وہ بڑے شوق سے میرو کی سرگزشت بیان کرنے لگے۔

''جب وہ پہلے پہل ہمارے گھر کی فٹن چلانے لگا تب اس کی ٹانگ صحیح سلامت تھی۔ سارا زمانہ اسے لُچا بدمعاش سمجھتا تھا لیکن اباجانتے تھے کہ میرو کی آنکھوں میں جو سرخی تھی' وہ شراب کی نہ تھی۔ اس کی باتوں میں اگر اکھڑ پن تھا تو اس کی وجہ طبیعت کا کٹیلا پن نہ تھا بلکہ ایک خاص قسم کی شرم تھی۔''

ساجدہ ماں بھی اب دلچسپی لینے لگی تھی..... ''پر اباجی اسے دیکھ کر ایک بار دل کانپ ضرور جاتا تھا۔ کیا مونچھیں تھیں' کانوں کی خبر لاتی تھیں..... سینڈو تھا پورا سینڈو۔''

پہاڑوں پر تانگے نہیں چلتے۔ اس لیے وہاں تانگے کی باتیں اڑنے والے قالین سے کم نہ تھیں۔

''لو بھئی ساجدہ بہو! ایک رات کا ذکر ہے ہم ریس کورس روڈ پر جا رہے تھے۔ فٹن ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ اس روز میرو عین بم پر بیٹھا تھا۔ یکدم ڈاکٹر مہاراجکر کی کوٹھی کے سامنے گھوڑا رک گیا اور پیچھے کو سرکنے لگا.....''

''ہیں؟ وہ کیوں..... ڈر گیا ہوگا۔''

''بھلا ڈرتا کس چیز سے تھا۔ سامنے سڑک پر خالی بتیاں جل رہی تھیں..... سڑک خالی نہ کارنہ تانگا۔''

''سنا ہے گھوڑے کتے بدروحیں دیکھ کر بدک جاتے ہیں۔'' ساجدہ ماں بولی۔

''لو جی خدا تمہارا بھلا کرے۔ میرو تانگے سے اترا اور گھوڑے کو پچکار کر چلانے کی کوشش کی لیکن جی وہ تو کچے میں اتر گیا اور پچھل پاپاؤں مارنے لگا۔''

اب ساجدہ ماں آگے کو جھک آئی..... ''بھلا وہ کیوں اباجی۔''

''میں ہمیشہ سے کہتا ہوں ہر بات میں کوئی راز ہوتا ہے' سوچا کرو۔ میں بھی تانگے سے اترا اور گھوڑے کی پیٹھ تھپتھپائی تو بھئی ساجدہ میری حیرانی کی حد نہ رہی۔ گھوڑا تو پسینے میں شرابور۔ جنوری کا مہینہ اور ٹپ ٹپ پسینہ گرنے لگا گھوڑے کے بدن سے۔''

''آخر وجہ کیا تھی؟''

''صبر بھی کیا کرو..... چپکی رہو تو بات بھی بڑھے۔''

''چلیے اچھا۔''

''تو بھئی ساجدہ گھوڑا اتھا کہ ایک قدم آگے نہ چلتا تھا اور میرو تھا کہ اس بات پر بضد کہ لے کر جائے گا۔ جب گھنٹہ بھر مغز ماری کے باوجود گھوڑا قدم بھر آگے نہ بڑھا تو ہم نے تانگہ موڑا۔ واپسی پر گھوڑا فراٹے بھرتا آیا' کوئی خاص بات نہ ہوئی۔''

''لیکن یہ کیا بات ہوئی' سمجھ تو کچھ نہیں آیا۔''

''بات یوں تھی ساجدہ میرو نے بتایا بعد میں کہ چھ مہینے پہلے کا ذکر ہوگا جب ایک رات وہ چھ نوجوانوں کو تانگے میں بٹھا کر سڑک پر جا رہا تھا۔ عین اس جگہ ڈاکٹر مہاراجکر کے بنگلے کے آگے باڑھ میں سے چار آدمی نکلے۔ ایک کے ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا تھا۔ میرو نے کوشش کی کہ تانگہ نکال لے جائے لیکن ایک نے تڑ سے راجے کے ڈنڈا مارا۔''

''راجہ کون اباجی.....''

''تب میرو اپنا تانگہ چلاتا تھا۔ اس کے گھوڑے کا نام راجہ تھا۔ ڈنڈے کا لگنا تھا کہ راجہ تو ہوا ہو گیا۔ مقدر خراب اس وقت مہاراجکر صاحب کا خانساماں سائیکل پر کوٹھی سے نکلا۔ وہ گھوڑے کے نیچے آ گیا۔ راجہ بھلا سنتا تھا کسی کی روندتا ہوا نکل گیا.....''

''یعنی خانساماں مر گیا..... ہیں اباجی مہاراجکر صاحب کا خانساماں کچلا گیا۔ راجہ کے نیچے آ کر۔''

''ساجدہ ایک تو تو کودن بہت ہے..... لے پھر جو سواریاں لدی تھیں تانگے پر وہ تو گئیں اپنے اپنے گھر۔ امیر دین سیدھا پہنچا پہلوان ساجھا کے پاس.....''

''وہ کیوں.....؟''

''پھر وہی سوال! بات کی ساری جان نکل جاتی ہے سوال سے۔ بھلی لوک پہلوان سے مالش کرواتا تھم اتانگہ

کی۔ جوڑ چڑھ جاتا تھا۔''

''اچھا تو یعنی اس واقعے سے پہلے ٹانگ ٹھیک تھی میرو کی.....''

''پہلوان نے کہا' بھائی صاف مکر جاؤ گے تو بچو گے ورنہ ہتھکڑی لگے گی۔ انگریز کا زمانہ ہے' وہ انصاف کو چھوڑتا نہیں۔ لے ساجدہ بی بی کسی سواری نے جا کر تھانے میں جڑ دی کہ امیرو ین تانگے والا نشے میں وحشت تانگہ اڑائے لیے جاتا تھا۔ اسی لیے مہاراجکر صاحب کا خانساماں پہیوں تلے آ گیا..... تین پیشیاں تو میرو مکرتا رہا۔ جب چوتھی پیشی ہوئی تو ایک سواری سلطانی گواہ بن گئی۔ اس وقت بھی میرو کی آنکھیں سرخ اور چڑھی ہوئی تھیں۔ بلبلا کر کورٹ میں بولا..... جج صاحب مجھے شراب سے سخت نفرت ہے۔ میں نے اس وقت بھی شراب نہیں پی رکھی تھی..... لوجی چھ مہینے کے لیے دھر لیا گیا..... باہر نکلا تو ٹانگ کا نقص پکا ہو چکا تھا۔''

''اچھا تو میرو پیدائشی لنگڑا نہیں تھا.....''

''ساری رات رامائن سنی صبح پوچھتے ہیں سیتا مرد تھی یا عورت۔ ساجدہ بی بی جانور سیکھ گیا کہ ڈاکٹر مہاراجکر کی سڑک پر نہیں جانا نہیں جانا..... ہماری فٹن کو بھی کوٹھی کے آگے نہیں لے گیا' واپس مڑنا پڑا..... پر تم کو اللہ میاں نے ایسی ہمت دے رکھی ہے کہ ہر آزمودہ کو دوبارہ پورے جھل کے ساتھ آزماتے رہنے میں اپنی بڑائی ہے..... سن لو بی بی! گھوڑے نے سیکھا کہ سڑک خطرناک ہے' تم کو پتہ ہی نہیں۔ جو آج ساڑھی بندی لگا کر آزادانہ آئی ہے تو جانے کل کیا گل کھلائے گی۔ بی بی! صوفیا کہتے ہیں ساری بات میل جول ہے' سب کچھ میل جول سے ملتا ہے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ پر تمہاری بلا سے۔ راحیلہ کیا سارا گھرانہ ڈوب جائے تمہیں پرواہ.....''

''ایک تو آپ چھوٹی سی بات پکڑ کر اتنا لمبا لیکچر دے سکتے ہیں ابا جی کہ سننے والا زہر کھانا چاہتا ہے۔ بچی ہے سکول میں ڈرامہ ہے' گھڑی بھر کو ساڑھی پہن لی تو کیا..... پھر کہتے ہیں کوئی پاس نہیں بیٹھتا..... سب آنکھیں چراتے ہیں ہاں..... بیٹھے کوئی خاک!''

●○●○●○

دوسرا عہد

(ب)

پھر برآمدے میں ایک بھورا چوہا داخل ہوا۔

اس بھورے چوہے کی ہلکی ہلکی مونچھوں کا آغاز تھا' جو بھوری ہونے کی وجہ سے سائے کی طرح لگتی تھیں۔ نیلی مائل بھوری آنکھیں..... دنوں میں اس کا قد اوماسے لمبا ہو گیا۔ بچپن میں یہ چوہا بالکل کسی انگریز کی اولاد لگتا تھا۔ ہاشی بہن جی اسے انگریز باوا کہا کرتی تھیں لیکن اب وہ احتجاجاً دیسی بھورا چوہا بن گیا تھا جو کھیتوں میں سرنگ نکال کر فصلوں کو برباد کیا کرتے ہیں۔ اس کی جلد اس قدر پتلی تھی کہ چہرے پر سرخ اور نیلی شریانیں نظر آتیں لیکن پتہ نہیں کیا بات تھی حضرت ابھی لمبے قد کی لڑکی سی نظر آتے۔ ذرا سی بات ہو جاتی تو سارا چہرہ شرمندگی سے گلابی ہو جاتا۔ شاید ببو کو بھی احساس ہو چلا تھا کہ وہ نازک ہے..... اندر اور باہر اسی لیے اسے مضبوط جسم بنانے کا خبط ہو گیا تھا۔ دن رات باڈی بلڈنگ کی کتابیں دیکھتا رہتا..... چیسٹ Expander میں اس کی جان تھی۔ ابھی Jogging کا رواج نہ ہوا تھا اور کسرتی جسم بنانے کے لیے پہلوانی بکھیڑے مول لینے پڑتے تھے۔

چوہے کو اندر کی طرف آتے دیکھ کر راحیلہ نے پوچھا..... "بڑے دنوں بعد نظر آئے ببو؟....."

"شوکی کہاں ہے؟....." اب وہ راحیلہ کو اکیلا پا کر جھینپ جاتا تھا۔

"تمہاری طرف گئے تھے' ملے نہیں؟"

"نہیں تو....." اتنے میں اس کا چہرہ پھر گلابی ہو گیا۔

"کوئی کام ہے؟"

"اچھا تو پھر....."

"میں چلتا ہوں..... کسرت کا وقت ہو گیا ہے۔"

ببو کا قد اور حلیہ تو بدل گیا تھا لیکن اندر کی روح ابھی Mature نہ ہوئی تھی۔ وہ شاید جینی مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ سب نہ تو اپنی جسمانی تبدیلیوں سے پوری طرح آگاہ تھے نہ ہی انہیں معلوم تھا کہ ان کے اندر جوار بھاٹا پھیل رہا ہے۔ ببو نے پٹھان کوٹ سے امرتسر تک جانے والے انجن کا ڈرائیور بننے کا خواب چھوڑ دیا۔ چپکے چپکے وہ لیفٹیننٹ کی وردی

سپنے کے خواب دیکھتا۔ کبھی اسے خیال آتا ہے کہ وہ پائلٹ ہے اور شعلے لپکاتا برما فرنٹ پر بم گرا رہا ہے۔ طیارے کی دم میں آگ لگ چلی ہے۔ فضا میں اس کے دھوئیں کی لمبی لکیر پھیلی ہے لیکن وہ فرض شناس آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور آخر میں بم گرا کر ہیرو کی شکل میں مرجاتا ہے۔ یہ خواب وہ جب بھی دیکھتا اپنی موت پر اسے خود ہی رونا آ جاتا۔ وہ پاشی بہن جی سے لے کر اوما تک کسی کو یہ خواب سنا نہیں سکتا تھا لیکن اس کی کاپی پر اب طیاروں کی ڈرائنگیں موجود ہوتیں۔

''یہ ہاتھ میں کیا ہے ہو؟.....'' راحیلہ نے پوچھا۔

''کچھ نہیں.....''

''ہائے اللہ دکھاؤ تو سہی۔'' راحیلہ نے ہاتھ پھیلایا۔

''باڈی بلڈنگ کی کتاب ہے' تمہارے مطلب کی نہیں ہے۔''

''پھر بھی.....''

''بھائی کہہ دیا ناں' تمہارے مطلب کی نہیں.....مرد قریباً قریباً ننگے.....'' یکدم وہ چپ ہو گیا.....اور پہلی بار راحیلہ بھی ہو سے جھینپ گی۔

ایک دن اوما اور راحیلہ نے چوری چوری ہو کی ایک ایسی ہی کتاب دیکھی تھی۔ پہلا صفحہ جب کھولا تو راحیلہ نے ششدر ہو کر اوما کی جانب دیکھا۔ اسی طرح مہاتما بدھ نے بوڑھے آدمی کو دیکھا ہوگا۔ پہلے صفحہ پر مسٹر یونیورس کی تصویر تھی۔ لمبا چوڑا آدمی چھوٹی سی لنگوٹی نما بریف پہنے دونوں بازوؤں کے پٹھے نکالے' گردن اکڑائے' چھاتی پھلائے بانہیں اٹھائے یوں کھڑا تھا گویا ایک ایک بوٹی میں گوشت کی جگہ لوہا ہو۔ دونوں نے نظریں نہ ملائیں اور جلدی جلدی ورق الٹنے لگیں۔ ان پر ان تصویروں کا ایسا ہی اثر ہوا گویا پورنوگرافی کی کوئی ماڈرن کتاب دیکھ رہی ہوں۔ مردوں کی نرگسیت میں کوئی فرق نہ تھا۔ اپنے جسم کے کس بل پر عاشق ان باڈی بلڈرز کی مچھلیوں پر وہی چکناہٹ نظر آتی جسے کیمرہ مین کی روشنیوں نے نمایاں کر رکھا تھا۔ ابھی عورتیں حیا کو زیور سمجھتی تھیں اور ہر وہ فعل جوان کی حیا کو کم کرتا عصمت دری کے مترادف نظر آتا۔ وہ دونوں کئی دن ایک دوسرے سے جھینپتی رہیں اور اس کتاب کا بھی ذکر ایک دوسرے سے نہ کر پائیں۔

''لو پھر بھیا آئیں تو میری جانب بھجوا دینا.....''

''ٹھہر جاؤ' ابھی آتے ہوں گے.....''

''راحیلہ.....راحیلہ.....'' اندر سے دادا ابا کی آواز آئی۔

''ذرا ٹھہرو میں ابھی آئی.....''

راحیلہ کے اندر جانے سے پہلے آواز پھر آئی'' راحیلہ.....''

''کیا کام ہے دادا ابا.....''

''کچھ کام نہیں' آواز آ رہی تھی۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے؟''

''ہونا کیا ہے دادا ابا.....''

راحیلہ کو یکدم غصہ چڑھ گیا۔ وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ اب اس پر نگرانی ہونے لگی ہے.....اپنی آزادی کو مجروح

ہوتے دیکھ کر وہ نہ جانے کیوں بے قرار ہو جاتی۔

جو برآمدے میں کھڑا کوئی باڈی بلڈنگ کی کتاب غور سے دیکھ رہا تھا۔

"شوکت بھائی آتے ہی ہوں گے......"

"نہیں میں چلتا ہوں......"

چند قدم چل کر جو پھر لوٹا...... "ارے تم نے پنیا کب سے بنانی شروع کی راحیل؟"

"بس یہ پچھلے ہفتے سے......"

"اچھی لگ رہی ہے......شیل کانت بہن جی کی طرح......"

وہ پھر گلابی ہو گیا۔ بڑے ہی Self-consious انداز میں اس نے انگور کی بیل کا ایک پتہ توڑا۔ اسے اپنی کتاب میں رکھ کر وہ بغیر کسی سلام دعا کے رخصت ہو گیا۔

اس سے پہلے چھپنے چھپانے کی ریت نہ تھی۔ کوئی انگور کی بیل کا پتہ ان سب کے درمیان در نہ آیا تھا۔ اب ایک جھینپ سی سب طرف پھیل گئی۔

ویسے یہ بات تو بہر صورت ماننا پڑے گی کہ سارے گروہ میں ہریش کمار عرف جو سب سے گنوتم کا نوبالغ تھا۔ پچھلے جنم میں شاید وہ سفید پھولوں سے لدا کیتھو کا درخت تھا۔ پھر بھری بہار میں کسی گھڑی نے اسے بڑی بے دردی سے کاٹا۔ سارے سفید پھول آنسوؤں کی طرح چھم چھم گرے۔ ڈالیاں بے آسرا ہاتھوں کی طرح زمین پر گریں لیکن کیتھو کا درخت کٹتا چلا گیا اور اس کے کٹنے پر ایک نئے جنم میں ہریش کمار سین نے جنم لیا۔ نیلی آنکھوں اور سفید رنگ کے باوصف ایک روکھی احساس کمتری نے گھیر رکھا تھا۔ اس کی وجہ کچھ جسمانی نہ تھی۔ اوما کو جو اہمیت گھر، سکول میں اور گروہ میں ملتی تھی اس کی وجہ سے جو اندر ہی اندر جذباتی طور پر مجروح ہو گیا تھا۔ سردیوں میں تو خیر اسے تو گرمیوں میں بھی زکام نہ چھوڑتا۔ جتنی بار سال میں اسے یہ عارضہ ہوتا کسی کو بھی یہ مصیبت اتنی بار دیکھنا نہ پڑتی۔ شروع سردیوں میں جو کی گلابی ناک چقندری سرخ رہنے لگتی۔ ہر لمحے ٹپ رہی ہے۔ اچھی جا رہی ہے۔ کھجلائی جا رہی ہے۔ یہ اسی ناک کا حوصلہ تھا کہ جو کا ساتھ دیے جاتی تھی۔ اوما اور جو میں ایک واضح فرق تھا۔ اوما جلد حالات سے سمجھوتہ کر کے انہیں اپنی موافقت میں ڈھال لیتی۔ جب سے ٹھاکر مدن سین برما گئے اوما نے جان لیا کہ کوئی گھر والدین کے گھر سا سازگار نہیں ہوتا۔ حالات نے اسے موقع شناس اور محنتی بنا دیا تھا لیکن جو عمر میں کم ہونے کی وجہ سے حالات کی نزاکت کو سمجھ نہ پایا۔ راحیل اور جو کو اب الگ الگ سکول جاتے تھے لیکن دونوں جب بھی نوٹس ملاتے نالائقی ایک سی نکلتی۔ اساتذہ انہیں گالیوں سے نوازتے۔ کلاس سے نکال دیتے اور گھر شکایتوں کے رقعے بھیجتے۔ سکول حالات سے تنگ آ کر کچھ عرصہ پہلے جو نے ایک طوطا پالا۔ لیکن اس کاٹھے طوطے کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ضدی تھا۔ ماسی کرشنا کو شوق تھا کہ طوطا بولے۔ وہ طوطے کو چوری کھلا کر کہتیں...... "بولو میاں مٹھو رام رام......" لیکن میاں مٹھو ساری چوری تو ہڑپ کر لیتا لیکن رام رام کی طرف توجہ نہ دیتا۔ اسے اگر رام رام ہی سیکھنا ہوتا تو بھلا وہ پنجرے میں کیوں ہوتا؟

میاں مٹھو نے ایک بھرے بھرے دن خود اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا تھا۔

سارے ماسی کرشنا کے گھر اوما اور ہبو کے کمرے میں بیٹھے کھیل رہے تھے۔ کچھ دیر لوڈو چلی پھر ''گیدڑ گیدڑ'' کھیلنے کا آغاز ہوا۔ قرعہ شوکی کے نام نکلا اور وہ چوکی پر بیٹھ گیا۔ اب باری باری جانوروں کو حکم ہوا کہ وہ شیر کو سلام کریں۔ جونہی آخری لومڑی آتی' شیر اسے پکڑنے کی کوشش کرتا۔ اگر لومڑی پکڑی جاتی تو شیر اپنی حکمرانی پر بحال ہو جاتا۔ اگر لومڑی والی کو چھو پاتی تو پھر شیر کو چوکی سے اترنا پڑتا۔ شوکت کانوں کے اوپر گڑحل کے دو پھول لگائے چوکی پر بیٹھا تھا۔ ہبو ہاتھ پاؤں پر چلتا آیا اور آتے ہی بولا۔

''چاندی کا تیرا چونترا کوئی صندل لیپا جائے
کانوں ترے دو مرکیاں کوئی راجہ جیسی ہوئے''

شیر نے ہبو کو اشیر باد دی اور خوش ہو کر سر ایسے ہلایا کہ گڑحل کے پھول بھی ہلنے لگے۔ بعد ازاں سریندر' روی' اجنا' شاردا سب نے یہی بانی پڑھی اور اشیر باد کے مستحق ہوئے۔ آخر میں اوما لومڑی بن کر آئی اور بادشاہ کی چوکی چھو کر توہین آمیز لہجے میں بولی۔

''مٹی کا تیرا چونترا کوئی گوبر لیپا جائے
کانوں تیرے دو مینڈکیاں کوئی گیدڑ بیٹھا ہوئے''

جونہی شوکی نے چوکی پر دھرا اوما کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ وہ اڑن چھو ہو گئی اور جست میں کھڑکی کھول کر باہر کود گئی۔ اس وقت ہبو کا کند ذہن طوطا اندر داخل ہوا۔ سب کو شیر گیدڑ بھول گئے۔ کھڑکی دروازے فوراً بند کیے گئے۔ چونکہ اوما کافی دیر کمرے سے باہر شیر سے پکڑے جانے کا انتظار کرتی رہی تھی' اس لیے اس نے کمرے میں گھستے ہی رٹ لگا دی.... ''یہ مہا پاپ ہے..... پرندوں کو پکڑنے سے سراپ ملتا ہے۔''

پہلے تو طوطا مہاراج روشن وان سے روشن دان تک اڑتے رہے۔ پھر کوئی ترکیب نہ سوچ سکنے کے باعث ششدر ہو کر روشندان کے پاس بیل پر نراش ہو کر بیٹھ رہے۔ ہو سکتا ہے اسے روی کے ڈنڈے کی ضرب لگی ہو جو اس نے کہیں بھی جانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔ کھیل جاری ہو گیا لیکن طوطے کی عقل ملاحظہ ہو وہ آنکھیں پھراتا گم سم اسی بیل پر بیٹھا رہا۔ دروازہ کھلا..... کھڑکی کھلی..... لیکن اسے نہ جانا تھا نہ وہ گیا اور صبح جب لا بھ چند ملازم نے اسے پکڑا تو اس کا جسم ایسے ہی کانپ رہا تھا جیسے مس ریاضی کی آمد پر روما لرزا کرتی تھی۔

اس کے بعد ہبو نے میاں طوطا رام سے شیر و شکر ہونے کی کوشش کی لیکن ہبو کے سمجھانے رٹانے کے باوجود طوطا اپنی ہی زبان بولتا رہا..... اور ایک دن بھی نہ کہہ سکا..... ''ہریش کمار سین نمستے..... ماسٹر دیے مر گئے..... رام کشن صاحب حساب پڑھانے والے کا دیہانت ہو گیا..... غلام صاحب کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔''

طوطا رام سارا وقت بادام کی گریاں کھاتا لیکن سمجھتا تھا کہ کیسے سے اگر پڑوسن کی گتیا مر جائے تو پھر کس گھر میں دودھ پوت رہے۔

پورے چار دن اپنا سبق پڑھنے کے بجائے ہبو نے طوطے کو پڑھانا چاہا۔ پھر ایک دن اچانک طوطا ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ پروں میں منہ دیے کبھی ایک ٹانگ کبھی دوسری ٹانگ پر مراقبے میں جاتا تھا۔ اس کی پریشانی تو خیر قابل برداشت تھی لیکن

بہو کی نیلی آنکھوں میں اتنا سمندر دیکھا نہیں جاتا تھا۔ پہلے تو پشپ کانت بہن جی کی منتیں کیں کہ اس ڈاکٹرنی کو بلا دیجیے جو آپ سے ملنے آتی ہے لیکن جب گھر والوں نے پروا نہ کی تو بہو رضائی اوڑھ کر طوطے رام کو گود میں لے کر بیٹھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ طوطے رام کو بھی زکام ہی ہوا ہوگا۔ اس روز روی دلجوئی کے لیے پاس بیٹھا تھا اور تسلیاں دیے جاتا تھا۔

''اوما..... اوما..... کہاں ہو بھئی؟''

''تم جلدی سے شوکت کو بلاؤ۔ وہ بڑا پاتال جنتر آدمی ہے۔ ضرور کچھ کرے گا۔ پتہ نہیں اس کو ہوتا کیا جا رہا ہے۔''

''لیکن اوما کہاں ہے..... تمہیں کیسے اکیلا چھوڑ جاؤں؟''

''میری پروا نہ کرو..... جلدی جاؤ پتہ نہیں اس مٹھو کو ہوتا کیا جا رہا ہے۔''

ڈگلے پر بنی سیڑھیاں پھلانگتا جلدی جلدی روی شوکت کے گھر پہنچا۔ حسبِ معمول دادا ابا تخت پوش پر بیٹھے بڑی باقاعدگی کے ساتھ سیب تراش رہے تھے۔ روی نے اندر گھس جانا چاہا تو دادا ابا کھانسے..... ''آؤ روی سیب کھاؤ۔''

''نمستے دادا ابا! شوکت کہاں ہے؟''

''وعلیکم السلام..... کیا کام ہے؟''

''بس جی ہے ایک..... زندگی کا سوال ہے۔''

روی اندر بھاگ گیا۔

ساجدہ ماں ایک ہاتھ میں بالٹی اٹھائے وارد ہوئیں تو دادا ابا بولے..... ''پتہ کرو کچھ معاملہ کھٹ پٹ ہے..... سارے نوجوان بھاگے پھر رہے ہیں.....''

''کچھ نہیں ابا جی! بچوں کے سالانہ امتحان سر پر ہیں..... غریب ہراساں ہیں۔ سارا سال تو جی نہیں دیتے۔ بس آخر میں ہی ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔''

''تو پھر..... قصور کس کا ہے ساجدہ بہو.....''

''میرا جی میرا.....''

ساجدہ ماں بالٹی اٹھائے انگور کی بیل سے لدے برآمدے میں سے نیچے اتر گئیں۔ جب گھوم پھر کر روی نے سارے بچوں کو اکٹھا کیا اور وہ سب بہو کے پاس پہنچے تو طوطا سر مار رہا تھا۔ بہو کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

شوکت نے نئی لائن آف ایکشن اختیار کی..... ''پالتو جانور اس لیے پالا جاتا ہے بہو کہ انسان مضبوط ہو۔ جب جانور مرے تو مردانگی کے ساتھ موت کا مقابلہ کرے۔ تم تو اوما اور راحیلہ سے بھی گزرے ہو..... اس میں تمہارا بھی کوئی قصور نہیں..... تمہاری آنکھیں بھی لڑکیوں جیسی ہیں اور جلد بھی..... ہمت کرو ہمت..... مرد جنگ لڑتا ہے چوکیداری کرتا ہے۔ سیاسی لیڈر بنتا ہے..... روتا نہیں عورتوں کی طرح.....''

یہی وہ گھڑی تھی جب بہو نے اپنے خواب بدلے..... اس نے لال نیلی جھنڈی ہلا کر خوابوں میں پٹھان کوٹ سے امرتسر کی ٹرین چلانا چھوڑ دی..... اب وہ جب بھی فارغ ہوتا چیسٹ ایکسپینڈر کو اٹھاتا اور چھاتی کی ورزش کرنے لگتا۔

ان دنوں اٹھک بیٹھک کو Push ups نہیں کہتے تھے۔ ابھی پہلوانی کی اصطلاحیں ہی چلتی تھیں اور نہ تو جوگنگ کا رواج تھا۔ نہ ہی روبیکو کا بس سیدھی سادی تیل مل کر کسرت کی جاتی تھی اور وہ ہو کر رہا تھا۔

پاشی بہن جی کا خیال تھا کہ طوطے رام کے دیہانت کے بعد ہو ضرور پڑھائی میں سنجیدہ ہو جائے گا لیکن ہونے جسم بنانے کا جو یکطرفہ فیصلہ کیا تھا اس کی وجہ سے آٹھویں جماعت کی تیاری نہ ہو سکی..... ہاں اس کی ایک اور وجہ ہمالیہ ٹاکیز میں لگنے والی فلمیں تھیں۔ نیو تھیٹرز نے اس سارے گروپ کی سوچ میں عجیب قسم کے مدوجزر پیدا کر دیے تھے۔ اب زیادہ گفتگو فلموں سے متعلق تھی۔ ادھر پاشی بہن جی ساجدہ باجی کو ساتھ لے کر فلم دیکھنے جاتیں۔ ادھر ان بچوں کو بھی ضد کا موقع مل جاتا۔ ساجدہ ماں نے بھی ایک گروپ بنا لیا تھا۔ کانن بالا، بروا، رینو کا دیوی، سہگل، لیلا ڈیسائی، پنکج ملک نیو تھیٹرز کے سارے کردار اب نوجوان پود کے خوابوں میں بس گئے تھے۔ آہستہ آہستہ بومبے ٹاکیز بھی مقابلے پر اتر آئی اور وہاں ایکٹروں کی ایک نئی کھیپ نے جنم لیا۔ پھر خورشید، لیلا چٹنس، ثریا، وینا، ممتاز شانتی، سنیہہ پربھا پردھان، شانتا آپٹے، پرتھوی راج، سہراب مودی اور پری چہرہ نسیم کی دیومالائی شخصیتوں نے دلوں کو گھیر لیا۔ پنجاب نے بہت بعد میں انگڑائی لی اور پنچولی فلمز کو جنم دیا۔ پنجاب سے راگنی، رمولا، منور ما ابھریں۔

لیکن یہ ابھی پوری طرح سے نیو تھیٹرز کا دور تھا۔ سیاسی گفتگو صرف سیاسی جاگرتی رکھنے والے کیا کرتے۔ عشقیہ شاعری اور نیو تھیٹرز کے ہیروز کی باتیں البتہ نوجوان کا مرغوب ٹاپک تھیں۔ وقت بہت سست رفتاری سے چلتا تھا۔ ہندوستانی غلام تھے اور انگریز حکمران لیکن اس کا احساس بہت گہرا نہ تھا۔ گھروں میں امن و عافیت کی فضا تھی۔ سائنسی ایجادوں نے ابھی دھاچوکڑی نہ مچائی تھی۔ ہوائی جہاز صرف بم گراتے تھے۔ بھانت بھانت کی سواریاں اٹھا کر رنگ برنگے کلچروں کو ہکابکا کرنے کی وجوہات ابھی سامنے نہ آئی تھیں۔ لوک ریت مضبوط تھی اور ناک پر انگلی رکھ کر اعتراض کرنے کا رواج عام۔ لوگوں کے خوف سے ابھی لوگ دیدہ دانستہ اخلاق گراوٹ کی باتیں نہیں کرتے تھے۔ ابھی سائنس نے پہلا دھاوا بولا تھا اور فلموں کے ذریعے لوگوں کو اشانتی کا پہلا سبق پڑھایا تھا۔

شوکت نئی چیز کو جلدی قبول کرتا تھا۔ سب سے پہلے وہ ہی نیو تھیٹرز کے جال میں سے نکلا۔

"چھوڑو یار دیوداس اور دیا پتی کو..... کس کو اب سہگل یا پنکج ملک یاد ہے....."

"ہمیں ہمیں ہمیں....." ہو چلایا۔

"ارے سنیہہ پربھا پردھان کو دیکھ لو..... تو لیلا چٹنس بھول جائے۔ تم لیلا ڈیسائی کو روتے ہو....."

"ارے بھائی نیو تھیٹرز کے ایکٹروں کو کون بھول سکتا ہے؟"

"جو پردیسی میں خورشید کو دیکھنے کے بعد کانن بالا کو بھول گئے ہیں۔" شوکت نے غرا کر کہا۔

سب خاموش ہو گئے کیونکہ ابھی تک کسی نے پردیسی فلم نہ دیکھی تھی۔

"ارے بھائی آپ سب جب خورشید کو گا تا دیکھیں گے پہلے جو محبت سے انکار کیا ہوتا..... تمہاری کانن بالا بیچ ہے بیچ اس کے سامنے....."

سارے گروپ نے اس بات کا برا منایا لیکن ہو ان دنوں ورزش کر رہا تھا اور تھوڑا تھوڑا ابھا ور بھی ہو چلا تھا۔ اس

کے نزدیک واڈیا مووی ٹون بہترین فلمساز اور نا ڈیا خوبصورت ترین عورت تھی۔ پاسنگ شو میں کتنے کی ایکٹنگ بہترین تھی اور سکندر فلم بنا کر سہراب مودی نے ساری فلموں کو نیچا دکھا دیا تھا' وہ چڑ کر بولا۔

''ابھی کل تو تم کہہ رہے تھے کہ ابھی تک تمہیں پردیسی فلم دیکھنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔''

''چلو میں نے فلم نہیں دیکھی۔ چترا رسالہ تو پڑھا ہے۔ خورشید کی تصویریں تو دیکھی ہیں۔''

اوما کے علاوہ سارے کھی کھی کر کے ہنسنے لگے..... اوما شوکت کی دیوار چین گرتے دیکھ نہیں سکتی تھی۔ جھڑک کر بیو سے بولی..... ''یہ جو تو بھگوان کی سوگند بہت بڑا بنا پھرتا ہے اور دوسروں کو نیچا دکھانے کی تجھے فکر رہتی ہے' ہر سے یہ ساری شیخیاں امتحان کے بعد نکلیں گی..... یاد رکھنا سب کو پتہ چل جائے گا کہ جناب کتنے پانیوں میں ہیں۔''

یکدم بیو اداس ہو گیا۔ اسے اس وقت بڑی فکر یہی تھی کہ دسویں کا امتحان خیر وخوبی سے پاس ہو جائے۔ اس کے بعد اس کا جو پلان تھا' وہ اس نے کسی پر ظاہر نہ کیا۔ لیکن ایک بات ظاہر تھی کہ اس کے بعد کے خواب کو چیسٹ ایکسپینڈر اور قد کے ساتھ ضرور کوئی گٹھ جوڑ تھی۔

ڈاکٹر سرفراز کی کوٹھی سے ماسی کرشنا کے گھر تک ان گنت بار اوما کے قدم اٹھے تھے۔ ڈنگے کی سیڑھیاں اترتے ہی چھ چیڑ کے درخت یوں قطار باندھے کھڑے تھے جیسے کسی ریس میں بھاگنے کے لیے تیار کھڑے ہوں۔ پھر ایک بڑا سانڈے کی شکل جیسا پتھر جس کو اٹھانے کے لیے بیس آدمی بھی کافی ہوتے' اس کے ایک جانب کبھی سورج کی ایک کرن بھی نہ پہنچی اور اس جانب کائی جمی رہی سردیاں گرمیاں..... سریندر کی چھوٹی سی گڑیا سات برس کی ہو گئی لیکن چیل کے درختوں میں گم نہ آیا۔

کھڈ سے پار تنگ پگڈنڈی تھی جو آگے چل کر دوشاخہ بن جاتی۔ ایک راستہ ناشپاتی کے باغ سے ہو کر سریندر کی روز کالج کو جاتا تھا اور دوسری چھوٹی سی پگڈنڈی اوما کے بڑے بنگلے کی طرف نکلتی تھی جس کا ڈنگا کم سے کم بیس فٹ اونچا تھا۔ اس پگڈنڈی پر کبھی کبھی بکریاں بھی راحیلہ کو مل جاتی تھیں۔ نیکروں فراکوں کا عہد گزر چکا تھا لیکن نیچے بہنے والا کھڈ کا پانی ہمیشہ کی طرح چمکتا دمکتا شفاف تھا۔ اسی کنارے ایک دن اسی کھڈ کنارے بڑے پیالے سے پتھر پر بیٹھ کر شوکت نے دھوبن چڑیا سے راحیلہ کی گڑیا کے کپڑے دھلائے تھے..... اسی جگہ سریندر نے انکشاف کیا تھا کہ وہ شاعر بن گیا ہے۔ وہ اس وادی میں گزارے دن اپنے دل سے علیحدہ کر رہا تھا جیسے مرنے والے کبھی کبھی ہچکیاں لے لے کر اس زندگی سے اپنا تعلق توڑتے ہیں۔ پتہ نہیں سریندر کہاں تھا؟ اس جگ کو گفتگو سمجھنے والا کہاں تھا۔ کیا وہ بڑا شاعر بن سکا؟ کیا گمنامی کے کسی گوشے میں یوں سٹ کر رہ گیا کہ اس کی کوئی خبر ہم تک نہ آ سکی..... سریندر ایک ایسا نام تھا جو ہم آپس میں بھی کبھی استعمال نہ کرتے۔ آگے چل کر پگڈنڈی ایک کھلی سی باڑی میں ختم ہو جاتی۔ یہاں موسی کرشنا کی براؤن اور سفید گائے رہتی تھی..... یہ بھوری بھینس بھی ہماری طرح البڑ بچھیری تھی۔ اسی کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک دن روی نے کہا تھا..... تھو جیل نا نگا نیکا میرا..... راحیلہ سوچتی کہ اگر واقعی نا نگا نیکا روی کا ہو جاتا تو وہ کیا کر لیتا؟

موسموں کا طبیعت پر عجب اثر ہونے لگا تھا۔ شام دوپہر صبح نئے معنوں کے ساتھ آتیں۔ راحیلہ کو لگتا جیسے اوما ٹھیک کہتی ہے۔ پرتھوی کو ایک گائے نے سینگوں پر اٹھا رکھا ہے۔ جب ایک سینگ تھک جاتا ہے تو وہ اسے دوسرے سینگ

پڑ جاتا ہے۔ ایسے میں ساری دنیا پر بھونچال آتے ہیں۔ پانیوں کا مدوجزر بڑھ جاتا۔ پاگل خانوں کے باسی خواہ مخواہ بکارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور نو بالغ لڑکیاں لڑکے کچھ ایسی باتوں میں کھو جاتے ہیں جن کے بارے میں ابھی ٹھیک سے ان کی معلومات نہیں ہوتیں۔

موسی کرشنا دودھ کا پتیلا اٹھائے کوٹھڑی سے نکل رہی تھیں..... "مجھے پتیلا دے دیجئے موسی کرشنا۔"

موسی کرشنا مسکرا کر بولیں..... "چرن جیو رہو راحیلہ چرن جیو رہو..... مجھ سے اب اس پتیلے کے ساتھ چڑھائی پر چلا نہیں جاتا۔"

"تو میں کہہ رہی ہوں ناں مجھے اٹھانے دیں....."

موسی کرشنا نے پتیلا نہ دیا۔ پہلی بار راحیلہ کو احساس ہوا کہ وہ برسوں موسی جی کے گھر آئی گئی لیکن موسی جی نے ایک دن کسی برتن کو اسے اٹھانے نہ دیا بلکہ وہ تو کبھی باورچی خانے کے اندر بھی نہ گئی تھی۔ پاشی بہن جی اس سے بہت باتیں کرتی تھیں لیکن جب بھی کوئی کھانے کی چیز دیتیں۔ پتوں کے دونے میں..... لڈو جلیبیاں حلوہ راحیلہ نے ہمیشہ پتوں کے دونے میں کھائے اروی کے پتے پر..... آج پتہ نہیں کیوں راحیلہ کو نیا احساس ہوا شاید دادا ابا سچے ہوں۔

"تجھے کچھ پتہ ہے راحیلہ....."

"کیا جی؟....."

"ہیرا ایئر فورس میں جا رہا ہے....."

"ایئر فورس میں؟..... وہ کیوں....."

"بس..... اسے تو سرکاری چٹھی بھی آ گئی ہے....."

راحیلہ کے دل کو دھکا لگا۔ افسوس فیل ہو جانا بھی کتنی بڑی حماقت تھی۔ اگر وہ دھن کی جیومیٹری سوہن لعل کا جغرافیہ سرمایا اردو پڑھتی رہتی تو آج وہ بھی کہہ سکتی کہ وہ کالج جانے والی ہے لیکن اس نے تو سارا وقت طلسمی چوری، بمبئی کا ڈاکو، مغلوں کی شہزادی پڑھنے میں گنوایا۔ اب جب کوئی پوچھتا بھئی کیا ارادے ہیں تو سر جھکا کر کہنا پڑتا جی ابھی تو دسویں کلیئر کرنا پڑے گی..... آگے ہمدردیاں بچ بچ..... ہائے بھئی تم تو خاصی ذہین لگتی ہو..... وغیرہ وغیرہ۔

ڈنگا چڑھ رہے تھے تو آگے سے ہیرا اور اوما مل گئے..... ہیرے نے بھاگ کر ماسی کرشنا سے دودھ کا پتیلا پکڑ لیا اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتا اوپر چلا گیا..... ماسی کرشنا ایک سیڑھی پر بیٹھ گئیں اور راحیلہ کی کمر میں بازو حمائل کر کے دونوں سہیلیاں اوپر جانے لگیں۔

"کچھ پتہ ہے تجھے راحیلہ؟....."

"کیا؟....."

"الو گدھا..... کمینہ....." اوما کی آنکھوں میں یکدم آنسو آ گئے۔

"ہوا کیا بھئی....." راحیلہ نے پوچھا۔

"آج پھاڈنی بو کر کر جنگ آفیسر کو عرضی دے آیا ہے..... ایئر فورس میں جائے گا۔ گدھا.....!"

"لے تو کیوں فکر کرتی ہے۔ ماسی کرشنا جانے دیں گی....."

"مشکل تو یہی ہے کہ ماسی کرشنا کو علم ہے نہ پاشی بہن جی کو اور میں اسے وچن دے چکی ہوں کہ کسی کو بتاؤں گی نہیں....."

"لو وچن تو ٹوٹ گیا ہے اب ماسی کرشنا کو بھی بتا دینا....."

ہو شلّو رسوئی میں رکھ کر ان کی طرف آ گیا۔

"اوما بتا دیا تم نے؟"

"ہاں راحیلہ کسی کو نہیں بتائے گی....."

"ماسی جی کو پتہ نہ چلے راحیلہ وہ بڑے روزے انکا ئیں گی....."

اس عمر میں سب لڑکے لڑکیاں یہی سمجھتے ہیں کہ کوئی ان کے دل کا راز نہیں جانتا!

راحیلہ کو فیل ہونے سے زیادہ اس میں خطرہ نظر آیا کہ ہو ایئر فورس میں جا رہا تھا۔ بھلا ان لڑکوں کو ہوتا کیا جا رہا تھا۔ مہا کوی سریندر نے اپنی بہن گڑیا کا بھی خیال نہ کیا۔ ہو ستون کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ تمام ورزشوں کے باوجود اتنے لمبے قد کے باوصف اس کا چہرہ معصوم اور لڑکیوں کی طرح ملائم تھا۔

یہ ہوائی جہاز اڑائے گا؟

یہ لڑکا ایئر فورس میں جائے گا؟

بھلا اتنی ملائمت کا ایسی ہٹ دھرمی سے کیا جوڑ؟

یہ برما فرنٹ پر جا کر بم گرائے گا.....ان نیلی آنکھوں میں اتنی کٹھورتا کا راحیلہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ کیسے ہو سکتا ہے.....برما فرنٹ اور ہو.....؟

ساری شام اوما اور راحیلہ اسے سمجھاتی رہیں اور بظاہر وہ مان سا گیا لیکن راحیلہ کو شک گزرا کہ اس نے محض لڑکیوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ان کے مشورے سنے تھے۔ جب شام اندھیرے میں بدل گئی اور سامنے پول کیمپ کی بتیوں نے وادی میں چراغاں کر دیا تو شوکت بھیا راحیلہ کو لینے آ گئے.....

"چلو راحیلہ.....اتنی دیر نہ کیا کرو دادا ابا مجھے ڈانٹتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تم نے جان بوجھ کر مجھے بلانے کی خاطر یہ وطیرہ اختیار کیا ہے۔"

"جانے دیں شوکت اب کون کتنی دیر یہاں ہے.....خواہ مخواہ دادا ابا ڈانٹتے ہیں۔"

"نہ جاؤ ابھی....." اوما نے خالصاً شوکت بھیا کو دیکھ کر کہا۔

"اوما بہت دیر ہو گئی ہے....."

"ابھی تو کیول سات بجے ہیں کونسی دیر ہوئی ہے۔" اوما نے کلاک کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا۔

"امی ناراض ہوتی ہیں ناں....."

"تو پھر نہ آیا کرو.....یہ کیا آنے جانے کی مصیبت ہے.....ابھی کل تک تو سب شکر کرتے تھے کہ بچوں سے

جان چھوٹی.....اور اب۔" وہ منہ منا کر بولی۔ اس کی آنکھوں میں ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔

شوکت بھیا اس پھوار کے آگے کمزور پڑ گئے۔

"چلو بھائی نہیں جاتے.....آج سے یہیں رہیں گے بس۔" شوکت بھیا نے کہا۔

"اچھا؟.....وعدہ.....؟ وعدہ ناں۔"

اوما نے ہاتھ بڑھا کر شوکت بھیا کی انگلیاں تھام لیں۔

پھر ایک لمبا منٹ پہاڑ سا گزرا۔ سب خاموش ہو گئے۔ شوکت بھیا کی عادت تھی وہ راحیلہ کے سامنے بدھو بننے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اس لیے بھی انہوں نے احمقوں کی سی شکل بنائی۔ البتہ راحیلہ ایسی شرمندگی سے کئی بار پہلے بھی دوچار ہو چکی تھی۔ ان دنوں پشپ کانت بہن جی کی منگنی ہوئی تھی اور گھر میں خوب چہل پہل تھی.....راحیلہ اوما کو تلاش کرنے بنگلے کے پچھواڑے گئی۔ یہاں چشمہ تھا جس پر پکا کمرہ بنا تھا۔ آگے نلکے لگے تھے جہاں پاشی بہن جی عموماً بیٹھی کپڑے دھوتی اور تاروں پر پھیلاتی رہتی تھیں۔ اس جانب ٹوٹے بنچ، کرسیاں ٹین کنستر ڈبے بھی پڑے رہتے۔ ان گنت جھاڑو کاغذ پرانے برتن بھی ادھر ہی رکھے جاتے..... یہاں ہی اس وقت سرسوتی بہن جی چشمے سے کچھ دور بیٹھی تھیں۔ کن من کن من پہاڑوں کا شفاف پانی ایک نلکے سے ہولے ہولے گر رہا تھا۔ ایک کرسی پر سرسوتی بہن جی سر پر آنچل لیے ننھی منی سی بنی بیٹھی تھیں اور کرسی کے بازو پر شیل کانت بہن جی کے شوہر یعنی جیجا جی پرکاش ارجن بیٹھے تھے۔ پھر راحیلہ کو دیکھتے ہی سرسوتی بہن جی نے زور زور سے ہاتھ جھٹکنا شروع کر دیا اور آنکھ بھینچ لی "ہائے جی.....بڑا درد ہو رہا ہے..... پتہ نہیں کیسے پڑ گیا تنکا.....ہائے میرے بھگوان۔"

"دیکھنے تو دو.....آنکھ تو کھولو.....سرسوتی....."

"نہیں کھلتی ناں ماتا جی کو بلائیں....."

"میں بلاتی ہوں ماسی کرشنا کو ابھی لائی جی ابھی....."

راحیلہ الٹے پاؤں ملزم بنی چلی گئی!

پچھلی گرمیاں بھی ایک واقعہ عجیب قسم کا راحیلہ کے راستے کو بلی بن کر کراس کر گیا۔ خالہ ثریا گرمیاں گزارنے آئی ہوئی تھیں۔ وہ امی ساجدہ کی سگی بہن نہ تھیں لیکن محبت سگی بہن سے بھی زیادہ کرتی تھیں۔ خالہ ثریا کا پاندان ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا۔ چہرے پر مہاسوں کے داغ تھے اور دانتوں کو پان نے غارت کر رکھا تھا۔ بطخ کی طرح بھد بھد چلتی تھیں۔ سامنے والے دانتوں میں بڑا فاصلہ تھا۔ عورتوں کی محفل ہوتو بڑی سیانی کھری کھری گفتگو کرتیں۔ مرد آ جاتے تو نوجوان لڑکی کی طرح شرما لجا جاتیں۔ شوکت اور راحیلہ کے کمرے میں آتیں تو بالکل فری ہو جاتیں۔

"کیا ہو رہا ہے بچو؟ کیا شرارتیں ہو رہی ہیں؟....." ایک جست میں ان دونوں کو بچے بنا دیتیں۔

شوکت کو ان سے بڑی الرجی تھی۔ وہ عموماً ساجدہ امی سے پوچھتا..... "خالہ ثریا کب جائیں گی؟"

"گرمیوں کا سیزن ختم ہوگا تو جائیں گی ناں..... امرتسر میں اتنی گرمی پڑ رہی ہے۔"

خالہ کو ایکٹرسوں کی طرح نمائشی پوز بنانے کا شوق تھا۔ اوپر سے گانے کا بھی شوق..... جب موقع ملتا بڑے شوق

سے گنگنا تیں.... "میں کیوں نہ کروں پیار انہیں..... میں کیوں نہ کروں پیار" وجہ تو کوئی نہ تھی لیکن مشرق میں بڑی بوڑھیوں کے رول متعین ہو جاتے ہیں۔ جیسے بچہ عبادت کرتا عجیب لگتا ہے' ایسے ہی عمر رسیدہ لوگ بغیر نماز روزہ و تسبیح کے فلاوی مخلوق لگتے ہیں۔ خالہ کی سب سے بڑی ٹریجڈی تھی کہ وہ اندر سے بیس برس کی تھیں اور باہر سے بوڑھی پھوس..... لڑکیوں کے ساتھ مل کر کھٹے کھاتیں۔ اوما کے گھر کے پچھواڑے کھٹے کی باڑ تھی۔ اوما جب بھی آتی جھولی میں دو چار کھٹے اٹھائے لاتی۔ پھر بڑی پریت سے "ٹھہرو..... روبیہ..... رکو ذرا" کہہ کہہ کر خالہ ثریا کھٹے صاف کرتیں۔ پھر راحیلہ حساب سے نمک مرچ ملا کر باورچی خانے سے چرا لاتیں۔ میٹھی املی کی چٹنی بنائی جاتی۔ پھر چٹنی ملا کر نمک مرچ چھڑک کر کھٹے کھائے جاتے۔ آنکھیں میچ میچ کر چسکے لے لے کر۔ آخر میں خالہ ثریا انگلیاں چوم چاٹ کر پٹی یوں صاف کرتیں کہ گویا دھوئی ہوئی ہے۔

لیکن ایک روز ڈاکٹر ابا آ گئے..... خالہ ثریا نے جلدی سے سر ڈھانپ لیا۔ ڈاکٹر صاحب مجھے مانتے ہیں۔ ایک پھانک اٹھا کر منہ میں ڈال لی..... فوراً غسل خانے میں تھوکنے چلے گئے..... اونہہ آخ تھو..... چھی چھی چھی یہ کیا بکواس ہے۔ خالہ ثریا کا منہ اتر گیا۔

"میں سمجھا مالٹے ہیں....."

"گلے خراب ہو جائیں' چلو باہر پھینکو ابھی۔ میں کہوں بچوں کی آوازوں کو کیا ہوا ہے۔ آپ بھی نہیں سمجھاتیں انہیں..... شوکت ابھی کھڈ کے نیچے پھینکو انہیں' یا اللہ۔"

خالہ ثریا کی عادت تھی۔ ڈاکٹر سرفراز دادا ابا' ساجدہ ماں کے سامنے کھانا بھی نرگی کھاتیں..... میز پر تو کھانا سونگھا جاتا تھا۔ اصلی کھانا تو بچوں کے کمرے یا باورچی خانے میں ٹھونسا جاتا۔

"ابھی پھنکواتی ہوں بھائی جی ابھی....." فوراً سر پر پلّو مار کر خالہ بی بولیں۔

"ہاں ابھی اسی لمبے کھڈ کے نیچے..... ابھی....."

خالہ ثریا کے حلق میں قہقہے دب گئے۔ انہوں نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا..... "ارے ری ٹھہر اوما اس کی کھٹائی نچوڑ کر اچار میں ڈال دیں گے۔"

ڈاکٹر سرفراز گرجے..... "انہیں پھینکو پرے..... ایک تو کھٹے اوپر سے جانے کیا گند بلا ملا رکھا ہے....."

جب ہم سب قریب آدھی تھالی کھڈ میں اور آدھی پیٹوں میں اتار کر واپس آئے تو خالہ بستر پر پٹی سر پر باندھے لیٹی نظر آئیں۔ اس کے بعد معمول ہو گیا۔ جاپانی ریشم کا۔ سیاہ رومال جس کی گرہ کان کے قریب لگتی تھی' باندھ کر خالہ ثریا پڑ رہتیں۔ پھر سارا گھر ان کے گرد گھومنے لگتا۔ کبھی ساجدہ ماں گرم پانی کی بوتل پکڑا رہی ہیں۔ کبھی دادا ابا پانی دم کر کے پلاتے۔ ڈاکٹر صاحب اسٹیتھو سکوپ لگا کر آ تکتے پر کھٹے اوما پیروں سر دباتی اور راحیلہ تا تکتیں۔ شوکت بھیا کیمرہ' ڈیزی کن' کتابیں اور ادھر سب کچھ بھول بھال' کبھی کوئی والی سوڈے کی بوتلیں لاتے' کبھی رام ناتھ کی دوکان سے پکوڑیاں سموسے.....

اس رات خالہ راحیلہ کے ساتھ سونے کی تیاری کر رہی تھیں۔ ایک ساجدہ ماں تھیں کہ ہر گھڑی بجتیں۔

"اور راحیلہ ذرا ہٹ کے سو' کیا جڑی چلی جاتی ہے....." ایک خالہ ثریا تھیں کہ بازو پر سلاتیں' سر تھپکتی رہتیں' منہ

میں کچھ پڑھ پڑھ کر دم کرتیں..... خالہ ثریا نے تھپک تھپک کر سلایا۔ راحیلہ کو جلد نیند آ گئی۔ پھر چاند نمودار ہو گیا.....

پہاڑوں کا دھلا دھلایا چاند..... اس نے کھڑکی سے ایسے جھانکا جیسے Peeping Tom ہو..... جاپانی کیلنڈرز راحیلہ کا تکیہ' جاپانی عورت کا کیلنڈر' شوکت بھیا کا کیمرہ' سارا کباڑ روشن ہو گیا۔ راحیلہ نے کمبل چہرے سے اتارا.....

شوکت بھیا سٹول پر بیٹھے خالہ ثریا کا سر دبا رہے تھے اور نیند میں جھول رہے تھے۔ پھر خالہ ثریا بھیا کے بازو پر ہاتھ پھیرنے لگیں..... راحیلہ کو خوف آ گیا۔ اس نے آیت الکرسی پڑھنا چاہی لیکن ابھی یہ سبق پکا نہ ہوا تھا۔ دادا ابا کو سناتے وہ کئی بار اٹکی ہوئے ہوئے اللہ میاں سے التجا کی کہ شوکت بھیا کو بچا لے..... انہیں کچھ نہ ہو۔

خدا جانے وہ کیوں سمجھتی تھی کہ شوکت بھیا کو کچھ ہونے والا ہے۔

پھر خالہ ثریا اٹھ بیٹھیں اور بھیا کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور خود جھولنے لگیں۔

پہلے راحیلہ کا جی چاہا کہ خالہ سے کہے' میں جاگتی ہوں جی۔ پھر اس خوف سے کہ وہ ناراض ہوں گی' چپ ہو گئی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ بھیا جانتے ہیں..... دل میں وہ دعائیں مانگنے لگی' یا اللہ صبح ہو جائے۔ پھر خالہ نے شوکت بھیا کو گال پر چوما تو بھیا سٹول سے اٹھ گئے۔

صبح راحیلہ اٹھی تو صرف وہی شرمندہ تھی۔ اسے شبہ ہوا کہ شاید دادا ابا ٹھیک کہتے ہیں' ساری خرابی نامحرم کی صحبت اختیار کرنے میں ہے..... نہ اتنی قربت حاصل ہوتی..... سر دبوانا پڑے۔

''بھئی یہ بوتل میں بند جن کس عمر تک انسان کا پیچھا کرتا ہے اور مانتا کیوں نہیں؟ نہ مذہب دیکھے نہ عمر..... نہ شکل.....''

☆☆☆

''چلو ہم بھی تمہیں چھوڑنے جاتے ہیں راحیلہ.....'' اوما بولی۔

''پگڈنڈی کی طرف سے نہیں سڑک سے جائیں گے۔''

کئی مرتبہ پہلے بھی ایسے ہو چکا تھا۔ پہلے اوما اور بیو ساتھ چلتے تاکہ راحیلہ اور شوکت کو ان کے گھر پہنچا آئیں۔ پھر شوکت اور راحیلہ انہیں ٹھاکر چندر سین کے پائن ولا تک چھوڑنے جاتے۔ چھوڑنے چھڑانے میں کئی پھیرے لگ جاتے اور دونوں گھروں کے بڑے بوڑھے پریشان ہو جاتے۔ امی ساجدہ کو تو ویسے ہی جنگلوں میں سے گزرنے والی سڑک سے بڑا خوف آتا۔ گو شہر میں بجلی آ جانے سے ساری سڑک پر بجلیاں جلتی تھیں لیکن خاموشی اور روشنی بڑی مبہم تھی۔ یوں لگتا جیسے چیڑ کے درختوں کے پیچھے کوئی چھپا ہوا ہے..... لیکن ان بچوں نما نوجوانوں کو کبھی ان جنگلوں سے خوف نہیں آیا تھا۔

بیو اور شوکت آگے چل رہے تھے۔ شوکت کا ہاتھ بیو کے کندھے پر تھا اور وہ ابھی بھی بیو کو سمجھا رہا تھا کہ ایئر فورس کی زندگی بہت tough ہوتی ہے۔ اوما مسلسل مس ریاض کی باتیں کر رہی تھی لیکن جب وہ سامنے دیکھتی تو کچھ گم سی ہو جاتی اور از سر نو بات وہیں سے شروع کرتی جو پہلے بھی بتا چکی تھی۔

پھر ایک موڑ آیا اور بیو اور شوکت اچانک موڑ کاٹ کر اوجھل ہو گئے۔

کافی آگے تک وہ دونوں چلتی رہیں لیکن لڑکوں کا کوئی سراغ نہ تھا۔

پھر جب ایک اور موڑ کاٹ کر یہ دونوں آگے بڑھ رہی تھیں تو پیچھے سے کسی نے آ کر اچانک کہا...... ''ہو!......''

خیر ذرا سی بات تو تھی ہی لیکن راحیلہ شوکت بھیا کو دیکھ کر سنبھل گئی لیکن اوما نے پہلے تو چیخ ماری پھر چھوٹے بھیا کے قریب ہو کر ڈولنے لگی۔ وہ آگے بڑھے اور اسے سنبھالتے ہوئے بولے...... ''تو اس کا بھائی ایئر فورس میں جائے گا۔ بس ڈر گئیں؟''

اوما نے اپنا سر شوکت بھیا کے کندھے سے جوڑ کر کہا...... ''جاؤ ہم نہیں بولتے شوکت' کیسی معمولی سی بات تھی۔ ہر دیس میں لڑکے لڑکیاں بڑے ہو کر ڈرنے ڈرانے کی نئی روایتیں قائم کرتے لیکن اس ایک لمحے میں بے دھڑک ہو کر ڈرنے اور ڈرانے والے یکدم اکٹھے ہو جاتے ہیں...... بات معمولی تھی لیکن راحیلہ سوچتی رہی کہ اوما نے کچھ زیادہ دیر ہی شوکت بھیا کے کندھے سے سر جوڑے رکھا!

ماں باپ بچے کو گندھی مٹی دیتے ہیں۔ آگے صراحی پیالہ تھالی بچے خود بناتے ہیں۔ کبھی کبھی اولاد برتن بنا کر اسے توڑ بھی دیتی ہے۔ کبھی گیلی مٹی کے برتن کو اپنی ہڈیوں کا سیک دے کر بچہ خوبصورت روغنی نقش و نگار سے آراستہ ظروف بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی مٹی اس درجہ بھربھری رہتی ہوتی ہے کہ بچہ لاکھ کوشش کریں' کوئی برتن نہیں جڑتا۔ ماں باپ یہ مٹی عموماً اپنے آنسوؤں میں گوندھ کر دیتے ہیں۔ یہ آنسو ان کے اپنے تجربات سے نکلتے ہیں۔ جو والدین امیر کبیر ہوتے ہیں۔ وہ عموماً آوارہ عورتوں' دھوکے باز شاطروں' لالچی رشتہ داروں کے تجربات پر نکلے آنسو مٹی میں گوندھتے ہیں۔ تعلیم یافتہ گھرانوں میں رہن سہن اور سوچ کے مسائل پر آنسو نکلتے ہیں۔ معاشرے کی ناانصافیاں ان کا باعث بنتی ہیں۔ مذہبی والدین تلوار کی دھار پر چلتے ہیں۔ مسلکوں پر چلتے' حق و باطل کی جنگ میں شریک ہونے والے ان مسائل پر روتے ہیں جو بچوں کی آرزوؤں کو نہ پورا کرنے پر آنکھوں سے نکلتے ہیں۔ غریب والدین قرضہ' سوسائٹی میں بے مائیگی' عزتِ نفس پر مسلسل حملوں کی وجہ سے آنسو مٹی میں بوتے ہیں۔ کچھ لوگ مٹی کو اس قدر پتلا کر دیتے ہیں کہ اس گارے سے بچہ کچھ بنا ہی نہیں سکتا۔ کچھ بنے بنائے برتنوں کو لات مار کر وراثت کا اثاثہ ضائع کر دیتا ہے اور پھر ساری عمر پچھتاتا رہتا ہے۔

لیکن مامی کرشنا نے تو بیو کو گندھی مٹی نہ دی تھی...... وہ اوما اور بیو کو پالتی پالتی کہیں ایسے ہی راستے میں الجھ گئی تھیں۔ ان کے پاس زیادہ آنسو بھی نہ تھے۔ بیو نے پرورش کے دوران اپنے گورے رنگ اور نیلی آنکھوں کی وجہ سے سب کی محبت بٹور لی تھی۔ وہ مامی کرشنا کی کوکھ سے پیدا نہ ہوا تھا لیکن جب سے بیو کے جانے کی خبر پھیلی تھی۔ مامی کرشنا نے اندازی کھوائی لے رکھی...... اوما کی کچھ کچھ اور بات تھی۔ اس نے مامی کرشنا کے گھر میں اپنی آرزوئیں دبا کر اپنے آنسو چھپا کر اپنے ارادے نہ ظاہر کر کے گرفت کی تھی۔ لیکن اندر ہی اندر اوما اس چیز سے کبھی چھٹ نہ پاتی جس پر اسے شبہ ہوتا کہ اس کی ہے۔ اس نے برما جانے والے اپنے تین بہن بھائی چھوڑے تھے...... اب وہ بیو سے بچھڑنے والی تھی۔ پھر پتہ نہیں اس پر خدا کی کیا سنوار تھی؟ وہ پیدائشی سیانی ہوئی۔ شوکت بھیا گر بی اے میں تھے تو اس کے یہ معنی نہ تھے کہ ان کی روح بھی بالا پن چھوڑ چکی ہے۔ وہ بڑی رازداری' خاموشی اور شرمساری کے ساتھ اوما کا راز خود اپنے آپ سے چھپا کر اس کی طرف بڑھتے تھے لیکن اوما کو اگر بار بار مامی کرشنا یقین نہ دلاتیں کہ یہ اسی کا گھر ہے تو وہ کیسے مان لیتی۔ شاید اسی لیے کبھی کبھی وہ لیٹ کر

سوچا کرتی کہ شوکت اس قدر سست کیوں ہے کہ روز اس سے شیو بھی نہیں ہوتی۔

راحیلہ اور شوکت ایک بار پھر اوما کی طرف پوچھنے گئے کہ بوکب جارہا تھا۔ پاشی بہن جی ماسی کرشنا نے رو رو کر برا حال کر رکھا تھا۔ اوما اندر کی کیفیتوں کو چھپائے منہ سجائے شلغموں کے ہار پرونے میں مصروف تھی اور بو اپنا سامان اور جملہ انتظامات کرنے میں لگا تھا۔

''بو کیوں جائے گا.....ہم اسے کبھی جانے نہ دیں گے.....'' اوما نے نڈر بن کر کہا۔

''اگر وہ تمہاری وجہ سے ٹھہر گیا تو میں سوچوں گا کہ بو انتہا کا بودا' بزدل اور معمولی آدمی ہے۔ اتنی ورزشیں بیکار گئیں۔''

''وہ میرا اکلوتا بھائی اور آنکھ کا تارا ہے.....اور کبھی کوئی چھوڑ سکتا ہے..... کسی کو.....''

شوکت نے ایک کتا شلغم اٹھایا اور بولا..... ''آنکھ کا تارا ضرور ہے اوما کسم لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ بو نہیں ہے۔ وہ پہلے بو ہے۔ پھر تمہاری آنکھ کا تارا ہے۔ تم اس کی سالمیت' انفرادیت کو کیسے برباد کر سکتی ہو؟ تم اس کی چنی ہوئی راہ میں بڑا سا پتھر بن کر حائل ہونا چاہتی ہو۔ اتنی خطرناک محبت! کمال ہے یار.....''

جب شوکت یوں باتیں کرتا تو اس کے ماتھے پر ان گنت جھریاں پڑ جاتیں اور ان لائنوں کی وجہ سے لگتا کہ وہ بی اے کا طالب علم نہیں کسی فیکٹری کا منیجر ہے۔ کسی پولیس سٹیشن کا اے ایس آئی' کالج کا معمر پروفیسر!

اوما نے سوت میں شلغم پروئے ہار ایک طرف کیے اور شوکت کی جانب کھسک گئی۔ اسے اس سے شوکت بھیا بڑے کمینے لگے۔ ساری عمر پرانی گراریوں' پرزوں سے محبت کی..... سٹل لائف کی تصویریں کھینچیں۔ ڈیزی گن سے بیچارے پدو مارے انہیں کیا معلوم کہ محبت کیا ہوتی ہے؟

''لیکن شوکت! جب بو چلا جائے گا تو میں کیا کروں گی.....؟''

شوکت نے ایک بار پھر ماتھے پر سلوٹیں ڈالیں اور آہستہ سے کہا..... ''اور جب تم چلی جاؤ گی تو بو کیا کرے گا.....جو کچھ بو تب کرے گا تم اب کرلو۔''

اگر عام نارمل دن ہوتے تو اوما جنگ برپا کر لیتی لیکن اب وہ کچھ سوچ کر بولی..... ''اور جو میرا دکھ دیکھ کر بو آپی نہ گیا تو.....''

شوکت نے بھولپن سے اپنا مضبوط ہاتھ اوما کے کندھے پر رکھا اور ہولے سے بولا..... ''وہ اور بات ہے' میں نہیں کہتا تم بو کے جانے کی خوشی میں دیپ جلاؤ' شادیانے بجاؤ.....میں تمہاری جگہ ہوتا تو یہی کچھ کرتا۔ لیکن بو کو اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرنے دو.....اور بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اس کے فیصلے کی عزت کرو..... ہر انسان کو اپنی زندگی بنانے اور بگاڑنے کا کلی اختیار ہے۔ تم کو بو پر سارے اختیارات ہیں۔ صرف تم اس کے فیصلے پر قابض نہیں ہو سکتیں۔''

اوما کا نیلا دوپٹہ شام کی روشنی میں بنفشی رنگ پکڑ گیا۔ وہ خود بھی کوئی اور اوما لگ رہی تھی۔

''لیکن.....''

''تمہیں یاد ہے روی کے کتے نے تمہاری گڑیا کا دولہا مار ڈالا تھا۔''

''ہاں یاد ہے.....''

''پھر یاد ہے تمہیں اس کتے سے بڑا پیار ہو گیا تھا۔ تم اسے دیکھتے ہی گود میں بٹھا لیتی تھیں۔ یاد ہے یاد ہے کہ نہیں.....''

''ہاں یاد ہے شوکت.....''

''جو آج اچھا لگ رہا ہے' کل برا لگ سکتا ہے.....کیا پتہ چلتا ہے دل کا.....یہ ایک راستے پر چلے بھی.....''

راحیلہ نے حیرانی سے اپنے بھائی کو دیکھا۔ ابھی چند سال پہلے شوکت مخمل نیکریں پہنتا تھا۔ سردیوں میں اس کے گھٹنے نیلے پڑ جاتے اور یوں لگتا سفید ٹانگوں پر پیوند لگے ہیں۔ یہ تو کوئی اور ہی نوجوان تھا۔ اس لڑکے نے تو کبھی ہوکا خرگوش چرایا ہی نہ تھا۔ دھوبن چڑیا بن کر گزیا کے کپڑے نہ دھوئے تھے۔ بڑی طرحدار قمیض کی بانہیں اوپر چڑھی تھیں اور سفید بانہوں پر سنہری بالوں نے ہلکی ہلکی تہہ جما رکھی۔ تلوار کی دھار ایسی کریس والی پینٹ کا اپ ٹرن چمکتے بوٹ پر جھک رہا تھا.....شوکی کس قدر بدل چکا تھا۔ اس کا اندازہ اوما کے بعد پہلی بار راحیلہ کو ہوا۔ اسی اپالو کے سامنے اوما نہ چاہتے ہوئے بھی جھک گئی۔

اوما کے گھر سے غروب آفتاب کا منظر ایسے نظر آتا جیسے ساری وادی نارنجی اور سرخ رنگ کے سیلاب میں گھر گئی ہو۔ شوکت کے گھر جب شام آتی تو سامنے دھولی دھار کا پہاڑ لاوے کی طرح ابلتا نظر آتا۔ آسمان آگ میں گھر جاتا لیکن گھر منظر کا حصہ نہ بنتا۔ یہاں نہ مکین نہ گھر رنگ پکڑتا۔ لیکن اوما کا گھر منظر میں ڈوب جاتا۔ چہرے گلال ہو جاتے۔ لوگ سحر آلود نظر آتے۔ ڈھلوان پر نظر آنے والے چھوٹے سے مندر کے کلس نارنجی ہو کر اور بھی قریب آ جاتے اور سندھیا کی گھنٹیاں ہر کمرے میں سنائی دینے لگتیں.....شوکت بھی اس منظر کا حصہ تھا اور بہو کی روانگی پر ایک قدرتی دلگیری نے اسے گھیر رکھا تھا۔ شاید وہ اس قدر مضطرب بھی نہ تھا۔ وہ بھی مضطرب اوما کی بے چینی سے خوفزدہ تھا لیکن اسے اس سے بھی بڑا خوف یہ تھا کہ اگر وہ بہو کے جانے کے بعد اس خلا کو پُر نہ کر سکا جو بہو کی عدم موجودگی سے پیدا ہوگا تو پھر کیا ہو سکتا ہے۔ وہ اسے اپنی توہین سمجھ رہا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے اوما اس قدر غم محسوس کر رہی ہے۔

بہو نے اندر سے چنگھاڑ لگائی.....''لیکن اس سوٹ کیس میں تو سامان پیک نہیں ہو رہا.....''

راحیلہ ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔

''یہ تو اچھا ہے اس کے معنی ہیں' تم نہیں جا سکتے.....بقول ماسی جی یہ اچھا شگون نہیں۔''

''واقعی تمہیں دسویں میں فیل ہی ہونا چاہیے تھا۔''

وہ سوٹ کیس سے کشتی لڑنے لگا۔

''جانتے ہو بہو لڑائی میں جا رہے ہو اور لڑائی میں کوئی ہنسی مذاق نہیں.....''

''میں نے کب کہا' یہ ہنسی مذاق ہے۔''

''تمہارا جانا ایسا ضروری ہے بہو.....''

''شاید یہ بھی ایک خواب رہ جاتا۔ جانتی ہو نا ں میں بچپن میں ریلوے کا انجن ڈرائیور بننا چاہتا تھا۔ پھر بازی

بلڈنگ کا جنون ہو گیا..... لیکن..... پھر میں وہ دوکان کرنا چاہتا تھا۔"

"باقی خوابوں کی طرح یہ بھی چھوڑ دیتے....."

"چھوڑ دیتا..... لیکن شوکت نے مجھے سمجھایا..... ہر انسان کی ایک شخصی زندگی ہوتی ہے جس پر کسی اور کو تو کیا خود اسے بھی اختیار نہیں ہوتا..... اپنی انفرادی سالمیت۔"

بگڑ کر راحیلہ بولی..... "شوکت بھیا اور ان کی انفرادیت سالمیت! باتوں کا دیا کھاتے۔ یاد ہے نا شیشے کا خرگوش؟....."

بالآخر سوٹ کیس اس کے گھٹنے کا وزن سہہ کر بند ہو گیا تھا۔ "شوکت بھیا جو کچھ کہتے ہیں محض کہنے کی خاطر کہتے ہیں۔ صرف مرعوب کرنے کو..... باتوں کا ان کی اصلی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہبو....."

"نہ ہبو..... میں جانتا ہوں۔"

"پھر بھی تم شوکت بھیا کے بھرّے میں آ کر ماسی جی کو چھوڑ رہے ہو؟ ہبو! اپنی شخصی زندگی ایسی چیز نہیں کہ چھلکا اور کیلا علیحدہ علیحدہ ہو سکیں۔ جن لوگوں کو چھوڑ رہے ہو پگلے' تمہاری زندگی ان ہی کے سہارے چلتی ہے۔ انفرادی سالمیت شخصی آزادی معمولی الفاظ ہیں۔"

"یہ بھی جانتا ہوں....."

اوما بھی اٹھ کر آ گئی۔ اس کا چہرہ بیچی سا نکل آیا تھا۔ کپڑے گندے اور آنکھیں روئی روئی تھیں۔

"پھر منہ پھلا لیا اوما۔" ہبو نے اسے کندھوں سے پکڑ کر پوچھا۔

"میں تمہیں جیون بھر معاف نہیں کروں گی..... اور دیکھ لینا..... اتنی دور..... اتنی دور چلی جاؤں گی کہ تم عمر بھر مجھے ڈھونڈتے پھرو گے..... عمر بھر....."

"تم نے بھگوان سے وائرلیس لگا رکھی ہے اوما..... کاش تمہیں ساتھ لے جا سکتا تو بڑے کام کرتیں..... راحیلہ ذرا دیکھنا ماسی کرشنا کہاں ہیں۔ وقت کم رہ گیا ہے....." وہ اپنی گھڑی دیکھنے لگا اور اوما اس سے لپٹ گئی۔

ان دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر راحیلہ ماسی کرشنا کو ڈھونڈنے چلی..... پاشی بہن جی اداس چہرہ لیے کمرے میں پھنکارتی ٹہل رہی تھیں۔ ان کو دیکھ کر ویسے ہی سرسوتی بہن جی' شیل کانت' بہن جی کھسک جایا کرتی تھیں لیکن راحیلہ کو ہمیشہ پاشی بہن جی پر غصہ آیا۔ لو بھلا پاشی بہن جی پہلی عورت تھی جو بیوہ ہوئی..... ان کی وجہ سے نہ تو دیوالی کو ان کے گھر ٹھیک طور سے دیئے جلتے نہ بسنت کے روز کوئی بسنتی ساڑھی پہنتا۔ نہ ماسی کرشنا کروا چوتھ کا برت رکھ سکتیں۔ نہ جنم اشٹمی کے دن برہمنوں کی سیوا ہوتی۔ بس جب کوئی بات ہوتی بلک بلک کر رو دیا جاتا۔ رونا اگر رونا رہے تو خوب ہے لیکن اس میں اگر جنتر کی کیفیت پیدا ہو جائے تو باقی رہتے بستے گھر والے سہم کر رہ جاتے ہیں۔ سارے گھر والے ایسے تھے گویا اوپر سے برف پوش چوٹیاں اور اندر دہکتا ابلتا لاوا.....

"تو جا رہا ہے ہبو..... کیوں راحیلہ....."

"پتہ نہیں پاشی بہن جی....." گھبرا کے راحیلہ بولی۔

"سب پتہ ہے سب کو پتہ ہے۔ ایک پاشی کرم جلی کو کچھ نہ ہتا تا..... ہاں۔" وہ بھاں بھاں کر کے رونے لگیں اور راحیلہ وہاں سے کھسک کر اندر چلی گئی۔

جوتھیکا رائے لہک لہک کر ریڈیو پر گا رہی تھی..... "پل پل جلتا ہے شمشان....."

ریڈیو راحیلہ کے لیے نئی چیز ہی تھی۔ ابھی اونچے گھروں میں کہیں کہیں یہ ایجاد در آئی تھی۔ ٹھا کر مدن سین یہ ریڈیو جنگ کی خبریں باقاعدگی سے سننے کے لیے لائے تھے لیکن گانے سننے کی اجازت نہ تھی۔ ایک تو ان کا خیال تھا کہ بجلی زیادہ خرچ ہوتی ہے۔ دوسرے ریڈیو کے گانے مخرب الاخلاق شمار ہوتے تھے۔ گانے سننے کے لیے وہی پرانا دھوتو والا گراموفون مناسب سمجھا جاتا۔ چند لمحے راحیلہ دم بخود جوتھیکا رائے کا گانا سنتی رہی۔ پھر اس نے دیکھا آرام کرسی میں دھنسی سرسوتی بہن جی ننکا تنگ سویٹر بن رہی ہیں۔ ان کی آنکھیں پھٹی پھٹی اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"آداب سرسوتی بہن جی....." راحیلہ نے ہولے سے کہا۔

سرسوتی جی نے ہلکا سا سر ہلا کر نمستے کہا۔

راحیلہ جانے لگی تو بہن جی بلبلا کر بولیں..... "راحیلہ تم ہو کو سمجھا نہیں سکتیں..... کیا فائدہ جنگ میں جانے کا..... ہائے رام وہ بم گرائے گا کبھی کبھی وہی..... جیو ہتیا کرے گا ہو؟"

"میری کب سنتا ہے سرسوتی بہن جی....."

"ہاں جی کوئی کب کسی کی سنتا ہے....."

شوکت نے اس ملی جلی سوسائٹی میں بڑے کاسموپالٹن قسم کے رویے اختیار کر لیے تھے۔ دادا ابا کو دیکھ کر وہ معرفت کی باتیں کرتا' طائف کے کربلائے معلی کے واقعات سناتا۔ پھر اوما کے گھر وہ مہابھارت سنانے لگتا..... شوکت مغل واقعی اکبر بادشاہ کا جانشین تھا۔ اس کا دل چاہتا سب مل جل کے رہیں۔ کوئی کسی کا دل نہ دکھائے۔ جبر نہ ہو کسی پر..... اوما کے اٹھتے ہی شوکی جوتے اتار کر ماسی کرشنا کے کمرے میں گیا۔ وہ سنکھ بجا کر چھوٹی الماری میں بھگوان کرشن کے چرنوں میں رکھ رہی تھیں۔

"ماسی کرشنا ذرا اونچے اونچے شلوک پڑھیے بڑا آنند ملتا ہے....."

ماسی کرشنا منمنا منمنا کر اوم بھور بھیئے سواہا پڑھنے لگتیں۔ سندھیا کا سماں پہاڑوں میں خالص عبادت کا وقت ہوا کرتا ہے..... دور کہیں آسمان وادی کے گلے مل کر پالاگن کہتا۔ سورج آخری سجدہ دے کر کائنات بنانے والے کا اعتراف کرتا۔ درخت سورج سے بچھڑ کر یوں لگتے جیسے سیاہ فام قوم ملگجی اوڑھنیاں اوڑھ کر قطار اندر قطار وداع کا گیت گا رہے ہوں..... اگر اوما اس وقت آتی تو اسے لگتا کہ یہ سورج غروب کا اعجاز نہیں۔ دھولی دھار پہاڑ کا جادو نہیں فقط اس کی ذات کا سحر ہے جس نے شوکت کو شلوک سننے پر مجبور کیا۔

"ہے بھگوان ہونہ جائے..... ہے کرشن مہاراج میری بنتی سنیے....."

"ماسی کرشنا میں جانتا ہوں..... ہو آپ کے جیون کا کیندر ہے اور آپ اسی کے دھیان میں رہتی ہیں۔ لیکن ایسی مہلا جو مرلی دھر کے شرن میں اپنا سب کچھ دان کر چکی ہوں اسے چنتا کیوں۔ شاستروں میں تو آیا ہے کہ آپ ایسی پتی برتا شبھ چنتک سویم سویکا استری سے تو مہادیو بھی ڈرتے ہیں۔ پھر یہ اشانتی کیوں؟"

اوما نے دروازے میں آ کر یہ بولی شوکت کو بولتے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ سمجھ نہ پائی کہ یہ باتیں ازراہِ ہمدردی ہیں کہ تمسخر؟

"تم ٹھیک کہتے ہو شوکت بیٹا لیکن میں بوڑھی ہو چکی ہوں..... بہو کے جانے کا سن کر میں بوڑھی ہوئی بیٹا..... اب مجھے نظر آیا میرے دانت ٹوٹ گئے ہیں۔ میرے بال سفید ہیں اور اب مجھ سے دودھ کے مٹکل نہیں اٹھتے....."

"دودھ کا مٹکل تو ویسے بھی آپ کو نہیں اٹھانا چاہیے ماتا جی..... بھلا یہ شریمتی اوما کس لیے ہیں؟"

آنسو بھری آنکھوں سے ماسی کرشنا نے اوما کی جانب دیکھا..... اور اپنے آپ سے بولیں..... "نہیں بیٹا نہیں، مجھے اوما سے دودھ کے مٹکل نہیں اٹھوانا..... لو بھلا میں اتنی مورکھ ہوں کل اس کے ماں باپ آ کر لے جائیں تو پھر کون سارے گا..... یہ تو تلسی کا پودا ہے۔ شوکت! تم اس کا دان کرنا پڑے گا....."

دان.....؟

شوکت نے دل میں سوچا۔ کیا خیرات ہمیشہ حقدار ہی کو دی جاتی ہے.....

بہو کو روانہ کرنے ہم سب لاریوں کے اڈے تک گئے..... ہم سب کی الوداعی جھکیریاں ختم ہونے میں نہ آ رہی تھیں اور لاری کا ڈرائیور بار بار ہارن دے رہا تھا۔ دادا جی ٹھاکر مدن سین کو تھپک تھپک کر تسلی دے رہے تھے۔ "ٹھاکر جی..... دیکھیے ناں یوں بر ماتہ جاتا تو وہ برما پہنچ جاتا۔ اپنے ماں باپ کے پاس..... برما تو بہو کی قسمت ہے....."

ڈاکٹر سرفراز نے مردانہ طریقے سے بہو کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "جوان ہوتے ہی ایسے ہیں۔ کیا ڈیل ڈول نکالی ہے..... کیوں بھئی بہو! گیدڑ کی بولی آ گئی....."

بہو اس گھڑی اپنے فیصلے کی نالائقی پر پچھتا رہا تھا۔ آواز اس کے حلق سے نہ نکلی تھی۔ اس نے صرف اثبات میں سر ہلایا۔

"کیوں اوما! تم کو گیدڑ کی بولی آ گئی..... ان لڑکیوں کو آ جاتی تو انہیں بھی لاہور بھیج دیتے کسی کالج میں....."

ڈاکٹر سرفراز یوں باتیں کر رہے تھے جیسے کالے بادلوں کو چیر کر سورج کی شعاعیں نکلنے کی کوشش میں ہوں۔

اوما کے لیے دم دلاسے فضول تھے۔ وہ غم میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ ہر طرف آنسوؤں سے کوڑے برسا رہی تھی۔ ماسی کرشنا رو رہی تھی لیکن خیر و برکت کے ساتھ..... ابھی تک وہ دل ہی دل میں بہو کے رک جانے کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر تشویش کی جگہ آس تھی۔ لیکن اوما ماں باپ سے بچھڑی آج تک جھگڑتی چلی آئی تھی..... وہ سرسوتی بہن جی کے ساتھ لگی جھول جھول کر ہچکیاں لیتی روئے جا رہی تھی۔

"سنو اوما سنو ناں آخر تو بہو کو جانا ہی تھا ناں۔ ایئر فورس میں نہ جاتا تو پڑھنے لاہور چلا جاتا..... وہاں نہ جاتا ٹھاکر چاچا کے پاس برما چلا جاتا۔"

لاری کے قریب بہو کسی مجرم کی طرح لب بند کھڑا تھا۔ وہ ساجدہ ماں سے کبھی کبھی ہولے سے کچھ کہہ لیتا اور ساجدہ ماں اپنے نقاب سے آنکھیں پونچھ لیتی۔ شوکت اس بڑے گروہ سے ہٹ کر ایک لمبی سی شاخ کو چاقو سے چھیل رہا تھا۔ اس لمبی لچکیلی ڈال کو ہنٹر کی طرح مارتا وہ اوما تک پہنچا۔

"اگر یہ روتی ہے سرسوتی بہن جی تو رو لینے دیں ناں....."

اوما کی ہچکیاں اور اونچی ہو گئیں۔

"ویسے بھی رونا اس کی صحت کے لیے اچھا ہے..... رو لینے دو.....جی بھر کے۔" ہچکیوں کے دوران اوما چلائی..... "سب تم جیسے کٹھور نہیں ہوتے....."

شوکت بھیا نے تازہ مچھلی چھڑی اپنی کمر کی جانب کی اور بولا..... "آہا تمہیں تسلی اچھی لگتی ہے! میں نے تو سمجھا تم ہمدردی سے نفرت کرتی ہو اوما..... بھلا دکھ کس بات کا..... ہوا ایئر فورس میں جا رہا ہے مر نہیں رہا....."

"ہائے تمہارے منہ میں خاک شوکت....." ساجدہ ماں نے نقاب سے گیلی آنکھیں پونچھ کر کہا۔

"چلیے اماں میرے منہ ڈھائی سیر خاک.....لیکن اوما بیگم اگر تمہارے ان آنسوؤں سے ہو رک سکتا ہے تو کوئی انوکھی بات ہوتی..... جب وہ رک نہیں سکتا تو رونا بیکار ہے....."

اوما نے چڑ کر کہا..... "تم نے کبھی دکھ دیکھا ہو تو جانو..... تمہیں کیا پتہ ہیر اکیا ہوتی ہے۔" ساجدہ ماں پاشی بہن جی کو چپ کرانے لاری کے پیچھے چلی گئیں تو شوکت نے کہا۔ "اور تم کیا سمجھتی ہو تم ہی فقط انسان ہو۔ اوما سنو! دکھ صرف تمہارے ہی دل کو ودیعت کیا گیا ہے۔ اوما آسکر وائلڈ تم سے بہت پہلے پیدا ہوا تھا۔ جیل میں ایک دن اس نے لکھا تھا۔ دنیا میں بس ایک ہی رت مستقل ہے..... دکھ کا موسم..... یوں لگتا ہے جیسے سورج اور چاند بھی ہم سے چھینے جا چکے ہیں۔ باہر چاہے سورج نیلا ہٹوں میں ڈوبا سونا بکھیر رہا ہو لیکن جو روشنی ہمارے حجرے دھندلائے شیشے اور سلاخوں سے نکل کر آتی ہے بے کیف، بے آب اور ناکافی ہوتی ہے..... جیل کی کوٹھڑی میں ہمیشہ دھندلکے ہوتے ہیں۔ بیزار جھینگے بسرام کرتے ہیں۔ بالکل ایسے دھندلکے دل میں رہتے ہیں۔ ٹھٹھرے ہوئے اداس..... کبھی تم نے ایسے محسوس کیا اوما..... اگر تم نے ایسے محسوس کیا ہوتا تو تمہارے غم میں قناعت ہوتی..... ہتھیار ڈالنے کی کیفیت..... غم میں جھگڑا نہیں ہوتا اوما بیگم..... میں نے تو اسی دن سے غم کے ساتھ رہنا سیکھ لیا ہے جب میں نے تمہاری گڑیا کے کپڑے دھوئے تھے.....دکھی ہونا تو Privilege ہے اوما بیگم..... تم اسے سزا سمجھ رہی ہو....."

لمحہ بھر کو اوما نے بس کی فرنٹ سیٹ میں سوار ہوتے ہو کو دیکھا۔ پھر شوکت پر نظر ڈالی۔ ایسے دھاڑیں مار کر وہ پھر کبھی نہیں روئی حالانکہ واقعات اور بھی اس کی راہ میں آئے۔

☆☆☆

"او جی تم رفو کرو گی تم؟"

اوما نے قمیض زبردستی چھین لی اور دیوار کے ساتھ بیٹھ کر قمیض کو گھٹنے پر کس کر دیکھنے لگی۔

"ایک تو تم لوگوں کو بڑا مان ہے کہ ڈاکٹر چاچا صرف تمہارے ہیں..... بھائی دسویں میں اس لیے فیل نہیں ہوئی کہ تو نالائق ہے..... بس تیرا خیال ہے کہ تجھے سب کچھ آتا ہے۔"

"اور یہ تیرا دُکھتا ہاتھ....."

"اب تو نہیں دُکھ رہا ناں..... چاچا جی کی قمیض جب تک رفو نہیں ہوگی..... ہاتھ نہیں دُکھے گا....."

"کمال ہے....."

''ہاں جی اوما بیگم کا ہاتھ ہے' کوئی مذاق ہے؟''

راحیلہ خاموش ہوگئی اور اوما رفو کرنے لگی۔ راحیلہ کو خیال آیا کہ اوما کے چہرے پر آنند بھری خوشی ہے۔ اس نے پوچھنا چاہا کہ اوما سچ بتاؤ تمہیں شوکت بھیا کیسے لگتے ہیں لیکن اس کے اندر شوکت بھیا کی گراریوں جیسے جملے گول گول چل رہے تھے۔ کچھ بھی ٹھیک سے اسے سجھ نہ آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اوما نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور سوئی رفو کے تانے بانے میں چلاتی بولی..... ''رفو تو ادھر ہو رہا ہے قمیض میں' پھر یہ تمہاری زبان کو کیا ہوا؟.....''

''کیا معنی؟.....''

''بولتیں کیوں نہیں؟''

''کیا کہوں' کچھ سجھ میں نہیں آتا۔ دراصل کچھ کہنے کو ہو تو بولوں ناں.....''

''کل مجھے روی ملا تھا بازار میں..... وہ تو پہچانا نہیں جاتا..... کچھ جاسوس سا..... کچھ غنڈہ' سر پر فلیٹ ہیٹ نیچے تنگ پاجامہ اور لمبا کرتا بڑا بے وقوف لگ رہا تھا۔''

''ہاں..... میں نے بھی کچھ دن ہوئے دیکھا تھا۔ دادا ابا نے منع کر دیا ہے.....''

''کس بات سے؟.....''

''بس دادا ابا کہتے ہیں کہ ہرگز ہرگز روی سے بات نہیں کرنا۔ اس کی Reputation ٹھیک نہیں.....'' راحیلہ نے کہا۔

''اچھا بھلا..... Reputation کیوں خراب ہو جاتی ہے؟''

''جب کوئی لڑکا لڑکی آپس میں وہ چیز کرتے ہوں تو.....''

''اچھا یہ لڑکا لڑکی بھی بڑے پاگل ہوتے ہیں۔ ماں باپ کے آگے ہاتھ جوڑتے پھرتے ہیں۔ گندھرب وواہ کر لیا کریں.....''

''گندھرب وواہ..... وہ کیا چیز ہے بھئی۔''

''بتاتی ہوں بھائی بتاتی ہوں..... گندھرب وواہ وہ شادی ہے جس میں بغیر کسی گواہی کے مرد اور عورت دیوتاؤں کے سامنے میاں بیوی بن جائیں.....''

''یہ دیوتا حضرات کہاں سے آ گئے.....''

''آتے ہیں' آتے ہیں۔ ہر معاملے میں آتے ہیں۔ راجہ دشمنت نے شکنتلا سے گندھرب وواہ کیا۔ مہاراج اندر کے لاڈلے ارجن نے الوپی سے ایسا ہی گندھرب وواہ کیا۔ بھیم سین نے باسک ناگ کی راجکماری ایل متی سے ایسی ہی شادی رچائی۔ پھر آج کل کے لوگوں میں ایسی شادی کے خلاف اتنا زہر کیوں؟'' اوما روی کو سرے سے بھول چکی تھی۔

''بھائی اوما وہ تمہارے دیوتا لوگ پاک صاف لوگ تھے..... اب آج کے زمانے میں یہ گندھرب وواہ جاری ہو جائے تو سوسائٹی میں کئی خرابیاں پیدا ہو جائیں۔ بس تم ایسے خیال چھوڑ ہی دو اوما.....''

اوما ان دنوں اپنے آپ کو اوما بیگم کہتی تھی اور شوکت بھیا پر ہندی بولنے کا بھوت سوار تھا۔ وہ ماسی کرشنا کو دیکھتے

ہی کہتا..... ''موسی کرشنا پالاگن''

''چرن جیو رہو چرن جیو رہو بیٹا۔''

ماسی کرشنا ہولے ہولے کہتی..... بھیا یہ تمہارے ہونے تو مجھے بوڑھا کر ڈالا۔ کیا کچھ سمجھایا پر اس کے من میں جانے کیا سمائی۔ جا کر ہی رہا۔

''موسی کرشنا آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہیں۔ ہیو بہت جلد واپس آئے گا۔ ابھی رات ہی ایسی ہی باتیں کر رہے تھے جگ رکھنے ہی والی ہے۔''

''ہائے رے بھگوان کرے تیرے منہ میں گھی شکر..... دیکھو ہیو کے جانے سے میں بوڑھی لگتی ہوں ناں۔ بوڑھی ہوگئی ہوں ناں میں۔''

شوکت بھیا نے جلدی سے کہا..... ''ماسی جی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ ابھی تو آپ کو ہیو کا دواو کرتا ہے..... اس دن تو آپ کا روپ بہو کو بھی شرمائے گا۔''

لیکن ماسی جی کی تسلی نہ ہوئی۔ وہ لمبی سی آہ بھرتی بھد بھد کرتی دودھ کے نخل تک گئیں اور بولیں..... ''جا بیٹا اندر کیا چھپر تلے بیٹھا ہے۔''

ہولے ہولے اوما گانے لگی۔ ''شمن بن گگن چلت پروائی۔''

اوما کی آواز میں ایک انوکھا لوچ آ گیا تھا۔ یوں لگتا جیسے وہ خود ایک راگ ہو۔

سا سا گا ما دھانی سا..... مالکونس زندہ باد.....

شوکت بھیا کی گفتگو کا سلیقہ نکھر آیا لیکن جب یہ حضرت آدم کی اولاد آمنے سامنے ہوتی تو دونوں دم سادھ کر ہمہ تن گوش ہو جاتے..... اوما نے ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ بھی موسی کرشنا کی طرح ساڑھی کا پلو سامنے کی طرف رکھتی۔ وہ واقعی مہارانی دمینتی لگ رہی تھی۔ قمیض رفو ہوگئی تو اوما پھدک کر اٹھی اور راحیلہ اور وہ دونوں ڈاکٹر سرفراز کے کمرے میں گئیں۔

''دیکھیے چاچا جان.....''

''واہ اب تو گیدڑ کی بولی بھی سیکھ جائے گی۔ لگتا ہی نہیں رفو کیا ہے۔ اس شوکت کو بھی سمجھاؤ تم دونوں..... لاہور میں ایڈمیشن ہو گیا ہے اور یہ جانا نہیں چاہتا..... وہاں کلاسیں شروع ہوگئی ہیں۔''

اوما کی آنکھوں سے جھٹ بارش کی طرح آنسو نکلے۔

''کیا ہوا.....؟'' راحیلہ نے پوچھا۔

''ہاتھ دکھنے لگا ہے.....''

''تم سے کس بے وقوف نے کہا تھا قمیض رفو کرنے کو۔''

''بس کل تو شوکت کو لاہور جانا ہی پڑے گا۔ میں اسے اور اس کی ماں کو نوٹس دینے آیا ہوں۔'' راجہ جی یوں بے وفائی کرے گا۔ اوما کو شاید علم نہ تھا وہ راحیلہ کے گھر سے بھاگی اور راستے میں اس کے آنسو سسکیوں میں بدل گئے۔

●○●○●○

دوسرا عہد

(پ)

یہ تو بالکل ایسے ہوا جیسے کسی نے دو نالی بندوق کو عین شوکت بھائی کے سینے پر تان کر کہا' اپنے ماں باپ کو گولی سے مار دو اور وطن کے خلاف تقریر کرو..... شوکت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ چھٹی کا دن گرم گرم بستر ا..... سامنے آدھا جڑا کینو..... منہ میں ناریل والی ٹافی..... ''ابھی تو بال بالکل ٹھیک ہیں' پچھلے ہفتے کٹائے تھے امی.....''

''دیکھو پورا چھتر ابن گیا ہے پیچھے..... یہ دیکھو!''

ساجدہ ماں شوکت کی گردن پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ ''اور تم بھی اٹھو راحیلہ..... دو دو انچ چھوٹے کراؤ..... کندھے سے جا لگتے ہیں۔''

''لیکن اوما نے تو چوٹی رکھ لی ہے امی..... وہ تو.....''

''اچھا تم کو کسی سے کوئی غرض نہیں..... اٹھو.....''

راحیلہ اور شوکت کسمساتے بستروں سے نکلے۔ نائی سے ملاقات کے کیا معنی ہیں؟ شاید اس کی اہمیت آپ پر کھل نہیں سکتی۔ راحیلہ جو کچھ محسوس کرتی وہ الگ بات ہے لیکن شوکت کو گردن پر چلتا استرا قیامت سے کم نہ تھا۔ گدگدیوں اور باریک چٹکیوں کا شغل جاری رکھتا۔ کچ کچ استرا چلتا۔ جب شوکت دو چار سال چھوٹے تھے تو دانت بھینچے لب نکالے وقفے وقفے پر باربر صاحب کو گالیوں سے نوازتے۔

باربر؟

باربر کیا معنی اچھا خاصا نائی تھا لیکن ہمیشہ نعرہ یہی لگاتا ''حضور باربر آیا ہے.....''

کوتوالی بازار میں ایک چھوٹی سی دوکان تھی جس کے دروازے شیشے کے تھے۔ اوپر سرخ پالش سے لکھا تھا' ہیئر کٹنگ سیلون۔'' اندر جھاگ اور ننھے ننھے بالوں سے اٹے برش اور استرے..... ان کی دکان عموماً بعد دوپہر گرم ہوتی۔ صبح وہ زین کا تھیلا' کند قینچی' بالوں میں پھنس کر اٹکنے اور نہ چلنے والا استرا اور شیشہ لے کر پرانے گاہکوں کے گھر دستک دیتا۔ یہ آئینہ مداری کا تھا جس میں بندر تو شکل دیکھ سکتا لیکن بال کٹوانے والے کو عموماً دھبے دھبے ہی نظر آتے۔ دادا ابا کو نائی میاں بہت پسند تھے۔ وہ ہفتے میں دو بار خط بنواتے' کانوں کے بال ترشواتے' ناخن کٹواتے' ابرو ٹھیک کراتے اور شہر بھر کی خبریں

اور گوپ سنتے۔ دادا ابا ہاتھ میں دھیے دار آئینہ لے کر ٹوکتے اور نائب صاحب! ہاں جی ہاں جی درست ابھی لیجیے کہتا" اپنی مرضی کرتا رہتا۔

"اوپر اوپر..... حیات میاں! یہ جو دم سی نکل آئی ہے ناں....."

لیکن جب بال کٹوا کر دادا ابا غسل خانے میں پہنچتے تو دم ویسے ہی موجود ہوتی۔

راحیلہ اور شوکت کھسکتے کھسکاتے جب باہر پہنچے تو حسبِ معمول زمین تک پھیلی چادر گلے میں پھنسائے حیات سے دادا ابا خط بنوا رہے تھے۔

"واہ حیات! تمہارا ہاتھ بہت صاف ہو گیا ہے۔ ذرا محسوس نہیں ہوتا کہ کھال کھینچے لیے جاتے ہو۔" وار خالی گیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اپنی ہانکتا رہا..... "حضور کی نوازش ہے' سرکار سارے شہر میں کسی کی ایسی ملائم ڈاڑھی نہ ہوگی..... میں تو خط نہیں بناتا۔ دودھ پر سے بالائی اتارتا ہوں۔ آپ نے رگھو چندر صاحب کی ڈاڑھی نہیں دیکھی جب استرا پھیرتا ہوں لگتا ہے جڑ سے درخت اکھیڑ رہا ہوں۔ سرکار! جو بال ایک بار الٹے اُگ آئیں وہ کبھی درست نہیں اُگ سکتے۔ ڈاڑھی چھیلی جاتی ہے اور کھونٹی صاف نہیں نکلتی۔ ساری عمر رگھو صاحب کلین شیور ہے۔ اب ڈاڑھی کا شوق پتہ نہیں کیسے ہو گیا....."

حیات ہی کی زبانی علم ہوا کہ وکیل کھوسلا صاحب شدھی تحریک کے سرگرم رکن ہیں اور ان کا بس نہیں چلتا ورنہ تمام مسلمان ملیچھوں کو شدھی کی بھینٹ چڑھا دیں۔ حیات ہی نے بتایا کہ ٹھیکیدار صاحب بہت ڈرپوک ہیں۔ جب بھی حجامت بنواتے ہیں سانس روک لیتے ہیں۔ گویا ذرا سا ہلنے پر استرے کے ساتھ ہی سر کی ٹوٹنی بھی اتر جائے گی۔ حیات نے سارے زمانے کی ڈاڑھیوں اور بالوں کے متعلق دادا ابا کو ایسی تفصیلات بتائی تھیں اور یوں ہنستا تھا گویا اس کے بال تو کبھی کسی نے کاٹے ہی نہ ہوں۔

جس قدر رپریت سے دادا ابا کی ڈاڑھی بناتا بال کاٹتا اسی قدر اس کا انداز شوکت کی باری تلخ اور کرخت ہو جاتا۔ یوں لگتا گھاس کاٹنے والی مشین لان پر چل رہی ہو۔ شوکت کو دبکا کر بار بار حیات کو روحانی خوشی ملتی..... "میاں جی..... اچھے مغل ہو..... مغلوں نے سارے ہندوستان کو فتح کر لیا اور ایک تم ہو..... سر سیدھا رکھو شوکت میاں۔"

تھوڑی دیر کے لیے شوکت گردن اکڑا لیتا۔

"ایک تو تم ڈرتے بہت ہو..... استرا ہے تلوار تو نہیں ناں۔"

"کون ڈرتا ہے....." شوکت غراتا۔

"اچھے مسلمان ہو..... یہ بنیا لوگ یوں گردن اکڑا کر رکھتے ہیں۔ چاہے استرا بھیجے میں اتر جائے اور تم مغل ولی عہد.....!"

شوکت ذرا سا اینٹھ کر بیٹھ جاتے لیکن دانت بھینچ کر اندر ہی اندر کئی پشتوں کو گالیاں دیتے نظر آتے۔

ماں ساجدہ کے جملہ گیان میں ایک بات یہ بھی قابلِ ذکر تھی کہ انہیں وہم تھا کہ جن لڑکیوں کو جلدی چھیا رکھوا دیتے ہیں ان کے بال نہ تو لمبے ہوتے ہیں نہ گھنے۔

"آئیے آئیے راحیلہ بی بی۔ آئیے آج میں تمہارے بال میڈم جیکسن جیسے کاٹوں گا۔ انہوں نے ایک لنڈ ن ...

رسالہ دکھا کر بال کٹوائے ہیں۔"

"بس اب راحیلہ بال نہیں کٹوائے گی حیات میاں بہت ہو چکی.....ان کا تو دماغ خراب ہو گیا۔ اتنی سیانی بچی کو تو برقعہ پہننا چاہیے۔ یہ پہاڑیوں پر بکری کی طرح پھرتی ہے.....تم اندر چلو راحیلہ۔"

"اور میں..... مجھے بھی چھٹی....." شوکت نے خوشی سے پوچھا۔

"تم آرام سے بیٹھ کر حجامت بنواؤ.....بونق لگ رہے ہو!"

یوں راحیلہ کی جان بار بر حیات سے چھوٹی اور وہ بھی اوما کی طرح دو چوٹیاں کر کے ان کے آخر میں پھولے پھولے ربن ڈالنے لگی۔ دادا ابا کے حساب سے راحیلہ پوری سیانی ہو چکی تھی لیکن ابھی اس کی آوارہ گردی میں کمی نہ آئی۔ سارا گروپ پڑھائیوں سے خوفزدہ تھا۔ سب پہاڑی بکری تھے۔ پڑھنے سے کسی کو کوئی شغف نہ تھا۔ شوکت اور راحیلہ کا وہی معمول تھا۔ سکول سے آتے ہی بستے برآمدے میں پھینکتے پھر باورچی خانے کی پیڑھیوں پر بیٹھ کر کھانا کھایا اور.....پھر منہ ہاتھ دھو کر اوما کے گھر راستے میں وہی کھنڈ سفید گرے بڑے بڑے پتھر' ناشپاتی کا باغ' ڈنگا.....ابھی تک راحیلہ اپنے دوپٹے کا گولا بنا کر اسے ہوا میں اچھالتی رہتی تھی اور سوچا کرتی تھی دسویں کے امتحان اگر پاس نہ کر سکی تو پھر.....شاید مجھے بھی گھر سے بھاگنا پڑے۔

لیکن میں تو شاعر بھی نہیں۔

شاید کسی طرح بمبئی پہنچ جاؤں اور پری چہرہ نسیم بن جاؤں.....اس خواب کو سینچنے کا اسے بڑا شوق چڑھا تھا اور وہ کئی رنگوں سے اسے سجاتی رہتی تھی۔

"بچی سیانی ہو گئی ہے ساجدہ بہو! برقعہ پہناؤ اسے.....تم جانے کس فکر میں ہو....."

یہ آواز امتحانوں کے کابوس سے مل جل گئی تھی۔ سیانی سے دادا ابا کی کیا مراد تھی۔ اس کے معنی آہستہ آہستہ راحیلہ کو سمجھ میں آنے لگے لیکن یہ بات سن کر اسے رونا سا آ جاتا۔ وہ مجرم سا محسوس کرتی۔ یوں لگتا راتوں رات کوئی چھوت کی بیماری لگ گئی ہے۔ برص کے داغ سب کو دکھا کر بتایا جاتا کہ دیکھیے یہ لڑکی سیانی ہو گئی ہے۔ راہیں ہولے ہولے بند ہونے لگیں۔ روک ٹوک بڑھنے لگیں۔ کچھ وقت لوگوں سے خوفزدہ رہنے میں گزرنے لگا۔ اوما کو بھی کچھ نہ کچھ پاشی بہن جی کہتی رہتی تھیں کیونکہ سارے جہاں میں ہی نو عمر لڑکیوں کو لیکچر ملتے ہیں۔

اپنے ایکٹرس ہو جانے کے خواب کو اچھالتی وہ اوما کے گھر پہنچی تو پاشی بہن جی سوٹے کے ساتھ کپڑے کوٹ کوٹ کر چشمے پر دھو رہی تھی اور اوما کھلے پانیوں میں انہیں ڈبوتی اوپر نیچے کرتی جھاگ نکال رہی تھی۔ راحیلہ کو دیکھ کر وہ بہتے پانی سے باہر نکل آئی۔

"کیسے آئی ہو راحیلہ....."

حیرانی سے راحیلہ نے اوما کا چہرہ دیکھا۔

"جیسے آیا کرتے ہیں....."

"ارے بھائی کپڑے تو پھیلا جاؤ تار پر....." پاشی بہن جی غرائیں۔

"ابھی آتی ہوں جی..... ابھی آئی....."

"جانے دے پاشی میں مدد کر دیتی ہوں..... زیادہ روک ٹوک سے بھی لڑکیوں کا دل میلا ہوتا ہے۔" وہ دونوں کھسک کر ڈھتے سے اترنے والی سیڑھیوں پر جا بیٹھیں۔ یہ جگہ باقی گھر سے علیحدہ تھی' ڈھتے پر چھتروں میں نئے نئے فرن اور میڈن ہیر پھوٹ رہے تھے۔

"تمہیں ایک بات بتاؤں؟....."

"بتاؤ....."

"مجھے کاکڑی نے بتایا ہے اس کا بھائی حشمت روی کے ساتھ پڑھتا ہے....."

راحیلہ کے گھٹنے سکڑ گئے اور وہ اوما کے چہرے کے اور قریب ہو کر بولی..... "بولو ناں بتاؤ....."

"وہ جو روی ہے ناں..... وہ....."

"ہاں وہ..... وہ تو اب لڑکوں کے سکول جاتا ہے' تمہیں کب ملا؟"

"ہا ہا بات سنا کرو' کاکڑی نے بتایا ہے مجھے گورکھا لڑکی نے نویں جماعت میں اس کا بھائی ہے۔ حشمت کے ساتھ فرسٹ ایئر میں..... وہ..... اور حشمت۔"

"وہ کون؟"

"ہائے بھگوان کیسی احمق ہے..... روی کا دوست اور کون..... وہ سگریٹ پیتا ہے اور گندے گندے لڑکوں کے ساتھ پھرتا ہے....."

پتہ نہیں روی گندے لڑکوں کے ساتھ پھرتا تھا کہ نہیں ایک بات طے تھی کہ راحیلہ مغل کودن تھی۔ اس کو اللہ نے ایسا گھڑا گھڑایا چہرہ دے رکھا تھا کہ منطقی چہرے کے ہوتے ہوئے اسے کسی محنت کی ضرورت نہ تھی۔

ڈاکٹر سرفراز خود کتابوں میں ڈوبے رہتے اور اٹھتے بیٹھتے بچوں کو بھی یہی تلقین کرتے کہ کتاب سے بڑھ کر انسان کا کوئی دوست نہیں۔ جو انسان کتاب دوستی اختیار کرتا ہے وہ اداس نہیں ہوتا..... وغیرہ وغیرہ..... شامت اعمال ان ہی دنوں ایک ماسٹر صاحب لڑکوں کے سکول میں ایسے آئے کہ ان کا شہرہ فلمی ایکٹرسوں کی طرح گھر گھر پہنچا۔ ان کا گھر ٹھیکیدار صاحب کے گھر سے ملحق تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دونوں بچوں کو ان کی شاگردی میں بٹھا دیا۔ ماسی کرشنا کو علم ہوا کہ ماسٹر صاحب کا رنگ سیاہ لیکن عقل دنگ کرتی ہے۔ انہوں نے بھی بجو اور اوما کے لیے انہیں مقرر کر لیا۔ ماسٹر صاحب سخت گیر تھے۔ لڑکیوں کے بھی کان کھینچ لیتے تھے۔ سب اس ٹیوشن سے خوش تھے کہ بچے اب سیدھے ہوں گے۔ صرف دادا ابا کا خیال تھا کہ خواہ مخواہ کی مصیبت ہے۔ راحیلہ کو آزادی کی راہ دکھائی جا رہی ہے۔ اس ٹیوشن سے پڑھائی پر تو کم ہی اثر ہوا..... اب ان چاروں کو ایک بار پھر اکٹھے رہنے کا وقت ملنے لگا۔ شوکت کی فرسٹ ایئر کی رپورٹ خراب تھی لیکن اسے سب کچھ نہ کہتے تھے کیونکہ ساجدہ ماں کا خیال تھا کہ یہ ساری پچھلے سال کی بیماری کا اثر تھا۔

جلد ہی سب پر ایک دوسرے کی لیاقت کا بھرم کھل گیا۔ شوکت کے متعلق اوما کو پتہ چلا کہ نہ تو حضرت ڈکشنری دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں اٹلس سے نقشہ اتارنا آتا ہے۔ بجو کا بھی بھید کھلا کہ بیچارے کو وقت دیکھنا بھی نہیں آتا۔ ایک روز

جب وہ ماسٹر جی کے گھر میں داخل ہو رہے تھے تو راحیلہ نے پوچھا..... ''کیوں بھئی کیا وقت ہوا ہے.....''

''یہی کوئی چار بجے.....''

''گھڑی پر سے دیکھ کر بتاؤ..... '' راحیلہ بولی۔

''ابھی دیکھا تھا.....''

راحیلہ اور ببو اندر داخل ہوئے تو راحیلہ نے دیوار کی طرف اشارہ کر کے پوچھا..... ''اچھا بھائی اب بتاؤ کیا بجے ہیں؟''

ببو کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے منہ پرے کر کے کہا۔ ''مجھے کیا پتہ۔''

''پھر یہ گھڑی کیوں کلائی پر پہن رکھی ہے۔''

ببو چپ چاپ اٹھا اور باہر نکل گیا۔ اس شام اس نے پڑھائی نہ کی۔

اوما ببو کے برعکس گھڑی بھی دیکھ سکتی تھی اور ڈکشنری بھی۔ وہ لب ہلاتی رہتی اور صفحے پلٹتی جاتی اور ڈکشنری میں سے فٹ لفظ کا مطلب نکال لیتی۔

خیر امتحان کا رزلٹ جب نکلا تو راحیلہ فیل ہو گئی۔ وہ محنت پر نہیں کسی معجزے پر اعتماد رکھتی تھی اور وہ معجزہ نہ ہو سکا۔ ہسٹری تو اسے مغلوں کی بھی نہ آتی تھی۔ پھر برٹش راج کے سوالات کیسے کر لیتی؟ ہسٹری تو ویسے دغا دے گئی لیکن جغرافیے کا پرچہ تو اچھا ہوا تھا۔ اس نے پتہ نہیں کیوں دغا دی۔ اچھا بھلا لکھ دیا تھا کہ بلوچستان میں چھوٹی چھوٹی گھاس اگتی ہے جسے بھیڑ بکریاں کھاتی ہیں۔ اگر خدانخواستہ آگ لگ جائے تو ڈپٹی کمشنر آگ بجھانے جاتا ہے۔ جغرافیے کا جغرافیہ شہریت کی شہریت.....!

اس دسویں کے امتحان میں فیل ہونے پر جیسا کچھ راحیلہ کا دل پریشان ہوا یہ وہی کچھ جانتی تھی۔ شوکت بھائی کی جان عجب مخمصے میں پھنس گئی کہ اپنے فرسٹ ایئر میں پاس ہونے کی خوشی تو نہ ہوئی البتہ راحیلہ کا فیل ہونا دل کو لگ گیا۔

فیل ہونا راحیلہ کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ تھا۔ اب وہ سارا سارا دن کتابیں گود میں لے کر بیٹھی رہتی اور سوچتی اگر میں بھی بمبئی چلی جاؤں اور وہاں جا کر ایکٹرس بننے کی کوشش کروں تو شاید..... لیکن امتحان میں فیل ہونے پر اس کا حوصلہ اس قدر پست ہو چکا تھا کہ اس نے ایکٹرس بننے کا خواب بھی دیکھنا بند کر دیا۔

سارا دن کتابوں میں بند رہنا باقی سب کو بھلے دے سکتا تھا لیکن دادا ابا راحیلہ کے اس ڈرامے میں نہ آئے۔ انہوں نے ایک دن ساجدہ ماں کو بلا کر کہا۔

''بہو..... اگر چاہتی ہو کہ راحیلہ دسویں پاس کرے تو اسی وقت اسے برقعہ پہنا دو..... اپنے گھر سے نکھڑ کر اسے نہ دین ملے گا نہ دنیا.....''

ساجدہ ماں زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتی تھی۔ راحیلہ کو بلایا اور اپنا برقعہ اسے پیش کر کے بولیں..... ''بھائی ہم سب کا خیال ہے تمہیں برقعہ پہننا چاہیے۔''

شاید راحیلہ برقعہ پہننے سے انکار کر دیتی۔

شاید اس شٹل کاک برقعے کو اپنی آزادی کی توہین سمجھتی۔

ہندو آبادی میں رہنے کے باعث اسے برقعہ عجیب لگتا۔

لیکن دسویں کے امتحان میں فیل ہونے نے اس کی احتجاج کی قوت سلب کر لی تھی.....

اچھی یا بری..... پسند یا ناپسند وہ اب اپنی رائے کا اظہار کرنے سے خوفزدہ تھی۔

☆☆☆

یہ لمبی کہانی ہے۔ اوما اور شوکت آگہی کی منزلوں سے آہستہ آہستہ گزرے..... کئی سالوں میں..... کئی احساسات کے بعد گروپ کے باقی بچے آگہی کی نئی سمتوں کو اچانک چھونے لگے۔ فطری حجاب نے لڑکے لڑکیوں میں ٹھنک کر ملنے کا احساس جگایا۔ پہلے وہ سب ایک ہی سیب کو باری باری کھانے کے عادی تھے اور اب وہ علیحدہ علیحدہ ایک ایک پلیٹ سے کھانے لگے۔ ببو اور سریندر رخصت ہو گئے! باجی جیز اور بھاپا جی جنہوں نے کو برے کو پھن اٹھانے پر مجبور کیا تھا' وادی میں آگ لگا کر رخصت ہوئے۔ شوکت لڑکوں کے سکول میں جہاں ایف اے تک نظام تعلیم تھا' داخل ہو گیا۔ ٹھیکیدار چاچا کی لڑکیاں پھوآ پی آپ کٹ آف ہو گئیں۔ ایسے میں گروپ میں صرف تین فرد رہ گئے..... اوما..... شوکت اور راحیلہ۔

شوکت کی بیماری کے دوران بہت ﷺ ہوئی تھی۔ اسے لیٹے لیٹے نہ صرف اپنے قد کے بڑھنے کا احساس ہوا تھا بلکہ اسے یہ بھی پتہ نہ چلا تھا کہ قد کے ساتھ ہی اسے ''میں'' کی بیماری بھی ہو گئی۔ ہر بات ''ناں'' پر سے شروع ہوتی اور ہر قصہ ''میں'' پر ختم ہوتا۔ اپنی تعریف کرنے کے ڈھنگ بھی عجیب تھے۔ بظاہر لگتا اپنی بد تعریفی کر رہا ہے لیکن چند لمحے سوچنے کے بعد یہ بھید کھلتا کہ دراصل اپنی برتری مقصود ہے۔ راحیلہ تو فیل ہونے کی وجہ سے دب گئی تھی اور اب ساجدہ ماں کے اصرار پر زیادہ وقت شوکت مغل کو شوکت بھیا کہنے پر مجبور تھی لیکن اوما بہت پکی تھی۔ اس نے بن ماں باپ کے اپنے ماحول کو متاثر کرنے کا فن سیکھ لیا تھا۔ شیل کانت بہن جی تو خیر بیاہی گئیں لیکن پاشی بہن جی بھی اوما اوما کرتے نہ تھکتی تھیں۔

شوکت بھیا کالج جاتے وقت چینٹ قمیض پہنتا لیکن گھر پر ٹخنوں تک اونچی شلوار اور بند کالر کی قمیض پہننے کا آرزو تھا۔ جب برتری کی پتنگ بہت اڑنے لگی تو اوما گھوم پھر کر بات لباس پر لے آتی۔ یہ شوکت بھیا کی دکھتی رگ تھی۔ ''کیا کریں ہم مغل ایسے ہی دقیانوسی ہوتے ہیں۔ ابھی تک پرانے وقتوں میں رہتے ہیں۔'' اوما کا خیال تھا کہ شوکت لباس کے معاملے میں پٹ جاتا ہے لیکن ہوتے ہوتے یہاں بھی شوکت مغل نے اپنی خاندانی ساکھ کا بھرم قائم کر لیا۔ دقیانوسی پرانے دیرانے' روایتی (Traditional) ایسے الفاظ استعمال کر کے وہ در پردہ بورژوا' اعلیٰ حسب نسب اور اقتدار بھرے لوگوں کا نقشہ کھینچ دیتا۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ببو نے چوری چوری پاکٹ کی درخواست دے رکھی تھی لیکن ابھی جانہ پایا تھا۔ اوما اور شوکت مل کر دنیا کا نقشہ گذی کاغذ پر ٹریس کر رہے تھے۔ راحیلہ احساس حسن کی وجہ سے کاہل ہو چکی تھی۔ ببو اپنے خیال میں گم تھا۔ نقشہ تو ان دونوں کو بھی بنانا چاہیے تھا لیکن ان کو پڑھائی کا کچھ شوق نہ تھا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تھا اور دادا ابا نواڑی پلنگ پر مراقبہ میں جھکے کچھ ورد کرتے دکھائی پڑتے تھے۔

شوکت مغل اپنی نو یافت آزادی کو پا کر بہت مسرور تھا۔ اب اگر کوئی غلطی سے اسے کالج کا لڑکا نہ سمجھتا تو وہ

ناخوش ہو جاتا۔ فرسٹ ایئر کا نوجوان ویسے بھی معلق شخصیت کا انسان ہوتا ہے۔ پاؤں اس کے زمین سے اٹھ جاتے ہیں اور اترنا اسے آتا نہیں..... ایسے میں شوکت مغل ادھر اُدھر کی کہانیاں غور سے سنتا۔ ان کو میں سے وابستہ کرتا اور اپنے گروپ کو متاثر کرنے میں ہر داؤ پیچ لگاتا۔

"اگر تم نے بندر گاہیں بھر لی ہوں تو ذرا اٹلس مجھے دینا....." شوکت بھیا نے کہا.....

"کیا بور لوگ ہیں آپ سب۔ یہ نقشے تو بنتے رہیں گے پھر بتاؤ ناں کیا ہوا....." راحیلہ نے پوچھا..... روحوں کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کبھی شوکت کینن ڈائل تھا اور کبھی ایڈگر ایلن پو.....

"یہ جمعرات کی شام کا ذکر ہے..... میں اور ساجد..... ٹی گارڈنز کی طرف گئے..... ہمیں وہاں اندھیرا ہو گیا....."

"تبھی امی ناراض ہو رہی تھیں....." راحیلہ بولی۔

"امی مجھے ناراض نہیں ہوتیں جی..... میں کوئی بچہ تھوڑی ہوں....."

"سننے دو راحیلہ....." ہومنت بھرے لہجے میں بولا۔

"ابھی شام تھی لیکن میرا دوست ساجد تھک گیا اور میں اکیلا ہی چل دیا۔ دور حد نظر پر بیاس دریا کی ریت نظر آتی تھی۔ پتہ نہیں کیا بات ہے' بس میں چلتا گیا' چلتا گیا....."

"اکیلا..... رات کے وقت....." اوما نے غیر یقینی لہجے میں پوچھا۔

"شام تھی ابھی تو..... اور پھر میں نہیں ڈرتا کسی سے۔"

اوما نے ابرو اٹھایا لیکن چپ رہی۔

"تمہیں پتہ ہے ناں وہاں آگے چل کر ایک بڑا سا کھنڈر نما محل ہے۔ کہتے ہیں جب کانگڑے میں مغلوں نے حملہ کیا تو ایک سپہ سالار نے یہاں محل بنا لیا تھا..... مجھے اس کھنڈر کے قریب ایک لڑکی نظر آئی....."

"ہائے میں مر جاؤں۔" راحیلہ بولی.....

"بس اوما جیسی تھی' یہی قد..... اور کچھ کچھ ایسی ہی شکل۔ اس نے سارے سفید کپڑے پہن رکھے تھے۔ تم نے فلم سیتی مرادو دیکھی ہے ناں' بس جیسے سفید جالی کے روشنی کے بنے ہوئے جو آخری سین میں راگنی نے پہنے تھے' ویسے....."

"جیسے کپڑے روحوں کے ہوتے ہیں۔" ہو نے پوچھا۔

"بالکل بالکل....." اس نے آگے بڑھ کر پوچھا" شوکت مغل پانی پیو گے۔"

"اسے تمہارا نام کیسے پتہ چل گیا؟" اوما نے شک بھری نظر ڈال کر کہا.....

"جیسے اسے پتہ چلا کہ مجھے پیاس لگی تھی..... وہ آگے آگے میں پیچھے پیچھے..... وہ..... مجھ پر تو جادو ہو گیا تھا..... وہ محل سے ملحق ایک پرانے گھر کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ گھر پر پھوس کا چھپر تھا اور اس میں سے سمٹا سمٹا دھواں نکل رہا تھا۔ اس نے اندر چلنے کا اشارہ کیا....."

"اور تم چلے گئے اندر....." ہو کی پتلیاں پھیل گئیں۔

"نہیں میں ہچکچا گیا۔ وہ اندر چلی گئی اور ایک چمکتی طشتری میں جانے کیا چیز ڈھانک کر لے آئی....."

''طشتری میں کیا تھا شوکت بھیا؟'' راحیلہ نے سوال کیا۔

''اس لڑکی نے طشتری پر سے سفید کپڑا ہٹا کر اسے میری طرف بڑھایا۔ اس میں خوشبودار گرم گرم پلاؤ تھا.....''

''ہاں پلاؤ تھا.....لیکن میں نے انکار کر دیا۔''

''کیوں؟.....'' ابرو اٹھا کر اوما بولی.....

''بس میں نے سوچا' کوئی ٹونا نہ ہو۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور گھر کے اندر لے گئی۔ اندر ہری کین جل رہی تھی اور کھاٹ پر کوئی کمبل اوڑھے سوتا تھا۔ چولہے پر پلاؤ کی دیگچی چڑھی تھی.....لڑکی نے سوئے ہوئے کے چہرے پر سے کمبل اٹھایا اور بولی.....اسے چوم لو! اب وہ شخص بھی جو سویا ہوا تھا' مردہ تھا!''

''مردہ!.....مردہ!''

سامعین اس قدر اونچی چلائے کہ ٹاور روم کی طرف سے دادا نے اونچی آواز میں کہا..... ''کیا ہوا بچو!''

''کچھ نہیں دادا ابا' ان کو کربلائے معلی کے واقعات سنا رہا ہوں۔''

دادا ابا مطمئن ہو کر پھر مراقبے میں چلے گئے۔

''اس لڑکی نے مردے کے پاؤں کو چھوا تو یکدم کمبل اتار' وہ مردہ ہوا میں معلق ہو گیا۔ میں تو گھر سے نکلا اور بھاگنے لگا۔ وہ لڑکی بھی میرے پیچھے پیچھے..... بھاگ رہی تھی.....اور بار بار کہتی تھی' پانی تو پیتے جاؤ..... پانی تو پیتے جاؤ۔ کچھ دور نکل کر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اب آواز کافی دور ہو گئی تھی جیسے وہ پیچھے رہ گئی ہو..... میں نے دیکھا..... میں نے دیکھا.....''

''ہاں ہاں بتاؤ.....''

''کیا بتاؤں وہ اپنے ساتھ کھاٹ اور کمبل بھی گھسیٹے لا رہی تھی.....اس کے بال گھٹنوں تک لمبے اور بھورے جیسے تھے۔ منہ میں دانت نہیں تھے اور وہ بوڑھی عورت کم از کم سو برس کی تھی..... میں تو سرپٹ ہو گیا اور شاید بے ہوش ہو جاتا لیکن ساجد آگے سے مل گیا۔ وہ مجھے تلاش کرنے ترائی کی طرف آ گیا تھا۔ ہم دونوں دوسرے دن پھر وہاں گئے۔ نہ محل تھا نہ جھونپڑا۔ اور تو اور بیاس کا منظر بھی وہاں سے نظر نہ آتا تھا۔''

اسی رات راحیلہ ساجدہ ماں کے ساتھ سوئی۔ اوما اور بو کے دل پر کیا گزری' اس کا کچھ علم نہ ہو سکا.....شاید اوما نے بو کو منع کر دیا ہو کہ ہم انہیں بزدل سمجھیں گے۔

پہاڑ کے گھروں کا نقشہ عموماً ایک سا ہوتا ہے۔ کوٹھی کے دونوں جانب عام طور پر نیم دائرے کی شکل والے کمرے ہوا کرتے تھے جنہیں وہ لوگ ٹاور کہا کرتے۔ بعد میں ان ہی کمروں کو Sun rooms کہنے لگے۔ ان کمروں میں کھڑکیاں ہی کھڑکیاں تھیں جن سے سردیوں میں سورج چمکا کرتا۔ ایک ٹاور میں جو ڈنگے اور سیڑھیوں کے قریب تھا' دادا ابا رہا کرتے تھے اور دوسرے میں سرفراز بسیرا کیے رہتے۔ ان دونوں ٹاوروں کے درمیان لمبا سا برآمدہ تھا جس کے پیچھے ڈرائنگ روم' امی ساجدہ کا اوٹ پٹانگ لونگ روم اور مہمان خانہ تھا۔ اس برآمدے کے سامنے پتھروں کے بنے ہوئے ستون تھے جن کے ساتھ ساتھ موتیے بیلیں اور انگور کی بیل چڑھی تھی۔ سردیوں میں تو یہ کوئٹہ سے لائی ہوئی انگور کی بیل ٹنڈ منڈ

ہو کر رہ جاتی لیکن گرمیاں نکلتے پر ان میں بادامی مائل سبز انگوروں کے خوشے لٹکتے جنہیں دیکھ کر خواہ مخواہ غزل الغزلات یاد آ جاتی۔

برآمدے سے ملحق کمرے کے پیچھے راحیلہ اور شوکت کا کمرہ تھا۔ جب سے راحیلہ نے برقعہ پہن لیا تھا' وہ امی ساجدہ کے کمرے میں سونے لگی تھی لیکن سارا دن اس کا پچھلے گودام ہی میں گزرتا۔ اس مین گھر سے کچھ ہٹ کر دو کمرے اور تھے۔ ایک تو باورچی خانہ اور دوسرا ملازمین کا کوارٹر۔ اس کوارٹر کے پنچھی بدلتے رہتے لیکن اس میں لگے ہوئے پرانے کیلنڈرز جالے' گندا روشن دان اور ادھیڑی ادوائن والی چارپائیاں سدابہار تھیں۔ برآمدے میں بارش والے دنوں میں بیڈمنٹن تک کھیلی جاتی۔ پتھر کے ستونوں کے ساتھ پردے باندھ کر ڈرامے اور کچرل شو ہوتے۔ دادا ابا کے تاؤ اور سرفراز کے کمرے کی جاسوسی کی جاتی۔

اس روز راحیلہ اور اوما پچھلے کمرے میں تھیں۔ راحیلہ نے پہلی بار محسوس کیا کہ اوما کچھ بدلی بدلی نظر آتی ہے..... یہ سالانہ امتحانوں سے بہت پہلے کی بات ہے۔ اس کی ستواں ناک اب بڑی شخصیت والی لگتی تھی اور چہرے کا بھول پن کہیں غائب ہو گیا تھا۔ ناک کی چمکتی کیل اور بھی چمک رہی تھی۔ راحیلہ کو وہ دن یاد آ گیا جب اوما نے ناک چھدوائی تھی۔ ایک مارا مار ادھم مچا تھا۔ ماسی کرشنا کی گلی کی پہلی ڈاکٹرنی سوئی صاف کیے کھڑی تھی اور اوما بپھری ہوئی دھاڑ رہی تھی۔ شوکت اور راحیلہ ستون کے ساتھ لگے کھڑے ہو سے سرگوشیاں کر رہے تھے اور سریندر اس منظر کی تاب نہ لا کر کہیں نو دو گیارہ ہو گیا تھا۔

اور اب اوما کے جینے سے لگتا تھا کہ یہ ناک کی کیل ہمیشہ سے یہیں تھی۔

''یاد ہے جب تم نے ناک چھدوائی تھی.....؟''

''ہاں یاد ہے.....'' اوما منبری سی بولی۔

ابھی کچھ سال ادھر ہارمونیم کے ساتھ اوما گانا سیکھا کرتی تھی اور اس کی آواز میں شکن بن گگن سن کر ہم سب کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے تھے۔

''راحیلہ تم یہ کمرہ ٹھیک نہیں کر سکتیں کبھی..... کیا اوٹ پٹانگ بنا رکھا ہے.....''

پہلی بار راحیلہ کو شک پڑا..... اور وہ سوچنے پر آمادہ ہوئی اپنے سے پرے۔

''ہاں ایک بار شوکت بھیا کی رضامندی کے بغیر ان کا کمرہ ٹھیک کیا تھا تو ایسی کرکری کی تھی انہوں نے اول تو کمرے سے ہی نکال دیا تھا اور پھر دنوں دن یوں برسا کیے گویا میں کوئی ڈاکہ ڈالنے کی نیت سے اس کی چیزیں دیکھ رہی تھی۔''

''سب لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں.....'' ممتا سے اوما بولی۔

ہوتے ہوں گے بڑی بی..... راحیلہ نے دل میں کہا..... بس شوکت بھیا نے تو بسا بسایا کمرہ الجھی اون کا گولا بنا دیا.....!

اوما نے اٹھ کر کچھ کتابوں کو ترتیب سے رکھا اور پھر شوکت بھائی کا کمرہ صاف کرنے لگی۔ اس وقت کندھے پر

تولیہ رکھے شوکت برآمد ہو گئے.....''ارے رے اوما کسم تم رہنے دو بھائی۔''

''کیوں کیا حرج ہے.....''کنول نین نے کہا۔''میں نے کون سا پاپ کیا ہے۔''

''ناں جی پاپ تو کوئی نہیں لیکن اگر روز یہ کام کرو گی تو شوکت بھیا اسے بتیا چار کھنے لگیں گے۔''

''ہرگز نہیں.....''شوکت مغل بولا.....

''مجھے تو وہ لاڑ کے زہر لگتے ہیں جن کی چیزیں صاف.....گھر کرے صاف چہرے صاف بس باؤلے لگتے ہیں آدمی تو لگتے ہی نہیں۔''

ہاں جی آدمی ہونے کے لیے گوریلا ہونا ازحد ضروری ہے ناں!

شوکت بھیا عجیب سی مسکراہٹ میں ڈوبے غسل خانے میں فیڈ آؤٹ ہو گئے۔

اوماان کی چیزیں صاف کرتی پونچھتی جھاڑتی ٹھکانے پر لگاتی رہی۔ راحیلہ کے ساتھ معاملہ دوسرا تھا۔ اگر بھی کاغذ کی کترنیں کاٹ کر فرش پر ڈال دیتے تو راحیلہ کہتی.....''اب یہ کیا ہے بھیا؟''

''کاغذ.....''

''گند کیوں پھیلایا ہے؟''

''یہ گند ہے.....بھلا کاغذ میں گندی چیز کونسی ہے؟''

''یہ کاغذ کی پرچیاں ہیں.....یہ گند نہیں تو اور کیا ہے؟''

''ابھی اپنی پرم پیاری اوما کو ان ہی کترنوں پر خط لکھنے بیٹھ جاؤ گی.....''

مشینوں کو تیل دے رہے ہوں تو گندے ہاتھوں سمیت کھانا کھانے آ جائیں یعنی بغیر ہاتھ دھوئے۔ جب سے فرسٹ ایڈ میں گئے ساجدہ ماں بھی دبنے لگی تھیں اب وہ گزارش کرتیں۔

''شوکت بیٹا ہاتھ دھو لیتے آپ۔''آواز میں التجا ہوتی۔

''کیوں امی.....''

''ہاتھوں پر چکنائی سی کیا ہے؟.....''

''تیل ہے.....گن آئل.....''

''تو ہاتھ گندے ہوئے ناں۔''

''اسی لیے تو کہتا ہوں سب کو کیمسٹری پڑھنا چاہیے بابا یہ Purified چیزیں ہیں۔ Chemically purified.....کیا سمجھیں آپ؟''

''پھر بھی جراثیم ہوتے ہیں ناں.....''

بیچاری ساجدہ ماں کا مبلغ علم دسویں تک کا تھا۔

''جراثیم؟.....توبہ کیجیے.....یہ تو گھی کی جگہ استعمال ہو سکتا ہے.....''

لیکن اوما نہ امی کی طرح بحث کرتی نہ راحیلہ کی طرح چڑتی۔ صفائی کرتی جاتی اور بھیا کو الجھاتی رہتی۔ گویا کسی

قیمت پر انہیں سلجھانا منظور ہی نہ ہو..... ویسے تو بات ہی نہ کرتے لیکن جب اوما موجود ہوتی راحیلہ کے دوپٹے سے ناک پونچھتے۔ راحیلہ دوپٹہ چنٹ کر کے رکھتی اور وہ اسے آرام سے سرہانے رکھ کر لیٹ جاتے گویا دوسیٹوں پر ہی سوتے آتے ہیں۔ آپ بھی ٹھن کر بیٹھے ہیں اور وہ غسل خانے سے نکلتے ہی کچھ ایسے اپنے جھٹرے سے بال ہلائیں گے کہ سارے کپڑے غارت!

لیکن شرط تھی کہ اوما کمرے میں ہو۔

اس روز بھی دونوں نے ایک سے کپڑے پہنے تھے۔ لٹھے کی شلواریں..... چنٹ کیے ململ کے دوپٹے اور جارجٹ کی قمیصیں..... جارجٹ بھی ایسی کہ دو بوند پانی پڑ جائے تو یوں سکڑ جاتی تھی جیسے الاسٹک۔ ہم دونوں سر جوڑے ایک پینٹنگ بنانے میں مصروف تھیں۔ اندر شوکت بھیا دیر سے گا گا کر نہانے میں مشغول تھے۔ برف پوش گھر پینٹ کرنے کی کوشش لیل ہو رہی تھی۔ شوکت بھیا غسل خانے سے باہر نکلے.....

نیچے پینٹ کندھوں پر تولیہ..... گورے چٹے بازو گیلا منہ اور بال اور ہاتھوں سے پانی کی بوندیں ٹپکتی ہوئیں۔

"نہالیا شوکت بھیا؟....." راحیلہ نے پوچھا۔

"لگتا ہے ابھی تک نظر کمزور ہونے کا سلسلہ جاری ہے..... کیا بن رہا ہے....."

اوما نے نظریں اٹھا کر مغل بچے کو ایسے دیکھا جیسے کوئی کر کوٹل اپنے مالک کو دیکھتا ہے۔

"تصویر بن رہی ہے....."

"آہا خوب....."

پھر ہاتھوں کی پوروں پر جمے قطرے ہماری پینٹنگ پر اتر آئے اور انہوں نے سر کچھ یوں دائیں بائیں جھٹکا کہ جارجٹ کی قمیضوں میں بلبلے پڑ گئے.....

"الو گدھے..... شوکت بھیا۔"

"اونہ اس طرح نہیں کہتے۔" یہ وہی اوما تھی جو ہوگی ٹھیک بات پر بھی کہرام مچا دیتی تھی۔ راحیلہ اس بات پر حیران تو ضرور تھی لیکن دل میں اسے علم تھا کہ اوما میں یہ تبدیلی کچھ ایک دن کا کرشمہ نہیں..... یہ بات تو بڑے دنوں میں آہستہ آہستہ رینگ کر یہاں پہنچی تھی۔

ابھی شوکت نیکر پہنتے تھے۔ جب انہوں نے آٹھویں جماعت میں فرسٹ آ کر ڈیزی گن خریدی تھی اور پھر سارے گروہ میں شیخی خورے بن کر کہا تھا....." آج میں تمہیں وہ پدو مار کر دکھاؤں گا۔"

"ہائے ہائے جیو جیا نہ کیا کرو یہ مہا پاپ ہے....."

"تم لوگوں کو چلنا ہو تو چلو ورنہ میں اکیلا چلا جاؤں گا۔"

گروپ کے لیڈر تو وہ تھے ہی اور اوما کے علاوہ انہیں کوئی tough ٹائم بھی نہیں دیتا تھا لیکن اس روز اوما بھی جان گئی بہت ڈھونڈے پر بھی کوئی پدو نہ ملا۔ شوکت اپنا سا منہ لٹکا کر کھڈ کی جانب سب کو لے آئے۔ اب مشورہ یہ ہوا کہ مچھلیاں جو اوپر آ جاتی ہیں انہیں چھرے سے شکار کیا جائے۔ کچھ دیر شوکت نشانہ بناتا رہا۔ مچھلیاں شاید چھٹی حس سے جان

گئیں کہ شکار ہو جائیں گی وہ پانی کی تہہ میں تیرنے لگیں۔ ہر فائر کے بعد جب مچھلی اپنی رفتار سے آگے نکل جاتی تو مارے شرم کے شوکت کے چہرے پر ننھے ننھے قطرے ابھر آتے اور آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔ کچھ دیر کے بعد شکاری نے آلوچوں کے باغ کا رخ کیا۔

''نہیں بھیا آج بھاگ پور کی طرف چلتے ہیں.....''

شوکت بھیا مچھلیوں کو شکار نہ کر سکتے۔ پر کھسیانے سے ہو کر شمال کی جانب چلنے لگے۔ راستے میں اوما نے حسب عادت اپنی کہانی شروع کر دی..... ''پتہ ہے شیر کا شکار کیسے کرتے ہیں۔ شیر کو بلانے کے لیے بکری باندھنا پڑتی ہے اور شکاری اوپر مچان میں بیٹھتے ہیں۔ ایک راجہ جی شیر کے شکار کو نکلے.....''

''راجہ جی نہیں..... بادشاہ سلامت کہو..... راجہ جی پر شیر کا شکار کچھ بجتا نہیں اوما۔'' شوکت بولا۔

''میں تو راجہ جی ہی کہوں گی.....''

شوکت خفت زدہ تھا خاموش ہو گیا۔

''بکری بندھی تھی۔ راجہ جی اور ان کے دوست مچان پر بیٹھے تھے۔ اتنے میں دور سے شیر غراتا آیا۔ بکری دیکھی۔ اس کے دو نوالے بنا کر کھا گیا۔''

کچھ دیر بعد وزیر چلایا۔ ''راجہ جی شیر کو شکار کیجیے.....''

شیر کو نشانہ بنا کر کانپتے کانپتے بندوق چلائی۔ شیر لوٹنیاں کھانے لگا۔ وزیر نے کہا ''مہاراج خنجر سے شکار کریں۔'' پہلے تو راجہ جی راضی نہ ہوئے پھر کانپتے کانپتے درخت سے اترے۔ دیکھا شیر میں دم ہی نہیں۔ کان سے پکڑ کر خنجر سینے میں اتار دیا.....

''ہائیں.....'' بھو بولا۔

''یہ ہوا کس طرح..... راجہ جی اتنے بہادر نہیں ہو سکتے.....'' شوکت بولا۔

''ہو کیوں نہیں سکتے۔ تم سمجھتے ہو صرف بادشاہ ہی بادشاہ ہوتے ہیں۔''

''اچھا اچھا بحث کی گنجائش نہیں۔ بادل آ گئے ہیں بارش ہو گی۔'' روی بولا۔

''پتہ ہے وزیر نے دو سیر پکی افیون بکری کے بدن پر مل دی تھی۔ بکری کھاتے ہی شیر کو نشہ ہو گیا..... ہائے مجھے سردی لگ رہی ہے واپس چلو۔''

بادلوں کے آنے سے پہلے سردی ہو چکی تھی۔

''شوکت اپنا کوٹ دے دو میں ٹھٹھر جاؤں گی۔''

مچھلیاں پکڑنے کے شوق میں اوما بار بار پانی میں اتری تھی۔ اس کی شلوار ٹخنوں تک بھیگی ہوئی تھی۔

''جس کو سردی کا خیال ہو وہ گھر سے گرم کپڑے پہن کر آیا کرے۔''

بادل کی وجہ سے سب طرف اندھیرا سا ہو چلا تھا۔ چیڑ کے درخت کا بڑا سا تنا کائی جمے راستے پر گرا تھا۔ سب اسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"وہ دیکھو پدو...... وہ۔" ہیو چلایا۔

"کہاں کہاں......؟"

"وہ جنگلی گلاب کی جھاڑی پر......وہ اُدھر۔" انگلی کے اشارے سے ہیو بولا۔

بندوق کو نشانے پر فٹ کرنے کی غرض سے شوکت نے ڈیزی گن کندھے پر لگائی تو اوما نے اچک کر نالی کے آگے ہاتھ کر لیا..... "سنو شوکت' جیو ہتیا پاپ ہے۔ دیکھو سوریاست ہو رہا ہے۔ سارے جانور سندھیا کے لیے جا رہے ہیں......"

شوکت نے اوما کا ہاتھ نالی سے اٹھانا چاہا لیکن دوسرے ہاتھ سے لبلبی پر بوجھ پڑ گیا۔ وہ تو خیر ہوئی ورنہ اوما کا انگوٹھا اس کے دائیں ہاتھ سے غائب ہو جاتا۔ لیکن ہوا یوں کہ ایک چھرا اپنا نشانہ چھوڑتا اوما کے انگوٹھے کو چومتا گلابوں کی جھاڑی میں غائب ہو گیا۔ اوما نے چیخ ماری تو شوکت کے ہاتھ سے بندوق چھوٹ گئی۔

"میں مر گئی..... مر گئی میں ماتا جی..... مر گئی رام......"

اوما نے واویلا مچا دیا۔ سب اس کے گرد جمع ہو گئے اور سریندر جھنڈ کے آخر میں بیٹھ کر رونے لگا۔

"دکھاؤ..... دکھاؤ تو سہی......"

"بڑا درد ہو رہا ہے بڑا......" وہ برابر ہاتھ کو جھٹکے دے رہی تھی۔

"یہ تم نے کیا کیا شوکت......" راحیلہ چلائی۔

"آج کا دن ہی برا ہے......" شوکت نے آہستہ سے کہا۔

عین انگوٹھے کے نیچے کلائی کی جانب خون کی پتلی سی لکیر پھیلنے لگی۔

شوکت کی ڈیزی گن گھاس میں پڑی تھی اور وہ اس قدر پریشان صورت تھا کہ اوما کے آنسوؤں کے باوجود اس پر زیادہ ترس آتا تھا۔

"شوکت نے جان کر نہیں کیا..... اوما یہ Accident ہے..... بندوق ہوتی ہے تو ایسے حادثے ہوتے ہیں......" روی نے سمجھانے کی کوشش کی۔

جب راحیلہ نے اوما کے انگوٹھے پر پٹی باندھ دی اور اس کے آنسو تھم گئے تو شوکت نے اپنا کوٹ اتارا اور اوما کے کندھوں پر رکھ دیا۔ شوکت نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"خدا قسم اوما..... بندوق چلانے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا..... بس تم مجھے معاف کر دو۔"

پھر آنکھوں میں آئے آنسو پینے کی خاطر وہ گھاس میں پڑی ڈیزی گن پر جھک گیا۔

یہ بارش کا پہلا قطرہ تھا!

اس کے بعد ایک مدت تک ڈیزی گن باہر نہ نکلی۔ ڈیزی گن کا عشق اس قدر تھا کہ شوکت اسے بستر میں سرہانے رکھ کر سوتا۔ سکول سے آتے ہی اس کی صفائی ہوتی لیکن گروپ کے ساتھ ڈیزی گن نہ جا سکتی۔ کوارٹرز اور باورچی خانے کی جانب ایک تختہ لگا کر گھنٹوں مشق ہوتی۔ نشانہ شوکت کا اس قدر اچھا ہو گیا تھا کہ جلتی موم بتی کی لاٹ کھٹ سے بجھ

جاتی..... لیکن جنگل میں جس روز اوما کا انگوٹھا زخمی ہوا' اس روز ایک نئے کھیل کا آغاز ہوا جو اس بندوق چلانے سے کہیں مشکل تھا اور اس سے کہیں خطرناک بھی!

شوکت زندگی سے بھرپور تھا۔ ایڈیسن کا بھتیجا۔ آئن سٹائن کا بھانجا اور کولمبس کا نواسہ..... ہونی اور ان ہونی سکیمیں بنانے کا قدرتی ملکہ تھا۔ سننے والا اس کے پلان کے سحر میں جلد آ جاتا۔ کبھی گھر پر ٹونا بن رہا ہے جو پھلجھڑی اور گھریلو بم کے مابین کوئی چیز تھی۔ کبھی ہوائی فانوس بنا کر پہاڑ دھولی دھار کی طرف اڑانے کی ترکیبیں زیر بحث آ جاتیں۔ ڈیزی گن کے واقعے کے بعد شوکت بھیا کو دوسرا بخار کیمرے کا چڑھا۔ اس کیمرے کو چھپانے کے لیے کئی جتن کیے گئے۔ یہ داستان پرانی ہے لیکن آخر کو ماسٹر محمد حسین سے یہ کیمرہ قسطوں پر خریدا گیا۔ اس ننھے براؤنی کیمرے کی سب سے بڑی خاصیت یہ تھی کہ اس کا View Finder غلط تھا۔ اگر امی کی تصویر لی جاتی تو امی غریب دیوار سے چپٹی مکھی کی طرح بے رنگ بے وجود نظر آتیں اور باقی سارا باورچی خانہ جملہ تفصیلات کے ساتھ کاغذ پر موجود۔ نہ صرف یہ کہ حضرت کیمرہ بھینگے تھے بلکہ سفید اور کالے میں بھی امتیاز کرنے سے قاصر تھے۔ ویسے تو کیمرے رنگوں کا فرق نہیں جانتے لیکن ان براؤنی صاحب کو خاص کر یہ شوق تھا کہ کالے بال سفید اور سفید چہرہ سیاہ کر دکھاتے۔

ایک روز ماسی کرشنا اور ساجدہ ماں سب بچوں سمیت ہمالیہ ٹاکیز جا رہی تھیں..... سب لوگ لپک جھپک تیار ہو رہے تھے لیکن شوکت اپنے براؤنی کو کھول کر ٹھیک کرنے میں مصروف تھے۔ کوئی اور ہوتا تو اس کیمرے کو اٹھا کر کھڈ میں جا مارتا لیکن شوکت کی دنیا ہمیشہ امید پر قائم رہی۔ وہ ہر بار براؤنی کھولتا' اس کے پرزے Adjust کرتا۔ پاکٹ منی سے نیا سپول ڈالتا اور پھر منتیں کر کے سب کی تصویریں اس امید پر کھینچتا کہ اس بار پچھلا نقص ختم ہو چکا ہے۔

سب سریندر کے گھر کی جانب رواں تھے۔ ابھی اوما اور راحیلہ دوپٹے تو اوڑھتی تھیں لیکن اوڑھنی کھیل کا حصہ تھی' لباس کا نہیں۔ سارا راستہ جیبی رومال نکال کر شوکت کیمرہ کا بیرونی لنز صاف کرتا رہا۔ ناشپاتیوں کے باغ میں اندھیرا سا تھا لیکن جونہی روز کا ٹیج کی سیڑھیاں آئیں' نادر شاہی حکم ملا کہ لائٹ بہت اچھی ہے تصویر یہاں ہی کھینچی جائے گی۔

''اب اوما اور راحیلہ تم دونوں بیٹھ جاؤ اور..... تم روی اور بیو کھڑے رہو..... لیکن ہلنا نہیں.....''

اوما نے بڑے اہتمام سے دوپٹہ کندھوں پر لیا' مصنوعی مسکراہٹ سے چہرہ سجایا اور یوں دم سادھ لیا گویا سانس لینے سے بھی تصویر بگڑ سکتی ہے۔

ایک مدت شوکت کیمرے کے اندر شست لگا کر دیکھتا رہا۔ پھر بولا..... ''اونہہ اس طرح بیلنس نہیں ہے' تم نیچے آ ؤ بیو..... اور تم اوپر چلو اوما کسم.....''

شوکت ہالی وڈ کے ایم جی ایم کیمرہ مین کی سی سنجیدگی سے ایک بار پھر ویو فائینڈر کے گرد ہو گیا اور چند لمحوں بعد اوما اور راحیلہ کو جگہ بدلنے کی زحمت دی۔ پھر ایک ایک کر کے سب کو سیڑھیوں سے ہٹا دیا اور آخر میں صرف اوما رہ گئی..... اکیلی..... اس کی پورٹریٹ میں ہم تینوں کو کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن اب ہم سر پھرے ناظرین بن گئے۔ شوکت بھیا کی ہدایات جاری ہو گئیں..... ''ذرا سر اس طرف گھماؤ..... یوں..... ذرا مسکراؤ..... ہاں..... بس ٹھیک ہے..... مسکراؤ..... لو سارے دانت

کیوں نکالے.... مسکراؤ.... ہلکا سا ذرا سر جھکاؤ... اتنا نہیں.... دائیں.... بائیں.... میری انگلی کی طرف دیکھو۔"

ایک ہاتھ ہوا میں اٹھا کر کرکٹ کے امپائر کی طرح شوکت نے انگلی دکھائی۔ شوکت بھیا کہتے گئے اوما کرتی گئی.... اس بار پوز بھی اوما نے ٹھیک بنایا۔ بھیا بھی مطمئن نظر آئے۔ ہمارا خیال تھا اب تو تصویر کھنچ ہی جائے گی لیکن عین اس وقت جب اوما تھنھرے ہوئے بندر کی طرح دانت نکالے کیمرہ دیکھ رہی تھی۔ چھوٹے بھیا اوما کی جانب لپکے...."یہ بال کیسے بنائے ہیں۔ گردن ہی گردن نظر آتی ہے۔.... اس قدر کس کے چٹیا کرتے ہیں۔"

شوکت نے بال ڈھیلے کرنے کے انداز میں اوما کے سر کو ہاتھ لگایا تو وہ سرے سے گڑبڑا گئی اور سر دائیں بائیں ہلا کر بولی...."تم کو شوکی تصویر لینا ہے تو لو.... ورنہ.... ورنہ...."

راحیلہ نے دیکھا کہ ایک آنسو ٹپ سے اوما کی آنکھ سے گر کر جھولی میں جا پڑا۔ اوما کی آنکھ سے گرے آنسو نے راحیلہ کو تڑپا دیا۔ وہ بھاگ کر پاس گئی تو دیکھا کہ واقعی بال بہت کس کر بندھے تھے۔ اوما نے بالوں کو جلدی سے دوپٹہ اوڑھ کر ڈھانپ لیا تھا۔

"بس میں نے بال ابھی دھوئے ہیں، میں انہیں ڈھیلا نہیں کروں گی ہاں...."

شوکت اور راحیلہ دونوں نے جھک کر دوپٹہ اتارا اور جب راحیلہ نے بال ڈھیلے کرنا چاہے تو دیکھا کہ اوما کے بال تسمے سے بندھے تھے.... یہ تسمہ تین چار دن سے شوکت ڈھونڈ رہا تھا۔

"ہیلو! میرا تسمہ باندھ رکھا ہے.... لو جناب میں نے سارا گھر ڈھونڈ مارا...." شوکت نے تسمہ اتارنا چاہا۔

"مجھے تو برآمدے میں گرا ہوا ملا تھا...."

اوما نے صریحاً جھوٹ بولا اس کے کان اور ناک کی پھننگ گلابی ہو گئی۔

"برآمدے میں.... کمال ہے نئے بوٹ کا تسمہ برآمدے میں...."

"کمال کی کیا بات ہے؟ میں نے گرا پڑا پایا' سمجھا کام کا نہیں ہے باندھ لیا۔" اوما نے قدرے جرأت سے کہا۔

"اچھا تو اب واپس کر دو اوما کسم نالنی۔ میں بوٹ پہننا چاہتا ہوں۔"

"تسمے سے بال باندھے ہیں۔ میں پاشی بہن جی کو بتاؤں گا' بڑی گندی ہے اوما۔" ہیرو نے چھچھی کے انداز میں کہا۔

"اچھا بھئی لاؤ تسمہ...." شوکت نے اصرار کیا۔

"ابھی نہیں مل سکتا' گندا ہو گیا ہے...."

"کیسے؟.... کیسے گندا ہو گیا...."

"میرے بالوں میں جو بندھا رہا.... گندا ہو گیا۔"

راحیلہ حیران رہ گئی.... یہ بھی نرالی منطق تھی۔ جوتی کا تسمہ بالوں میں بندھنے کے لیے صاف تھا اور جوتے میں پڑنے کے لیے گندا.... لیکن ایسے موقعوں پر کہنے کے لیے راحیلہ کو کبھی مناسب بات ہاتھ نہ آئی۔

"چلو چھوڑو.... اوما کو.... ہاتھ میں ریکٹ اور چڑیا پکڑ کر تصویریں کھینچتے ہیں۔ جیسے بیڈمنٹن کا میچ جیتا ہو...."

"تو پھر جلدی کرو.... سورج تو غروب ہونے والا ہے...."

جلدی جلدی سارے راحیلہ کے گھر کی طرف لوٹے۔ انہیں شک تھا کہ سورج جان بوجھ کر جلدی غروب ہو جائے گا....

"میں گھر چلتی ہوں' میری طبیعت خراب ہے۔" آدھے راستے میں اوما بولی۔

"کیوں کیا ہوا ہے طبیعت کو...."

"پتہ نہیں... بس جانے دو!...."

"یہ بڑی moody ہو گئی ہے۔ ذرا سپورٹنگ سپرٹ نہیں رہی.... کل میرا رسالہ پھاڑ دیا تھا...." ہو بولا۔

"کونسا رسالہ؟...."

"Illustrated Weekly.... وہ جو دولہا دولہن کا صفحہ نہیں ہوتا۔ میں نے ایک تصویر دیکھ کر کہا تھا.... دیکھو عین مین شوکت مغل کی تصویر.... اس اوما کی بچی نے تصویر دیکھی اور صفحہ ہی پھاڑ دیا...."

اوما یہ بات نہ سن سکی۔ وہ ان سب سے بچھڑ کر اپنے گھر جا رہی ہے اور بار بار اس کا ہاتھ بندھے ہوئے بالوں کے تسمے پر جاتا تھا۔

پڑھائی سب کی کمزور تھی لیکن راحیلہ کو آئینہ دیکھنے کا مرض اس قدر تھا کہ وہ پڑھتے پڑھتے اٹھتی اور غسلخانے میں جا کر آئینے میں مگن ہو جاتی۔ پھر بالوں کی لٹ سو سو انداز سے نکالتی' لب سکوڑتی مسکراتی آنکھیں بناتی۔ اس مشغلے میں اسے بھول جاتا کہ کتابیں پڑھے بغیر کوئی پاس نہیں ہوا کرتا۔ اس روز حسب معمول راحیلہ آئینے اور کتاب کے درمیان بار بار معلق ہو جاتی۔

باہر بادل چھائے تھے اور وہ گودام نما کمرے میں ٹوٹے صوفے پر کھلی کتاب کھولے بیٹھی سوچ رہی تھی کہ آخر اتنی کم پڑھائی سے اس کا کیا بنے گا۔ کمرے میں شوکت کا کیمرہ' ڈیزی گن' کیلنو جادو کا سامان' گراریاں' پیچ' پیچ کس جابجا پڑے تھے۔ اسی کی چیٹی تلے سے جھینگر رو رو کر بولتا تھا۔ کچھ اندر کا اندھیرا کچھ باہر کا۔ جی میں خیال آتا کہ سارے کمرے کی صفائی کر ڈالے جالے اتارے' پردے جھاڑے سامان ٹھکانے پر لگائے لیکن بیزاری کا یہ عالم تھا کہ راحیلہ نے اس کے سہارے ایک خواب بننے کو ترجیح دی۔ سوچنے لگی کہ ابھی جھینگر سانپ بن جائے گا۔ پھر یہ سانپ باہر نکل کر پھٹے صوفے پر چڑھے گا اور کھٹ سے مجھے ڈس لے گا۔ پھر سارے مل جل کر میت کے ارد گرد کھڑے ہوں گے۔ فضا میں گلاب کے پھولوں اور کافور کی خوشبو ہو گی.... سب روئیں گے.... سب کو بھول جائے گا کہ راحیلہ نالائق تھی اور پڑھتی نہیں تھی۔ وہ الماری کی آڑ میں رکھے صوفے پر یوں دھنسی خود ترسی میں مگن تھی کہ کواڑ پر ہلکا سا دباؤ پڑا۔ راحیلہ یکدم خوفزدہ ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ سانپ کے بغیر ہی ملک الموت آ گیا ہے۔

ہولے سے دروازہ کھلا۔ پریشان خاطر اوما داخل ہوئی۔ اس کے بال کھلے اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ شاید یہ آنسو بھانپ کر ہی راحیلہ نے اوما کو نہ بلایا۔ اوما چپکے سے شوکت کی الماری کے پاس گئی۔ پٹ کھولے کچھ دیر کنسوئی لیتی رہی اور پھر دبے پاؤں جس قدر رازداری سے آئی تھی چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد راحیلہ کو کتاب اور آئینہ دونوں بھول

گئے۔اس کا خیال تھا کہ اوما الماری کھول کر کچھ چرانے آئی ہے۔اٹھ کر الماری دیکھی تو ہکا بکا رہ گئی۔
بھیا کے کیمرے کے پاس ان کے بوٹ کا تسمہ پڑا تھا جس میں گلاب کی ایک ننھی سی کلی بندھی تھی.....

اوما اور شوکت بیچاری راحیلہ کے لیے معمہ بنتے جا رہے تھے۔اوما ان دنوں تلسی کے پودے سے محبت کرنے لگی تھی۔اگر کوئی ایک پتے کو ہاتھ لگا تا وہ چڑ جاتی۔شام سندھیا کی پابندی بھی ضروری تھی۔شام کو گانا سکھانے والے ماسٹر کا اب وہ مذاق نہ اڑاتی بلکہ اس نے آواز گرا کر ماسٹر جی کی طرح شلن بن گگن کہنا سیکھ لیا تھا۔اب جب وہ تالی بجاتی ہوئی خالی دے کر آواز اٹھاتی۔"مورے مندر اب لو نہیں آئے....." تو یوں لگتا بانسری پر مہاراج کرشن رادھیکا کا انتظار کر رہے ہیں۔جوان دنوں اپنے طوطے میں مگن تھا۔اس نے بہن کی تبدیلی کو محسوس نہ کیا لیکن اوما بدل رہی تھی۔گاڑی ہولے ہولے نئے سٹیشنوں کی جانب چل رہی تھی۔یہ بات اور ہے کہ اوما کو بھی معلوم نہ تھا کہ ان نئے سٹیشنوں پر کس نام کا بورڈ لگا ہے۔

☆☆☆

راحیلہ دادا ابا سے چھپ چھپا کر اوما کے گھر پہنچی تو اوما چٹائی پر بیٹھی ہارمونیم بجا رہی تھی۔راحیلہ کو دیکھ کر اس نے سرگم بجانی بند کر دی۔

"پشپ کانت بہن جی نہیں آئیں؟"

"ابھی کل تو گئی ہیں امرتسر۔"

وہ دونوں پشپ کانت بہن جی کی شادی کے واقعات دوہرانے لگیں۔

"یہ تم لوگوں کی شادی میں پھیرے لیتے ہوئے اتنی دیر کیوں لگاتے ہیں۔" راحیلہ نے پوچھا۔

"تاکہ جنم جنم کا بندھن ہو....ساتھ کبھی نہ ٹوٹے....."

اوما چپ ہو گئی' کچھ دیر وہ دونوں کچھ اندر ہی اندر سوچتی رہیں۔راحیلہ آئینے اور پڑھائی کے بارے میں اور اوما پھیروں کے بارے میں....

"ہمارے ایک اور قسم کی شادی بھی ہوتی ہے راحیلہ؟....."

"کیسی شام....."

"گندھرب ودواہ....مرضی کی شادی....تم نے فلموں میں نہیں دیکھا۔مندر میں جا کر مرد اور عورت دیوتا کو گواہ کر کے شادی کر لیتے ہیں۔دیوتا کے اشیر باد کے ساتھ شادی....."

"چوری چوری....گھر والوں کو بتائے بغیر....."

"اور کیا؟ ماں باپ کو کیا پتہ ہوتا ہے کہ اولاد کے من کو کیا چاہنا ہے....."

واقعی اوما اور بجو کے والدین تو برما میں رہتے تھے۔انہیں کیا خبر تھی کہ اوما اور بجو زندگی کے پانیوں میں کہاں ڈولتے پھرتے ہیں؟

"چھوڑو آؤ....کس کی شادی کہاں کی شادی۔آؤ کینتھ کے پھول توڑیں....."

کینتھ کا درخت آلوچے کے درخت کی طرح درمیانے سائز کا ہوتا ہے۔اس میں آڑو آلوچے جیسے سفید پھول

بے تحاشہ لگتے ہیں۔ دور سے یہ پھول کاغذی نظر پڑتے اور ڈالیاں ہلانے پر سفید پھولوں کی بارش سی برس جاتی۔ ہمارا ارادہ ان کی لچکیلی ڈالیاں گلدانوں میں سجانے کا تھا۔

اس شغل میں مشغول اوما نے پوچھا..."اچھا یہ بتاؤ راحیلہ! تمہارے اللہ میاں نے پھول کیوں بنائے تھے؟"

سیدھی بات تو راحیلہ کے جی میں آئی کہ کہہ دے اللہ تعالیٰ کو تخلیق کرنا اور تجربے کرنا دونوں مرغوب ہیں لیکن سرسری طور پر وہ بولی...."بس اسے پھول بنانا آتے ہیں۔ یہ ہنر تمہیں آتا تو تم بھی سارا دن رنگ برنگی چڑیاں گھڑتی نظر آتیں۔"

اوما نے ایک خطرناک مسکراہٹ منہ پر سجا کر کہا..."بھلا ایک کام تو بھی عورتیں کر سکتی ہیں۔ سارے میں بچے تو رینگتے نظر نہیں آتے۔"

"اس لیے....اس لیے کہ بچے شاید پھولوں جتنے خوبصورت نہیں ہوتے اور پھر اس عمل میں محنت زیادہ پڑتی ہے...." راحیلہ نے منطقی بن کر کہا۔

"ہاں جی! بچے تو پھولوں سے زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں....اپنی نہالو کا بچہ دیکھا ہے۔ یوں ماں کے پیچھے جھاڑو پکڑے پھرتا ہے جیسے حبشی قوم کا فرشتہ ہو.... گھنگھریالے بال اڑھکتی باتیں.....بے حد بھولی بھالی آنکھیں۔"

"ہاں.... ہاں....فقط حبشی قوم کا فرشتہ....! آچھیں....آچھیں...." پھولوں کے قرب کی وجہ سے راحیلہ چھینکیں مارنے لگی۔

"سنا ہے کوئی یاد کرے تو چھینکیں آتی ہیں...."

آچھیں آچھیں کرتی راحیلہ ان گنت ڈالیوں کو بازو میں سمیٹے اوما کے ہاتھ میں ایک صراحی دار گردن والا گہرا نیلا گلدان تھا۔ راحیلہ کو اس کی اس آرائش بازی سے نفرت تھی لیکن وہ چپ رہتی....

"مجھے کچھ سروٹ درکار ہیں....چلتی ہو...."

"کہاں؟...."

"اوپر مہارانی کالسی کے گھر کے پچھواڑے سروٹ اُگے ہیں۔ ان کے بھٹے اتنے خوبصورت ہیں جیسے چینی تصویروں میں ہوتے ہیں۔ چلو ناں...."

"پھر؟....لا کر کیا کریں گے...."

"انہیں سجائیں گے...."

"اور پھر؟...."

"پھر کچھ نہیں...." اوما نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"تو اتنا سارا جھنجھٹ محض کچھ نہیں کے لیے کیا جائے؟...." راحیلہ بولی۔

"جانا نہیں تو صاف کہو یہ گول مول سی باتیں کیوں کرتی ہو؟...." اوما روہانسی ہو کر بولی۔

جس وقت اوما روہانسی ہو جایا کرتی دونوں بہن بھائیوں کے چھکے چھوٹ جاتے۔

"چلو بھئی چلو..... جانِ من..... حضور والا....."

جب دونوں سہیلیاں بہت سارے ہمیس بھرے سروٹ لاکر گھر کے تمام گلدانوں میں سجا چکیں اور آخری پتلی گردن والے گلدان میں لمبی ڈالیوں کی گنجائش نہ رہی اور پھر دو چار سروٹ باقی رہے تو اوما نے سوچا کہ ایک ڈالی چھوٹی کر کے ٹھونس دے۔ اس نے چھری استعمال کرنے کے بجائے ایک ڈالی کو دونوں ہاتھوں کے دباؤ سے توڑا۔ ڈالی تو پچکی سی ٹوٹ گئی لیکن انگشتِ شہادت سے فرن فرن لہو بہنے لگا۔

"یہ کیا کرلیا..... یہ اچھی بھلی قینچی' چھری دونوں پڑی ہیں۔"

"کچھ نہیں کچھ نہیں۔" اس نے جلدی سے انگلی منہ میں ڈال لی۔

"بڑا ظالم کاٹتا ہے سروٹ۔ بالکل شیشے کی طرح۔ آؤ ٹنکچر لگائیں چل کر....."

"اب ذرا ذرا سی بات پر ٹنکچر لگانے چلیں....." وہ اٹھلا کر بولی۔

اوما نے اس زخم کی طرف سے بڑی بے پرواہی کی۔ پھر برساتوں کا موسم تھا۔ فضا میں نمی تھی۔ دو تین دن کے اندر اندر اوما کا ہاتھ خمیری روٹی بن گیا راتوں رات بھر۔ اچھل اچھل کر روتی۔ ابھی ہوا ایئر فورس میں نہیں گیا تھا۔ اس نے جو جسک کی کتابیں بند کردیں۔ کالج کے ڈرامے میں وہ ان دنوں ہیروئن کا پارٹ کر رہا تھا۔ اوما کے سوجے ہوئے ہاتھ نے ساری ریہرسلیں چوپٹ کردیں۔ اس کے پروفیسر نے گھبرا کر موٹی موٹی آنکھوں والے ایک سکھ لڑکے کو مہارانی دروپدی کا رول دے دیا۔ ہوا ایسے خوفزدہ تھا جیسے طوطے کی بیماری کے دوران ہوا تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں آنسوؤں سے بھری رہتیں اور یہ دکھانے کے لیے کہ وہ بالغ ہوگیا ہے' وہ کھنڈ کے پاس بڑے سفید پیالے نما پتھر پر بیٹھا رہتا لیکن بار بار لوٹتا اور پوچھتا۔

"دکھاؤ..... دکھاؤ اوما....."

"دفع ہو جاؤ دکھتا ہے ہاتھ کیا دکھاؤں..... ہائے مر جائے سارے کے سارے بھگوان کرے۔" اوما کرب سے چلائی اور بیچارہ ہوا پھر ڈگے کی سیڑھیوں سے اترتا ماسی جی کی میا کے پاس سے گزرتا اور جا کر کھنڈ کنارے اپنی نشست قائم کر لیتا۔ پھر وہ اپنی ٹانگ ہلا ہلا کر اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کرتا اور کانوں سے اوما کی آواز سننے میں مشغول رہتا..... ہوا کمزور ڈرپوک' اناڑی اور کم ہمت تھا لیکن اس کے سارے خواب طاقت' بہادری' لیاقت اور ہمت سے وابستہ تھے۔

ماسی کرشنا نے ہلدی آٹا تیل کر گرم گرم پلٹس تیار کی لیکن جب اوما کے ہاتھ پر لیپ کرنے لگیں تو وہ یوں بلبلائی کہ ماسی کرشنا کا حوصلہ نہ ہوا کہ وہ لیپ کرسکیں۔ ڈاکٹر سرفراز نے جب ہاتھ دیکھا تو ماسی جی کو جہالت پر لیکچر سننا پڑا اور حکم ہوا کہ دوسرے دن اوما کو لے کر ہسپتال پہنچیں۔

صبح ماسی کرشنا نے اپنے پٹی کوٹ پر ان گنت بیل بوٹے کشیدہ کیے ہوئے لٹھے کے پٹی کوٹ پر ململ کی ساڑھی پہنی۔ بنارسی کپڑے کی گتھلی میں دس روپے ڈال کر بلاؤز کے اندر اڑسے اور اوما کو لے کر بطخوں کی طرح دھپ دھپ کرتی ہسپتال کی طرف روانہ ہوئیں۔ اتفاق سے کہیے کہ شوکت اور راحیلہ کوتوالی بازار سے ذرا پہلے سڑک کنارے کول کے پانی میں بہتے پتے دیکھ رہے تھے۔

شاید یہ اتفاق بھی نہیں تھا۔

شوکت نے معمول کے مطابق ڈاڑھی بڑھا رکھی تھی۔

"راحیل؟..."

"ہوں... کیا ہے؟..."

"کچھ نہیں... بس۔"

تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ سڑک کی چڑھائی کی جانب دیکھتا۔ سڑک سے ملحق پہاڑی پر بکریاں چر رہی تھیں اور ہلکی ہوا میں چیل کے درخت سے کبھی کبھی Aeom ٹوٹ کر گرتے تو عجیب طرح سے خاموشی ٹوٹ جاتی۔

"راحیل؟..."

"کہو ناں شوکت بھیا..."

"کچھ نہیں... بس۔"

کچھ دیر بعد راحیل کو احساس ہوا کہ شوکت بھیا کو کسی کا انتظار ہے۔ شاید اوما آنے والی ہے!... اوما کا ہاتھ دیکھ کر تو شوکت بھیا نے منہ پھیر لیا تھا۔ پھر جب دلچسپی ہی نہیں تو انتظار کیسا؟

"راحیل..."

"جی حضور..."

"مجھے تجھ سے کچھ کہنا ہے..."

"فرمائیے ارشاد... حکم؟"

کچھ توقف کے بعد جیسے شوکت نے اندر ہی اندر رائے بدل لی..." بھئی یہ تیری ناک تو چپٹی ہے۔ مغلوں کی طرح ستواں نہیں اور آنکھیں چینیوں جیسی ہیں اور قد... بانس کی طرح... تیرا کیا بنے گا۔"

"بن جائے گا جو بننا ہے... تمہیں کیا فکر ہے شوکت بھیا..."

شوکت نے پھر چڑھائی کی جانب دیکھا جہاں پہلا گھر اوما کا تھا۔ دونوں پھر خاموش ہو کر جھاڑی سے رسونت توڑ کر کھانے لگے۔

"شوکت بھیا..."

"ہوں..."

"ایک بات ہے..."

بھیا یکدم چوکنا ہو گئے۔

"کیا...؟ کیا؟"

"یہی کہ نہ تم نے شیو کی ہے... ڈاڑھی بھی ہو تو کیا بات ہے۔ یہ تو ایویں کوچی سی لگتی ہے۔ دادا ابا کہتے ہیں۔ صاحبزادے کو نہ اردو آتی ہے نہ انگریزی... اوپر سے ہمیشہ ایکٹروں جیسے سفید بوٹ... تمہارا کیا بنے گا۔"

"ہمارا کیا بننا ہے بھلی لوک... ہم تو گلی سڑی سبزی ہیں۔ کوڑے کے ڈھیر جوگے ہمارا کیا بننا ہے..."

اس وقت چڑھائی کی جانب مڑتی سڑک پر ماسی کرشنا نمودار ہوئیں۔ وہ فر فر بول رہی تھیں اور پیچھے پیچھے اوما یوں چل رہی تھی گویا بچھیا کو قصائی گھیرے جا رہے ہیں۔ ہمارے قریب آ کر دونوں رک گئیں۔

''آداب ماسی جی....'' راحیلہ بولی۔

''نمستے ماسی کرشنا۔'' شوکت نے نظریں نیچی ڈال کر کہا۔

''چرن جیو رہو.... چرن جیو رہو.... اب تم ہی سمجھاؤ اسے بیٹا ہسپتال نہیں جائے گی چیرا نہیں دلوائے گی تو ہاتھ کیسے ٹھیک ہوگا۔ بہو کو تو ایسے جھڑک کر آئی ہے کہ بیچارہ بن ناشتے کالج چلا گیا....دکھا ہاتھ.... ہاتھ دکھا.... ہاتھ تو ڈبل روٹی سا اور ضد یہ کہ ہسپتال نہیں جاؤں گی.... بھگوان کی سوگند کبھی کبھی تو اس کا کل پرزہ ڈھیلا ہو جاتا ہے۔'' اپنے سر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

راحیلہ نے اوما کی طرف دیکھا۔ بدمزاجی سے اس کا نچلا ہونٹ لٹکا ہوا تھا اور ناک کی پھننگ پر پسینے کے قطرے تھے۔ شوکت مغل اوما کو ایک بار انکھیوں سے دیکھ کر کرشن کنہیا کی طرح کھڑے تھے۔

''میں ہسپتال تو چلتی ہوں لیکن چیرا نہیں دلواؤں گی۔'' اوما منت بھرے لہجے میں بولی۔

''اچھا چل تو سہی....'' ماسی کرشنا نے اس کے بازو پر بوجھ ڈال دیا۔

''ہائے رام دکھا دیا.... ہائے دکھا دیا ماسی کرشنا جی....'' اوما بلک بلک کر رونے لگی۔ اس لمحے شوکت بھیا نے اوما کی طرف کچھ ایسے دیکھا کہ وہ یکدم خاموش ہوگئی اور اس کی آنکھوں میں آئے آنسو ٹھٹک گئے۔

''چلو ناں ماسی جی پھر تو گیارہ بجے ہسپتال بھی بند ہو جائے گا....''

اس روز شوکت بھیا کالج نہ گیا۔ یہ ان ہی کی زبانی علم ہوا کہ اوما نے ہاتھ کو چیرا نہیں دلوایا۔ ڈاکٹر سرفراز کسی ایمرجنسی سے کا نگڑہ گئے تھے۔ چھوٹا ڈاکٹر منتیں کرتا رہا' پہلے تو ماسی کرشنا نے ڈانٹا پھر دلاسہ دیا اور آخر کو روہانسی ہو کر بے بس ہوگئیں.... اوما بلبلاتی رہتی اور کسی کو ہاتھ چھونے تک نہ دیا۔ چھوٹے ڈاکٹر نے چند گولیاں تجویز کیں اور چھٹکارا حاصل کر لیا۔ دبی زبان میں اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ خدشہ ہے ہاتھ سیپٹک ہو چکا ہے' جراحی نہ کی گئی تو ہاتھ خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ڈاکٹر سرفراز موجود نہ تھا ورنہ معاملہ نپٹ جاتا۔

شوکت کے منہ میں سارا دن ایک کھیل بھی نہ گئی۔ راحیلہ نے بھانپ لیا کہ وہ اوما کے لیے پریشان تھا۔ اوما بھی ایسا اڑیل ٹو تھی کہ جب کسی بات پر جم جاتی تو عقل بھی استعمال نہ کرتی۔ نہ کسی کا مشورہ اس پر اثر کرتا۔ بس ایک ہی رٹ تھی' کڑوی کسیلی دوا جتنی بنی چاہے پلا دیجیے۔ روی کے والد وکیل چاچا آئے اور مشورہ دیا کہ انجکشن لگوا دیجئے۔ ایک بار سوگئی تو آپریشن آسان ہو جائے گا لیکن اوما انجکشن کی سوئی سے یوں بدکتی تھی گویا پستول سے ڈرتی ہو۔ چاچا مدن سین خوب ڈانٹ ڈپٹ کر سیر کو نکل لیے۔ بہو نے ڈاکٹر کو یہ کہتے سن لیا تھا کہ اگر زیادہ پیپ پڑ گئی تو ہاتھ ناکارہ ہو جائے گا۔

شوکت تھوڑی دیر کے لیے اندر گیا اور ہاتھ میں ایک پوٹلی سی اٹھائے آ گیا۔

''یہ سپرٹ کی خوشبو کیسی ہے....'' راحیلہ نے پوچھا۔

''چلو آؤ....''

ہو اور راحیلہ سر جھکائے ساتھ چل دیئے۔

ماسی کرشنا اپنی الماری کھولے دیوی دیوتاؤں کے ننھے گروہ سے بنتی کر رہی تھیں کہ اوما کا دماغ صحیح ہو جائے۔ اوما سامنے پلنگ پر ہی اوئی اوئی کرنے میں مشغول تھی۔ وہ تینوں چوروں کی طرح منظر پر پہنچے۔

''اوما.....'' عجب تحکم سے شوکت بھیا بولے۔

''ہائے مر جاؤ سب کے سب..... ہے بھگوان میں مر جاؤں جو یہ لوگ نہیں مرتے.....''

''اوما ادھر دیکھو ادھر Silly نہ ہو to چھوڑ دو..... ہو بھاگ کر گرم پانی لاؤ.....'' شوکت جانتا تھا کہ اس گھر کے ان لکھے قانون کے مطابق راحیلہ باورچی خانے میں نہیں جا سکتی۔

اوما نے شوکت بھیا پر نظر ڈالی تو اس اپالو کے حضور ساری بددعائیں الٹے پاؤں لوٹ گئیں۔

''ہاتھ دکھاؤ.....''

اوما نے بڑی آہستگی سے ہاتھ بڑھایا۔ یہ وہی ہاتھ تھا جس کے دو دو گز قریب آنے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ ہاتھ کی ہتھیلی تک پیپ کی وجہ سے زرد ہو رہی تھی اور ہاتھ کی الٹی طرف پر کوڑیالے سانپ سے دھبے پڑ گئے تھے۔

''سنو اوما! میں سارے کمرے کے پرزے کھول کر جوڑ سکتا ہوں..... جوڑ سکتا ہوں ناں.....''

''ہاں.....''

''میرا ہاتھ Steady ہے۔''

''ہاں.....''

شوکت بھیا نے اوما کی انگشت شہادت پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو بے اختیاری طور پر اس کے منہ سے سی نکل گئی۔

''جانتی ہو یہ ساری پیپ ہے.....''

اوما نے کرب سے سر ہلایا۔ ماسی کرشنا نے الماری چھوڑ دی اور کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر قریب آ گئیں۔

''میں تمہارے ہاتھ پر چیرا دینے لگا ہوں۔ میں نے ابی کو کئی بار یہ عمل کرتے دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے یہاں کوئی پھانس رہ گئی.....''

اوما کا چہرہ فق ہو گیا۔

''میں پلٹس باندھ لوں گی.....''

ہو نے ابلتا پانی پاس لا کر رکھ دیا.....

''ڈرو نہیں..... میں کئی بار ابو کے ساتھ یہ آپریشن کر چکا ہوں۔''

''ڈاکٹر دوا دے گیا ہے شوکت.....''

شوکت نے گرم پانی میں روئی کے پھاہے ڈال دیئے اور بڑھ کر اوما کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ منمنائی لیکن شوکت نے پروا نہ کی۔

''مجھ پر اعتبار ہے کہ نہیں..... بول بتا دے اب..... یہی وقت ہے۔''

اوما نے لمحہ بھر کو شوکت مغل کو دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ یہ جواب غالباً ہاتھ کے سلسلے میں نہ تھا.... صرف راحیلہ نے دل میں سوچا' بھلا فقط اعتبار سے کیا بنتا ہے شوکت بھیا؟

جب شوکت نے احتیاط سے سپرٹ لگے بلیڈ سے چیرا دیا تو پیپ کا گندا ان کی چینٹ پر گرنے لگا۔ اوما نے روئی کے پھاہے سے اسے صاف کیا اور اپنا ہاتھ بھول گئی لیکن جب فسٹ ایڈ کے بعد شوکت ہاتھ پر پٹی باندھنے لگا تو اوما کے گالوں پر آنسو لڑھکنے لگے۔ شوکت ماسی جی کے غسل خانے میں ہاتھ دھونے گیا تو راحیلہ بولی..... "بارش آنے والی ہے اوما' ہم اب چلتے ہیں۔"

"پھر کب آؤ گی راحیلہ؟"

"جلدی....."

"پھر بھی کب....."

"تمہارے ہاتھ پر زخم ہے' پاؤں تو ٹھیک ہے۔ تم آ جانا ناں....."

راحیلہ چلنے لگی تو اوما نے کہا..... "زخم میں تو اتنی درد نہیں راحیلہ! پتہ نہیں یہ رونا کیوں آئے جا رہا ہے....."

ماسی کرشنا کے کمرے سے شوکت برآمد ہوا۔ وہ بھی کچھ روہانسا سا نظر آتا تھا۔

"بھلا کل آؤ گے شوکت؟....."

شوکت نے مزاح پیدا کرنے کی غرض سے کہا..... "آ دشیا آؤں گا چندر بالکا....."

اوما کی عقل پر پتھر پڑے تھے۔ آخر شوکت بھیا میں مر مٹنے والی کونسی بات تھی۔ ذرا ٹوتھ پیسٹ کے اشتہار جیسی مسکراہٹ' ایکڑ نما بال' دو چار سائنسی باتیں.... اوما تو کبھی شوکت بھیا وقت کے جینئس ہیں۔

شوکت بھیا ابھی اپنے آپ کو دریافت کرنے کی سٹیج میں تھے۔ ان کے ساتھ زندگی گزارنا تو در کنار دن گزارنا مشکل تھا۔ اوما کو ان کی بے پرواہی پسند تھی لیکن راحیلہ کا جی چاہتا اپنا سر نوچ لے۔ جس کمرے میں شوکت آدھا گھنٹہ قیام کر لیتا ساری جگہ کارزار بن جاتی۔ بستر ہے ہیں تو فرش پر..... ڈریسنگ ٹیبل ہے تو صابن کے پھاہوں سے پُر.... غسلخانہ ہے تو پانی سے شرابور..... اوپر سے ڈارک روم بنا ہوا ہے۔ شور مچاؤ تو پتہ چلتا ہے تصویریں دھو رہے ہیں..... ایک تو براؤنی کیمرے سے تصویریں کھینچنے کا شوق بڑھتا ہی جاتا ہے۔ جب سے اوما کا واقعہ ہوا کسی انسان کی تصویر نہیں لیتے.... ٹوٹی دیوار پر فوکس.... پوچھیے کہ یہ کیا ہے تو..... پولیس کے سٹل لائف کی سٹڈی۔ مکھی گلاس پر بیٹھی ہے۔ شوکت پینترے بدل بدل کر اس کی تصویر بنانے کے درپے استفسار ہوا کہ جی بھلا کیوں جواب ملتا ہے۔ تم نہیں جانتی راحیلہ ایسی ہی تصویریں پرائز فوٹو ہوتی ہیں۔ چولہے کی اینٹ ڈھ جائے اور تیز می دیگچی چڑھ جائے ماں ساجدہ ترکاری بھونیں تو شوکت بھیا باورچی خانے میں فلیش لائٹ لے کر موجود۔ اب ای بھی تصویر میں آ جائیں تو کیا حرج لیکن کیمرہ تو عین چولہے کی تاک میں ہے۔ چڑ کر پوچھ بیٹھو بھی یہ جھنجھٹ کس لیے جواب ملے گا تم کند ذہن ہو راحیلہ! میں تجربہ کر رہا ہوں لائٹ اینڈ شیڈ کا.... حالات شوکت بھیا خراب کریں اور شکایت امی ساجدہ کو راحیلہ سے۔ بھیا کے اوزار بکھرے پڑے ہیں۔ اوپر سے نادر شاہی حکم ہے کہ خبردار جو کا ویئے کو ہاتھ لگایا یا پچ کس کو چھیڑا.... ادھر ساجدہ ماں چیخ رہی ہیں کہ سکول سے اٹھالوں گی جو صفائی نہ رکھی۔

رضائیاں بستروں پر نہیں کھڑکیوں میں لٹک رہی ہیں۔ راحیلہ پوچھے کہ بھئی یہ کیا ہے۔ جواب ملتا ہے لائف کٹ کر رہا ہوں۔ کمرے میں جا بجا لوہے کا کباڑ پھیلا ہے لیکن راحیلہ کی کیا مجال جو ہاتھ لگا سکے۔ اصل میں تو ساجدہ ماں بھی چیزوں کو چھیڑتے ڈرتی تھیں۔ لیکن عتاب ہمیشہ راحیلہ پر نازل ہوتا ہے...." تمہیں پرواہ ہی نہیں راحیلہ.... ورنہ کمرہ صاف نہ ہوتا!"

لیجیے ساجدہ ماں کو راحیلہ کیسے بتائے جہاں دخل ہی نہ ملتا ہو۔ وہاں کوئی کام کیسے کرے لیکن اوما کو یہ کباڑ گھر اچھا لگتا ہے.... وہ کمرے کی جیسی کیسی حالت میں گینتھے کے پھول سجا جاتی ہے۔ کمرہ تو خیر سانجھا تھا لیکن اپنی حالت بھی عجیب بنا رکھی تھی۔ ایک زمانہ تھا جب بڑا شوق تھا کہ گھنی مونچھیں ہوں' چھاتی پر بلیڈ پھیرا کرتے۔ کبھی کبھار ابو کے کمرے سے سیفٹی ریزر لا کر صاف ستھرے چہرے کی شیو بھی بنا لیتے۔ قینچی سے ہاتھوں کے اوپر آئے ہوئے سنہری بالوں کو کاٹتے رہے لیکن اب یہ عالم کہ شیو بڑھی ہے نہیں کاٹتے.... نہائے بغیر گزارہ ہو جائے تو بغیر غسل کے خوش رہتے ہیں۔

"یہ تمہیں کیا تکلیف ہے' باقاعدگی سے شیو کیوں نہیں کرتے...." ڈاکٹر صاحب پوچھتے۔

"جی میری ڈاڑھی سخت ہے۔ روز مجھ سے شیو نہیں ہوتی...."

ملائم سنہری بالوں کو دیکھ کر ابو مسکرائے...." سارا جہاں روز شیو کرتا ہے بھائی تمہیں کیا کسر ہے؟"

"جی دیکھنے میں تو میرے بال ٹھیک ہیں لیکن کچھ نیچے کی طرف اگتے ہیں۔ کچھ اوپر کی جانب۔"

"تو پھر ڈاڑھی رکھو.... یہ ہونق سی شکل نظر نہ آئے...."

لیکن جب شوکت نے کوچی نما ڈاڑھی رکھ لی تو امی ساجدہ معترض ہو گئیں اور ایسا جھگڑا پڑا کہ ڈاکٹر سرفراز کو ہار ماننا پڑی۔ اب شوکت بھیا اپنی مرضی سے شیو کرتے.... کرنا چاہی کر لی.... نہ جی چاہا تو بلا سے۔ یہ مرضی بھی کیا چیز ہے۔ افسوس اس کے متعلق امریکہ نے کوئی دوا نہ بنائی ورنہ ہم ایک آدھ خوراک پلا کر ان کی مرضی بدل لیتے۔ فلم دیکھنے جانا ہو تو شیو بڑھی ہے.... سونے کی تیاری ہو تو ٹھوڑی نکال کر سونے آ جائیں گے۔ اوما کو ڈاڑھی دیکھ کر ہنسی آیا کرتی۔ وہ ہمیشہ ڈاڑھی رکھنے والے کو Nanny Goat کہا کرتی تھی اور بھیا کو دیکھ کر ایک ہی بات کہتی۔ "بھئی شوکت پر ڈاڑھی جچتی ہے' ڈاڑھی کے لیے مغل ناک اور چہرہ چاہیے بابر بادشاہ لگتے ہیں۔"

دادا ابا نے باقی گھومنا پھرنا تو ابھی بند نہ کیا ہاں بازار جانے سے پہلے شوکت بھیا کی منتیں کرنی پڑتیں۔ برقعہ اوڑھنا پڑتا.... دادا ابا کہا کرتے تھے...." لو بھئی ایک بات طے ہے انسان کے اندر چھپے شر کا کوئی علاج نہیں۔ عورت اگر اپنے نظارے کو چھپائے رکھے اور مرد نگاہیں نیچی کرے تو کچھ بچت ہو سکتی ہے.... لیکن ایسی عقل ہے بنی نوع انسان کی بچت چاہتا ہی کون ہے۔"

ان لیکچروں کے باوجود کبھی کبھی' راحیلہ برقعہ پیچھے چھوڑ جاتی اور شوکت کو شوکت بھیا کہنا بھی بھول جاتی۔ امی البتہ شوکت کے ساتھ جاتے کتراتی تھیں۔ اوما کا زعم تھا کہ شوکت کے ہوتے ہوئے دکاندار زیادہ مؤدب ہو کر جی حضور جی باپو جی کی رٹ لگا دیتے ہیں۔ اوما جب بھی ہمارے ساتھ ہوتی ایک آدھ نیل پالش' دو چار ٹافیاں خرید کر پاکٹ منی ختم کر لیتی لیکن راحیلہ کو جوتی کپڑا سب خریدنا ہوتا۔ ادھر شوکت کا اصرار کہ اب قیمت پوچھی ہے خریدو.... دکاندار نرخ غلط بتائیں یا

بتائیں لیکن شوکت کا تھم ہوتا بڑھتا گھٹتا ذلیل حرکت ہے۔
امی جس روز آخری مرتبہ شوکت کے ساتھ گئیں۔ گھنٹہ بھر میں واپس آ گئیں۔ تھیلے میں ایسی چیزیں تھیں جن کا ان کی ذات سے کوئی تعلق نہ ہو۔ آتے ہی برآمدے سے ہی شوکت نے ڈرامہ شروع کر دیا۔
''امی جی..... راحیلہ اور او ماتو باہر رہیں۔ امی اندر برکت علی کی دکان پر گئیں۔ ایک ساڑھی دیکھی دام پوچھے کہنے لگے تین روپے گز..... بولیں ہم تو ایک روپیہ گز دیں گے دینا ہو تو دے ڈالو ورنہ مت!''
ڈاکٹر سرفراز مسکرانے لگے..... ''بھئی یہ مت کیا چیز ہے.....''
اب اس ''مت'' کو امی ساجدہ ہی بہتر سمجھتی تھیں اور کھسیانی ہنسنے میں مشغول تھیں۔
''میں تو کہہ رہی تھی کہ.....''
''پتہ ہے ابی برکت علی بزاز نے کہا جی نہیں اور تھان کاؤنٹر سے اٹھا لیا۔ اب امی جی فرماتی ہیں برکت علی! ہم تو ساڑھی لے کر جائیں گی۔ برکت علی نے تھان کاؤنٹر پر رکھ دیا اور پوچھا جی فرمایئے ساڑھے پانچ گز کہ چھ..... دیکھ لیجئے کشمیر کا ریشم ہے.....''
ڈاکٹر ابی ہنسنے لگے اور جلدی سے بولے.... ''چپ کر شوکت چپ!''
''سنئے تو سہی..... جب تھان پھر کاؤنٹر پر آ گیا تو امی جی بولیں..... ''سنو بھئی ہم تو ایک روپیہ گز دیں گے۔ کرشنا بہن جی ایسے ہی لے کر گئی ہیں۔'' اس نے پھر تھان واپس الماری میں رکھ دیا۔
اب پوچھیے ان سے کتنی بار ایسے ہوا اور آخر میں ساڑھے تین روپے گز کے حساب سے کپڑا خرید لیا۔ کیوں امی جی آپ حساب میں کمزور ہیں کہ دل کی کمزور ہیں۔ شوکت دلار سے امی کے ساتھ لپٹ گیا۔
''پرے ہو گری لگتی ہے.....''
امی کا جلوس نکل رہا تھا اور وہ خفیف ہو رہی تھیں۔
''پرے ہو گری لگتی ہے۔'' امی کھسیا کر بولیں اور نرگس کے پھول سونگھنے لگیں۔
''یہ پھول کس سے لائی ہو ساجدہ بہو.....'' دادا ابا نے اخبار سے نظریں اٹھا کر پوچھا..... ''اپنے گھر میں کیا کم لگے ہیں؟''
''اس نے دلوا دیے..... شوکت نے.....''
''جی نہیں دادا ابا میں نے ہرگز نہیں دلوائے۔ ہوا یوں کہ نرگس بیچنے والا ان کے پیچھے پڑ گیا اور کہنے لگا جی ایک روپیہ دے دیجئے۔ امی نے جھٹ کہا میں تو آٹھ آنے دوں گی۔ تم کو وارا کھائے تو دے دو ورنہ مت!''
''بھئی ساجدہ یہ مت کیا بلا ہے؟.....'' ڈاکٹر ابی نے ہنستے ہوئے استفسار کیا۔
''یعنی نہ سہی ابی جی..... نہ سہی۔ پھول والا کدی بولا جی نہیں..... امی آگے چلی گئیں۔ اب وہ روتا ہوا ساتھ چل رہا ہے کہ جی بال بچے بھوکے ہیں۔ میرے تو روز پھول مسز جیکس کے گھر بک جاتے ہیں۔ آج وہ بابا لوگ سمیت کلو گئی ہیں۔ رینوکا دیوی سے ملنے بکری نہیں ہوئی..... امی نے فوراً ڈیڑھ روپیہ دے کر پھول لے لیے۔''

"اچھا سچ سچ بتانا ساجدہ! اڈی سی کی بیوی کا سن کر خرید لیے کہ ترس آ گیا پھول والے پر؟" ڈاکٹر ابی نے پوچھا۔

"بس جی جانیں دے۔"

دادا ابانے ابرو اٹھا کر اخبار سے چہرہ پرے کیا اور بولے...."لو بھو ڈیڑھ روپے کے پھول اتنے اسراف کا حکم نہیں ساجدہ بہو!"

خیر! ای تو اس واقعے کے بعد شوکت بھیا کے ساتھ جاتے کتراتی تھیں لیکن راحیلہ کی مجبوری تھی۔ اکیلے بازار جانے کی ممانعت تھی۔ ہر دکان میں گھسنے سے پہلے شوکت بھیا ایک بغل گھونسے سے ایسی تنبیہ کرتے دیکھو راحیلہ بھاؤ تاؤ نہ کرنا اگر کوئی چیز نہ لی تو واپس لے جاؤں گا۔ ساری دوکان دیکھنے کی ضرورت نہیں جو دکھائے وہی دیکھنا۔ ایسے جلاد کے ساتھ راحیلہ کیا خریداری کرتی۔ اس کا تو طریقہ یہ تھا کہ گزوں گز تھان کھلوا لیے بعد میں چار گرہ کپڑا خرید لیا.... دکاندار خوش کہ کچھ کما لیا راحیلہ خوش کہ اتنے سارے ریشمی تھان دیکھ لیے چھو لیے!

جوتیوں والی دکان پر البتہ ایک آفت آتی۔ کوئی جوتی عین انگوٹھے کی جانب کاٹتی تھی۔ کسی کے تسمے بندھتے نہ تھے۔ کسی کے بٹن کاٹتے تھے۔ کسی جوتی کا فیشن بابا نوح کے زمانے کا تھا کہ پہنتے ہی شخصیت دو کوڑی کی ہو کر رہ جاتی۔ لیکن شوکت بھیا کے ساتھ اتنے ڈبے کیونکر کھلوائے جائیں۔ وہ تو دکان میں گھستے ہی ٹانگیں ذرا ذرا علیحدہ کر کے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر ڈٹ جاتے۔ ادھر راحیلہ نے جوتے میں پاؤں ڈالا ادھر انہوں نے بٹوہ کھول لیا۔ اب بتائیے جوتا بھی کیا اس طرح خریدا جا سکتا ہے؟

راحیلہ کو کھوجتی تھی۔ ایک ہی بستر ایک ہی کمرے میں رہنے والی اکلوتی بہن لیکن اتنی دیر ساتھ رہنے کے بعد یہ عالم تھا کہ راحیلہ کے کسی کام کے لیے وقت ہی نہ تھا۔

"شوکت بھیا ذرا میز پوش ٹریس کر دو.... مس ریاض ناراض ہوتی ہیں۔" راحیلہ نے لجاجت سے کہا۔

"دیکھتی نہیں ہو میں مصروف ہوں۔"

مصروفیت یہ ہے کہ کرسی پر دونوں ٹانگیں رکھے ایک چھوٹی سی گراری کا معائنہ جاری ہے اور وہ گراری بھی ایسی زنگ آلود کہ لگتا کسی ٹول سے نکالی ہو۔

"بھیا ٹائم ٹیبل دیکھ دو دادا ابا پوچھتے ہیں۔ پٹھان کوٹ سے کٹ کٹ ٹرین جاتی ہے امرتسر۔"

"بھئی مجھے بڑا کام ہے راحیلہ! شام کو دیکھ دوں گا۔"

کام کی نوعیت یہ کہہ کر کیمرہ کندھے پر لٹکائے چراغ کھنڈ کی سمت چلے جائیں گے۔

"بھیا میرے سارے پھول اور تہذیب نسواں جلد کروا دیجئے پلیز.... آج ہی...."

"آج تو کسی قیمت پر نہیں.... آج مجھے فلمیں دھونی ہیں...."

اور غسل خانے پر رضائیاں ٹانگی ہیں! یہ تو حال تھا شوکت بھائی کا.... لیکن اوما کا شاید خیال تھا کہ شوکت کا ایک ایک لمحہ ایک ایک پل اس کے نام مختص ہو چکا ہے.... نو عمری میں یہی احساس غرور کا باعث بنتا ہے ان دنوں اوما کا مزاج بھی ساتویں آسمان پر تھا۔

راحیلہ کا خیال تھا کہ شوکت کی محبت محض بندراسی ہے۔ اِدھر چڑھی اُدھر اتری لیکن اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ اوما سی سیانی کو کیسے اس جھنجھٹ کا خیال آیا۔ شوکت بھائی سارا دن ایک شعر گنگناتے 'بوئے جوئے مولیاں آید ہمی' اور راحیلہ سوچتی کہ بھائی کا ذوق بھی کیسا گرا ہوا ہے۔ سارا دن مولیاں کھانا چاہتے ہیں۔ تو کھائیں لیکن اس تمنا کا اظہار اس قدر ترنم سے کیوں کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ابا کے ڈریسنگ ٹیبل پر ایک فرانسیسی عورت کی تصویر تھی لیکن اس تصویر سے گھر کی ہوا کبھی نہ بدلی.... اوما اور شوکت کے درمیان بظاہر کچھ نہ تھا۔ جلد ہی راحیلہ کو احساس ہوا کہ وہ راستہ جو اوما اور شوکت اپنے لیے بنا رہے ہیں' وہ بے ڈھنگا ہے اور اس پر بادل تنے ہیں۔ شاید یہ محبت بھی نہیں تھی' شاید ہو۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے سوائے کچھ نظر نہیں آتا تھا لیکن اس کو کیا کہا جائے کہ دوسروں کی نظریں معمول کے مطابق دیکھتی چلی جاتی ہیں۔ محبت تو اندھی ہوتی ہے لیکن اس میں مبتلا صرف دو ہو جاتے ہیں۔ باقی ارد گرد کے لوگ ان کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔ ویسے تو اگر آپ قرض مانگنے جائیں اور روپیہ ادھار دینے والا اصل موضوع سے سرکتا جائے تو مانگنے والے کی جان جاتی ہے۔ اگر کبھی سڑک پر آمد و رفت گھنی ہو اور عین سڑک کے وسط میں پاؤں پھسل جائے اور گرنے کا اتفاق ہو تو ساری شیخی کرکری ہو جاتی ہے.... اور اگر پھر کسی عالیشان پُرتکلف ڈنر پر یوں ہو کہ آپ کانٹے چھری سے بٹیر قابو میں لا رہے ہوں اور معاً پلک جھپکنے میں پھدک کر آپ کی پلیٹ سے سامنے بیٹھی خاتون کی گود میں جمپ لگا جائے تو آپ کا رنگ فق ہو جاتا ہے لیکن جو حالت ایک غیر کی دو محبت کرنے والوں کے درمیان ہوتی ہے اس کی کیفیت بس صرف اسی کا جی جانتا ہے وہ بھی جب ایک اپنا شوکت بھائی ہو اور دوسری بچپن کی سہیلی اوما۔

راحیلہ اوما کے گھر سے روانہ ہوئی.... پتہ نہیں کیوں راستے میں اس کے دل میں خود بخود جملے ابلنے لگے۔

پیاری اوما کسم نالنی: تم کو ایک نام تمہارے ماں باپ نے دیا' ایک نام تمہاری ماسی کرشنا کے گھر سے ملا.... اور تیسرا نام پاشی بہن نے دھرا.... ایک نام کی ابھی کسر ہے۔ پھر چاروں سمتیں پوری ہو جائیں گی.... اور جب کسی کی چاروں دشائیں مکمل ہو جاتی ہیں تو وہ وقت میں ٹھہر جاتا ہے' اچانک کسی زمانے کسی مقام پر قید ہو جاتا ہے۔ یکدم اسے دادا ابا کی آواز سنائی دی۔

"سخی کی دوسری سمت کنجوسی ہے.... سخی کنجوس نہ ہو تو سخی نہیں ہوتا۔"

ذہین انسان غبی ہوتا ہے.... کئی معاملات میں وہ احمق پن کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ خوبصورت شخص کے قریب ہی بہت بدصورتی جنم لیتی ہے بلکہ خوبصورتی ہی بدصورتی کو پیدا کرنے میں معاون ہوتی ہے....

ساری خوبیاں.... اپنا توازن بے خوبیوں سے پیدا کرتی ہیں۔

ساری خرابیاں خوبیوں کو جنم دیتی ہیں.... یہی سمتوں کا کھیل ہے۔

جہاں کہیں تضاد توازن میں آ جائیں میانہ روی پیدا ہو جاتی ہے.... جب بھی سمتوں کا تعین ہو جائے فوراً انسان وقت میں قیام کرنے کے قابل ہو جاتا ہے.... مشکل یہی ہے راحیلہ بیگم! انسان آگ اور پانی دونوں سے بنا ہے۔ کبھی آگ زیادہ ہوتی ہے اور پانی کم.... اور کبھی پانی اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ آگ اپنا کرشمہ دکھا نہیں سکتی.... میانہ روی اختیار کرو.... میانہ روی

''آ تجھیں....'' راحیلہ نے اپنا سر جھٹکا اور سوچا کہ بھلا میں کب دادا ابا کی باتیں غور سے سنتی ہوں۔ پھر بھی.... پھر بھی وہ اچانک یاد کیوں آ جاتی ہیں؟

کھنڈ کی طرف جاتے ہوئے راحیلہ اس بڑے سفید پتھر پر بیٹھ گئی جہاں پہلے پہل شوکت نے دھوبن چڑیا بن کر کپڑے دھوئے تھے۔ پھر اسی پتھر پر سریندر مچھلیاں پکڑتے ملا تھا۔

پتہ نہیں کیوں اسے اوما پر ترس سا آنے لگا۔ اس نے جی میں بیٹھی اوما سے کہا.... ''پتہ نہیں تو نے ایسے راستے کیوں چن لیے ہیں اوما؟ جانتی نہیں کہ اتنی بڑی خلیج ہمارے درمیان بہتی ہے کہ ساری عمر بھی تیرتی رہو تو منجدھار تک نہ آ سکو.... پھر؟''

اس وقت راحیلہ کو اوما پر اتنا پیار آ رہا تھا کہ اس کا جی چاہا وہ اوما بن جائے اور اوما راحیلہ پھر سارے مسئلے آپ ہی آپ سلجھ جائیں۔ رشی منی شراپ نہ دیں.... بددعائیں ہواؤں میں تحلیل ہو جائیں.... اور راوی ہر طرف چین ہی چین لکھے۔

راحیلہ نے سوچا کہ لڑکیاں تو ازل سے گدھی ہوتی ہیں۔ پھر اوما سے کیسے کہا جائے کہ بھئی ہوش کرو دائیں بائیں نظر ڈالو۔ کچھ جان بوجھ لو۔ پھر عاشق بھی ہو لینا۔ اول تو لڑکیوں کی یہ بھی عین ادا ہے کہ ہوتی عاشق ہیں اور بن محبوب جاتی ہیں۔ جی میں ہوتی ہے کہ کسی کو دیوتا بنا کر دل کے تخت پر بٹھائیں اور لپک جھپک اس کی پوجا کریں لیکن کرتی یوں ہیں کہ ادھر دیوتا صاحب آئے اُدھر پیٹھ موڑی.... ادھر لڑکوں کا یہ عالم کہ دنیا جہاں کے کاموں سے فرصت نہیں اور عاشقی کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ دوستوں کے ساتھ جھک مارتے مارتے تنگ آ گئے تو کسی آسمان سے پنچھی کے عاشق بن گئے۔ ذرا لڑکی کے والدین کا چکر پڑا سماج نے گھونسہ دکھایا تو جھٹ مظلوم دکھیارے یا بزدل قسم کی کوئی چیز بن گئے.... فرہاد تو جنم جنم سے ہیں لیکن فرصت کے اوقات میں.... لیلیٰ لیلیٰ پکارنے سے بہتر کوئی مشغلہ نہیں بشرطیکہ کوئی بہتر کام نہ ہو۔ رانجھا بننے میں بھی کوئی حرج نہیں لیکن صرف پارٹ ٹائم!

طبیعت طبیعت کا بھی فرق ہے۔ پہلے راحیلہ کی یہی کوشش ہوتی کہ کہیں سرک جائے۔ پہلے وہ پانی پینے کے بہانے اٹھتی۔ غسلخانے میں گنگنا گنگنا کر پانی پیتی پھر موسیقی کا عشق ہو جاتا۔ پھر باہر برآمدے میں جا کر گھڑی دو گھڑی انگور کے خوشے گننے میں لگاتی۔ آخر میں خوب شور مچاتی' چیزوں کو ٹھوکریں مارتی' واپس لوٹتی تاکہ بھیا کو علم ہو جائے کہ راحیلہ آ رہی ہے۔ واپسی پر علم ہوتا کہ آپ کی آہٹ اول تو انہوں نے سنی نہیں' دوسرے ٹھیک طرح اندازہ نہیں لگا سکتے کہ راحیلہ کتنے میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آ رہی ہے۔ کبھی کبھی یہ جان کر کہ اٹھ جانا معیوب لگتا ہے راحیلہ وہیں ٹکی رہتی۔ ایسی منجمد قسم کی خاموشی سے سابقہ پڑتا کہ راحیلہ کو اپنی سادہ گفتگو بھی بھول جاتی۔ ایسے میں راحیلہ کسی کتاب میں ناک ٹھونس کر پڑھنے کا ڈھونگ رچاتی۔ ادھر کھسر پھسر جاری ہو جاتی۔ بولنے تک تو خیر جب اوما کو ہنسنے کا دورہ پڑتا تو راحیلہ خود بخود متوجہ ہو جاتی اور پھر پریشان ہو جاتی کیونکہ وہ دونوں دل آنکھوں میں ذھر کر ہنسا کرتے۔

ویسے تو راحیلہ اب سمجھنے لگی تھی کہ سب پر یہ دن آتا ہے یعنی وہ مغربی رسالے دیکھ کر اندازہ لگاتی کہ مغرب میں چوماچاٹی عام ہے۔ لوگ پلیٹ فارموں' باغوں میں بڑی آزادی سے بہت کچھ کرتے ہیں۔ بڑی پیچ قسم کی گفتگو بھی چلتی ہے اور کوئی پوچھتا نہیں لیکن ابھی اس دور افتادہ شہر میں مسلم اور ہندو کلچر میں بڑی شرماشرمی تھی لیکن ابو کو دیکھتے ہی شوکت بھیا

کے سر میں کئی بار شدید درد اٹھا۔ پھر اوما کے زانو پر سر دھر کر وہ دیوانے لگتے۔ بال خراب ہو جاتے تو اوما بالوں میں کنگھی بھی کر دیتی۔ ایسے میں سارا وقت شوکت بھیا راحیلہ سے باتیں کرتے رہتے اور ایسا چہرہ بناتے گویا کبھی کچھ ہوا ہی نہیں.... کچھ ہوا ہی نہیں رہا.... ہاں ایک دن بھی پڑتا ہے۔

ایک بات سے راحیلہ ڈرتی تھی۔ اس کے سامنے جو چھوٹے چھوٹے واقعات ہو جاتے ان کا وہ کبھی بھی ذکر کسی سے نہ کرتی لیکن اسے ڈر تھا کہ اگر بات چل نکلی تو اوما ضرور کہے گی کہ شوکت تم میری رسوائی کا موجب ہوئے۔ ادھر شوکت بھیا اصرار کریں گے کہ لڑکیاں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں لیکن راحیلہ جی میں کہتی کہ وہ جو آپ دونوں کی باتوں پر گیتوں کا شبہ ہوتا ہے۔ کیا اس سے لوگ کچھ نہیں جانتے۔ وہ جو نظروں میں قند اور مصری گھلی رہتی ہے' کیا وہ کسی کو نظر نہیں آتی۔ دادا ابا کے سامنے اتفاقاً جو اوما نے ٹھوکر کھائی اور شوکت بھیا سنبھالنے کو لپکے تو دادا ابا کی عینک گرتے گرتے بچی۔ ٹھیک ہے دادا ابا کی نظر خراب ہے لیکن اس قدر بھی نہیں!

بات بہت معمولی تھی لیکن چونکہ شوکت بھیا کے متعلق تھی۔ اس لیے راحیلہ بہت متعجب ہوئی۔ راحیلہ کا خیال تھا کہ شوکت بھائی ان باتوں سے بہت بلند ارفع واعلیٰ ہیں۔ انہیں نہ کسی لڑکی سے کبھی لگاؤ ہوا نہ ہو ہی سکتا ہے۔ اسی لیے جب شوکی بھیا کے ارمانوں کی بستی نے سر نکالا تو راحیلہ حیران رہ گئی۔

اوما اور راحیلہ کو گلدان سجانے کا بہت شوق تھا۔ وہ بن کے سرخ پھول توڑ لاتیں۔ کبھی جنگلی گلاب ہی ان گلدانوں کی زینت بنتی کبھی کینتھ۔ جیسے انگریزی جوکی ڈالیوں کو زینت کے لیے سجایا جاتا۔ حیرانی کے دنوں کی بات ہے ایک دن اوما آئی۔ اس نے کس کے کانوں کے قریب دو چوٹیاں کر رکھی تھیں۔ نیچے ربن باندھے ہوئے تھے اور شلوار کے اوپر ایک اونچی فراک اور دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ راحیلہ نے اسے اشارے سے بلایا اور پھر باہر چلی گئی۔

●○●○●○

تیسرا عہد

(الف)

''ملکی حالات اچھے نہیں ساجدہ.....'' ڈاکٹر سرفراز بولے۔

''جی میں بھی جانتی ہوں.....''

''ہم نے اتنے سال پہاڑوں پر گزارے..... اتنے دوست ملکی بنائے' وہ لوگ کہاں ہیں؟.....''

''پہاڑوں میں.....''

''میں جانتا ہوں ابھی زندگی سست رفتاری سے چل رہی ہے لیکن یہ ایسے نہیں رہے گی..... تمہاری میری جیسے کیسے گزر جائے گی لیکن ان بچوں کا کچھ سوچو.....''

''اب آپ کے کہنے پر شوکت کو لاہور بھیج دیا ہے..... اور کیا چاہتے ہیں آپ؟''

''اسے سال بھر سے گھر بٹھا رکھا ہے راحیلہ کو کس لیے.....؟''

''اسے تو اول آخر بیاہنا ہی ہے ناں ڈاکٹر صاحب..... کیا فائدہ اسے مزید پڑھانے کا۔''

ڈاکٹر سرفراز اپنے اندر دلائل تلاش کرتے رہے۔ پھر سوچ سوچ کر بولے..... ''سنو بھائی! تعلیم کسی کا نقصان نہیں کرتی اللہ کی بندی..... اللہ ہی کا نام لے کر اسے کالج میں بھیج دو۔''

''کہاں ہوسٹل میں.....؟'' ساجدہ قریباً چیخی۔

''تو ہوسٹل کوئی بلیک ہول تو نہیں ہے۔''

''پھر بھی.....؟''

''کل میں ٹھاکر چندر سین کے گھر گیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے اوما اس کم بھی ہوسٹل میں ہے۔ دونوں بچپن میں ساتھ رہی ہیں۔ تمہاری راحیلہ اداس نہیں ہوگی.....''

''لیکن اوما تو..... وہ تو ٹھاکر صاحب کے پاس پہاڑوں پر رہتی تھی' وہ لاہور کیسے چلی گئی۔''

''اوما کے ماں باپ برما سے آ گئے ہیں۔ کئی بار تم سے کہہ چکا ہوں' ٹھاکر چندر سین کے چلو وہی اوما کے اصلی ماتا پتا ہیں۔''

"لیکن ڈاکٹر صاحب......"

"بس کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب......تم اللہ کا نام لے کر راحیلہ کو لاہور بھیجو۔"

اب ساجدہ ماں ڈاکٹر صاحب کو کیسے سمجھاتی کہ اسی ایک سال میں راحیلہ نے شاہد کو ڈھونڈ نکالا تھا اور شاہد لاہور میں ایم اے کے فائنل سال میں جانے کس مضمون کی تیاری کر رہا تھا۔ ساجدہ ماں کو ایک ہی فکر تھا کہ اگر راحیلہ اور شاہد دونوں آزادانہ لاہور میں ملنے لگے تو پھر کیا ہوگا...... بدنامی ہوگی کہ کچھ اور......

"راحیلہ کچھ ایسی ذہین نہیں ہے ڈاکٹر صاحب......"

"ملکی حالات کچھ اچھے نہیں ساجدہ۔ لڑکیاں ہوسٹل میں گھر سے زیادہ محفوظ ہیں۔" باوجودیکہ ساجدہ ماں نے بہت اوئی توئی کی۔ دادا ابا نے بے پردگی اور لاہور کا قریبی رشتہ سمجھایا۔ راحیلہ خود بہت ڈھٹائی سے انکار کرتی رہی۔ اسے لاہور پہنچا دیا گیا۔ ہاں ایک خواہش ضرور تھی اور وہ بھی اوما سے ملنے کی اسے دیکھنے کی۔

اب جب ڈاکٹر سرفراز مغل نے فیصلہ کر لیا تھا کہ راحیلہ فوراً کالج چلی جائے۔ اندر ہی اندر راحیلہ بغاوت پر آمادہ تھی۔ وہ عباس منزل میں آنے جانے لگی تھی اور وہیں شاہد بھی تھا۔ میاں اور بیگم عباس کا خوبصورت بیٹا......لیکن جب ابا کسی بات کا فیصلہ کر لیتے تو پھر انہیں منانا آسان نہ ہوتا۔

راحیلہ نے آسمان پر پھیلی ہوئی سفیدی کو ایک نظر دیکھا اور سوچنے لگی کہ اب اگر میں نہ اٹھی تو نماز قضا ہو جائے گی۔ سامان بھی ٹھیک طور سے بندھ نہ سکے گا اور ہو سکتا ہے کہ گاڑی نکل جائے اور شوکت بھیا اور شاہد اپنے اپنے کالجوں کو اس کے بغیر ہی چلے جائیں۔

جب راحیلہ پہاڑوں سے آئی تو سب سے پہلے اس کا تعارف تسنیم آپا سے کروایا گیا۔ ڈاکٹر مغل کی غیر موجودگی میں تسنیم آپا اور اظہر بھائی ابراہیم لاج کی دیکھ ریکھ کرتے تھے......لیکن کچھ سال پہلے اظہر بھائی کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد تسنیم آپا اور ان کا بیٹا ٹنکو ابراہیم لاج کے پچھلے کمروں میں رہتے بھی تھے اور کوٹھی کا دھیان بھی کرتے تھے۔ راحیلہ نے سوچا اگر میں تسنیم آپا کی جگہ ہوتی تو......تو کیا میں اظہر بھیا کی موت کے بعد صرف ان کی یاد کے سہارے جی لیتی؟ یادیں جو حسین سہارا تو ہو سکتی ہیں لیکن جن کو چھوا نہیں جا سکتا۔ اپنی گرفت میں نہیں آ سکتیں...... انسان انہیں بدل نہیں سکتا۔

سفیدی آسمان پر بڑھ رہی تھی۔ تسنیم ایک بازو لٹکائے بے سدھ سو رہی تھی۔ راحیلہ کی ساجدہ ماں جانماز پر بیٹھی تسبیح پھرانے میں مشغول تھیں۔ راحیلہ نے تسنیم کی گوری بانہہ کو دیکھا......اتنا گورا رنگ! راحیلہ نے سوچا تسنیم آپا مجھ سے کتنی مختلف ہیں۔ سب ہمیں سگی بہنیں سمجھتے ہیں لیکن مشابہت چہرے سے آگے ختم ہو جاتی ہے۔ ہمارا کردار، شخصیتیں بالکل الگ الگ ہیں۔ وہی نیکی جو تسنیم بغیر سوچے سمجھے محض اپنی طبیعت کی اچھائی کے باعث کر لیتی ہے۔ میں اپنے آپ سے پہروں جھگڑنے کے بعد بھی نہیں کر سکتی۔ راحیلہ نے سوچا اس کی تمنا یہی ہوتی ہے کہ کام خود بخود ہو جایا کریں۔ فیصلوں کا بوجھ اس پر نہ پڑے اور تسنیم نہ صرف اپنی زندگی کو فیصلہ کن انداز میں بسر کرتی بلکہ اوروں پر بھی اپنی سوچ کا مثبت اثر چھوڑتی چلی جاتی۔

کیا میں شاہد کے بغیر ایسے جی سکتی ہوں؟

دیر تک اس کی یاد کے سہارے خوش رہ سکتی ہوں؟

بڑی آہستگی سے راحیلہ نے کروٹ لی اور کوشش کی کہ اظہر بھائی کا چہرہ اپنے ذہن میں لائے۔ ان کی شبیہہ ذہن میں یوں آئی جیسے کسی من پسند فلم کے ہیرو کا چہرہ...... جس وقت تسنیم باجی کا بیاہ ہوا اس کی عمر نو برس کی تھی۔ اس نے اظہر بھائی کو سرخ پگڑی اور سنہری تاروں والا سہرا باندھے دیکھا تھا۔ گھر میں سب ان کی تواضع کرتے اور آنکھیں بچھاتے۔ نہ جانے کیوں راحیلہ کو اندر ہی اندر اظہر بھائی سے بڑی چڑ تھی۔ آخر یہ ہوتا کون ہے تسنیم آپا کے ساتھ بیٹھنے والا؟..... اس کا کیا حق ہے ساجدہ ماں کے پاس گھس گھس کے بیٹھے...... جب وکیلوں والا سیاہ کوٹ پہن کر وہ کچہری جاتا تو سب کی نظر بچا کر تسنیم بھی پیچھے پیچھے گھستی جاتی......

اور جب تسنیم آپا بیوہ ہوئیں تو ساجدہ ماں نے تین دن کھانا نہ کھایا۔ وہ سب ان دنوں پہاڑ پر تھے۔ ساجدہ ماں نے رو رو کر اپنے مرحوم داماد بھائی کو یاد کیا۔ "ہائے بیچاری گود میں نشانی دے کر چلا گیا اظہر..... کون سنبھالے گا گگو کو...... کون اس کی خوشیاں منائے گا؟"

اور یوں بیوگی کے بعد آپا تسنیم اور گگو ڈاکٹر سرفراز کے گھر کا حصہ بن گئیں۔

تسنیم اس گھرانے کی غریب رشتہ دار تھی جو کام میں آگے اور حقوق میں پیچھے تھی۔ جب بھی کسی رشتہ دار میں تحکم اور دھونس ہو، وہ فیصلے کرنے، رعب جمانے، بچوں کو ڈانٹنے، نوکروں کو درست کرنے، فرنیچر کو تبدیل کرنے کا حق رکھے وہ عموماً امیر رشتہ دار ہوا کرتا ہے۔ ملازموں کو مشرق میں چاچا، ماسی، بوا، بابا جی کہنے کا رواج ہے مگر یہ مشرقی انداز تکلم ہے۔ جب یوں عزت سے پکار کر گھر والے ملازم کو برابری کا حق دینے سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ ملازم کبھی بھی نہ تو حقوق طلب کر سکتا ہے نہ برابری کر سکتا ہے۔ گوری چٹی کشمیری تسنیم آپا نہ تو پوری رشتہ دار تھی نہ ہی ملازم..... وہ کہیں ان دونوں کے درمیان ڈولتی پھرتی تھی۔

جب پہاڑوں سے واپسی پر راحیلہ نے تسنیم آپا کو دوست بنانا چاہا تو اس نے دیکھا کہ تسنیم آپا تو بہت ہی کم بولتی تھی۔ کبھی کبھی وہ گگو کو گود میں بٹھا کر ایک ہی کرسی پر پہروں بیٹھی رہتی۔ کسی نے بلایا تو مختصر جواب دے دیا ورنہ بچے کا منہ گم سم تکتی رہتی۔ انجام کار ماں اور بچہ دونوں ہی بلا وجہ رونے لگتے۔ راحیلہ کو ان دنوں علم نہ تھا کہ بغیر غم کے کیونکر آنسو نکلتے ہیں۔ پھر وہ سوچتی جب کبھی شاہد نہیں آتا اور کئی دن گزر جاتے ہیں؟ تب......

راحیلہ کو ان آنسوؤں میں بڑی آمیزش نظر نہ آتی۔ کبھی کبھی تو وہ یہاں تک سخت دل ہو جاتی کہ سوچنے لگتی تسنیم آپا محض امی کو متوجہ کرنے کے لیے روتی ہیں۔ خاص کر جب کبھی تسنیم آپا اسے ٹوکتیں تو وہ دل میں سوچتی..... "پتہ نہیں اس آپا کا ہمارے گھر میں کیا کام ہے۔ بس سارا دن چیزیں گھستی پھرتی ہیں۔"

آسمان پر سفیدی میں ہلکی سرخی شامل ہو گئی تھی۔ راحیلہ کا دل اٹھنے کو نہ چاہ رہا تھا۔ اسے وہ دن یاد آیا جب ایک روز ناشتے پر راحیلہ نے شہد کی چمچ بھر کر منہ میں ڈالی۔ دیر تک چمچ چاٹتی رہی اور پھر دانتوں کو چمچ سے بجانے لگی۔ تسنیم نے پہلے نظروں سے روکا..... پھر ہوں ہاں کی..... لیکن راحیلہ نہ مانی تو ساجدہ ماں متوجہ ہو گئیں اور بولیں..... "سنتی نہیں تسنیم منع

کر رہی ہے.....''

چمچ تو راحیلہ نے واپس رکھ دیا لیکن ناشتے سے انکار کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آخر تمہیں ٹوکا ہے تو کیا برا کیا ہے۔ ہم بول رہے تھے تم شور مچا رہی تھیں۔ آرام سے بیٹھ کر ناشتہ کرو.....''

''سب ہم ہی پر رعب جماتے ہیں..... ہم کچھ نہ کھائیں..... بس تسنیم آپا کی تو یہی خواہش ہے۔'' یکدم تسنیم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا..... ''بھائی بھائی بھائی! معاف دے دو اور ناشتہ کرو.....'' راحیلہ نے ساجدہ ماں کی طرف جھک کر پوچھا..... ''تسنیم آپا اپنے گھر کب جائیں گی؟''

تسنیم آپا کی ساری چائے ان کی جھولی میں گر گئی۔ ڈاکٹر صاحب چپ چاپ اٹھ کر چلے گئے اور ساجدہ ماں نے پورے ہاتھ کا تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا..... ''تو جائے گی تو..... اس گھر سے میرے جیتے جی تسنیم نہیں جا سکتی.....''

راحیلہ کو یہ واقعہ یوں یاد آ رہا تھا گویا کل کی بات ہو۔ اس چپت کے بعد اپنا پہروں رونا اور تسنیم آپا کا احساس جرم میں پھرنا بھی اسے یاد ہے۔ نہ جانے اس نے تسنیم آپا کو کتنی بددعائیں دی تھیں..... ہائے میں بھی کتنی نالائق تھی..... اللہ نہ کرے تسنیم آپا کو کبھی بھی کچھ ہو۔ وہ سوچنے لگی۔ شروع شروع اس چڑ کی وجہ تسنیم آپا کی شرافت اور نیکی تھی۔ راحیلہ موقعے تلاش کرتی کہ تسنیم کی شرافت کو ڈھونگ ثابت کرے۔ جس طرح لوگ مرشد کی غلطیاں پکڑنے اسے بے نقاب کرنے میں وقت لگاتے ہیں۔ اسی طرح راحیلہ بھی تسنیم کو معمولی سمجھنے اور بنانے پر تلی رہتی۔ یہ محض اس کے اپنے وجود کا پرتو تھا۔ وہ بھی دکھاوے کی خاطر اپنے آپ کو نیک ثابت کرنے کے لیے بہت سے کام کرتی تھی۔ کبھی کبھی ساجدہ ماں کے کام بھاگ بھاگ کر کیے جاتی۔ اباجی کی قمیض نکال کر ان میں بٹن ٹانکنے لگتی۔ دل میں سوچتی کاش اباجی کے بٹن لوہے کی تار سے ٹانک دیے جائیں۔ پھر دھوبی کپڑا دھوئے یا تسنیم آپا..... کبھی بٹن نہ ٹوٹیں۔ راحیلہ کا دل چاہتا ہر کام کے بعد اس کی تعریف کی جائے۔ اس کے کام ہی کی نہیں اس کے سراپے کی' لباس کی بھی دم بدم تعریف کی جائے اور جب ایسا نہ ہوتا تو وہ کتابوں میں سر دے کر پڑی رہتی..... ایسے میں کوئی تسنیم آپا کی تعریف کر بیٹھتا تو راحیلہ کا جی چاہتا کہ وہ تسنیم آپا کے ساتھ تعریف کرنے والے کا بھی گلا گھونٹ دے۔

جس روز تسنیم نے اپنا برقعہ استری کروا کے اسے پہنایا' اس روز تو راحیلہ کے دکھ کی کوئی انتہا نہ تھی۔ چہرے پر نقاب ڈالے تیز تیز چھوٹے قدم دھرتی وہ سوچنے لگی کہ یہ ساری اختیاری بیوگی کی عطا کردہ ہے..... یااللہ! میں بیوہ کیوں نہیں..... میں آزادی سے زنانہ کلب کیوں نہیں جا سکتی۔ مجھ پر بندش کیوں؟ کیا میں نے کسی کی چوری کی ہے۔ مجھے لوگوں کو نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی بھی اجازت نہیں..... اب سورج مشرق میں لالی پیدا کر رہا تھا..... وہ تسنیم آپا اور اپنی لڑائیاں اپنی ضدیں اور آپا کی خاموشیاں یاد کر رہی تھی..... وہ سوچ رہی تھی کہ یہ وہی تسنیم ہے جس کے بغیر اب میں ایک پل کاٹ نہیں سکتی۔ اس کی خاطر میں پھانسی کے تختے پر چڑھ سکتی ہوں..... زہر کھا سکتی ہوں۔ اس کا یا پلٹ کی بھی ایک خاص وجہ تھی.....

انسان بھی کس قدر مجبور تھا ایک ہی فرد کے لیے محبت اور نفرت..... توبہ!

ہوا اب کوٹھے پر آہستہ آہستہ چلنے لگی تھی۔ یوکلپٹس کی وہ ڈالیاں جو اوپر والی منزل سے نظر آتی تھیں اب اس ہوا میں جھولنے لگیں اور گھڑاں کے قریب پڑے ہوئے موتیا کے پھول فرش پر بکھرتے گئے۔ سرہانے تلے سے گھڑی نکال کر

راحیلہ نے دیکھا۔ سوا چھ بجے تھے۔ اب تو اٹھ جانا چاہیے۔ لاہور کے لیے سامان باندھنا چاہیے..... ورنہ تو.....

ساجدہ ماں نے جائے نماز تہہ کیا۔ پھر سلیپر گھسیٹتی ہوئی برساتی میں چلی گئیں۔ پھر گیلری میں اترنے والی لکڑی کی بڑی سیڑھیوں پر ان کے قدموں کی آواز دیر تک آتی رہی۔

اسے اچانک ناصر بھائی یاد آ گئے..... ان کے قدموں کی آہٹیں دیر تک ان سیڑھیوں سے آتی رہی تھیں۔ وہ اظہر بھائی کے چچازاد بھائی تھے اور وہ تسنیم آپا کو سسرال لے جانے کے لیے آئے تھے۔ تسنیم آپا کی منجھلی نند کی شادی تھی اور ساس نے بہ اصرار بلایا تھا۔

ناصر بھائی کو دیکھ کر راحیلہ کا اپنا دل ڈول گیا۔ پورے کا پورا گریک دیوتا۔ دراز قد' وجیہہ اور اپنے اندر اپنے حسن کی تمازت سے سمٹا ہوا..... یوں لگتا تھا کہ وہ ہر بات میں ٹھہراؤ' شانتی اور پریم پیدا کرنے کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ خود راحیلہ کی زندگی آبشاری نہ رہی تھی..... تسنیم آپا کا تعطل بھی زیادہ دن قائم نہ رہ سکا۔ ناصر بھائی جی حضوری کے آداب صرف آپا تسنیم کے دربار میں استعمال کرتے تھے۔

اس روز تسنیم آپا مشین پر گگو کی قمیض سی رہی تھیں۔ راحیلہ تخت پوش پر بیٹھی گگو کے ساتھ لوڈو کھیل رہی تھی اور ناصر بھائی قالین پر اوندھے لیٹ کر مشین سے گری کترنوں کو سیدھا کرتے' رول بناتے' تہہ کرنے میں لگے تھے۔ ہر کترن وہ ایسے چھوتے جیسے اسے چوم رہے ہوں۔

"اچھا راحیلہ بیگم بتاؤ' جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو اپنی آپا تسنیم ہو گی کہ ساجدہ ماں جیسی؟"

یکدم راحیلہ غصے سے بولی..... "کیوں ناصر بھائی! کیا اب میں بڑی نہیں ہوں....."

"بہت بڑی ہو' بہت بڑی جناب عالی..... اپنی آپا سے بھی بڑی..... نادان تو یہاں بس ایک ہی شخص ہے۔"

مشین پر جھکا ہوا سر لحہ بھر کو اٹھا۔ تسنیم آپا نے ناصر بھائی کو دیکھا اور پھر اور بھی انہماک سے سینے میں مشغول ہو گئیں۔ ان کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا تھا۔

"اچھا بھئی یہ راحیلہ اور گگو تو میرے بچے ہیں..... میرے اپنے۔"

"ہم بچے وچے کوئی نہیں ہیں....." گگو اکڑ کر بولا۔

اس کی بات سن کر تسنیم مسکرا دی۔ اچانک نکل آنے والی قوس قزح کی طرح تسنیم کی مسکراہٹ بڑی دلفریب تھی۔ اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ ناصر بھائی پر ڈالی اور نگاہیں جھکا لیں۔ ان نظروں میں عجیب قسم کی کیفیت تھی..... پسندیدگی' خوف اور اضطراب سب کچھ ملا جلا سب کچھ اکٹھا..... راحیلہ کو پہلی بار تسنیم آپا اچھی لگیں۔ اسے اسی لمحہ یہ بھول گیا کہ وہ تسنیم آپا سے سدا بہار چڑتی رہی ہے.....

کترنوں کو ایک دوسرے پر رکھ کر ناصر بھائی کہنیوں کے بل ہو گئے..... "تو پھر کسی طرح بھی سسرال نہیں چلو گی.....؟ میرے ساتھ۔"

"نہیں....."

"شاید تمہیں اپنے سسرال والوں پر اعتبار نہیں..... ہے ناں؟"

ناصر بھائی کو بھول گیا کہ راحیلہ اور نگو اب لوڈو نہیں کھیل رہے تھے۔

"اعتبار؟.....شاید اتنا اعتبار تو میں اپنے آپ پر بھی نہیں کرتی....."

یہ جملہ سسرال والوں کے لیے نہیں تھا۔ اسی لیے پشیمان سی ہو کر تسنیم آپا نے کام ادھورا چھوڑ دیا اور جلدی سے اندر چلی گئیں۔

ناصر بھائی نے ان کے دوپٹے کو پکڑنا چاہا۔ پھر ہوا میں ہاتھ سا چلا کر رہ گئے۔

مردانہ حسن اور اس پر طبیعت کی نرمی۔

چلبلا پن اور ایسی گھمبیرتا۔

وہ تو ان گنت متضاد عناصر کے مناسب میل سے بنا ہوا دیوتا تھا۔ ناصر تو بیک وقت بھائی' باپ' خاوند اور عاشق سبھی کچھ ہو سکتا تھا۔ راحیلہ نے سوچا کیا وہ ایسے کر سکتی تھی.....کیا وہ ناصر بھائی کا دل توڑ سکتی تھی۔

ان دنوں تسنیم آپا کے لیے کئی رشتے آئے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کی بیوگی اور بچہ کسی کے لیے بار ہی نہیں لیکن تسنیم آپا رو رو کر کہتی....."ساجدہ ماں! مجھے معاف کیجیے۔ میرا دل نہیں مانتا.....ابھی۔"

تسنیم کے آنسو دیکھ کر رشتہ بڑے ادب اور خاموشی کے ساتھ لوٹا دیا جاتا۔ ان دنوں راحیلہ سوچا کرتی کہ آخر اس بیوہ عورت نما لڑکی کو لوگ اس قدر کیوں چاہتے ہیں۔ اس کا اپنا حسد نہ تو تسنیم کا رنگ روپ دیکھنے دیتا' نہ ہی اسے سمجھ آتی کہ اس زمانے میں باحیا' صابر شاکر راضی برضا رہنے والی لڑکیاں ان ووگ تھیں۔ لوگ ہرنیوں سی' کم بولنے والی سر جھکانے اور دوپٹہ سر پر اوڑھنے والی لڑکیوں کو سینت سینت کر لاکروں میں بند کر کے اپنے نام کی مہر سے داغ کر رکھنا چاہتے تھے.....راحیلہ اس اعتبار سے ماڈرن تھی کہ وہ اپنے دماغ سے کام لیتی اور اپنی سوچ پر اندر ہی اندر شرمندہ نہ ہوتی۔ اسے کبھی اس منطق کی سمجھ نہ آئی کہ جب اظہر بھائی دوسرے جہاں چلے گئے ہیں اور کبھی آ نہیں سکتے تو ان کی یاد سے اس قدر چمٹ کر رہنا بھی کہاں کی عقلمندی ہے۔

کیا میں ایسے کر سکتی تھی؟

کیا شاہد.....کیا شاہد کے نہ ہوتے ہوئے میں صرف خواب کے سہارے زندہ رہ سکتی تھی؟ راحیلہ نے کروٹ لی۔ اب چھت پر اس کے سوائے کوئی نہ تھا۔ راحیلہ اور نگو نیچے جا چکے تھے۔ دادا ابراہیم کی چار پائی بھی خالی تھی اور مسہری اوپر ٹنگی تھی۔ سورج یوکلپٹس کی چھدری شاخوں میں اپنی سرخ روشنی چھوڑ رہا تھا۔

اسے وہ دن یاد آ گیا جب اچانک اس کا سارا غصہ' حسد' نفرت محبت میں بدل گئے اور وہ تسنیم آپا کی ہاتھ باندھی غلام ہو گئی۔ وہ برساتی کے کونے میں دری بچھا کر پڑ رہی تھی۔ تسنیم آپا شاید ناصر بھائی سے بھاگ کر اوپر آ گئی تھیں اور الانی چار پائی پر بے یار و مددگار بیٹھ کر لمبی لمبی آہیں بھرنے لگی تھیں۔ انہیں علم نہ تھا کہ راحیلہ کونے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ناصر بھائی اوپر برساتی میں آ گئے۔ وہ بھی اپنے جذبات میں کچھ ایسے کھوئے ہوئے تھے کہ انہوں نے راحیلہ کو نہ دیکھا۔

ناصر کو دیکھ کر تسنیم آپا کھڑی ہو گئیں۔

دونوں کی پیٹھ اس کی طرف تھی۔

''تو تمہارا پکا ارادہ ہے کہ تم میرے ساتھ نہیں چلو گی؟.....''

''میں جا نہیں سکتی ناصر..... مجھے ڈر ہے کہ..... کہیں کچھ ہو جائے گا.....''

''مثلاً کیا؟..... زیادہ سے زیادہ بیوہ کا نکاح ہو جائے گا..... یہ تو تمہارے مذہب میں بھی جائز ہے.....'' ناصر نے قریباً جھڑک کر کہا.....

''ناصر تم مجھ سے خفا ہو گئے ہو..... لیکن مرنے والے کو خدا بخشے' میں اس سے قول ہارے بیٹھی ہوں۔'' راحیلہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

تسنیم آپا کی ساری خاموشی' رعونت' خود اعتمادی پرانے لباس کی طرح فرش پر پڑی تھی۔ وہ ڈرتی کانپتی سہارے کی متلاشی ہوتے ہوئے بھی اسی سہارے سے گریزاں تھی۔ سہارے کے بازو اسے ساتھ لپٹانے کے لیے ترس رہے تھے لیکن اظہر بھائی کے ساتھ کیا ہوا' وعدہ زندہ تھا اور وہ مہارانی سیتا کی طرح جھونپڑی کے باہر لگی ہوئی لکیر کو پار نہ کر سکتی تھی..... پہلی بار راحیلہ حیران رہ گئی۔ اوما نے اسے مہارانی سیتا کی کہانی سنائی تھی۔ جب راجہ رام چندر' لکشمن جی اور مہارانی سیتا بن باس کو سدھارے تو رام چندر جی جب بھی باہر جاتے جھونپڑی کے باہر ایک لکیر کھینچ جاتے۔

سیتا جی کے لیے یہ باؤنڈری لائن تھی۔ لائن کی سرحد عافیت کا امر کوٹ تھا۔ باہر آفات تھیں۔ خوف و ملال کے ریلے تھے لیکن جب راون فقیر کا بھیس بدل کر آیا اور سیتا جی سے دکشنا مانگی۔ مہارانی سیتا خیرات لے کر آگے بڑھیں تو راون نے اصرار کیا کہ وہ جھونپڑی کے آگے لگی ہوئی حد سے باہر نکل کر دکشنا دیں۔ رانی جی پہلے تو مہاراجہ رام چندر کی لگائی ہوئی لائن کو کراس کرتے ہوئے ہچکچائیں۔ پھر سوچا فقیر کہیں سراپ ہی نہ دے اور ہم تینوں پہلے ہی بن باس جھیل رہے ہیں اور درگھٹنائیں ہمارے مستک میں نہ لکھی جائیں۔ بیچاری مہارانی بددعا کے خوف سے سیفٹی لائن کراس کر گئی تو راون جو ملنگ بنا ہوا تھا' فوراً آگے بڑھا۔ دیوی کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور لنکا کا راجہ لنکا کوٹ سدھارا۔ جب رام جی اور لکشمن جی واپس لوٹے تو ماتھا ٹھنکا۔ جان گئے کہ پتنی نے حکم نہ مانا اور سیتا نے لائن کراس کی۔

راحیلہ نے سوچا آپا تسنیم کی طرح مرے ہوئے شوہر کے ساتھ وعدے کی لکیر کے اندر رہنا زیادہ کٹھن کام ہے کہ وعدہ توڑ کر اپنی خوشی کو حاصل کرنا اور احساس جرم میں مرتے رہنا مشکل ہے۔ راحیلہ نے سوچا..... کیا میں ایسا کر سکوں؟..... کیا یہ انکار کرنا آسان ہے۔

ناصر بھائی اپنے جملوں میں ٹھہراؤ پیدا کر کے بولے..... ''تم سمجھتی ہو کہ تمہیں صرف اظہر نے چاہا' صرف اسی نے تم سے وعدے لیے۔ تمہارا خیال ہے جس محبت پر خاموشی کی مہر ہوتی ہے' وہاں نباہ کے وعدے نہیں ہوتے۔ یوں گم سم کیوں کھڑی ہو۔ تمہارے دل میں میرے لیے تھوڑی سی جگہ بھی نہیں؟ بولو تسنیم..... چلو انکار میں ہی سر ہلا دو..... جواب تو دو۔''

تسنیم نے منہ موڑ لیا اور دھیرے سے بولی..... ''تم اس سوال کا جواب جانتے ہو ناصر۔ پھر یہ اصرار کیوں.....؟''

اب ناصر بھائی بات میں ٹھہراؤ پیدا کرنا بھول گئے..... ''اصرار کیوں نہ کروں' کیسے نہ کروں؟ تمہیں زندگی کی حرارت سے زیادہ قبر کی سرد لاش کا خیال ہے..... تمہیں یہ علم ہی نہیں کہ جانے والے سے وفا کر کے تم ایک جیتے جاگتے انسان کو مردہ بنا دو گی..... بولو اس جیتے جاگتے لاشے کا بوجھ برداشت کر لو گی..... ایسی بے احساسی کیوں تسنیم..... کیوں؟ کیا بیوہ کے نکاح کا حکم نہیں آیا.....''

تسنیم نے سسکی بھری آواز میں کہا..... ''میں نے اظہر سے وعدہ کیا تھا ناصر.....''

''کہ میں تمہاری خاطر..... ناصر کا خون کر دوں گی..... اظہر بھائی تو اتنے سخت دل نہ تھے..... وہ..... اگر زندہ ہوتے تو..... تو میرے حق میں..... میں کیا کہوں اور کیسے کہوں.....''

''امی کو سلام کہنا اور معافی مانگنا' میں فرخندہ کی شادی میں شریک نہ ہو سکی۔''

''تو میں سمجھوں کہ..... کہ..... کہ.....''

''ہاں..... میرا انکار واضح ہے۔''

پھر ناصر بھائی کے تھکے ہارے بول فضا میں تیرے..... کسی بیوہ کی آدھی رات کی سسکیاں فضا میں بلند ہو گئیں۔

ناصر بھائی نے تسنیم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا..... ''سنو..... ایک وعدہ میرے ساتھ بھی کر لو..... وعدہ کرو..... مجھے یاد رکھو گی.....''

ناصر بھائی دھتکارے ہوئے فقیر کی طرح سیڑھیوں کی طرف چلے گئے۔ پھر ان کے قدموں کی آواز لکڑیوں کی سیڑھیوں سے آتی رہی۔

تسنیم چند قدم پیچھے گئی اور پھر پشیمان و خجل وہیں ڈھیر ہو کر بیٹھ رہی۔ اس کی سسکیوں کی آواز نے راحیلہ کو اتنا ڈرا دیا کہ اس نے اٹھ کر تسنیم کو چپ کرانے کی جرأت بھی نہ کی۔

اسی وقت راحیلہ کی ساری نفرت' چڑ' حسد بھسم ہو گیا۔ اس کے بعد وہ عمر کے تفاوت کے باوجود تسنیم آپا اور ننگو کا دم چھلا بنتی گئی۔ تسنیم آپا اب بہن سے عزیز اور سہیلی سے زیادہ راز داں تھیں.....

تسنیم اچانک راحیلہ کا آدرش بن گئی تھی!

عورتیں اب بھی تسنیم پر ریجھ جاتی تھیں۔ رشتے بھی چلے آتے تھے۔ رشتہ آنے پر تسنیم کہتی..... ''ساجدہ چچی! اب میری فکر چھوڑ دیجئے' یہ جو اونٹ گھر باندھ رکھا ہے اس کے لیے گھر تلاش کیجیے..... میرا دولہا تو ننگو میاں ہے..... کیوں ننگو.....''

ننگو جھینپا شرمیلا اپنی کتاب پر جھک کر کہتا ''مجھے شادی نہیں کرانا..... میں ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گا.....''

ساجدہ وہاں آہ بھر کر کہتیں..... ''میں کب تک تیرا ساتھ دوں گی..... اوپر سے حالات تو دیکھ' رات کو تو بلوائیوں کے شور سے دل دہل جاتا ہے۔ تم دونوں اپنے اپنے گھر جاؤ تو میں بھی چین کی نیند سوؤں.....''

عجیب پژمردگی کے ساتھ تسنیم کہتی..... ''میرا کیا ہے ساجدہ چچی..... میں بھلا کب تک جیتی رہوں گی۔ اگر جی بھی گئی تو ننگو کچھ کر کرا ہی لے گا۔ کیوں ننگو چندے؟''

رات گئے جب تسنیم کے بازو پر راحیلہ کا سر تھا تو اچانک دونوں کی آنکھ کھل گئی تھی۔ پورا چاند یوکلپٹس کے اونچے درختوں کے پاس جگمگا رہا تھا۔

''آپ نے...... یعنی میں پوچھنا چاہتی ہوں آپ شادی کیوں نہیں کرا لیتیں تسنیم باجی......''

''کس سے شادی کروں؟ جب ناصر جیسے آدمی سے نہ کرائی تو...... تو...... پھر اور کس سے کرانی ہے......''

راحیلہ نے جلدی سے سر اٹھا کر دیکھا۔ تسنیم آپا کی آنکھوں سے جھلار بہہ رہی تھی۔

راحیلہ سوچنے لگی...... ''یہ عورت ہے کہ پتھر کی مورت۔ انسان ہے کہ فقط آدرش...... کیا تسنیم کے لیے ہر خوشی صرف غم سے پیدا ہوگی۔ اس کی خوشی لغزش پر قابو پانا ہی ہے......؟ دھوپ اب خوب چڑھ آئی تھی۔ گیلری کی سیڑھیوں پر قدموں کا شور ہوا۔ پھر تسنیم آپا نے دروازے سے جھانک کر کہا...... ''ابھی لیٹی ہوئی ہے اور سارا سامان باندھنا ہے۔ میں سب جانتی ہوں جس دن سے تیری بات شاہد سے پکی ہوئی ہے' رات گئے سوتی ہے اور منہ اندھیرے اٹھتی ہے۔ نہ عشاء کی نماز نہ فجر کی...... بھلا کیا میں نہیں جانتی سارا وقت کیا سوچتی ہے تو......؟''

''بھلا کیا......'' تجاہلِ عارفانہ سے راحیلہ بولی۔

اس وقت نیچے سے ساجدہ ماں نے آواز دی...... ''اب اٹھ جاؤ...... لڑکیو! چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے...... اور یہ دھوبی کب کا آیا بیٹھا ہے......''

☆☆☆

کالج پہنچ کر راحیلہ نے اندازہ لگایا کہ ایک سال تو وہ فیل ہوئی' دوسرا سارا سال اس نے گھر بیٹھ کر شاہد کی نذر کیا۔ اس لحاظ سے اوما کو اس سے دو سال آگے ہونا چاہیے۔ تھرڈ ایئر کی کئی لڑکیوں سے اس نے اوما کسم نالنی کے متعلق پوچھا لیکن اوما کا اتہ پتہ نہ ملا۔ پھر یہ خیال آیا کہ یہی ایک کالج تو سارے لاہور میں نہیں ہے اور بھی کئی درسگاہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے اوما اس کالج کی طالب علم ہی نہ ہو۔ فرسٹ ایئر کی راحیلہ کو نئے ماحول نے مایوس بھی کیا اور دلگیر بھی۔ وہ ہر دروازے' برآمدے' لان پر اوما کو تلاش کرتی رہی۔

یہ کالج نہر کے قریب اور شہر سے دور تھا۔ ان دنوں نہر کے پار اجاڑ تھا۔ مال روڈ پر تانگے چلتے تھے۔ خاندانی لوگ رئیسی تانگوں میں شام کے وقت نہر کے ساتھ ساتھ ہواخوری کو نکلتے۔ پونٹیک' فورڈ اور وولز لے گاڑیاں فیشن میں تھیں۔ منی مائز چھوٹی کار تھی اور لوگ اسے نو دولتیے لوگوں کی کار سمجھتے تھے۔ فلم دیکھنا تفریح کی انتہا تھی۔ ابھی شادیاں برادریوں میں اور سادگی سے ہوتی تھیں۔ ہوٹلوں میں یا مغلیہ انداز کے شامیانے لگا کر مہندی اور شادی کی رسومات تک کسی کا تصور بھی نہ پہنچا تھا۔ لٹھے کی شلوار اور چنا ہوا دوپٹہ جدید فیشن تھا جو امیر اور غریب سب کی پہنچ میں تھا۔ عام تقریبات میں لڑکیاں میک اپ سے عاری نظر آتی تھیں۔ نیل کی جوتیاں صرف دیدہ دلیری پہنتی تھیں۔ دو چوٹیاں عام تھیں۔ لڑکیاں ناول اور شاعری کی کتابیں چوری چوری پڑھتی تھیں اور یہ دور شفیق الرحمٰن' جذبی' ندیم کا تھا۔ نوجوان تعلیم یافتہ کافی ہاؤس میں جاتے اور روسی لٹریچر سے شغف رکھتے۔ اپنے آپ کو کمیونسٹ ظاہر کرنے میں فخر محسوس کرتے۔ پینٹ لیدر کے دور تنگے جوتے' لکیر والی پتلونیں' مفلر جیسی رومال اور ریشمی قمیض پہنتے۔ سائیکل عام نوجوان کی پسندیدہ سواری تھی۔ پھر بھی کبھی اس سائیکل کے کریز

پر چنٹ والے دوپٹے اور لیمے کی شلوار پہنے کوئی لڑکی نظر آ جاتی تو چرچا زیادہ نہ ہوتا کیونکہ پڑھی لکھی آزاد لڑکی اور گھر میں رہنے والی لڑکی کے درمیان زیادہ تقابل نہ تھا۔ دونوں اپنے اپنے حال میں مست تھیں۔ آزادی کی قیمت صرف اینگلو انڈین اور عیسائی لڑکی ادا کرتی تھی۔ ابھی ٹیلی ویژن' ایئر ریل' وی سی آر' ڈش سے لوگ نا آشنا تھے۔ انٹرنیٹ' سوفٹ ویئر' ہوائی ڈاک' ویڈیو گیمز' کمپیوٹر' مائیکرو اوون' ریفریجریٹرز' ڈیپ فریزر ایجاد بھی نہ ہوئے تھے۔ سب معمولی گارڈن فین لگا کر صحن یا چھت پر تاروں تلے سوتے تھے۔ ایئر کنڈیشنر کی ٹھنڈی ہوا سے لوگ ناواقف تھے۔ گھروں پر کھانا پینا سادہ تھا۔ سوائے کشمیری گھرانوں کے ہمالیہ کی ترائی میں رہنے والے عام طور پر رات کو دال چاول کھا کر خوش رہتے۔ ہوٹلوں میں فیملی کو لے جانے کا رواج نہ تھا۔ بچوں کو زیادہ لاڈ پیار سے پالنے کی ریت نہ تھی۔ نہ ہی ان کی تعلیم کے لیے قیمتی سکول تھے۔ مشنری کالجوں سکولوں میں پڑھنے والوں کو عام سوسائٹی حقارت کی نظر سے دیکھتی۔ کلاشنکوف' فنڈ منگلسٹ' Terrorist' ہیومن رائٹس ابھی گفتگو کا حصہ نہ بنے تھے۔ کہیں قتل ہو جاتا تو واقعی لوگ آنسوؤں سے روتے۔ چوری' ڈاکے' ریپ' اغوا' اخباروں کی زیبائش نہ تھے۔ لوگ غیبت' سکینڈل اور سیاسی گفتگو کو تفریح نہ سمجھتے تھے۔ کہیں مہنگائی کا چرچا نہ تھا۔ سیاسی لیڈروں کو لوگ پوجتے تھے اور ان کے کہے کو سچ جانتے تھے۔ ٹریفک کا کوئی مسئلہ بھی جنم نہ لے سکا۔ مال روڈ پر بھی تانگے چلتے تھے۔ شہر میں بھینسوں کے گروہ' بکریوں کے ٹولے پھرتے تھے۔ سردیوں میں گھروں سے دھنکیے کی روئی دھنکنے کی آواز آتی تھی اور گلیوں میں چوڑیاں بیچنے والیاں آوازیں دیتیں۔

لیکن خلفشار' انتشار اور بغض' نفرت' تعصب اور وحشت کے زمانے سے انسان کے ساتھ چلے آتے تھے۔ یوں لگتا ہے کہ اگر انسان کا سارا تانا بانا نیکی کا ہے تو منفی خصوصیات خمیر کی طرح ہیں۔ تھوڑی سی تخمیر سے پورا آٹا پھول جاتا ہے..... برصغیر کے ہندو مسلم' سکھ عیسائی بظاہر ہاتھ پکڑے "پھولوں میں ہم آتے ہیں" کھیل رہے تھے۔ سطح پر رہن سہن میں ابھی میل ملاقات میں جھڑپیں نہ تھیں..... لیکن آٹا پھول رہا تھا۔ تحریکیں پانی کی سطح سے نیچے جوار بھاٹے کی شکل میں ابھر رہی تھیں۔ ہندو آبادی کبھی یہ نہ بھولی تھی کہ محمد بن قاسم فاتح تھا۔ اسے مغل بادشاہوں کا ایک ہی روپ یاد تھا اور وہ حملہ آوروں کا تھا۔ نادر شاہ کے حملے' احمد شاہ ابدالی کی یورش' محمود غزنوی کے سترہ حملے ان کے دلوں پر کندہ تھے۔ انہوں نے کبھی ایک لمحہ بھی ٹھنڈے دل سے نہ سوچا تھا کہ مسلمان بادشاہوں نے آمر ہونے کے باوجود کبھی کسی ہندو کو جبراً مسلمان نہ کیا۔ نہ سپین میں نہ ہندوستان میں..... انہوں نے تو اس درجہ ایمان کی عزت کی تھی کہ وقتاً فوقتاً ہندوؤں کو جزیہ ادا کرنے پر مجبور کر کے ان کے حقوق متعین کر دیے تھے۔ اور تو اور مغلیہ بادشاہوں نے راجپوت رانیاں بیاہ کر بھی انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا..... ہندوستان میں جتنے مسلمان بادشاہ ہوئے اگر وقتاً فوقتاً وہ ظلم سے نہیں سخاوت ہی سے اسلام کی اشاعت کرتے تو سارا ہندوستان کبھی کا مسلمان ہو چکتا۔ یہاں آ کر ہر مسلمان اپنی حدود کے اندر رہنے پر مجبور ہو جاتا تھا نہ جانے کیوں؟..... وہ جو شراب پیتے' زنا کے مرتکب ہوتے' سود خوری کا شیوہ پالتے..... کبھی اسلام پیش کرتے وقت جبر کے مرتکب نہ ہوئے' کسی مسلمان بادشاہ نے کسی غیر مسلم کی گردن پر تلوار رکھ کر یہ اصرار نہ کیا کہ کلمہ پڑھ اور مسلمان ہو جا..... ہاں تلوار سونت کر اپنی سلطنت بڑھائی' دولت اکٹھی کی۔ اپنی آمریت کو اور بے لگام کیا..... کیونکہ وہ انسان تھے اور خمیروں میں سب سے بڑا خمیر حرص ہے.....

ادھر ہندو کو مسلمان ہمیشہ بن بلایا مہمان لگا۔ ادھر تخت و تاج گنوا کر مسلمان احساس کمتری کا شکار ہو گئے۔۔۔۔۔ دینی رہنما اس میں فلاح چاہتے تھے کہ مسلمان اتنے بڑے ہندو سمندر میں اپنی شناخت قائم رکھ سکیں۔۔۔۔ کچھ سرسید جیسے ترقی پسند دیکھتے تھے کہ جنگ آزادی کے بعد ہندو اور انگریز ایک پارٹی بن چکے ہیں۔ ہندو بڑھ چڑھ کر انگریز کی جی حضوری اس کی خوشامد کا انداز اپنا رہے تھے۔ ادھر مسلمانوں کو ہر طور جاہل' احمق' وقت ناشناس سمجھنے اور سمجھانے میں کوئی ایسی دقت پیش نہ آ رہی تھی۔ مشنری کالجوں میں ہندو آبادی جوق در جوق داخلے لے رہی تھی۔ آگے چل کر وہ اسی تعلیم کو تلوار کی طرح استعمال کرنے والے تھے دمسلمان کلچر کو اسلام سمجھ کر اپنے خود ساختہ کلچر کو سینے سے لگائے نہ تو مشنری تعلیم حاصل کر رہے تھے نہ دینی۔ انہیں تو اس درجہ احساس کمتری رہنے لگا تھا کہ وہ اپنے اسلاف پر بھی خود نکتہ چینی کرنے پر مجبور تھے۔۔۔۔ ایسے میں اسلامی تحریکیں فیل ہونے پر مجبور تھیں۔ بنیادوں میں پانی بھرا تھا۔ عمارت کہاں کھڑی رہتی۔ ایسے میں مسلم لیگ کو نہ جانے کہاں سے مضبوطی حاصل ہو گئی یا یوں سمجھ لیں جب قوم کی نیت ٹھیک ہو اور وہ اپنے لیے کچھ نہ کر سکے تو اسے لیڈر مل جایا کرتا ہے۔۔۔۔ راحیلہ بھی بودی تھی' اچانک اسے کالج میں داخل ہونے کا آرڈر ملا تو وہ گھبرا گئی۔ پھر ایک تسلی تھی کہ شاید اوما بھی اسی مشنری کالج میں ہو۔

راحیلہ کو کالج میں یہ دسواں دن تھا۔ اس کے ساتھ کی کئی فریش مین کالج میں حیرت زدہ پھرتی تھیں۔ لیکن اوما کسم نالنی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ راحیلہ کو ویسے تو پڑھنے کی عادت نہ تھی لیکن دوسروں کی دیکھا دیکھی وہ بھی لائبریری میں گئی اور ایک میز پر اخبار کھول کر پڑھنے لگی۔ سارے اخبار سیاسی جاگرتی کی خبروں سے بھرے تھے۔ یونینسٹ پارٹی' ماسٹر تارا سنگھ' نہرو گاندھی اور قائداعظم جیسے جاگتے لیڈر تھے جو اپنی اپنی بصیرت کے مطابق نیم مردہ قوموں کو جگانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ لائبریری سے باہر برآمدے میں مس بھٹناگر سے چند لڑکیاں باتیں کر رہی تھیں۔ گو ان کی آوازیں نیچی تھیں لیکن لائبریری میں آئرش مس والکر بار بار قہر آلود نظروں سے اس جمگھٹ کو دیکھ رہی تھی۔ مس بھٹناگر کی وجہ سے ابھی اس نے اس گروہ کو تتر بتر نہ کیا لیکن مس والکر بے انتہا منتظم تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ لائبریری کی لمبی میزوں پر بڑے تمکنت کے ساتھ مجلد دبیز کتابوں پر جھکی فورتھ ایئر کی لڑکیاں پڑھ رہی تھیں۔ لڑکیوں کے چہرے اور کتابوں کے اٹھے ہوئے حصے میزوں کی لشکتی شفاف سطحوں پر منعکس ہو رہے تھے۔ کچھ طالبات لمبی الماریاں کھولتے کتابیں نکالے ٹھونگا ٹھونگی میں مصروف تھیں۔

دراصل مس والکر ڈسپلن کے معاملے میں پہلے جتنی سخت نہ رہی تھیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے اس نے سرتیج بہادر سپرو کے خاندان کی ایک لڑکی کو خاصی بری طرح ڈانٹ دیا تھا جس کی وجہ سے کئی مہینے پرنسپل صاحب اس کے پیچھے پڑی رہی تھیں۔

برآمدے میں کون جانے کتنی لڑکیاں مہا سبھائی تھیں' کس کس کا تعلق سر سکندر حیات کی فیملی سے تھا۔ کون کانگریسی ریفرنس رکھتی تھی۔ ایک لڑکی کو تو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اس کے والد وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے۔ انگریز اب بھی ہندوستان کے حاکم تھے لیکن ان کی پالیسی بدل چکی تھی۔ جہاں بھی وہ گستاخی بغاوت اور طاقت کو ابھرتا دیکھتے جھٹ کنی کترا جاتے جیسے گاندھی جی۔ جب بھی کوئی سمجھوتہ کرنے نکلتے ہمیشہ کہتے بھئی میں تو کانگریس کا چار آنے کا

بھی ممبر نہیں۔ میں اپنی حیثیت میں آیا ہوں۔ مس والکر کبھی کبھی پنسل سے میز بجا دیتی اور ناخوشگوار چہرہ بنا کر سر کرسی سے لگا کر بیٹھ جاتی۔

مس بھٹناگر پڑھاتی کم اور عشق زیادہ تھی۔ وہ اپنی کم علمی کو جدید کٹ کے کپڑوں اور رنگ برنگی جدت میں چھپا لینے کی کوشش کرتی۔ فرسٹ ایئر کی ان گھڑ بدتمیز اور برخود غلط لڑکیوں کا جمگھٹا سب سے زیادہ ان ہی کے گرد ہوتا۔

برآمدے میں پھر ایک دبا دبا قہقہہ ابھرا۔

ایک بی اے کی طالب علم نے کتاب سر سے اٹھا کر ساتھ والی سے کہا "مس بھٹناگر Again popularity حاصل کرنے کے پرانے حربے....."

"ہائے بیچاری....."

مس والکر نے پھر پنسل میز پر کھٹکائی۔ برآمدے کا گروہ disperse نہ ہوا۔ اسی گروہ میں نو وارد راحیلہ بھی تھی۔ وہ اوما کو تلاش کرنے ادھر آئی تھی۔

"مس بھٹناگر پلیز ہمیں پکچرز لے چلیں۔" ہیڈی لیمار جیسی لڑکی نے کہا۔

"شی شی..... آہستہ بولو لڑکیاں ڈسٹرب ہوتی ہیں۔"

اس موقع کا فائدہ اٹھا کر ایک لڑکی نے اپنا چہرہ مس بھٹناگر کے کان سے ملا کر کہا۔

"ہائے جی پلیز لے چلیں ناں..... بسنت لگی ہوئی ہے....."

"اچھا بھئی لے چلوں گی' لے چلوں گی Now go to your classes۔"

"تم کچھ کھوئی کھوئی لگتی ہو۔ راحیلہ....."

"جی ٹھیک ہوں..... اب۔"

"واوا..... اب۔"

ساری لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس دیں۔

"مائی گڈ گرلز..... فورتھ ایئر کا سنڈی پیریڈ ہے..... کالج پسند آیا تمہیں راحیلہ۔" مس بھٹناگر نے سوال کیا۔

"جی بہت۔"

"اور کالج..... ہمارا کالج بہت پرانی traditions کا ہے۔ مدراس' سیلون' برما سے بھی لڑکیاں یہاں پڑھنے آتی ہیں....."

ایک منہ چڑھی لڑکی نے برا سا منہ بنا کر کہا..... "لیجیے ہمیں تو آپ پوچھتی ہی نہیں ہیں مس بھٹناگر۔" اس ریمارک پر مس بھٹناگر نے ایک چنچل اور مسکراہٹ اسے بطور تاوان پیش کرتے ہوئے کہا..... "گو آن سرلا..... تم جانتی ہو میرا فیورٹ کون ہے۔"

ان کی بے معنی با معنی سرسری باتوں کے تسلسل کو اکیڈیمک گھنٹی نے توڑا۔ فضا میں ایک عجیب قسم کی ہلچل پھیل گئی۔ لڑکیاں' سٹاف ممبر کمروں سے نکل کر لمبے برآمدے میں پھوٹ بہیں۔ متعدد رنگین جھرنے آپس میں ملنے لگے۔

رنگین اوڑھنیاں' کاٹن کی ساڑھیاں ساڑھیوں سے جا ملیں۔ کٹے بال لمبی چوٹیوں کے قریب آ گئے۔ کالج کی لڑکیاں گروہوں میں بٹ گئیں۔ فرفر انگریزی بولنے والیاں علیحدہ ہو گئیں۔ جو لڑکیاں "اردو بولو" کے سلوگن کے تحت اردو پر جان چھڑکتی تھیں وہ گروہ بنا کر کھڑی ہو گئیں۔ فرسٹ ایئر کی خفت تاب اپنی شناخت کی تلاش میں جماعت کی صورت میں آپس میں باتیں کرنے لگیں۔

مس بھٹناگر یکدم گھنٹی کی آواز پر خفیف ہو کر سٹاف روم کی طرف چل دی۔ ان کی تین انچ کی ہیل پر ان کا پتلی سا جسم اور گھڑے جیسے Hips ڈولتے چلے گئے۔ مس بھٹناگر کا سایہ آگے بڑھتا گیا اور پلو لہرا لہرا کر سولانگ..... سولانگ کہتا رہتا۔ کالج کی حیرت زدگیوں میں مس بھٹناگر نے فرسٹ ایئر پر جادو کر دیا تھا۔

ان کے جاتے ہی مقفل سے آئی ہوئی کئی لڑکیوں کے دیپ بجھ گئے۔ ان میں سے ایک راحیلہ بھی تھی۔ ابھی تک اسے اپنی کلاس کی صرف ایک لڑکی پسند آئی تھی۔ کھدر کا شلوار قمیض اور کھدر کی چادر اوڑھنے والی یہ سکھ لڑکی خاموش طبع' بچی اور دراز قد تھی۔ اس نے کالج کی نہ تو کسی بات کی تعریف کی تھی نہ مذمت..... وہ بس اس ماحول میں اپنے Resources کے ساتھ جگہ بنانے میں مشغول تھی۔ اسے نہ تو کسی پر کوئی Impression ڈالنے کی ضرورت تھی نہ ہی کسی کا تاثر لینے کی.....!

راحیلہ اور ورشن موتیا کی جھاڑیوں کے قریب جا کر رک گئیں۔ ڈرائنگ روم ایک برآمدہ بھر دور تھا۔

"پتہ نہیں یہ وارڈن صاحب کیا کرتی ہیں۔ روز کھانا لیٹ ہوتا ہے اور عین کھانے کے بعد ہماری ہسٹری کی کلاس ہوتی ہے۔"

حیا کیا چیز ہے۔ جھجک کس طرح جنم لیتی ہے۔ دوسرے انسان کا حقیقت جان لینا کتنا بڑا عذاب بن سکتا ہے۔ وہ سوچتی رہی اور دریچے سے پرے دوسرا کر ورشن کو کیاری بھر منظر بھی نہ دکھا سکی۔

کھانے کے ہال سے کھانے کی خوشبو اٹھ رہی تھی اور ان دونوں کو بہت بھوک لگی تھی۔ وہ پورچ کے تھڑے پر بیٹھ کر چنبیلی کے پتے توڑ توڑ کر مسلنے لگیں.....

"کیا سوچ رہی ہو ورشن؟....." راحیلہ نے سوال کیا۔

"کچھ نہیں....."

"پھر بھی....."

"اس پھر بھی کی کوئی تفصیل....."

ورشن مسکرا کر خاموش ہو گئی اور دونوں خاموش ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد ورشن نے پوچھا۔

"کیوں بھئی کیا سوچتی ہو؟....."

"کچھ نہیں....."

"پھر بھی....."

راحیلہ نے سر جھکا لیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس بار پھر شاہد بلاوجہ خفا ہو گیا۔ اب شاید کئی ہفتے وہ ملاقاتوں کے

بیرکاروں آباد کردیا ہے

اوقات میں اسے ملنے نہ آئے۔ اس نے پچھلے ہفتے صرف اتنا کہا..... ''آپ کے ساتھ عابی نظر نہیں آئی.....!!''

شاہد نے منہ تھتھا کر کہا..... ''تم مجھے اور عابدہ کو لازم و ملزوم کیوں سمجھتی ہو؟''

''بس ہیں جو.....''

یکدم شاہد کو نہ جانے کیا ہوگیا۔ وہ تیزی سے بولا۔ ''تو اچھا ہم ان ہی کے پاس جاتے ہیں۔'' بغیر سلام کیے سائیکل چلا کالج کا پھاٹک عبور کرگیا۔ صرف ایک جملہ اس کے پہیوں کی سپوکوں کی طرح گھومتا رہا۔

''تو پھر ہم عابدہ ہی کے پاس جاتے ہیں۔''

راحیلہ اس شاہد کے متعلق سوچ رہی تھی جو بات برداشت ہی نہ کرسکتا تھا۔

''پھر بھی..... '' ورشن نے دوسری مرتبہ پوچھا۔ بتادوں؟ یا چپ رہوں؟ بچپن کی باتیں' اوما' شوکت بھیا' روی' سریندر..... اور پچھلے سال بھر سے شاہد اور اس کی ناراضگیاں کیا سب کچھ بتادوں؟..... کیا انسان برہنہ ہونے کا عمل بار بار کر سکتا ہے۔ کیا برہنگی ہمیشہ قربت کا باعث ہوتی ہے وہ چاہے جسمانی ہو یا روحی؟ کیا خیال کی برہنگی جسم کے برہنہ پن سے مشکل ہے۔

ڈائننگ ہال میں دوپہر کے کھانے کی گھنٹی بجی..... راحیلہ نے غور سے لڑکیوں کو دیکھا..... شاید کہیں اوما ہو۔ اس نے دل میں سوچا' آج شام میں وارڈن صاحب کے پاس جاکر اوما کے متعلق ضرور پوچھوں گی..... شاید وہ اسی کالج میں ہو۔ وہ بھی کتنی بے وقوف تھی' کالج آنے سے پہلے نہ تو کالج کا نام پتہ کرسکی' نہ اوما کو خط ہی لکھنے پائی۔ یہی تو باتیں تھیں جن کی وجہ سے وہ دسویں میں فیل ہوئی تھی۔ اس کی انٹرمیڈیٹ ادھوری اور مقدم موخر خراب تھا۔ یہ کم Exposure کی وجہ سے تھا یا اسے سب کام کیے کرائے ملتے تھے۔ راحیلہ کبھی کیل کو ہتھوڑی کی پہلی ضرب سے دیوار کے اندر گھسانے میں کامیاب نہ ہوئی۔

کھانے کی گھنٹی بجتے ہی رنگین اوڑھنیاں' رنگ برنگی ساڑھیاں ایک سیلاب کی شکل میں اکیڈیمک بلڈنگ سے ڈائننگ ہال کی طرف بہہ نکلا۔ یہ بلڈنگ قدرے چھوٹی تھی۔ اس کے باہر کا باغ انتہا رول تھا۔ جھاڑیاں' درخت' پھولوں کی کیاریاں اپنی مرضی سے اُگ رہی تھیں۔ درمیان میں بڑا ڈائننگ ہال دائیں ہاتھ وارڈن صاحبہ' نرس اور مارکر کے کمرے تھے۔ بائیں ہاتھ چھوٹی سی ڈسپنسری اور ہیلتھ روم تھا۔ پچھواڑے خانسامے' بیرے کوارٹروں میں رہتے تھے اور ڈائننگ ہال سے ملحق پچھلی جانب لمبا سا باورچی خانہ' گودام اور پینٹری تھی جس میں صبح صبح کئی ٹرے مکھن سلائس سے لدے نظر آتے۔ باورچی خانے کی آوازیں اور بڑی کیتلی کی شوں شاں کبھی بند نہ ہوتی۔ اس کی سیمنٹ کی بڑی سنکوں میں برتن لدے رہتے۔ خانسامے میلے چیکٹ ایپرن پہنے عورتوں کی طرح چلتے مصروف نظر آتے۔ بیرے تھانیداروں کی طرح رعب جھاڑتے اور مس جیکسن اپنی اہمیت جتانے کے لیے بار بار خود بخود کھلتے بند ہونے والے دروازے کو کھول کر آجاتیں۔

لڑکیاں وارڈن مس جیکسن کو کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اس سے ڈرتی تھیں۔ کھانے کے ہال میں سب کو مس جیکسن کے بعد داخل ہونے کی اجازت تھی۔ مس جیکسن دراز قد' گہری سانولی اور مردانہ چہرے کی مالک تھی۔ یونیفارم تھی' ایرکی لڑکیاں

اس برآمدے کی چھت اس قدر شکستہ تھی۔ یہاں برسات کے دنوں میں ننھی منی بوندیں سارا دن برستیں اور یہ برآمدہ جس میں بمشکل تمام دو چار پائیاں بچھتی تھیں' جل تھل ہو جاتا۔ ڈومیسٹری کے بستر ہمیشہ سلوٹ زدہ رہتے۔ کئی بار سینئر ہیڈ گرل فائن کر جاتی لیکن لڑکیاں پلنگوں پر لیٹنا' ستانا نہ چھوڑتیں۔ دروازے میں سے گھستے ہی ہسپتال کے جنرل وارڈ کی طرح سات چار پائیاں بچھی تھیں اور بائیں جانب ہر پلنگ کے سامنے ایک میز کرسی طالب علم کی پڑھائی کے لیے نصب تھا۔ کمرے کے فرش پر نہ کوئی قالین تھا نہ دری۔ لڑکیوں کے ٹرنک سوٹ کیس ہر لڑکی کے پلنگ کے نیچے گھسائے گئے تھے اور ہر رات سونے سے پہلے ٹرنکوں کو گھسیٹنے کی آواز سے خوب شور مچ جاتا تھا۔ لمبے ڈومیسٹری ہال کے آخر میں جہاں غسل خانوں کی طرف گیلری جاتی تھی' دو چادریں رسی پر ٹانگ کر ڈریسنگ روم بنایا گیا تھا۔ اس پردے کے پیچھے دیوار پر کھونٹیاں ہی کھونٹیاں اور ان پر کپڑے ہی لٹکتے تھے۔ یہاں صبح اور رات خوب ہنگامے ہوتے۔ ایک لڑکی کپڑے تبدیل کرتی تو دوسری پہرہ دیتی۔ کبھی کبھی پہرہ دینے والی بے ایمان ہو کر اندر جھانک لیتی۔ ایسے میں چیخوں کی آواز ڈومیسٹری میں پھیل جاتی۔

راحیلہ کا خیال تھا کہ اس وقت سب لڑکیاں یا تو کھانے والے کمرے میں ہوں گی یا اکیڈمک بلڈنگ میں.....

لیکن دو تین لڑکیاں ابھی بھی ڈومیسٹری میں تھیں۔

''راحیلہ آؤ چلیں.....'' شیاما نے کہا۔

''بس آج میرا جی ٹھیک نہیں' تم چلو.....''

شیاما نے میز پر سے اپنی کتابیں اٹھائیں اور باہر برآمدے میں چلی گئی۔

چند ثانیے بعد اس نے دروازہ ذرا سا کھول لیا۔

''بھئی بہانہ خوری نہ کرو۔ مس ہیڈسن بار بار پوچھیں گی۔''

''میرا جی ٹھیک نہیں۔''

''پھر تو مسی بابا آئی کھڑی بھو.....''

وارڈن کو سب لڑکیاں مسی بابا اور سٹاف نرس کو نرسی جی بلاتی تھیں۔ اگر وارڈن شادی شدہ اور بچوں والی ہوتی تو بھی اس کا بلانے کا نام مسی بابا ہی ہوتا۔ نرسی جی درمیانی عمر کی موٹی بھدی نیلی سیاہی مائل رنگت کی عورت تھی۔ کوئی طالب ذرا سی بیمار ہوتی تو وہ اسے کھینچ کھانچ کر ہیلتھ روم میں لے جاتی۔ یہاں لڑکی کو سفید چادر بچھی پلنگڑی نما چار پائی پر لٹا کر نرسی جی نبض' بلڈ پریشر' زبان دیکھتیں اور اس کے بعد ان کی نرسنگ ختم ہو جاتی۔ وہ یکدم اپنی ٹریننگ بھول کر حکیمی نسخے بیان کرنے لگتیں۔ لیموں کی سکنجبین' چرائتہ' رسونت' معجون' برہمی بوٹی' سونف پودینے کا پانی ایسے معمولی علاج تجویز کر کے اور ان پر عملدرآمد کرا کر نرسی جی لڑکیوں کو چنگی بھلی کر دیتیں۔ ہر ہفتے کے روز لیڈی ڈاکٹر برتھہ ہارٹ آتیں تو ہیلتھ روم عموماً خالی ملتا۔

اب بھی جب شیاما ایک بار پھر مڑی تو اس نے کہا..... ''ابھی مسی بابا آئیں گی اور پکڑ کر تمہیں ہیلتھ روم میں لے جائیں گی۔ پھر ہفتہ بھر اجوائن پودینے کا پانی پینا.....''

''اچھا جی پی لیں..... الجبرا حساب کی کلاس اٹینڈ کرنے کو دل نہیں کرتا.....''

شیاما پوری کی پوری ماہی منڈا تھی۔ لڑکوں کی طرح کالروالی قمیض پہنتی اور بازو چڑھا کر رکھتی۔ اس کی سلیٹی مائل نیلی آنکھوں میں عجیب قسم کی بے باکی تھی۔ شلوار کے پائینچے بھی مردوں کی طرح باہر کی طرف رکھتی۔ اس کے نیچے پشاوری چپل ہوتی۔ کسی نے اسے کبھی سینڈل پہنے نہ دیکھا۔ سردیاں آتیں تو مردانہ کٹ کی واسکٹ اور سر پر روسی ٹوپی پہنتی لیکن ایک دن ڈومیسٹری کی ایک لڑکی ورشن نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ پردے والی چادر کے پیچھے شیاما کپڑے بدل رہی ہے۔ اُس نے چادر اٹھا کر دیکھ لیا۔ پھر تو شیاما شیرنی بن گئی..... ''او جی بھگوان کی سوگند بڑی بے شرم ہو تم لوگ..... کیا دیکھ لیا تم جیسی لڑکی ہوں آخر۔''

رات شیاما پلنگ پر لیٹی روتی رہی۔ ڈومیسٹری کی ساری چھ لڑکیوں نے معافی مانگی۔ مسی بابا نے آکر ورشن بی بی کو جھڑکیاں دیں لیکن شیاما روتی رہی۔ اس روز راحیلہ کو احساس ہوا..... مردانہ رویے سے کوئی لڑکی مرد نہیں بن جاتی۔ چاہے لاکھ دوسری لڑکیاں اسے مرد ہی کیوں نہ سمجھیں۔

شیاما کے جاتے ہی اس نے خط نکالا۔ ڈومیسٹری پہنچ کر بھی وہ یہ خط کھولنا نہ چاہتی تھی۔ پرانے زمانے میں لوگ Privacy کا اس قدر خیال نہ کرتے تھے۔ ایک کا خط سبھی کا خط تھا۔ اس نے خط کو پلو میں چھپالیا اور اپنے ہوسٹل کے پچھواڑے لوکاٹ کے درختوں کے جھنڈ میں گھس گئی۔ کچھ شہد کی مکھیاں درختوں میں منڈلا رہی تھیں اور گھٹنوں تک ابھر آئی گھاس میں Grass hopper پھدک رہے تھے۔

اس نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی اور خط کھولا۔ ان دنوں خط ایک بڑی ہی پرائیویٹ چیز تھی۔ اس میں اشتہار، رسالے جاری کرانے کے مراسلے، ٹیوشن سنٹر اور جملہ اشتہارات کی اطلاعات نہ ہوتی تھیں۔ خط کاروباری کم تھے اور پرسنل زیادہ۔ کبھی کبھی لفافوں میں چین لیٹر بھی آدھمکتا۔ پھر لوگ اتنے وہمی، سادہ لوح اور اعتبار کرنے والے ہوتے کہ چین لیٹر ملتے ہی جتنے خطوں کا حکم نامہ ملتا لکھنے بیٹھ جاتے۔

نیلے لفافے کے اندر اس کی سہیلی تسنیم کا خط تھا۔

''جانِ شاہد۔''

القاب پڑھتے ہی راحیلہ کا دل دھڑکنے لگا۔ یہ جانِ شاہد تسنیم کا تکیہ کلام تھا۔ اس نام کو سنتے ہی اس کے دل میں بھی ڈھولک بجنے لگی۔ گوٹا کرن سلمٰے ستارے چمک چمک آنکھوں کے آگے آتے۔ سارا خط معمولی باتوں سے بھرا تھا لیکن آخری پیراگراف تشویشناک تھا۔ لکھا تھا۔

''تم نے تو کالج میں سنا ہی ہوگا۔ گاندھی جی بظاہر تو کانگریس کے ممبر تک نہیں لیکن وہ تمام فیصلوں کو ہندو کے حق میں کروانا چاہتے ہیں۔ اندر سے وہ نہرو جی کو تھپکی دے کر ہلاشیری دیتے ہیں۔ ان کا حوصلہ بڑھاتے ہیں اور اوپر سے وہ انصاف کے ساتھ ہیں۔ دوہری پالیسی کچھ رنگ لائے گی۔ سکھ اس وقت زیادہ کی تلاش میں ہیں۔ وہ نئی بننے والی ریاست کا ساتھ اس لیے نہیں دے سکتے کہ اول تو پاکستان ابھی وجود میں نہیں آیا اور ان دیکھے کا یہ لوگ اعتبار نہیں کر سکتے۔ دوسرے آپ کے دادا ابا کہتے ہیں..... سکھ لوگ مسلک کے اعتبار سے مسلمان ہیں اور رشتے ناطے کے حساب سے ہندو۔ ان کے پاس توحید اور آخرت کا ایمان ہے۔ اپنے نانک جی کو گرو مانتے ہیں، پیغمبر نہیں کہتے۔ ایسے لوگ جو عقیدت میں ڈھیر ہوں،

کبھی جھوٹ نہ بولتے ہوں' ان لوگوں کو ٹخل دینا کسی خوشامدی کے لیے بہت آسان ہے۔ بہر کیف بظاہر ابھی بھی ہندو مسلمان ساتھ ساتھ ہیں۔ سکھ اپنے لیے توازن ڈھونڈ رہے ہیں۔ ان کے تارا سنگھ سادہ آدمی ہیں۔ اگر دھوکے میں آ گئے تو سکھ جاتی کی حیثیت ہندوؤں کے تمک جیسی ہوگی۔ ہوا ہو انہ ہوانہ ہوا.....

تمہارے شاہد جی کی اماں ہمارے گھر آئی تھیں۔ کہنے لگیں ملک کے رنگ ڈھنگ ٹھیک نہیں چھٹیوں میں یعنی جولائی' اگست میں کوئی تاریخ رکھیں گے لیکن اگر راحیلہ کے گھر والے نہ مانے تو ہم معذور ہیں.....اب یہ بتاؤ تمہارے گھر والوں کو منانے کا کیا طریقہ ہے.....؟"

تمہاری تسنیم

خط پڑھ کر راحیلہ نے اسے تکیے تلے رکھ کر اوپر سے پلنگ پوش بچھا دیا۔ خط کے آخری پیراگراف میں خوف کے ٹائم بم چھپے ہوئے تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے مسلم گھرانوں کی خواتین ڈرپوک تھیں۔ وہ بیرون خانہ کی خبر گیر نہ تھیں لیکن عجیب بات ہے باقی خواتین کی طرح جو بھی کام شاہد کی اماں خوف کے دباؤ تلے آ کر کرتیں' درست ہوتا۔ راحیلہ کا اپنا دل ہی کہتا تھا کہ ملکی حالات کے پیش نظر انتظار فضول تھا۔ شاہد کو ایم اے کرنا ہوگا تو شادی کے بعد بھی کر لے گا۔ لیکن سیاسی حالات کے پیش نظر شادی کا ہو جانا ضروری تھا.....ورنہ.....ورنہ کون جانے.....

کالج کی فضا بظاہر سیاسی الجھنوں سے پاک تھی۔ یہاں بناوٹی خوش اخلاقی کے تحت سب لڑکیاں یک جان اور ہزار قالب ہو کر رہتیں۔ کہیں ہندو مسلم کی خاص گروہ بندی نظر نہ آتی لیکن ہندو لڑکیاں جانتی تھیں جب وہ اکٹھی ہو کر بندے ماترم گانے کے لیے دائرہ یا قطار بناتیں تو مسلم لڑکیاں بظاہر مصروفیت کا بہانہ بنا کر آہستہ آہستہ کھسک جاتیں اور یہی مصروفیت ان کے انکار کی آڑ بن جاتی۔ مسلم لڑکیاں اپنی ہندو سہیلیوں کا دل توڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ یہ ہندو زدہ بنگالی گیت انہیں اپنا قومی ترانہ نہ لگتا اور اگر کبھی کوئی لڑکی بندے ماترم گانے پر مجبور بھی ہو جاتی تو اسے ذہنی کوفت ہوتی۔ رات کے کھانے کے بعد لڑکیاں ٹولیوں میں بٹ جاتیں۔ ہوسٹل اے اور بی کے اردگرد جانے والے لمبے راستے پر مختلف قسم کے گانے گاتی ہنستی کھیلتی لڑکیاں گروہوں میں ایک دوسرے سے ملتیں اور اپنے اپنے راستے پر چلی جاتیں۔ رواج تھا کہ ایک گروہ دوسرے آنے والے گروہ کو راستہ دیتا اور آگے نکل جاتا۔ گروہ کی لڑکیاں کبھی دوسرے گروہ میں شامل نہ ہوتیں۔ کبھی کبھی مسلم لڑکیاں پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگاتی ہوئی گزرتیں تو بندے ماترم کے بول چپ ہو جاتے۔ ہندو لڑکیاں اس نعرے کو سن کر جامد ہو جاتیں۔ انہیں لگتا جیسے یہ نعرہ ان کے خلاف ایک زندہ للکار ہے۔

ابھی ایک دن پہلے کی بات تھی۔ لڑکیاں اپنے اپنے مسلکوں میں' اپنی اپنی موج میں گھری ناشتہ کر کے ڈائننگ ہال سے نکلی تھیں۔ اکیڈمک ہال میں ابھی گھنٹی نہ بجی تھی۔ لان صبح کی اوس سے گیلے سیلے تھے۔ سنبل کے درختوں میں سے سورج جھانک تو رہا تھا لیکن ابھی اس کی کرنوں میں صرف روشنی تھی' حدت نام کو نہ تھی۔ کچھ لڑکیاں لائبریری سے ملحق ریڈنگ روم میں چلی گئی تھیں اور اخبار رسالے دیکھتے ہوئے پہلی گھنٹی بجنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ راحیلہ کو بھی ڈاکٹر کوئنس کی امر کہانی کے متعلق انفرمیشن مطلوب تھی۔ وہ اس فلم کو دیکھنا چاہتی تھی لیکن دادا ابا نے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ تمہیں ہوسٹل سے باہر کسی قیمت پر بھی نہیں جانا۔ ملک کے سیاسی حالات دن بہ دن متغیر ہو رہے ہیں۔ اپنے آپ کو کسی غلط سچویشن میں ڈالنے

کی ضرورت نہیں۔ لیکن اسے بے شری فلم ایکٹرس کے متعلق بہت سی معلومات حاصل کرنا تھیں۔ اس ایکٹرس نے فلم "شکنتلا" میں ایسا رول کیا تھا کہ سارے ہندوستان میں اس کی شہرت پھیل گئی تھی۔ اخبار "ملاپ" میں ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی کا اشتہار تھا۔ بے شری ایک چینی لڑکی کے روپ میں نظر آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ریگل سینما میں Lost Horizon فلم کا بھی لمبا اشتہار تھا جس میں رونلڈ کالمن اپنی مبہم مسکراہٹ کے ساتھ نمایاں نظر آ رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بالکل شاہد کی طرح پُراسرار اور زندہ تھی۔ راحیلہ نے دل میں سوچا ایسا کیوں ہے کوئی واقعہ نام 'موسم' جگہ اپنے کسی اور واقعے' جگہ' شخص' موسم کی طرف کیوں لے جاتی ہے۔ ہم کسی ایک جگہ قید ہو کر کیوں زندہ نہیں رہ سکتے۔ بظاہر رونلڈ کالمن کی تصویر دیکھتے رہنا کیوں ممکن نہیں؟ کیا یہ قوت متخیلہ کا کرشمہ ہے کہ روح کا..... کیا پچھلی گزری ہوئی باتوں کی کشش ہے کہ حالیہ واقعے میں کچھ انگیخت کی قوت ہوتی ہے..... اعادے کا یہ عمل اتنا فوری اور جاذب کیوں ہے کہ قید خانے میں قیدی کبھی تنہا نہیں رہتا۔ ہجوم خیال اس کی تنہائی کو اجالتے رہتے ہیں۔ یہاں ہوسٹل میں گھر کا کوئی فرد شاہد موجود نہ تھے اور پھر بھی یادوں کے سہارے وہ زندہ تھی..... کیا یادزندہ رکھنے کے لیے بنائی گئی ہے کہ موت سے ہمکنار کرنے کے لیے..... یا پھر اس کے دو فعل تھے..... ہر چیز کی طرح!

اس نے سر جھٹک کر ایک بار پھر اخبار پر توجہ دینا چاہی لیکن تعلیم کے معاملے میں راحیلہ کا دماغ سست تھا۔ اس نے سامنے نظر کی۔ کچھ لڑکیاں ریڈنگ روم کے باہر پکی روش پر چل چل کر اونچی آواز میں اپنی کتابیں پڑھ رہی تھیں۔ جب وہ ریڈنگ روم کے پاس سے گزرتیں تو ان کی آوازیں بھنبھناتی مکھیوں کی طرح کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکراتیں۔ ان کے سائے اخباروں پر منڈلاتے اور پھر آگے بڑھ جاتے۔ سورج کی شعاعیں اس بڑے کمرے کی تازگی میں اضافہ کر رہی تھیں اور کالج کا ٹیوب ویل نماز کے وقت سے زور و شور سے چل کر ریڈنگ روم کی خاموشی کو توڑنے پر مجبور تھا۔ نہائی دھوئی خوشبوؤں میں بسی لڑکیاں پھولوں کی طرح ریڈنگ روم میں پھیلی تھیں۔ کچھ کھڑکیوں کے آگے بنی ہوئی پتھر کی سلوں پر بیٹھی رسالوں کی ورق گردانی کر رہی تھیں۔ کچھ واقعی اخباروں میں غرق تھیں۔ پھر پتہ نہیں کیسے اس خاموش فضا میں بحث چل نکلی اور ہوتے ہوتے ساری لڑکیاں اس کی لپیٹ میں آ گئیں۔

پہلے یہ بحث دو لڑکیوں کے درمیان کھسر پھسر کی صورت ہوئی۔ پھر سازھی چولی میں ملبوس جہاز اڑاتی قہر آلود نظروں والی لڑکی بولی..... "I tell you تمہارا یہ پاکستان کا Demand بالکل Unpractical ہے....."

"کیسے بتاؤ کیسے؟ کیا ایک باپ کے دو بیٹے جائیداد الگ کرنے کے حقدار نہیں۔" خالدہ نے "ڈان" چھوڑ کر کہا۔

"پاکستان ایک چھوٹا ملک ہوگا۔ اس کے Economic Resources کافی نہیں ہوں گے۔ یہ قرضوں پر زندہ رہے گا....."

"تم ہمارے مطالبے سے اس لیے ڈرتے ہو مونیکا کہ تمہیں علم ہے کہ پاکستان ہی ایسا واحد ملک ہوگا جو Self sufficient ہو سکے گا..... پٹ سن، روئی، گندم یہی تو وہ Essentials of life ہیں..... جو صرف ہمارے خطے میں ہوں گی..... جس ملک کی گرین بیلٹ پیچھے موجود ہو اسے کیا غم....." خالدہ بولی۔

"انشاء اللہ..... ہمارے پاکستان کو سنتے خیر یں ہیں۔" شمسہ بولی اور ساتھ ہی کسی نے نعرہ لگایا.....

''پاکستان زندہ باد.....''

''Your dream'' نعرہ سن کر مونیکا نے طنز کا تیر چھوڑا۔

''جو پورا ہوگا..... انشاءاللہ!'' شلوار قمیض والی لڑکی نے دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

''او جی تمہارا مطلب Prodigal son جیسا ہے۔..... سب کچھ گنوا کر ہمارے پاس آجاؤ گے..... منہ لٹکا کر۔'' سرلا بولی۔

''تم لوگ اس ملک کے باشندے نہیں ہو حملہ آوروں کی اولاد ہو۔ ہم انگریز کو نکالیں گے یہاں سے اور تمہیں بھی جانا ہوگا اس ملک کو چھوڑ کر.....''

اس وقت ایک لڑکی جو بڑی بڑی آنکھوں کی مالک تھی اور جسے سب راگنی ایکٹرس سے مشابہ سمجھتے تھے بہت مدھم آواز میں بولی..... ''بھائی! اس ملک کی بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں سبھی حملہ آور رہتے ہیں۔ اگر حملہ آوروں کے خلاف ہیں تو سب سے پہلے آریائی قوموں کو یہاں سے کوچ کرنا ہوگا۔ بچارے کول' دراوڑ' بھیل جنوب میں بند ھے بیٹھے ہیں۔ آریا لوگوں کو ان کا ملک واپس کرنا ہوگا اور امریکیوں کو ریڈ انڈین لوگوں کے لیے امریکہ خالی کرنا پڑے گا..... حملہ آوروں کی بات کی تو سب کو اکٹھے ہی انڈیا چھوڑنا ہوگا۔''

''چلو مان لیا مسلمان پروڈگل سن Prodigal son کی طرح واپس آئیں گے..... سب کچھ لٹا کر..... پھر تو ان کی اور بھی خاطر مدارات کرنا پڑے گی.....''

سونیا آج خوب بپھری ہوئی تھی۔ وہ عام طور پر بحثوں میں حصہ نہ لیتی۔ خیالات کے اعتبار سے وہ سوشلسٹ تھی۔ روسی لٹریچر پڑھتی اور غریب آدمی کی طرفداری کرتی لیکن آج وہ سانپنے کی طرح ابھر رہی تھی۔

''کسی ایک آدمی کو تو واپس Welcome کیا جا سکتا ہے' پوری قوم کو نہیں۔''

''معافی اور آخر تک معافی تمہارے مذہب کی اساس ہے سونیا۔''

''مذہب کا دور نکل چکا ہے۔ میرے ڈیڈی کہتے ہیں۔ اب انسان اسی صورت میں بچ سکتا ہے جب اس کی سوچ Secular ہو اور اس کا مذہب ڈیموکریسی..... ورنہ ایک مذہب دوسرے سے ٹکراتا رہے گا اور کوئی انسان عزت کی روٹی نہیں کھا سکے گا.....''

''تم اس لیے ایسے خواب دیکھتی ہو کہ تمہارا تعلق اقلیت سے ہے..... اقلیت کو آخری سانس تک معافی درکار ہوتی ہے.....'' کملا دیوی بولی۔

سونیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ اس وقت پریت لڑی' پڑھنے والی' لال نری کی جوتی اور سفید کھدر کا شلوار قمیض سدا بہار پہننے والی ہردرشن کور بحث میں شامل ہوئی۔ وہ ایک مارشل ریس کی جاندار لڑکی تھی.....

''کملا..... گاندھی جی کا تیز ترین حربہ بھی ستیہ گرہ ہے..... ستیہ گرہ کیا ہے..... معاف کرنے اور معافی دینے کا علم۔ میرے بھاپا جی کہتے ہیں ستیہ گرہ..... Non-violence گاندھی جی کے عیسائی حربے ہیں جنہیں انہوں نے شدھی

کر کے ہندو کر لیا....."

اس وقت مس بھٹنا گر ریڈنگ روم میں آ گئیں۔

شاید دوستی یا تمکنت کی ریشمی ڈوریوں میں سخت گانٹھیں پڑ چکی تھیں لیکن مس بھٹنا گر کو دیکھتے ہی سب دائرے کی شکل میں ان کے گرد کھڑی ہو گئیں۔ مس بھٹنا گر انگریز سیاست دانوں کی طرح ہندو مسلمان سب کو اپنے گرد لپیٹ رہی تھی..... اسے غصہ ور کو ٹھنڈا میٹھا کرنے کا ہنر آتا تھا۔

راحیلہ کے لیے کالج' اس میں پڑھنے والی طالبات' ان کے نظریات' اندرونی اور بیرونی فضا' ماحول سب کچھ نیا تھا۔ وہ بار بار حال سے ماضی میں پناہ ڈھونڈتی۔ ہر غیر محفوظ انسان کی طرح جہاں بھی اسے خطرہ محسوس ہوتا' وہ ماضی میں لوٹ جاتی۔ اس وقت اس کے سرہانے تلے ایک خط ایسا تھا جو اسے بڑے تحفظ کا احساس دلا رہا تھا..... اس نے ایک بار پھر تسنیم کا خط پڑھا اور اپنی ساجدہ ماں کے متعلق سوچنے لگی۔ بھلا امی کبھی شاہد کو بیٹی دیں گی۔ ایک فلتھ ایئر کے لڑکے کو جو ابھی کہیں سے بھی برسرِ روزگار نہیں..... اور تو اور ایک ایم اے ہونے سے اور وہ بھی ہسٹری کا..... کیا شاہد گورنر لگ جائے گا' لاٹ صاحب ہو جائے گا..... ساجدہ ماں کیا تمہیں ڈر نہیں لگتا..... بچھڑنے سے' علیحدہ ہو جانے سے' نقل مکانی سے.....

راحیلہ کے پاس بہت سی پناہیں تھیں۔ جس روز اس نے لاہور آنا تھا اس سے ایک شام پہلے وہ اپنی سول لائنز کی ابراہیم لاج کے پچھواڑے پھر رہی تھی۔ روشوں پر مولسری کے پھول بکھرے پڑے تھے۔ وہ کہیں بھاگ جانا چاہتی تھی۔ لاہور میں ہوسٹل کی زندگی اسے ڈرانے والا تجربہ تھا اور وہ ٹیوب ویل کے ارد گرد بنی روشوں پر ٹہل ٹہل کر کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتی تھی۔

ماں باپ کا حکم.....

شاہد.....

پڑھائی سے نامناسبت۔

ہوسٹل کی زندگی

وہ دیکھنے میں تو انسان تھی لیکن اس کا دل و دماغ کسی جائیداد کا سا تھا۔ کسی حد تک تو وہ زندگی کو سمجھ جاتی لیکن زیادہ باتیں بالا ہی بالا طے ہو جاتی تھیں۔ ان کے طے ہونے میں اس کا ہاتھ کبھی نہ تھا۔

یکدم شاہد پانی سے بھری چھوٹی سی آڈ کو لانگ کر اس کے سامنے آ کر بولا..... "حضور انشاء اللہ خاں کا شعر پڑھوں....."

راحیلہ مولسری کے گرے پھولوں پر دو قدم پیچھے اچھل گئی۔

"کیا اچھا مصرعہ ہے انشاء اللہ خاں کا..... جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا....."

"ایسے نہ کیا کرو شاہد..... میں تو ڈر گئی تھی..... بالکل ڈر گئی تھی....."

"اچھا تو پھر کس طرح کیا کروں؟....."

"کیا.....؟" راحیلہ نے آنکھیں کھول کر کہا.....

"یہی جو کچھ میں نے ابھی کیا ہے اور جس پر حضور کو اعتراض ہوا ہے....." شاہد نے مظلومانہ چہرہ بنا کر کہا۔

پھر وہ راحیلہ کے بالکل قریب ہو کر بولا..... "مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کا دل اتنا چھوٹا ہے چوہیا جیسا....."

شاہد کو محسوس ہوا کہ عورت کی باس ہر خوشبو دار شے سے علیحدہ ہے۔ عجیب مست کر دینے والی چیز..... اناس 'منی' تمبا کو پچھلی رات کی باسی چنبیلی پتھر چٹ کے پھولوں کی خوشبو۔ وہ بھی انشاء اللہ خاں کی طرح خوشبوؤں پر ایک سہ غزلہ لکھنا چاہتا تھا۔

"میں تو بڑی بہادر ہوں شاہد۔ ابو جب بھی شکار کر کے لاتے ہیں۔ میں ہی انہیں صاف کرتی ہوں..... لیکن یوں اچانک..... یوں آپ معاً نظر آئے جیسے..... جیسے....."

"جیسے شیطان..... چلیے چھوڑ یئے میں کب مانتا ہوں آپ کی دلیری کو....."

"اچھا تو منواتا کون ہے..... راہ چھوڑ یئے ناں....." راحیلہ نے نگاہیں نیچی کر لیں اور جانا چاہا۔ ابھی لڑکیاں بہانے بہانے سے تادیر لڑتی جھگڑتی عاشقوں سے باتیں کرنے کی عادی تھیں۔ ان کی گفتگو مکمل نہ ہوتی۔

"اچھا میں اتنا موٹا ہوں کہ آپ گزر نہیں سکتیں۔ جایئے ناں روکتا کون ہے....."

اور قریب..... عورت کی خوشبو کے اور قریب ہو جانے کی خواہش شاہد کی آنکھوں میں جھلک رہی تھی۔ اس نے نہ بازو کھولے نہ ایک قدم راحیلہ کی جانب بڑھایا لیکن راحیلہ کو اپنی جگہ میخ کے رکھ دیا۔

"شاہد جانے دیں ناں..... امی بلا رہی ہیں۔"

"جانے سے پہلے کوئی دلیری کا ثبوت دو ناں..... خالی خولی..... لفظی دلیری کس کام کی....."

"اس بار جب ابا ہرن مار کر لائیں گے تو آپ کے سامنے صاف کروں گی....."

"یہ تو وعدہ فردا ہوا ناں....."

عجب بات تھی۔ راحیلہ گزرنا چاہتی تھی اور یہ بھی چاہتی تھی کہ شاہد اسے اپنے بازوؤں میں تھام لے..... ابھی خود خواہشیں واضح شکل میں لانے کا رواج نہ تھا۔ لڑکیاں ایسے گانے نہیں گا سکتی تھیں جن کے بول ہوتے..... "چولی کے پیچھے کیا ہے.....؟" لیکن اندر ہی اندر خواہش کی بھڑکی ہوئی خوشبو انہیں بھی بھگائے پھرتی۔ انسان اس خوشبو پر کتنے صحرا پھلانگ چکا تھا۔ کتنی ریت پھانک گیا تھا۔ یہ کسی فرشتے کے علم کی بات نہ تھی۔

صرف انسان ہی ایسے دوزخ کے تھپیڑے کھانے کا اہل تھا۔

آم کے پیڑ پر ایک گرگٹ گردن اٹھائے ان دونوں کو دیکھنے میں مشغول تھا۔

"اگر میں یہ گرگٹ تم پر پھینکوں اور تم اپنی جگہ سے نہ ہلو میں سمجھ جاؤں گا تم دلیر ہو..... یا پھر..... یا پھر....."

راحیلہ کنی کترا کر آگے نکل گئی..... اور شاہد ایک قدم پیچھے چلنے لگا۔ کوئی چیز راحیلہ کو بتا رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے..... ایسا گھمبیر خطرناک..... جو ساری عمر اس کا تعاقب کرے گا۔

"تو تم دلیر نہیں ہو..... ہے ناں۔"

"نہیں....." بمشکل راحیلہ نے جواب دیا۔

"تو دلیری سیکھو جانِ من....."

اب ان دونوں میں آدھے فٹ پون لمبے کا بھی فاصلہ نہیں تھا۔ شاہد نے پچھلی طرف سے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے کندھے جکڑ لیے.....اور آہستہ سے اپنے چہرے کو اس کے کھلے بالوں میں ڈبو دیا۔

اتنی سخت گرفت کو راحیلہ نے پتے پر ٹکے ہوئے شبنم کے موتی کی طرح محسوس کیا۔

"میں گر جاؤں گی شاہد....."

خود شاہد نے اس کے بالوں کی خوشبو میں گرتے ہوئے کہا....." ساجدہ ماں کس ٹھاٹھ سے تمہیں بلاتی ہیں۔ کاش وہ دن جلد آئے.....جب میں بھی تمہیں آواز دے سکوں.....راحیلہ.....راحیلہ.....ہر صبح جاگنے پر میں آنکھیں بند کیے پڑا رہتا ہوں اور سوچتا ہوں.....وہ مجھے جگانے آئے گی....."

یکدم وہ چپ سا ہو کر علیحدہ ہو گیا.....ہمیشہ کی طرح اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی آ گئی۔ جیسے وہ ہنستا ہنستا رو دیا ہو۔ جیتی ہوئی بازی کے مہرے بکھیر کر کہنے لگے.....لو میں ہار گیا..... بولو اب کیا چاہتی ہو.....شاہد نے منہ پھیر کر سگریٹ سلگا لیا۔ وہ اپنے آپ کو شانت کرنا چاہتا تھا.....

"ساجدہ ماں تمہیں کیوں بلاتی ہیں ہر وقت..... ہر جگہ....."

راحیلہ کے پاؤں پریوں کے پر بن گئے اور وہ بادلوں کی طرح ہلکی پھلکی ہلکورے کھاتی اندر چلی گئی۔ اسے لگتا تھا وہ ابھی ابھی گر جائے گی.....

ڈومیٹری میں ایک خط کو تکیے تلے رکھ کر راحیلہ سوچ رہی تھی کہ اتنا بڑا خزانہ کہاں رکھوں۔ یہ تو یادوں سے بھی قیمتی نکلا۔ وہ اس تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور کلاسیں بھاڑ میں جھونک دیں۔

ڈومیٹری کا دروازہ پھر کھلا اور کسی نے میٹھی سی آواز میں انگریزی میں پوچھا....." کیا اس ڈومیٹری میں مس راحیلہ مغل رہتی ہیں؟"

"کیوں کیا بات ہے؟"

"باہر آپ سے ملنے کوئی شاہد صاحب آئے ہیں۔ مس بٹی برن کہتی ہیں ان کا نام وزیٹر بک میں نہیں ہے۔ آپ ان سے صرف دس منٹ مل سکتی ہیں۔ اگلی بار کے لیے آپ کو اپنے والد کی پرمیشن دکھانا ہو گی۔"

اطلاع دینے والی وارڈن تھی۔

☆☆☆

ڈومیٹری سے باہر نکلی تو سورج غروب ہو رہا تھا۔

کیا وہ اتنے گھنٹے سوئی تھی۔

کیا وہ برسوں یادوں میں کھوئی رہی؟.....کیا نیند اور یاد کا باہم کوئی رشتہ تھا؟ کیا تلخیاں بھلانے میں ان دونوں کا کام منشیات کی طرح اہم تھا؟

اکیڈیمک بلڈنگ کے باہر سورج ڈوب رہا تھا۔ درخت 'لان' اکیڈیمک بلڈنگ' ڈائننگ ہال کی جانب نارنجی

روشنی آخری دموں پر تھی۔ بیضوی لان میں کرسیاں ٹکڑیوں میں پڑی تھیں اور ان پر ملاقاتی ہوسٹل کی لڑکیوں سے ملاقات میں مصروف تھے۔ ابھی تھوڑی دیر میں ملاقات ختم ہونے کی گھنٹی بجنے والی تھی۔ کھیلوں کی گھنٹی کچھ دیر پہلے بج چکی تھی۔ لڑکیاں ٹینس کورٹ چھوڑ کر سفید کپڑوں میں ملبوس ریکٹ اٹھائے اپنے اپنے ہوسٹل کی طرف جا رہی تھیں۔

لیکن باقی روشیں قدرے خاموش اور سونی سونی تھیں۔ اجالا اندھیرے سے رخصت لینے لان پر بے چارگی سے کھڑا تھا۔

مسی بابا مس ہنی برن نے شاہد کی طرف دیکھا..... ''دیکھو مسٹر شاہد! ہوسکتا ہے جو کچھ تم کہتا ٹھیک ہو لیکن ہم کو اجازت نہیں کہ ہم لڑکی کو کسی ایسے وزیٹر سے ملائے جس کا نام پتہ رجسٹر میں نہ ہو..... دیکھو..... سی فور یور سیلف صرف راحیلہ کے برادر کا نام ہے..... سی شوکت مغل۔''

''ٹھیک ہے مس صاحب! میں اجازت نامہ بھی منگادوں گا..... لیکن آپ پلیز آج کی شام ملنے دیں..... راحیلہ میری منگیتر ہے۔''

''آئی سی لیکن آخری بار..... مجھ پر کیس بن سکتا ہے۔''

مس ہنی برن اپنا رجسٹر نیچے میز پر رکھے چپ ہوگئی۔ شاہد نے طشت میں مسکراہٹ رکھ کر پیش کردی اور لان کی طرف چل دیا۔ مس ہنی برن نے شاہد کی طرف غور سے دیکھا۔ جہاں سے قمیض پتلون کے اندر کی گئی تھی۔ یہاں چھوٹے لفافے جتنا کپڑا ہوا اور چال کی وجہ سے ہچکولے کھا رہا تھا۔ ایڈن برا میں شاہد کا ہم شکل ایک نوجوان اسے قلعے میں ملا تھا۔ اس کی قمیض میں بھی ہوا ابھری تھی اور وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے عین مین پشت سے شاہد ہی لگتا تھا۔ وہ دونوں بغیر تعارف کے ایک دوسرے کے ساتھ چلنے لگے۔ پھر چلتے چلتے ان میں باتیں ہوئیں اور جب وہ دونوں اکٹھے ٹیپو سلطان کی تلوار دیکھ رہے تھے تو نوجوان نے کہا..... ''آپ سکاچ ہیں مس ہنی برن.....''

''نہیں میں تو خاص الخاص لندن کی رہنے والی ہوں۔ ہیمر سمتھ میں ہمارا گھر ہے..... اور میرا نام الزبتھ ہے..... کافی کامن سا نام ہے۔''

''حسن اتفاق سے میں بھی ہیمر سمتھ میں ہی رہتا ہوں..... مکان میں نہیں کونسل کے بنے ہوئے سرکاری اپارٹمنٹ میں..... اور حسن اتفاق سے میرا نام تھامس ہے..... الزبتھ سے بھی زیادہ عام نام..... ہے..... شاید ہم انگریزوں کو نام نہیں سوجھتے۔ ہم تین تین پشتوں تک ایک ہی نام کے ساتھ گزارا کر لیتے ہیں۔''

وہ دونوں ہنس دیئے۔ قریب کھڑی ایک گائیڈ چند ٹورسٹوں کو بتا رہی تھی کہ ٹیپو سلطان کون تھا اور کیوں اس کی تلوار کو یوں میوزیم میں رکھ کر حکومت انگلشیہ نے اپنی بہادری کا ایک پورا باب محفوظ کر لیا ہے۔ ایک ٹورسٹ نے ناگوار نظروں سے ان دونوں کی جانب دیکھا اور اپنے گروپ کو لے کر آگے نکل گئیں.....

''تم جانتے ہو یہ ٹیپو سلطان کون تھا؟'' الزبتھ نے پوچھا۔

''غالباً یہ انڈیا کا کوئی فریڈم فائٹر تھا لیکن انگریزوں کا دشمن۔''

''یہ کیا بات ہے تھامس کہ جس کو مقامی لوگ ہیرو سمجھتے ہیں۔ وہی دشمن کی زبان میں بغاوتی بھی کہلاتا ہے.....

سنا ہے چنگیز خاں کو اس ملک میں پوجنے کی حد تک ہیرو سمجھتے ہیں۔ Charlemagne پر Gaul کے لوگ مرتے تھے لیکن جرمنی کے لوگ اسے ظالم کمینہ سمجھتے تھے.....''

مس جنی برن اور تھامس دونوں میوزیم سے باہر نکل آئے اور قلعے کی ایک اونچی دیوار پر بیٹھ کر دور بہنے والے Thames کا نظارہ کرنے لگے۔ ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور الزبتھ کے ہلکے ہلکے براؤن گھنگھریالے بال لہرا رہے تھے۔ تھامس نے یہ نظارہ کئی بار پہلے دیکھا تھا۔ لڑکیوں کے بال تو ہوتے ہی اس لیے ہیں کہ ہوا کا ہلکا سا اشارہ پا کر لہرانے لگیں لیکن آج اسے یہ منظر ٹیپو سلطان کی تلوار سے بھی حیرت انگیز لگا۔

''تھامس! ہم لوگوں نے اتنی مدت ہندوستان پر کیسے حکومت کی۔ ہماری تو فوج بھی کم تھی..... اگر وہاں کے لوگ ہمیں بھگانا چاہتے تو انھیں سے بھگا سکتے تھے؟.....''

''میں تو ڈاکٹر ہوں الزبتھ اور میں نے کبھی ہسٹری توجہ سے نہیں پڑھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فرداً فرداً بھی اور بحیثیت قوم کے بھی مرعوب ہونے کی ایک وجہ ہوتی ہے اور وہ جمال ہے۔ مرد عورت کے حسن سے مار کھا کر اس کا غلام بنتا ہے۔ سیاہ قومیں سفید قوموں سے اس لیے نہیں ڈرتیں کہ سفید قومیں کچھ میں سائنس میں کی اور Know how میں ان سے بہتر ہوتی ہیں..... صرف رنگ..... سفید رنگ..... انگریز نے اتنی دیر سیاہ ہندوستان پر حکمرانی کی ہے..... وہ افریقہ، مصر، برما، چین ہر جگہ اپنی کالونیاں بناتا چلا گیا ہے۔ کیوں؟ کیسے؟ انگریز کبھی فرانس کو تابع نہیں کر سکا۔ جرمنی کو اپنی کالونی نہیں بنا سکا۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے کہ انسان خوبصورتی نے جمال نے سفید رنگ سے خائف ہے۔ سفید آدمی جب کالے آدمی کو حکم دیتا ہے تو کالے کو بات ماننے میں دیر نہیں لگتی کیونکہ اس نے دل میں پہلے ہی سفید آدمی کو اپنے سے برتر مان لیا ہوتا ہے۔ اس میں خوش ہونے والی بات نہیں ہے..... سفید آدمی نے کبھی اپنی جلد کے لیے خدا کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ یہی وہ معجزہ ہے جو مغرب کے پاس ہے۔ ہتھیار نہیں سائنسی Know how نہیں صرف سفید جلد جاپان کچھ سائنس میں کم نہیں لیکن اس کا سکہ کبھی دنیا میں نہیں چل سکتا..... وہ لوگ حسن میں مار کھاتے ہیں۔ غور سے سوچو۔ الزبتھ! یہ آریائی کس لیے انڈیا پر قابض ہوئے۔ یہ بتاؤ بھلا کیا وجہ ہے سپین میں سو سال مسلمانوں نے حکومت کی لیکن کوئی بھی مقامی مسلمان نہ ہوا۔ تہذیبی اثر ہوا..... مسلمان لوگوں نے عربی کھانے پینے رہنے سہنے کے انداز ضرور ہسپانیہ کے لوگوں کو عطا کیے۔ ایسے گھر بنے جن کے اندر صحنوں میں فوارے اور باغ تھے لیکن مقامی لوگ مسلمان نہ ہوئے۔ کبھی تم نے سوچا کیوں؟ مسلمان بادشاہ رعایا سے محبت کرتے تھے پھر بھی ہسپانیہ کے لوگ مسلمان نہ ہوئے ایک بڑا سوال ہے.....''

الزبتھ نے ہوا کے خلاف اپنے بالوں کو ترتیب دے کر کہا..... ''میرا خیال ہے تھامس یہ جو مسلمان ہیں ناں یہ کبھی کسی پر اپنا مذہب نہیں ٹھونستے۔ ہماری طرح ملک ملک تبلیغ نہیں کرتے..... یا تو یہ لوگ مشقت کرنا پسند نہیں کرتے یا ہو سکتا ہے ان کے مذہب میں کسی کو جبراً مسلمان کرنا منع ہو.....''

تھامس نے حیرانی سے الزبتھ کی طرف دیکھا۔ اسے اس معمولی انگلش لڑکی سے اتنی ذہانت کی توقع نہ تھی۔ جرمن لڑکیاں عموماً اس کے ساتھ بڑی چھندار گفتگو کیا کرتی تھیں لیکن انگریز نرسیں اور ڈاکٹریں عموماً موسم کافی ڈونٹ کے آگے نہ جاتیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ Privacy کی خواہش نے انگریز لڑکیوں کا دماغ ڈل کر دیا ہے.....

"تمہاری وجہ بھی ممکن ہے درست ہو..... لیکن میں سمجھتا ہوں' کوئی سفید آدمی سیاہ آدمی سے اس کا مسلک' دین' علم قبول نہیں کرتا کچھ Exceptions ہو سکتی ہیں۔ لیکن..... زیادہ تر سفید آدمی کا تصورِ حسن ہی اس کے نظریات پھیلاتا ہے....."

"لیکن دیکھ لو اسلام دنیا میں کس قدر پھیلا ہوا مذہب ہے۔ کہاں کہاں اس کی دسترس نہ ہوئی....."

"اس کی وجہ بھی سفید فام ترک ہیں۔ انہوں نے اسلام پھیلانے کی جو خدمت کی ہے' وہ مسلمان کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔"

"یہاں تمہاری سوچ میں ایک سقم ہے تھامس۔ مغل تو بالکل سفید فام لوگ تھے۔ پھر انہوں نے کیوں انگریزوں کے آگے ہتھیار ڈالے....."

کچھ دیر ڈاکٹر تھامس نے سر کھجلایا اور کچھ سوچ کر بولا....."الزبتھ! مغل بادشاہ ایک مدت سیاہ رعایا کے ساتھ رہ کر اپنے آپ کو احساس کمتری کے حوالے کر چکے تھے۔ ان کے محلوں میں ہندوستانی ہندو رانیاں تھیں..... ان کے دوست راجپوت اور دشمن مرہٹے تھے۔ اندر سے مغل قوم نے اپنے آپ کو Superior سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔ جب آپ اپنے آپ کو کمتر سمجھ بیٹھتے ہیں تو پھر آپ کو شکست ہو ہی جاتی ہے۔ اور پھر یہ بھی بات ہے مغل سفید فام ضرور تھے لیکن ہم انگریزوں کی طرح نہیں....."

وہ دونوں خوشی سے ہنس دیئے۔

اس روز مس جنی برن بار بار ہنسی۔ اس نے اپنے بال ہاتھوں سے کئی بار درست کیے۔ انہوں نے ایڈریس' فون نمبر بھی ایک دوسرے سے تبدیل کیے لیکن حیرانی کی بات ہے۔ انہیں پھر ملنے کا موقع نہ ملا۔ دو مرتبہ الزبتھ بھی گئی لیکن تھامس سرجری میں تھا۔ تھامس گھر آیا وہ تھیٹر گئی ہوئی تھی۔ اس طرح آنکھ مچولی میں مہینہ گزر گیا اور وہ ہندوستان آ گئی۔ اب اس کے دل میں ایک دن کی تصویر لٹکی رہ گئی۔

شاہد کی کمر مس جنی برن کی طرف تھی اور وہ بالکل تھامس کی طرح کرسی کے بازو پر کہنی ٹکا کر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے والی کرسی پر راحیلہ مغل آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے دو چوٹیاں کر رکھی تھیں جن کا فیشن نرگس اور مدھو بالا نے رائج کیا تھا۔ گود میں ہاتھ دھرے کندھے جھکائے خوشبودار رومال کو گود میں تکتے ہوئے وہ بچی لگ رہی تھی۔ ابھی ٹشو پیپر کا رواج نہ ہوا تھا۔ شاید یہ ایجاد معرض وجود میں نہ آئی ہو۔

اس کمسن شکل کی بچی نما لڑکی کو دیکھ کر شاہد کا فطری وقار بڑھ گیا۔

"اماں کی باتیں سنو تو ایسے پگھل جاؤ جیسے موم۔ وہ تو اگست میں شادی کرنے پر تلی ہیں۔"

باوجودیکہ راحیلہ جانتی تھی کہ اماں کیوں کہتی ہیں اور کیا کہتی ہیں۔ راحیلہ نے اٹھلا کر کہا....."اماں جو بھی کہیں' ہمیشہ میری طرفداری کرتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں۔"

"کیوں نہیں جناب! آج کل کی ماں بیٹے کے بجائے بہو کا ساتھ دیتی ہے۔ ہم نے کہا تھا ناں کہ تم تیاری پکڑو....."

قریب سے ورشن گزری۔ اس کے تن پر ہمیشہ کی طرح سفید کھدر کا شلوار قمیض اور دوپٹہ تھا۔ اس کے ساتھ کشتی نما نیلی پگڑی اور چینٹ قمیض میں اس کا لمبا تڑنگا بھائی پتہ نہیں کس بات پر اونچے اونچے ہنس رہا تھا۔

راحیلہ چاہتی تھی کہ شادی سے متعلق باتیں ہوتی چلی جائیں۔ ساتھ ساتھ رواج کے مطابق وہ لجائی جا رہی تھی..... ''آپ نے جذبی کا کلام پڑھا.....'' ان دنوں جذبی کی شاعری کالج کی لڑکیوں میں ان تھی۔

کرکٹ کھیلنے کے بعد وہ تکان سے نچورا اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ کر کرسی میں ڈھیر تھا۔ اس کی لمبی ٹانگیں اور بڑے بڑے بوٹ راحیلہ سے تھوڑی دور تھے۔ وارڈن صاحب نے اس کی جانب ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا اور پھر ملاقاتی کی چٹ لکھنے میں مشغول ہوگئی۔

راحیلہ سے کچھ دور ان دونوں کی جانب پشت کیے فورتھ کی سرلا چوہان اپنے ڈیڈی سے مل رہی تھی.....

''پر ڈیڈی جی..... ایک سو پچاس میں میرا گزارہ نہیں ہوسکتا۔ ابھی عید ڈنر باقی ہے۔ بسنت لنچ کا چندہ میں نے ادا نہیں کیا۔ میں نے سوشل ورک میں بھی نام دے دیا ہے ڈیڈی جی..... چندا کیسے دوں گی؟''

''بھئی سرلا..... آئی ایم سوری۔ پر Not a pie move.....'' ڈیڈی جی نے کرختگی سے کہا۔

''لیکن..... لیکن ڈیڈی جی! میری ساری سیلف ریسپکٹ خاک میں مل جائے گی۔'' آنسوؤں سے بھیگے لہجے میں سرلا نے کہا۔

''چلو ایک سو ساٹھ..... بس آخری بولی۔''

پلس فور والے ڈیڈی نے جواب دیا۔

''نو ڈیڈی ڈیئر پلیز ڈیڈی سویٹ..... بات تو سنیے پلیز۔'' سرلا گڑگڑائی۔

''جانتی ہو تمہاری ماتا جی نے کیا کہا تھا۔ انہیں پتہ تھا کہ..... ایک پائی بھی بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ پچھلی بار وہ ناراض ہوگئی تھیں۔''

''دو سو پلیز ڈیڈی صرف دو سو۔''

سرلا نے بچوں کی طرح بگڑتے ہوئے کہا۔

راحیلہ کے بالکل سامنے سرلا اور پشت کی جانب شیاما بیٹھی تھی۔ اس کے قریب ایک شاعر نما لڑکا دونوں ہاتھوں کو بار بار مکھی کی طرح ملتا۔

''خواہش مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ
دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہو گا''

گردن تک بڑھائے ہوئے بالوں والا بیمار سا لڑکا بولا۔

''میں نہیں سمجھی اب تمہارا مطلب اس شعر سے کیا ہے۔'' لڑکی نے سمجھتے ہوئے بھی تجاہل عارفانہ سے پوچھا۔

''ہائے وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات۔''

''بس یہ شاعری ختم کرو سوز..... دیکھو کتنا سندر موسم ہے اور تم موڈ سوار کر رہے ہو..... غم کا۔''

"خدانے دل وہ دیا ہے کہ شادکام نہیں.....'' شاعر نے گردن جھکا کر معذرت کے انداز میں کہا۔
"سوسوز! آج میں نے ٹینس کے دوسیٹ جیت لیے مارگر صاحب سے۔ مارگر کہہ رہا تھا کہ میں نے بہت Improve کیا ہے.....''
''کیا اوج پر ستارۂ گوہر شناس ہے.....''
''پلیز یہ Rubbish بند کرو۔ تم نے اُرملا کو دیکھا..... ہے نا.....نو.....اچھا؟ وہ جو میرے ساتھ Easy home آئی تھی۔ پتہ ہے ذرا اچھا نہیں کھیلتی' بس ذرا شہرت بن گئی ہے.....سٹائل ہے' مارگر کہتا تھا۔''
''یہ مارگر مر نہیں سکتا؟.....کسی دن.....''سوز صاحب بولے۔
''ہائے جی مارگر صاحب سے جلتے ہو.....ہی ہی ہی.....مارگر سے Jealous.....بھلا کوئی بات بھی ہو.....''
وہ کانوں تک سرخ ہو کر ہنسنے لگی۔
بیمارلڑ کا نامرد سوز صاحب بولے.....'' تم کیا جانو شیاما۔ کبھی مومن کا یہ شعر پڑھا ہے۔

کیا باتیں بناتا ہے وہ جان جلاتا ہے
پانی میں دکھاتا ہے کافور کا جل جانا''

شیاما کا افیئر ان دنوں ایک مسلمان شاعر سے چل رہا تھا۔ سوز نے پتہ نہیں وارڈن صاحب سے کیا جوڑ توڑ کر رکھا تھا۔ وہ ہفتے میں دو بار شیاما سے ملنے ضرور آتا۔ ہفتہ بھر میں جس قدر شعر پڑھے ہوتے کچھ اپنے نام اور کچھ دوسروں سے منسوب کر کے شیاما کو سناتا اور چلا جاتا.....شیاما کو صرف اس تعریف سے دلچسپی تھی جو سوز وقتاً فوقتاً اس کی کرتا رہتا تھا۔ اس سے زیادہ اسے سوز سے کچھ درکار نہ تھا۔

شاہد اور راحیلہ کچھ دیر خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہے۔ پھر شاہد نے کہا.....''پتہ نہیں اس کی وجہ کیا ہے لیکن علامہ اقبال کہتے ہیں۔ مشرق کے شاعر کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ وہ عورت کے علاوہ اور کچھ دیکھ نہیں سکتا۔ میں نے خود سوچا تھا کہ اس روایت کو جھٹلائیں گے لیکن دیکھ لو.....اس وقت تمہارے سامنے بیٹھے ہیں۔ جیسے بین کے آگے سانپ ہو۔''
''اچھا خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے' آؤ ادھر چلیں۔''
''چلو.....مری جان۔'' زیرلب شاہد بولا۔

جابجا بیٹھے ملاقاتیوں میں سے راستہ بناتے وہ دونوں پیپل کے چھتنارے درخت کی طرف چل دیے۔ وہاں تلے دو نواڑی کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ ایک لڑکا سفید پینٹ اور قمیض میں ملبوس ہاتھ ہلا ہلا کر اپنی کارکردگی دکھا رہا تھا۔ لان میں بیٹھی لڑکیاں اور ملنے والے سب اس کے گرویدہ ستائش بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اسے غالباً کسی کی پرواہ نہ تھی۔ اس کی سفید پینٹ پر جا بجا مٹی کے دھبے تھے۔ سفید قمیض کا گریبان کھلا تھا۔ یکدم وہ کرسی سے اچھلا اور لڑکیوں کے گروپ کے درمیان آ گیا۔ ''پھر میں نے اس طرح Leg Break دی۔ بخدا اس سے سنبھالی نہ گئی۔ چہرہ دیکھنے والا تھا بیٹ مین کا.....درمیانی وکٹ صاف! جناب ہوا میں ہٹ کرتے رہ گئے۔ پھر کوئی نعرے لگے ہیں۔ کوئی تالی بجی ہے۔ تم نہیں آئیں ناں.....سارا لارنس گارڈن گونج گیا تھا تالیوں سے۔''

لڑکیوں میں گھری پاؤڈری بہن نے جمائی لے کر پوچھا..... "ابا جی کا کوئی خط آیا ہے....."

لیکن بریڈ مین کے بھتیجے نے ذرا پروا نہ کی اور جملہ لڑکیوں کے گروپ سے بولا..... "واللہ کوئی سٹائل تھا میرا۔ کوئی میرے جیسا گیند spin تو کر کے دکھائے۔ کیپٹن نے میرے سامنے کہا تھا۔ یہ لڑکا آئندہ بین الاقوامی شہرت کا مالک ہوگا۔ تم کب مانو گی عائشہ..... گھر کی مرغی دال برابر..... میچ دیکھنے نہیں آئیں' کمال ہے....."

سامنے بیٹھی لڑکی غالباً نوجوان کی بہن تھی۔ اس نے لمبی جمائی لے کر پوچھا..... "تمہارے پاس کچھ ایکسٹرا پیسے ہیں؟"

بریڈ مین کے بھتیجے نے اس کی التجا نہ سنی اور بولتا چلا گیا۔

"مجھ سا باؤلر نہیں ملے گا..... سارے انڈیا میں..... کوئی ہوٹنگ ہوئی ہے ہمارے دشمنوں کے کوئی نعرے لگے ہیں۔ سرفی پاؤڈر ہائے ہائے سرفی پاؤڈر ہائے ہائے....."

نوجوان تالیاں بجا بجا کر ہوٹنگ کا منظر پیش کرنے لگا۔ لڑکیاں کھی کھی کر کے ہنسنے لگیں اور لان کے اوول میں عجب قسم کی مسرت پھیل گئی جو صرف نوجوانوں کے قہقہوں سے پھیلتی ہے۔

شاہد اور راحیلہ ان کے قریب سے گزر رہے تھے..... شاہد نے چھیڑنے کی غرض سے کہا..... "بالکل..... تمہارے کالج پہنچ کر تو واقعی نعرہ لگانا پڑتا ہے میکس فیکٹرز زندہ باد....."

"ہمارے کالج میں چیک اپ نہیں ہوتا جی۔ مس ہنی برن جرمانہ لگا دیتی ہیں۔ گھر رپورٹ جاتی ہے۔" عین اس وقت جب ملاقات کافی رنگین ہو جاتا' اچانک کہیں سے ملاقات کا وقت ختم کرنے کے لیے مس ہنی برن گھنٹی بجا دیتی۔

شاعر نے آہ بھری اور قیامت تک آتے رہنے کا وعدہ کیا۔

کرکٹر نے کرسی کے بازو کے ساتھ ٹکے ہوئے ٹینس کے ریکٹ کو اٹھایا اور بہن سے پندرہ روپے لے کر لڑکیوں کے گروہ کو چھوڑ دیا۔

ساری لان پر نمی میں بھیگا اندھیرا پھیلا تھا۔ آہستہ آہستہ تمام باپ' بیٹے' رازدان' عاشق' منگیتر رخصت ہو گئے۔ شاہد کئی بار خدا حافظ کہنے کے باوجود راحیلہ کے قریب کھڑا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ راحیلہ کے گھر سے پھر ملاقات کرنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ وہ اسی ایک ملاقات میں عمر بھر کی خوشی کو قید کرنا چاہتا تھا۔ آخری بار شاہد نے سانس بھری آواز میں کہا..... "راحیلہ خدا حافظ۔"

دور اونچے چھتنارے سنبل کے پیچھے سے وارڈن نے آواز دی..... "آ جاؤ راحیلہ مس ہنی برن ناراض ہو رہی ہیں۔"

راحیلہ نے ہاتھ بڑھا کر شاہد کو چھونا چاہا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ واقعی وہ گوشت پوست کا بنا ہوا انسان ہی تھا۔ شاہد نے سگریٹ کی راکھ اپنی پینٹ سے جھاڑی۔ بغیر حق کی سائیکل کو گرفت میں لیا اور پھر ان جانے قدموں سے ہاتھ کھولتا بند کرتا بڑے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

کالج کی مین بلڈنگ اندھیرے کا لبادہ اوڑھے تھی۔ فضا خاموش تھی۔ اس فقیر کی مانند جو کسی

ساتھ لے کر گداگری کرنے آ نکلا ہو۔ یہاں وہاں جھینگر بولتے تھے لیکن اُن کی آواز بڑی کرخت تھی۔ جیسے کسی عبادت گاہ میں ڈھول کا ارتعاش۔

گرمی بہت تھی لڑکیوں نے ہوسٹل سے متصل لان پر چارپائیاں بچھائی ہوئی تھیں۔ مسہریوں سے ڈھکی چارپائیاں‘ راحیلہ کو پھریری آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ورشن کی چارپائی تھی۔ ورشن کا ہاتھ مسہری سے باہر تھا۔ وہ راحیلہ کا ہاتھ پکڑنا چاہتی تھی لیکن راحیلہ شام کی ملاقات میں گم تھی۔

سوڈھی سکھوں کی دراز قد ورشن صحت کا پاکیزہ نمونہ تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں سخت اور جسم گواہ تھا کہ اس میں ایسے سکھوں کے جرثومے تھے جنہوں نے کھیتوں میں سخت مشقت اور خوشدلی سے فصلیں اُگائی تھیں۔ ورشن کبھی روٹی لے کر کھیتوں پر نہ گئی لیکن اس کی ماں دادی نے اپنے باپ‘ بھائی‘ شوہر‘ بیٹے کے لیے کڑی مشقتیں جھیلی تھیں۔ وہ ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی جہاں نہ تو مرد نے اپنی ریاضت کا کبھی رعب دیا نہ ہی کوئی عورت بلبلائی کہ اس پر ظلم ہو رہا تھا۔ اس گھرانے کے مرد‘ عورت ساتھی تھے اور اپنے کام کے بوجھ تلے پس کر بھی انہیں احساس تھا کہ ان کے ساتھی کا کام ان سے سخت ہے۔ شاید یہ صحت کے کرشمے تھے۔ ان کی سادہ زندگی کا معجزہ تھا۔ اچھی تازہ خوراک نے ان میں صحت مند رویے پیدا کر رکھے تھے..... سوڈھی سردار ہر بات پر ہی واہگرو کے کرم کا شکریہ کرنا پسند کرتے۔ ان کے چہروں پر ہاتھ سے کام کرنے والوں کی انوکھی پرسنتا تھی۔ سردارنیاں دودھیل تھیں۔ اپنی گود میں بچے پال کر ان کے کیس اپنے ہاتھوں دھو کر امرت چکھنے کی رسم کی منتظر رہتیں۔ ان کی زندگی اتنی سخت تھی کہ وہ چارپائی پر لیٹنے کو ہی عیاشی سمجھتی تھیں۔ بچوں سے فارغ ہو چکتیں تو گائے بھینس کے گرد اگرد ہو جاتیں۔ انہیں چیزوں میں صرف سبزیاں ترکاریاں‘ دہی لسی مکھن کا شوق تھا۔ وہ بے جان چیزوں کو استھان نہیں دیتی تھیں جس قدر وہ جاندار چیزوں پر مرتی تھیں اور ورشن کی دادی کہتی دیکھ پرم کور فصل کے کورے چندے میں مران مٹی چڑھی ہے‘ کیسے ناچ رہی ہے مستانی۔“

یہ سکھ گھرانے اپنے خاندان‘ ملک‘ معاشرے سے اس درجہ مطمئن تھے کہ انہوں نے چندولال کو معاف کر دیا تھا جس نے ان کے گرو ارجن کی اہم کار جو دشا بنائی‘ وہ عبرت ناک بھی تھی اور حیا سوز بھی بلکہ اس مارشل ریس کے لوگ تو اس درجہ شانت تھے کہ دشمن کی صحیح نشاندہی نہ کر سکے اور اسی دشمن کے ساتھ رشتے ناطے کر لیے۔ ہر مارشل ریس میں ایک بڑی کوتاہی ہوتی ہے۔ وہ چونکہ بہادری کو شعار زندگی بناتی ہے۔ اس لیے اسے خوشامد‘ بزدلی‘ جی حضوری کے کم دار ہتھیاروں کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ ہمیشہ ہر معاملے میں کھلے میدان میں سردھڑ کی بازی لگا کر زندہ رہنے کو اور معاملے کو مکا بجا کر تلوار سونت کر حل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ انہیں کمانڈو بن کر بحث کرنے سے الرجی ہوتی ہے..... سوڈھی سرداروں کے لہو تھرتھر کر ورشن میں آئے تھے۔

ورشن کا لہجہ کھردرا‘ آواز اونچی‘ باتیں مختصر اور جملے ان گھڑ ہوتے لیکن اس کی نیت ستھری‘ عمل ٹھیک اور بات طنز سے پاک ہوتی۔ جب کبھی وہ راحیلہ سے بات کرتی تو اس کی پنجابی میں ماہیا کی تانیں ہیر کے بند‘ بالو کے ٹپے جھلکنے لگتے۔ وہ لیے سے لیے نام کے ساتھ بھی ”جی“ کا استعمال کرنا پسند کرتی تھی۔ یہ ”جی“ اس کی معاشرت کا حصہ تھا۔ وہ اس چھوٹے سے لفظ سے قصیدہ‘ غزل‘ رباعی سب کچھ بنا لیتی۔

راحیلہ تکیے پر سر دھرے آسمان پر چاند کے طلوع ہونے کی منتظر تھی۔

''راحیلہ جی..... کیا سوچ رہی ہو؟''

''جب میں گھر سے چلی تھی تو کسی نے مجھے بتایا تھا کہ اس کالج میں مجھے گُسم اوما نانی ملے گی.....''

''وہ کون جی.....؟'' ورشن نے پوچھا۔

''میری بچپن کی سہیلی ہے۔ پچھلے دو تین سال سے بچھڑ گئی ہے..... میں نے تو بر سرے بھی پوچھا۔ وہ کہہ رہی تھی جنرل رجسٹر میں نام تو درج ہے..... لیکن پتہ نہیں فیس والے رجسٹر میں نام کیوں نہیں۔''

''پتہ ہے کیا کریں کل صبح اسمبلی کے وقت دروازے میں کھڑے ہو کر دیکھیں۔ وہاں تو کالج شروع ہونے سے پہلے ساری بورڈرز اور ڈے سکالر جمع ہوتی ہیں۔ وہاں تو راحیلہ جی اسے ہونا چاہیے.....''

''چلو دیکھیں گے ورشن.....''

دونوں اپنی اپنی چارپائی پر بالکل سیدھی لیٹی تھیں۔ ورشن نے اپنا بایاں ہاتھ اور راحیلہ نے دایاں مسہری سے نکال کر مضبوطی سے ایک دوسرے کو تھام رکھا تھا۔ ان ہاتھوں کی اپنی گفتگو جاری تھی۔ بہناپا' دوستی' رفاقت وفا بہت سی باتیں یہ دونوں ہاتھ بھی گرم توانائی اور لہو کی مسلسل رفتار سے کر رہے تھے۔

''تم سمجھتی ہو راحیلہ جی کہ اوما تمہاری دوست ہے؟ کیا کوئی ہندو لڑکی آپ کی دوست ہو سکتی ہے؟''

راحیلہ دماغی طور پر سست تھی۔ واقعہ گزر جانے کے بہت بعد اسے سمجھ آتی کہ اصل میں کیا ہوا؟ کسی گستاخ جملے کا جواب کئی دن بعد میں سوجھتا۔

''دادا ابا کہا کرتے ہیں کہ دوست کا لفظ سہیلی کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اوما میری سہیلی تھی..... ہے اور رہے گی..... دادا ابا قسم کے لوگ ابھی چھوٹی چھوٹی لفظی غلطی بھی پکڑا کرتے تھے۔''

''راحیلہ جی..... یہ جو اکثریت ہوتی ہے ناں کسی جگہ کی بھی کیوں نہ ہو..... اس اکثریت کا خیال ہوتا ہے کہ وہ ہولے ہولے پریم کے ساتھ اقلیت کو چوس لے گی..... جیسے سیاہی چوس سیاہی چوس لیتا ہے لیکن سیاہی چوس کو پتہ نہیں چلتا کہ تھوڑی سی سیاہی سارے سیاہی چوس کا رنگ بدل دیتی ہے..... ہمارے ہندوستان کی اکثریت تو ویسے بھی بہت جیاوہ ہے۔ آپ لوگ تو سامنسی بارہ پرسنٹ ہوں گے۔''

''اس کے باوجود..... وہ میری سہیلی تھی اور رہے گی.....''

''آپ راحیلہ جی جو مرضی کہہ لیں۔ جو جی چاہے سمجھ لیں' وہ آپ کی سہیلی بھی چاہے آپ کو دوست ہی مانے پر..... کسی توحید پرست کے لیے کسی بت پرست کو دوست سمجھنا بڑا کٹھن ہے.....''

''کیوں کس لیے؟.....''

''میرے بھاپا جی کہتے ہیں۔ سکھ جاتی کو بھی ایک دن تجربہ ہوگا۔ ہندو جاتی میں رشتے ناطے کر کے ہاتھ پاؤں کٹوا لیے ہیں۔ ہندو کی محبت میں مغل دشمنی کی ہے۔ ایک دن پتہ چلے گا کہ ہندو سکھوں کی طرح پاگل نہیں ہیں۔ بے وقوف نہیں ہیں۔ باتوں میں آنے والے نہیں ہیں۔''

ورشن کے والد سودھی سردار تھے۔ انہوں نے دس بارہ سال پہلے اپنی آدھی زمین پریت نگر کے نام وقف کر دی تھی۔ وہ پریت لڑی رسالے کے لیے باقاعدہ ایک کثیر رقم دیتے رہتے تھے۔ خوابوں کے دیکھنے والے بڑے ہی Radical خیالات کے انسان تھے۔ ان کی خواب پرستی نے ان کو کمیونسٹ خیالات کا بنا دیا تھا۔ سردار پریتم سنگھ چاہتے تھے کوئی ایسا نظام ہندوستان میں مستعمل ہو جائے جس کی بدولت امیر غریب ایک ہی گھاٹ پانی پیئے۔ ایک سی عزت نفس کا مالک ہو۔ انہوں نے اپنے سات بیٹوں کو بڑی تعلیم دلوائی تھی اور تعلیم دلوانے کے بعد پریت نگر میں کھپا دیا۔ ورشن اپنے بھاپا جی کے خیالوں کی چنڈی ہوئی تھی۔ اس کا نام اس پر اس لیے بھی جچتا تھا کہ وہ اتنے بڑے کالج میں دیکھنے کی چیز تھی۔ صحت مند، سیدھی اور مضبوط!

''آپ مغل لوگ بھی پورے پورے سکھ ہیں۔ اتنے برسوں یہاں حکومت کی اور کچھ نہ جانا کہ یہاں کی اکثریت کیسی ہے۔ منہ میں رام رام کو تو خوب جانا پر بغل کی چھری نہ دیکھی۔ آپ مغل لوگ چاہتے تو برصغیر کے لیے کیا کیا نہ کر جاتے۔ پر جس کو اپنے نام کی فکر پڑی ہو وہ واقعی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ تاج محل، شالیمار..... جہانگیر کا قلعہ، یہ ساری عمارتیں کس کی یاد دلاتی ہیں۔ بادشاہوں کی، مغل بادشاہوں کی رعایا کی نہیں.....وہ تو بس ایک شیر شاہ سوری تھا پشاور سے کلکتہ تک سڑک بچھا دی.....تین چار سال کے اندر.....ذرا سوچیں راحیلہ جی نام تو اس کا بھی رہا..... پر اور طرح سے.....''

جس روز ان دونوں لڑکیوں کا داخلہ فرسٹ ایئر میں ہوا تھا اسی روز انہوں نے فیصلہ کیا کہ اگر اکیلا کمرہ ملا تو بھی اور اگر ڈومیسٹری میں جگہ ملی تو بھی وہ ساتھ رہیں گی۔ دونوں لڑکیاں انٹرویو کے لیے نمبر وار قریب قریب بنچ پر بیٹھی تھیں۔ پہلے راحیلہ آفس میں پرنسپل سے ملنے گئی اور مسکراتی لوٹی۔ پھر ورشن کی باری تھی۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا..... ''راحیلہ جی جو میں واہگرو کی کرپا سے داخل ہو گئی تو ہوسٹل میں اکٹھے رہیں گے.....''

''بالکل.....میں فیس جمع کرانے جا رہی ہوں۔ آپ بھی وہیں آ جانا.....''

ورشن اپنے خاندان کی پہلی لڑکی کالج میں داخلے کے لیے آئی تھی۔ اس کے کھدر کے لباس اور پنجابی جوتی میں دیہاتی پن تھا لیکن وہ اپنے لباس پر نازاں تھی۔ انگریزی داں انگریزی شناس لڑکیاں اس کے اس حوصلے سے کچھ کچھ بدکتی بھی تھیں۔

ورشن سارے کالج میں شاید واحد لڑکی تھی جو اپنے لباس، بولی، رہن سہن پر نہ تو شرمندہ تھی نہ نازاں۔ بس وہ جو کچھ کہتی تھی.....اس کے لیے کافی تھا۔ فرسٹ ایئر میں چند اور سکھ لڑکیاں بھی تھیں جو اس مشنری کالج سے انگریزی زبان، تہذیب اور اطوار سیکھنے آئی تھیں۔ وہ اپنے سکھی پنجابی لہجے پر تھوڑی تھوڑی شرمندہ، اپنے اکھڑ طریقوں پر پشیمان رہتی تھیں۔ مسلمان لڑکیاں تو ویسے ہی منفعل رہنے کی عادی تھیں لیکن یہ لڑکیاں جو بڑے سرداروں کی بیٹیاں تھیں، جلد از جلد انگریزی لب و لہجہ اپنانے میں لگی رہتی تھیں۔ ہندو لڑکیاں البتہ اکثریت میں ماڈرن لبرل اور progressive تھیں۔ وہ شام کے وقت چولیاں ساڑھیاں پہن کر روشوں پر ٹہلتی رہتیں۔ ان کے لمبے بالوں کے جوڑے چنبیلی کے ہاروں سے سجے ہوتے۔ اکثریت مشن سکولوں سے پڑھ کر آئی تھی۔ ان کا انگریزی لب و لہجہ درست تھا۔ یہ لڑکیاں بڑی اونچی ہوا میں اڑتی تھیں اور سفید فام پروفیسروں کا دست راست تھیں۔

ایسے ہی ایک رات جب راحیلہ اور ورشن ٹہل رہی تھیں تو ورشن نے محبت سے پوچھا۔

"وہ جو اس شام ملنے آئے تھے وہ....."

"ہاں شاہد....."

"کتنے سوہنے ہیں....."

"تمہیں بھی لگے؟....." راحیلہ نے قدرے گلابی ہو کر پوچھا۔

"کیا لگتے ہیں تمہارے؟"

راحیلہ نے ابھی پاؤں پر جھوٹ بولنا نہ سیکھا تھا' گھبرا گئی۔

"تمہیں شاہد جی سے بہت محبت ہے....."

"توبہ توبہ....." راحیلہ بغلیں جھانکنے لگی۔

"تم بتانا نہیں چاہتیں۔"

راحیلہ نے کلائی میں پڑے موتیا کے گجرے سے پھول توڑتے ہوئے کہا....."لو کوئی بتانے والی بات بھی ہو۔"

"توبہ جی....."

یہ گجرا اسی شام کوئی لڑکی اس کے تکیے پر رکھ گئی تھی۔

"تم بہت چاہتی ہو اسے..... واہگرو کی سوگند سچ بتاؤ ناں؟"

"اونہہ وہ بہت چاہتا ہے مجھے۔"

اس وقت سامنے سے ایک ٹولی گاتی ہوئی ان کی طرف بڑھی۔ اس ٹولی میں زیادہ وہ لڑکیاں ہندو تھیں اور وہ بڑی لہک کے ساتھ گا رہی تھیں God is my sheperd وہ جب راحیلہ اور ورشن کے پاس آئیں تو رک گئیں۔

پریتا نے منہ بنا کر انگریزی میں کہا....."کل مس ہنی برن سے کہیں گے کہ شام کو ساری لڑکیاں کلاک وائز سیر کیا کریں۔ اس طرح جگہ جگہ رکنا پڑتا ہے....."

"ہم تو وہیں راستہ کھلا ہے۔ آپ لوگ گزر جائیں....."

شکنتلا کالج کی ڈانسر مشہور تھی۔ وہ آنکھیں نچا کر گردن گھما پھرا کر باتیں کرتی' اترا کر اس نے ساتھ والی سے کہا....."پتہ ہے سارا کالج over-crowded ہے جنہیں بالا خر دیہات میں رہنا ہے۔ انہیں مشنری کالجوں سے غرض؟" سب کھی کھی کر کے ہنس دیں۔

ورشن تھوڑ دل نہ تھی لیکن تڑپ گئی۔ چند لمحے توقف کے بعد جل کر بولی....."یہ آپ نے ٹھیک کہا۔ جنہیں بالآخر تیل گھی ہی تولنا ہو سرلا اسے یہاں کالج کی تعلیم کی ضرورت؟"

سارا گروپ ہنستے ہنستے چپ ہو گیا۔ کالج میں سب جانتے تھے کہ سرلا کے پتاجی معمولی دوکاندار تھے اور اب ترقی کرتے کرتے ملٹری ٹھیکیدار بن گئے تھے۔ فوج کو گھی' تیل سپلائی کرتے ان کی جیبیں سونے چاندی سے بھر گئی تھیں۔

"آؤ چلیں ورشن..... بس..... ہاں جی ایکسکیوزی....."

راحیلہ ورشن کو کھینچ کر آگے لے گئی۔ بظاہر ورشن نے اس واقعے کو بھلا دیا لیکن جب بھاپا جی گھر کا ساگ' مکھن' اچار اور بہت سارے گنے چھوڑ کر گئے تو ورشن نے سرلا کی غیر موجودگی میں دعوت کی۔ حالانکہ وہ اسی کی ڈومیسٹری میں رہتی تھی۔ ورشن کا خیال تھا کہ سرلا اس کی اس دعوت کا بھی مذاق اڑائے گی۔

اس واقعے کے بعد ورشن میں ایک تبدیلی آ گئی۔ اب کبھی کبھی وہ کریپ کا سوٹ اور سینڈل بھی پہننے لگی لیکن اس طرح کرنے سے اس کی شخصیت میں کم فرق آ سکا۔ وہ پہلے بھی کسی جاٹ کی بیٹی لگتی تھی' پھر بھی سوڈھی سرداروں کی سپتری لگتی رہی۔ انگریزی خواں انگریزی داں لڑکیوں کے احساسِ برتری نے اتنا ضرور کیا کہ ورشن کی شخصیت میں ہلکی سی دراڑ آ گئی جو آگے بڑھتے بڑھتے اندر ہی اندر کئی فاصلے طے کرتی آپریشن بلیو سٹار تک گہری کھائی بن گئی.....کوئی فرد یا قوم ایک دن میں احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوتی۔ یہ ایک لمحے سے دوسرے تک ایک صدی سے دوسری تک..... باپ دادا کے لہو سے پوتے تک.....سرکتی چلی آتی ہے۔ جیسے ندی میں ادھر اُدھر سے پانی اکٹھا ہوتا ہوا دریا بنتا ہے۔

مسلمان جاگیرداروں اور سکھ زمینداروں میں کچھ واضح فرق اور مماثلتیں موجود ہیں.....مسلمان جاگیردار ایک مراثی یا مزارعہ کو بغل بچے کی طرح پالتا ہے جو اس کے گن اور اوگن پر جی سائیں سبحان اللہ سبحان اللہ کرتا رہتا ہے۔ خوشامد پسندی مسلمان جاگیردار کا بنیادی مزاج ہے۔ وہ مربعوں کے بغیر شاید زندہ رہ سکے لیکن پنکھا جھلنے والے ساتھی کے بغیر سانس نہیں لے سکتا۔ اگر گھروالی کھردی طبیعت کی مالک ہو تو پھر چودھری کو طوائف تلاش کرنا پڑتی ہے جو قدم قدم اس کے صدقے واری جائے۔ چودھری مراثی طوائف مزارعہ کی موجودگی میں ہوا خارج کرے تھوکے' گندے پاؤں ان کی گود میں رکھ کر دبوائے' اپنے جھوٹے برتنوں میں کھانا ڈال کر دے.....وہ جاگے خوشامدی کے حضور سو جائے' خراٹے لے' وہ پنکھا جھلتے جائیں گے۔ کمر اور سر میں لاڈ سے دھموکے مارے۔ خوشی اور غصے دونوں موقعوں پر ماں بہن کی گالیاں دے کر نوازے۔ کبھی چارپائی پر ساتھ بیٹھے۔ کبھی کچہری میں اپنی کرسی کے پیچھے کھڑا رکھے۔ ایک معمولی کتے' باز طوطے کے لیے میلوں چلا جائے۔ یہ سارے ظلم نہیں کیونکہ عام طور پر جاگیردار بھی انسان ہوتا ہے۔ اس کے دل میں بھی نیکی اور بدی مثل صاف اور گندے لہو کے ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ وہ بڑی بڑی نیکیاں بھی کر گزرتا ہے صرف فرق اتنا ہے کہ وہ اپنے مراثی' مزارعے' طوائف اور کسی نوعیت کے بغل بچے کی عزت نہیں کر سکتا۔ عزت کی شیرینی پر صرف جاگیردار کا حق ہے۔ وہ صرف لہو پیتا ہے۔ باقی ہڈی بوٹی کتوں' گیدڑوں کے آگے ڈال دیتا ہے۔ کمی کمین سے جاگیر سے اپنی ذات کے لیے تعریف خوشامد اور دبواتے رہنے کی خواہش رکھتا ہے۔ جس قدر خوشامد ہو گی ویسا ہی مزارعے کا گھر دانوں سے بھرے گا' من برسے گا۔ قرض معاف ہوں گے.....سکھ جاگیردار سردار ایک نئے مذہب کی گرفت میں آئے ہوئے ہیں وہ بظاہر.....سب سکھوں کو برابر سمجھتے ہیں۔ توحید اور اخوت پر کاربند سکھ سردار جب بھی بغل بچہ پالتا ہے یا تو وہ مذہبی سکھ ہوتا ہے یا پھر مسلمان مراثی.....یہ بھی پاؤں دبوانے' گھٹنے چھنے' شادی بیاہ کے پیغامات لے جانے لے آنے کے کام آتے ہیں۔ ان کے وڈیانے سے سرداری کا خون جوش میں آتا اور مارشل ریس کے اچھے اور غلط فیصلے طے پاتے ہیں۔

لیکن ورشن کے والد نے اپنی آدھی زمین پریت نگر کے لیے وقف کر کے ایک آدرشی زندگی کو جنم دیا تھا۔ وہ دل سے مانتے تھے کہ سوا لاکھ آدمی اور ایک سکھ ایک ہی معنی رکھتا ہے.....بڑے سے بڑے جتھے کی روح ایک ہو سکتی ہے.....

ورشن بھی اپنے باپ کی طرح آدرشوں کی خاطر جینا چاہتی تھی اور اس کے لیے اسے سب سے بڑا آدرش کیمونزم لگتا تھا۔

کالج کی آخری گھنٹی کچھ دیر پہلے بجی تھی۔ کچھ لڑکیاں کلاس رومز سے نکل کر لان کی کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ ان لڑکیوں کو اپنی گاڑیوں کا انتظار تھا اور چہروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ایک کار کے نہ آنے سے وہ زندگی سے بیزار ہو چکی ہوں۔ ایک گروہ ٹیوب ویل کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس کے بڑے چو بچے میں پانی یوں کلبلا رہا تھا جیسے لسی بلوئی جا رہی ہے۔ سکھ چین کی لمبی ڈالیاں ٹیوب ویل کے اوپر لہرا رہی تھیں لیکن ان کے پتوں کا عکس پانی میں کلبلا نہیں رہا تھا۔ کچھ فورتھ ایئر کی لڑکیاں حوض کے پانی میں ٹانگیں ڈبوئے متفرق قسم کی بحثیں کر رہی تھیں۔ عجب بات ہے کہ قیام پاکستان کچھ اتنا دور نہ تھا لیکن ان لڑکیوں کی گفتگو میں بڑی یگانگت تھی اور وہ ابتلا جس کی سارے ہندوستان پر پرچھائیں پڑ رہی تھی اس کا ان باتوں میں نام و نشان تک نہ تھا۔

راحیلہ اور ورشن آہستہ آہستہ اکیڈیمک بلڈنگ سے نکل کر ہوسٹل کی طرف جا رہی تھیں۔ دونوں کی چال میں بڑا وقار تھا اور یوں نہ لگتا تھا کہ راحیلہ فرسٹ ایئر کی احساس کمتری میں مبتلا لڑکی ہے جو فورتھ ایئر کی لڑکیوں اور ان کی منجھی ہوئی انگریزی سے مرعوب ہے۔ اس کے قدم عزم سے بڑھتے' جمتے اور آگے بڑھ جاتے۔ اسے چلتا دیکھ کر لگتا سمندر کی لہریں ساحل کی جانب بڑھ رہی ہیں۔ بڑے ٹھاٹھ سے بڑے جلال سے.....

"یہ لاہوری لڑکیاں تو ہمیں کچھ بھی نہیں سمجھتیں ورشن....."

"نہ سمجھیں راحیلہ جی.....ہم بھی انہیں کچھ نہیں سمجھتیں....." ورشن کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

"ان لڑکیوں کو ایک بڑا فائدہ ہے.....؟" راحیلہ نے کہا۔

"کیا جی.....؟"

"یہ لاہور میں رہی ہیں ساری عمر.....ان کا بڑے شہر کا Exposure ان میں خود اعتمادی پیدا کرتا ہے۔ ہم چھوٹے شہر کی لڑکیاں اس Confidence کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ پھر ان کی انگریزی کی تعلیم بھی ہم سے بہتر ہے.....بول چال تو بھئی کمال ہے۔"

ورشن اندر ہی اندر راحیلہ سے متفق تھی لیکن بظاہر سیسہ پلائی دیوار کی طرح نظر آتی تھی۔

"انگریزی سے کیا فرق پڑتا ہے.....انگریزی کونسی ہماری ماں بولی ہے۔"

"ہمیں تو دادا جی نے مروایا' وہ ہمیشہ کہتے تھے اردو سیکھو اردو بولو....."

"پنجاب کے لوگوں کو صرف پنجابی بولنی چاہیے راحیلہ جی.....ہم جب تک اپنی بولی کو مضبوط نہ کریں گے تو کیا باہر کے لوگ آئیں گے۔ وارث شاہ کو دیکھ لیں.....کیا رعب سے لکھتے ہیں۔" وہ زبانی وارث شاہ کی ہیر سے کچھ بند بولنے لگی.....

لیکن راحیلہ اپنے خیالات میں کچھ افراتفری محسوس کر رہی تھی۔ پنجاب کے Influential گھرانوں نے انگریزی کو اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا اور وہ انگریزی بولتے اپنے آپ کو کرستان محسوس نہیں کرتے تھے۔ سکھ پنجابی پر قابض ہو گئے تھے اور پنجابی زبان بھی اپنے لب و لہجہ کے اعتبار سے دو حصوں میں منقسم ہو چکی تھی۔ اردو اہل زبان کی تھی اور جب تک

گز گز پران کی مہر نہ ہوا روہ وثقہ کبھی نہ جاتی۔ پنجابی مسلمانوں نے اردو بولنا لکھنا سیکھ لیا تھا لیکن کبھی ان پر گلابی اردو کبھی لب و لہجہ اور کبھی تذکیر و تانیث کا غلط استعمال وارد ہو جاتا۔ پھر بھی ہولے ہولے کبھی چھپ کر کبھی اعلانیہ ایک نئی اردو پنجاب میں جنم لے رہی تھی۔ اس اردو کا کہیں اس پاکستان سے گہرا تعلق تھا جو ابھی پیدا نہ ہوا تھا۔ اس اردو کا ارادہ دور دراز کے ملکوں میں پھیلنے کا تھا..... کینیڈا' جاپان' چین' جرمن..... یہ وہ زبان تھی جسے پنجاب کے اردو بولنے لکھنے والے تشکیل دے رہے تھے۔ شعوری طور پر نہیں..... کسی اور مشن کے تحت کسی ان دیکھے پروگرام کی خاطر.....

راحیلہ نے شپٹا کر گیٹ کی جانب دیکھا۔

مایوس' کندھے جھکتا شاہد سائیکل گھسیٹتا گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ مس ہنی برن سے ملا تھا اور بڑی لجاجت سے دست بستہ آرزو ظاہر کی تھی کہ وہ اسے راحیلہ سے ملنے کی اجازت دے۔ مس ہنی برن کی عادت تھی' وہ کسی اچھے خاصے بیرسٹر سے بڑھ کر جرح کرتی تھی۔ وہ لڑکی کے رشتہ دار کو تپاک سے سامنے والی کرسی پر بٹھا کر بڑے تحمل سے اس کی باتیں سنتی۔ عینک اس کی ناک کی پھننگ پر پھسل آتی اور وہ عینک کے اوپر سے رشتہ دار مرد کا یوں جائزہ لیتی کہ ملاقاتی چور محسوس کرتا۔ جو مرضی کر لو یا کہہ لو پھر بھی وقت سے پہلے ملنے کی اجازت نہ ملتی۔ آخری پیریڈ ختم ہونے میں صرف بیس منٹ باقی تھے لیکن مس ہنی برن غالباً ہر ملاقاتی سے بغض للہی رکھتی تھی۔ ساری باتیں' استدلال' مجبوریاں سننے کے بعد بولی..... "امید ہے آپ میرے ساتھ Co-operate کریں گے۔ لڑکی کے اکیڈیمک کریئر کا سوال ہے۔ امید ہے آپ میرا نکتہ نظر سمجھتے ہیں۔ اگر آپ پرنسپل صاحب سے مل لیں تو شاید وہ ملاقاتیوں کے ٹائم سے پہلے راحیلہ کو ملنے کی اجازت دے دیں۔"

جیسی وارڈن ویسی پرنسپل ہو گی..... شاہد نے برآمدے کے ستون کے ساتھ لگی سائیکل سیدھی کی اور گیٹ کی طرف چلنے لگا۔

اس وقت آخری گھنٹی بجی۔ لڑکیاں اپنی اپنی جماعتوں سے ایسے نکلیں جیسے قیدیوں کو پروانہ آزادی ملا ہو۔ وہ مڑتی ہوئی سڑک پر رک کر اس سیلاب نسواں میں راحیلہ کو تلاش کرنے لگا۔ وہ ایک لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تیز تیز باتیں کرتی چلی آ رہی تھی۔

محسوسات کا بھی عجب چکر ہے۔ ایک ہی حالات ایک ہی وقت میں سے گزرتے ہوئے دو لوگوں کے تاثرات بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ دونوں ہی شک و گمان کے حوالے سے ایک دوسرے کو جانچتے اور پہچانتے ہیں اور حقیقت سے کہیں دور جا بھٹکتے ہیں۔ شاہد اور راحیلہ بھی کراس کرنے والی ٹرینوں کی طرح ایک دوسرے کو قریب پا کر بھی رک نہ سکے۔

شاہد نے جب راحیلہ کو آتے دیکھا تو اسے عجیب سا لگا۔ اپنے شہر میں جب بھی اس نے راحیلہ کو دیکھا' وہ سر ڈھانپے نظریں جھکائے میڈونا سی بنی نظر آئی لیکن اس وقت یہ ایک نئی راحیلہ تھی۔ میڈونا سی معصومیت کے ساتھ ساتھ نسوانیت کی پوری خداداد شوخی' الھڑپن اور چیلنج بھی موجود تھا..... کیا مرد کبھی بھی کسی عورت کو پورا پورا دیکھ سکتا ہے؟ وہ باہر جانے والی مین سڑک سے کچھ ادھر روش پر باڑ کے کنارے کھڑا ہو گیا لیکن راحیلہ اس کی طرف نہیں آئی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور پھر لڑکیوں کے ریلے میں غائب ہو گئی..... شاہد کھڑا سوچتا رہ گیا کہ آخر یہ

لڑکیاں اس قدر بے اعتنائی کیوں برتتی ہیں۔ کیا ہوا اگر میں ملاقاتوں کے وقت سے پہلے آ ہی گیا تھا۔ تو کیا اس روش تک چند لمحوں کے لیے آ نہ سکتی تھی..... چند باتیں..... اک سلام..... نظروں کا ٹکراؤ..... یہ سب کیا ہے؟ تجاہل عارفانہ۔ بے اعتنائی..... سرد مہری۔

راحیلہ کا ارادہ تھا کہ وہ ورشن کو اگلے موڑ پر چھوڑ کر جلدی سے کالج کے مین گیٹ کی طرف جائے اور یقیناً شاہد اتنی جلدی غائب نہیں ہو جائے گا لیکن جب وہ الیسٹر کی باڑ کے ختم ہوتے روش کے مڑنے تک پہنچی تو شاہد سائیکل پر سوار گیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ ایک بار بھی اس نے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش نہ کی۔

''لو تمہارے کزن تو چلے بھی گئے.....'' ورشن نے راحیلہ سے کہا۔

''ہاں.....''

راحیلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے..... یہ ہمیشہ ایسے کیوں ہوتا ہے۔ شاہد اتنا انتظار کیوں کرواتے ہیں۔ وہ اس قدر جلد کیوں روٹھ جاتے ہیں۔ جس چوکھٹ پر سر جھکاتے ہیں اسی کو تو ذکر کیوں دم لیتے ہیں۔

راحیلہ نے پھاٹک کی جانب مڑنے کا ارادہ چھوڑ دیا۔

''شاید کوئی Message چھوڑ گئے ہوں۔ چلو مس جتی برن سے پوچھتے ہیں۔''

''آ پی ڈنر کے وقت مل جائے گا.....''

لڑکیاں ہوسٹل کی طرف بڑھنے اور ٹکڑیوں میں بٹنے لگیں۔

یہ کالج کی الیکشن کا زمانہ تھا۔

راحیلہ اب آنسوؤں کے بہت قریب تھی۔

ساتھ چلتی چندرا نے محبت سے پوچھا..... ''کیوں راحیلہ! تمہیں فلاسفی میں وقت پیش آ رہی ہے ناں؟''

''ہاں.....'' اسے تو سانس لینے میں بھی عجب قسم کی کٹھنائی پیش آ رہی تھی۔

''بھئی ایسا مضمون نہ سر نہ پیر..... یہ لوجک کیا بلا ہوئی۔ بھگوان کو بھی اندھا بنا دیتی ہے بیٹھے بٹھائے..... پریم اندھا ہے..... اور بھگوان پریم ہے۔ اس لیے بھگوان اندھا ہے ہاہاہا.....'' اس ٹکڑی میں فرمائشی قہقہہ پڑا۔

حوضکے قریب ٹیوب ویل کے چوبچہ میں ٹانگیں لٹکائے ایک لڑکی نے آواز دی..... ''ورشن چندرا..... بھگوان کی سوگند بڑا ٹھنڈا پانی ہے۔ آؤ تم بھی ٹانگوں میں آئس کریم جما لو.....''

''آؤ چلیں.....'' چندرا نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

''نہیں چندرا..... مجھے ذرا کام ہے۔ ورشن ویک اینڈ پر جا رہی ہے۔ اس کا سامان بندھوانا ہے۔''

''آؤ بھئی..... ویک اینڈ کے لیے کون سے ٹرنک جمع کرنا ہوتے ہیں۔''

ورشن اور راحیلہ آگے نکل گئیں۔

''کیوں راحیلہ جی تیرا چہرہ کیوں زرد ہے..... جی تو اچھا ہے.....'' ورشن نے پوچھا۔

''اچھا ہے.....''

ورشن نے چند لمحے اپنی کتابوں کو دیکھا پھر جلدی سے بولی....."اوہو فلاسفی کی کتاب تو میں ڈسک ہی پر بھول آئی....."

ورشن اکیڈیمک بلڈنگ کی طرف تیز تیز قدم دھرتی چلی گئی اور چندرا ہوسٹل کی طرف مڑ گئی۔ اس وقت راحیلہ کسی سے بھی بات کرنا نہ چاہتی تھی۔ اس وقت اس کی چال میں وقار کی جگہ مضمحل پسپائیت جھلک رہی تھی۔

ہوسٹل کے برآمدے میں اسے ارملا کپور نظر آئی۔ لمبی لچکیلی دو چوٹیوں والی ارملا کپور فورتھ ایئر کی مقبول لڑکی تھی۔ دراز قد ہونے کی وجہ سے وہ ڈراموں میں ہیرو کا رول کرتی' سائیکل چلانے میں اس کا ثانی نہیں تھا۔ ٹینس کورس میں وہ مار کرکو دوڑائے پھرتی۔ کھلتے گندمی رنگ کی ارملا کپور کے بائیں رخسار پر ایک بڑا سا تل تھا جو اس کی جاذبیت میں اضافہ کرتا۔ اس وقت ارملا نے سفید شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ قمیض کا کروائی تھی اور دوپٹہ کندھوں پر تنا تھا۔ سامنے کے دو بٹن کھلے تھے جن میں سرخ ریشمی مفلر مردوں کی طرح ناٹ لگا کر بندھا تھا۔ بائیں چوٹی میں سفید گلاب کا ایک پھول کان کے قریب سجا تھا۔ شاید اسی پھول نے تازہ و تازہ و سرگوشی میں کچھ کہا تھا کہ ارملا خود کھلے پھول کی طرح تر و تازہ نظر آتی تھی۔ اس لڑکی کی خود اعتمادی' مرعوب کرنے والے رویے کو دیکھ کر اب راحیلہ کو سمجھ آئی کہ فرسٹ ایئر کی لڑکیوں میں اس کا چرچا کیوں رہتا تھا۔ ارملا کپور دل موہنے کے سارے گر جانتی تھی۔ وہ ماڈرن تھی اور وقت شناس۔ فرزانہ ناہید اور وہ دونوں ہیڈ گرل کے لیے الیکشن میں کھڑی ہو رہی تھیں۔ فرزانہ سادہ رو' سادہ دماغ' سادہ لباس کی لڑکی تھی۔ وہ عموماً "نرسی جی" کے ساتھ پائی جاتی۔ بیمار لڑکیوں کے ساتھ وقت گزارتی۔ ڈائننگ روم میں پھول آراستہ کرتی۔ جہاں سے گزرتی لان ہو یا برآمدہ گرے پڑے کاغذ اٹھا لیتی۔ ارملا کپور اور فرزانہ ناہید مغرب اور مشرق کے دو پھول.....ایک خوبصورت تھا لیکن مہکتا نہ تھا۔ دوسرا خوشبودار تھا لیکن دیکھنے میں کم صورت تھا.....مشرق اور مغرب میں جو واضح فرق خود اعتمادی کا ہے وہی فرق ارملا اور فرزانہ میں واضح تھا۔ ارملا ماؤنٹ ایورسٹ فتح کرنے کے لیے پیدا ہوئی تھی اور فرزانہ احساس کمتری میں مبتلا ہندوستان کی جنگ آزادی ہارنے والی دل شکستہ تھی۔ ارملا نے گلے کا مفلر ڈھیلا کرتے ہوئے راحیلہ سے کہا....."ہیلو بھئی.....تم لوگ تو سرِ شام غائب ہو جاتی ہو.....سنڈے ٹائم کے بعد واک کے لیے بھی نہیں نکلتیں۔"

"وہ جی ذرا فلاسفی نے رنا ڈالا ہوا ہے.....دماغ ادھر چلتا نہیں۔"

"فلاسفی.....فلاسفی.....Let me see....." پھر اس نے اپنی پنسل سے اپنی گال میں گڑھا ڈالا' ذرا سا تحیر آمیز انداز اختیار کر کے لب گول کیے۔ پھر ثانیہ بھر کو ابرو اٹھائے اور بولی....."سنو راحیلہ! تم ایسے کرو' تمہیں ہیلپ کی ضرورت ہے۔ پمیلا کے پاس چلی جانا.....مجھے اگر فرصت ہوتی تو میں خود تمہاری مدد کرتی۔ ان کالج Elections نے مت مار رکھی ہے۔ خواہ مخواہ پکڑ کے مجھے کھڑا کر دیا۔ میں تو گوڈ نور ہیڈ گرل بننا ہی نہیں چاہتی.....فرزانہ از آل رائٹ۔ ذرا Traditional سی لڑکی ہے.....تو بھلا اس میں حرج ہی کیا ہے.....تم پمیلا سے ضرور ملنا' کہنا ارملا نے بھیجا ہے۔" پھر ارملا کپور نے آذری ہپ ہرن کی طرح سارے چہرے کو مسکراہٹ سے چمکاتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا' کندھے جھٹکے اور آگے چل دی.....اس مسکراہٹ کے آگے بڑے گیٹ سے مڑتی ہوئی شاہد کی سائیکل ماند پڑ گئی۔

فورتھ ایئر کی ارملا کپور نے بذات خود اپنی مرضی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس بے نیاز بت بے وا دنے

خود اس کی پڑھائی کی فکر کی..... اس نے فرزانہ ناہید سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ووٹ اسی کو دے گی لیکن یہ وعدہ اس لمحے اسے یکسر بھول گیا۔

یکدم ارملا کپور لوٹ آئی اور راحیلہ سے کچھ قدم رک کر بولی..... ''راحیلہ! یہ فرزانہ بڑی اچھی لڑکی ہے..... بڑی ہمدرد سمپل Soul..... لیکن متعصب ہے۔ اس کے والد مسلم لیگ کے بڑے اہم ورکر ہیں اور کالج میں یہ ایک Disqualification ہے۔ کالج میں مذہبی ہونا یا مذہب کو Politicize کرنا اچھا نہیں لگتا۔ ہم سب سٹوڈنٹ ہیں۔ کالج میں مذہب کی بنا پر سوچنا..... یہ متعصب ہونے کی دلیل ہے..... آئی ایم ناٹ ہندو..... یو آر ناٹ اے مسلم..... ہم سب سٹوڈنٹ ہیں اور مذہب کی بنا پر ہیڈ گرل Select نہیں ہوا کرتی..... ہے ناں۔''

ارملا آنکھیں جھپکا کر مظفر ٹھیک کرتی ہاتھ کے اشارے سے ٹاٹا کرتی لوٹ گئی۔ یا خدا مجھ میں یہ خود اعتمادی کیوں نہیں؟ راحیلہ نے اسے جاتے دیکھا تو چند لمحوں کے لیے شاید تو کیا اسے اپنا آپ بھی بھول گیا..... ٹھیک ہی تو ہے انسان اسی وقت پُر اعتماد ہو سکتا ہے جب وہ متعصب نہ ہو..... اس کا کوئی ملک' مذہب' ماں باپ' بہن بھائی نہ ہو۔ جب تک وہ اپنی سوچ میں آزاد نہ ہو۔ وہ کسی وقت بھی خود اعتمادی کو چھو نہیں سکتا۔ یہ ساری چیزیں جو آپ کو Possess کرتی ہیں۔ دراصل آپ کو پُر خوف بھی کرنے کی ضامن ہیں اور خوفزدہ انسان کبھی اپنے اوپر اعتماد نہیں کر سکتا۔

چند لمحوں بعد وہ پھر خوفزدہ ہو گئی۔ اگر جو کہیں دادا ابا کے کانوں میں میری سوچ کی بھنک بھی پڑ جائے تو وہ کہیں گے لڑکی کو کالج کی ہوا لگ گئی ہے' یہ لادینی ہے۔ فوراً گھر بلاؤ۔

شام کی چائے کے بعد ڈومیٹری میں سیاسی بحث میں لڑکیاں آنکھیں' ناخن' منہ سے جھاگ نکال نکال کر بحث کر رہی تھیں۔ کانگریسی خیالات کی لڑکیاں مسلم لیگ اور قائداعظم کو انگریز کا پٹھو اور ہندوستان دشمن لیبل کر رہی تھیں۔ خضر حیات ٹوانہ کی ایک رشتہ دار اپنے گھرانے کو سب سے زیادہ پنجاب دوست ثابت کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ درشن خاموش تھی' اس کا گھرانہ باتوں کے وقت خاموش اور عمل کے وقت زندہ ہو جاتا تھا۔ اس کے بڑے کہیں نینا دیوی کے آگے انسانی قربانی پیش کر چکے تھے۔ دھرم سنگھ' سکھا سنگھ' دیا سنگھ' ہمت اور لکھن سنگھ اس کے بزرگ تھے۔ کبھی نہ مرنے والے اکالی نیلے ایرن کا شلرنجی لباس پہن کر پاہل کی رسم کو جی جان سے ماننے والے تھے۔ اس خطے میں ستی کی رسم' کیس کٹوانے کا رواج جہاد کا مسلک زندہ تھا.....

درشن نے خاموشی سے راحیلہ کی طرف دیکھا۔ وہ ساڑھی باندھنے کی پریکٹس کر رہی تھی۔

''اب چلی بھی جاؤ راحیلہ جی..... پھر دیر ہو جائے گی۔''

راحیلہ عمر میں درشن سے کچھ بڑی تھی لیکن جب بھی وہ سرزنش کرتی راحیلہ کو اماں ساجدہ یاد آ جاتیں۔ اس نے کاپی پنسل اٹھائی۔ ماتھے کا پچنی کوٹ اتارا اور پمیلا کے کمرے کی طرف چل دی۔ راحیلہ کسی سے پڑھنا نہ چاہتی تھی لیکن ارملا کپور کا اصرار ایک طرح سے حکم نامہ بن گیا تھا۔ کیا بات ہے' کمزور آدمی کسی کی بات ماننے پر کیوں مجبور ہے..... اور اگر بات بھی مانے تو اس میں راحت سی کیوں محسوس کرتا ہے۔

پامیلا تھرڈ ایئر کی سمارٹ سپورٹس مین قسم کی لڑکی تھی۔ فلاسفی میں اس کا شہرہ تھا اور یہ بات سارے کالج میں

مشہور تھی کہ ارملا کپور اور پامیلا گوپال داس کی دوستی کبھی کبھی دوستی کی حدود سے بڑھ جاتی ہے۔

اس نے سارا برآمدہ ناکارہ سے جذبات سے جھگڑتے پار کیا اور بالآخر ان مانے جی سے پامیلا کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے جلترنگ بج اٹھا....."What is?"

"جی.....میں.....راحیلہ مغل....."

"Come in"

راحیلہ پنجوں کے بل اندر پہنچی۔

کمرے میں یوڈی کلون کی خوشبو پھیلی تھی۔

پامیلا کا رنگ مدراسی لڑکیوں کی طرح سانولا تھا اور وہ ہمیشہ تیز گلابی کیسری لال جامنی رنگ کی ساڑھیاں بڑے سلیقے سے پہنتی اور کبھی بدصورت نہ لگتی۔

"ہیلو....."

"ہیلو....." راحیلہ کے لہجے میں ابھی گنوار پن تھا۔

"جی وہ ارملا بہن جی نے کہا تھا کہ میں آپ سے پڑھوں.....فلاسفی.....مجھے کچھ مشکل پیش آ رہی ہے۔"

اس نے پامیلا کی لفٹی پر نظریں گاڑ دیں۔

پامیلا پاؤڈر کا پف پکڑ کر میز پر بیٹھ گئی۔ اس کی ناک اور ٹھوڑی پر پھنکیاں سی پڑ رہی تھیں۔ اکلوتی کرسی پر ان گنت ساڑھیاں بلاؤز لدے تھے۔ راحیلہ تکلف کے ساتھ چارپائی کی پائنتی پر بیٹھ گئی۔

"ارملا بڑی ڈیسنٹ لڑکی ہے.I simply adore her....." پامیلا نے ذرا جھوم کر کہا۔

"جی....." اس لمحے راحیلہ کو پامیلا سے مکمل اتفاق تھا۔

"اس دفعہ تو غضب کا میچ کھیلا اس نے۔ یونیورسٹی کپ جیت گئی۔ دراصل ٹینس سروس کی گیم ہے۔ کوئی اس کی سروس Return نہیں کر سکتا۔"

اس میں بھی کوئی شک نہ تھا۔

"اور ڈرامینگ میں تو.She has an edge.....اسے دیکھ کر تو لگتا ہے کوئی مرد ایکٹنگ کر رہا ہے۔ بھگوان جانے ایسی مردانہ آواز کہاں سے لاتی ہے۔ غضب ہے.....غضب ہے ارملا کپور.....غضب اور قیامت....."

ارملا کپور کی تعریف تو قریباً کالج کی تمام لڑکیاں فرصت کے لمحوں میں کرتی تھیں۔ بھلا اس میں اچنبھے کی کونسی بات تھی۔

"جی.....وہ فلاسفی.....کوئی ٹائم بتا دیں پلیز....." راحیلہ بولی۔

"ہاں.....Oh yes.....پر راحیلہ آج تو مجھے فرصت نہیں ہے شام کو مارکر آتا ہے۔ سو اس وقت میں فری نہیں.....رات کو میں جلد سو جاتی ہوں.....مجھے تو.....یعنی آئی ایم سوری....."

وہ بڑے اخلاق سے الماری میں سے چاکلیٹ نکال لائی۔

"Have some....." اس نے راحیلہ کی طرف چاکلیٹ بڑھا کر کہا۔
راحیلہ کا دل چاہتا تھا کہ وہ کیڈ بری کا سارا پیکٹ لے جائے لیکن وہ تکلفاً بولی۔
"جی نہیں شکریہ..... میں نے ابھی چائے پی ہے۔"
"لے بھی لو ڈیئر....." چاکلیٹ پر سے چاندی کا ورق اتارتے ہوئے پامیلا نے کہا۔
"شکریہ....."
"تمہیں تکلیف تو ہوگی راحیلہ لیکن اگر تم راجندر سے ہیلپ لو ناں تو وہ تمہیں ضرور پڑھا دے گی۔"
"چلو میں تمہیں اس کے پاس لیے چلتی ہوں..... کم آن....."
"جی نہیں، مجھے کوئی ایسی خاص ڈیفیکلٹی نہیں ہے۔ میں خود پڑھ لوں گی۔"
لیکن راحیلہ کے ٹالنے کے باوجود پامیلا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے راجندر کے پاس لے گئی۔
راجندر کے کمرے کا دروازہ کھلتے ہی دیسی گھی کا ایک بھبھکا اٹھا اور ان دونوں سے لپٹ گیا۔ پامیلا نے ذرا سا چہرہ پرے کر کے کہا..... "او مائی گاڈ۔"
راجندر اپنی ٹفن باسکٹ بند کرتے ہوئے ان کی طرف بڑھی..... "آیئے..... آیئے ناں۔" اس کی آنکھیں، لب، بازو بھی خوش آمدید کہہ رہے تھے۔
"راجی ڈیئر ایک کام کر دو پلیز۔ نو انکار.....See بات یہ ہے کہ ارملا نے کہا ہے مائنڈ یو ارملا نے..... کہ راحیلہ کو فلاسفی پڑھاؤ۔ مجھے تو ٹائم نہیں ہے۔ تم یہ کام کر سکتی ہو۔ No refusal..... بس ارملا نے کہا ہے۔ میں اب چلتی ہوں، مارکر آ گیا ہوگا۔" ابھی راجندر نے انکار کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ پامیلا گھڑی دیکھتی چل دی۔
راحیلہ نے دل میں سوچا کہ مارکر کے آنے سے کہیں زیادہ گھی کی خوشبو نے اسے اتنی جلدی چلے جانے پر مجبور کیا۔
"بیٹھیں جی....." راجندر نے پنجابی لہجے میں انگریزی بولی۔
راجندر کا من پن سے مشابہ تھی۔ سر بڑا، کمر تک ڈھانچہ بھی بڑا لیکن اس کے بعد کسی سوکھے بچے کے سے سرین اور ٹانگیں۔ وہ جب بھی ساڑھی پہن لیتی تو لگتا رنگین چھتری کو اہتمام سے باندھ کر کھڑا کر دیا ہے۔ راجندر کے کمرے میں اشیاء نے دھما چوکڑی مچا رکھی تھی۔ آڑی چارپائی پر گزوں لمبا پلنگ پوش تھا۔ چوڑی لیس فرش پر گر رہی تھی اور رنگدار کشیدہ کئے ہوئے پھول کمرے کے چھوٹے پن کا تمسخر اڑا رہے تھے۔ چھوٹی میز ان گنت کتابوں سے لدی تھی اور کتابوں کے اوپر چینل کے گلاس میں گلاب کے پھول ٹھنسے تھے۔ پردے کچھ ڈھیلے کہیں سے اونچے کہیں سے نیچے ایک طرف کو لٹکے ہوئے تھے۔ راجندر بھی دیسی گھی میں بھیگی سی لگتی تھی۔
"ہائے فلاسفی تو کچھ مشکل نہیں راحیلہ جی....." راجندر بہن مسکرا کے بولیں۔
"دو چار مہینوں میں خود ہی آ جائے گی..... دراصل بات یوں ہے راحیلہ جی کہ جب تک آدمی خود نہ پڑھے، کم از کم یہ سبجیکٹ بالکل نہیں آتا۔"

"جی......"

"آئیں میں آپ کو اپنا فیملی البم دکھاؤں....." ایسے کئی البم راحیلہ ڈومیسٹری میں دیکھ چکی تھی۔

البم میں زیادہ تصویریں ارملا کپور کی تھیں۔

"بڑا سندر ناچتی ہے....." ایک ڈانسنگ پوز دکھاتے ہوئے راجندر بولی۔

"سچ....." رسماً راحیلہ نے پوچھا۔

"دھرم نال....."

"جی ہاں بڑی اچھی ہیں ارملا بہن جی....." راحیلہ نے راجندر کی نگاہوں کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کہا.....

"سچ بتاؤں راحیلہ جی' کالج میں اس جیسا اور ہے کون؟.....فرزانہ ناہید ٹھیک ہے سمجھدار ہے.....نیک ہے.....
لیکن ارملا جیسا گلیمر کہاں' پھر اوپر سے انگریزی کا لب ولہجہ۔ آدمی قربان ہو جائے جی۔"

راحیلہ نے محسوس کیا کہ یہ گلیمر بھی غالباً کوئی پنجابی لفظ ہی ہوگا۔

راجندر نے دبلے دبلے ہاتھ جوڑ کر کہا....."راحیلہ جی! میں تو ہر وخت پرارتھنا کرتی ہوں کہ ارملا ہیڈ گرل ہو جائے۔ پھر ساری لڑکیوں کو انصاف ملے گا' ہمدردی ملے گی.....امید تو بڑی ہے آپ کا کیا خیال ہے راحیلہ جی؟"

یہ دل بھی کیا چیز ہے۔ کبھی تیر کی طرح نشانے پر جا لگتا ہے اور کبھی گرداب کی شکل گول گول گھومتا ہی چلا جاتا ہے۔ راحیلہ تو کالج کے الیکشن میں ہی الجھ کر رہ گئی تھی۔ وعدہ اس نے فرزانہ ناہید سے کر لیا تھا اور اچھی اسے ارملا کپور لگتی تھی۔

وہ بڑے محتاط لہجے میں بولی....."جی ارملا کپور بڑی مقبول عام ہیں۔"

راجندر کھل اٹھی....."یہی تو میں کہتی ہوں....."

اس کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے اسے راحیلہ کا ووٹ جیت لینے کی بڑی خوشی ہو.....وہ دوبارہ البم پر جھک گئی۔

ناچتی ہوئی ارملا.....پھولوں کے گلدستے اٹھائے ارملا.....گیٹ کے آگے ارملا.....ارملا.....

پروپیگنڈا ہی پروپیگنڈا.....ہر سطح پر.....

راحیلہ کی ڈومیسٹری میں مدھم بلب جل رہا تھا۔ سونے کی گھنٹی کبھی کی بج چکی تھی۔ برآمدے میں کھلنے والا دروازہ کھلا تھا اور تیز روشنی کا تختہ برآمدہ کی لائٹ کو لیے ڈومیسٹری کے فرش پر پڑ رہا تھا۔ شیاما لمبے شیشے کے سامنے کھڑی اپنے دوپٹے سے پگڑی باندھنے میں مشغول تھی۔ اس کا خیال تھا کہ بھگوان نے اسے لڑکی بنا کر بڑا انیائے کیا ہے۔ سوائے شیاما کے ساری لڑکیاں خاموشی سے پڑھ رہی تھیں۔ چندرا نوٹس بنانے میں مشغول تھی اور اسے علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے؟ شیاما نے اپنے خوبصورت لبوں پر احتیاط سے سرمے کی مونچھیں بنائیں۔ پھر ذرا سی شلوار اڑسی اور چندرا کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔ چندرا اس وقت جیومیٹری میں گم تھی۔ پھر چندرا کو اس قدر غافل پا کر شیاما چارپائی پر کود کر بولی....."لے چندرا آ گیا ذان جوان.....تیرا کابلی پٹھان....."

ساری لڑکیاں ہنس دیں لیکن ورشن ذرا تیکھے لہجے میں بولی..... "پلیز ہم پڑھ رہے ہیں۔"

ورشن تو ضرور پڑھ رہی تھی لیکن راحیلہ سرگوشیوں میں باتیں کیے جا رہی تھی۔ دن بھر کی بے مصرف آوارہ گردی کا مفہوم اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

"توبہ..... کبھی پامیلا..... کبھی راجندر..... کبھی اِدھر گھسیٹ کبھی اُدھر..... توبہ توبہ ساری شام ارملا ہی کی باتیں ہوتی رہی ہیں۔ میں تو چڑ گئی..... آخر یہ اتنا سارا التفات مجھ پر کیوں؟"

ورشن نے کرسی کے بازو پر ذرا جھک کر کہا..... "سب الیکشن سٹنٹ ہے راحیلہ جی..... باہر جو کچھ ہوا..... اسی کی ہوا اِدھر بھی گھس آئی ہے....."

اب راحیلہ پر کھلا کہ دن بھر کے التفات کے کیا معنی تھے؟ پامیلا' راجندر' شمع' رانی جی' خود ارملا ہر طریقے سے الیکشن کے لیے پروپیگنڈا کر رہی تھیں۔ صبح ٹک شاپ والا واقعہ بھی اب اس پر عیاں ہو گیا۔

صبح بریک کے وقت وہ اور ورشن ٹک شاپ پر گئی تھیں۔

اس وقت فرسٹ ایئر کی لڑکیاں سموسے اور چاٹ لیے بنچوں پر بیٹھی تھیں اور ان سے ہٹ کر درخت تلے لکڑی کی ہری کرسیوں پر فورتھ ایئر کی چند سینئر لڑکیاں دمنوپل رہی تھیں۔

پھر ان ہی میں سے رانی جی نے ذرا اونچی آواز میں کہا..... "بیچاری فرسٹ ایئر کی لڑکیاں تو فرزانہ ناہید کے پھانسے میں آ جائیں گی لیکن کسی عقلمند لڑکی کو اس قدر بے وقوف بنانا مشکل ہے۔ فرزانہ ناہید نیکی کی گیم کھیل رہی ہے لیکن اندر سے وہ بہت Uppish ہے۔ اپنے لیگی لیڈر جناح کی طرح۔ بھئی ہیڈ گرل کے لیے ڈبل پالیسی والی لڑکی نہیں چاہیے۔"

راجندر نے دمنو کی چسکی لگا کر کہا..... "نو نو..... نو ڈیئر! ارملا کے خلاف اس کے کوئی Chances نہیں..... ہرگز نہیں۔"

پامیلا کا لہجہ کچھ مدراسی کچھ گورا شاہی تھا اور وہ لفظوں کی ادائیگی میں ہونٹوں کو کچھ اس طرح استعمال کرتی کہ احساس ہوتا ہر لفظ پاپا مما کے ہم وزن ہے۔ پھر رانی جی جن کا اصلی نام ایشر دیئی تھا اور کانسی کی چھوٹی سی سٹیٹ کی اکلوتی وارث تھی' نزاکت سے پُر اعتماد قدم بھرتی بنچوں کے پاس آئی اور بڑے انداز سے بولی..... "بھئی آپ لوگوں کو کچھ پلائیں' سکوائش' شربت' ٹی' کافی۔"

یہ تو سبھی جانتے تھے کہ سٹیٹ چھوٹی ہو یا بڑی' اس کے مالکوں کی جیب بھری ہوتی ہے۔

فرسٹ ایئر کی لڑکیوں نے سموسے چاٹ کھانے بند کر دیے اور جھینپ کر ایک دوسری کو دیکھنے لگیں۔

"بھئی تم لوگ شرماتی بہت ہو' کم آن ورشن..... راحیلہ....."

فرسٹ ایئر کی دو ایک لڑکیوں کے علاوہ سب نے مہارانی کی دعوت کو رد کر دیا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اتنی سی شہ پا کر فورتھ ایئر کا سارا گروپ اٹھ کر فرسٹ ایئر کے ارد گرد منڈلانے لگا..... اور پر وہ اور ورشن پر وہ ارملا کپور کے لیے دونیں اکٹھی کی جانے لگیں۔

اور فرزانہ ناہید جو زری جی کے ساتھ بیمار لڑکیوں کی خدمت کرتی تھی' ہمیشہ کلاس میں فرسٹ آنے والی' ریس میں لانگ جمپ میں ٹرافی لانے والی لڑکی ارملا کپور کے سامنے دھندلانے لگی۔

درشن کی طرف جھک کر راحیلہ نے کہا..... "پتہ ہے درشن! کالج میں بڑا پروپیگنڈا ہو رہا ہے۔"

"ہاں..... نظر آ رہا ہے..... " درشن نے جواب دیا۔

"تم کس کو ووٹ دو گی درشن....."

"اب تو کسی کو بھی نہیں....."

"کیوں؟....."

"بس یونہی....."

"پر کوئی وجہ بھی تو ہو..... " راحیلہ گرما کر بولی۔

"بس کوئی خاص وجہ نہیں۔ دونوں ہی میرے معیار پر پوری نہیں اترتیں..... بس۔" درشن نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔

شیاما اس وقت چندا کے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا رہی تھی۔ ذرا تڑپ کر بولی..... "بھئی آپ لوگوں کو نہیں پڑھنا تو ہمیں تو پڑھنے دیں..... ہاں۔"

کمرے میں مکمل سکوت چھا گیا۔

اور باوجودیکہ درشن نے اپنا ووٹ کسی کو نہ دیا..... اور راحیلہ نے بالآخر اپنا قیمتی ووٹ فرزانہ ناہید کو ہی دیا..... سب سے زیادہ نعرے فرزانہ ناہید ہی کے لگے۔ وہ بیس ووٹوں سے ہار گئی۔

کالج میں فرزانہ ناہید ہار گئی۔

جیسے باہر یونینسٹ پارٹی کے آگے لیگ ہار گئی تھی۔

انارکلی کے بازاروں میں لوگوں نے اپنے قیمتی ووٹ بکھرے ہوئے دیکھے۔ لیگ کی ہار میں اس کی جیت مضمر تھی۔ لوگوں کے عزم میں' اُن کے ویژن میں ایسا اضافہ ہوا کہ لوگوں کو شک گزرنے لگا کہ پاکستان خواب نہیں حقیقت ہے۔ بے لوث ورکر کوچہ بہ کوچہ گھومنے لگے..... گروہ ندی نالے بن کر بہے اور آہستہ آہستہ دریا کی شکل اختیار کر گئے۔

کیا ہوا اگر لیگ الیکشن نہ جیت سکی۔

کیا ہوا..... اگر یونینسٹ نے منسٹری قائم کر لی۔

اللہ اپنے کاموں کا بھید کب کسی کو دیتا ہے؟

ریڈنگ روم کی فضا زاہدہ کے رونے سے بوجھل تھی۔

وہ سٹینڈنگ ڈیسک کے سامنے کھلے اخبار پر ہاتھ رکھے بھاں بھاں رو رہی تھی۔ وہ اخبار پڑھنا چاہتی تھی لیکن آنکھوں سے بہنے والے آنسو کچھ بھی پڑھنے نہ دیتے تھے۔

"گھبرا کیوں رہی ہو زاہدہ..... تمہارے گھر سے کوئی اطلاع نہیں ملی..... اگر کوئی ایسا بڑا خطرہ ہوتا تو کیا وہ تمہیں

اطلاع نہ دیتے؟"

"آخر اتنے سارے اخباروں میں جو لکھا ہے وہ جھوٹ تو نہیں ہو سکتا ناں....." زاہدہ اپنی سسکیاں کنٹرول کر رہی تھی۔

"آخر گھر تار کیوں نہیں دے دیتیں..... چلو میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں....." ورشن نے زاہدہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"پاگل روتی کیوں ہو۔ ابھی تار دو اصلی حالات معلوم ہو جائیں گے۔" تشویشناک نظروں سے راحیلہ نے زاہدہ کو دیکھا۔

ریڈنگ روم میں ساری لڑکیاں گم سم ہوگئیں۔ ایک طرح کی ہیبت سارے ماحول پر طاری تھی۔ ابھی دس منٹ پہلے جو کام افراتفری کے باعث ہو رہے تھے خود بخود رک گئے۔ وہ لڑکیاں جو زاہدہ کو جانتی تھیں اور وہ جو مکمل طور پر ناواقف ہو گئیں جیسے سٹل شاٹ سکرین پر جم گیا۔

بنگال میں فسادات ہوئے تھے۔ نواکھلی میں تقریباً تین سو جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ کئی گھر برباد ہو چکے تھے۔ پانچ ہزار بے گھر کلکتہ کے کیمپوں میں پریشان حال بیٹھے تھے۔ لیکن اب تک گویا یہ خبریں ان لڑکیوں کے لیے زندہ نہ ہوئی تھیں۔ راحیلہ روز ریڈنگ روم میں آ کر اخبار پڑھتی تھی۔ وہ ورشن اور ڈومیسٹری کی لڑکیاں سیاسی حالات آپس میں ڈسکس بھی کرتی تھیں۔ دو چار لڑکیاں کبھی کبھی روتی بھی نظر آتیں لیکن زاہدہ کے رونے سے پہلے یہ خبریں کبھی اسے ہلا نہ سکی تھیں۔ ابھی اس کے نزدیک انسانیت کا تصور اتنا وسیع نہ تھا کہ دنیا کے کسی غیر معروف کونے میں آگ لگتی اور یہاں وہ بخار میں تپنے لگتی۔ لیکن ابھی آدھ گھنٹہ پہلے جب شمسہ ڈومیسٹری میں آئی تو مکمل حواس باختہ تھی۔

"ارے بھئی وہ زاہدہ کہاں ہے؟"

راحیلہ اپنے لمبے بالوں میں بال چھڑا چھڑا کر کنگھی پھیر رہی تھی..... ٹھٹک کر بولی..... "کیوں خیر ہے۔"

"خیر کہاں بہار میں فسادات شروع ہو گئے....."

ورشن پلنگ پر بیٹھی پریت لڑی پڑھ رہی تھی۔

"یہ کوئی نئی بات ہے شمسہ..... یہ تو دیری کی کتھا ہے....."

پریما کو پتہ نہیں کب کا غصہ تھا بھڑک کر بولی..... "آخر بنگال کا بدلہ بہار کو لینا ہی تھا۔ یہ تو زنجیر ہے۔ کڑی سے کڑی ملتی ہے۔ بتا جی کہتے ہیں۔"

"بدلہ..... بدلہ..... آخر کب تک بدلے لیتے چلے جائیں گے۔ کب تک....."

اس وقت سر پر تولیہ لپیٹے زاہدہ غسل خانوں کی طرف سے آئی۔

"ہیلو..... شمسی..... خیر تو ہے صبح صبح؟"

"زاہدہ ڈیئر پٹنہ بھاگل پور منگیار اور گیا ڈسٹرکٹ میں بے پناہ Riots ہو رہی ہے....."

پٹنہ کا نام سن کر تو جیسے زاہدہ کو سکتہ ہو گیا۔

"کیا.....کیا.....کیا.....؟"

"وہ تین چار دن ہوئے ہندوؤں نے تو ایکشن ڈے منایا۔ کیسی دھواں دھار تقریریں کی۔ اشتعال انگیز.....بس ان ہی کی وجہ سے.....تم خود چل کر ریڈنگ روم میں دیکھ لو۔ ہر اخبار اسی خبر سے بھرا پڑا ہے۔"

زاہدہ فق چہرہ لیے کھڑی تھی' جیسے اس کی عقل کام نہ کر رہی ہو۔

شمسہ چند لمحے ٹھہری' پھر چلتے ہوئے بولی....."راحیلہ میں ریڈیو سٹیشن جا رہی ہوں۔ ریہرسل کے لیے۔ تم ذرا مس تھامس سے ایکسکیوز مانگ لینا میرے behalf پر۔"

ریڈیو سٹیشن وقت پر پہنچنا ضروری تھا۔ شمسہ اس وقت رک نہ سکتی تھی۔ زاہدہ کے لیے بھی نہیں! شمسہ کو دیکھ کر ہمیشہ لگتا گویا کسی چھاپے خانے کی تیز رفتار مشین ہے جو کھٹا کھٹ ضمیمہ چھاپ رہی ہے۔ وہ ہر بات سناپ پریس کے انداز میں کرتی۔ فرسٹ ایئر کی لڑکی ہونے کے باوجود وہ صحافی دنیا کے تمام صحافت نگاروں کو جانتی تھی۔ ریڈیو سٹیشن کے ڈراموں میں شریک ہونے کی وجہ سے وہ سیماب قزلباش' موہنی حمید' آفتاب احمد جیسے نامور آرٹسٹوں کو بذات خود جانتی تھی۔ ریڈنگ روم میں بہت سویرے پہنچ جاتی اور اندر جانے والی قریباً ساری لڑکیوں کو زبانی سرخیاں سنا دیتی....."ڈان" میں تو اس کی جان تھی اور یہ اخبار اس کے کمرے میں خود ذاتی طور پر لگا رکھا تھا۔ کالج میں صرف دو اخبار ذاتی آتے تھے' ایک پرنسپل صاحب کا اخبار اور دوسرے شمسہ کا۔

درشن کا سہارا لے کر راحیلہ کے ساتھ وہ تینوں ریڈنگ روم میں پہنچیں۔ زاہدہ سٹینڈنگ ڈیسک پر جھک کر پہلے خبریں پڑھتی رہی' پھر بھاں بھاں کر کے رونے لگی..... پہلے تو ریڈنگ روم کی لڑکیاں دم بخود ہوئیں۔ پھر ارملا کپور اور اس کی حواری لڑکیاں زاہدہ کو پرنسپل صاحب کے پاس لے گئیں۔

زاہدہ کی پیکنگ میں خاموشی سے ڈومیسٹری کی لڑکیوں نے حصہ لیا۔ بڑی سرعت سے جو کچھ اس کی ملکیت تھی' اکٹھی کی گئی۔ ہولڈال اور ٹرنک اکٹھا۔ زاہدہ نے برقعہ پہنا اور شمسہ جیسی سہیلی کو الوداع کہے بغیر وہ پٹنہ کے لیے روانہ ہو گئی۔

"میرا اسلام شمسہ سے کہنا....." زاہدہ نے تانگے میں بیٹھ کر کہا۔

جب تانگہ گیٹ سے نکل کر مین سڑک پر پہنچا تو زاہدہ نے آخری نظر اپنے کالج پر ڈالی۔ سنبل کے گھنے اونچے درختوں کو ذہن میں محفوظ کیا۔ اکٹھی کھڑی لڑکیوں کے لیے ہاتھ ہلایا۔ وارڈن کے کمرے پر نظر دوڑائی اور پھر کالج کی چار دیواری کو دیکھتی زاہدہ سٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی۔

ان ہولناک حادثات نے ساری زندگی Uncertain کر دی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ گو اس نے دس دن کی چھٹی لی ہے لیکن اب وہ کبھی اس کالج میں نہ آ سکے گی۔

اس دن کے بعد فسادات نے ایک ذاتی خوف کی شکل اختیار کر لی۔ اس سے پہلے جو فسادات بنگال میں ہو رہے تھے' ذاتی شکل کے نہ تھے۔ زاہدہ کے رخصت ہوتے ہی بہار کی صورتحال ایک خاص نوعیت کا المیہ بن گیا۔ وہاں جو کچھ ہوتا' خود راحیلہ پر اثر انداز ہو کر رہتا۔ زاہدہ کے جانے کے بعد وہ گہری سوچوں میں رہنے لگی۔

پہلی بار وہ ذہنی خوشی' کھیل کود رشتے ناطے سے کٹ کر سوچنے لگی..... سب کیا تھا کم از کم۔ فٹ بال' ٹینس کا

کھیل نہیں تھا..... یہ سب جو اردگرد erupt کر رہا تھا' ہنسی مذاق بھی نہ تھا..... اس کا رشتہ نا طے سے بھی کچھ ایسا گہرا تعلق نہ تھا۔

پھر زندگی کیا تھی۔ پہاڑوں میں گزارا ہوا وقت بے فکری میں گزرا۔ پہاڑوں نے اسے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ زندگی کے متعلق سوچتی۔ وہاں تو پانی کشش ثقل اور اپنے بہاؤ کے زور پر اترتا چلا جاتا تھا۔ اب بھی کبھی راحیلہ کو خیال آتا کہ زندگی ایک سوال ہے..... جس کا جواب صدیوں سے لوگ اپنے اپنے طور پر نکالتے آئے۔ آج تک بھی دو آدمیوں نے ایک سا جواب نہیں نکالا۔ حالانکہ سوال ایک ہی ہے..... آپ نے زندگی کی گندھی مٹی سے کیا بنایا؟

پیالہ' گھڑا..... پرات' ہانڈی' اگربتی کا سٹینڈ' گڑیا کا کھلونا' پنگوڑی کے پائے' گھگو گھوڑے' ہاتھی' گھوڑے' گلدان' پیسے' ڈول..... وغیرہ وغیرہ اور کیا آپ نے زندگی کی مٹی کو نظر انداز کر چھوڑ دیا؟ گندھی مٹی بھی سب کو ایک سی نہیں ملتی..... کہیں یہ مٹی بھربھری ریت بھری ہوتی ہے۔ کہیں چکنی لیس دار..... کہیں سیاہ کہیں کولوراڈو جیسی سرخ آتشیں زدہ..... دریا کنارے کی دھلی دھلائی اور پھپھوندی میں بسی۔

زندگی تو کچھ خوبیاں' خرابیاں اس مٹی میں سمو کر کچھ Handicaps پیدا کر کے انسان کو مہلت دیتی ہے اور ایک ہی سوال پوچھتی۔ بتا اس مٹی کا کیا بنایا.....

اپنی مٹی کا کیا بنایا؟

اور اس اولاد کا کیا بنایا جس کا تو کفیل تھا؟ جس کی تو پرورش کرنے والی تھی؟

اپنا اگر کچھ بن بھی گیا اور اولاد کا سوال غلط نکلا تو بھی فیل..... اور اولاد کا کچھ بن گیا اور آپ راندۂ درگاہ رہے تو بھی ناکام..... دنیا میں سب کچھ حاصل حصول ہوا اور آخرت اکارت گئی تو بھی صفر بٹا صفر اور ساری عمر جوتیاں چٹخائیں اور آخرت کا ویزا لگا لیا' آ گیا تو بھی جواب پرانڈہ ہی ملا..... یہاں تو سوال کا جواب جب بھی پاس نمبر لائے گا دین و دنیا ملا کر لائے گا..... یہاں بھی خوب رہے اور وہاں بھی.....

پھر ایسے ملک میں جہاں جواب نکالنے کے لیے نہ حالات ہاتھ میں تھے نہ فرد ضامن تھا' وہ اپنے سوال کا جواب کیسے نکالے..... جب قومیں اپنی شناخت کے حصول میں ہوں اور قومی سطح پر جواب غلط نکل رہے ہوں تو کیا فرد اپنے عمل کا ضامن رہ سکتا ہے؟ کیا تیز بہاؤ میں بہنے والے تنکوں سے پوچھا جا سکتا ہے کہ انہیں کنارا کیوں نہ ملا؟ کیا جتھوں میں بھاگنے والوں کو سمت کا علم ہوتا ہے؟

راحیلہ مغل کو پہلی بار زندگی سے خوف آنے لگا۔ اس کا جی چاہا وہ واپس امرتسر چلی جائے جہاں ڈاکٹر سرفراز تھے' جہاں دادا ابو کلف لگی سفید پگڑی میں پاتال تک گڑے تھے' جہاں ساجدہ ماں تھی' گول گول ہر جگہ گھومتی' اعتماد سے چمکتی..... ان لوگوں نے کیا آسانی سے زندگی کا سوال حل کر لیا تھا۔ اپنے اپنے مسلک سے ہٹے بغیر اپنی اپنی سوچ کو بگاڑے بنا۔

☆☆☆

راحیلہ دوسری منزل کی طرف جانے والی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ ساتھ کامن روم میں لڑکیاں سرلا بہن جی کو چھیڑ رہی تھیں جس کے پتاجی نے اس کا بیاہ تو کر دیا لیکن شوہر کے ساتھ امریکہ بھیجنے کے بجائے اسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے چھوڑ گئے۔ سرلا عمر میں باقی فرسٹ ایئر کی لڑکیوں سے تین چار سال بڑی تھی اور گم سم رہتی تھی۔ شیاما جو اپنی چرب زبانی کے طفیل بہت مشہور تھی۔ بے زبان سرلا کو چھیڑتی جا رہی تھی اور سرلا کانوں تک سرخ جھینپی جا رہی تھی۔ اس چھیڑ چھاڑ کی فضا میں پرس جھلاتی شمسہ آ پہنچی۔ وہ مجسم ریڈیو سٹیشن تھی۔ اس کی عینک ناک کی پھننگ تک پھسل آئی تھی اور پانلی دار سوتی ساڑھی جا بجا سے اٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر ہمیشہ کپڑے کی وہ گڑیا یاد آتی جو گھریلو عورتیں بچوں کے لیے بنایا کرتی تھیں۔ اس کے کپڑے ہمیشہ تن سے جدا جدا' کسی ہوئی چوٹی پرے پرے اور بازو کھلے ہوتے حتیٰ کہ اس کی گفتگو بھی اس کے وجود کا حصہ نہ لگتی۔ آتے ہی وہ سیڑھیوں پر پرس' کتابیں پھینک کر بولی۔ "بخدا تم لوگ بڑی Thick-skinned ہو۔ بہار میں خون وکشت کی کوئی حد نہیں اور تم لوگوں کو ہنسی مذاق سوجھا ہے..... مر جاؤ مر جاؤ شرم سے۔"

"ہم لوگ بھی مر جائیں شمسہ عین جوانی میں یار۔" شیاما نے سرلا کو آنکھ مار کر پوچھا۔

"وہاں ڈاکٹروں کی نرسوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں وہاں مدد کے لیے پہنچنا چاہیے اور پلیز مجھے یار نہ کہا کریں' مجھے بڑا wilgar لگتا ہے..... بڑا عامیانہ لفظ ہے....."

شیاما نے شرارت سے کہا..... "غالباً یہاں تو کوئی بھی ڈاکٹر یا نرس نہیں دوست۔"

شمسہ سننے والوں میں سے نہیں تھی' بولتی گئی..... "سبھی کو جانا چاہیے۔ کالج کی طرف سے انتظام ہوتا ہوگا۔ ہم مس میکالے سے آج ہی کہیں گے۔"

"اچھا تو زاہدہ سے ملنے کا آپ نے یہ طریقہ سوچا..... ہے..... ویری Innovative۔"

شیاما کی بات پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ شمسہ کے بازو ڈھیلے پڑ کر ساتھ لگ گئے۔

"ہم Untrained لڑکی لوگ وہاں کیا کرے گا شمسہ۔" اینگلو انڈین کرشی نے سوال کیا۔

"جہاں کچھ کام کرنے کا ارادہ ہو وہاں کام بہت....."

"اچھا یار تم Manage کرو ہم جائے گا۔ ہمارے ڈیڈی کا تمہارا جیسا Idea ہے..... اور یار کے لفظ پر غصہ نہیں کرتا..... آفٹر آل یار کا مطلب ہے فرینڈ۔" کرشی بولی۔

"بالکل..... بالکل..... یار کے مطلب ہیں فرینڈ....."

شمسہ جیسے تھک کر راحیلہ کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ جانتی تھی کالج میں زیادہ تعداد ایسی لڑکیوں کی تھی جو کسی معاملے میں بھی سنجیدہ نہ تھیں..... راحیلہ نے شمسہ کی کتابوں تلے دبا ہوا اخبار اٹھایا اور اسے پڑھنے لگی..... سارے صفحے فسادات کی خبروں سے بھرے تھے۔ قتل' زن' لوٹ' تپتے مہاجرین پر جتھوں کے حملے' اکا دکا مسافروں کا بے دریغ قتل' عورتوں کی آہ و بکا' بچوں کی چیخ و پکار.....

مدد کے لیے اٹھے ہاتھ

آہوں میں ڈوبے ہونٹ

بے سہارا آنکھیں..... تلاش میں سرگرداں

زاہدہ کے جانے سے بہار نے ایک خاص اہمیت حاصل کر لی تھی۔ حیرانی سے اس نے ایک سرخی پڑھی۔ ایک دن میں ایک سو پچاس جانیں تلف..... ان لوگوں میں بچے بھی تھے اور عورتیں بھی' نہتے بھی تھے اور بیمار بھی..... بوڑھے بھی تھے اور نادار بھی..... اگر قتل کرنے والوں کو یہی عورتیں اکیلی مل جاتیں ہندو حملہ آور انہیں سلام بھی کرتے اور حال بھی پوچھتے۔ ان کے لیے آہیں بھی بھرتے اور اکیلے میں ان کے لیے سوچا بھی کرتے۔

راحیلہ نے اخبار پرس پر رکھ کر سوچا..... یہ سارے لوگوں کے سروں پر خون ہی خون کیوں چڑھ گیا ہے؟ کیا انسان حیوانیت کے دائرے میں مقید ہے؟

''چلو آ جاؤ اب سونے کی گھنٹی بج گئی بھی کی.....'' ورشن نے راحیلہ کو مخاطب کر کے کہا۔ گھنٹی کے سنتے ہی لڑکیاں تتر بتر ہونے لگیں۔ راحیلہ نے ورشن کا ہاتھ پکڑ کر سوچا۔ اس بے بس قافلے کے متعلق جسے فجر کی نماز سے کچھ دیر پہلے ایک ہندو مجمع نے لوٹ لیا۔ قافلے میں کوئی بھی ہتھیار بند نہ تھا۔ اس لیے عالم بے بسی میں وہ کسی قسم کا مقابلہ نہ کر سکے اور ان کے لہو سے ان ہی کی سرزمین سرخ ہو گئی۔

سرخ یاقوتی لہو..... جس کے ایک ایک قطرے سے زندگی آگے بڑھتی ہے جو بلڈ بینک میں جمع ہو کر مریض کی صحت برقرار رکھتا ہے..... لہو جو بچوں کو بھولی مسکراہٹ اور جوانوں کو ولولہ بخشتا..... وہی خون زمین پر کیچڑ میں مل گیا اور سوکھ کر بھر زمین کی پپڑیوں میں بدل گیا۔ رائیگاں خون..... رائیگاں زندگی.....

''بھئی کوئی Greatest good کی تعریف کرے.....'' ارملا کپور نے اوپر والی سیڑھی پر رک کر کامن روم سے آنے والی لڑکیوں سے پوچھا..... ''تم بتاؤ ذرا راحیلہ.....''

''جی مجھے یہ تعریف نہیں آتی.....''

ورشن نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے راحیلہ سے سرگوشی میں کہا..... ''ہیڈ گرل کیا بن گئی' دماغ پھر گیا ہے اس کا.....''

لڑکیاں ٹکڑیوں میں ایک دوسرے سے بچھڑ گئیں۔ سنگل روم کی لڑکیاں اپنے اپنے کمروں کے تالے کھولنے لگیں اور ڈومیسٹری کے ریلے اکٹھے آ ماجگاہوں میں داخل ہوئے۔

راحیلہ کپڑے تبدیل کیے بغیر پلنگ پر لیٹ گئی۔ اس کی چارپائی کے پائنتی والی کھڑکی سے چاند نظر آ رہا تھا۔ وہ دیر تک آدھی سوئی آدھی جاگی چاند کو دیکھتی رہی۔ صاف شفاف ایپرن کلف سے اکڑی نرسوں کی ٹوپیاں..... عام طور پر وہ سونے سے پہلے شاہد کو یاد کیا کرتی تھی۔ اس کے مضبوط ہاتھ' بازو سب پر سنہری بالوں کی گھاس' براؤن آنکھوں میں طلب اور چاہت کی نمی۔

لیکن آج اس کا خواب مختلف تھا۔ وہ کسی تیز رفتار ٹرین میں سوار بہار جا رہی تھی۔ اس کے اپنے بال کٹے ہوئے تھے اور ان پر کلف سے اکڑی ٹوپی مور پنکھی بنی تھی۔ اس ٹرین میں وہ تنہا نہیں تھی۔ ورشن..... شیاما' شمسہ بھی تھیں.....

شیاما ہمیشہ کی طرح مردوں کی طرح کھڑی تھی۔ اس کا گریبان بھی ہمیشہ کی طرح کھلا تھا۔ وہ نروس ہو کر چیونگم چبا

رہی تھی۔سب کے کپڑوں سے ویسی ہی خوشبو آرہی تھی جو اباجی کے ہسپتالی کپڑوں سے آتی تھی۔سپرٹ اور آیوڈین کی تیز خوشبو۔

پھر زخمیوں کے زخم سیئے جارہے تھے۔

نرسوں کے ایپرن خون کے دھبوں سے بھر گئے۔وہ پھرکی کی طرح گھوم پھر رہی ہیں۔کسی مریض کو دوا پلائی جا رہی ہے۔کسی کو بڑی نرمی سے اٹھایا جارہا ہے.....پھر اس نے نگاہ اٹھائی تو پہلا خواب غائب ہوگیا۔

کھیت جل چکے تھے'بستیاں اجڑ چکی تھیں۔لوگ اپنے سروں پر ہاتھوں میں گٹھڑیاں'ٹرنک'بچے سنبھالے گرتے پڑتے سوچتے روتے روانہ ہورہے تھے.....نہ جانے انہیں اپنے گھر'کھیت'بستی چھوڑ کر کہاں جانا تھا.....ایک بار پھر اللہ نے انسان کو خانہ بدوش بنادیا تھا۔درخت دریاؤں میں بہنے پر مجبور تھے۔

قافلہ در قافلہ

لوگ جو صدیوں سے ایک ہی جگہ ٹکے رہے اب بے گھر تھے۔

ایک خواب کے لیے.....ایک آدرش کی خاطر

راحیلہ کی کتاب ہاتھوں سے پھسل گئی اور آہستہ آہستہ کھلی آنکھوں کے خواب

اصلی خوابوں میں گھل مل گئے.....بہار'زخمی'زمین'آدرش سب کچھ ختم ہوگیا.....اور ایک بار پھر اس نے دیکھا کہ شاہد اس کی جانب بڑھ رہا ہے۔

☆☆☆

کالجوں میں ایک بڑی Activity سالانہ ڈرامہ ہوا کرتا ہے۔اس مشنری کالج میں تو یہ سالانہ فنکشن بے حد اہم تھا۔ڈرامے میں مین کردار ادا کرنے والی لڑکیاں تو اہم تھیں ہی'وہ لڑکیاں جو میک اپ پر مامور تھیں اور وارڈ روب انچارج تھیں۔ان کے پاؤں بھی زمین پر نہ ٹکتے تھے۔پرومٹر بی بی تو اتنی اہم تھیں کہ ہر انسان کو بلاوجہ جھڑکتی تھیں۔

ابھی کچھ دیر پہلے ڈرامے کی ڈائریکٹر مس ارشاد کا فون آگیا۔وہ ڈرامے کی ریہرسل کو درمیان میں چھوڑ کر آفس میں چلی گئیں۔ان کے جاتے ہی ڈرامے کا سارا نظم وضبط ختم ہوگیا۔ساری کاسٹ گپ چپ بیٹھی تھی۔اب مسلسل بولنے لگی۔کلیو پٹرا نے اپنی خواص تا تا تیا کے گلے بیاں ڈال کر اور ہی قصہ نکالا۔پرومٹر بھی Relax ہو کر مونگ پھلیاں کھانے لگیں۔ورشن اور راحیلہ نے آرٹ پیپر پر چھپی رومن لباسوں کی کتاب ٹھپ سے بند کردی اور مس ہنی برن کی باتیں کرنے لگیں۔

ارملا کپور جولیس سیزر کا رول کررہی تھی'اب وہ آزادی سے تھیٹر کی سیڑھیاں بھاگ کر چڑھنے اترنے میں مشغول ہوگئی۔جب وہ ایک ہی باری دس سیڑھیاں اوپر چڑھ جاتی تو پھر رومن بادشاہوں کی طرح دونوں بازو سینے پر باندھ کر کہتی....."اے نیل کی وادی میں بسنے والو!گواہ رہنا.....گواہ رہنا کہ سیزر بوڑھا نہیں.....اور تم اے جان جاں کلیو پٹرا جان لو کہ سیزر بوڑھا نہیں.....اگر اس بار یونیورسٹی میں ہائی جمپ کا ریکارڈ نہ توڑ دوں تو میرا نام سیزر نہیں'انطونی رکھ دینا.....مجھے ویسے بھی نفع رہے گا....."

کاسٹ' پروممنز وارڈ روب کی انچارج پروفیسر مستری سب پر اوس پڑ گئی۔ زندگی کے دھارے کو چلتے چلتے ایک خبر نے روک دیا تھا۔ بھلا ہولے ہولے دفتر کی طرف چلنے لگی۔ اس کی چال میں بڑی تکان کے آثار تھے۔ وارڈ روب کے کپڑے راحیلہ اور ورشن نے تہہ کر کے ٹرنکوں میں دھر دیے۔ اپنے اپنے رول کی مُرلی سی بنا کر لڑکیوں نے بغلوں میں دبائی اور بغیر کچھ بولے ہوسٹل کی طرف چل دیں۔ مستری صاحب سیٹ کے پھٹنے ادھیڑنے میں مشغول ہو گئے اور نئی ہیروئن کی تلاش میں ذہنی طور پر سرگرداں مس ارشاد اپنی منی مائز کی طرف چل دی۔

''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' میں ڈرامے کے التوا کے ساتھ بڑی عجیب و غریب خبریں چھپ گئیں اور اس کے بعد اخباروں نے پنجاب میں فسادات کی آگ میں جھلسنے والے واقعات کو شہ سرخیوں میں تبدیل کر دیا۔ اب کامن روم اور لائبریری میں لڑکیوں کے درمیان ہار سنگار کے بکھیڑے' ایکٹرا ایکٹرسوں کے سکینڈل' آپس کی غیبت قریب قریب بند ہو گئی اور سیاسی صورتحال پر گفتگو ہونے لگی۔ لڑکیاں اپنے اپنے مذہبی جھکاؤ کی بنا پر سیاسی چالوں پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ ایک نئی طرز کی گفتگو کا سیلاب بہہ نکلا۔ خضر مستری لوگوں کے دلوں میں راہ پیدا کرنے کی ناکام کوشش میں مبتلا تھی۔ لیگی کارکن بڑے جوش و خروش سے اپنے مطالبات پیش کرنے میں مشغول تھے..... سیاسی گتھیوں کو سلجھانے میں گھر گھر مباحثے ہو رہے تھے۔ اب کالج کی ہمواری میں بھی اونچ نیچ در آئی تھی۔ ان لڑکیوں کو احساس ہونے لگا تھا کہ وہ مذہب' کلچر' زبان' علاقائی دوریوں کے باعث ایک دوسرے سے کتنی مختلف ہیں۔ اپنی شناخت کے احساس ہی سے ان میں گھمبیر فاصلے پیدا ہو گئے تھے۔

آلوچے اور آڑو کے شگوفے ساری لان پر بہار کا احساس دلا رہے تھے لیکن دلوں میں پھولوں کا احساس نہ تھا۔ گیت' چاندنی' پھول سب اضافی سمبل بن گئے تھے۔ آلوچے کے ایک گھنے درخت تلے گول کیاری میں فلاکس چمک رہے تھے۔ دھوپ اور سردی باہم مل کر عجیب قسم کا مبہم احساس دلا رہے تھے۔ گھاس صبح کاٹا گیا تھا اور مستطیل لان میں جا بجا کٹی گھاس کی چھوٹی بڑی ڈھیریاں پڑی تھیں جن پر بھرے ٹنڈے اور بھونرے آتے جاتے منڈلا رہے تھے۔ یہ قطعہ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نو عمر لڑکے نے تازہ تازہ شیو کی ہو لیکن جو لڑکیوں کی ٹکڑی گھنے آلوچے کی چھدری دھوپ تلے بیٹھی تھی' ان کی تیوریاں چڑھی تھیں۔ کہیں اندر ان سب میں اپنے وجود کے احساس کے ساتھ ساتھ قومی بے حیثیتی کا احساس بھی جاگ اٹھا تھا۔ ذاتی حقوق کے ساتھ ساتھ وہ ملی حقوق کو بھی ٹٹول ٹٹول کر سمجھنے لگی تھیں..... ابھی باہمی رفاقتوں کا رنگ انفرادی شناختوں پر غالب تھا۔ وہ ایک دوسرے کو چھوٹے لینٹنے سجانے میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتی تھیں۔

ورشن نے راحیلہ کے بالوں میں ورہینیا کا گچھا سا پھول سجاتے ہوئے کہا..... ''یہ Disturbed Area کیا چیز ہے؟ جب لاہور' امرتسر' شاہ پور' اٹک' کیمبل پور' میانوالی' سیالکوٹ' جالندھر سارے اہم شہر فسادات کے گھیرے میں آ گئے تو باقی کیا رہا ہے۔ یہ جو پنجاب Disturbance Act بنا ہے' سب ڈھونگ ہے..... محض گورنمنٹ کا بکواس تماشا۔''

ورشن بڑی سلجھی ہوئی خاموش طبع اجلی سی لڑکی تھی۔ وہ سیاسی مباحثوں میں حصہ نہیں لیتی تھی۔ آج اس کے پھٹ پڑنے پر سب لڑکیاں حیران سی رہ گئیں..... چند لمحوں کے لیے سکوت طاری ہو گیا۔ اس ٹولے میں فرسٹ ایئر سے فورتھ ایئر

کی بھی مذاہب' رنگوں' جماعتوں کی لڑکیاں جمع تھیں لیکن ورشن کا کچھ ایسا امپریشن سب پر تھا۔ چند ثانیے کوئی نہ بولی۔ پھر آشا چندر بھان نے بدک کر کہا...."بیچاری گورنمنٹ کو دوش نہ دو ورشن.....ابھی چند دن ہوئے 7th Indian Division کے انگریز سپاہی اور 2R. A.7 سکواڈرن ان علاقوں میں گشت لگا گئی ہے.....ہم لوگ ما ئیں بھی کس کی.....ہم کو تو بہکایا جا رہا ہے......"

"یہ فوجیں کچھ کرنے کرانے کی غرض سے گشت نہیں لگا تیں آشا.....بس یونہی تفریحاً.....بھاگ دوڑ.....ایک آپریشن ڈالا جاتا ہے جعلی نقس......"

راحیلہ نے حیراتی سے ورشن کو دیکھا اور پھر چپکے سے اس کے چٹکی کاٹی کہ زبان بند رکھے.....لیکن اس وقت پامیلا "ڈان" اخبار لہراتی دور سے بھاگی آئی.....

آشا نے اسے آتے دیکھ کر کہا...."لو بس Panic آ گئی.....اب مزہ آئے گا۔"

قریب آ کر پامیلا نے کہا...."فسادات! خون کی ہولی.....سب اپنا اپنا سامان باندھ لو ہمیں اپنے اپنے گھر جانا پڑے گا......"

آشا ڈرامے میں پروملر رہنے کے باعث لقمہ دینے کا فن سیکھ گئی تھی۔"اس ایکٹ سے کیا ہوتا ہے؟ اور آگ بھڑکے گی دیکھنا......"

فرزانہ نے ٹھنڈے چھینٹوں کی طرح بڑی محبت سے کہا...."چلو لیڈر لوگوں پر بھروسہ کرو..... پنڈت نہرو کتنی رواداری کی تقریر کر کے گئے ہیں۔تم نے پڑھی ان کی تقریر......"

پتہ نہیں ورشن کو اچانک کیا ہو گیا تھا' چمک کر بولی...."اور جہاں سے پنڈت جی تقریر کر کے نکلتے ہیں' دوسرے دن وہیں فساد کی آگ زیادہ بھڑکتی ہے۔"

ارملا کپور کی عینک ناک پر پھسل آئی تھی اور وہ کوئی اہم Statement دینے کے موڈ میں نظر آتی تھی۔ جب سب لڑکیوں کی نظر پرنسپل صاحب پر پڑی۔

پرنسپل لمبی چوڑی امریکن عورت تھی۔ اس کا قد پونے چھ فٹ کے قریب تھا۔ چلتی تو مردانہ وار..... ہاتھ ہلا کر لڑکیوں کو شا کر کے چپ کرا لیتی۔ لیکن اسمبلی کے قریب جب وہ چھوٹی سی دعا مانگ کر دن کا آغاز کرتی تو عموماً اس کی آنکھوں میں آنسو ہوتے اور آواز لرزتی' وہ امریکہ کی کنساس سٹیٹ میں رہتی تھی۔ اس عیسائی علاقے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس کا یقین تھا کہ دنیا میں تمام لوگ گنہگار پیدا ہوتے ہیں اور حضرت مسیح اس گنہگاری کا داغ دھونے کے لیے رحمت کا باعث بنے۔ اس کے لیے عیسائی مذہب اس کی اقدار زندہ تھیں۔ وہ تین میں ایک اور ایک میں تین کی قائل تھی۔ اسے لمحے بھر کے لیے بھی کبھی شک نہ گزرا تھا کہ حضرت مسیح خدا کا بیٹا نہ تھا۔ اس کے دل میں احساس جرم سدا بہار گندے تالے کی طرح بہتا تھا جسے وہ محبت کی خوشبو اسپرے کر کے خوشبودار بنائے رکھتی تھی۔

ہاتھ میں بائبل پکڑے وہ آلو بے اور آڑو کے شگوفوں میں تازہ کٹی ہوئی لان پر آ رہی تھی۔ اس کے پاؤں میں سفید کینوس کے جوتے تھے۔ لمبے سکرٹ اور سفید سویٹر میں وہ بڑی پاکیزہ نظر آتی تھی۔ لڑکیاں اسے دیکھتے ہی ادب سے

خاموش ہو گئیں۔ بملا نے ساڑھی کا پلو درستی سے کندھوں پر لیا۔ راحیلہ نے ورشن کی گود سے سر اٹھایا۔
پرنسپل قریب آئی تو تمام لڑکیاں سکول گرلز کی طرح کھڑی ہو گئیں۔
"گڈ آفٹرنون....." سب بیک وقت بولیں۔
"گڈ آفٹرنون گرلز.....Studying؟....."
سب مسکرانے لگیں۔

".....Enjoying the Sun"
"یس..... مس....." ارملا پور سب کی جانب سے بولی۔
".....Nice Weather"
لڑکیوں نے اثبات میں سر ہلائے۔ پرنسپل لان پر تمکنت سے چلتی گئی اور جب تک وہ ہوسٹل کی پچھلی لان میں غائب نہیں ہو گئی۔ سب لڑکیاں چپ چاپ کھڑی رہیں۔ مس صاحب کی بڑی شان تھی۔
اس جیسے سفید فام برصغیر کے حاکم تھے۔
پھر وہ باضابطہ اس کالج کی پرنسپل تھی تعلیم یافتہ تھی۔
مقدس صورت ہونے کے ناطے اس کا تقدس قائم تھا۔
اور سب سے بڑی بات اس کے بال سفید تھے۔ ابھی مقامی کلچر میں بڑی بوڑھیوں کا بڑا لحاظ کیا جاتا تھا۔ ابھی کلچر مغربی رنگ میں ڈھلا نہیں تھا۔ جو لوگ اس رنگ میں رنگے گئے تھے۔ کرسٹان اور اینگلو انڈین کہلاتے تھے اور مقامی کلچر والے ایسے لوگوں سے نفرت کرتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ چالیس پچاس سال بعد برصغیر میں بلا امتیاز ملت و قوم بلا تخصیص مذہب و مسلک مغربی کلچر ہی سب کا طرہ امتیاز بن گیا۔ برصغیر کے لوگ کیا اپنی نفرت کے سدرش چکر کا شکار ہو گئے تھے۔ کیا نفرت آگے چل کر نفرت کرنے والے کو ہی شکار کر لیتی ہے۔ جن کرسٹان اور اینگلو انڈین لوگوں کے کلچر اور انداز زیست سے نفرت کی گئی۔ وہی بعد میں سب کا شکار ٹھہرا۔
کالج میں اتوار کا دن ایک خاص اہمیت کا حامل تھا۔ جن لڑکیوں کے ملنے ملانے والے شہر میں موجود تھے وہ ویک اینڈ پر گھر جا چکی تھیں۔ ڈے سکالرز کا شور کم تھا۔ اکیڈیمک بلڈنگ خاموش پڑی تھی۔ ہوسٹلوں میں فرش دھونے چارپائیاں گھسنے اور بال دھونے کا عمل جاری تھا۔
گلاب کے بڑے بڑے بادامی پھول سرخ گلدان میں لگاتے ہوئے راحیلہ نے کھڑکی میں سے آڑو کے درختوں کو دیکھا۔ ابھی دو ہفتے پہلے یہ درخت شگوفوں سے لدے تھے۔ بادام کے چند درخت جو ڈومیسٹری اور لان کے درمیان تھے اب ان میں چھوٹے چھوٹے بادام نکل آئے تھے..... موتیا کی جھاڑیوں میں اولین کلیاں سر نکال رہی تھیں..... گرمیاں محسوس ہونے لگی تھیں۔
گلدان میں پھول سجاتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھا..... بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں ایک چپ لعلوں جڑی انگوٹھی تھی۔ اس کے پاس کئی اور خوبصورت انگوٹھیاں بھی تھیں لیکن اس انگوٹھی کو وہ تو...

سارا دن گلے کے تعویذ کی طرح یہ ساتھ رہتی۔ یہ انگوٹھی اس کی منگنی کے دن پہنائی گئی تھی۔ اسی نے اس کی زندگی کے دھارے کو متعین کر دیا تھا۔ وہ شاہد کے حصار میں مقید ہو گئی تھی۔ وہ نہاتے وقت بھی یہ انگوٹھی تن سے جدا نہ کرتی۔

پھولوں کو سجاتے ہوئے راحیلہ نے سوچا..... ایسے کیوں ہوتا ہے کہ زندگی کو موڑنے والے واقعات اکثر اوقات بڑے چھوٹے' سہل اور بے معنی ہوتے ہیں۔ ایک نظر..... چھوٹی سی بے معنی ملاقات' ایک انگوٹھی ہاتھ کی تیسری انگلی پر آتے ہی بڑے بامعنی دیرپا اثر کرتی ہے..... ابھی وہ زلزلہ خیز بڑے واقعات سے واقف نہ ہوئی تھی۔

ڈومیسٹری کے لیے مستطیل کمرے میں اس وقت اتفاقاً وہ اکیلی تھی۔ اسے زیادہ دیر سوچنے کی مہلت نہ ملی۔ چندرا گیلے بالوں کو تولیے سے ڈھکے کندھے پر لٹکائے داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں صابن دانی اور برش تھا۔ اس نے یہ دونوں چیزیں اپنی الماری میں رکھیں۔ ایک چوکلیٹ کا ٹکڑا منہ میں ڈالا اور پچھواڑے لان کی طرف چلی گئی۔ برآمدے میں چند فورتھ ایئر کی لڑکیاں کورس میں گاتی ہوئی نکل گئیں۔ راحیلہ نے پریت سے اپنے بستر کی چادریں بدلیں۔ غلاف تبدیل کیا۔ اپنے ٹرنک کے کپڑے درست کیے۔ صدیوں سے عورت نے گھریلو صفائی کی تھی۔ اس کے جراثیم گھر کی صفائی کو قدرتی طور پر قبول کرتے تھے۔ راحیلہ کو بھی اس وقت صفائی کر کے عجیب لذت سی محسوس ہو رہی تھی۔ کہیں اس کے اندر کا فرش بھی دھل رہا تھا۔ جھڑنے کے عمل میں تھا۔ جھاڑنے دھونے والی محبت شاہد کا روپ اس ایک جذبے نے کتنے غیر اہم جذبوں کو دل سے نکال دیا تھا۔ وہ ساری کالج کی لڑکیوں سے بے نیاز تھی۔ اسے کسی سے حسد نہ تھا..... وہ اپنے بھائی' والدین کی یاد میں اداس بھی نہ تھی..... لمحہ بھر کو راحیلہ نے سوچا..... بھلا جو لوگ اللہ کو دل میں بساتے ہوں گے' وہ تو ساری دنیا سے بے نیاز ہو جاتے ہوں گے..... اللہ کی محبت سب کچھ جھاڑ پونچھ کر کتنا اجالا کر دیتی ہوگی۔

راحیلہ اپنے سے بڑی باتیں سوچنے پر ابھی آمادہ ہی ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اپنے گیلے بالوں پر دوپٹہ اوڑھ لیا۔ ادھ کھلے ہال دروازے سے جھانک کر دھوبی نے دیکھا اور کھنگار کر بولا..... ''مس صاحب آ جاؤں.....''

''آ جاؤ آ جاؤ..... ابھی میں نے چادریں اتاری ہیں.....''

دھلے کپڑے راحیلہ کی چارپائی پر رکھ کر دھوبی مؤدب کھڑا ہو گیا۔

راحیلہ اپنی میز کی کتابوں' کاپیوں میں وہ کاپی تلاش کرنے لگی جس میں وہ دھوبی کا حساب لکھتی تھی۔ ہر بار جب دھوبی آتا وہ عجلت میں کاپی تلاش نہ کر سکتی اور ادھر اُدھر کی کاپیوں میں دھوبی کا حساب لکھ لیتی۔ اسے دھوبی کے کپڑے گننا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس زحمت سے فراغت پانے کے لیے اسے جو بھی کاپی ملتی' وہیں کپڑے کا ڈے ڈال لیتی۔ اسے دھوبی کے چہرے سے' کپڑوں سے وحشت ہوتی تھی۔ بہانہ بنا کر وہ وقت ٹالنا بھی چاہتی تھی لیکن ہوسٹل کے دھوبی بھی ٹرینڈ ہوتے ہیں۔ وہ بھی کسمساتے' دھیمی آواز میں ڈانٹتے۔ اپنے قیمتی وقت کا احساس دلاتے' ہیر پھیر کر اپنی منوا ہی لیتے تھے۔

کپڑے گٹھڑی میں جمع کرتے دھوبی بولا..... ''مس صاحب کچھ پیسے لینے تھے میں نے۔''

''کتنے؟.....''

''دو روپے بارہ آنے..... سوڈا اتنا مہنگا ہو گیا ہے سرکار..... اوراِن فسادات کا برا ہو کوئلے تو ملتے ہی نہیں.....''

راحیلہ کو اپنے خطوں والا ڈبہ یاد آیا۔ اس میں شاہد کے خطوط رہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے پیسے بھی اس میں رکھتی تھی..... اس نے ٹرنک کی تہہ سے یہ جادو کی پٹاری نکالی۔ ہیپ مِشی کا ڈبہ کھول کر پیسوں کی تلاش کی۔ اس میں سے صرف چند سکے نکلے۔ میز کی تمام درازیں دیکھیں۔ کوئی پیسہ نہ نکلا..... اس وقت اسے اپنی فضول خرچی پر بہت غصہ آیا۔ ابھی دو دن پہلے وہ ورشن کے ساتھ جا کر انار کلی بازار سے اپنے لیے دو سوٹ لائی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید کبھی بھی شاہد اسے ان کپڑوں میں دیکھ پائے۔ شاہد کو کالج میں آنے کی اجازت نہ تھی..... لیکن پھر بھی..... شاید ہو سکتا ہے! پھر اس نے پیسٹری مین کو بھی پورے چار روپے ابھی ایک شام پہلے دیئے تھے۔ پیسٹری مین سہ پہر کے وقت اپنے سلور کے ٹرنک میں پیسٹری لے کر بڑے پھاٹک سے ہو کر لان میں آیا کرتا۔ اس کی اوپر والی ٹرے میں کریم والی پیسٹریاں اور نچلے حصے میں کیک، سکوائز اور وِیفرز ہوتی تھیں۔ اس کے آتے ہی لڑکیاں دور دور سے کمرے، ہوسٹل ڈائننگ روم چھوڑ کر آتیں اور چٹ پٹ اس کا جستی ٹرنک خالی ہو جاتا۔ وہ بڑی آسانی سے ادھار بھی دے دیا کرتا تھا اور اس ادھار کا حساب کتاب بھی لڑکیوں کی یادداشت پر چھوڑ دیتا تھا۔

''وہ بات یہ ہے کہ..... دھوبی جی..... اس وقت تو ٹوٹے پیسے نہیں ہیں۔ آپ دوسری یا تیسری تاریخ کو آ کر پیسے لے جانا.....'' راحیلہ کو لگا جیسے اس کے حلق میں خشک سوئی اٹکی ہوئی ہے۔

''جی..... جی..... وہ تو ٹھیک بات ہے مس صاحب..... لیکن آپ کی دھوبن بیمار تھی۔ میں ٹھہر کے لے جاتا۔ پہلی، دوسری یا تیسری کو.....''

''ذرا باہر ٹھہرو میں ابھی آتی ہوں.....''

دھوبی کمرے کی الماریوں کو گھورتا ڈومیٹری سے باہر نکل برآمدے میں دھوپ سینکنے لگا۔

راحیلہ بھاگ کر پچھلے غسل خانوں کی طرف گئی۔ کئی نلکے چل رہے تھے۔ زیادہ غسل خانوں کے دروازے بند تھے۔ کسی کسی سے گانے کی آواز بھی آ رہی تھی۔

دو تین دروازے کھٹکھٹانے اور سوری مانگنے کے بعد وہ صحیح غسل خانے تک پہنچی۔

''کون ہے؟.....'' ورشن نے چیخ کر پوچھا۔

راحیلہ نے دروازے کے ساتھ منہ لگا کر کہا..... ''کتنی دیر ہے بھئی..... ذرا جلدی نکل، کام ہے.....''

''بس ابھی نکلی ابھی.....'' لیکن باقی جو کچھ ورشن نے کہا، وہ راحیلہ سن نہ سکی۔ ساتھ والے غسل خانے سے کوئی لڑکی اونچے اونچے گانے لگی..... ''روی روی روی میرے سپنوں کی رانی.....''

گیلے منہ سر ورشن کھٹاک سے باہر نکل آئی۔ اس کا گریبان کھلا تھا اور شلوار کا ایک پائنچہ گھٹنوں تک اٹھا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا اس نے جسم پونچھنے کا تردد بھی نہیں کیا تھا۔

''کیا ہوا راحیلہ؟..... کہیں کوئی چلی..... کیا خبر ہے؟.....''

اب راحیلہ کو یہ مصیبت آن پڑی تھی کہ اس سے دو روپے بارہ آنے کیسے مانگے؟

وہ دونوں فر وفر باتیں کرتی ہوئی واپس ڈومیٹری میں پہنچیں۔ سارے راستے راحیلہ سوچتی گئی کہ یہ تو ٹھیک ہے

کہ ورشن اس کے دل سے قریب تر ہے لیکن وہ اس سے پیچھے کیوں گر رہا گئے۔ جب وہ دونوں ڈومیٹری کے برآمدے میں پہنچیں تو راحیلہ کو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ دھوبی جا چکا تھا۔

پیسے مانگنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ سارا دن دھوبی کے خوف سے راحیلہ نے کامن روم میں گزارا۔ جہاں کوئی ریڈیو ٹی وی نہیں تھا۔ جب چھٹی کا دن ہوتا۔ کبھی کبھی لڑکیاں مل جل کر یہاں بیٹھ کر کیرم کھیلتیں۔ ڈھولک کے گیت گاتیں۔ جوش کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے درمیان پروفیسروں کی غیبت چلتی۔ وارڈن کے خلاف باتیں ہوتیں۔ امتحان اور رزلٹ ڈسکس کیے جاتے۔ ہوسٹل کے کھانوں میں نقص نکالے جاتے۔ کالن بالا سیکنڈ خورشید سیبہ پر بھاپ دھان کی باتیں ہوتیں۔ بھی ناکیز اور نیو تھیٹرز کے تقابل ہوتے۔ پنچولی آرٹ فلموں کی رعایت سے رمولا شانتا آپٹے راگنی منورما کے قصے چل نکلتے۔ سب مل کر گانے گاتیں۔

ساون کے نظارے ہیں لا..... لالالا.....

ان لڑکیوں کے دلوں میں ابھی رومان زندہ تھا۔ باہر چلنے والی گولیاں، قتل و غارت سے ان محفوظ جانوں کا تعلق گہرا نہ تھا..... وہ سرزمین، مذہب، کچھ اجتماعی زندگی کے متعلق اتنا ہی سوچ سکتی تھیں جس قدر آرام اور سکون کی زندگی گزارنے والا شخص سوچ سکتا ہے۔ ان میں ابھی بابا آدم کی طرح تجسس کی آگ نہ لگی تھی..... اپنے لیے خود سوچنا، نکھارنا اور پھر آگے بڑھنے کے مرحلے سے وہ ناواقف تھیں۔

☆☆☆

کامن روم میں رات گئے ابھی تک کچھ سرپھری لڑکیاں پنکج ملک کا گیت گا رہی تھیں۔

"یہ کون آج آیا سویرے سویرے....."

ورشن سو چکی تھی۔ ڈومیٹری کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ موسم گرم تھا۔ دو ایک پنکھے بھی چل رہے تھے۔ عموماً سڑک کی جانب سے ٹریفک کا شور سنائی دیا کرتا تھا لیکن اس وقت سوائے ان لڑکیوں کے اور کسی قسم کا شور نہ تھا۔ چھٹی کا دن تھا ورنہ رات دس بجے سارے کامن روم خالی ہو جاتے۔ سٹڈی ٹائم شروع ہو جاتا اور گیارہ بجے وارڈن سارے کمروں میں بتیاں بجھانے کا حکم دیتی چیک کرتی پھرتی ہے۔

شاہد بھلا اس وقت کہاں ہوگا؟

اپنے کالج کے سوئمنگ پول میں تیرنے کے بعد وہ تھکا ہارا اپنے خالو کے گھر کسی پلنگ پر سو رہا ہوگا..... شاید سائیڈ ٹیبل کی بتی جلتی ہو..... ہو سکتا ہے ریڈیو چل رہا ہو اور اس پر پنکج ملک کا گیت بج رہا ہو۔

یہ کون آج آیا سویرے سویرے؟

شاید وہ کسی دوست کے ساتھ فلم دیکھنے گیا ہو اور اگلی سیٹ میں بیٹھی کسی کرائسٹین سکول سے وہ سکرین پر کچھ اور دیکھ رہا ہو..... مجھے..... کسی اور کو..... اس شک کے ابھرتے ہی اس نے سر جھٹکا۔ شاید ایسا نہیں ہو سکتا۔ شاید ایسا سوچ بھی نہیں سکتا..... اس کی نظروں میں لمبی تڑنگی عابدہ گھوم گئی۔ اس کا ڈھیلا ڈھالا انجر پنجر شتر مرغ کی چال چلتے ہوئے ابرو دونوں ابروؤں کے درمیان سرمے کی کالی بندی زنگ برنگی ساڑھیاں، منقش جوتیاں، اونچے قہقہے..... راحیلہ کا حسد عابدہ کے معاملے

میں کبھی کبھی اتنا شدید ہو جاتا کہ اس کی اپنی زندگی ساقط ہو جاتی اور وہ عابدہ کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ اس کے تخیل نے دیکھا کہ شاہد آگے بڑھا اور اس نے اپنے دونوں بازوؤں میں عابدہ کو بھر لیا۔ اس تصور سے ہی راحیلہ پسینے میں بھیگ گئی۔

کامن روم میں ایک کرلڑکیوں نے تان لگائی۔

ساہنوں نت دے خیال برے.....وے ماہی گھر آ جاوے

اس نے گانے میں جی لگانا چاہا۔ پھر سو جانے کی کوشش کی لیکن تصور نے نیند کو کھڑکی بند نہ کرنے دی۔

اس کے ساتھ والی چارپائی ورشن کی تھی لیکن آج نہ جانے وہ کدھر چلی گئی تھی۔ اس کے پلنگ پر کوئی لڑکی اوندھی لیٹی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں وہ سو رہی تھی کہ جاگنے میں مشغول تھی۔ بس اس کا انداز شکستہ سا تھا۔ ایسی بچہ نما لڑکیوں کو عموماً مائیں تھپک تھپک کر سلاتی ہیں۔ راحیلہ نے باتھ روم جانے کے ارادہ سے پیروں میں سلیپر ٹھنسائے تو لڑکی نے اپنے چھتے سے بال جھٹک کر منہ پھیر لیا۔ اندھیرا کافی تھا' وہ پہچان نہ سکی کہ ساتھ والی چارپائی پر کون ہے۔

راحیلہ دبے پاؤں دروازے تک پہنچی تو آخری چارپائی سے کھسر پھسر کی آواز سنائی۔

''میں تمہارے ساتھ قیامت تک نہیں بولوں گی۔'' سسکیوں میں ڈوبی آواز کسمسائی۔

''مری جان سنو.....سنو تو سہی.....''

''تمہیں میری پرواہ نہیں ہے.....نہیں ہے.....میں نے خط تمہاری اکنامکس کی کتاب میں خود رکھا تھا۔ تم نے خط کا جواب بھی نہ دیا۔''

''دیا تھا' دیا تھا۔ تمہارے سرہانے رکھا تھا تکیہ کے اندر.....''

''تم راجندر کے ساتھ زیادہ گھل مل گئی ہو۔ اب میری کیا پروا؟.....'' منت کے ساتھ بے پرواہی کا گلہ جاری تھا۔

''بھگوان کی سوگند.....مجھے تمہاری قسم.....''

راحیلہ نے باتھ روم کا خیال چھوڑ دیا۔ دبے پاؤں اپنے بستر پر لوٹ آئی۔ وہ عجیب قسم کی سوچ سے دوچار تھی.....کیا واقعی انسان اکیلا تھا.....اتنی بڑی کائنات میں اس کا وجود اپنی تنہائی کے باعث کسی دوسرے کی وجہ کا ہمیشہ کے لیے متلاشی تھا.....وہ ساتھ والی شکستہ انداز لڑکی کی کائناتی مجبوری کو سمجھ رہی تھی۔ وہ ان دونوں لڑکیوں کے عہد و پیمان کی وقعت بھی جانتی تھی۔.....فقط تنہائی کا خوف' اکیلے رہنے' رہ جانے کی بے بسی.....

کیا تنہائی انسان کا آخری انجام نہیں تھا؟.....اور اگر یہ تنہائی.....اتنی بڑی کائنات میں انسان کا تنہا وجود ہی اس کا مقصود تھا تو وہ اس سے سمجھوتہ کیوں نہیں کر لیتا.....ہمیشہ بے ساختہ وہ کسی دوسرے سے اس تنہائی کو مٹانے کے لیے منتیں سی کیوں کرنے لگتا ہے۔ اسے یکدم ایک مجذوب یاد آ گیا۔ وہ مغرب کی نماز کے وقت سول لائنز کی جانب سے گزرا کرتا تھا۔ اس کے جسم پر رنگ برنگی گدڑی' گلے میں مالائیں' سر پر عمامہ' کندھے پر عربی رومال' ہاتھ میں چمکدار سونٹا ہوا کرتا۔ وہ جب سڑک سے گزرتا اپنے سونٹے کو کھڑکا تا' دائیں ہاتھ کی انگلی آسمان کی جانب اٹھا کر اونچی آواز میں کہتا..... ''سب تو.....''

اسے بھی اپنے سوائے ایک اور کی Assurance درکار تھی..... اتنی بڑی کائنات میں لوگوں سے اتنی یکطرفی کے باوجود وہ بھی اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھنا چاہتا تھا.....

اسے بھی کسی دوسرے کی تلاش تھی۔

ناخدانہ ہونے کی صورت میں وہ خدا کو پکارنے پر مجبور تھا۔

دوئی نہ ملنے پر وہ اپنی دوئی مٹانے کے لیے آخری بازی لگانے کی سعی کرتا رہتا تھا۔

شاہد.....شاہد.....شاہد.....

یہ کیسی تنہائی تھی جو کالج کی ان گنت لڑکیوں کے باوجود اپنا تونبا بجائے جاتی تھی۔

رات دن ایک خیال..... چاکلیٹ جیسی جمی جمی آواز..... کریپ لیدر کے بھاری بھاری جوتے' وزن اٹھانے والے مضبوط ہاتھ..... برداشت کر لینے والا چوڑا چکلا سینہ..... وہ دنیا کے کسی کونے میں ہو راحیلہ کے وجود کا سارا بوجھ اسی ایک شاہد پر تھا۔

کوئی تیزی فضا کو چیرتی اپنی کرہناک آواز راکٹ کی طرح چھوڑتی' اپنی تنہائی کو روتی پیٹتی کہیں غائب ہوگئی..... اب کامن روم سے دبی دبی آواز آئی۔

مکھن چھانصیب لے گئے کھیڑے

تے توں بجیاں نوں سانبھدا ہب گیا

وہ سوچنے لگی اگر کسی وجہ سے..... حالات کے بدلنے سے اس کی شادی شاہد سے نہ ہو سکی..... تو کیا ہوگا..... کیا وہ سمندر کی تہہ میں ڈوب جانے والے جہاز کی طرح کبھی سمندر کی سطح پر نہ آسکے گی۔ ہمیشہ ڈوبی رہے گی۔ پھر راحیلہ نے کسی اور شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور کیا..... ان گنت عجیب تصورات بل کھاتے پھنکارتے سانپوں کی طرح اس پر پل پڑے۔ اس کا سانس رکنے لگا..... وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اب ساتھ والی چارپائی پر درشن آلیٹی تھی اور محو خواب تھی۔ اپنے منحوس خیالات سے پیچھا چھڑانے کی خاطر راحیلہ نے اس ملاقات کے متعلق سوچنا شروع کر دیا جو کچھ دن پہلے کالج کی لان پر شاہد سے ہوئی تھی..... شاہد کو وارڈن صاحب بھی راحیلہ سے ملنے نہ دیتی..... لیکن عابدہ اور جمیلہ شاہد کو بطور ڈرائیور سمگل کر لائی تھیں..... گو بظاہر شاہد ناخوش نظر آتا تھا لیکن دل ہی دل میں وہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ کہیں وہ دونوں جولا ہور محض سیر سپاٹے کے لیے آئی تھیں اپنا پروگرام نہ بدل لیں۔

شاہد کا سفید رنگ پیلاہٹ میں ڈوبا ہوا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ یوں لگتا تھا وہ کئی دنوں سے سویا نہیں۔ اس کا لہجہ اکھڑا اکھڑا تھا۔ جیسے وہ خود تصفیہ نہ کر سکا ہو کہ اسے کیا کہنا ہے۔ اس کے برعکس عابدہ بڑی پُر اعتماد اور اپنے آپ کو لیے دیئے تھی۔ ٹھیک مقام پر ہنستی' صحیح ریمارک دیتی' فروعی باتوں میں بڑے موقع پر ابرو اٹھا کر دلچسپی کا اظہار کرتی۔ اس کی لفظی جوتی نے اسے اور بھی سروقد کر دیا تھا اور یوں وہ شاہد سے ذرا سی کم لگتی تھی۔ وہ راحیلہ کے مقابلے میں کسی ایکٹرس کی طرح نمایاں لگ رہی تھی۔ راحیلہ تو ہمیشہ ایسے لگتی جیسے ابھی سو کر آئی ہے۔ بار بار اس کے دل

میں غالب کا یہ شعر گھوم رہا تھا۔

"رات کے وقت مئے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں"

شاہد سامنے تھا..... عابدہ بھی سامنے تھی..... اور راحیلہ کو معلوم نہ تھا کہ اس ملاقات پر شکر کرے یا اداس ہو.....

"واپس کب جا رہی ہو عابدہ....."

"بس یہی دو چار دن کے اندر..... ابو ساتھ آئے ہیں۔ انہیں ہائیکورٹ میں کسی مقدمے کی پیروی کرنا ہے..... یہ بوڑھے لوگ مقدموں میں اتنی دلچسپی کیوں لیتے ہیں شاہد؟....."

شاہد نے آنکھیں سکوڑ کر ذرا توقف کے بعد کہا..... "میں نے بوڑھوں کے متعلق کبھی سوچا نہیں۔"

"سوچنا تو چاہیے۔ یہ لوگ ہماری زندگی کا کافی بڑا حصہ ہیں..... کیوں راحیلہ؟....."

راحیلہ نے آج تک ساجدہ ماں' سرفراز ابو اور دادا کو بھی خصوصی طور پر بوڑھا نہیں سمجھا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ لوگ کچھ اس سے علیحدہ ہیں.....

"میں تو سمجھتی ہوں انہوں نے ہمیں زچ کرنے کا ٹھیکہ اٹھا رکھا ہے۔ ہر چیز پر اعتراض ہر بات پر Objection..... تمہیں پتہ نہیں یہ کتنی مشکل سے مجھے ساتھ لائے ہیں....."

جمیلہ نے ذرا اکتا کر کہا..... "بھئی کوئی ہلکی پھلکی باتیں کرو ناں..... ہم یہاں بوڑھوں کو ڈسکس کرنے تو نہیں آئے....."

"اچھا بھئی آج کل تمہارا پسندیدہ مشغلہ کیا ہے شاہد؟....."

"سونا..... سونا..... اور پھر سونا....."

راحیلہ نے سوچا بھلا شاہد کو اتنی نیند کیسے آ سکتی ہے؟

"جھوٹ جھوٹ جھوٹ..... اتنی جھوٹ جھوٹ جھوٹ..... رات تم بارہ بجے لان پر ٹہل رہے تھے۔ پکڑی گئی ناں چوری؟....."

شاہد نے غصے سے کہا..... "پتہ نہیں کیوں ہر بار میرا تیرا ساتھ لڑائی پر ختم ہوتا ہے!"

"اوہو بھائی آج تو تم جلال میں ہو..... ہلکی پھلکی باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ کیا سپرٹ ہے شاہد۔" عابدہ نے اسے کہنی سے پکڑ کر واپس کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ اول تو عابدہ کے ساتھ آنا غلطی تھی۔ پھر آ کر یوں غصے میں اچانک آ جانا مزید حماقت تھی..... یہ راحیلہ کیا سوچتی ہوگی' میں اور عابدہ آخر آپس میں کتنے فری ہیں۔

جمیلہ ان سب کے اندر بہنے والے ندی نالوں سے ناواقف تھی۔ اس کے لیے یہ تینوں واقعی احمق لوگ تھے۔

"باقی میرا تو محبوب ترین مشغلہ شکنجبین پینا ہے..... اور شکنجبین ہم جگ سے منہ لگا کر پیتے ہیں ایک سانس میں....."

"واہ....." عابدہ کی انگلیاں شاہد کی کرسی کے بازو پر منڈلا رہی تھیں۔

سب مصنوعی ہنسی ہنسنے لگے۔

کسی سے کوئی بات نہیں بن رہی تھی۔ اندر کی گفتگو نے سب کو بے معنی باتیں کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کچھ دیر انھوں نے کوشش کی کہ کتابوں پر تبصرہ کریں لیکن شاہد کرکٹ کا کھلاڑی تھا' وہ گفتگو میں گھبرا نہ گیا۔ پھر شاہد نے سیاسی گفتگو اور لیڈروں کا تجزیہ پیش کرنا چاہا لیکن لڑکیاں اس ٹاپک میں نہ تو دلچسپی رکھتی تھیں نہ ہی مکمل واقفیت..... شاہد نے کچھ دیر کرکٹ کی باتیں کرنا چاہیں اور لڑکیوں کو امپریس کرنے کے موڈ میں ایل بی ڈبلیو اور ان سوئنگ آؤٹ سوئنگ کا فرق بتانے کا جتن کیا۔ لڑکیاں ایک بار سرد تندھے پیش کرنے میں کامیاب رہیں..... پھر عابدہ اور جمیلہ جدید فیشن کے کپڑے جوتیاں ڈسکس کرنے لگیں تو شاہد کری کی پشت سے سر ٹکا کر چپ ہو گیا.....

راحیلہ کا جی چاہا کہ وہ محبت کے متعلق باتیں کرے۔ یہ کیسا Phenomena ہے جو صدیوں سے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کیا کسی دوسرے کے روپ میں انسان اپنے ہی سے محبت کیے جاتا ہے۔ کیا محبت روح کی تنہائی دور کرنے کا واحد راستہ ہے۔ کیا دوسرا انسان محض آئینہ ہے کہ اپنے ہی عکس سے محبت کرنے کا عمل جاری ہو جاتا ہے۔ کیا محبت انسانی کمزوری ہے یا پھر انسان کی سب سے بڑی عظمت..... پاتال میں اترنے کا ذریعہ ہے کہ عرفان کی سیڑھیاں چڑھنے کا۔

راحیلہ کم عمر بھی تھی۔ پھر گھر سے نکل کر دوسرے لوگوں سے ملنے کا بھی اتفاق کم تھا۔ وہ ساری شام گم سم باتیں سنتی رہی..... ایک بار بھی اس نے کوئی سوال پوچھنے کی جرأت نہ کی..... ہاں عابدہ کے لپکتے قہقہے اس کے شاہد کی جانب کھسکتے ہاتھ راحیلہ کے لیے بڑی اذیت کا باعث رہے۔

اس ملاقات کے تصور نے ازسرِنو اس کے دل میں آگ لگا دی تھی۔ وہ پانی پینے کے لیے کھڑکی میں دھرے جگ گلاس کی طرف گئی۔ اس کی نظر لان کے پار بڑی سیمنٹ والی کوٹھی پر پڑی جو آسمان تک دھوئیں میں ملبوس تھی اور اس میں چٹک چٹک کر شعلے ابھر رہے تھے۔

لڑکیاں کبھی سیاست میں دلچسپی نہ لیتی تھیں۔

انھیں سائنس اور ترقی کا بھی علم نہ تھا.....

وہ مذہب کو بھی اتنی باریکی سے نہ جانتی تھیں۔

لیکن تعجب کی بات ہے مذہب' سیاست اور سائنس کو لڑکیوں میں گہری دلچسپی تھی۔ وہ لڑکیوں کا مستقبل ڈھال رہی تھی۔ ان کے حالات قسمت سے کھیل رہی تھی..... وہ آج کیا تھیں اور انھیں کل کیا ہونا تھا اس کی باریک سی تار ان ہی تینوں نے تھام رکھی تھی۔

اس وقت راحیلہ اکیلی تھی جو ڈورمیٹری میں جاگ رہی تھی..... کامن روم کی لڑکیاں رونق میلے سے تھک کر سو چکی تھیں..... اس کی نگاہیں دھوئیں کے مرغولے ان میں جلتی کوٹھی دیکھ رہی تھیں اور قتل و غارت کی وارداتیں' فسادات' ہندو مسلم اختلافات..... لیڈروں کے بیان اب قریبی حقیقت بن کر اس کے اردگرد منڈلانے لگے تھے..... جب تک اپنے پاؤں نہ جلیں انسان آگ کی گرمی سے آشنا نہیں ہو سکتا۔

وہ ہڑبڑا کر بھاگی..... اور روشن کا کندھا ہلا کر بولی..... "روشن آگ..... آگ اُف توبہ آگ....."

"ہائے واہ گرو....." ورشن ہڑ بڑا کر اٹھی۔

چند لمحوں میں ساری ڈومیٹری کی لڑکیاں اچکتی بھاگتی باری باری اٹھیں کچھ کھڑکیوں میں کچھ برآمدے میں کچھ پچھلی لان پر جلتی کوٹھی کا منظر دیکھنے کے لیے چلی گئیں۔

سیمنٹ والی کوٹھی اس ہوسٹل کے پچھواڑے لان سے ہٹ کر تھی۔ لان کے کنارے گھنے درخت اور درختوں کے آگے چالو سڑک تھی لیکن اب منظر دھوئیں میں لپٹا ہوا نہیں تھا۔ چٹختے شعلے لپکتے دمدار ستاروں کی آگ کی لائیں فلش کی نالیوں میں کھڑکیوں کے پردوں سے نکلتی باہر کو نکل رہی تھی۔ وہی بنگلہ جو سر شام سیاہ رات میں نظر بھی نہ آتا تھا۔ ایک جگمگاتا شوکیس بن گیا۔ بھڑکتی آگ اور دھواں ایک دوسرے سے لپٹے پردوں میں الماریوں میں پلنگوں سے نکل کر صوفوں ٹرنک میں ریچھ کے بچوں کی طرح کھیل رہے تھے۔ ایرانی قالینوں کا رنگ اس روشن دہکتی آگ میں اور بھی نکھر آیا تھا۔ قد آدم آئینے میں جلتا ساز و سامان پوری بے بسی سے منعکس تھا۔ آگ دھوئیں کا تعاقب ایسے کر رہی تھی جیسے کوئی اوباش مرد عورت کو تنہا پا کر اس پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ چنگاریاں اب آسمان میں بکھر رہی تھیں۔ دھڑام دھڑام دیواریں گرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جلتے دروازے الماریاں فرنیچر منہ کے بل گرتا اور اینٹوں میں دب کر بھی سلگتا چلا جاتا۔ آسمان تلے ایک اور آسمان دھوئیں کا پیدا ہو گیا اور اس میں جہاں کہیں کوئی ستارہ نظر آتا۔ یونہی لگتا جیسے آگ سے بچھڑی کوئی چنگاری ہو۔

جلتی کوٹھی کے ارد گرد جنونی مرد حیوانوں کی بولیاں بول رہے تھے۔ ان کے نعروں میں درندوں کی سی بے رحی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے خراب مائیکروفون پر بے رحم دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔

ان آوازوں نے لڑکیوں کو دہلا دیا تھا..... وارڈن صاحب لڑکیوں کو واپس کمروں میں دھکیلنے کی کوشش میں تھیں۔ کچھ بزدل ویسے ہی ڈر کے مارے باہر نہ نکلی تھیں۔ کچھ گروہوں کی شکل میں حیران ایک دوسرے کو دیکھنے میں مشغول تھیں۔ کچھ اکڑوں بیٹھی چارپائیوں پر سسکیوں کے ساتھ روئے جاتی تھیں۔

کچھ مارے تجسس کے لان کے پار درختوں تک جا پہنچیں۔ کچھ نے ہوسٹل سے نکل جانے کی خاطر بڑے پھاٹک کا رخ کیا۔ چوکیدار اپنی بے نوری روشنی والی لالٹین لیے سارے میں بولایا پھرتا تھا۔ اس کا چہرہ کوٹھی کی آگ میں بدروح کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کی ٹانگوں کا خم اور بے جا دلیری مضحکہ خیز لگتی تھی۔ جب کوئی بھی سو نہیں رہا تھا' اس کی جاگتے رہو' کا نعرہ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس نعرے پر چیخ کا احتمال ہوتا تھا۔

ہولے ہولے ساری لڑکیاں ایک ہوسٹل میں جمع ہو گئیں۔ خطرہ تھا کہ واردات کرنے والوں کا حیوانی گروہ کہیں کالج کا رخ نہ کرے۔ اس وقت امریکن پرنسپل اپنا سلیپنگ گاؤن کمرے بندھے بلٹ سے باندھتی ہوئی آئی۔ پہلے اس نے لڑکیوں کو خاموش ہونے کا حکم دیا۔ جو لڑکیاں ہسٹیریا کی حد تک بے قابو ہو رہی تھیں۔ ہولے ہولے چپ ہو گئیں۔ پرنسپل نے ہاتھ جوڑ کر اپنے عیسیٰ مسیح سے لمبی چوڑی دعا مانگی اور پھر لڑکیوں سے مخاطب ہو کر بولیں..... "آپ سب کو علم ہے کہ برصغیر اس وقت فسادات کی لپیٹ میں آ چکا ہے۔ میں اس بات پر فیصلہ صادر نہیں کر سکتی کہ یہ سب کچھ کیوں' کیسے اور کس طرح وقوع میں آیا..... لیکن تم سب ایک بات یاد رکھنا کہ جب حقوق دیئے نہیں جاتے تو پھر چھین لیے جاتے ہیں۔ جب کسی مسلک کو کمتر سمجھا جاتا ہے تو پھر نفرت کی آگ بھڑکتی ہے۔ تم سب جب یہاں سے جاؤ تو یاد رکھنا کہ خود جینا اسی وقت ممکن ہے جب آدمی

دوسرے کو جینے کا حق عطا کرتا ہے۔ جب بھی آپ دوسروں کو قید کرتے ہیں‘ ردعمل کے طور پر خود قید ہو جاتے ہیں کیونکہ ہر عمل کا ردعمل ضروری ہے۔ آدمی دوسرے آدمیوں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے..... اور..... مل جل کر رہتا اسی وقت ممکن ہے جب دوسروں کی آزادی ان کے حقوق پامال نہ کیے جائیں..... جہاں کہیں بھی آپ سب جائیں‘ تم سے یہ شکایت کسی کو نہ ہو کہ تم نے اس کا دائرہ وزیست تنگ کر رکھا ہے..... حضرت مسیح کے نام میں خدا حافظ..... کیونکہ کل ہوسٹل بند ہو رہا ہے۔“

●○●○●○

تیسرا عہد

(ب)

سول لائنز سے ملحق ایک آبادی لبرل لوگوں کی تھی جو آج کی زبان میں وی آئی پی تھے۔ ان کی کوٹھیاں بہت کشادہ تھیں۔ سامنے بھی لان اور پچھواڑے بھی۔ سامنے والی لان کے دونوں طرف خوبصورت گیٹ تھے اور گاڑیاں عموماً نصف دائرہ کاٹ کر سڑک تک پہنچ جاتی تھیں۔ ان کوٹھیوں کے پورچ اونچے برآمدے' کھلے کمرے' کشادہ سیڑھیاں گیلری سے اوپر تک جاتی تھیں۔ یہ عمارتی نقشہ Symetrical تھا۔ باورچی خانے عام طور پر کوٹھی کی Main بلڈنگ سے پیچھے ہوتا۔ ملازموں کی ریل پیل تھی۔ یہ کوٹھیاں انگریز بہادر کے رہن سہن کی کاپی تھیں۔ گو اندر بسنے والے لوگ مسلمان' ہندو' سکھ' عیسائی سب اپنے اپنے مذہب اور کلچر کے پابند تھے لیکن کھانا میز پر چنا جاتا۔ نئی پود آپس میں گھل مل رہتی۔ بیڈمنٹن' کیرم اور تاش کے کھیل عام تھے۔

عجیب بات اس دور کی یہ تھی کہ بظاہر ان لبرل گھرانوں کی دوستی انسان دوستی کے نظریے پر قائم تھی لیکن اندر ہی اندر یہ لوگ اپنے اپنے مذہب کو گانٹھ دے کر بچوں کی وراثت میں شامل چھوڑ جانا چاہتے تھے۔ انسان ازل سے تضاد کا شکار ہے۔ ہمیشہ ایک سے حالات میں رہنا چاہتا ہے اور تبدیلی کا خواہش مند ہے۔ ہیشگی اور تبدیلی کے تضاد ہی نے اسے ہمیشہ frustate کیا اور تن من دھن سے کسی ایک راستے پر چلنے کی سکت سلب کی..... لبرل آبادی کی کوٹھیوں میں بسنے والی عورتیں خاص طور پر بڑے تذبذب کا شکار تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ زنانہ کلب کی دوستی بڑھنے نہ پائے۔ وہاں تو لڑکیاں عورتیں خوب بناپے سے ملیں۔ آپس میں عیدملن پارٹی' ہولی' دیوالی' کرسمس سب کچھ منائیں' رت جگے ہوں..... فن فیئر جو اس زمانے میں زنانہ قسم کی ایگزیبی تھی اور جسے لوگ باگ مینا بازار کہتے تھے مینابازاروں کا سکول کالجوں میں زنانہ کلبوں میں بڑا رواج تھا۔ سول لائنز کی خواتین ذوق شوق سے مینابازاروں میں جاتیں لیکن مسلمان' ہندو' سکھ' عیسائی عورتوں کی دل ہی دل میں یہ خواہش رہتی کہ یہ اختلاط ان فنکشنوں تک ہی رہے۔ لڑکیاں بالیاں غیر مذہب کی لڑکیوں میں زیادہ گھل مل نہ جائیں۔ ابھی لڑکیاں ماؤں کی اجازت سے دوستی کرتی تھیں۔ خط لکھنے کا رواج تو عام تھا لیکن کسی سہیلی کے گھر دن گزارنے کی اجازت مشکل سے ملتی۔ رات گزارنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

شیدائی تھے۔ انسان کو ہر مرض کا دارو سمجھا جاتا۔ شہروں میں کسی نے کبھی لوڈشیڈنگ کا نام بھی نہ سنا تھا..... وقت بڑی سست رفتاری سے قطرہ قطرہ گزرتا تھا۔ لوگ سیاست' غیبت کا سہارا لیے بغیر بھی ایک دوسرے سے دلچسپی کے ساتھ بات کر لیتے۔ عورت اور مرد کے رابطے میں ابھی تقابل' برابری اور دولت درنہ آئی تھی۔ یہ رابطہ ابھی نظر' گفتگو اور لمس کے سہارے زندہ تھا۔ سوچ کروٹ کروٹ سارے مارکیٹ' معاشرے' رشتوں کو اتھل پتھل کر کے دیکھ نہ رہی تھی۔ ابھی عورتیں محفل میں خاموش رہتی تھیں اور لوگوں کے سامنے زیادہ کھانے سے پرہیز کرتی تھیں۔

وقت' زندگی اور معاشرہ سست رو تھا۔ محاورے بولتے اور پرانی دانش کی باتوں پر عمل کرنے کو معراج سمجھتے تھے۔ کیرم بورڈ' تاش اور بیڈمنٹن عام گھروں میں تفریح کا باعث تھے اور نوجوان بچے ان ہی کھیلوں کے سہارے آپس میں جڑے رہتے تھے۔ سہگل' کانن بالا' پنکج ملک' خورشید' جوتھیکا رائے' رام ڈلاری کے گانے شوق سے سنے جاتے..... امراؤ ضیا اور شمشاد کا زمانہ نکل چکا تھا۔ کلاسیکی موسیقی ان تھی۔ روشن آرا بیگم' استاد اسد علی خاں' امید علی خاں' فریدہ خانم ان تھیں۔ ان کی آوازوں کے عاشق ہر وقت ریڈیو کے ساتھ جڑے نظر آتے تھے۔

لیکن یہ سب اوپر والی سطح کا معیار تھا۔ سطح سے نیچے سارے لوگ ایک اور زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہندو مسلمان سکھ عیسائی بھائی بھائی نہیں تھے..... جہاں کھانا پینا' شادی بیاہ آسانی سے نہ ہو سکے وہاں لوگ ایک دوسرے میں گوندھے نہیں جا سکتے۔ سکھ ہولے ہولے ہندوؤں میں مدغم ہوتے جا رہے تھے۔ مسلک اور ایمان کے حساب سے وہ مسلمانوں کے قریب تھے۔ ان کے اوتار نے توحید' قیامت' فرشتوں پر ایمان سکھایا تھا۔ بابا نانک کی تعلیم منیر حسن صاحب نے کی تھی۔ بابا جی بذات خود پورا سال بھر مکہ معظمہ میں رہے۔ نمازوں کی ادائیگی کی۔ انہوں نے ہمیشہ رسول پاک کو آخری نبی جانا اور نمازیں پڑھیں لیکن اس رد عمل کا مطلب؟

لوگ ایک دوسرے سے خائف تھے۔ اپنے پرائے کی شناخت پر یڈ جاری تھی۔ اندر اندر رنجشیں بدل رہی تھیں۔ ہندو ہندو کے قریب رہ کر عافیت محسوس کرتا تھا۔ سکھ ملک کے اعتبار سے مسلمانوں کے قریب تھے لیکن معاشرتی زندگی میں وہ ہندو جاتی کے قریب تھے۔ ہندوؤں میں شادی بیاہ کرنے کے بعد انہیں گرو جی کا چولا بھول گیا تھا جس پر آیات قرآنی درج تھیں۔ وہ اپنے آپ کو ہندو کے قریب رکھ کر سیاسی اور دنیاوی طور پر بڑے خوش محسوس ہوتے تھے۔

مسلمان گویا چوہے کی طرح کڑکی میں پھنسے تھے۔ انہوں نے برس ہا برس ہندو کا ساتھ دے کر بھی یہ سبق سیکھا تھا کہ ہندو پہلے ہندو پھر ہندوستانی۔

مشکل اس وقت پیدا ہوتی جب بظاہر لبرل تعلیم یافتہ حضرات آپس میں دوست بن جاتے۔ پھر خاندانوں کا بھی میل ہونے لگتا۔ ایک دوسرے کا دل رکھنے کے لیے کئی باتیں درگزر کرنا پڑتیں۔ بیگم عباس نے تو سازھی کے ساتھ بندیا بھی ماتھے پر لگانا شروع کر دی تھی اور کرواچوتھ کے تہوار پر وہ مانگ میں سیندور بھی لگا لیتی۔ وکیل غلام عباس لندن سے پڑھ کر آئے تھے۔ وہ ایسی باتوں کا نوٹس نہ لیتے۔ ڈاکٹر سرفراز مغل اب پکے مسلم لیگی تھے۔ وہ پنڈت گوپال داس اور وکیل غلام عباس کے گھرانے میں آتے جاتے ملتے ملاتے لیکن پل بھر کو بھی وہ اتنے لبرل نہ ہو سکتے کہ ان کے دھیان میں اپنے کلچر یا مذہب کی نفی ہو.....

ابراہیم دادا کو مسلمانوں میں نیچری مشہور تھے اور علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ سرسید احمد خاں کے گروپ کی طرح وہ سائنس اور موجودہ تعلیم کے حامی تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ پنڈت گوپال داس کے گھرانے کے ساتھ اس قدر شیر و شکر ہونے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اٹھتے بیٹھتے نوجوانوں کا سوچتے اور بہو ساجدہ بیگم سے کہتے رہتے..... "یہ تم پنڈت جی کے گھر آنا جانا چھوڑ دو۔ پاپڑ کھتائیاں بازار میں بھی بکتی ہیں۔ وشنیو کھانے کا چسکا رنگ لائے گا..... میں تمہیں بڑیاں سموسے بازار سے لا دوں گا۔ ان کی ترکیبوں کے بہانے پنڈت جی کے گھر نہ گھسی رہا کرو۔ بھئی! نوجوان بچے ہیں۔ کیا جانے دل میں کیا سما جائے۔ میل جول اسی حد تک رکھو جہاں تک اپنے مذہب کو دھکا نہ لگے اور کلچر محفوظ رہ جائے۔ اپنا بھی اور دوسرے کا بھی۔

دراصل یہ سارے گھرانے دو راستوں پر چل رہے تھے۔ ایک طرف تو ان کی آرزو تھی کہ اپنا مذہب اور کلچر جوں توں اگلی پود کو وراثت میں دے جائیں' دوسرے ہندوستان کی ساری آبادی اکبر کے صلح کل فارمولے کے تحت ساتھ ساتھ جینا سیکھ جائے..... نہ گائے کی قربانی ہو نہ محرم کے دنوں میں فسادات ہوں۔ آپس میں اکٹھے رہیں اور مذہب کو آنچ نہ آئے۔ بڑی مشکل سی بات تھی۔ ہندو مسلمان آپس میں نہ تو مواکلت اور نہ مناکحت کرتے تھے..... جب ساتھ نہ کھانا پینا ہو نہ شادی بیاہ میں بندھ سکیں تو بتایئے cohesion کیونکر ہو..... مسلمان اس معاملے میں اب تک اس قدر فراخ دل ہو چکے تھے کہ انگریزوں' اینگلو انڈین اور عیسائی لوگوں سے کھانے پینے کا پرہیز قریباً ختم ہو چکا تھا۔ یورپین اور برٹش عورتوں سے شادی بھی رچا کر لے آتے کہ اہل کتاب سے مناکحت جائز تھی لیکن اینگلو انڈین اور عیسائی گھرانوں سے اس معاملے میں ابھی پرہیز جاری تھی..... ہندو اور سکھ بھی لیڈیاں بیاہ لانے کے شوقین تھے لیکن وجہ اس کی کچھ اور تھی..... وہ سیاسی طور پر مضبوط ہونا چاہتے تھے اور مسلمان معاشرتی طور پر......

یہ قیام پاکستان کا سال تھا۔ جس طرح بہت ساری چینی پانی میں ملا کر رکھ دیں تو کچھ عرصہ بعد پانی خشک ہونے پر چینی مصری کی صورت میں ٹکڑی ٹکڑی علیحدہ ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی ایک عرصہ ہندوستان کی آبادی نے بہت کوششوں سے ایک دوسرے کے ساتھ اچھے ہمسائے بن کر رہنا چاہا لیکن اب ہولے ہولے لوگ اپنی شناخت چاہتے تھے۔ سکھ ابھی اس خواب میں زندہ تھے کہ وہ اور ہندو باہمی رشتہ و پیوند کے باعث اکٹھے رہ سکتے ہیں لیکن بعد میں یہی سکھ Disillusion ہوئے۔ کشمیری' میزو' ناگا' نکسل باڑی' تامل' آسامی' تلنگانا لوگ اٹھے اور علیحدگی کے درپے ہوئے۔

کیا ایسے ہے کہ انسان پہلے پہل قبیلے کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ پھر پھیل کر سلطنت کے خواب دیکھتا ہے اور جب سلطنت کی سرحدیں وسعتوں کو پا لیتی ہیں تو پھر ٹوٹ پھوٹ کر از سر نو قبیلے کی زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ کیا یہی کھیل ازل سے کھیلا جاتا رہا.....؟

کیا وکیل غلام عباس' ڈاکٹر سرفراز مغل' پنڈت گوپال داس اندر ہی اندر ایک بہت بڑی سلطنت کا خواب دیکھ رہے تھے اور اپنے کلچر اور مذہب کی قربانی دے کر بھی ہندو یہ خواب پورا کرنا چاہتے تھے اور کیا مسلمان اپنے مذہب اور کلچر کے تحفظ کے لیے علیحدہ حکومت کا خواب دیکھ رہے تھے۔ ابراہیم لاج سول لائنز میں سب سے ممتاز بنگلہ تھا۔ کوٹھی کے بائیں جانب آم اور مولسری کے درخت تھے۔ گرمیوں کے موسم میں ان کی خوشبو دور دور پھیل جاتی۔ دائیں طرف گلاب' موتیا'

کبھی کبھی ابراہیم صاحب کی ڈاڑھی میں ایک آدھ آنسو گر جاتا اور پھر وہ اپنی پرانی کھتونیاں رجسٹریاں دیکھنے بیٹھ جاتے جو جنگ آزادی کے بعد ضبط ہوگئی تھیں۔ کچھ ایسے نئے اسٹام کا غذ بھی ان کے پاس تھے جو انگریز نے بعد غدر حکما چلائے تھے لیکن اب اس وقت کو بہت دیر ہوگئی تھی۔ پرانی زمینداریوں کے کاغذاب دادا ابا کی صندوقچی سے نکال کر کوئی نہ دیکھتا تھا۔

ڈاکٹر سرفراز مغل صرف اس کوٹھی اور اپنی سول سرجنی کی آمدنی پر بھروسہ کرتے تھے۔ عجیب سی بات ہے جس قدر سرفراز ڈھب' سلیقے اور نفاست کے شوقین تھے۔ اتنی ہی اماں پھوہڑ تھیں۔ کبھی کبھی جب اماں کمروں میں بال بکھرائے پھرتیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے تھری پیس سوٹ میں ملبوس ٹانگ پر ٹانگ دھرے ان کو دیکھتے رہتے اور آواز گرا کر کہتے......
''بھائی بال باندھ لو......جوڑا بنا لو......یا چٹیا' جراثیم پھیلتے ہیں......'' اب بھلا یہ کون سے جراثیم تھے جو بالوں سے لگے پھرتے تھے؟

وہ راحیلہ کو بھی ناخن رکھنے سے منع کرتے۔

''بھائی راحیلہ ناخن چھوٹے رکھو ان سے بیماری بڑھتی ہے۔ اپنی ماں سے غلاظت کا سبق نہ سیکھا کرو......'' اماں پوری گئو تھیں لیکن کبھی کبھی چڑ جاتیں۔

''لو جی یہ ابراہیم صاحب کے بیٹے ہیں۔ وہ تو یوں صاحب نہ بنے' علی گڑھ میں پڑھے تھے...... پر بھی جراثیموں پر نہ اترائے۔''

ڈاکٹر سرفراز اپنی ڈاڑھی میں انگلیاں پھیر کر کچھ دیر سوچتے رہتے اور کہتے...... ''بھائی صفائی تو نصف ایمان ہے۔ تم کب سمجھوگی؟ مسلمان کو تو پانچ وقت وضو کرنا پڑتا ہے۔''

''صفائی کو عزیز رکھیے ڈاکٹر صاحب لیکن آپ تو صفائی کو ہماری جان سے بھی عزیز جانتے ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب بھی سوچتے رہ جاتے کہ کیا واقعی وہ صفائی کو اپنے مذہب کا حصہ سمجھتے ہیں یا جو تعلیم انہوں نے دیا نا میں حاصل کی' کیا ان کی صفائی کا تصور وہاں سے آیا ہے۔

زندگی ابھی سست رفتار تھی۔ ہندو مسلمان دونوں کے راسخ العقیدہ لوگ اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح انگریز تو درمیان سے نکل جائے لیکن ہندوستان میں جو قومیں آباد تھیں' وہ باہم کسی نفاق کے بغیر رہتی چلی جائیں اور کوئی بڑا تفرقہ یا فساد نہ پھیلے...... ابھی ہندوستان میں چھوٹی چھوٹی باتیں اہم تھیں۔ لوگوں کے پاس رسم و رواج منانے کا وقت تھا۔ ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر گھریلو قسم کی نیمل ناک کرنے کا ٹائم تھا۔ ابھی وقت کی رسی دراز تھی۔

شام کو ڈاکٹر سرفراز مغل نے گیلری دھلوا ڈالی تھی۔ کھانے کے کمرے اور بیڈروم اسی نمی کے باعث حبس آلود تھے۔ صرف ڈرائنگ روم خشک تھا کیونکہ یہاں کے قالین اٹھوانے پر راحیلہ کی اماں رضامند نہ ہوئی تھیں۔

''ہی ہی ہی......کمال آم ہیں آپ کے پاس ڈاکٹر صاحب' سبحان اللہ......''

''گٹھلی تو کاغذ ہو کر رہ گئی......'' میاں غلام عباس بولے۔

ڈاکٹر صاحب اس قدر خوش ہوئے گویا کوئی دائم المریض صحت یاب ہو گیا۔

"جی..... جی طوطا پری اور سیندوری ابھی لگوائے ہیں۔ البتہ لنگڑا اباجی نے لگوایا تھا۔ آم کے پسند نہیں۔ وہ مرزا غالب والی بات تو آپ نے سنی ہی ہوگی....."

پھر میاں غلام عباس نے اپنی بیوی کی خالی پلیٹ دیکھ کر کہا..... "البتہ گدھا آم نہیں کھاتا۔"

ڈاکٹر سرفراز نے آموں سے لدی کشتی نما ٹوکری بیگم عباس کی طرف بڑھا کر کہا..... "کھائیے ناں۔"

"جی نہیں ڈاکٹر بھیا..... میرا معدہ کچھ خراب ہے۔"

پھر اس نے اپنے چپو شوہر کی جانب نظر ڈالی جس کی پلیٹ چھلکوں' گٹھلیوں سے عرابی ہو رہی تھی۔ دراصل وہ احتجاجاً کھانے پینے سے انکار کر رہی تھیں۔

ڈرائنگ روم میں لکڑی کی بریکٹوں پر پیتل کے چھلوں کے ساتھ لمبے لمبے گرین پردے لٹکتے تھے۔ سردیوں کے موسم میں آتش دان میں باغ کی وافر لکڑی جلا کرتی۔ پیتل کا خوبصورت جنگلہ سیاہ آتشدان کے سامنے چمک رہا تھا اور ان سے ٹیک لگائے پیتل کا چمٹا اور آگ کریدنے والی سلاخ جو ڈاکٹر صاحب نے پارسی نارو جی کی دوکان سے خریدی تھی ڈمک رہی تھی۔ میزوں پر کاڑھے ہوئے میز پوش اور صوفوں کی پشت پر بھی سفید صوفہ کور لگے تھے۔

ڈرائنگ روم میں اوما کے چاچی پنڈت گوپال داس اور ماتا جی کے درمیان بیگم عباس بیٹھی تھیں۔ ان کی پلیٹ خالی تھی اور کمرے میں ان کا وجود فرنیچر کی طرح ضمنی تھا۔ اگر راحیلہ کی امی ان سے کوئی بات کرتیں تو وہ واجبی سا جواب دے دیتیں ورنہ مسکراہٹ پر اکتفا کرتیں۔ ان کی کوٹھی اوما کے گھر سے ملحق تھی اور وہ اپنے خیالات میں کٹر بھی نہ تھیں لیکن انہیں اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ ان کی بیٹی جمیلہ ہر وقت اوما کے گھر میں گھسی رہتی اور اب تو کبھی کبھی ان کو شبہ بھی ہوتا کہ جمیلہ ایک سکھ ڈاکٹر سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اپنی ساڑھی کے پلو کو انگلی پر لپیٹتی ہوئی وہ اپنے بچوں کے متعلق ہی سوچ رہی تھیں۔ اب جمیلہ کو لاہور سے واپسی پر اوما کے گھر جانے کی اجازت نہ تھی۔ وہ ان گرمیوں کی چھٹیوں میں کچھ ایسا انتظام کرنا چاہتی تھیں کہ جمیلہ کا نکاح ہو جائے۔ ابھی تک جمیلہ نے کچھ نہ بولا تھا لیکن اس کی آنکھوں اور گردن کے خم سے ظاہر ہوتا کہ وہ ماں کے قریب نہیں رہی۔ اللہ! یہ بچے جوان ہوتے ہی ان کے لیے ایک معمہ کیوں بن گئے۔ بات راحیل کے ساتھ چل رہی تھی اور شاہد ساری شام خان صاحب کی عابدہ کے ساتھ ٹینس کھیل کھیل کر ہانپتا رہتا تھا۔

وہ دل ہی دل میں سوچتی رہتیں' سارا قصور مسلمانوں کا ہے۔ ہم نے ہندو جاتی کی نقل میں اتنی آزادی اولاد کو دے دی ہے کہ ہم اب ان کو کنٹرول نہیں کر سکتے..... یہ موئے انگریزوں کی کھیلیں ٹینس' بیڈمنٹن' کیرم' تاش ان کی بھلا ضرورت ہی کیا ہے۔ بیٹھ کر کوئی دینی رسالہ پڑھیں' مسجد جائیں..... لڑکیاں کشیدہ کاری کریں..... ٹنگ سیکھیں۔

بیچاری بھولی خاتون کو علم نہ تھا کہ وقت پیچھے کی طرف نہیں جا سکتا۔ وقت میں جب کوئی قوم بستی ہے اور کسی دوسری قوم کے تال میل سے فیض یاب ہوتی ہے تو پھر شدھ شکل میں کچھ نہیں رہ سکتا۔ اس میں انہی تال میل کے باعث کئی چھوٹی موٹی تبدیلیاں' کئی نئے رنگ' سوچ کے زاویئے نامعلوم طریقے سے سرایت کر جاتے ہیں۔ کچھ اسی وقت تک اپنی اصل میں رہتا ہے جب تک کوئی قوم کسی جغرافیائی حدود میں مقید ہو اور دوسری قوموں کے اثرات سے محفوظ زندگی بسر کرے ورنہ تال میل کا اقتضا ہے کہ تبدیلی آتی چلی جائے' محسوس اور نامحسوس طریقے سے..... پسند اور ناپسند کے راستے

سے۔ اسی لیے کچھ پر تکیہ کرنے والے ریت کے قلعے میں رہتے ہیں اور مسماری کا خدشہ ہمیشہ رہتا ہے۔

''تم کچھ نہیں کھا رہے بیٹا شاہد..... جھجک کیوں رہے ہو؟ جوانی کا کھایا پیا بڑھاپے میں کام آتا ہے.....''

''جی شکریہ..... میری طبیعت ٹھیک نہیں کچھ.....''

شاہد نے بڑی لجاجت سے شربت کا گلاس ہاتھ میں گھماتے ہوئے کہا۔ بیگم عباس نے چور نگاہوں سے بیٹے کو دیکھا..... اللہ اب اس کی طبیعت بھی ناساز رہنے لگی..... یہ بچوں کو ہو کیا گیا ہے۔

شربت کا گلاس بھرا بھرا یا قریباً آدھے گھنٹے سے شاہد کے ہاتھ میں تھا۔ اس میں پڑی برف کی قاشیں اب پگھل گئی تھیں اور باہر ننھے ننھے قطرے ابھر آئے تھے۔ اس نے بمشکل تمام ایک آدھ گھونٹ پیا ہوگا۔ صرف ہاتھ سرد کرنے کے لیے گلاس تھامے وہ بار بار اونچی چھت سے لٹکے پنکھے کو دیکھ لیتا۔ ڈاکٹر سرفراز نے اس پنکھے کو تیل دینے کی کوشش نہ کی تھی۔ شاہد کو لگ رہا تھا جیسے پنکھے کے رونے کی آواز کے ساتھ ساتھ کوئی کہہ رہا ہو..... مجھے جانے دو..... مجھے جانے دو.....

وہ سارے لوگوں سے پرے ریڈیو کے قریب بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی وہ ماتا جی کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا۔ یوں کمرے کے آخری کونے میں تنہا بیٹھا وہ کسی ایسے بچے کی طرح لگ رہا تھا جو بڑی کوششوں کے بعد بھی گھر والوں کی توجہ کا مرکز نہ بن سکا ہو اور اب ایک اندھیرے کونے میں اس غرض سے چھپ کر بیٹھا ہو کہ سب اسے ڈھونڈیں۔

شاہد بڑا وجیہہ نوجوان تھا۔ صرف اس کے چہرے پر قدرتی طور پر تفکر کے آثار تھے۔ ماتھے پر سلوٹیں تھیں۔ اس کا جوان چہرہ ان سلوٹوں کے باوجود بڑا خوبصورت تھا لیکن اس وقت اس کے منہ کے اتار چڑھاؤ کہہ رہے تھے کہ وہ بڑی کرب کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ ایسا کرب جو خواہ مخواہ اس کے گلے مڑھ دیا گیا۔

وہ قریب والی کھڑکی سے باہر لان کو دیکھ رہا تھا۔ دیر سے یہی سوچ اسے ستا رہی تھی کہ آخر راحیلہ اور اوما کہاں بسرام کر رہی ہیں؟ کیا انہوں نے ہماری موریس کار کا ہارن نہ سنا تھا۔ اس کار کی گڑگڑاہٹ سے تو سڑک کے سوئے کتے بھی جاگ جاتے ہیں..... اسے تو راحیلہ کی ناراضگی کا اسی روز احساس ہو گیا تھا جب وہ اور عابدہ ٹینس کے ریکٹ ہاتھ میں لیے برآمدے میں آئے تھے..... راحیلہ اور اوما دونوں کین چیئرز پر بیٹھی ہنس رہی تھیں۔ پھر اچانک عابدہ کو دیکھ کر راحیلہ چپ ہوگئی۔

عابدہ دبلی پتلی گوری چٹی لمبوترے چہرے پتلے ہونٹ اور چھوٹی آنکھوں والی مضبوط لڑکی تھی۔

''لو جی ہم نے تو عہد کر لیا ہے کہ کھیلیں گے تو شاہد کے ساتھ ورنہ نہیں..... ہاں.....''

پھر ساری شام راحیلہ بیگم عباس سے ہی باتیں کرتی رہی اور ایک بار بھی اس نے شاہد کی جانب نگاہ نہ کی۔ جب اوما اور راحیلہ چلنے لگیں تو شاہد نے دبی آواز میں کہا..... ''چلو تمہیں چھوڑ آؤں.....''

''جی نہیں شکریہ.....''

''لیکن موریس بھی تو کھڑی ہے.....''

''آپ تردد نہ کیجیے موریس میں عابدہ چلی جائیں گی..... آخر وہ کیسے جائیں گی.....''

''بھئی میں پیدل چلی جاؤں گی.....''

عابدہ بڑے چینل کے گملے میں پام کے پتے کو چیر رہی تھی' یکدم بولی۔

راحیلہ کی خفگی ایک خطرناک موڑ کاٹ گئی۔

شاہد نے شربت کا گلاس ریڈیو والی میز پر رکھ دیا اور باہر لان پر استراحت کرتی چاندنی سے دل ہی دل میں کہا.....لو بھئی چاندنی! اگر عابدہ میرے پیچھے لٹھ لیے پھرتی ہے تو بتاؤ اس میں میرا قصور؟ وہ میری بہن جمیلہ کی نکلی ہے۔ میں اسے کیسے avoid کر سکتا ہوں۔ میں راحیلہ کو کیسے یقین دلاؤں' کیسے سمجھاؤں؟ ٹینس کھیلتے کھیلتے میں اس کا عاشق تو نہیں ہو گیا؟

یہ لڑکیاں بھی عجب احمق ہوتی ہیں۔

''تمہارا دل نہیں لگ رہا.....شاہد بیٹے۔'' راحیلہ کی امی بولیں۔

''شوکت ہوتا تو دل بھی لگتا' اب یہ کس سے باتیں کرے بیچارہ۔'' ماما جی بولیں۔

''شوکت کی چھٹیاں نہیں ہوئیں۔ سب بچے تو کالج سے آ لوٹے.....'' بیگم عباس نے سوال کیا۔

''اپنے دوست کے پاس رہ کر ڈ ینگ سیکھ رہا ہے آ جائے گا۔'' ڈاکٹر سرفراز بولے۔

''کچھ آم ہی لو بیٹے.....تھکے تھکے لگتے ہو.....''

''جی خالہ جی تین سیٹ ٹینس کے کھیلے' ذرا سا تھک گیا ہوں۔ کیوں چلیں امی؟'' شاہد نے ماں کی طرف دیکھا۔

''اوہو.....دیکھیے ڈاکٹر صاحب.....یہ ہمارے بیٹے ٹینس کھیل کر تھک جاتے ہیں اور اپنے وقتوں میں پہروں کبڈی کھیلنے سے بھی پسینہ نہ آیا تھا۔ ہر وقت تازہ دم.....ان دنوں لوگوں کے جسم ہوتے تھے جسم.....جیسے شیر ہوں' کوئی برادہ نہیں بھرا تھا۔'' عباس صاحب نے ایک اور آم کو پلیٹ سے اٹھا کر جانچنا شروع کیا۔

ڈاکٹر سرفراز نے بیرے کو برتن اٹھانے کے لیے اشارہ کیا اور خوشدلی سے قہقہہ لگا کر بولے.....''ہاں ہاں اپنے وقتوں میں جو دیواریں تم پھاندا کرتے تھے' سو ہم ہی جانتے ہیں۔''

اس پر سارے کمرے میں قہقہوں کی گونج پیدا ہو گئی۔

لیکن بیگم عباس صرف مسکرا کر رہ گئیں۔

یا اللہ! ان بچوں کو کیا ہو گیا ہے.....اب اس شاہد کے چہرے کو ہی دیکھو.....ماتھے پر اتنی سلوٹیں اور ناک کی دونوں جانب یہ لمبی لمبی لکیریں۔

''وہ راحیلہ کہاں ہے.....'' بالآخر انہوں نے پوچھ لیا۔

''اوما اور وہ کوٹھے پر تھیں' آتی ہی ہوں گی.....'' راحیلہ کی امی بولیں۔

شاہد کے کان کھڑے ہو گئے۔ اپنی بے چینی چھپانے کے لیے وہ صوفے کی بانہہ پر انگلیاں بجانے لگا۔ اب انتظار اس کے لیے شدید ہو گیا تھا۔ عموماً انتظار کی آخری چند گھڑیاں اس کے لیے ہمیشہ ناقابل برداشت ہوا کرتیں۔ وہ عام طور پر کھانے کی میز پر دیر سے آتا اور جب اس کی اماں تاخیر کی وجہ پوچھتیں تو وہ کہتا ''اماں خواہ مخواہ انتظار میں وقت ضائع ہوتا ہے' میں بیٹھ کر مکھیاں مارتا ہوں' کھانا آ ہی نہیں چکتا.....''

''مکھیاں نہ مارا کرو' آرام سے کھانے کا انتظار کیا کرو۔ بڑی اچھی پریکٹس ہے کام آئے گی.....'' بیگم عباس کہتیں۔

''لیجیے اماں اب کھانے کا بھی انتظار کھینچنا پڑے گا؟''

اس کی بے صبری کا تو یہ عالم تھا کہ اگر کبھی سینما ہال میں جلدی پہنچ جاتا اور فلم لگنے کا انتظار کرنا پڑتا تو وہ پانچ چھ منٹ سے زائد ہال میں نہ رہتا اور Exit دروازے سے نکل کر کہتا..... ''چلو کل پھر دیکھ لیں گے'' اور دوسرے دن وہ ضرور چند منٹ لیٹ آتا۔

اس وقت راحیلہ اور اوما کا انتظار کرتے ہوئے وہ اپنے جی سے کہہ رہا تھا..... ''بابو جی تم سے عاشقی ہو چکی۔ تم کہیں لنڈے میں جا کر دوکان کھول لو..... کباڑی سنٹر..... لو انتظار کے بغیر عاشقی کیسی۔ عاشقی صبر طلب اور تمہیں ہر وقت بھاگم بھاگ.....!''

اپنی توجہ بٹانے کے لیے اس نے ساتھ والی تپائی پر رکھے پانچ میٹر بینڈ ریڈیو کا نوب دبایا۔ چند لمحے سبز روشنی جلی اور پھر سارے کمرے میں پھلوں کی خوشبو کے ساتھ شہنائی کی آواز لہرانے لگی۔ ابھی ریڈیو سٹیٹس سمبل تھا۔ جن گھروں سے ریڈیو کی آواز آتی' وہ گھرانے اونچے' فیشن ایبل' تعلیم یافتہ' کلچرڈ شمار ہوتے۔ ریڈیو پر خبریں سننا اور ان کو پھیلانا جنتری کا اہم مشغلہ تھا۔

میاں عباس کو بحث کرنے اور تقریر جھاڑنے کے لیے دراصل کبھی کوئی موضوع درکار نہ تھا۔ شہنائی کے لگتے ہی وہ موسیقی پر گوہر افشانی کرنے لگے۔ ڈاکٹر سرفراز جو جلد سو جانے کے عادی تھے' جمائیوں کو مصنوعی مسکراہٹوں میں چھپا کر خوشدلی کے ساتھ امیر خسرو' تان سین' سور داس کا تذکرہ سننے لگے اور دل میں سوچتے رہے کہ آخر یہ لوگ کب رخصت ہوں گے۔ یقیناً دس بج چکے ہوں گے۔ خانساماں باورچی خانے میں سٹول پر بیٹھا منتظر ہوگا۔ بیرے حسین بخش نے کئی بار باورچی خانے اور ڈائننگ روم کے درمیان لگے دروازے کے گول شیشے سے خالی میز کو دیکھا ہوگا۔ پھر اوپر برساتی میں سفید چادروں سے مکلف بستر ے الگ جان کو رو رہے ہوں گے۔

ڈاکٹر سرفراز کو آج تک اس بات کی سمجھ نہ آئی تھی کہ جب وہ محفل میں بڑے پُرتکلف انداز میں جی ہاں جی ہاں کرتے دوسروں کے ساتھ گھل مل کر بیٹھے رہتے تھے تو ان کے اندر ایک سینگوں والا ڈاکٹر جس کے دو اوپر والے دانت نچلے ہونٹ پر پڑتے تھے' جس کے کان لمبے اور سر پر استرا پھرا تھا' کہاں سے سر نکال کر سب پر منفی تبصرہ کیے جاتا۔ اسی دوسرے ڈاکٹر نے ان کی مجلسی زندگی برباد کر رکھی تھی۔ وہ مسلسل اپنی من مانی کیے جاتا۔ انہیں دوسروں کی نیت' ان کے نظریات کے الٹ' ان کی عادات کے برخلاف زمانے کے نامطابق پوائنٹ پر پوائنٹ مارے جاتا..... اس ہمزاد نے ڈاکٹر سرفراز کو بڑا تنگ کر رکھا تھا..... حکیم ابراہیم کو یہ مصیبت نہ تھی۔ وہ اگر اس موقع پر موجود ہوتے تو کھڑے ہو کر محبت سے کہتے..... ''بھائی دوستو..... مجھے جلد سو جانے کی عادت ہے۔ اگر ناگوار نہ ہو تو اب محفل برخاست کر کے کل پر اٹھا لیں..... ابھی مجھے نماز بھی پڑھنا ہے اور عشاء کی نماز لمبی ہوتی ہے۔''

حکیم صاحب کی بات کا نہ تو کوئی برا مناتا نہ ہی کبھی کوئی ناراض ہوتا۔

لیکن ڈاکٹر سرفراز مغل ابھی مدح وذم کے زنے میں تھے۔ سچ نہ بولتے" اس خوف سے کہ لوگوں کے ناخوش ہونے کا خطرہ تھا۔ جھوٹ بول کر اس لیے راضی نہ رہ سکتے کہ تربیت ایسی ہوئی تھی جس میں جھوٹ بولنا گناہ تھا۔

میاں عباس کوئی لمبا سا فلسفہ بگھار رہے تھے۔ اس فلسفے کی روانی میں ایک جملہ بھی پھنسانا مشکل تھا۔ لمبی سی جمائی کو مسکراہٹ میں بدل کر ڈاکٹر صاحب نے کہا....." بھائی! بڑا ہی دردناک راگ ہے' وہ بھی شہنائی پر....."

" دردناک ہرگز نہ کہیے ڈاکٹر صاحب.....موسیقی تو روح کی غذا ہے' پھر درد کیسا؟ درد تو وہ ہے جو دل پر بار بن جائے' یہ تو انفراد ہے انفراد۔"

ڈاکٹر صاحب کو احساس ہوا کہ منطق غلط ہے۔ کیا درد روح کی غذا نہیں؟.....لیکن مارے نیند کے اس نے کچھ نہ کہا۔

عین اس وقت تسنیم پردہ ہٹاتی مسکراتی ہلکے قدم دھرتی اندر آئی۔ اس نے منہ سے کچھ نہ کہا' صرف ہاتھ جوڑ دیئے اور پھر شاہد کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

" وہ راحیلہ؟....." بیگم عباس نے پوچھا۔

اوما نے وہی شربت کا گلاس اٹھایا جو ابھی چند لمحے شاہد کے ہاتھ میں تھا اور کچھ جواب نہ دیا۔

" بڑی گرمی ہے....." اوما بولی۔

" بہت زیادہ....."

" ویسے چاندنی بڑی پیاری ہے۔ کامنی کے پھولوں کی خوشبو آ رہی ہے۔"

" ہاں....." وہ بھی بیگم عباس کی طرح جاننا چاہتا تھا کہ راحیلہ کہاں ہے؟

" ہم چھت پر بیٹھے اسی خوشبو میں مست تھے۔" اوما نے کہا۔

یہ ہم بڑا حوصلہ افزا تھا کیونکہ اس میں راحیلہ بھی شامل تھی۔ اس نے راحیلہ کے متعلق تسنیم سے پوچھنا چاہا لیکن اسی وقت اس کی امی نے پوچھا....." بھئی اوما وہ میز پوش ختم ہو گیا تمہارا؟"

" جی آنٹی جی' بس پھندنے لگنے والے ہیں۔"

" ذرا دکھانا تو.....جمیلہ مانگ رہی تھی....."

شاہد کو تعجب ہوا کیونکہ اس کی بہن کو تو کشیدہ کاری' لیس اور ٹمٹنگ سے کہیں زیادہ روسی ناول پسند تھے۔ اس کی امی کی آرزو تھی کہ وہ باقی لڑکیوں کی طرح سلائی کڑھائی میں دلچسپی لے۔ باورچی خانہ اور وہ لوازم و ملزوم ہو جائیں۔ اردگرد کے لوگوں میں دلچسپی لے.....سکینڈل سنا کرے' غیبت کیا کرے لیکن جمیلہ کو تو لاہور سے آ کر دو ماہ کی چھٹیاں گھر گزارنا مشکل تھیں.....مردوں کی طرح روز اس کی ڈاک آتی..... پلندے کے پلندے' ان کے جواب لکھے جاتے' رجسٹریاں بھیجی جاتیں' پارسل بنائے جاتے..... جب امی کے طعنے بہت بڑھ جاتے تو وہ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ پہلے ہی ہوسٹل نو دو گیارہ ہو جاتی.....آخری چھٹی تک گھر رکنا محال تھا۔

اوما ڈرائنگ روم میں آئی بھی تو اکیلی۔ اب اس میں مزید انتظار کی گنجائش نہ تھی۔ یکدم اس کے ماتھے پر تیوری

چڑھ گئی۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کیس کو ٹٹولا۔ اس وقت اسے سگریٹ پینے کی سخت حاجت تھی۔ اس نے آہستہ سے ریڈیو بند کیا اور باہر کی جانب چلا۔

''ہیں ہیں کہاں چلے صاحبزادے۔'' میاں عباس نے شملہ کانفرنس پر ریویو ادھورا چھوڑ کر یکدم کہا۔

''ابی جی ذرا ان پرنبلوں گا..... یہاں تو بڑی ظالم گرمی ہے.....'' شاہد شان بے اعتنائی کے ساتھ گیلری کی جانب بڑھ گیا۔ بیگم عباس نے لمحہ بھر کے لیے اوما کی طرف دیکھا اور پھر بولی..... ''ڈلہوزی والی کوٹھی خالی کروا رکھی ہے۔ پر اس دفعہ کچھ حالات ٹھیک نہیں۔ عباس صاحب جانے نہیں دے رہے.....''

''ہم تو ہر سیزن پہاڑوں پر گزارتے ہیں..... ہم تو اس گرمی کے عادی نہیں۔''

ساجدہ بیگم نے اوما کی طرف دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔ وہ سوچتی تھی کہ اتنی ڈینگیں مارنے والی بیگم عباس کے ساتھ راحیلہ کیسے رہے گی؟

بیگم عباس نے یکدم ڈاکٹر صاحب کو آواز دے کر کہا..... ''بھائی صاحب! گھر میں ڈاکٹر ہو اور بہن گنٹھیا کے مرض میں ادھ موئی ہو جائے.....''

''جی جی فرمائیے.....'' جب سے راحیلہ کی توجہ شاہد پر ہوئی تھی۔ ڈاکٹر سرفراز مغل اپنے آپ کو بوڑھا محسوس کرنے لگے تھے۔ بیگم عباس کی خدمت میں فوراً متوجہ ہو کر بولے۔ ''فرمائیے فرمائیے۔''

''فرماؤں کیا بھائی صاحب۔ جب سوج ہو جاتی ہے تو ان کی کر جتنے ہو جاتے ہیں یہ گھٹنے۔ چلنے پھرنے سے معذور ہو جاتی ہوں.....''

ساجدہ بیگم کو دل میں ہنسی آ گئی کیونکہ بیگم عباس کی اپنی کمر میاں عباس کے پیٹے سے کم نہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب پوری توجہ سے استفسار میں مشغول ہو گئے۔ ''آپا جی! وہ آپ کو کول چی سن دی تھی۔ اس سے کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ گنٹھیا کے لیے تو اکسیر ہے۔ کیلشیم ٹیبلیٹ بھی ضرور کھایا کریں..... دراصل یہ مرض حیاتین کی کمی سے ہوتا ہے۔''

بیگم عباس بڑی نخریلی، خوش لباس اور اترا کر بولنے والی تھیں۔ تڑپ کر گویا ہوئیں۔ ''بھائی صاحب! چاہے کسی طرح ہو ہمیں تو نجات چاہیے اس مرض سے..... علاج بھی ایسے ہیں کیے جاؤ مسلسل تو درد کو افاقہ۔ آج دوا روکو..... کل مرض پھر حاضر..... میں تو اسپرین اور سوڈا سالسلیٹ کھا کھا کر عاجز آ گئی ہوں سچ!''

بیگم عباس کا موٹاپا ان کے شوہر سے بھی کئی گنا زیادہ تھا۔ ملنے ملانے والے سوچتے تھے کہ آخر میاں بیوی بیک وقت ایک دروازے سے کیونکر گزرتے ہوں گے۔ لوگوں کو علم نہ تھا کہ ایسی حماقت میاں جی اور بیگم صاحب نے کبھی کی ہی نہ تھی..... بیگم عباس طبعاً مہارانی تھیں۔ ہر وقت نواڑی پلنگ پر گاؤ تکیوں کے سہارے پھسکڑا مار کر بیٹھی رہتیں..... دھوبی آیا تو اندر..... درزی آیا تو اندر..... بیرا آیا تو بیگم صاحب کے پاس..... حتیٰ کہ خانساماں بھی ٹرے میں دیگچیاں رکھ اندر ٹیسٹ کرانے لے جاتا۔ محلے والیاں تو ماسٹر بیڈ روم میں گھسے رہنے کی عادی تھیں۔ بیگم عباس کو ملاقاتوں کا یہ ان فارمل طریقہ پسند تھا۔

ڈاکٹر سرفراز مغل نے فرش پر نظریں جما کر لجاجت سے کہا..... ''اس بیماری میں ذرا ٹہلنا اچھا ہوتا ہے.....

ہیں راحیلہ؟"

"جی..... حساب اور فلسفہ۔"

"فلسفہ..... یہ آپ کی بیٹی اور فلسفہ ڈاکٹر صاحب..... کمال ہے۔"

وہ اکیلے ہی ہنس دیے۔ بیگم عباس نے میاں صاحب کی جانب یوں دیکھا گویا ان کا قہقہہ اس کی باتوں میں مخل ہوا ہو۔

وہ از سرِ نو تسنیم کے ساتھ باتیں کرنے میں مشغول ہو گئیں۔

اس تسنیم میں بیگم عباس کی دلچسپی اس لیے بڑھی ہوئی تھی کہ تسنیم اس عہد کی ماڈل لڑکی تھی۔ وہ خاموش طبع' صابر' خدمت گزار اور فرمانبردار تھی۔ دوسروں کا حکم ماننے اور ان کا نکتہ نظر سمجھتے ہوئے اسے دقت پیش نہ آتی۔ اس کی زندگی میں قربانی' ایثار اور آنسو نیچرل تھے۔ اپنے حقوق کے لیے لڑنا' بدی کر کے اس پر اترانا' اپنے زاویہ نگاہ کے لیے جھگڑنا اس کے نزدیک مردانہ شوق تھے۔ حیا اس کا قدرتی لباس تھا۔ وہ گھر کی دیکھ ریکھ اور گھر والوں کی محبت میں اسیر ہو کر ان کی خدمت اپنے طور پر کرتی تھی۔ یہ اس کا Privilege تھا۔ اسی میں اس کی شان' خوشی اور محبت کا اظہار تھا۔ وہ جانتی تھی لیکن اس کا اظہار ضروری نہ تھا کہ خدمت ہی محبت کا دنیاوی اور بہترین اظہار ہے..... تسنیم جہاں جدھر اور جب بھی گزرتی دوسروں کے لیے رحمت کا فوارہ بن جاتی۔ بیگم عباس بھی اس لڑکی کو اچھا کہنے اور سمجھنے پر مجبور تھیں۔

راحیلہ کچھ دیر بیٹھی رہی۔ پھر چند برتن اٹھا کر گیلری میں نکل گئی۔ لمحہ بھر کو اس کے جی میں آئی کہ وہ لان پر جا کر ٹہلے... لیکن جب بھی وہ اکیلی ہوتی اور ٹہلنے لگتی تو برے خیالات کا ایک سلسلہ چل نکلتا۔ خیالات تو ہر گھڑی اس کی جان کے لاگو رہتے لیکن لان میں ٹہلتے وقت خاص طور پر وہ اپنی قوتِ متخیلہ کے زور پر عابدہ اور شاہد کے متعلق ایسی باتیں سوچنے لگتی کہ اس کے کان سرخ ہونے لگتے..... کوٹھے پر جا کر اس نے تخت پوش پر جائے نماز بچھایا اور نماز پڑھنے کی نیت سے اس پر بیٹھ گئی۔

یکدم خیالات کا سلسلہ پھر چل نکلا۔

یہ مسہری آج ایسی کیوں لگ رہی ہے؟ ڈھیلی بے ڈھنگی سی۔ یوکلپٹس کے درختوں کی اونچی شاخیں کوٹھے پر ایسے مہیب سائے کیوں ڈال رہی ہیں؟ چاندنی اتنی بے رونق کیوں ہے؟..... یہ موسم کیسا؟..... میرے کپڑے آرام دہ کیوں نہیں؟.....

کیوں؟..... وجہ؟..... آخر؟

سوالات' خیالات اور کیفیات کے ساتھ ساتھ اس نے نماز پڑھنے کو جاری رکھا۔ پھر فورڈ ماڈل انیس سو تیس پورچ میں گڑگڑائی جیسے اپنے مالکوں سے معافی مانگ رہی ہو کہ اب میری سواری کے دن ہو چکے' پنشن چاہتی ہوں۔

شاہد کے سخت ہاتھوں میں وہیل گھومی' کار کے اونچے مڈگارڈ کے اوپر دو تیز بلبوں کی روشنی بجری والے ڈرائیو وے پر پڑیں۔ کار کا ہارن بجا اور گاڑی سول لائن کے مین راستے پر چلی گئی۔ دیر تک اس کا شور نماز پڑھتی راحیلہ کو ستاتا رہا۔

تسنیم [illegible] نکل کر کھانے کے کمرے میں جھانکا۔ پھر سونے والے کمرے میں راحیلہ کو آوازیں

دیں اور ترنت اوپر والی منزل پر چلی گئی..... پھر اس نے چارپائیوں سے ہٹ کر تخت پوش پر نظر ڈالی۔

راحیلہ نے سلام پھیر کر پاس بیٹھی تسنیم کو دیکھا۔

"صلح ہو گئی پھر....."

"صلح کیسی صلح....." راحیلہ نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

"واہ جی..... شاہد نے منا لیا ہو گا..... لان پر اور کیا ہو رہا تھا....."

راحیلہ نے سر جھکا کر کہا..... "میں تو شاہد سے نہیں ملی....."

"ہائے اور وہ اکیلا لان پر ٹہلتا رہا..... آئے ہائے....."

"آپ نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا..... پہلے کیوں نہ اوپر آئیں تسنیم باجی....."

راحیلہ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے..... ابھی لڑکیاں چھوٹی چھوٹی باتوں پر رو سکتی تھیں.....

تسنیم نے راحیلہ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا..... اس کے پاس دینے کو بہت ساری ہمدردی تھی' پیار تھا..... اس کنوئیں کے پانی ٹھنڈے تھے۔

سول لائنز دراصل رام کشن داس روڈ کا ایک حصہ تھی۔ شروع میں اس شاہراہ نما سڑک کا آغاز رام کشن داس روڈ کے نام سے ہوا۔ پھر کمپنی باغ کے شروع ہوتے ہی اسے سول لائنز کے نام سے نوازتے اور آخری سرے پر جہاں پٹرول پمپ تھا اور آگے بڑے گراؤنڈ میں کبھی کبھی مویشیوں کی منڈی لگتی تھی' یہ سڑک سول لائنز نہ کہلاتی بلکہ ایک بار پھر رام کشن داس کا چھوڑا ہوا نام اختیار کر لیتی۔

اسی پٹرول پمپ سے ملحق میاں عباس ایڈووکیٹ کی حویلی نما کوٹھی تھی۔ سامنے پورچ اور برآمدہ حالیہ تعمیر تھی لیکن اوپر والی منزل کی چھوٹی چھوٹی بوسیدہ کھڑکیاں' برآمدے کے بعد ڈیوڑھی' مردانہ بیٹھک' اندر زنانہ خوابگاہیں' صحن درمیان میں صحن کے وسط میں پرانی وضع کا فوارہ ایک ایسا سلسلہ تھا جسے دیکھ کر پتہ چلتا کہ یہ عمارت خاصی پرانی تھی۔ ساری کوٹھی کا سامان قدیم اور جدید کی غیر متوازن آمیزش کا آئینہ دار تھا۔

برآمدے سے ملحق بیٹھک یا گول کمرہ تھا۔ اس میں فرنچ کھڑکیاں بھی تھیں اور چھت کے قریب روشندان بھی۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ حنوط شدہ ہرنیاں' بارہ سنگھے اور شیروں کے سر ٹنگے تھے۔ بنگال کے ٹائیگروں کی کھالیں بمع سروں کے لکڑی کے فرشوں پر پڑی تھیں۔ شکار کرنے والوں کی قدآدم تصویریں بندوقوں کے ساتھ کھنچی تھیں۔

اپنی جوانی کے دنوں میں میاں عباس ایڈووکیٹ بڑے معرکے کے شکاری رہ چکے تھے اور ایک ایک شکار کے ساتھ کئی کہانیاں وابستہ جو سامعین کو جانچ تول کر نیا رنگ' وقت اور حیرت کا توڑ بدل لیتی تھیں۔ جمیلہ اس پرانی حویلی کو بدلنا چاہتی تھی بلکہ اس کا دل تو چاہتا تھا کہ اس کو مسمار کر کے ابراہیم لاج کی طرح ایک ماڈرن رہائش گاہ تعمیر کی جائے لیکن جمیلہ کے اصرار کے باوجود صرف برآمدہ اور پورچ ہی کا اضافہ ہو سکا۔ باقی حویلی اپنے ماضی کی طرح گری اینٹیں' بند کوئیں' بتوں کے ڈھیر' کائی جمی دیواروں' کواڑ اکھڑے دروازوں کے ساتھ ساتھ جدید فیشن کا فرنیچر اور قالینوں سے بھرتی گئی۔ گھر میں جابجا بڑے چھوٹے تخت پوش بچھے تھے۔ ان پر بوسیدہ غلافوں میں بھاری گاؤ تکیے اور پرانے قالینوں کے ٹکڑے نظر آتے

تھے۔ جمیلہ کو ان تخت پوشوں سے وحشت ہوتی تھی۔ اسے لگتا کہ ان ہی کی وجہ سے عباس منزل میں وقت ٹھہر گیا ہے۔

میاں عباس ایڈووکیٹ کا کمرہ گول کمرے سے ملحق تھا۔ ان کا کمرہ بے حد سادہ تھا۔ آمنے سامنے دو دیواروں میں لکڑی کی الماریاں تھیں جن میں قانون کی بھاری بھرکم لیدر باؤنڈ کتابیں ٹھسا ٹھس بھری تھیں۔ جہاں بھی جگہ ملتی میاں عباس کچھ نئی کتابیں لاکر زبردستی پھنسا دیتے۔ تیسری دیوار میں آنے جانے والا بڑا دروازہ تھا جس میں رنگدار شیشے لگے تھے۔ اسی دیوار میں ان گنت کھونٹیاں تھیں جن پر کالے کوٹ، شیروانیاں، پاجامے، شلواریں مردار جانوروں کی طرح لٹکتے رہتے۔ عین دروازے کے سامنے والی دیوار کے ساتھ بڑا پلنگ، رائٹنگ ٹیبل اور الارم والی وال کلاک تھی۔ لکھنے والی میز بھاری اخروٹ کی لکڑی سے بنی تھی۔ اس میں ان گنت دراز تھے جن میں کاغذ بھرے تو گئے تھے لیکن نکالنے کی فرصت نہ ملی تھی۔ پلنگ کی چادریں جس روز تبدیل کی جائیں صرف اسی دن کوئی ملازم کمرے میں گھس کر تھوڑی دیر جھاڑ پونچھ کر دیتا ورنہ میاں عباس کمرے میں کسی کو گھسنے نہ دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ کوئی ان کے کاغذ تلف کر دے گا۔

بیس بائیس برس پہلے انہوں نے عباس منزل میں دیواروں کے ساتھ گھڑیاں لگوائی تھیں۔ باقی گھڑیوں کو تو چابی دینا نوکروں کے فرائض میں سے تھا لیکن اپنے کمرے کی گھڑی وہ کرسی پر چڑھ کر خود چلاتے۔ اسے اپنے جیبی رومال سے صاف کرتے۔ پھر زنجیر والی گھڑی سے اس کا وقت ملاتے۔ یہ گھڑی جو انہوں نے بمبئی میں فارسٹر اینڈ فارسٹر مرچنٹ سے منگوائی تھی' ابھی تک ان کی خوشی اور دلبستگی کا باعث تھی۔ شکار کی کہانیوں کے ساتھ ساتھ وہ اس گھڑی کی داستان بھی بڑی تفصیل اور شوق سے سنایا کرتے..... ''میں نے اخبار'' ملاپ'' میں فارسٹر صاحب کا اشتہار پڑھا تھا۔ بمبئی خط لکھا۔ بڑے دنوں جواب نہ آیا تو ایک اور بھی خط رقم کیا۔ اس روز مسٹر فارسٹر..... خود..... مسٹر فارسٹر آ گئے۔ فٹن ان کی پھاٹک سے باہر کھڑی رہی۔ میں نے خود انہیں گول کمرے میں بٹھایا..... واہ کیا صاحب تھے..... کیا رنگت تھی' کیا قد تھا۔ جب تک میں نہیں بیٹھا فارسٹر بیٹھا رہا۔ سکاٹش تھا فارسٹر..... اس کا دادا بیگ پائپ بجاتا تھا۔ مجھے بتانے لگا کہ کسی کام کے سلسلے میں آیا ہے۔ کچھ گھڑیاں ساتھ ہیں۔ اگر میں خریدنا چاہوں تو دیکھ سکتا ہوں..... میں نے سارے بڑے کمروں میں گھڑیاں لگوائیں..... صاحب کی بات ہی اور ہے۔ ایک ایک گھڑی کو اپنے سامنے لگوایا۔ چابی دے کر دکھائی..... کبھی کبھی جمیلہ کہنا چاہتی ''ابا جی یہ آپ سفید لوگوں سے اتنی جلدی مرعوب کیوں ہو جاتے تھے کہ اکٹھی بارہ گھڑیاں خرید لیں..... اپنے دکاندار سے تو آپ آدھ سیر آلو کی قیمت پر جھگڑتے ہیں۔ صاحب نے جو منہ مانگی قیمت مانگی آپ نے دے دی۔

ابا جی اس سفید قوم میں کیا تھا کہ آپ خود اس کے ہاتھوں بکنے پر تیار تھے.....''

لیکن جمیلہ اور شاہد کبھی میاں عباس کے آگے بات نہ کر پائے۔ ان کے کمرے ہالی وڈ کی فلموں کی طرح آراستہ تھے..... کریئون جالیوں کے پردے' خوبصورت گلدان اور بیڈ لیمپ ماڈرن فرنیچر اور ریڈیو ان کمروں میں وہ سب کچھ تھا جہاں تک ابھی ماحولیات نے ترقی کی تھی۔

ماحولیات کی ترقی سائنس کی سب سے بڑی دین ہے..... وہ بیماری' زیبائش اور انسانی جسم کے آرام کے لیے سب کچھ سوچتی اور کرتی ہے..... لیکن روح کن پھندوں میں جکڑی ہے۔ اس کا اسے احساس نہیں ہوتا اور اگر احساس ہوتا بھی ہے تو وہ کچھ کر نہیں سکتی کیونکہ روح غیر مرئی اور ہاتھ میں نہ آ سکنے والی شے ہے۔ شاید اس کی ترقی کے اصول لیبارٹری

میں طے نہیں ہو سکتے یا اگر طے ہو بھی سکتے ہیں تو اس کی لیبارٹری اور قسم کی ہے۔

ہر نسل کا پہلا ٹکراؤ پچھلی نسل کے ساتھ ماحولیات کی تبدیلی پر ہی ہوا کرتا ہے۔ نئی اشیاء جدید رہن سہن اور اس کی مطابقت میں آنے والی سوچ سے نوجوان جلد سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔ پرانی نسل پچھلے عہد کے نوسٹلجیا میں مبتلا اپنی آزمودہ اشیاء وفا اتنی جلدی بدل نہیں پاتے۔ اسی لیے قدم قدم پر روایات پر اٹل بھروسہ اور ترقی کا بے جا جنون آپس میں ٹکرا جاتے ہیں۔

کلچر مذہب اور ترقی ایک ازلی تثلیث ہے..... ترقی کی راہ میں کلچر ہمیشہ تلوار لیے کھڑا ہوتا ہے۔ کلچر چونکہ صدیوں پرانا درخت ہے' وہ ترقی کی قینچی سے اپنی شاخیں کٹوانا نہیں چاہتا۔ ترقی اس بات پر مصر رہتی ہے کہ پرانی شاخیں کاٹ کر درخت کی سرجری کی جائے۔ غیر مطلوب رسم و رواج جو حالیہ ماحول سے مطابقت نہیں رکھتے' چھوڑ دیے جائیں لیکن پرانی نسل ہر وہ چیز سینت کر رکھنا چاہتی ہے جو گلے وقتوں میں اندو وہار ہی۔

مذہب کا تعلق ترقی سے دور از کار رہتا ہے۔ مذہب کا بنیادی تعلق چونکہ روح سے ہے اور یہ قالوا بلا سے لے کر روزِ قیامت تک تغیر پذیر نہیں اس لیے مذہب ترقی کی راہ میں کلچر کی طرح دیوار بن کر کھڑا نہیں ہوتا۔ ماحول چاہے پتھر وحات کے زمانے کا ہو یا ماڈرن انٹرنیٹ کا..... حق و باطل کی جنگ وہی رہتی ہے۔ بیماری کو انسان آرگینک ادویہ سے دور کریں یا جڑی بوٹی سے یہ جسم کا معاملہ ہے۔ مذہب اس وقت تک علاج معالجے کا نوٹس نہیں لیتا جب تک علاج میں حقوق کی پامالی نہ ہو۔ جب روح کسی طور پر گلو گیر ہونا شروع ہو جائے اور مذہب کی حدود پامال ہونے لگیں تو پھر مذہب کسی طور circumvent کر کے غلط کام سے منع کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر جعلی ادویات بننے لگیں اور انسانی جسم کو شفا کے بدلے موت کا سامنا ہو تو پھر معاملہ مذہب کی حدود میں شامل ہو جاتا ہے..... کلچر کو اس بات سے غرض نہیں کہ شفا یابی جائز ہے یا نہیں..... اگر جادو کسی خطے کا شعار ہے تو پھر ایلو پیتھک ادویات کے استعمال سے کلچر فوراً Threatened ہو جائے گا.....

عباس منزل میں بھی نئی اور پرانی پود میں کھنچاؤ ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو چکی تھی اور اس کی سب سے بڑی وجہ فورڈ ماڈل کی گاڑی تھی جو عباس صاحب کو صبح کچہری لے جاتی اور شام کو گاں گاں کرتی واپس لاتی۔ شاہد اور جمیلہ اس کار میں چڑھتے ہوئے گھبراتے تھے کیونکہ جس جگہ سے یہ نکلتی انگلیاں اٹھنے لگتیں۔ اب شہر میں ماڈرن سٹریم لائن بہت ہی خوبصورت کاریں آ گئی تھیں اور ان دونوں کو اس کھٹیچر کار میں بیٹھتے شرم آتی تھی لیکن میاں عباس کا خیال تھا کہ پرانا سونا کے مصداق ابھی فورڈ سواری کے قابل تھی۔

پہلی بار جب شاہد لاہور سے لوٹا اور بقول میاں عباس اسے لاہوری ہوا لگی تو دبی زبان میں پہلا جھگڑا ہوا۔ شاہد نے ٹینس ریکٹ ہوا میں لہراتے ہوئے کہا تھا۔ "ابا جی! اس گاڑی سے تو بہتر ہے کہ انسان ٹب کو پہیے لگوا' سامنے ایک گدھا باندھ کر سواری کیا کرے۔ اگر محض سواری مقصود ہے تو وہ تو ویسے بھی ہو سکتی ہے....."

میاں عباس الف ہو گئے..... انہیں معلوم نہ تھا کہ فرسٹ ایئر کا شاہد اب ان کے نمبر والا بوٹ پہننے لگا ہے۔ انہوں نے اپنی مونچھوں کو دو انگلیوں سے اٹھاتے ہوئے کہا..... "خیر! میرا مقصد تو صرف سواری ہے اور مجھے یہ سواری میسر ہے۔ تم اپنے ٹب کا انتظام کر سکتے ہو۔"

شاہد اور جمیلہ دونوں سمجھ گئے تھے کہ عباس منزل میں تبدیلی سیدھے سبھاؤ نہیں آ سکتی۔ تبدیلی کے لیے چوری چھپے کے ہتھکنڈے استعمال کرنے پڑیں گے۔ اب شاہد اکنامکس کے آخری سال میں تھا اور اس نے آواز بلند کرنا چھوڑ دی تھی..... لیکن اندر روایت سے بغاوت کا سلسلہ جاری تھا۔ تبدیلی کی خواہش شدید تھی لیکن اس پر منکشف ہو چکا تھا کہ جس طرح ڈرائنگ روم میں پرانے حنوط شدہ شیر رہیں گے' گیراج کا پھاٹک بغیر پالش کے نظر آئے گا۔ اوپر والی منزل کی کھڑکیاں ٹوٹی رہیں گی۔ جس طرح اس کی کلاس کی انوراد عینک کا فریم نہیں بدل سکتی کیونکہ مقصد صرف دیکھنا ہے اور وہ گول سنہری بھدی فریم سے بھی حل ہو سکتا تھا' اسی طرح عباس منزل میں صرف فورڈ سن ہی رہے گی تاوقتیکہ وہ خود ہی سواری کے قابل نہ رہے..... پرانے کلچر میں زیبائش کی گنجائش کم تھی..... برتھ ڈے منانا' خوبصورت کاغذ میں تحفے پیک کر کے پہنچانا' خواہشات کا اظہار کارڈوں کے ذریعے کرنا' پھولوں کے گلدستے پیش کرنا اور بجا سجانا سب پرانے کلچر میں غیر مناسب تجاوزات تھے۔ یہ نہیں کہ قدیم کلچر میں سجاوٹ کی گنجائش نہ تھی یا زیبائش ممکن ہی نہ تھی لیکن اسکا رنگ مقامی ہونا چاہیے تھا۔ سائنس کی اختراعات سے پرانے اصول صد سالہ سکہ بند قدیم کلچر کے تھے..... مذہب کا وہی صدیوں پرانا ایک ہی وطیرہ تھا کہ جس سجاوٹ سے کسی اور کا کوٹھا لرز رہا ہو' دل سرنگوں ہو جائے اس سے پرہیز کرو۔ اب جوتا چاہے ولایت سے آئے چاہے دیسی ہو اگر اس کی نکاکاہٹ سے فساد کا اندیشہ ہو' تکبر دل میں سمائے تو حذر کرو.....

عباس منزل میں بھی کچھ مذہب کی پابندی سے نئی نسل سے بگاڑ نہ تھا۔ میاں عباس بھی پرانے محاورے' اکھان' فوک Wisdom کے سہارے جی رہے تھے۔ وہ تو عیدین کی نماز پڑھنے بھی مسجد میں نہ جاتے تھے۔ سعیدہ عباس بھی رسم ورواج کی حد تک مذہب کی پابند تھیں۔ لوک لاج ان کا سب سے بڑا حجاب تھا۔ اسی لیے جو تبدیلی بھی عباس منزل میں آتی' بہت لڑ جھگڑ کر در آتی۔ میاں عباس پکے کانگرسی تھے۔ ان کے نزدیک برصغیر کے تمام مسائل کا حل کانگریس کی مٹھی میں تھا۔ ایک مدت انہوں نے کھدر کا کرتا' پاجامہ اور سر پر نہرو کیپ پہنی تھی۔ لیکن کچھ سالوں سے انہوں نے کھدر کا لباس ترک کر دیا تھا۔ اس کی وجہ سعیدہ عباس کو یہی معلوم تھی کہ عباس صاحب کے جسم پر گرمی دانوں سے مشابہ چتی دار پھنسیاں جا بجا نکل آئی تھیں اور ان کو کھدر کی رگڑ سے تکلیف پہنچتی تھی۔

شاہد اور جمیلہ نے اندرونی بغاوت کو سرد جنگ میں اس لیے بھی بدل لیا کہ وہ ابھی خود کفیل نہ تھے۔ شاہد ایم اے معاشیات کے آخری سال میں تھا۔ جمیلہ بی اے میں پڑھ رہی تھی۔ انہوں نے اپنی اپنی بغاوت کو بند بوتل کے جن کی طرح کہیں موجزن سمندر میں چھپا رکھا تھا۔

سیر کے بعد جب شاہد عباس منزل پہنچا تو کافی سورج نکل آیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح صبح گرم تھی۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہمیشہ اسی طرح ہوتی آئی تھیں..... بارشوں کے آنے تک تپتے ہوئے دن..... کمروں میں خنکی سی سیلی خس کی خوشبو..... پنکھوں کا مسلسل چلنا' نیلے پردے والی چقوں کا گرے رہنا' پردوں کا بند ہونا..... مشروبات' گھریلو ہاتھ والی مشین میں آدھی جمی آئس کریم' دالانوں میں قطار در قطار چارپائیاں' کھیس اور سفید چادریں..... کریلے گوشت' بھنڈی گوشت کا ہر روز سامنا' ماؤں کی نصیحتیں' باپوں کے دبکے..... سیاسی گفتگو کی پھوار..... خوف وملال کی فضا..... گرمیوں کی دوپہروں میں تگی دھوپ کی طرح سب کچھ ٹھہرا ہوا..... سوکھی گھاس پر پانی کی تلاش میں پھرتی چھوٹی چھوٹی چڑیاں' کبھی کبھی املتاس کے

درختوں سے آنے والی کوئل کی آواز..... کو..... کو.....

شاہد نے فٹ ربر پر اپنے کینوس کے فلیٹ صاف کیے اور اندر چلا گیا۔ اندر گیلری میں خنکی اور اندھیرا تھا اور کہیں سے آملیٹ کی خوشبو آ رہی تھی۔ اسے گیلری کی ٹھنڈک اور آملیٹ کی خوشبو اچھی لگی۔ اس کا ارادہ تھا کہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر وہ تصویریں دیکھے جو اس نے ابراہیم لاج میں کھینچی تھیں۔ خاص کر وہ تصویر جس میں راحیلہ درمیان میں بازوؤں والی کرسی میں بیٹھی تھی اور اس کے بازو پر جمیلہ یوں بیٹھی تھی جیسے ابھی گرنے والی ہو۔ آج صبح سیر کے وقت اسے پھر وہی پاگل شخص نظر آیا تھا جو سول لائنز کے پہلے چوک پر خالی سڑک پر سپاہیوں کی طرح سڑک کا ٹریفک کنٹرول کر رہا تھا۔ سڑک خالی سنسان تھی' اکا دکا تانگہ' کار کبھی کبھی گزر جاتے لیکن وہ مسلسل ہاتھ کے اشارے بڑی مستعدی سے دیے جاتا تھا۔

شاہد گیلری میں بچھے ہوئے تخت پوش پر بیٹھ کر اپنے جوتے جرابیں اتارنے لگا..... صبح سے وہ سوچ رہا تھا کہ یہ پاگل شخص یقیناً کسی راحیلہ کی وجہ سے ان حالوں کو پہنچا ہوگا..... عورت بھی کیا Safe زندگی گزارتی ہے' شاہد نے سوچا..... عشق کرے تو ہزار پردوں میں چھپ کر..... اظہار نہ کرے تو بھی خوش' کرے تو بھی راضی..... شادی ہو جائے تو بچوں میں مگن..... شادی نہ ہو پائے تو لوک لاج کے سہارے زندہ..... اسے کبھی عشق ڈس نہیں جاتا..... اس پاگل کی طرح جو سارے جہاں کا ٹریفک کنٹرول کر رہا تھا اور خود اپنی گاڑی کا وہیل اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا.....

اگر راحیلہ مجھے نہ ملی تو..... راحیلہ ساتھ کوٹھی میں رہتی ہے۔ اسی لیے آنا جانا اتنا سہل تھا۔

لیکن اگر اس قربت کے باوجود راحیلہ کسی اور کی ہو گئی تو.....

اس نے ننگے پاؤں ٹھنڈے فرش پر رکھ دیے۔ کچھ خنکی اس کے دماغ کی طرف چڑھ گئی۔

"شاہد..... شاہد بیٹا..... ذرا اندر آؤ....."

فلیٹ بوٹ اور جرابیں فرش پر چھوڑ کر اسے اماں کے کمرے میں جاتے ہی بن پڑی۔

سعیدہ عباس بڑے نواڑی پلنگ پر دھوبی کی جوگاں جیسی پڑی تھی.....

شاہد نے اس ڈھیر ساری عورت کی طرف دیکھا اور سوچا..... بھلا اپنی مائیں موٹی' کالی' بھدی بدہیئت کیوں نہیں لگتیں؟

"آؤ بیٹا..... السلام علیکم۔"

"جی السلام علیکم..... فرمائیں!" شاہد بولا۔

"بیٹھو بیٹھو فرماتی بھی ہوں..... آؤ....."

شاہد نے اپنے ننگے پاؤں ٹھنڈے فرش پر دھر کر پلنگ کی پائنتی پر یوں نشست جمائی گویا بھاگ جانا چاہتا ہو۔ سعیدہ عباس بڑے نواڑی پلنگ پر پھسکڑا مار کر بیٹھی تھیں۔ دن خاصا چڑھ آیا تھا لیکن یوں لگتا تھا' وہ ابھی ابھی خواب خرگوش سے بیدار ہوئی ہیں۔ ان کی بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ گھنگریالے بال جن میں سفیدی بڑھ چکی تھی' بے ترتیب تھے۔

شاہد بڑے تکلف سے بیٹھا تھا۔

سعیدہ نے جی میں سوچا کہ اولاد بھی کیا چیز ہے..... ایک وقت تھا یہی شاہد ان کی گود کے لیے ہمکتا روتا تھا۔ ذرا

ان کا دھیان کسی اور طرف کو ہو جاتا تو وہ رونے لگتا۔ نہاتے وقت چوری غسلخانے کا رخ کرتیں۔ پھر بھی اگر شاہد کو علم ہو جاتا تو وہ غسلخانے کا دروازہ پیٹنے لگتا۔

کسی سے بات کرتا تو در کنار چہرہ بھی شاہد ہی کی طرف کرنا پڑتا۔ شاہد جاگتا ہو تو کروٹ لے کر اس کی جانب پیٹھ نہیں کی جا سکتی تھی۔ اور اب..... شاہد اور ان کے درمیان ایسا حجاب تھا کہ وہ سیدھے سبھاؤ اس سے بات بھی نہ کر سکتی تھیں۔

شاہد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سعیدہ عباس نے اپنی خفت پر بڑی مشکل سے قابو پایا' آواز گرا کر بولی..... "بیٹے یہ عالی بہت آنے لگی ہے آج کل..... یعنی وہ....."

"مجھے کیا پتہ امی جمیلہ وجہ جانتی ہوگی۔ سارا سارا دن یہاں بیٹھ کر "کون وودا وند" پڑھتی رہتی ہیں۔" شاہد نے کندھے جھٹک کر کہا۔

"اس سے بھی پوچھوں گی..... پر پتہ نہیں جب سے تم لوگ لاہور سے لوٹے ہو' میں تو کچھ پوچھتے ہی ڈرتی ہوں۔ سوال کچھ ہوتا ہے' جواب کچھ ملتا ہے....." وہ سارا بوجھ گاؤ تکیے پر ڈال کر بولیں۔

"آپ کی باتیں بھی عجیب و غریب ہوتی ہیں....." شاہد اٹھتے ہوئے بولا۔

"بیٹھ بیٹھ۔ تو کوئی مہمان تھوڑا ہے کہ یوں دم بھر میں اٹھا چلا جاتا ہے..... واہ بیٹے واہ....."

"میں سمجھا بات ختم ہو گئی..... اس لیے....."

بیگم عباس نے پہلے بانہیں اٹھائیں پھر لمبی جمائی لی۔ قمیض کی آستین کہنیوں تک جمع ہو گئی تھی۔ پتلی جلد تلے نیلی رگوں کا جال پھیلا تھا۔ بہت ٹھہر ٹھہر کر بولیں..... "میں جانتی ہوں تم ہمارا تار پا کر ناراض ہوئے..... ملکی حالات ٹھیک نہیں..... ڈاکٹر صاحب کا گھرانہ چاہے منہ سے کچھ نہ کہے' وہ لڑکی کا بھار اتارنا چاہتے ہیں..... تم کو اپنے امتحانوں کی پڑی ہے..... میں تمہیں واپس جانے کی اجازت نہیں دے سکتی ہاں..... ویسے بھی بیٹا! راحیلہ ہر صورت عابدہ سے اچھی ہے۔ لو اب تم جا سکتے ہو..... یہ موا درد پھر ابھر آیا..... اللہ۔"

شاہد سوچتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا.....

اماں بھی کمال کرتی ہیں۔ ذرا سے شک پر تھوڑے سے گمان کا خمیر لگا کر حقیقت کو کیا سے کیا بنا دیتی ہیں۔ راحیلہ اور عابدہ کا کیا مقابلہ..... لیکن اگر عالی خود ہر وقت میرا پیچھا کرے تو میں بھی کیا کر سکتا ہوں؟ یہ کامریڈ جمیلہ اگر عالی کا ساتھ نہ دیا کرے تو مصیبت آدھی ہو جائے لیکن یہ جوڑا تو گویا توام تھا' ہر لحظہ ساتھ' ہر گھڑی اکٹھی.....

بھلا گلاب اور گیندے کا آپس میں کیا مقابلہ..... اب تک تو کسی نے یہ مقابلہ کیا نہیں' آئندہ کی خدا بہتر جانتا ہے!

کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے اماں کے ڈریسنگ ٹیبل سے برش اٹھایا۔ بال بنائے۔ پھر ڈریسنگ ٹیبل پر دھری چھوٹی قینچی اٹھائی اور جیب میں دھری۔ اسے ایسی ہی تیز تیکھی قینچی کی عرصے سے تلاش تھی۔ عموماً اپنی کند مقراض سے مونچھیں سنوارنے میں اسے بڑی دقت پیش آتی..... وہ ماں کی ہر چیز بڑی دھونس سے لے سکتا تھا۔ یہ وہ عادت تھی جو اسے

ابھی بچپن سے جدا نہ کرسکی تھی..... اماں اور اس کے درمیان ابھی لین دین میں دوئی پیدا نہ ہوئی تھی.....

ننگے پاؤں گیلری سے ہو کر وہ پچھلے برآمدے میں پہنچا اور پھر دائیں مڑ کر اپنے کمرے کے ٹھنڈے اندھیرے میں پہنچ گیا۔

نیلے کریٹون کے پردے ایک طرف کیے تو پیتل کے چھلے جن سے پردے ٹنگے تھے ایک چھناکے کے ساتھ جلترنگ کی طرح کھنکے اور پھر کمرے میں مکمل سکوت ہو گیا۔ دائیں جانب کی کھڑکی سے سورج کی شعاعیں اندر داخل ہو گئیں اور اس روشنی میں میز پر دھرے ہز ماسٹرز وائس ریڈیو کے سوئچ چمک اٹھے۔ اس نے صبح کی اس تیز روشنی کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا اور کھڑکی کے پردے پھر برابر کر دیے۔

کمرے میں ایک بار پھر ٹھنڈا اندھیرا سا ہو گیا۔

اسے اپنی ماں پر عجب قسم کا غصہ آ رہا تھا۔ ایک ذرا وہ عابدہ کے ساتھ ٹینس کیا کھیلنے لگا تھا سب کے دماغ اور ہی کچھ سوچنے لگے تھے۔ کچھ دیر اندر ہی اندر بلبلانے کے بعد اس نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ اکنامکس کی کتاب نکالی اور Sterling Balance کی گتھیاں سلجھانے لگا۔ لیکن جلد ہی اس کا ذہن ان اوراق کو چھوڑ کر اس پیلی کوٹھی کی طرف بھاگ گیا جس کے لان پر ابھی کل رات وہ دیر تک ٹہلتا رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر راحیلہ باہر کیوں نہیں آئی۔ ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے وہ چنچل بھلی تھی۔ اب جمیلہ سے ملنے کے بہانے بھی وہ گھر نہ آتی تھی۔ ہاں وہ جب ابراہیم لاج جاتا' عابدہ اور جمیلہ کی جوڑی ساتھ ہو لیتی۔ جمیلہ ایک بیکار بہن تھی' وہ خود اپنی ذات میں اس قدر مگن تھی کہ اس پر کبھی پوری طرح اس بات کا انکشاف ہی نہ ہو سکا کہ شاہد اور راحیلہ کی شادی بہت قریب ہے اور اسے اس شادی میں کچھ عملی شمولیت بھی کرنی چاہیے۔ وہ اپنی کتابوں میں مگن رہتی۔ کالج کی سہیلیوں کو مسلسل خط لکھنا' گلدستے سجانا' اپنے کمرے کی صفائی' عابدہ کی دوستی کے بعد وقت بہت ہی کم بچتا تھا۔

شاہد تھوڑا سا خوفزدہ ہو گیا..... اگر عابدہ کے متعلق اماں سوچ سکتی ہے تو کیا راحیلہ پر کچھ اثر نہ ہوا ہوگا..... کہیں لاہور میں کوئی اور نہ ہو..... ہم جماعت کا بھائی بند؟ راحیلہ بدل گئی تھی..... پہلے تو وہ بہانے ڈھونڈ کر اسے ملا کرتی تھی۔ جمیلہ بہن گو اسے منہ نہ لگاتی تھی پھر بھی وہ عباس منزل آ جاتی اور جمیلہ کے کمرے میں چپ چاپ بیٹھی رہتی۔

اگر یہ خفگی..... بددلی بڑھ گئی تو؟

خدانخواستہ..... خدانخواستہ۔

اس کے جی میں آئی کہ فورڈ کار لے کر فوراً ابراہیم لاج پہنچے اور فوراً راحیلہ سے ملے لیکن اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہے بھئی؟....." شاہد نے ان گنت سلوٹیں ماتھے پر ڈال کر کہا۔

"حضور عابدہ بی بی باہر بلا رہی ہیں....." بیرے نے بظاہر دلچسپی نہ لیتے ہوئے اطلاع دی۔

"کیا کام ہے؟....."

"جی مجھ سے تو کچھ نہیں کہا....." اس نے انکھیوں سے صاحب کو دیکھ کر کہا۔

''اچھا جا کر کہو صاحب مصروف ہیں.....ذرا رکو۔دیکھو انہیں کہو ہم آ رہے ہیں ہاں.....''

''جی.....''

لیکن جب بیرا جانے لگا تو شاہد بولا..... ''غلام علی۔''

''جی حضور.....''

''نہیں بھئی یوں نہ کہنا.....تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ صاحب سو رہے ہیں؟''

''جی کہہ دوں گا.....''

''نہیں بھئی یوں نہ کہنا.....کہ صاحب نے کہا ہے.....''

''سرکار.....اب میں اتنا بھی بے وقوف نہیں.....''

غلام علی گیلری سے مسکراتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اسے بھی سوچنے اور بات کرنے کے لیے ایک مزیدار خبر مل گئی تھی۔ صاحب بھی کیسا گدھا آدمی! ایک شکار خود قدموں میں گرتا ہے اور یہ منہ پھیرے مولوی بن رہا ہے۔ ایسی پارسائی کا انجام بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ اسے اس واقعے سے اخبار کا سا لطف آ رہا تھا۔ ابھی کچن میں جا کر اس نئی بات پر کیسی گوہر افشانی کرے گا۔

خانساماں یکدم چاقو' چھری رکھ کر کہے..... ''ارے سچ.....نہیں؟.....''

اور غلام علی مرچ مسالے لگا کر بتائے گا..... ''وہ خود آئی تھی.....خود.....تم دیکھ لینا۔ عبدالرحمٰن ان ہی آنکھوں سے.....تائی کے بال سامنے آئیں گے۔ وہ راحیلہ بی بی سے منگنی ٹوٹ جائے گی اور خان صاحب کی بیٹی کے ساتھ.....نیا ڈرامہ ہوگا.....ترپاہٹ سے کب تک بچے گا صاحب؟ کب تک.....''

شاہد نے سست رو بہنے والے وقت میں ایک بار پھر راحیلہ کے متعلق سوچنا چاہا لیکن اب اسے تھوڑے سے احساس جرم نے گھیر لیا تھا۔ آخر عابدہ سے مل لینے میں کیا حرج تھا۔ وہ خدا جانے کس جذبے کے تحت آئی تھی۔ بڑی صاف ستھری ماڈرن لڑکی تھی۔ جانے کا کیا مسئلہ تھا۔ میں نے خواہ مخواہ اپنے ہی الجھاؤ میں آ کر دھتکار دیا۔ ازلی مرد نے سر اٹھا کر شاہد کو للکارا.....اب جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اس نے پھر احتیاط کی راہ پر چل کر سوچنا شروع کر دیا کہ ایسی ہی سرسری بے معنی ملاقاتوں کا تو اثر ہے کہ راحیلہ اب اس سے کترانے لگی ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تو راحیلہ ایسی نہ تھی۔ جب وہ ''دیوان غالب'' لے کر ساتھ والی کوٹھی پہنچا تھا تو اس کے ہاتھ میں پکڑی کتاب اور راحیلہ کی انگلیوں میں عجیب سا کرنٹ چل نکلا تھا۔

شاہد نے غالب کا دیوان راحیلہ کو پکڑاتے ہوئے یہ شعر دکھایا تھا.....

''میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نشیدن کہ کیا کہوں؟''

راحیلہ نے چند لمحے شعر پر نگاہ ڈال کر ہولے سے کہا تھا..... ''پرسش ہے اور پائے سخن درمیان نہیں.....'' پھر اپنی اس جسارت پر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور وہ کتاب کا تحفہ وصول کیے بغیر ہی اندر بھاگ گئی تھی۔

وہ اپنے جذبات کو الٹ پلٹ کر نتھارنے لگا۔ اپنی محبت کا پوسٹ مارٹم کرنے میں اسے بڑا لطف آنے لگا.....کیا

میں اس لڑکی سے محبت کرتا ہوں؟

''ہاں......نہیں۔''

راحیلہ؟ جس کی رنگت پرانے ہاتھی دانت کی طرح زرد ہے جس کی آنکھوں کے کھلے کٹورے دیکھ کر میرے ہونٹوں میں جلن سی ہونے لگتی ہے۔ یہ لڑکی جو چلتے وقت بالکل جھولتی نظر آتی ہے اور آگے بڑھ کر اسے سنبھالنے کو جی چاہتا ہے۔ کیا میں واقعی راحیلہ سے محبت کرنے لگا ہوں۔ بالفرض یہ لڑکی مر جائے تو کیا میں چوراہے میں کھڑا ہو کر سینہ کوبی کرتے ہوئے گھوموں گا؟ یکدم اس کا دل لرزنے لگا۔ خواہ مخواہ اپنا کھاتی ہے اپنا پہنتی ہے۔ مجھے اس کی موت کا تصور بھی کرنا نہ چاہیے تھا۔

لمحہ بھر کو اسے وہ شام یاد آ گئی جب شام کے جھٹپٹے میں سارے گھر والے لان سے ذرا دور کھڑے ملکی حالات پر تبصرہ کر رہے تھے تو اس نے راحیلہ سے کہا ''یہ جو چاندی کا چھلا ہے تمہاری انگلی میں......مجھے چاہیے۔''

'''آپ اسے کیا کریں گے۔ آپ کی کسی انگلی میں نہیں آئے گا......''

''بس مجھے چاہیے......''

''اب؟......'' راحیلہ نے کٹورے سی آنکھیں ڈھانپتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ہاں......اب اور کب؟......''

''سب دیکھ رہے ہیں۔ میں کل لے آؤں گی آپ کے گھر۔''

''ابھی اور اسی وقت......''

راحیلہ اسی وقت اندر چلی گئی تھی۔ شاید چھلا اتارنے......شاید اس کی ضد سے بچنے کے لیے اسی وقت میاں صاحب اماں اور جمیلہ کار میں سوار ہو گئے اور اسے چھلا نہ مل سکا......پتہ نہیں راحیلہ کا ارادہ دینے کا بھی تھا کہ نہیں......اب اس واقعے کے متعلق سوچتے ہوئے اسے اپنی مہمل حرکت پر غصہ آنے لگا......مجھے تو بس ایک چیز کی ضد ہو جاتی ہے۔ پھر وہ بات میرے ذہن پر سایہ کیے رہتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ چیز حاصل نہ ہو جائے یا پھر اس کی تمنا نہ رہے......جوں جوں چھلا ملنے میں دن پڑ رہے تھے وہ عابدہ کے ساتھ اور بھی بے تابی کے ساتھ ٹینس کھیلنے لگا تھا۔ کبھی سوچتا راحیلہ سے پوچھے کہ آخر تم نے وہ چاندی کا چھلا کیوں نہ دیا؟

پھر اپنا پچھن افشا کرتی......تو چھلے کے لیے مرے جاتے ہو۔ یہاں ایسے بھی ہیں جو تم پر اپنی جان نچھاور کر دیں۔

راحیلہ کو تم سے محبت نہیں ہے تبھی تو ناں۔

منگنی اور چیز ہے......محبت جنس کچھ اور ہے۔

لیکن میں نے چھلا مانگا ہی کیوں؟ اجتماعی بچپنا......گدھا پن......ایک سمجھدار آدمی نوبیں جماعت کے نوبالغ کی طرح مرتا ہے کیا؟ کچھ تو فرق ہونا چاہیے دونوں کی سوچ میں۔

وہ پلنگ پر نیم دراز ہو گیا......یکدم اسے عابدہ پر ترس آنے لگا......ایک وہ راحیلہ ہے مغرور، چپ چپ اس قدر شانت کہ جھنجھوڑنے کو جی چاہتا ہے......اور ایک وہ عابدہ ہے کہ لاکھا چھے کورٹ میں رہنا چاہے ٹینس کے بال کی طرح فوراً میرے کورٹ میں لوٹا کھا جاتی ہے۔ سب کچھ غلط ہو رہا تھا۔ سڑکوں پر......گھروں میں......وہ چند مسرف دات نے

زندگی ان سیف کر دی تھی۔ گھروں کے اندر لڑکیوں نے ناطقہ بند کر دیا تھا۔ کیا رعونت بھی راحیلہ کے رونے میں..... کہیں چوری چھپے ملنے کی راہ ہی نہ نکالتی تھی..... کالج جانے سے پہلے وہ ٹھیک ٹھاک تھی..... ساری رعونت خودسری خودرائی کالج ہی کا تحفہ تھی۔ لڑکیوں کو پڑھانا ہی نہیں چاہیے۔ دادا ابا ٹھیک کہتے تھے..... پھر یہ لڑکیاں کم رہتی ہیں، سہیلی زیادہ بن جاتی ہیں۔ اپنی جمیلہ ہی کو لو..... منطق ہی منطق..... الٹ پٹ کر دیکھ لو۔ نہایت جامع کتاب ہے اور وہ نسوانیت؟..... وہ سرے سے مفقود۔

اور عابی؟..... عابدہ بی بی

عابدہ کے متعلق سوچنا اسے تضیع اوقات لگا..... ایسی لڑکیاں لگتی کچھ ہیں، نکلتی کچھ اور ہیں۔ اس نے جھٹک کر اپنے آپ کو مناتے ہوئے ایک بار پھر اکنامکس کی کتاب اٹھائی۔ اس نے اپنی توجہ مجتمع کرنے کے لیے با آواز بلند پڑھنا شروع کر دیا۔

ابھی آدھا صفحہ بھی نہ پڑھا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"شاہد..... شاہد بیٹا....."

میاں عباس کی آواز تھی۔

"آیا..... آیا ابی جی....." ابھی باپ کی آواز پر گھبرا کر اٹھ بیٹھنا معمول تھا۔

"وہ ذرا "ڈان" اخبار میرے کمرے میں پہنچا دو....."

اس نے کتابوں سے لدی میز پر دھری اخبار اٹھاتے ہوئے سوچا۔ اخبار منگوانا تو محض بہانہ ہے، دیکھیے آج کی ڈِش میں کیا گل کھلتا ہے؟

ننگے پاؤں وہ میاں عباس کے کمرے میں پہنچا۔ وکیل صاحب کافی سنجیدہ چہرہ بنائے اپنی چارپائی پر اکڑوں بیٹھے تھے۔ ان کا کمرہ ہمیشہ کی طرح بے ترتیب تھا۔ آج خلاف معمول گھڑی بھی بند تھی۔ وکیل صاحب نے اخبار پکڑتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شاہد کرسی پر آگے ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اپنے باپ کی موجودگی میں بے بس سا محسوس کر رہا تھا۔ ان دونوں کے درمیان محبت، یگانگت، بھائی چارے کی فضا کبھی قائم نہ ہو سکی۔ برس ہا برس وہ اجنبی لوگوں کی طرح ساتھ رہے تھے لیکن ایسے واقعات دونوں کو یاد نہ تھے جن سے دل میں محبت کی شمع سلگ اٹھتی ہے..... عباس صاحب اخبار کے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے، پھر اٹک اٹک کر بولے....." کانگریس کبھی بھی جداگانہ انتخاب ماننے پر رضامند نہ تھی۔ نہ ہو سکتی تھی اس نے خوامخواہ مسٹر جناح کو بھلاوے میں رکھا۔ ایک دیانتدار آئین کے پابند کو کیا معلوم ٹیبل کے نیچے معاملات طے کرنے والے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ مسلمان سارے کے سارے سنی مسلمان ہیں یعنی سنی سنائی پر ایمان لے آتے ہیں۔ برخوردار..... ہندو وشال بھارت کا خواب دیکھتا رہا ہے۔ مہاراجہ اشوک کے زمانے کا خواب..... اور مہاراجہ اشوک کا خواب بھی کیا تھا..... وشال بھارت بنا کر خود بدھی دھرم اختیار کر لیا..... جگہ جگہ بودھی فرمان پتھروں پر کندہ کر کے لگا دیئے..... ستوپا بنا دیئے۔ بدھ مت پھیلا دیا۔ برصغیر میں ہندو مت کے وشال بھارت کا خواب بودھی دھرم کی ترقی میں ضم ہو گیا..... تاریخ پڑھا کرو تاریخ..... تاریخ سب سے بڑا علم ہے....."

پھر میاں عباس نے آنکھوں کو عینک کے اوپر سے ترچھی کر کے کہا..... "تم کچھ کمزور ہو گئے ہو..... کیا بات ہے؟..... محنت کر رہے ہو تو پاس بھی ہو جاؤ گے۔ ٹینس کھیلنا..... اچھا ہے..... لیکن زیادہ دھیان پڑھائی پر رکھو..... زیادہ کھیل کود بھی اچھا نہیں....."

پھر وہی عابدہ کی طرف اشارہ۔

اپنے گھٹنوں پر نظر جما کر اس نے عذر خواہی کی..... "ابی میں پڑھتا ہی آ رہا ہوں۔"

وہ بلا وجہ کھانسنے لگا۔

"ملکی حالات اچھے نہیں' میں تو چاہتا ہوں کہ امتحان پاس کر لو تو شادی بیاہ کا جھنجھٹ بھی کر یں..... لیکن سعیدہ بیگم کے نزدیک تمہارے امتحان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے..... پھر ڈاکٹر صاحب کے گھرانے کا بھی خیال ہے کہ..... پتہ نہیں برصغیر کی قسمت میں کیا ہو..... لوگ خوفزدہ ہیں' حکام کی چال نہیں رہی..... انگریزوں کا وہ پہلا سا دبدبہ نہیں رہا..... جانے کیا ہو..... لڑکی والوں کا اصرار جائز ہے بیٹا....."

شاہد نے بغیر سمجھے سر ہلا دیا۔

"وہ بس مجھے یہی کہنا تھا..... ہر وقت ٹینس نہ کھیلتے رہا کرو..... ڈاکٹر صاحب کے گھر بھی جایا کرو کبھی کبھی..... اب تم جا سکتے ہو....."

تیز ہوا میں ہلکے بادل جس طرح اڑتے ہیں ایسے ہی شاہد باپ کے مشورے میں اوپر اٹھنے لگا۔ اس نے پڑھنے کا ارادہ فی الحال ترک کر دیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے ارادہ باندھا کہ ابراہیم لاج جانا چاہیے۔ اگر موقع مل گیا تو ایک بار پھر چاندی کے چھلے کے لیے اصرار بھی کرنا چاہیے..... جانے آگے سے کیا جواب ترسیل ہو؟

اب وہ الماری کھولنے والا تھا' جب دروازے پر دستک ہوئی۔

"آ جایئے....."

عابدہ نے دروازہ کھول کر کان سے کان تک مسکراتے ہوئے کہا..... "ہیلو..... اس گدھے ہیرے کو یہ بھی نہیں معلوم کہ تم سو نہیں رہے بھلا اس وقت کون سو سکتا ہے؟....."

شاہد نے زیرِ لب اس بدشگونی پر لاحول پڑھی۔

"شاہد ہمیں ذرا گھر لے چلو مجھے اور جمی ڈارلنگ کو....."

عابدہ کے پیچھے سے جمیلہ نے بھی سر نکال کر کہا۔

"ہم دونوں بہت سخت بور ہو رہی ہیں۔ ہمیں عابدہ کے گھر پہنچا آئیں پلیز۔"

"تمہیں رکنا پڑے گا' میں ذرا شاور لے لوں....."

"واپسی پر نہا لیں اطمینان سے..... کیوں جمی ڈارلنگ....."

یہ عابدہ پتہ نہیں کیوں جمیلہ کو جمی ڈارلنگ کہہ رہی تھی؟

"مجھے ابراہیم لاج جانا ہے عابدہ....."

عابدہ اور جمیلہ دروازے کی چوکھٹ میں تصویر بنی کھڑی تھیں۔ عابدہ نے صبح سویرے کافی میک اپ کر رکھا تھا اور اس میک اپ میں اس کے جگمگاتے چہرے کو دیکھ کر شاہد کے دل میں الٹے سیدھے خیال آنے لگے۔ ماڈرن لڑکی اس کے لیے ایک بڑا چیلنج تھی۔ بیچاری راحیلہ میں تو ایسے کچھ بھی نہ تھا جو اسے ماؤنٹ ایورسٹ بناتا.....

''میں نے تو سنا تھا کہ راحیلہ تم سے ناراض ہے..... اور ناراضگی اتنی زیادہ ہے کہ کہیں خدانخواستہ..... خدانخواستہ.....''

عابدہ تاش کے پتے خوب کھیلتی تھی اور بلف کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔

''کون کہتا ہے کہ وہ مجھ سے ناراض ہے؟..... ناراض ہونے کی کوئی وجہ..... اسی نے تو مجھے بلایا ہے.....''

جمیلہ بڑی بچی لڑکی تھی۔ اس نے سچ بولتے وقت کبھی سوچا تک نہ تھا..... ''کب بلایا اس نے؟''

''ابھی آدھا گھنٹہ ہوا.....'' دیدہ دلیری سے شاہد نے جواب دیا۔

اچھی بہن ہے جمیلہ کبھی میری سائیڈ پر آج تک نہیں ہوئی۔

اس وقت دروازے پر بیرے غلام علی نے دستک دی۔

''جناب ڈاکٹر صاحب کے گھر سے ملازم آیا ہے۔ راحیلہ بی بی آپ کو بلا رہی ہیں۔''

غلام علی پیام دے کر چلا گیا۔

''یہ بلاوا تو اب آ رہا ہے شاہد، تمہیں پہلے علم نہ تھا۔ تم نے ہم سے سب جھوٹ کہا.....'' عابدہ نے منہ بنا کر کہا..... ''لفٹ کے لیے اتنی کیوں مری جاتی ہو جمیلہ۔ یہ قریب ہی تو گھر ہے۔ ہم چل کر پہنچ جائیں گے.....''

''گرمی ہے.....''

''ہم تانگہ لے لیں گے.....'' عابدہ بولی۔

''میں تمہیں ڈراپ کر کے چلا جاؤں گا جمیلہ..... اب بات کو اتنا بڑھانا بھی ٹھیک نہیں۔ تم دونوں ذرا سا انتظار کر سکو تو.....''

''ہم چل کر کار میں بیٹھتے ہیں۔''

وہ دونوں باہر جا کر پرانے ماڈل کی فورڈ میں جا بیٹھیں۔

نہا دھو کر جب شاہد باہر نکلا تو گاڑی گرمی میں تپ رہی تھی۔

●○●○●○

چوتھا عہد

(الف)

ڈاکٹر سرفراز اور ٹھاکر چندر سین دونوں آہستہ آہستہ کلب کی طرف روانہ تھے۔ کوتوالی بازار میں اکا دکا دکانوں میں بلب جل رہے تھے اور سی ایل مہرہ کی دوکان پر گراموفون کے دھوتو پر کندن لعل سہگل کا گانا بج رہا تھا۔ جب جب وہ گاتا ''دکھ کے اب دن بیتت ناہیں.....'' ڈاکٹر سرفراز کو عجیب قسم کا بوجھل پن محسوس ہوتا۔ نیچے وادی دھندلا رہی تھی اور سرفراز محسوس کر رہا تھا کہ پہاڑوں پر میدانی علاقے کے لوگوں کو مستقل طور پر نہیں رہنا چاہیے۔ اس ماحول میں وہی پنپ سکتا ہے جو بارشوں پہاڑوں اور بھیگے موسموں کا رسیا ہو.....

''آپ کیا سوچ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب.....''

''کل شام میں نے دیوداس دیکھی تھی۔ پتہ نہیں کندن لعل سہگل کی اداکاری میں کیا بات تھی۔ میں تو سر سے پاؤں تک اداس ہو گیا.....''

ٹھاکر جی نے اپنی نہرو کیپ کو سر پر درست کیا..... ''مہاراج یہ نیو تھیٹرز سارے ہندوستان میں اداسی کی تحریک چلا رہا ہے..... سہگل، پنکج ملک، بروا، جمنا..... اور تو اور یہ لیلا ڈیسائی دیکھیں بڑی باگی ہے۔ پر من بھگو دیتی ہے..... یہ فلمیں بند ہونی چاہئیں.....''

''نہیں نہیں ٹھاکر جی۔ جب آدمی اداس ہوتا ہے تو وہ سچا ہوتا ہے۔ جب سچا ہوتا ہے تو کسی کا برا نہیں چاہتا..... کانن بالا..... پہاڑی سانیال، نجم الحسن یہ لوگ تو ایک اور ہی مزاج کے آرٹسٹ ہیں۔ یہ تو بڑی دیر تک یاد رہیں گے..... یہ لوگ تو عہد ساز ہیں۔''

''میں آپ کو ایک ایسے ہی آرٹسٹ سے ملاؤں گا.....''

''کہاں؟..... کب؟.....''

''گھنیارا روڈ پر..... شمشان بھوم سے کچھ پہلے ایک رشی جی رہتے ہیں۔ دس سال کی سادھی کے بعد انہوں نے درشن دیئے ہیں..... بس جس طرح آپ کندن لعل سہگل کو دیکھ کر اداس ہوئے اسی طرح رشی گوپال داس سے مل کر آپ کا دل پرسن ہو جائے گا..... میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر صاحب! یہ جو بھگوان کے سیوک لوگ ہے سیوک یہ بھی نیو تھیٹرز کے آرٹسٹ

ہی ہوتے ہیں۔ آپ کے دل پر ان کی چوٹ ضرور پڑتی ہے.....''

''ضرور لے چلیے گا مجھے..... مجھے ایسے لوگ دیکھنے کا بہت شوق ہے' جو دل پر اثر انداز ہوسکیں۔''

''رشی گوپال داس تو ایسے ہیں ڈاکٹر صاحب! ایسے ہیں جیسے چودھویں کا چندرماں' خود بھی شانت..... دوسرے کو بھی شانت کرنے کی اچھیا..... کسی کو پاس نہیں آنے دیتے..... میں نے ایک دن ان کا ابرن چھولیا' آپ مانیں نہ مانیں کئی دن بڑی بھلی سگندھ آتی رہی اپنے ہاتھ سے۔''

وہ دونوں چپ چاپ اترائی کی طرف چلنے لگے۔ سامنے کلب تھی۔

یہ کلب ایک طرح سے اس شہر کا سٹیٹس سمبل تھی۔ اس کا ممبر بننا آسان نہ تھا۔ اس کے لیے کلب کے چند ممبروں کی تصدیق ضروری تھی۔ اعلیٰ سرکاری افسر' چند شہرہ آفاق وکیل' کچھ ملٹری کے سرکردہ اور کالج کے پرنسپل اس کے ممبر تھے۔ لیڈی ڈاکٹر' ہیڈ مسٹریس اور ممبران کی بیگمات یہاں آتی تھیں لیکن کم کم..... شام کو ممبر ٹینس کھیلتے' اندھیرا پڑنے پر اندر چلے جاتے۔ پھر چائے' کافی ڈرنکس کے ساتھ ساتھ Stakes کے ساتھ برج کھیلی جاتی۔ برج میں روپیہ ہارنے پر کوئی ممبر نقد رقم ادا نہ کرتا۔ اس کا حساب کلب کے سیکرٹری کے پاس چلا جاتا اور مہینے کے آخر میں کلب کے چندے کے ساتھ بقایا برج کا حساب بھی ساتھ آ جاتا۔

جس وقت ٹھاکر چندر سین اور ڈاکٹر سرفراز کلب کے برآمدے میں پہنچے تو سب سے پہلے دونوں کی نظر اس تختی پر پڑی جو جالی والے دروازے کے اوپر تازہ تازہ گاڑی گئی تھی۔ اس پر لکھا تھا۔

''پولیٹکس ڈسکس کرنا منع ہے۔''

ایسا ہی ایک حکم نامہ ڈاکٹر سرفراز نے پچھلی شام سینما کے سامنے بھی دیکھا تھا۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی اس عہد میں عجیب حالت تھی۔ ذہین اور جی دار ہونے کی وجہ سے وہ انفرادیت پسند تھے اور مغلیہ سلطنت گنوا بیٹھنے کے باعث ایک بار پھر ملت' قوم' اتحاد' یکجہتی کے خواب دیکھنے پر مجبور تھے۔ مسلمانوں کی گرم جوشی تحریکوں میں ڈھلتی ضرور تھی لیکن تحریکیں انفرادی سوچ اور باہمی اختلافات کی وجہ سے وہ استحکام نہیں پکڑ سکتی تھیں جن کے باعث برصغیر ہندو پاکستان کے مسلمان ایک سمت میں چل سکتے۔ اسی لیے مسلمان بہت سے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ کانگریسی مسلمان' نیشنلسٹ مسلمان' حکومت کے طرف دار مسلمان' انگریز حکومت کے خلاف مسلمان' نہرو رپورٹ کے حامی' نہرو رپورٹ کے مخالف مسلمان' خلافت تحریک کے عاشق' اسی تحریک سے بیزار علماء کے عاشقین اور اہل دین کے مخالف' مذہب کو واحد رستہ' نجات سمجھنے والے اور دین کو ترقی کے راستے کی سب سے بڑی دیوار ماننے والے' مغرب زدہ مسلمان اور مشرق پر جان چھڑکنے والے کلچر کو قومیت کی اساس گرداننے والے مسلمان اور ایسے مسلمان جو اسلامی کلچر کے ہی سرے سے قائل نہ تھے۔ لبرل مسلمان اور کنزرنس سے مس نہ ہونے والے مسلمان.....

مسلمان گروہی حالت میں تھے۔ چونکہ مارشل ریس تھے اس لیے ان کا ایک مضبوط لیڈر کے بغیر یکجا ہونا بھی مشکل تھا۔ اس سٹیج میں جبکہ مسلم لیگ ابھی پاؤں چلنا نہ سیکھی تھی اور پنجاب کے یونینسٹ یا دوسرے الفاظ میں پنجاب کے سرداری سسٹم اور جاگیردارانہ نظام نے مسلمانوں کو مزید کمزور کر رکھا تھا۔ اس وقت مسلمان اس کوشش میں تھے کہ ہندوؤں

کے چھاتے تک چلتے جائیں اور احتجاج کے بجائے گاندھی جی کی اہنسا پر موودھ کو ہی شعار بنائیں۔ مسلمان لبرل ہوئے تو بدقسمتی سے سوامی شردھانند نے شدھی کی تحریک جاری کر دی۔ لالہ سمپت رائے نے ہندو سنگھٹن کا شوشہ کھڑا کر دیا۔

یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ کمزور کو دراصل ساری قوت ظالم ہی مہیا کرتا ہے۔ پنجاب میں جب بھی جاگیرداری نظام ٹوٹے گا' وہ طاقت جاگیردار نے ہی اپنے کمزور' بزدل' خوف سے لرزنے والے مزارعوں کو عطا کی ہو گی۔ ہندوستان میں اگر مسلم لیگ نے تقویت پکڑی اور مسلمان گروہوں میں یکجہتی فراہم کی تو اس کی وجہ کچھ مسلمانوں کی انفرادی سوچ نہ تھی بلکہ کانگریس کے عمل کے ردعمل میں یہ جماعت نکھرتی چلی گئی۔ ابھی مسلم لیگ کو انفرادی راستہ نہ ملا تھا اور وہ ٹامک ٹوئیاں مارنے اور سوچنے کے قفل میں تھی۔ ابھی مسلمان ہندو گھرانوں کے ساتھ تال میل اور یگانگت کے ساتھ رہنے پر مجبور تھے۔ گھل مل کر رہنے کی سب سے بڑی دو شرطیں ہندوؤں کے لیے ماننا ناممکن تھیں۔ نہ تو وہ مسلمان ملیچھ لوگوں کے ساتھ کھانا کھاتے تھے' نہ ہی ان کے آپس میں رشتے طے ہو سکتے تھے۔ گو بظاہر گاندھی جی گائے کے ذبیحہ کے خلاف زبان نہ کھولتے لیکن جب بھی کوئی میٹنگ ہوتی اس میں گائے کے ذبیحہ کی ممانعت کا ایجنڈا ضرور پیش کیا جاتا۔

ڈاکٹر سرفراز کے لیے یہ بورڈ نئی چیز تھی۔ ایک عرصہ سے وہ سن رہا تھا کہ چھاؤنیوں میں ہر میس کے ماتھے پر یہ بورڈ آویزاں تھا۔ آفیسر لوگ آپس میں مذہب اور سیاست کی بات نہیں کرتے تھے لیکن سویلین یا پولیشن ایک عرصہ سے ہندوستان کا مستقبل' کانگریس' لیگ' اقلیتوں کے حقوق کی باتیں کرتے چلے آ رہے تھے۔ جہاں لوگ آپس میں بیٹھ کر Illustrated Weekly آف انڈیا کی کراس ورڈ نکالا کرتے۔ "چتر او یکلی" میں پری چہرہ نسیم' سنیمہ پر بھا پردھان' بے بی نور جہاں کی باتیں کرتے۔ وہیں انہیں گاندھی جی کی باتوں میں بھی بڑی دلچسپی تھی۔ وہ آپس میں ہندو مہا سبھا' پست اقوام کے لیڈر بی آر امبید کر' پارسیوں کے کاوس جی جہانگیر کی باتیں بھی دوہرایا کرتے تھے۔ مسلم لیگ اور اس کے ریزولیوشن زیر بحث رہتے تھے۔ جواہر لعل نہرو کیا کہتے تھے۔ حکومت برطانیہ کے ملک معظم کی حکومت' لارڈ لن لتھگو ہندوستان سے بغیر آزادی کے قطعی فیصلے کے کسی جنگی مدد کے طالب تھے..... یہ باتیں سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھیں لیکن اب کلب کے ماتھے پر نیا بورڈ لگا تھا۔

"سیاسی گفتگو کرنا منع ہے....."

ڈاکٹر سرفراز برج نہیں کھیلتے تھے۔ وہ اگر شام کو کلب آ جاتے تو ایک آدھ گیم ٹینس کی لگاتے۔ پھر کچھ دیر برج کے کھلاڑیوں کے ساتھ بیٹھ کر اخبار دیکھ کر گھر لوٹ جاتے۔ سول سرجن نے اپنی ٹینس کی کٹ فلیٹ بوٹ جرابیں تولیے سب کلب کے بیرے کے پاس ریٹائرمنٹ روم میں ہی رکھ چھوڑا تھا لیکن آج شام ہو چکی تھی' وہ برج ٹیبل کے پاس جا بیٹھے۔

"دیکھا آپ نے ڈاکٹر صاحب حکم نامہ....." پنڈت سنسار چند بولے۔ وہ ریٹائرڈ ڈی ایس پی تھے اور بڑی عالیشان کوٹھی میں ابھی بھی ڈی ایس پی جیسے سٹیٹس کے ساتھ رہتے تھے۔

"ہاں جی دیکھا....." نکا صاحب بولے۔

"ہم صرف دیکھنے کے لیے آئے ہیں بولنا منع ہے....." ٹھاکر چندر سین نے کہا۔

"آپ دیکھتے جائیے' دیکھتے جائیے گاندھی جی ٹھیک کہتے ہیں۔ گورنمنٹ کو کوئی قطعی بات کرنی چاہیے۔ یہ سارا

کچھ آئیں بائیں شائیں جو مسٹر لن لتھ گاؤ صاحب فرماتے ہیں Evasion ہے....." وکیل کھوسلا بولے۔

"نو بڈ....."

"نو بڈ....."

"تھری بار ٹیز....."

"نو بڈ....."

"نو بڈ....."

ڈاکٹر سرفراز خاموش تھے۔

"اگر ہندوستان میں جمہوریت کے ساتھ آزادی آئی تو ظاہر ہے..... یہ خطہ زمین اکھنڈ بھارت بنے گا' اکثریت ہندوؤں کی ہے.....ہندو راج ہوگا۔"

ٹھاکر چندر سین بولے۔ "پھر چاہیں تو اقلیتیں اپنی شناخت رکھیں' چاہیں تو اکثریت میں ضم ہو جائیں۔"

اب نکا فرمان علی بالکل چپ ہو گئے۔ وہ بھی اس بحث میں شریک ہونے سے گریز کر رہے تھے۔

"اچھا ہی ہوا آٹھ صوبوں میں کانگریس استعفیٰ دے گئی..... خواہ مخواہ جب حکومت انگلشیہ سنتی ہی نہیں.....تو..... کہاں تک ہم ان سے جنگ میں تعاون کریں۔"

"بھئی وہ تو سنتی ہے..... سنتی ہے اس جنگ کی وجہ سے سننے پر مجبور ہے۔ مشکل مسلم لیگ نے ڈال رکھی ہے۔ اب مسلم لیگ نے ریزولیوشن پیرا نمبر سات کے مطابق مطالبہ کر رکھا ہے کہ مسلم لیگ کی رضامندی کے بغیر ہندوستان کی آئینی ترقی کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا..... یہ تو ایک طرح سے متوازی مطالبہ ہوگا کانگریس کے ساتھ ساتھ..... سوچ لیں..... آپ حضرات! یہ جناح صاحب ملک کو کدھر لے جا رہے ہیں۔" پنڈت سنسار چند بولے۔

ٹھاکر چندر سین نے ڈاکٹر سرفراز کی طرف دیکھا..... نکا فرمان علی نے اپنے ہاتھ کے پتوں پر نظریں گاڑ دیں..... سب جانتے تھے کہ ڈاکٹر سرفراز نہ کانگریسی ہیں نہ مسلم لیگی..... وہ بلا کے لبرل اور انگلستان کے پڑھے ہوئے تھے۔

لیکن پھر بھی نہ جانے کیا بات تھی کمرے میں منجمد خاموشی پھیل گئی اور سب ممبران کلب کے ماتھے پر آویزاں بورڈ پر عمل کرنے لگے۔

"سیاسی گفتگو سے پرہیز کریں....."

اس وقت انگریز ڈی ایف او..... مسٹر ونڈر سمتھ ٹینس کے لباس میں داخل ہوا۔ ونڈر سمتھ امام باڑے کے قریب اور سول سرجن صاحب کے سرکاری ہسپتال سے متصل بہت بڑی کوٹھی میں رہتا تھا۔ دراز قد' خوبصورت' کپیلا' براؤن آنکھوں کا یہ آئرش آفیسر بڑی روانی سے اردو بولتا اور بڑی بے تکلفی سے گالیاں دیتا۔ اس کے قہقہے اتنے بلند بانگ تھے کہ لگتا پوری رجمنٹ ہنس رہی ہے۔ ونڈر سمتھ کی اہلیہ دو سال ہوئے اسے چھوڑ کر آئرلینڈ جا چکی تھی۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ وہ طلاق لے چکی ہے۔ کچھ کا خیال تھا کہ اسے یہاں رہنا پسند نہیں اور وہ اس کوشش میں ہے کہ ونڈر سمتھ نوکری چھوڑ دے۔

کوٹھی کے اردگرد مین سڑک تک جنگلی بانسوں کا اتنا گہرا جنگل تھا کہ اندر ڈی ایف او صاحب کی کوٹھی نظر نہ آتی تھی

کلب میں گھستے ہی ڈی ایف او نے سارا منظر بدل دیا۔

''میری طرف نظر کریں سب..... ٹینس کھیلنے نکلا تھا.....اور اس وقت پہنچ رہا ہوں۔ راستے میں ایک ریوسماجی لیڈرل گئے..... بحث ہوگئی.....میں نے کہا بھائی میں اکیلا ہوں' تم لوگ دس بارہ..... کلب چلو میرے کچھ دوست میرا ساتھ دیں گے.....'' پتہ نہیں وہ سچ کہہ رہا تھا کہ جھوٹ؟ پوری وادی میں کس کی اتنی پہل تھی کہ کسی سفید آدمی کے ساتھ انگریزی میں سیاسی گفتگو کر سکتا۔

بہر کیف ایک اونچا فرمائشی قہقہہ پڑا اور خوشدلی کی فضا پھیل گئی۔

اس کے بعد کوئی سیاسی گفتگو نہ ہوئی۔ وِنڈر سمتھ اور چند اور ممبران نے ایک نئے ٹیبل پر بیٹھ کر شراب کے آرڈر دیئے اور تاش پھینٹنے لگے۔

کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب نے سب کو خدا حافظ کہا اور باہر نکل آئے۔

آسمان پر بادل چھائے تھے۔ پہاڑی علاقوں میں جب شہر کی آبادی بھی کم ہو تو سرِشام ہی آدھی رات پڑ جاتی ہے۔ ڈاکٹر ہولے ہولے ہمالیہ ناکیز والی سڑک کو چھوڑ کر اپنے دھرمسالہ جانے والی سڑک پر چلنے لگا۔ اس کی دائیں جانب ٹھیکیدار صاحب کی کوٹھی میں تھوڑی سی روشنی تھی۔ بجلی کے کھمبوں پر ٹمٹمانے والے بلب بہت کم روشنی دے رہے تھے۔ آسمان پر پول کیمپ کی جانب روشنیوں کا ایک جہاں آباد تھا لیکن یہ روشنی اتنی دور تھی کہ اس سے دل میں روشنی نہ پیدا ہو سکتی تھی۔ دور وادی میں بادلوں میں بجلی چمک رہی تھی لیکن آواز یہاں تک نہ پہنچتی تھی۔

آج تک کبھی ڈاکٹر سرفراز کو اس راستے سے خوف نہ آیا۔ وہ رات کو بارہ بجے بھی کلب سے تنہا لوٹتا رہا تھا لیکن نہ تو کبھی وحشی باگھ بگھیلوں کا خیال آیا۔ نہ کبھی یہ بات سوجھی کہ کوئی گدی یا مقامی اسے لوٹنے کی غرض سے حملہ کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر سرفراز نے کالر گردن پر اونچے کر لیے اور مڑ کر پہاڑی سڑک پر نظر ڈالی۔ اوپر پہاڑوں پر گھنے بن کے درخت کالا اندھیرا پھیلائے کھڑے تھے۔ نیچے ہمالیہ ناکیز سے مدھم سے فلمی گیت کی آواز آ رہی تھی۔ سڑک پر دور دور تک کوئی نہ تھا۔

پتہ نہیں آج اسے کلب میں پہلی بار احساس ہوا کہ ٹھاکر چندر سین' پنڈت سنسار چند وکیل کھوسلا' ریلوے کی ریاست کے نکا فرمان علی سارے چہروں پر ماسک لگائے بیٹھے تھے۔ ایک بورڈ کلب پر کیا نصب ہو گیا تھا' لوگوں نے اپنے چہروں پر نئے چہرے سجا لیے تھے..... کچھ سمجھ نہ آتی تھی' کون کیا ہے.....اور کوئی کہاں ہے تو کب تک ہے؟ اور کیوں ہے.....

دادا ابا روز لڑتے جھگڑتے تھے کہ ''زمیندار'' اخبار لگواؤ لیکن ابھی تک ڈاکٹر صاحب گھر پر ''پرتاپ'' اور ہسپتال میں ''ملاپ'' اخبار پڑھتے تھے۔

پتہ نہیں کیا بات ہوئی دوسری صبح سے انہوں نے ''زمیندار'' اخبار بھی پڑھنا شروع کر دیا.....

کالج گویا بئے کا گھونسلا تھا۔ اندر گھسے اور عافیت ہی عافیت.....شانتی ہی شانتی..... یوں ٹھہرے وقت میں سے جب شوکت مغل اور راحیلہ سٹیشن پہنچے تو پہلے تو تانگے والے کو لارنس روڈ کی طرف سے واپس مڑنا پڑا.....جنت انتوفی کے چوراہے کی جانب وحشت ناک آوازیں' بلوہ اور آگ کے شعلے نظر آ رہے تھے۔ تانگے والے نے پہلے تو سواریوں کو لارنس باغ کے سامنے اتار کر بھاگ جانا چاہا۔ پھر راحیلہ کا چہرہ دیکھ کر اس کی مردانگی جاگی.....اور وہ شوکت سے مخاطب ہوا.....

"بھائی! میں تو کسی قیمت پر سٹیشن نہ جاؤں پر بی بی کا ساتھ ہے..... ایسے فسادیوں کا کیا ہے..... چلو جی مڑ کر مال کی طرف چلتے ہیں۔ شاید اُدھر سے راستہ مل جائے....."

راحیلہ اور شوکت دبی دبی آواز میں بھائی تانگے والے کا شکریہ ادا کرتے رہے اور وہ چوک میں آ کر راستے بدلتا رہا۔ مال روڈ پر پہنچتے ہی لال جھنڈیوں والے کمیونسٹ نکرے۔ گو ان کا جتھہ خاموشی سے امن کے نعرے لگا رہا تھا لیکن تانگہ موڑنا پڑا۔ ہال روڈ' نسبت روڈ' گورنر ہاؤس کا بغلی راستہ سب طرف خطرہ تھا۔ بالآخر خیر سے ہو کر تانگے والا میو روڈ پہنچا۔ یہ سڑک ریلوے کے افسروں کی آبادی تھی اور رات ہونے کے باعث قدرے خاموش تھی۔

شوکت کو اپنی فکر نہ تھی' وہ صرف اس قدر چاہتا تھا کہ کسی طرح راحیلہ عافیت کے ساتھ واپس گھر پہنچ جائے۔ ویسے بھی اسے ابھی لاہور نہیں چھوڑنا تھا۔ خالہ بتول اپنے گھر کی چابیاں اس کے سپرد کر کے ایبٹ آباد جا چکی تھیں اور تاکید کر گئی تھیں کہ کسی صورت میں گھر کو اکیلا نہ چھوڑا جائے۔ کرشن نگر کی یہ آبادی ہندو لوگوں کا گڑھ تھا اور یہاں کے ہندو نہ صرف اکثریت میں تھے بلکہ متمول ہونے کے باعث سینہ تانے ہوئے تھے۔ ایسے میں شوکت کا خیال تھا کہ وہ راحیلہ کو ٹرین میں سوار کر کے جلد واپس آ جائے گا اور اگر کوئی واقف شکل نظر نہ آئی تو وہ راحیلہ کے ساتھ سفر کر کے گورداسپور پہنچے گا اور واپسی ٹرین سے کرشن نگر آ جائے گا..... وہ خالہ بتول کے ساتھ کیے گئے وعدے کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔

کئی راستوں سے گول مال کرتے وہ سٹیشن پہنچے۔ یہاں لوگوں کا ایک جمِ غفیر تھا۔ لوگ بدحواس ٹکڑیوں میں گروہوں میں اور اکا دکا حیران' ششدر آ جا رہے تھے۔ ٹکٹ گھر کے آگے رش تھا لیکن لوگ خریدے بغیر اندر پلیٹ فارم پر دھکم پیل کرتے گاڑیوں میں چڑھ اتر رہے تھے۔ گیٹ کیپر اس سیلِ رواں کے آگے مجبور تھا۔ گارڈ بلاوجہ سیٹیاں بجاتے بھاگتے پھرتے تھے۔

جو ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی' اس کی چھتوں پر اتنے لوگ چڑھے ہوئے تھے کہ لگتا تھا ٹرین بیٹھ جائے گی۔ ٹرین میں راستہ بناتے قلی کو تلاش کرتے وہ بھی ٹھوکریں' ٹکریں' کہنیاں کھاتے کسی ڈبے کی طرف جا رہے تھے۔ ہر دوسرے آدمی سے شاہد پوچھتا۔

"یہ ٹرین گورداسپور جائے گی؟....."

جس کو علم تھا' وہ بھی اور جس کو علم نہیں تھا وہ بھی اثبات میں جواب دے رہا تھا۔

معاً کسی نے راحیلہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ جب راحیلہ نے مڑ کر دیکھا تو وہ شاہد تھا۔

خوشی اور حیرانی سے اس کی جان ہی تو نکل گئی۔

"میں عابدہ اور جمیلہ کو گورداسپور لے جا رہا ہوں۔" لوگوں کے شور میں شاہد نے شوکت مغل کو بتایا..... "میرے پاس فسٹ کلاس کی تین ٹکٹیں ہیں۔ راحیلہ کو میرے ساتھ جانے دو....."

دھکم پیل میں لوگوں کی لہریں کبھی انہیں آگے دھکیل دیتیں۔ کبھی وہ پیچھے چلے جاتے لیکن اس آنا جانی میں کئی بار شاہد نے راحیلہ کو ہاتھ سے پکڑا' بازو سے گھسیٹا' کندھوں پر دباؤ ڈالا..... راحیلہ کے برقعے کا اوپر والا حصہ کسی نے گھسیٹ کر گرا دیا تھا اور اب اس کی لمبی چوٹی آزادی سے لوگوں کے ہاتھ میں آ جاتی تھی۔ بمشکل تمام ساٹھ فٹ کا فاصلہ ہو گا جو انہوں

نے سوا گھنٹے میں طے کیا..... فرسٹ کلاس کا ڈبہ پہلے سے پُر تھا۔ وہ بھی ان لوگوں میں پیک ہو گئے۔ ہندو مسلمان' سکھ سب بھاگ رہے تھے..... ان کو کدھر جانا ہے' کیوں جانا ہے۔ یہ بات طے نہ تھی۔ کچھ طے تھا تو یہ کہ لاہور سے نکل جانا چاہیے۔ شاہ عالمی میں اتنی آگ لگی تھی کہ سارا شہر ہراساں ہو گیا تھا۔ نہر تک اس علاقے کے جلنے کا دھواں آسمان کو چھوتا نظر آتا تھا۔ کرشن نگر کی آبادی بھی کچھ سیف نہ رہی تھی لیکن شوکت راحیلہ کو شاہد کے سپرد کر کے واپس لوٹ گیا تھا۔ ویسے بھی اس کے امتحانوں میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ اسے اپنی پڑھائی کا ایک مسئلہ تھا۔ پڑھنے کے لیے جس دلجمعی کی ضرورت تھی' وہ نایاب تھی۔

واپسی پر سارا راستہ وہ یہی سوچتا رہا کہ اس نے راحیلہ کو شاہد کے ساتھ روانہ کر کے اچھا نہیں کیا۔ احساس جرم تلے اس کی آنکھیں ابلی پڑتی تھیں۔ پھر کافی دیر اپنے آپ کو ملامت کرتے رہنے کے بعد وہ دل کو تھپکی دے کر سمجھاتا کہ آخر شاہد ہی تو راحیلہ کا اصلی وارث ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے میری کیا حیثیت ہے۔ مردانہ وار' مردانگی' مردی یہ بھی کیا الفاظ تھے۔ غبارے میں ہوا بھر دینے والے نظریات..... ایم اے کے امتحان راحیلہ کو گھر پہنچانے سے کہیں زیادہ اہم تھے۔ جب اس نے شاہد کو بتایا کہ ان دونوں کے پاس ٹکٹ نہیں تو شاہد نے اسے تشفی دے کر کہا تھا..... ''میرے پاس تین ٹکٹ فسٹ کلاس کی ہیں۔ تم فکر نہ کرو میں Without سفر کر لوں گا.....''

کہنے کو تو شاہد نے اس کی تشفی کے لیے یہ جھوٹ بولا تھا۔ واقعتاً اسکے پاس بھی کوئی ٹکٹ نہیں تھی اور وہ کسی نہ کسی طرح راحیلہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا..... پورا زور لگا کر شاہد نے شوکت کو لوٹا دیا لیکن شوکت کو احساس ہوا جیسے اس نے اپنا فرض ادا نہ کیا..... یہ پھر ازلی فرض اور محبت کی جنگ تھی۔

''اگر فسادات کا یہی حال رہا تو میں کیسے واپس آ سکوں گا؟''

''امتحانوں کی تیاری کیسے ہو گی.....؟''

''خالہ بتول سے کیا ہوا وعدہ.....''

جب شوکت مغل کرشن نگر واپس پہنچا تو احساس جرم کم ہو چکا تھا۔ تاویلوں نے اندر شانت کر دیا تھا۔ اس نے کتابیں نکال کر پڑھنا چاہا..... پھر اٹھ کر باورچی خانے میں گیا۔ کافی بنانے کا ارادہ کیا تو دودھ نہیں تھا..... دودھ لینے کے ارادے سے سیڑھیاں اتر رہا تھا تو بازار میں سے شور کی آوازیں سنائی دیں۔ واپس لوٹ گیا اور بالکونی میں سے نیچے دیکھا..... بازار میں لوگ جتھے کی شکل میں اکٹھے ہو رہے تھے۔ شکلوں اور لباس کے حساب سے یہ لوگ اہل ہنود لگتے تھے۔ شوکت نے بالکونی والے دروازے کو بند کر لیا اور کتابیں از سر نو کھول کر پڑھنے کی سعی کی۔

کچھ دیر پڑھتے رہنے کے بعد اسے خیال آیا کہ اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ وہ گورداسپور ہی چلا جاتا..... اگر راحیلہ گم ہو گئی..... اتنے آدمیوں کے سیلاب میں اگر وہ گھر نہ پہنچ پائی تو.....

کیا میں اپنے آپ کو کبھی معاف کر سکوں گا؟.....

☆☆☆

جب ٹرین گورداسپور کے سٹیشن پر رکی اور سواریاں ڈبوں سے نکل کر پلیٹ فارم پر آئیں تو سب سے پہلے جو

صورت راحیلہ کو نظر آئی' وہ اوما کسم تانی کی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے یوں لپٹیں کہ لگتا تھا اب کبھی جدا نہ ہوں گی۔

''لاہور میں تم کہاں تھی اوما؟..... سارا کالج چھان مارا' سب سے پوچھا..... تمہارا کچھ پتہ ہی نہ تھا.....''

''میں تو لاہور پہنچتے ہی بیمار ہو گئی..... داخلہ ہی نہیں لیا..... ماتا جی کی ایک منہ بولی بہن شاہ عالم میں رہتی ہیں' انہی کے پاس رہی.....''

راحیلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے..... اس لڑکی کے نصیب میں اپنا ہی گھر نہیں ہے۔ پہاڑوں میں وہ پاشی بہن جی کے گھر رہی..... اور لاہور پہنچ کر کالج میں داخلہ نہیں لے سکی..... شاہد اور قلی ہلکے ہلکے سامان کو اٹھائے پلیٹ فارم سے نکل رہے تھے۔ گو سواریاں کم تھیں۔ پھر بھی باہر نکلنے والوں کو ٹکٹ چیکر کچھ پوچھ نہیں رہا تھا۔

''ہمارے ساتھ چلو اوما.....''

عابدہ شوخ رنگ کی لپ سٹک میں بے سروسامان لوگوں کے درمیان کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔

''تم مجھے راستے میں ڈراپ کر دینا راحیلہ.....''

''ہاں جی ہم آپ کو ڈراپ کر دیں گے' آپ فکر نہ کریں.....''

عابدہ اور شاہد آگے تانگے والے کے ساتھ بیٹھے..... پچھلی سیٹ پر اوما' راحیلہ اور جمیلہ اچک کر بیٹھ گئیں۔ شہر کی سڑکیں' درخت' کوٹھیاں سب امن' خاموشی اور اطمینان کی ضامن تھیں۔ سارا راستہ شاہد کے ساتھ سفر کرنے کا خمار راحیلہ پر سوار رہا۔ اب اچانک اوما کے مل جانے سے اسے اپنے شوکت بھائی کا خیال آیا..... پتہ نہیں کرشن نگر کا علاقہ محفوظ بھی ہے کہ نہیں۔ کون جانے وہ کس راستے واپس گئے۔ سارا شہر تو شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ جتھوں کی پہنچ میں تھا۔ احساس جرم سے راحیلہ نڈھال ہو رہی تھی۔

میں بھی کتنی خود غرض ہوں؟

شاہد کے شوق میں شوکت بھیا کو پلٹ کر دیکھ بھی نہ سکی!

کیا انسان اپنی ضرورتوں اپنی خواہشوں سے آگے دیکھ نہیں سکتا؟

کیا اندر کے خیال اس کے عمل کو ہمیشہ حصار میں رکھتے ہیں؟

کیا انسان اپنی خواہشوں' ضرورتوں سے آزاد نہیں ہو سکتا؟ تانگے کی ٹخ ٹخ کے ساتھ ساتھ وہ سب اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔ عابدہ کے دماغ میں ''نہ جانے دوں گی' جانے نہ دوں گی'' گیت بجے جا رہا تھا اور اس کی نگاہوں میں شاہد کے بجائے کانن بالا نیو تھیٹرز کی محبوب ترین ایکٹرس گھوم رہی تھی۔ وہ ابھی تک بمبئی ٹاکیز کی نئی ایکٹرسوں کی کھیپ کی کھیپ پر ریجھ نہ سکی تھی۔ اس لیے وہ کسے پسند کرتی.....؟ راگنی' زموا' منور ماسب اس کے نزدیک بس ایویں ہی تھیں۔ ان میں رینو کا دیوی' سیتا' جمنا' کانن بالا جیسا تہذیبی ورثہ کہاں تھا۔ کندن لعل سہگل' بروا' پنکج ملک جیسی Maturity کہاں سے آ سکتی تھی۔

شاہد محسوس کر رہا تھا کہ شاید اب وہ امتحان دینے واپس نہ جا سکے گا۔ کوئی بات اسے اندر ہی اندر بتا رہی تھی کہ شوکت نے درست قدم اٹھایا اور لاہور میں ہی رہ گیا..... کم از کم وہ امتحان تو دے سکے گا لیکن شاہ عالمی رات بھر شعلوں میں

جاگتا رہا۔ لاہور فسادات کی لپیٹ میں تھا۔ ایسی حالت میں وہ جمیلہ اور عابدہ کا کیا کرتا..... یہ درست ہے کہ وہ عابدہ کے چونچلوں کے آگے ہنستا تھا اور زیادہ تر اس چونچال کو اپنے سے دور رکھنا بھی ممکن نہ تھا لیکن وہ ان دونوں کو کیسے تنہا اتنے رش میں جانے کی اجازت دیتا اور پھر کیسے اس کی قسمت جاگی' راحیلہ بھی اس کی ہمسفر ہوگئی..... جب تانگے والا اپنی چھڑی کی نوک چلتے پہیے میں پھنساتا تو یکدم آواز بدل جاتی..... شاہد اس ٹخ ٹخ کے ساتھ دل ہی دل میں کہنے لگتا ''ہمسفر..... ہمسفر..... ہمسفر.....''

سول لائنز میں سب سے پہلے اوما کا گھر آیا۔ تانگہ پورچ میں چلا گیا۔ اوما نے اپنا ہلکا سا چینڈ بیگ اٹھایا اور اتر گئی۔ پھر اس نے برآمدے میں لگی گھنٹی بجائی تو سوہن سنگھ باہر نکلا۔

''ماتا جی تو رات ہی پہاڑوں پر گئی ہیں.....''

''اور پتا جی.....''

''وہ تو ہفتہ ہوا برما چلے گئے.....''

وہ گومگو کے عالم میں کھڑی تھی..... پانچ بہن بھائیوں کی اوما اکیلی کھڑی تھی.....اسے معلوم نہیں تھا کہ اسے برما جانا ہے کہ پہاڑوں پر..... لاہور لوٹنا ہے کہ یہیں اس کوٹھی کے کسی کونے میں بسرام کرنا ہے۔ راحیلہ جلدی سے پائیدان پر پاؤں دھر کر اتری..... ''چلو اوما میرے ساتھ چلو..... جب ماتا جی کا کھوج لگ جائے گا تو تم ادھر آ جانا..... جب انہیں پتہ چلا تو وہ فوراً آ جائیں گی سوچو مت..... چلو۔''

اوما کو ساتھ لادے پھاندے وہ جب ابراہیم لاج پہنچے..... ساجدہ ماں اندر گیلری سے بھاگ آئیں۔ آتے ہی اوما کا منہ سر چوما..... پھر راحیلہ کو گلے لگایا۔ بہت چاہا کہ عابدہ جمیلہ شام تک ٹھہر جائیں لیکن شاہد نے اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے میں جلدی کی اور تانگہ سول لائنز پر آگے نکل گیا۔

''شوکت کیوں نہیں آیا راحیلہ.....''

''آتے تھے امی لیکن ان کے امتحان ہیں۔ اگلے ہفتے وہ تیاری کر رہے ہیں۔''

''سارے ملک میں آگ لگی ہے اور وہ امتحان کی تیاری کر رہا ہے۔ الٹی کھوپڑی ہے شوکت کی۔ اچھا کیا شاہد آ گیا.....''

''وہ بھی واپس چلے جائیں گے۔'' راحیلہ بولی۔ ''ان کے بھی تو امتحان ہیں۔''

ساتھ والے کمرے سے دادا ابا نے آواز دی..... ''کون ہے..... راحیلہ؟.....''

اوما اور راحیلہ بھاگ کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئیں۔ ہمیشہ کی طرح اس کمرے سے لوبان کی خوشبو آ رہی تھی۔ سارا بستر اگول کر کے سرہانے والی طرف پڑا تھا اور دادا ابا اس رول کیے بستر سے ٹیک لگائے حقے کی نے سے منہ لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے پوپلے منہ پر نہ تفکر تھا نہ سوچ۔

راحیلہ اور اوما بھاگ کر ان سے ملیں..... دادا جی کا چہرہ کھل گیا۔

''آ گئی میری بچی آ گئی..... لو جب آخر کو بیٹی بیاہے بغیر چارہ نہیں..... گھوم پھر کر اسے کسی اور ہی کو دینا ہے تو اس

قدر مصیبت میں ڈالنے کا فائدہ؟ کیا ملے گا بی اے ایم اے کر کے۔ کوفتے بریانی پکانا سیکھو ساجدہ ماں سے۔ باقی سب جھوٹ ہے......"

اوما کو وہ کچھ کروا دیا بولے...." اوہو ہو ہماری اوما نے کیا قد نکالا ہے.... کیوں بھئی گیدڑ کی آواز نکالنا آ گئی ہے کہ کچھ کسر ہے.....؟"

☆☆☆

ہفتہ بھر سے مٹی سے لدی آندھیاں چل رہی تھیں۔ سارا دن کھڑکیاں دروازے بجتے رہتے۔ آندھی بند دروازوں، دریچوں کو دھکیلنے کھولنے کی سعی کرتی رہتی اور پھر ناکام ہو کر ابراہیم لاج کے باغ کا رخ کرتی۔ یہاں آندھی کھلی جگہ پا کر دیوانہ وار آم اور مولسری کے درختوں میں گھومتی پھرتی۔ سارے درخت جھاڑیاں کسی بڑھیا کے بالوں کی طرح دھونسے ہوئے جھوجھو کر رہ گئے تھے۔ چنبیلی موتیا کے پھول مٹی کی وجہ سے زرد تھے۔ لان کی گھاس نے مٹی کی باریک چادر اوڑھ رکھی تھی۔ سارا دن برآمدوں میں مٹی ہوا میں لہروں کی طرح کبھی ادھر کبھی اُدھر گھومتی رہتی۔ سیلنگ فین سارا دن مٹی ملی لو دھکیلتا اور دوپہر کے وقت اس گرم مٹی ملی ہوا میں نیند نہ آتی۔ اوما اور راحیلہ چادریں گیلی کر کے انہیں سر سے پاؤں تک اوڑھ کر قرار پاتیں۔

لیکن ڈاکٹر سرفراز نے کبھی دوپہر کو آرام نہ کیا تھا۔ وہ اپنا بیگ پکڑ کر دبے پاؤں کوٹھی سے نکلتے اور ہسپتال کا رخ کرتے۔ ان کا معمول تھا کہ وہ دوپہر کا گھنٹہ ڈیڑھ ضرور گھر گزارتے۔ ساجدہ ماں انہیں املی آلو بخارے کا شربت پلاتیں.... کچھ دیر خسبر کرو وہ کدو کر لیے یا بھنڈیاں کھاتے۔ اخبار پڑھتے' دانتوں میں خلال پھیرتے' نماز پڑھنے کے بعد پھر سول ہسپتال چلے جاتے۔ بار بار وہ گرمیوں کے سارے سیزن میں ایک جملہ کہتے" اوہ کتنی گرمی ہے.... اس بار تو پچھلے سال سے بھی زیادہ گرمی پڑ ئی' ہے ناں ساجدہ....."

ساجدہ ماں بغیر اتفاق رائے رکھتے ہوئے ہاں میں ہاں ملا دیتیں۔

لیکن تسنیم آپا کا رویہ سارے گھر سے علیحدہ تھا۔ غریب جوان بیوہ رشتہ دار ہونے کے ناطے اس گھر میں جو کچھ غلط ہوتا' اس کی ذمہ داری تسنیم محسوس کرتی اور جو کچھ ٹھیک ہو گزرتا' وہ ساجدہ ماں کا سلیقہ' ہوشیاری اور تجربہ تھا۔ تسنیم کو نہ کبھی سردی لگی نہ گرمی۔ کاموں نے اسے اپنے آرام و آسائش سے بے پرواہ رکھا۔ سرفراز بھائی کی مہربانی نے اس کی اپنی خواہشات پر بڑی آسانی سے پہرے بٹھا دیے..... دوپہر کا وقت بڑی فراغت کا وقت ہوتا۔ اس وقت وہ بڑی پیٹی کھول کر راحیلہ کے جہیز کی چیزیں بڑی دری' پلنگ اور صوفے پر بچھا رکھ انہیں جانچتی پرکھتی۔ جہیز بنانے کے لیے ابھی گھر کی بیبیاں اپنے ہاتھوں غرارے' قمیض' شلواریں سیتی تھیں۔ گوٹا کناری سلمی ستارہ بہت زیادہ کام سلیقے شعار گھر والیاں خود ہی ہاتھوں ہاتھ نپٹانے کی عادی تھیں۔ تسنیم آپا کے کمرے میں راحیلہ کا سارا جہیز تھا۔ بڑی پیٹی میں پلش اور مخمل کی رضائیاں' کمبل' تکیس چادریں' بیڈ کور تھے۔ سلائی کی مشین' زشتھ کا ریڈیو' گارڈن فین دیوار کے ساتھ ساتھ دھرے تھے۔ ابھی فرنیچر نہیں آیا تھا.... لیکن تسنیم دوسرے تیسرے ساجدہ ماں کے ساتھ تانگے پر سوار بازار جاتے وقت فرنیچر کی دوکان پر ضرور جاتی۔ ساری دوپہر تسنیم دوپٹوں کو گوٹہ کناری سلمی ستارہ ٹانکنے میں بسر کرتی۔ اسے بھولے رہتا کہ وہ بیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی

تھی اور اب اسے بیوہ ہوئے بھی تیسرا سال ہے۔ سرفراز بھائی کے گھر کی ذمہ داریوں نے اسے اس قدر خوش تو کر ہی دیا تھا جتنی مصروفیت ایک مشغول انسان کے حصے آتی ہے۔

راحیلہ اور اوما ہر وقت گرمی سے پریشان اپنے کمرے کے فرش پر وقت گزارتیں۔ انہوں نے اس کمرے کی چیل سے بنی ہوئی دری اٹھوا دی تھی۔ نیچے سے سفید و سیاہ شطرنجی نکل آئی۔ صبح صبح وہ بڑے اہتمام سے اسے دھلواتیں یا دھوتیں پھر چھوٹا سا پرانا دری کا ٹکڑا عین پنکھے تلے بچھا کر اس پر دن گزارتیں۔ وہ دروازہ جو باہر بالکونی کی طرف کھلتا تھا' اس پر خس کی چق لگی تھی۔ وہ بار بار اس پر پانی چھڑکتیں۔ جب لو چلتی تو اندر ہلکے سے اندھیرے میں خس کی خوشبو پھیل جاتی۔ راحیلہ کو سب سے زیادہ مٹی کی باس پسند تھی۔ جب بھری برساتوں سے پہلے بارش کے چھینٹے طیش زدہ مٹی پر پڑتے' ہوا مٹی پانی کے میل سے ایک عجیب قسم کی خوشبو اٹھتی...... راحیلہ کو ہمیشہ لگتا جیسے شاہد قریب ہی ہو...... دھرتی کو ٹھنڈا کرنے والی باس...... تپتی مٹی کو خنکی عطا کرنے والی باس...... راحیلہ کو خوشبو لگانے سونگھنے کا بہت شوق تھا۔ اس کے پاس ایوننگ ان پیرس کی کئی چھوٹی بڑی شیشیاں تھیں۔ یوڈی کلون' شنیل اور 4711 کی شیشیاں کھول کر استعمال کرنے سے پہلے وہ انہیں ضرور سونگھتی۔ پھر آنکھیں بند کر کے اس نامحسوس طرب کو وہ سینے میں بھر لیتی اور اسے لگتا وہ کسی باغ میں ہے...... موتیا' چنبیلی' نرگس' گلاب سب ایک اضطراری کیفیت کے ساتھ اس کے اردگرد بس جاتے۔ ویسے تو خوشبو اس کے ساتھ ہمیشہ رہی لیکن جب سے شاہد اس کی زندگی میں در آیا تھا' ہر اچھی چیز قابل ذکر واقعہ کے ساتھ شاہد کے وجود کی خوشبو وابستہ ہو گئی تھی۔ اس خوشبو کا اگر تجزیہ کیا جاتا تو لونگ' کافور' گلاب کی پتیاں اور تمباکو سے ملی جلی باس کا احساس ہوتا۔ وہ اس خوشبو کے بگولے میں پہلے اوپر کی جانب اڑتی پھرتی پھر ریت کی طرح بیٹھ جاتی...... سر پر گیلا تولیہ باندھ کر لیٹ جاتی۔ سر سے پیروں تک گیلی چادر یوں اوڑھتی گویا مردہ کفنایا گیا ہو۔ تسنیم آپا اسے یوں لیٹے دیکھ کر چیختیں......"میں یہاں اس لیے آئی ہوں کہ تو آرام سے لیٹی رہا کرے اور میں تیرے جہیز سے سر مارتی پھروں...... نحوست پھیلا رکھی ہے۔ اتار چادر ادھر سے۔"

راحیلہ سر سے تھوڑا سا چہرہ نکال کر کہتی......"پتہ ہے جی ہم مردہ مردہ کھیل رہے ہیں۔ اوما سنکھ بجاتی ہے۔ پھر ارتھی کو آگ لگائی جاتی ہے...... اوما زور زور سے کہتی ہے رام نام ست ہے...... رام نام ست ہے......"

راحیلہ جان بوجھ کر تسنیم کو دہلانے کے لیے کہتی اور تسنیم اپنے کانوں کو چھو کر کہتی......"توبہ توبہ...... توبہ یہ بھی کوئی کھیل ہے۔ اخبار پڑھا ہے بھی۔ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں پڑھ کر...... کبھی میری مدد بھی کر لیا کرو نیچے آ کر...... اتنا کام ہے...... اتنا کام ہے اور میں اکیلی جان......"

تسنیم اپنی اس اہمیت میں ہی خوش تھی۔ اس جواں سال کو معلوم ہی نہیں تھا کہ خوش رہنے اور ہونے کے لیے اپنی ذات کی پذیرائی بہت سے اور طریقوں سے بھی کی جا سکتی ہے۔ وہ بکتی جھکتی چلی جاتی تو ایک بار پھر اوما اور راحیلہ کی گفتگو...... یعنی بہت ہی پرائیویٹ شروع ہو جاتی۔ راحیلہ کے سنہری مائل براؤن بال ہوا میں جھولنے لگتے جیسے نئی کونپلیں تھوڑی سی ہوا میں بھی لہرانے لگتی ہیں۔

"سنو ناں اوما...... ایک روز ہم کالج کی طرف سے پکنک پر گئے تھے۔ کامران کی بارہ دری میں ہم لوگ مزے کر رہے تھے...... تو وہیں سے بار بار ایک لڑکا برآمد ہو جاتا۔ کبھی وہ کوئی ریمارک دیتا کبھی کوئی۔ ہم نے مس

شکایت تو نہ کی ایسے ہی بیچارہ پٹ جاتا۔ لیکن ورشن نے صرف اتنا کہا' کوئی نوٹس نہیں لے رہا تو یوں مارا مارا پھرتا ہے..... ہیں تو اوما پھر کیا ہوا..... کیا ہوا وہ لڑکا غائب..... ورشن بڑی خوش کہ اس نے لڑکے کو ایک ہی جملے میں بھگا دیا۔ اب کامران کی بارہ دری سے اتر راوی کنارے جا کر ہم نے پانی کنارے ڈیرہ جمایا..... کچھ دیر بعد ہم نے دیکھا ایک مردہ پانی پر بہتا چلا آتا ہے..... بالکل جیسے میں مردہ بن کر لیٹتی ہوں..... ہم سب حیران پریشان بھی یہ کیا ماجرا ہے..... تھوڑی دیر بعد وہ مردہ ہماری جانب آنے لگا۔ ہم سب گڑ بڑا گئیں۔ پھر پتہ ہے کیا ہوا' مردے نے قریب آ کر سر سے چادر اتاری' کھلکھلا کر ہنس پڑا اور بولا'' کیوں صاحبو! نوٹس لیا کہ نہیں.....''

یہ واقعہ سنا کر جلدی سے پیروں تلے اور سر کی جانب چادر لپیٹ کر راحیلہ کہتی..... ''یوں تھا وہ یوں.....''

اوما کا دل اس بات کو سن کر بجھ سا جاتا۔ وہ اس واقعہ کو سن کر اپنے لڑکپن میں چلی جاتی۔ جب پہاڑوں میں نہ موت کا کوئی تصور تھا نہ بچھڑنے کا..... وہ سمجھتی تھی ایک بار تو ماں باپ سے بچھڑ کر ماسی کرشنا کے دوارے آ گئے ہیں۔ اب یہاں سے نہ کہیں جانا ہے نہ کہیں آنا ہے۔ ساری عمر ایک ہی موسم ایک ہی خیال میں گزر جائے گا لیکن شوکت مغل کی طرح یہ خیال بھی سدا ساتھ نہ رہا..... زندگی کتنا کچھ نگل جاتی ہے۔

بارش کے انتظار میں کبھی کبھی راحیلہ اور اوما کھڑکی کے آگے جا کر بیٹھ جاتیں..... لیکن بالکل جزیروں کی مانند..... اوما اپنے بچھڑے بہن بھائیوں' ماں باپ اور پھر کرشنا ماتا جی ان کے پریوار کے متعلق سوچتی..... ہولے ہولے اس کا دھیان' کبھی کبھی سریندر' شوکت مغل کی طرف بھی جا نکلتا..... اس کے سارے رشتے' کبھی جھاڑی' بوٹا' درخت' جنگل نہ بن سکے۔ کہیں ان رشتوں کی سوجھ بوجھ پیدا ہونے سے پہلے ہی پنیری کی شکل میں ہی اسے جگہ جگہ اکھاڑ کر کبھی گملے میں' کبھی درخت تلے' کبھی تن تنہا اجنبی زمین میں گڑ جانے کا حکم ملتا۔ اس کی زندگی کا کچھ بھی کبھی طے نہ ہو پایا۔

راحیلہ بارش کے ساتھ ساتھ انتظار کی ایک اور شکل سے نڈھال تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اب یہ بیاہ ہو چکے۔ کہیں اس کے اندر ایک گھنٹی بجتی رہتی۔ وہ جھنجھلا جھنجھلا کر سوچتی' یہ جہیز بری کے کیا جھگڑے ہیں۔ شاہد کا امتحان کیوں اس قدر ضروری ہے۔ اب تاریخیں آگے بڑھائے جانے کا فائدہ؟..... اس کے دل میں ایک انجانا سا خوف تھا جس کا تجزیہ وہ خود نہ کر سکتی تھی.....

ایسے ہی لمحوں میں جب ان کے چہرے لمبے اور لب سلے ہوتے' کہیں سے تسنیم آ جاتی۔

''مٹھائی کھلاؤ مٹھائی.....''

''لو کس کے پاس کنواں بھرنے کی مٹھائی ہے.....''

''تو نہ سہی.....''

تسنیم کے پاس ایک ہی ٹاپک گفتگو کا تھا اور راحیلہ بھی چاہتی تھی کہ شاہد کا ذکر چلے۔ کسی نہ کسی بہانے اس کے گھر میں تو بس جہیز ہی کا چرچا تھا..... بارات مہندی کی باتیں تھیں..... شاہد کا ذکر تو نہ کوئی کرتا نہ سنتا۔

جب تسنیم چپ ہو گئی تو راحیلہ نے سلسلہ جوڑنے کی غرض سے کہا..... ''لو جی کیا ہم نہیں جانتے کہ آپ مجھے چھیڑیں گی.....''

''میں کیوں چھیڑنے لگی بھلا.....میرے پاس پہلے ہی اتنا کام ہے۔''
راحیلہ کے ہاتھ میں درشن کا خط تھا جسے وہ اوما کو دکھا دکھا کر اور چھپا چھپا کر پڑھ رہی تھی۔
''خط کس کا ہے ہاتھ میں.....''
''آپ کو کیا؟''
''پگلی بیگم مجھ سے بگاڑ کیا تو پھر تاریخ آگے سرک جائے گی.....''
راحیلہ کا جی چاہا چلا کر کہے..... ''ناں تسنیم یوں نہ کہو..... پہلے ہی میرا دل کہتا ہے کہ جوگ بھی ہو گا بھی کہ نہیں.....'' اسے بری جہیز کے قصوں سے بڑی وحشت ہوتی تھی بے انتہا.....
''درشن کا خط ہے جی.....''
اوما کھڑکی کی سل سے بندریا سی اتری اور تسنیم کے گلے میں بازو ڈال کر بولی..... ''کونسی تاریخ ہے..... تسنیم باجی.....''
''چودہ کو مہندی پندرہ کو نکاح..... رخصتی.....''
''تم اپنی سکھی درشن کو لکھو دس بارہ دن پہلے آجائے۔''
اوما نے خدشے بھری آواز میں کہا..... ''وہ بھلا کیسے آسکتی ہے پربت گھر سے..... اتنی مشکل سے تو ہم آئے ہیں.....کوئی حال ہے ٹرینوں کا.....''
''بس بس..... باتیں ہی باتیں..... مدد تو کیا کرو گی دونوں الٹا حرج میں وقت ضائع ہو گا.....اس تیرے بیاہ کی تیاریوں نے جان آفت میں ڈال رکھی..... ایک تو خود کام نہیں کرتیں پھر دوسروں کا بھی وقت ضائع کرتی ہیں.....''
تسنیم کو آنے والے بیاہ نے غبارہ بنا دیا تھا۔ وہ بغیر کسی وجہ کے اوپر سے اوپر اڑتی چلی جاتی تھی۔
''آپ تیاریاں کریں..... میں تو کالج چلی جاؤں گی چند دن بعد..... اخبار میں تھا کہ کالج کھلنے والے ہیں۔'' راحیلہ نے چھیڑنے کی غرض سے کہا۔
''جان من اب تو..... واپسی ناممکن ہے..... کچھ دنوں میں مائیوں بیٹھ جائے گی.....''
''جناب تسنیم آپا گر میں برما چلی گئی تو.....''
''اس کو دھکا دے کر برما جانا..... بلکہ دونوں کو ساتھ لے جانا..... چائے کے باغات میں ہنی مون.....''
''تسنیم آپا جان..... اس بار جب آپ کی شادی ہوگی ناں تو ہم دونوں منٹوں میں سارا جہیز تیار کر کے رکھ دیں گے..... یوں..... یوں.....'' راحیلہ نے چھیڑتے ہوئے کہا۔
تسنیم شادی پر رضامند نہیں ہوتی تھی لیکن جب بھی شادی کا ذکر چلتا وہ خوب مزے لیتی اور چھیڑنے پر خوش ہوتی۔
''لے بس میرا بیاہ ہو اشی بھی..... کھٹا کھٹ چٹا پٹ۔''
''پکی بات.....'' اوما نے ہاتھ بڑھایا۔

ہاتھ پر ہاتھ دھر کر تسنیم بولی..... "پکی بات۔"

"لو جی..... غضب دن..... آپ تو چھپی رستم نکلیں..... بھلا کون ہے وہ ایسا خوش نصیب کون ہے وہ شہزادہ؟..... ہم کالج میں ٹکریں مارتے رہے اور آپ نے سارا بندوبست بھی کر لیا؟ راحیلہ....."

"نام..... نام..... فوراً نام بتائیے فوجی ہے کہ ڈاکٹر..... وکیل ہے کہ بزنس مین....." اوما نے پوچھا۔

"ہاں جی..... یہ ناں بتائیں..... بتائیں تو یہ بتائیں لمبا ہے کہ درمیانہ..... گورا ہے کہ گندمی' گھنے بال ہیں کہ....."

تسنیم آرام سے پلنگ پر چڑھ کر گلابی دوپٹے میں گوٹے کے پھول لگانے میں مشغول تھی۔ پنکھے اور برسات کی ہوا میں دوپٹہ لرز رہا تھا۔

"بتائیں جی بتائیں....." دونوں تسنیم کے پاس گھستی ہوئی بولیں.....

"ذرا سا ستائیں' بتائیں جی بتائیں....."

اوما نے کھینچ کر دوپٹہ علیحدہ کیا اور گدگدی کرتے ہوئے بولی..... "بتائیں جی بتائیں' اب اور نہ ستائیں....."

تسنیم نے اوما کے ہاتھ پرے کر کے ہنستے ہوئے کہا....." ابھی بتاتی ہوں ابھی..... ابھی تو ہاتھ تو پرے کرو..... ناں"

"لیجیے پرے ہو گئے ہاتھ' فوراً بتائیں نام پتہ عمر..... پیشہ سب کچھ....."

"اونچی کرنے والی بات نہیں' تو کان قریب لا اوما۔"

اوما نے اپنے بائیں کان کو تسنیم کے خوبصورت دہن سے جوڑ دیا۔

"ہاں جی بتائیں۔"

تاریخ کے بندھتے ہی راحیلہ کی ساری آنکس ختم ہو گئی۔ اب اس نے سر پر گیلی چادر اوڑھ کر سونا چھوڑ دیا۔ انجانی خوشی نے اس کے پیروں میں پہیے لگا دیے۔ وہ دن میں کئی بار ابا جی کے کمرے میں لگی ہوئی خس کی ٹٹی پر پانی چھڑکتی۔ بھاگ بھاگ کر ساجدہ ماں کے کام کرتی۔ دادا ابا کے پاؤں دباتی' اوما کے کپڑے استری کر کے ہینگر پر ٹانگتی۔ تسنیم کے لیے تو وہ اردلی بن چکی تھی..... سارا دن وہ اوما کو گھسیٹتی چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف رہنے لگی۔

وہ تھی اور زمانے بھر کی باتیں۔

وہ تھی اور ان گنت کام۔

گلی میں پڑے رہنے والے کتوں کی طرح اب گرمی میں لوٹنے کا سماں گزر چکا تھا۔ اوما اسے دیکھ کر دل ہی دل میں ہنستی اور سوچتی..... کچھ لوگ مستقبل سے وابستہ ہو کر کیسے اچانک زندہ ہو جاتے ہیں! ذرا سی امید ہلکی سی روشنی سارے وجود کو اجالنے کے لیے کافی ہوتی ہے..... اوما سوچتی میں کس لیے جی رہی ہوں؟ ماتا جی کے پاس جانے کے لیے' برسوں سے بچھڑے ہوئے بہن بھائیوں سے دوبارہ ملنے کو یہ سانس آ جا رہے ہیں..... کیا ماسی کرشنا کے گھر میں بہو کے ساتھ جیون بسر کرنے کا نام مستقبل ہے؟ اگر حالات نارمل پر آ جائیں اور میں اپنی پڑھائی دوبارہ شروع کر دوں تو کیا میرا ہاتھ

بھمکھ ہے؟ اور اگر...... کہیں سے شوکت مغل اچانک گورداسپور کی اس بستی میں اتر آئے تو کیا اسے مجھے پہچاننے میں دقت ہو گی۔ کیا میں اسے دیکھ کر پرانی باتوں کے سہارے نئی خواہشوں کو جنم دینے کی اہل ہوں؟..... شوکت مغل کون ہے؟ اس نے مہارانی سیتا کی طرح سوچا..... شوکت مغل یقیناً راون ہے اور میں اگر اس کے متعلق سوچوں گی تو دھرم لکیر کو پاٹنے کا خواب دیکھوں گی..... وہ ہولے ہولے سانس لیتی سوچتی دھرم کیا چیز ہے؟ اندر کے کارن کا جواب..... باہر کے Survival کا نام..... یا جنم جنم جینے کی خواہش..... وہ سوچتے ہوئے من مگن میں آگ لگتے دیکھتی اور اس منظر سے ٹکرا کر بلکتی..... یہاں تو آنے والا سے ہی ناتا پربت سمان ہے' کون کرودھی جنم جنم جینے کی سوچ سکتا ہے۔ اسے امید کی وہ تصویر یاد آ جاتی جو سرفراز چاچا کے کمرے میں ٹنگی تھی..... اندھی عورت کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا چکارا..... جہاں صحرا ہے' وہاں چشمے کا خواب.....

اوما نے سلیپر پہنے اور نچلی منزل کی طرف چلی۔ اسے خیال آیا کہ اس وقت سرفراز چاچا گھر پر نہیں ہوتے۔ ان کا یہ وقت کلینک میں گزرتا ہے۔ میں ایک نظر امید کی تصویر کو دیکھ آؤں۔ راحیلہ غسلخانے میں اونچے اونچے گا رہی تھی۔ ساون کے نظارے ہیں۔ لالا..... لالا.....

اوما نے سر جھٹک کر اپنے کو سمجھانے کے انداز میں سوچا۔ میں راحیلہ سے حسد کرتی ہوں۔ اس کی محبت سے جو مستقبل میں اس کے لیے یقینی ہے۔ اس قدر قریب ہونے کے باوجود میں اسے یہ محبت ملتے خوش نہیں ہو سکتی..... یہ خیال بھی میرے لیے دکھ کا باعث ہے کہ بغیر ہاتھ ہلائے دکھ بھوگے راحیلہ محبت کے پالنے میں شاہد کے ساتھ جھولے..... ہے بھگوان انسان کے اندر کی موہ مایا کیسی سوت کی انی ہے؟ کبھی سلجھ ہی نہیں پاتی..... دیکھا ان دیکھا' جانا نہ جانا سب کچھ گتھم گتھا؟..... تو نے کیا سوچ کر یہ پرتھوی بنائی۔ کیا سوچ کر اس میں انسان کو بسایا..... کیا سوچ کر اس کے من میں کلپنا کا یہ دریا بہایا۔ وہ بغیر اجازت سرفراز چاچا کے دفتر میں داخل ہو گئی۔

دفتروں والی میز کے عقب میں گھومنے والی کرسی پر ڈاکٹر سرفراز بیٹھے کان میں ماچس کی تیلی پھیر رہے تھے۔

''آؤ..... آؤ..... اوما بیٹی کیسے آنا ہوا.....''

اوما یکدم ٹھٹک گئی۔ اب اسے یہ بتانا احمق سا لگا کہ وہ امید کی تصویر دیکھنے آئی ہے.....

'' کچھ نہیں چاچا جی! وہ ذرا میرے پیٹ میں درد ہو رہا تھا۔ سوچا آپ سے کوئی دوا لے لوں جی.....''

''آؤ آؤ..... عجیب اتفاق ہے میرے پیٹ میں بھی درد ہو رہا ہے..... کریلوں میں یہ خوبی ہے کہ آدمی کھا زیادہ جاتا ہے..... آؤ یہاں بیٹھو میں ابھی تمہیں کارمینیٹو مکسچر بنا دیتا ہوں.....''

وہ چپ چاپ میز کے سامنے دھری کین کی چوکور کرسی پر بیٹھ گئی۔ پتہ نہیں چاچا سرفراز پشت سے بالکل شوکت مغل لگ رہے تھے یا برسوں وہ اندر تیاری تھی اس کا جی کسی سے اندر کی باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔

''میں نے تو کریلے نہیں کھائے چاچا جی..... میں نے تو اپنے لیے علیحدہ بھنڈی بنائی تھی۔''

ڈاکٹر سرفراز کو یکدم یاد آیا کہ اوما تو ہندو تھی اور جس دن سے وہ راحیلہ کے ساتھ آئی تھی اپنا کھانا رسوئی میں خود پکاتی تھی..... روز ساجدہ وہاں اس کی سبزی ترکاری سوہن سنگھ کے ہاتھوں منگواتی تھیں۔ پتہ نہیں اس کے برتن بھی شاید علیحدہ تھے۔

''تمہارے پتا جی کا کوئی خط آیا.....'' مکسچر بناتے ہوئے ڈاکٹر صاحب بولے۔

''دو خط برما کے پتے پر لکھے ہیں' کوئی جواب نہیں ملا.....''

''اچھا.....''

ڈاکٹر صاحب کو معلوم تھا کہ اوما کی تین بڑی بہنیں اور دو چھوٹی بہنیں برما میں ہی تھیں' جہاں چندر سین صاحب کا ایک بہت بڑا زرعی فارم تھا' چائے کا کارخانہ تھا.....

''اور ہیرو.....''

''ہیرو تو جی چار سال سے باہر ہے' جاپان میں.....''

''اسے خط لکھا تم نے؟.....''

''چاچا جی.....'' وہ چپ ہو گئی۔

''جب وہ فوج کے ساتھ آسام گیا ناں تو وہاں پتہ نہیں اسے کیا ہوا' بھگوڑا ہو گیا..... پہلے تو کچھ دن فارم پر رہا۔ پھر ایک رات گم ہو گیا۔ ایک رقعہ لکھ کر رکھ گیا جی۔''

''تمہیں کیسے پتہ چلا.....''

''پتا جی نے اپنے خط میں لکھا تھا جی..... کہ ہیرو کچھ دنوں کے لیے برما میں آیا تھا ماتا جی کے پاس۔ پھر گم ہو گیا..... اسی لیے تو ایک بار پھر سب برما چلے گئے ہیں۔ ہم جی..... آپ کو تو پتہ ہے چھ بہنوں کا وہ ایک ہی بھائی ہے..... بس فوج چھوڑ دی اس نے اور جاپان چلا گیا..... اب پتا جی سارا سارا دن اسے ڈھونڈتے ہیں اور اس کا کوئی پتہ نہیں.....''

''اور وہ آخری رقعہ..... وہ کیا تھا۔''

''جی..... چاچا جی وہ جی رقعے میں لکھا تھا میں اب انگریز کی جنگ نہیں لڑ سکتا۔ میں نیتا جی سبھاش چندر بوس کی فوج کا کمانڈو بن کر لڑوں گا..... اگر جنگ ہی میرا بھوشیہ ہے تو میں کیوں نہ اپنے وطن کو آزاد کرانے کی کوشش کروں..... یہ..... یہ آدرشی لوگ یہ کیوں نہیں سمجھتے چاچا جی کہ انہیں اپنی جان گنوانے کا تو حق ہے پر کسی اور کی زندگی سے کھیلنے کا حق نہیں۔ اب ہم آٹھ بندے تڑپتے ہیں ہیرو کے لیے.....''

اس گھر کے نوجوانوں کو علم نہ تھا کہ خلافت تحریک کانگریس میں ضم ہو گئی۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ رولٹ ایکٹ کو سیاہ قانون کیوں پکارا جاتا ہے۔ سوراج کی پکار کہاں سے آ رہی ہے۔

ستیہ گرہ کیا چیز ہے؟

مسلمانوں نے انگریز کی پہلی جنگ عظیم میں جو مدد کی تھی اس کا فائدہ کس کو پہنچا؟

قائداعظم سیلف گورنمنٹ پر کیوں اصرار کر رہے تھے؟

کسی کو علم نہ تھا کہ آگے چل کر آزادی کی خواہش کیا رنگ لانے والی تھی؟ اس گھر میں زندگی اپنے عہد کی سست رفتاری سے چل رہی تھی۔ فروعی اور غیر ضروری چیزیں اہم تھیں۔ لوگ چھوٹے چھوٹے واقعات اور بہت معمولی باتوں کے سہارے زندہ اور خوش تھے۔
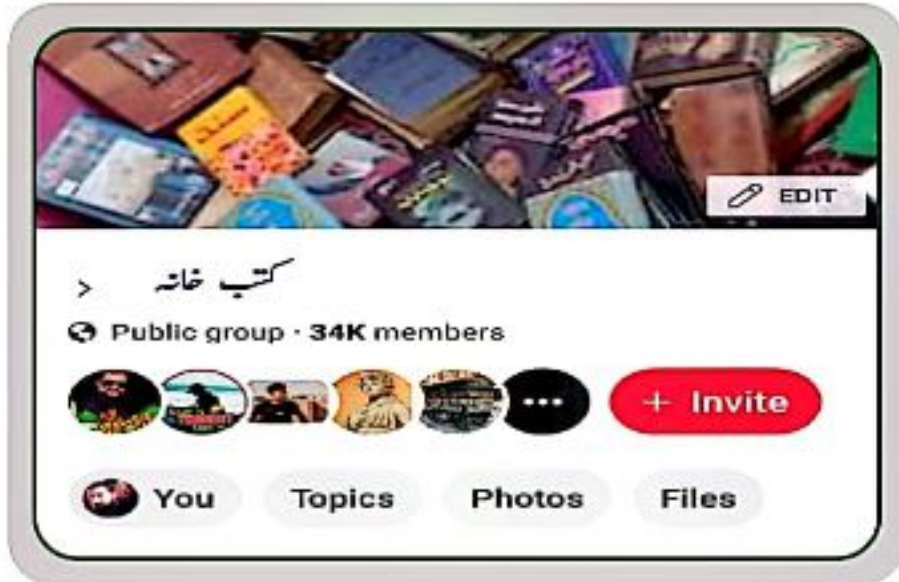
سرو کے درختوں میں سے چاند بڑی آب و تاب سے ابھرا تھا۔ اس کی روشنی میں سارا منظر گہرے سمندر سا نظر آتا تھا۔ ڈاکٹر سرفراز مغل کی پرانی فورڈ ماڈل 1927 ، پورچ میں کھڑی تھی۔ چاند ستارے درخت سب چپ تھے۔ اگست کی یہ خاموش رات سانس روکے تکتی تھی۔ ملگجے اندھیرے میں چند کرسیاں لان میں بے ترتیب پڑی تھیں۔ لگتا تھا اس پُراسرار رات میں ابھی پریوں کا مجرا ہوگا اور دور دور معطر خوشبوئیں جائیں گی۔

ابھی وقت سہانا تھا۔ اس کی رسی دراز تھی..... لوگوں نے کوارٹر گھنٹہ اور لمحوں کا حساب کرنا نہ سیکھا تھا۔ وہ وقت کو بے دریغ ضائع کرتے تھے۔ لوگ باگ آرام سے بیٹھ کر باتیں کیا کرتے۔ فارغ وقت گزارنے کے لیے باتوں سے بہتر کوئی مشغلہ نہ تھا۔ ٹیلی ویژن ایجاد نہ ہوا تھا۔ ریڈیو ابھی شاذ ہی گھروں میں در آیا تھا۔ کوٹھے کی منڈیر پر دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ وہ دن چھپے سے یہیں جمی بیٹھی تھیں۔ انہوں نے شام کو رات کی آغوش میں گم ہوتے دیکھا۔ انہوں نے شفق کی لالی کو سرمئی دھندلکوں سے رات کے اندھیرے میں منہ چھپاتے دیکھا۔ سخت گرمی اور بند فضا کے باوجود وہ دونوں وہی پنکھے جھلتی کئی گھنٹوں سے منڈیر پر بیٹھی تھیں۔ بار بار وہ پٹوں سے پسینہ پونچھتی تھیں اور غیر ضروری باتیں دوہرائے جاتیں۔ آنکھوں کا کاجل رخساروں پر بہہ نکلا تھا۔ قمیصیں پسینے کی وجہ سے کندھوں سے چپک گئی تھیں..... سانس گرم تھے۔

لیکن ان دونوں کا دھیان نہ گرمی کی طرف تھا..... نہ انہیں علم تھا کہ یہ اگست کا مہینہ ہے اور کوئی اہم واقعہ ہونے والا ہے..... انہیں یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ہندوستان میں ایک بڑا انقلاب آنے والا ہے۔ ان دونوں کا اندازِ گفتگو ہم عمر لڑکیوں کی طرح بے تکلف اور سادہ تھا۔ وہ اشیا کے متعلق نظریات سے متعلق پسند ناپسند کے بارے میں بات نہیں کرتی تھیں۔ ابھی ان کے اردگرد لوگ تھے اور وہ لوگوں میں زندہ تھیں۔

"چھی..... چھی..... ایسے نہیں کہا کرتے ہاں....." اوما نے پکا منہ بنا کر کہا۔

"تمہیں کیا پتہ وہ ایسا ہی ہے نامعقول..... بھنچر....."

"تمہارے دھیان کا سارا قصور ہے۔ ماتا جی کہتی ہیں۔ جیسی سوچ رکھو گی ویسا نتیجہ پاؤ گی۔"

اوما تائی ماتا جی ایسے کہتی تھی کہ بیچ میں سے الف غائب ہو جاتا۔

"بھلا تمہیں..... تمہیں اس میں کیا نظر آتا ہے.....؟"

"ہم کائستھ لوگ ہیں۔ ہمیں کشمیری اچھے لگتے ہیں..... گورے گورے..... پڑھے لکھے دوشالے اوڑھے..... زمین پر جن کا بوجھ نہیں پڑتا۔"

"چلو ہٹو مجھے معلوم ہے وہ..... مجھ سے شادی نہیں کرے گا..... وہ عابدہ کو پسند کرتا ہے۔"

"کرنے دے..... کرنے دے بات تو ادھر چل رہی ناں..... ہائے رام کیسی اوت ہے تو بھی راحیلہ....."

"اچھا سخی جا..... ناراض نہ ہو جانا....."

"نہیں جی ناراض کیا ہونا ہے....."

"سوچ لے دل کڑا کر لے....."

یونہی راحیلہ کا دل پھڑ پھڑایا..... کہیں؟ کہیں شادی نہ ہو اور کہیں تسنیم اسی لیے زور شور سے تیاریاں نہ کر رہی

ہوں..... منحوس بات کو اس دور تک سوچنا راحیلہ ہی کا خاصہ تھا۔

"دل کڑا کر لے....."

"ہاں جی کر لیا....."

"پھر سوچ لے....."

"سوچ لیا....."

اب اوما بھی کچھ ڈھیلی سی پڑ گئی جیسے بنی ٹھنی کنچنی ناچ بغیر لباس اتارنے لگے۔

"اب بتا بھی چکیں تسنیم....."

"ذرا قریب ہو اور قریب..... وہ تیرے جتنا لمبا ہے..... رنگ بھی تیرا جیسا کھلتا ہوا....."

"اچھا....."

"بولتا ہے تو گال میں بائیں طرف گڑھا پڑتا ہے....."

"کیا اتفاق ہے..... میری طرح ناں....." اوما بولی۔

"بالکل....."

"کیا نام ہے اس کا..... پلیز جلدی بتائیں تسنیم آپا..... جلدی....."

"اس کا نام ہے اوما کسم نالنی..... میرا بیاہ تو اوما سے ہوگا....."

اوما اور راحیلہ دونوں نے مل کر تسنیم کو گدگدی شروع کر دی..... شفون کا دوپٹہ گوٹے سمیت فرش پر جا گرا..... اور تسنیم پلنگ پر ہائے اوئی کرتی ہنستی روتی ہائیسٹیکل چلانے لگی۔ اوما اور راحیلہ کے ہاتھ ہر جگہ گدگدا رہے تھے۔ ساتھ وہ بڑی شوخی سے کہہ رہی تھیں..... "ہم سے مذاق۔ ہم سے۔ ہم چھوڑیں گے نہیں....."

"خدا کے لیے معاف کر دو..... راحیلہ! میں ساجدہ ماں سے کہوں گی اوما کی بچی باز آ جا..... خدا کے لیے بند کرو..... خدا کے لیے گدگدانا بند کرو۔"

شاید وہ دونوں دیر تک گدگداتی رہتیں لیکن اس وقت شرائے کی بارش کا پہلا ریلا کھڑکی سے اندر جھانک کر دیکھنے لگا۔

"چل باہر چلیں..... آ جا راحیلہ بارش بارش....."

تسنیم کو گھسیٹتی بارش بارش پکارتیں وہ لمبے برآمدے میں پہنچ گئیں۔ بارش کے شرائے برآمدے میں گر رہے تھے۔ پورچ کا پرنالہ بوگن ولا کی بیل پر برساتی نالے کی طرح بہہ رہا تھا۔ بوٹے درخت بیلیں جھول رہی تھیں۔

"خالہ جی بارش..... امی جی بارش....."

پانی چھاجوں برس رہا تھا۔ درختوں کے پتے منہ دھلانے پر بچوں کی طرح احتجاج کر رہے تھے۔ موتیا اور چنبیلی کے ہلکے پھول مٹی میں لتھڑے کیچڑ میں دھنسنے لگے تھے۔ جھاڑیاں بارش میں یوں نکھر رہی تھیں گویا کسی ساؤتھ انڈین کا بڑا سا جوڑا کھلنے کو ہو۔

''چل ہٹ ہم نہیں ملتے ایسے ڈانواں ڈول قسم کے لوگوں سے..... وہ عابدہ کا ہو جائے اچھا ہے۔''
اوما مسکرانے لگی..... اسے چھیڑنے میں اور راحیلہ کو چھڑے رہنے میں مزہ آ رہا تھا۔ اس چھیڑ خانی میں ملنے ملانے سے بھی زیادہ لطف تھا اور فراق کی یہ صورت وصل سے آگے نکل گئی۔

''چل اچھا نہ مل..... اور جو ابھی تمہیں خبر ملے کہ شاہد بیمار ہے تو؟..... تو بھی نہ جاؤ گی.....'' گدگدا کر اوما نے پوچھا۔ ''بولو تو بھی نہ جاؤ گی؟..... اشانت تو نہ ہو جاؤ گی۔''

''ناں..... آں.....'' آہستہ سے راحیلہ نے جواب دیا۔

''کھاؤ اللہ کی قسم.....''

''نہیں کھاتے.....''

''تو پھر چل سیدھی طرح نیچے ہے ناں پگلی..... مجھے گرمی میں مار دیا۔ ڈشٹ نے۔''

''نہیں نہیں نہیں مجھے نہیں جانا نیچے یا کہیں اور..... دیکھو ناں بستر لگے ہیں آ سو جائیں.....''

''اگر میں اس کا واسطہ دوں تو بھی نہیں.....''

''.........''

''بول ناں..... تو بھی نہیں ناں.....''

''اس کا واسطہ درمیان کیوں آئے۔'' راحیلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''چل پھر اسی کا واسطہ..... چل ناں..... دو بار پہلے بھی آ چکا ہے تو روٹھ جاتی ہے تو اس کا اتا سامنہ نکل آتا ہے..... چل راحیلہ..... بھگوان کی سوگند اگر تو اس سے نہ ملی تو میں فوراً گھر چلی جاؤں گی ابھی۔''

راحیلہ دھیرے دھیرے اوما کے پیچھے گھسٹنے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے نٹ کھٹ بچے کو باپ زبردستی سکول لے جا رہا ہو..... وہ دونوں چھت پر بچھی چارپائیوں میں سے گزرتی برساتی میں آئیں اور پھر سیڑھیوں کی بتی جلا کر نیچے اترنے لگیں۔ گیلری میں بڑی روشنی تھی' یکدم یوں اجالے میں آ جانے کے باعث ان کی آنکھیں نہ کھلتی تھیں۔ راحیلہ نے اپنا پنکھا آنکھوں کے سامنے کر لیا اور اوما کا ہاتھ خوب پکا پکڑ کر گھسٹنے لگی۔

راحیلہ خوبصورت نہیں تھی۔ وہ مردوں کی طرح لمبی تھی' اس کا جسم دبلا پتلا اور کندھے خمیدہ تھے۔ کبھی کبھی جب وہ ستون کا یا کسی ریلنگ کا سہارا لے کر کھڑی ہوتی تو اس کے نازک جسم کی خوبصورتی نظر آتی۔ ویسے بھی ابھی دبلی' سوکھی مریل لڑکیاں حسن کا مرقع نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ بھرے بھرے مدور جسموں والی لڑکیاں جو اُتھل پتھل نظر آتی ہوں' من پسند تھیں۔ راحیلہ کو سہارے لے کر کھڑے ہونے کی عادت نہ تھی۔ اسی لیے ہمیشہ اس میں نسائیت کم نظر آئی۔

راحیلہ کا رنگ سرخ و سپید تھا۔ آنکھوں کے نیچے ایسے نیلے سیاہ حلقے تھے جو روشنی میں اور بھی نمایاں ہو جاتے۔ اس کی بھوری بھوری آنکھیں کیفیتوں سے آباد نہ تھیں۔ پلکیں لمبی تھیں لیکن بھوری سبزی ہونے کی وجہ سے کبھی دبیز نہ لگیں۔ کبھی کبھی جب وہ جوش سے باتیں کرتی تو اس کے لرزتے نتھنوں پر ہلکا ہلکا پسینہ آ جاتا اور بات جب اپنی مرضی کے مطابق منوا نہ سکتی تو سختی سے ہونٹ بھینچ لیتی۔

سب سے خوبصورت چیز راحیلہ کا قہقہہ تھا..... سنجیدگی' تحکم بلاوجہ ٹھہراؤ کے بند توڑ دینے والا قہقہہ..... کبوتروں کی اڑان جیسا آزاد معصوم.....

یوں محسوس ہوتا اگر کبھی کسی حالات میں راحیلہ قہقہہ نہ لگا سکی.....تو شاید اس کی ساری خوبصورتی ہی ختم ہو جائے گی!

ڈاکٹر صاحب الماریوں میں نئے اخبار بچھا رہے تھے۔ پھر ان کی نگاہ ایک خبر پر پڑ گئی اور وہ اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ مریض کی اندرونی بھڑاس نکالتے۔ ابھی یہ نکتہ نظر عام نہ ہوا تھا کہ بیماری عام طور پر psychosomabie ہوا کرتی۔ از خود وہ ایک نتیجے پر پہنچے تھے کہ بیماری دو طور کی ہے۔ ایک تو جسمانی اور دوسرے اندرونی.....اندرونی بیماری کا تعلق روح سے ہوتا ہے' یہ ذہن سے پیدا ہو کہ قلب سے جذبات کے باعث بیماری نے جنم لیا ہو یا روح کی ماندگی سے پیدا ہوئی ہو اندرونی بیماری ہمیشہ جسم پر اثر انداز ہوتی ہے اور اگر جسم درماندگی کا شکار ہو جائے تو پھر روح پر اس کے اثرات ناگزیر ہوتے ہیں۔ وہ سائیکالوجی کے شیدائی نہ تھے لیکن اپنی پریکٹس کے دوران انہوں نے اپنا ایک نسخہ صحت اختراع کیا تھا کہ جسمانی بیماریوں میں وہ روحانی علاج کی طرف آمادہ کرتے یعنی دعا' صدقہ خیرات کی طرف توجہ دلاتے اور اگر ان کو یقین ہو جاتا کہ مریض اندر کی سطح پر بیمار ہے تو سیر' آب و ہوا کی تبدیلی' سینما بازار کی طرف راغب کرتے.....

ڈاکٹر سرفراز مغل مریض کے نکتہ نظر کو بہت غور سے سنتے۔ ابھی مریضوں کی قطاریں نہ بڑھی تھیں۔ ڈاکٹر بھی فراغت سے حال احوال سن سکتے تھے' نبض پر ہاتھ رکھ کر تھرمامیٹر منہ میں ڈال کر اسٹیتھو سکوپ لگاتے ہوئے وہ مسکراتے اور مریض کو ایٹ ایز کرنے کی کوشش کرتے۔ ابھی ذہنی علاج کے علیحدہ کلینک اور ڈاکٹر نہیں تھے۔ ڈاکٹر سرفراز سے فکر مند مریض عموماً محسوس کرتا کہ وہ ہلکا پھلکا ہو گیا ہے اور اس کی بیماری کچھ ایسی خطرناک نہیں.....

شہر میں کرفیو لگا تھا اور بسوں کی ہڑتال تھی۔ ڈاکٹر صاحب اپنے ذاتی کلینک میں بیٹھے ہری جن اخبار پڑھ رہے تھے۔ شروع سے انہوں نے اپنی زندگی کا ایک شعار بنا رکھا تھا کہ اپنے سے مختلف سوچ رکھنے والے کی بات ضرور سنو۔ اس کی رائے سن کر وہ تصویر کے دونوں رخ سمجھنے پر قادر ہو جاتے۔ دادا ابراہیم اس بات پر متفق نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اپنے مسلک' خیال یا مذہب کی عافیت ہی اسی میں تھی کہ آدمی اپنے جیسے لوگوں سے میل جول رکھے اور اپنے آپ کو بلاوجہ ٹیسٹ میں نہ ڈالے لیکن ڈاکٹر صاحب کسی ایسی مضبوط دھات کے بنے ہوئے تھے جن پر کوئی ایسڈ کام نہ کرتا تھا۔ وہ جب بھی حل ہوتے محبت کے محلول میں ہی حل ہوتے!

ڈاکٹر سرفراز مغل کے ہاتھ میں ہری جن کا پرانا اخبار تھا جو وہ اپنی الماری میں لگاتے لگاتے رک گئے تھے۔ اس اخبار کے ایڈیٹر پیارے لال تھے اور یہ احمد آباد سے شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے سر کو جھٹک کر سوچا کہ موہن لعل گاندھی کس نہج پر سوچ رہے ہیں' گاندھی نے لکھا تھا۔

''اردو.....؟ کیا یہ دونوں کی زبان ہے۔''

''آپ اس بات کے لیے بہت کوشاں ہیں کہ سارے ہندوستانی خاص کر وہ ہندو جو آپ کے قریب ہیں'

اردو سیکھیں۔ میں پوچھتا ہوں کیا کوئی مسلمان بھی یہ کوشش کر رہا ہے کہ مسلمانوں کو ہندی آ جائے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو آپ کی سعی کا یہی نتیجہ نکلے گا کہ اردو دونوں قوموں کی زبان ہو جائے گی اور ہندی فقط ہندوؤں کے تال میل کی زبان رہ جائے گی..... کیا آپ کی یہ سروس ہندی کی حق تلفی نہیں؟"

باپو گاندھی کی بات میں سے ڈاکٹر صاحب کو تعصب کی خوشبو آئی۔ وہ بھی ہندی کو قومی زبان بنانے پر مجبور تھے اور دیوناگری رسم الخط سے محبت کرتے تھے۔ گو بظاہر اس کا خیال تھا کہ ہندوستان میں ایک نئی زبان آہستہ آہستہ پنپ جائے گی جو اردو اور ہندی دونوں سے مستعار لے کر بنے گی..... لیکن اس کا عوامی رسم الخط کیا ہوگا۔ اس کے متعلق گاندھی جی نے کچھ واضح بات نہ کی تھی۔

اخبار پڑھتے پڑھتے یکدم ڈاکٹر صاحب پر منکشف ہوا کہ برصغیر میں رہنے والی قوموں کو ایک بڑی بیماری کا سامنا تھا۔ اگر وہ روحانی طور پر تندرست ہوتے تو 1857ء میں جنگ آزادی کا مثبت نتیجہ نکلتا۔ ہندو جاتی کے اندر کہیں بہت اندر اس کی مجموعی غیر شعوری سطح پر مسلمان کی نفرت موجود تھی۔ ایسی نفرت جو محکوم کو حاکم سے مجبور کو صاحب اختیار سے نیگرو کو سفید فام سے عورت کو مرد سے ہوتی ہے۔ ایسی نفرت جو صدیوں سے چھن چھن کر مصفّیٰ ہو کر جڑ تو موں کی سطح پر موجود رہتی ہے۔ گو بظاہر یہ نظر نہ آئے لیکن کہیں نہ کہیں Collective Conciousness میں اس کا Reservoir موجود ہوتا ہے۔ ادھر مسلمانوں کی سائیکی میں بت پرستوں سے میل جول آواگون پر اعتقاد رکھنے والوں سے دوستی اور ایک خدا کو مان کر ان گنت خداؤں کو پوجنے والوں سے قربت نے بڑا احساس جرم کہیں اندر ہی اندر پیدا کر دیا تھا۔ وہ بادشاہ اکبر بن کر دینِ الٰہی تو جاری کر سکتے تھے۔ بظاہر بڑے لبرل ہو سکتے تھے لیکن اپنے اندر کی فضا کو تبدیل نہ کر سکتے تھے۔ راجپوت رانیاں گھروں میں بسا کر مغل بادشاہوں نے اس بات کا ثبوت تو بہم پہنچایا تھا کہ اسلام میں اکراہ نہیں..... لیکن وہ اس بات کو اپنے اندر شانت نہ کر سکتے تھے کہ جہاد کا بھی ایک حکم ہے اور وہ ایسے ہی لوگوں کو سیدھے راستے پر لانے کا حکم ہے جو بت پرست بھی ہوں اور روزِ قیامت پر ایمان نہ رکھتے ہوں۔

ڈاکٹر سرفراز مغل جو برس ہا برس کانگریسی رہ چکے تھے جن کا ایمان رہا تھا کہ یکجہتی اور اتفاق میں ہی ہندوستان کی فلاح ہے ہولے ہولے سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ وہ سوچنے لگے تھے زبان کا اور وہ بھی رسم الخط کا تصفیہ ہی ممکن نہیں اور بڑے بڑے لیڈر خاص کر باپو جی ہندی کو بچانے کی سوچ رہے ہیں۔ اکثریت کا راج اس لیے قائم نہیں کر رہے کہ انہیں جمہوریت کا خیال ہے بلکہ جمہوریت کو ان کے نظریے کی مضبوطی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے تو بالآخر قائداعظم کو بھی راستہ تبدیل کرنا پڑا۔

☆☆☆

اپنی کھڑکی کی چٹخنی ڈھیلی تھی۔ پٹ پٹاخ سے کھل گیا۔ تیز ہوا کا جھونکا تھوڑا سا کسمسایا۔ پھر سارا پٹ کھل گیا۔ پردہ اڑا تو اپنی لپیٹ میں گلدان بھی اوندھا گراتا گیا۔ پانی پھیل کر کتابوں کی جانب گرا اور پھر آہستہ آہستہ فرش کی شطرنجی پر گرنے لگا۔ پھول بے ترتیبی سے پھڑکے اور مرغ بسمل کی طرح میز پر بکھر گئے۔ موتیے کے چند پھولوں نے تیز ہوا کے خلاف احتجاج کیا اور ٹہنیوں سے علیحدہ ہو کر گر گئیں۔ دیوار کے ساتھ لگا کیلنڈر پھڑ پھڑانے لگا۔ جو شیفون کا باریک دوپٹہ پلنگ پر

سوکھنے کے لیے راحیلہ نے ڈالا تھا' وہ بگولے کی سی تیزی سے فرش پر گرا اور رول کرتا ہوا غسلخانے کی جانب کھلنے لگا.....
راحیلہ نے اٹھ کر کھڑکی بند کرنا چاہی تو ہوا میں تندی کے باعث اس سے پٹ ملائے نہ جا سکے۔
برسات کی پہلی بارش..... آسمان پر گھیرے اوڑے سیاہ بادل رعونت سے گرجے مختلف اشکال میں بدلے ساری دھرتی کو سورج سے پناہ دیتے وہ بدلتے بکھرتے اڑتے جا رہے تھے۔ صبح تک تھکی بدلیاں ادھر اُدھر پروں کی طرح نیلے آسمان میں تیر رہی تھیں۔ اب مون سون کے بادل پانی سے لدے گھٹاؤں کا روپ دھارے سورج گرہن کی سی روشنی پیدا کرتے آسمان پر چھائے تھے..... پہلے راحیلہ کا ارادہ کھڑکی بند کر دینے کا تھا' پھر اس نے دونوں پٹ پورے کھول دیے۔ کمرے کا حبس اور راحیلہ کا طیش دونوں کم ہونے لگے۔ باہر پانی کے بڑے بڑے چھینٹے بتاشوں کی طرح گرنے لگے.....
تسنیم نے دروازے کا پٹ کھول کر کہا..... ''تو بہ پورے دس تولے گوٹا ایک دوپٹے پر' میں کہتی ہوں راحیلہ..... یہ دوپٹہ تو لوہے کی چادر بن جائے گا.....''
راحیلہ نے کھڑکی میں سے آنے والی ہوا کی جانب رخ کر لیا۔ اس کے براؤن ریشمی بال کیلنڈر کی طرح ہوا میں اڑنے لگے..... اس وقت وہ ہوا کے ساتھ ہی اڑ جانا چاہتی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ لوہے کی چادر اٹھا کر بھی اڑ سکتی ہے.....
پہلی بارش تو آ بھی گئی تھی..... اب وقت ہی کتنا رہ گیا تھا۔
اور اگر اس روز بارش ہو گئی تو شامیانے..... ان کے نیچے بھاگتے پھرتے ابا جی.....
لو میں بھی کیا منحوس ہوں' کبھی اچھی بات سوچ ہی نہیں سکتی۔ ہمیشہ منحوس خیالوں میں گھری رہتی ہوں۔ بھلا پھولوں سے لدی کار سے بارش کا کیا بیر؟ دولہے کے گلے کا ہار بھگونے سے بارش کو کیا ملے گا؟
اوما نے غسلخانے سے نکل کر لمبی سانس لی..... ''پنکھا بند کر دوں..... ٹھنڈی ہوا آئے گی.....''
تسنیم آپا اپنے کام کی اہمیت کے باعث بہت دھونسی بیچ بن چکی تھیں..... ''ناں ناں اوما بڑا پسینہ آ رہا ہے۔ اوپر سے شلوان کا گلابی دوپٹہ..... بھئی بتاؤ ایک ایک چھینٹا اور لگا دوں کہ بس؟''
''یہ ساجدہ ماں کا ڈیپارٹمنٹ ہے' ان سے پوچھیے پلیز.....'' راحیلہ بولی۔
''تسنیم آپا..... جو کہیں پنکھے نہ ہوتے تو؟'' اوما نے سوال کیا۔ وہ ہمیشہ تسنیم کی اہمیت بھری گفتگو میں کھنڈت ڈال دیتی۔
''تو کیا جب آدمی کو پنکھے کی عادت نہ ہوتی تو خود بخود دھڑے سے جیتا چلا جاتا.....''
''تو آپ کا مطلب ہے کہ لوگ مرتو نہ جاتے' جیتے ہی رہتے ناں۔'' اوما بولی۔
تسنیم ذرا سی بددل ہو کر کہنے لگی..... ''تم دونوں کو بس ایک ہی تکلیف ہے۔ سارا دن کوئی کام نہیں۔ کچھ ادھیڑ کر سیا کرو.....''
''لائیے یہ کرن ادھیڑ دوں.....'' اوما نے گوٹا لہری گلابی شفون کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
پہلے اوما اور راحیلہ جوتیوں سمیت بارش میں باہر نکل گئیں۔ بارش کے تواتر نے ان کے بال اور کپڑے بھگو کر تن

سے لگا دیئے اور ان کے جسم اچانک بے نقاب ہو گئے۔ تسنیم نے برآمدے سے باہر ہاتھ نکال کر ہتھیلی میں بوندیں جمع کیں اور زور سے چلائی..... "واپس آؤ نکمیوں..... بے وقوفو..... سردی لگ جائے گی....."

بارش کے تھپیڑے ان کے بدن پر منہ پر پڑ رہے تھے۔

"گرمی دانے ٹھیک ہو جائیں گے تسنیم آپا۔" راحیلہ چلائی۔

"سردی لگ جائے گی اندر آؤ..... "تسنیم نے چلا کر کہا۔

"سردی نہیں ہے..... گرمی ہے آپ بھی آ جائیں....." اوما چلائی۔

"نمونیا ہو جائے گا....." تسنیم نے پھر کہا۔

اس وقت مالی اور خانساماں کے بچے بھی لان میں آ کر نہانے اور چیخیں مارنے لگے..... برساتوں میں بارش میں نہانے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ ابھی تھرڈ ورلڈ سوئمنگ پول اور ایئر کنڈیشن کی عیاشی سے متعارف نہ ہوا تھا۔ جب بھی برساتیں تپتیں گرمی سے گھبرائے لوگ باہر نکلتے۔ غریب لوگوں کی اولاد سڑکوں پر دندناتی پھرتی۔ ان کی مائیں بچوں کو منع کرنے کے بہانے پیچھے بھاگتی نہاتیں۔ پردے دار خواتین گھروں کے صحن اور لانوں میں مینہ کے تراٹوں میں بھیگتیں..... اوما اور راحیلہ کا موڈ بھی تو اتر کی بارش نے توڑ دیا تھا۔ وہ دونوں بچوں کی طرح ہلڑ بازی مچا رہی تھیں۔ تسنیم چونکہ زکام سے زیادہ کسی بیماری میں کبھی مبتلا نہ ہوئی تھی۔ وہ چلا چلا کر بولی..... "زکام ہو جائے گا زکام..... اب واپس آ جاؤ..... ٹھنڈ لگ جائے گی۔"

اوما نے بھیگی ہوئی راحیلہ پر نظر ڈالی۔ اس کے دوپٹے کی چنٹ کھل گئی تھی۔ گلابی رنگ جا بجا چھوٹ کر قمیض پر اتر آیا تھا۔ پلکیں بھیگ جانے پر آنکھوں میں اور بھی روشنی آ گئی تھی۔ بھیگے کپڑوں میں اس کے جسم کے سارے موزوں خطوط ابھر آئے تھے اور وہ وینس کے مجسمے کی طرح سڈول نظر آتی تھی..... اس لاابالی سی لڑکی پر کوئی کب تک جان چھڑکتا رہے گا؟ شاید جنم جنم تک۔

"بھائی اب آ جاؤ تمہارے سسرال والے کیا کہیں گے۔ لڑکی کچی برف کھاتی ہے اور بارش میں نہاتی ہے۔"

سسرال کے نام پر راحیلہ ہولے ہولے واپس برآمدے کی طرف لوٹنے لگی۔ اس وقت سر پر بوری لیے ہاتھ میں ڈاکٹر صاحب کا بیگ تھامے سامنے سے چپڑاسی بھاگتا نظر آیا۔

"چھتری بیگم صاحب۔ چھتری صاحب آ رہے ہیں جی..... ڈاکٹر صاحب جی....." چپڑاسی اس قدر عجلت میں تھا کہ اگر وہ خود چھتری بن سکتا تو کبھی دریغ نہ کرتا۔ تسنیم بھاگ کر اندر چھتری لینے گئی۔ اس اثناء میں ڈاکٹر صاحب بھیگتے ہوئے پھاٹک پر نمودار ہوئے۔ ان کی پتلون جو انہوں نے کیچڑ سے محفوظ ہونے کے لیے اوپر ٹانگ رکھی تھی۔ گارے میں لت پت تھی۔ گیلے بال گالوں سے چپکے ہوئے تھے۔ پانی میں شرابور کوٹ ادھر اُدھر لٹک رہا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی اوما اور راحیلہ بارش سے نکل برآمدے میں پہنچیں اور پھر گیلے پیروں کا نشان چھوڑتی اندر غسل خانے کی طرف بھاگیں۔

ڈاکٹر صاحب اپنے گیلے کپڑے تبدیل کر کے باہر نکلے..... "ساجدہ بیگم..... بس اب شادی میں تاخیر نہ کرو۔ نہ موسم اچھا ہے نہ ملکی حالات۔"

چوتھا عہد

(ب)

سوہن سنگھ نے دبی زبان میں کہا..... "وہ جی ڈاکٹر مغل صاحب آئے ہیں۔ میں نے ان کو گول کمرے میں بٹھا دیا ہے۔ پنڈت جی کو پوچھتے ہیں....."

ماتا جی گڑبڑا سی گئیں۔

ڈاکٹر مغل کی حد تک تو ٹھیک تھا لیکن وہ جو اوما کسم سارا دن راحیلہ کے گھر میں دبکی رہتی تھی۔ یہ بات انہیں پسند نہیں تھی۔ اب اوما بچہ نہیں تھی' ٹھیک ہے وہ لوگ بڑے وسیع القلب تھے۔ انہوں نے ہر مذہب کے لوگوں سے بڑی فراخدلی سے دوستیاں پال رکھی تھیں۔ یہ بھی تو ٹھیک تھا کہ وہ کسی غیر ہندو کے گھر کھاتے پیتے نہیں تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے گھر میں صرف ایسے پھل اٹھا لیتے جن کا چھلکا اتر سکتا۔ کسی غیر جاتی میں اوما کا بیاہ ہے جانے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں.....پھر بھی ایک الارم سا ان کے اندر بجتا رہتا۔ شوکت کتنا خوبصورت تھا' بالکل کسی یونانی شہزادے کی طرح۔ کھڑی ناک فراخ ماتھا۔ ایسے نازک ہونٹ گویا کسی استری کے ہوں اور سنہری آمیزش لیے براؤن بال.....شوکت تو پورے کا پورا خطرہ تھا۔

کیا میں اوما کو ڈاکٹر صاحب کے گھر جانے سے منع کر دوں؟

پر جو راحیلہ اور شوکت یہاں آئے تو کیا بہانہ کروں گی؟

ایسی اوکھلی میں ماتا جی کا سر آ گیا تھا کہ چوری چوری وہ اس حد تک سوچتیں کہ بھلا ہی ہے جو پاکستان بننے کی افواہ ہے۔ بھلے ڈاکٹر صاحب کا کنبہ رخصت ہوگا' آفت ٹلے گی.....بھلا سانولی اوما کب تک یونانی شہزادے سے بچ سکتی ہے؟ چند لمحے وہ کھڑی سوچتی رہیں' پھر پتا جی کو تلاش کرنے نکل گئیں۔

لیکن سوہن سنگھ تمام کمروں میں گھومتا پھرتا بولتا رہا۔ سوہن سنگھ چھوٹے سے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ شاید اس کے پرکھ سکھ ہوں' پر وہ اپنے آپ کو راجپوت ہی ظاہر کرتا۔ سارا سر استرا پھرا اور چمکدار تھا۔ صرف بودی گردن پر گدی کے قریب لٹکتی۔ گرمی سردی کرتا نہ پہنتا تاکہ جیئو نظر آتا رہے اور کسی کپڑے سے چھو کر بھرشٹ نہ ہو۔ کمر پر ابھی سی دھوتی ہوتی جو پنڈلیوں کو بمشکل چھوتی۔ بائیں پاؤں میں چاندی کا ایک کڑا اور پیروں میں کھڑاویں رہتیں۔ کھڑاویں اس کی آمد سے پہلے پتہ دیتیں اور اس کے چلے جانے کے بعد دیر تک اس کی رخصت کی آواز بن جاتیں۔ سوہن سنگھ کی خواہش تھی کہ وہ کرشن جی

کے انوسار پھولوں کی بن مالا بھی پہنے لیکن اس شوق کو اس نے کبھی پورا نہ کیا۔ الکھ پرش کو خوش کرنے کے لیے وہ پوجا پاٹ کے علاوہ دن میں ایک راکھ دان میں کوئلے سلگا کر دھوپ سامگری اور ہرمل کی دھونی بناتا اوراوم بھور بھئے سواہا پڑھتا سارے کمروں میں Fumigation کرتا رہتا۔ ہر کمرے سے وہ ماتا جی سے باتیں بھی کرتا جاتا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح دھونی دینے سے نہ صرف جراثیم ہی مرجاتے ہیں بلکہ بدروحیں برے خیال اور بدشگون بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ پنڈت جی کے گھر میں پندرہ سال سے تھا اوران پندرہ سالوں میں ایک دن بھی اسے پتا جی کے خیالات سے اتفاق نہ ہوا۔

کھڑاویں بجاتا دھونی کا راکھ دان گول گول ہلاتا اس وقت بھی وہ ماتا جی سے کہہ رہا تھا۔ "یہ تو اور بات ہے بی بی جی کہ الکھ پرش کی مایا کہیں دھوپ کہیں سایہ پر جو میری مانو تو ان مسلوں سے ملنا چھوڑ دیں۔ یہ حملہ آور لوگ ہیں۔ ان سے کہیں انگریزوں کی طرح اپنا بوریا بستر باندھیں اور ہندوستان چھوڑ دیں۔ اپنے غزنی میں جا کر رہیں آرام سے....."

ماتا جی کے کمرے میں رام بن باس کی تصویر ٹنگی تھی۔ اس میں مہاراجہ رام چندر لکشمن مہارانی سیتا اور ہنومان تھے۔ مہاراجہ رام چندر اور لکشمن جی کی پشت پر بڑا دھنش تھے۔ ان تیر کمانوں کا رنگ سنہری مہاراجہ رام چندر اور لکشمن جی کے کمر سے بندھی ہوئی دھوتیوں کا رنگ زرد تھا۔ ہنومان جی چرنوں میں دست بستہ بیٹھے تھے اوران کا چہرہ بندر سے زیادہ ہاتھی کا سا لگتا تھا۔ مہارانی سیتا جی نے گہری قرمزی رنگ کی آڑی ساڑھی پہن رکھی تھی جس پر کمر میں پیلے گیندے کے پھولوں کا کمر بند لٹک رہا تھا۔ مہارانی اور مہاراجہ رام چندر کے سر کے پیچھے روشنی کے ہالے بڑے تھے۔ لکشمن جی اور ہنومان کے ہالوں سے روشنی بھی کم نکل رہی تھی اور ہالے بھی نسبتاً چھوٹے تھے۔

سوہن سنگھ ہمیشہ ماتا جی کے کمرے سے دھونی شروع کرتا۔ اس کا خیال تھا کہ مہاراجہ رام چندر کے آگے صبح صبح سیس نوانے سے سارا دن گلشن گھڑی بن جاتا ہے۔ اس نے اپنی آواز بھی نیچی کر لی اور دھونی کو آرتی کے انداز میں تصویر کے آگے گول گول پھرایا۔ پھر الٹے پیر کمرے میں اوم بھور بھئے سواہا گنگناتا باہر نکلا۔ ماتا جی کہیں نہ تھیں لیکن وہ بولتا گیا.....

"ماتا جی..... ان مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر ہمارا دھرم نشٹ کر دیا ہے۔ وہی دن بھلے تھے جب شودر سال بھر میں ایک بار حجامت بناتا۔ ساری عمر برہمن کا جھوٹا کھاتا تھا..... جو بھی اونچی جاتی والے کے ساتھ زبان لڑاتا تو زبان میں سوراخ کر دیا جاتا۔ میری ماں بتاتی تھی۔ دھرم کی باتیں شودروں کو کوئی سکھا نہ سکتا تھا۔ بھنگی' چمار' کنجڑ' دھنکار' ڈوم چنڈال بدھا تو سب گاؤں سے پرے رہتے تھے..... تمبولی' کوری کرمی کا بھی رہے تو گاؤں میں پر دور دور..... ان ملیچھ مسلمانوں نے آن کر انہیں اپنی جگہ ہی بھلا دی ہے۔ انگریزوں اور مسلمانوں کو تو چھوڑیے ماتا جی وہ تو ہیں ہی حملہ آور..... ان آریہ سماجیوں کی بھی مت ماری گئی ہے۔ مہاتما کبیر کے دوہے اور نانک جی کی باتیں بھی کرتے ہیں..... ہمیں کیا لینا ہے کسی نانک جی سے..... آپ مانیں نہ مانیں یہ گاندھی جی بھی ایکتا کی باتوں میں بہت دور نکل رہے ہیں..... بھلا بھنگی کالونی میں بسنے سے مسلمان' ہندو ایک ہو جائیں۔ جات پات مٹ جائے گی ایک دم..... ہمارے لیے تو مسلمان شودر سے بھی ملیچھ ہیں۔ یہ تو آپ ہی کا حوصلہ ہے کہ مسلمانوں سے ایسا لین دین ہیں۔ بھلا جو گائے ماتا کا ماس کھائیں' وہ ہم میں سے کیسے کہلائیں..... اتنا کافی نہیں ماتا جی کہ انگریز جائیں..... بھلے یہ مسلمان بھی سدھاریں غزنی جائیں یا بخارا۔ ہم گنگا جل سے اپنی دھرتی پوتر کریں گے۔"

گیلری میں اندر دیوتا کا کیلنڈر ٹنگا تھا۔ کیلنڈر پر 1945ء کا سن تھا۔ لیکن راجہ اندر کی تصویر اتنی دلکش تھی کہ ماتا جی نے دو سال بعد بھی اس کو یونہی ٹنگے دیا۔ گیلری سے نکل کر سوہن سنگھ نے اوما بی بی کے کمرے میں خوشبودار دھواں پھیلا دیا۔ اوما کے کمرے میں کرشن جی کی پیتل والی مورتی تھی۔ یہاں کرشن جی کے سارے وجود کے گرد پیتل کی بیل تھی۔ انہوں نے ایک ٹانگ اٹھائی ہوئی اور گلے میں مالا پہن رکھی تھی۔ اوما نے بھی رات ان کے گلے میں چنبیلی کا ہار ڈالا تھا جو بنسری سے ہو کر نیچے کتابوں کی الماری تک لٹک گیا تھا۔

اوم بھور بھئے سہاہا.....اوم بھور بھئے سواہا.....تت ست سوتر ورنیم بھوگو۔ تین بار آرتی اتار کر سوہن سنگھ بھی گویا نٹ کھٹ کنہیا بن گیا۔ بڑے سُر میں گانے لگا۔

شگن بن گگن چاہت پروائی.....

سُروں پر ہولے ہولے آواز جماتا غسل خانے میں دھونی کا دھواں چھوڑتا باہر نکلا تو پھر ماتا جی سے شروع ہو گیا۔ حالانکہ ماتا جی تو اس وقت گول کمرے میں پنڈت جی کے ساتھ بیٹھی ڈاکٹر سرفراز کی شکل تک رہی تھیں۔

"ہاں پنڈت جی! ابھی تک تو یہی تین صورتیں سامنے آئی ہیں۔ سرسید احمد خاں سوچتے رہے ہیں کہ مسلمانوں کو لبرل ہو جانا چاہیے۔ ہندو سے دوستی اور انگریزوں کی ایسی تقلید جو مذہب کے منافی نہ ہو ضروری ہے۔ سائنس اور اس کی ایجادات سے متنفر نہ ہو۔ ہندوستان کی ملی جلی آبادی کے پیش نظر سرسید نے یہ فارمولا بنایا ہے۔ میرے ابا جی خود علی گڑھ محمڈن کالج کی پیداوار ہیں۔ یقین کیجیے ان جیسا روشن خیال اور ساتھ ہی ساتھ دیندار شخص میں نے آج تک نہیں دیکھا....."

پنڈت جی گوپال داس خود بڑے لبرل خیالات کے آدمی تھے لیکن آریہ سماجی سرگرمیاں دیکھ کر وہ بھی کچھ متفکر ہو چلے تھے۔

"دیکھیے ڈاکٹر صاحب! لبرل ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن میں نے عام طور پر دیکھا ہے کہ لبرل لوگ مذہب کو پابندی سے اپنا نہیں سکتے۔ جونہی اپنے سے باہر کے اعتقادات رہن سہن ٹھیک لگنے لگے آدمی اپنے آپ کو سچا سمجھ نہیں پاتا۔ لبرل آدمی اچھا آدمی تو ہو سکتا ہے لیکن وہ سچا اور سُچا آدمی نہیں ہو سکتا۔" ڈاکٹر مغل کچھ دیر چپ چاپ فرش پر بچھی مضبوط دری اور اس کا ڈیزائن دیکھتے رہے۔

"پھر تو بڑا جھمیلا پڑے گا پنڈت جی..... اگر وفاداریاں نہ رہیں تو ہندوستان کا مستقبل کیا ہو گا..... ہندو مسلمان میں اور مسلمان ہندو میں ضم ہونے سے تو رہے! ہمیں اپنے اپنے مذہب کی پابندی کے ساتھ ہی کوئی ایسا فارمولا ایجاد کرنا چاہیے جس سے اپنا مذہب بھی رہے اور دوسروں کے ساتھ بھائی چارہ بھی نہ ٹوٹے..... ہمارے کچھ سوچ والے کہتے ہیں۔ اپنا مذہب چھوڑو نہیں دوسرے کا مذہب چھیڑو نہیں۔"

"یعنی سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔" پنڈت جی نے پوچھا۔

اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا..... ماتا جی کو بات سمجھ نہ آئی لیکن وہ تکلفاً قہقہے میں شامل ہو گئیں۔

"ایک اور صورت شریعت کی پابندی ہے..... کچھ مسلمانوں کا خیال ہے کہ اگر ہمارا تشخص قائم رہا تو پھر ہندو جاتی کے لوگ بھی اپنا تشخص قائم رکھیں گے۔ دونوں لوگوں کا تشخص واضح ہو گا دوستی مشکل سے قائم ہو گی لیکن مضبوط اور

پائیدار ہوگی کیونکہ دانا دشمن احمق دوست سے بہتر ہے۔ پنڈت جی! اگر ہندو اپنے دھرم پر چلے اور مسلمان اپنے دین پر..... تو حدود خود بخود قائم ہو جائیں گی..... طوطا اور کبوتر ایک ہی باغ میں رہ سکیں گے۔ تبدیلی پر اصرار نہ کریں..... چھوڑ دینے یا لینے کی تکرار نہ ہو....."

سروجنی ماتا جی نے بڑے سالوں کی دبائی ہوئی خواہش کا اظہار کیا..... "ہاں ڈاکٹر صاحب! اگر میل جول پر اتنا اصرار نہ ہو تو پھر تو یہ بات ہو سکتی ہے لیکن بھاونا تو یہی ہے کہ ہندو مسلم بھائی بھائی بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ آپس کے فرق مٹانا چاہتے ہیں۔ ایسے میں تو دھرم رہ نہیں سکتے۔"

کہنے کو تو ماتا جی کہہ گئیں لیکن سارے میں سناٹا چھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کو لگا کہ بارسنگھا کے اوپر لگی کلاک گھڑی میں چند ثانیے کو چپ ہوگئی۔

بڑی ملائم مسکراہٹ کے ساتھ ڈاکٹر سرفراز نے ہولے سے کہا..... "چلیے بہن جی..... اگر لبرل ہونے کا فائدہ نہیں ہے اور اپنے اپنے مذہب کی مکمل طور پر ادائیگی پر بھی ہم لوگ رضامند نہیں تو ایک تیسری شکل تو ہے ناں..... برصغیر کے صوفیا کہتے آئے ہیں کہ دعا میں ہمیشہ تیسرا حل موجود ہوتا ہے..... نہ آپ کا حل نہ میرا..... بلکہ خدا کی طرف سے ہمیشہ تیسری شکل نمودار ہو جاتی ہے جو سب کے لیے قابلِ قبول ہوتی ہیں....."

ہلکا سا کھنکار کر پنڈت جی بولے..... "سنیے ڈاکٹر جی..... مہاراج ادھیراج اکبر بادشاہ تھا تو ان پڑھ پر تھا سوچکار..... اس نے لاہور کے قلعے میں بند ہو کر مختلف مذاہب کے جان کار اکٹھے کیے اور سوچا کہ اس دھرتی کے لیے کوئی ایسی شکل نکالوں جو ہندو مسلم سکھ عیسائی سب کے لیے قابلِ قبول ہو..... راجپوت رانی بھی بیاہی 'ہون کنڈ' بھی جلائے۔ راجپوتوں سے تلواریں بھی بدلیں۔ ماتھے پر تلک بھی لگوایا 'آرتی' بھی اتروائی..... راج نیتی کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن مہاراج مذہب اور چیز ہے راج نیتی اور بلا ہے..... راج پاٹھ کی خاطر مہاپرشوں کی باتیں تو بدلی نہیں جاتیں..... یہ کوئی گول میز کانفرنس نہیں..... لیگ آف نیشنز کا فیصلہ نہیں..... کوئی Constitution بنانے کا آرا نہیں..... اوتار..... اوتار ہوتا ہے..... پیغمبر کی بات کو توتالا نہیں جا سکتا..... کیوں جی..... راجا اکبر نے دینِ الٰہی بنا کر ہندوستان کو کمزور کر دیا۔ اسلام کو زک پہنچائی اور ہندو کو بھی خوشامد پسند بنا دیا..... اتنی لچک بھی کس کام کی کہ بوجھ ہی اٹھانہ سکے۔"

ماتا جی کو راجہ اکبر پسند تھے جن کی راجپوت رانی ان کے ماتھے پر تلک لگا کر دربار میں بھیجتی تھیں۔ یہ شنار یورا انہیں دل سے مرغوب تھا۔ وہ بات کی تہہ کو تو نہ پہنچ پائیں پر چپ ہو کر رہ گئیں..... ہاں جو مسلمان بدل جائیں گئو ہتیا نہ کریں۔ اتنی اذانیں دے کر سب کی نیند خراب نہ کریں۔ عید کے روز بکرے ذبح نہ کریں..... کہیں جو مسلمان ہماری طرح رنگ رلیاں ناچ گانا بھی پسند کریں تو ہو سکتا تھا کہ ساتھ رہنا بھی ممکن ہو۔

ڈاکٹر مغل جی میں سوچ رہے تھے کہ جب تک شادی بیاہ ممکن نہ ہو کوئی کسی کے قریب کیسے آ سکتا ہے؟ پنڈت جی کے گھرانے سے تیسری پشت تک دوستی آ چلی تھی لیکن ابھی تک جیسے دونوں گھر علیحدہ علیحدہ تھے۔ کبوتر کبوتر تھا اور طوطا..... طوطا..... ساتھ رہنے کی صورت میں بھی علیحدگی ہی علیحدگی تھی۔

☆☆☆

"کیوں کیا ہوا؟ آخر....."

میں کہتا ہوں ایک دن کی تاخیر نہ کرو۔ تم اپنی تیاریوں کو روتی ہو آج چار لاشیں ہسپتال پہنچی ہیں۔ فسادات بڑھیں گے۔ Wavel کو اسی لیے واپس بلایا گیا ہے۔ کوئی لارڈ ماؤنٹ بیٹن آ گیا ہے۔ حکومت انگلیشہ جلدی سے پاور منتقل کرنا چاہتی ہے۔

خیری صلا ہے....." ساجدہ واں بولیں۔

"مجھے اچھے آثار نظر نہیں آتے۔"

"تو کیا رمضان میں شادی کر دیتے؟"

"اس سے پہلے شادی کیوں نہ کی۔ شاہد کی ماں تو راضی ہے....."

"ڈاکٹر صاحب گڈے گڈی کا بیاہ تو ہے نہیں کہ کاتا اور لے دوڑے۔ آخر برادری آئے گی۔ سب کہیں گے ساجدہ نے یہ کیسی سواہ گھولی۔"

"میری بات غور سے سنو ساجدہ بی بی۔ یہاں صوفے پر بیٹھو اور غور سے سنو۔ Three tier plan مر چکا ہے۔ ویول نے جاتے ہوئے نئے وائسرائے سے کہا تھا۔ دیکھو ہندوستان کی تقسیم operation mad house ہے..... میں سمجھتا ہوں انگریزوں کو برصغیر کو آہستہ آہستہ ایک ایک صوبہ کر کے چھوڑنا چاہیے..... پہلے عورتوں اور بچوں کو حفاظت سے جائے مقصود تک پہنچایا جائے۔ پھر فوج کی منتقلی ہو.....سب سے پہلے جنوب کو آزادی ملے پھر شمال کو..... ریاستیں سب سے پہلے آزادی جائیں اور اپنی مرضی سے الحاق کریں۔"

"تو.....تو.....آپ کا خیال ہے کہ ہندوستان تقسیم ہو جائے گا....."

"لو ادھر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پندرہ اگست تاریخ بھی مقرر کر دی اور یہ ابھی پوچھ رہی ہیں صحیح ہے۔"

"یہ لارڈ کیسا ہے؟"

"خوبصورت بہادر..... بیوی کی وجہ سے بہت امیر..... اپنی شہرت کا عاشق....."

"ہاں ڈاکٹر صاحب! خوبصورت تو شہزادوں جیسا ہے۔ بے نا بیگم عباس بھی کہہ رہی تھیں۔"

"لو جی کھوتا ہی کنوئیں میں ڈال دیا۔ ان کے نزدیک خوبصورت ہونا امیر ہونا بہت بڑی خوبی ہے بیگم۔ ماؤنٹ بیٹن میں کچھ نیلا لہو بھی ہے شہزادوں والا لیکن جہاں جہاں اسے ذمہ داری ملی وہ عہدہ برآ نہیں ہو سکا۔ تم دیکھ لینا ساجدہ بیگم..... گوٹے کناری لگتے رہیں گے۔ دولہنیں اجڑ جائیں گی۔" دل میں ساجدہ نے کہا' آپ کے منہ میں خاک لیکن منہ سے نہ بولی..... ساجدہ بیگم کے دھیان و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی نیا ملک بننے والا ہے..... کچھ ہو بھی سکتا ہے..... ابراہیم لاج ہمیشہ کے لیے چھوٹ بھی سکتی ہے!

"ماؤنٹ بیٹن اپنے گلیمر کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسے کچھ سیاست کا شوق نہیں لیکن اپنی شخصیت کا بادشاہوں کا سا چلن اختیار کر کے پچھلی جولائی سے اب تک اس نے شملہ کانفرنس بلائی اور مسلم لیگ اور کانگریس کو ایک فیصلہ پر رضامند کیا..... یہ اس کا کمال ہے کہ چھوٹے پاکستان پر قائداعظم اور کانگریس کے لیڈر سب رضامند ہو گئے ہیں..... لیکن جہاں

تک چندرہ اگست کی تاریخ کا معاملہ ہے تو حیران ہوں کہ یہ اتنا بڑا ایجنڈا اتنے کم عرصے میں کیسے ہوگا؟....."

"تو پھر تاریخ آگے بڑھادیں۔ انگریز بہادر کے آگے کون بول سکتا ہے۔"

"اٹلی نے تو جون 1948ء کا وقت مقرر کیا تھا۔ ویول بھی کہتا تھا کہ اگلے سال کے مارچ تک انگریز حکمران ہوں گے۔ عقلمندی انصاف اور پوری تفصیل میں جا کر تمام انتظامات مکمل کر کے تقسیم ہند ہوگی۔ پر یہ شہزادہ ماؤنٹ بیٹن جلد از جلد ساری ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ دیکھ لو..... کلکتہ کے قتل و غارت سے بھی کچھ نہیں سیکھا۔ پنجاب میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کی ذمہ داری بھی تمہارے ہیرو نما ماؤنٹ بیٹن قبول نہیں کرتے۔ ماسٹر تارا سنگھ بار بار کہہ رہے ہیں کہ حکومت کو چاہیے اکھاڑ پچھاڑ والوں کو سخت سزائیں دیں..... لیکن یہ مینن کو بغل بچہ بنا کر ہر مشورہ لے رہے ہیں۔ مینن کو انگریز مشیروں کے ساتھ رکھتا ہے۔ بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے کہ مینن تو مشیروں میں ہو تو ہمارا کوئی نمائندہ موجود ہی نہ ہو انگریز مجلس مشاورت میں۔ تم دیکھ لینا ساجدہ وایک تو یہ کرپس کچھ گل کھلائے گا۔ دوسرے انگریز برصغیر کو افراتفری کے عالم میں چھوڑ جائے گا کٹنے مرنے کے لیے..... انگریز کی نیت اچھی نہیں..... اور جب نیت ٹھیک نہ ہو تو پھر نتائج اچھے نہیں نکلتے۔ اور جو نیت اچھی ہو تو عمل کیسا بھی کیوں نہ ہو' نتیجہ ہمیشہ اچھا نکلتا ہے....."

"اللہ ڈاکٹر صاحب! آپ مجھے کیوں اس قدر ڈرار ہے ہیں بھلا....."

"اس لیے بی بی ساجدہ کہ برصغیر اس وقت ایک تبدیلی کے دہانے پر..... کچھ بھی ہو سکتا ہے جذبات بھرے ہوئے ہیں..... ہندو نے وشال بھارت کا جو خواب پال رکھا ہے وہ ٹوٹ رہا ہے۔ مسلمان جو ہندوستان کے حاکم رہے ہیں۔ مالک رہے ہیں۔ انہیں غلامی کا سامنا ہے..... دنیا کے مختلف ملکوں میں اقلیتیں اور اکثریتیں اکٹھی رہ رہی ہیں۔ لیکن برصغیر کا مسئلہ کچھ اور ہے۔ یہاں کا ہندو ہزار سال محکوم رہنے کے باوجود ابھی تک اس ملک کو اپنا سمجھ رہا ہے..... مسلمان نے اپنے ہاتھوں سے اسے گنوا کر ابھی تک حکومت کا خواب ہاتھ سے نہیں چھوڑا..... یہ تو نرم دلی ہے قائداعظم کی کہ وہ چھوٹے پاکستان پر راضی ہو گئے۔ کہیں جو میں ہوتا تو انگریز بہادر سے کہتا جس سے حکومت چھنی تھی اسی کو لوٹاؤ..... جس کے اقتدار کو پامال کیا تھا اسی کو اقتدار لوٹاؤ....."

"ڈاکٹر صاحب! یہ ساری باتیں آپ ہسپتال میں کیا کریں۔ یا دوستوں کے ساتھ..... ہم عورتوں کو ایسی باتوں کا کوئی شوق نہیں..... ہاں....."

"آپ کو شادی بیاہ کا تو شوق ہے ناں؟ ڈھولک مہندی میں تو جان ہے ناں آپ کی....."

"تو یہ کوئی عیب ہے..... ہم پردے میں رہتے ہیں۔ تو ہمیں تو ایسی ہی باتوں کا شوق ہوگا....."

"تو پلیز بیگم سرفراز..... فوراً اس ارمان کو پورا کرلیں..... ورنہ ہو کہیں کوئی نئی مصیبت گل کھلائے....."

پہلی بار ساجدہ بیگم ڈر گئیں..... اندر ہی اندر لاحول پڑھتے ہوئے اس نے ارادہ کیا کہ فوراً بیگم عباس کو کسی طرح کہلوائے گی کہ تاریخ مقرر کرنے آجائیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تو عادت ہی نہ تھی کہ اتنی تفصیل سے اسے غیر ضروری باتوں میں الجھائیں۔ آج کی باتوں کو برا شگون سمجھ کر ساجدہ گھبرا گئی اور شادی کی تیاری اور زور شور سے کرنے لگی.....

ڈاکٹر سرفراز طبعاً تھوڑے سے Apprehive تھے۔ وہ تھوڑا سا فکر پال کر ڈرائنگ چیئر میں بیٹھ جاتے اور پھر

آہستہ آہستہ اس فکر کی جگالی کرتے رہتے۔ نسخہ لکھنے کے بعد دوا دینے سے پہلے' آپریشن تھیٹر میں گھستے ہوئے' آپریشن کے بعد ان کے افق پر سوچ وفکر کی ہلکی سی بدلی چھا جاتی۔ وہ توکل کا ہاتھ پکڑنا چاہتے تھے' کبھی کبھی اپنے دادا کی روح بھی ان میں آجاتی اور وہ سب کچھ اللہ پر چھوڑ بھی دیتے لیکن پھر کہیں سے فکر کی ازن بھنبھیری دماغ میں اڑنے لگتی۔

ڈاکٹر صاحب صبح سے شامیانے کرسیاں لگوانے میں مصروف تھے۔ اب تھوڑی دیر کے لیے انہوں نے برآمدے میں راکنگ چیئر کا آرام قبول کرلیا... لیکن دماغ ابھی تک برصغیر کی حالت میں الجھا ہوا تھا۔

ماؤنٹ بیٹن نے پندرہ اگست کی تاریخ آزادی کے لیے مقرر کر دی تھی۔ قائداعظم چھوٹے پاکستان پر رضامند ہوگئے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے گلیمر کا سارا زور لگا کر کہیں دھمکی سے کہیں سیاست سے کہیں لالچ دے کر ہندوستان کی پانچ سو باسٹھ ریاستوں کے الحاق کے دستخط لے لیے تھے۔ صرف جونا گڑھ' حیدرآباد اور کشمیر ایسی تین ریاستیں تھیں جو آزاد رہنا چاہتی تھیں۔ پارٹیشن کے فارمولے کے مطابق حیدرآباد کو آبادی' جغرافیہ اور اخلاقی طور پر ہندوستان کا حصہ ہونا چاہیے تھا اور لارڈ ویول کے مطابق کشمیر کو آبادی' جغرافیائی سرحدوں اور اخلاقی طور پر پاکستان کا حصہ ہونا چاہیے تھا۔ لارڈ ویول سمجھتا تھا کہ کشمیر میں رائے شماری کروائے بغیر انگریز حکومت کو آزادی کا اعلان نہیں کرنا چاہیے کیونکہ کشمیر کے پاس نہ تو ایسے مالی وسائل ہیں کہ دباؤ کا مقابلہ کر سکے نہ ہی اس کے پاس فوجی طاقت کا وہ ذخیرہ موجود ہے جو دباؤ کی حالت میں اپنے ملک کا دفاع کر سکے...

راکنگ چیئر کو ہلورتے ہوئے ڈاکٹر سرفراز نے سوچا... اور کیا ہو کہ یہ آزاد ریاست ہی بعد ازاں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان لاینحل جھگڑے کا باعث بن جائے... کون جانے اونٹ کس کروٹ بیٹھے اور کس کی غلطی سے لاکھوں لوگ قتل وغارت کا شکار ہو جائیں۔

سول لائنز کی خاموش سڑک پر ایک جیپ نے بریکیں لگائیں۔ اس کی تیز روشنی برآمدے میں راکنگ چیئر پر پڑی۔ پھر جیپ نے Reverse لگائی۔ اس کے دو پہیے کچے میں اتر گئے۔ بغیر کلچ دبائے فوجی نے گیئر بدلی تو اس کی گڑگڑاہٹ ساری فضا میں گونج گئی۔

ڈاکٹر سرفراز اٹھ کھڑے ہوئے... بغیر کلچ دبائے گیئر بدلنا... بغیر فوجی انتظامات Administration کو طے کیے بغیر دو ملک قائم کرنا لوگوں کو مشکلات میں مبتلا کر سکتا ہے۔

ملٹری شہر میں گشت لگا رہی تھی۔ افواہ تھی کہ ایک دو دن کے اندر کرفیو نافذ ہونے والا ہے... گہری شام پر ایک نظر ڈال کر وہ شامیانے کی طرف چلے گئے۔ قناتیں ایستادہ کی جا رہی تھیں۔ مستری بجلی کے بلب فٹ کر رہے تھے۔ ملازم دریاں بچھانے میں مشغول تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر مستری لوگ اور بھی مستعدی سے درختوں میں بجلیاں لگانے لگے۔ جس مستری کے کان میں چھوٹی چھوٹی بالیاں تھیں' سیڑھی پر چڑھتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو قریب پا کر بولا...''ڈاکٹر صاحب! ایسے دنوں میں تو بی بی کا لگن نہ کرنا چاہیے تھا۔''

اندر ہی اندر ڈاکٹر صاحب کا فکر پنکھے کی ہائی سپیڈ پر چلنے لگا...

''ہاں کچھ برے دن آ گئے ہیں۔''

''برے دن ڈاکٹر صاحب برے سے برے..... جگوان کی سوگند بہت برے۔ دیس بدلیس جتھے پھرتے ہیں۔ لہو لوگوں کے منہ کو لگ گیا۔ اب تک تو قریباً آدھا شہر خالی ہو گیا ہے سرکار..... پتن والی سڑک پر جا کر دیکھ لیں راستہ نہیں ملتا.....''

''ہم سب جہالت کے مارے ہوئے ہیں بھائی رام دیال۔ آرام سہولت سے نہ کچھ کرتے ہیں نہ کسی کو کرنے دیتے ہیں.....''

''ہاں مہاراج.....'' دل میں وہ ہنسا' اب پتہ چلا ان مسلوں کو.....؟ ڈر گئے ناں۔

''رام دیال ان درختوں کو چھوڑ پہلے شامیانے کے اندر بجلی فٹ کر دو۔ وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔''

جب ڈاکٹر صاحب ذرا آگے بڑھ گئے تو رام دیال درخت سے اتر کر ٹین کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ آزادی اتنی قریب تھی اس نے دل میں سوچا کہ وہ بھی احمق تھا جو ڈاکٹر صاحب کے حکم مان رہا تھا۔ اس افراتفری کے زمانے میں کون ڈاکٹر صاحب اور کون مستری ہر دیال..... ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب نے بڑی جانفشانی سے اس کی بیوی کا علاج کیا تھا لیکن وہ بھی تو کوٹھی پر ڈالی لے کر گیا تھا پھلوں کی..... یہ مسلے دھرم کے بڑے پکے ہیں۔ کیسے ڈاکٹر صاحب نے ایک امرود اٹھا کر باقی ڈالی لوٹا دی تھی۔ ہر دیال نے دل میں کہا' یہ نہرو جناح کے بس کی بات نہیں۔ ان سالے مسلمانوں کو جوتے مار مار کر یہاں سے بھگانا چاہیے تھا جس دیس سے آئے تھے وہیں لوٹو..... ہمارے نیتا بھی کمزور ہیں پاکستان پر ہی راضی ہو گئے گدھے کہیں کے.....

کمپاؤنڈر جو انتظامات میں مشغول سارے میں تھرکتا پھر رہا تھا' رام دیال کی طرف آیا اور گرج کر بولا.....

''کیوں رے رام دیال! بیٹھ کر بیڑی پینے کا وقت نہیں ہے جلدی کر جلدی۔''

''چپ کر مسلے..... ہو جائے گا سارا کام..... عورتیں تو بے مہندی لائیں گی۔ ابھی سے کیوں مرا جاتا ہے۔''

کمپاؤنڈر غلام رسول حیران رہ گیا..... ابھی چند ماہ پہلے یہ رام دیال ہاتھ جوڑے تھکل پا چلتا عاجزی سے اسے مل کر جاتا تھا۔ آزادی کے تصور نے اس اچھا پر چارک کو شیر بنا دیا تھا۔ وہ اپنے خول Defensive سے نکل کر مرنے مارنے کو تیار تھا..... غلام رسول نے ہر دیال کو جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور آگے بڑھ گیا.....

راحیلہ کی مہندی کی رات تھی۔ گو کرفیو ابھی نافذ نہ ہوا تھا لیکن شہر نے چپ سادھ لی تھی۔ عورتوں پر سیاسی فضا کا کچھ اثر نہ ہوا تھا۔ دور شتے ناطوں میں الجھی گوٹے کناری میں مڑی کمروں میں گھومنے پھرنے اور ایک دوسرے سے میک اپ کا سامان مانگنے میں مشغول تھیں۔ کچھ سج سجا کر غیبت کی محفل جمائے بیٹھی تھیں۔ ابھی لڑکیوں نے ڈھولک نہ سنبھالے تھے اور چھوٹی لڑکیاں کیسری بسنتی لال پیلے سبز کپڑے پہنے گالوں پر سرخی اور لبوں پر لپ سٹک لگائے اپنے آپ کو بڑوں میں شمار کر رہی تھیں اور اسی خیال سے ڈھولک بجانے کی سعی کر رہی تھیں کہ چھوٹے لڑکوں نے کالر والی قمیضوں میں نکٹائیاں لگا رکھی تھیں۔ گو اس لباس میں انہیں گرمی لگ رہی تھی۔ پھر بھی وہ اپنے آپ کو معزز محسوس کر رہے تھے۔ ان کے چہروں پر دھنوڈ رنگ کے دھبے اور ہاتھوں میں آئس کریم کی چپچپاہٹ تھی۔ ان کا زیادہ وقت اندر سے باہر گھومنے پھرنے میں لگ رہا تھا۔ ان بیچاروں کو ہر کمرے سے بھگا دیا جاتا اور شامیانوں میں کرسیوں کے ارد گرد بھاگتے بھاگتے وہ خود اس

بھاگ دوڑ سے بھاگ گئے تھے۔ جس قدر چھوٹی لڑکیاں اہم تھیں اسی قدر یہ بونے قد کے لونڈے غیر اہم تھے۔ ماؤں کو خوب علم تھا کہ لڑکیاں بچیاں کہاں ہیں اور کیا کر رہی ہیں۔ کسی کو علم نہ تھا کہ لڑکے کہاں ہیں۔ ابھی پتلون میں سامنے زپ لگنے کا رواج نہ تھا۔ کبھی کبھی کسی لڑکے سے بٹن نہ کھلتے تو ماں کے پاس آ جاتا۔ جب ماں بغیر رازداری کے بٹن کھول دیتی تو وہ شرمندہ سا باتھ روم میں چلا جاتا اور کافی دیر تک ساتھیوں سے نظریں چراتا رہتا۔

لڑکیاں میک اپ اور کپڑوں میں گرفتار تھیں۔ آئینہ اور استری اس وقت سب سے مطلوبہ چیزیں تھیں۔ ہر ایک لڑکی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے ہی چہرے پر نثار ہو رہی تھی۔ آنکھیں گھما کر پلکوں پر مسکارا لگایا جا رہا تھا۔ ابھی Glitter ایسا عام نہ ہوا تھا۔ گوٹے کو باریک کاٹ کر چہرے پر لگایا جاتا۔ لال لپ سٹک کا رواج تھا۔ براؤن اور کیجی مائل لپ سٹکیں ابھی ایجاد نہ ہوئی تھیں۔ فیشن ایبل لڑکیاں دو چوٹیاں کر کے آگے ڈال لیتیں اور ان میں ربن کے آٹھ بنا کر باندھ لیتیں۔ بالوں میں پف اٹھانے کا فیشن تھا۔ جس سے چہرہ لمبا اور کتابی لگتا لیکن اس میں کچھ مردانہ پن بھی آ جاتا۔ جوڑے بڑی عمر کی عورتیں باندھتیں اور شادی بیاہ کے موقعوں پر ان میں چنبیلی اور موتیا کے ہاروں کو باندھ لیتیں۔ ابھی ڈائٹنگ اور ورزش سے جسم خوبصورت نہ بنائے جاتے تھے۔ حسن چہرے کا شمار ہوتا۔ جسمانی پیمائش ابھی نہ تو ان تھی اور نہ ہی مرد لوگ جسم پر اتنی توجہ دیتے تھے۔ بریسلٹ کے بجائے کانچ کی چوڑیاں ہائی ہیل کے بجائے لفٹی جوتیاں پاؤں کے لیے زیبائش کا باعث تھیں۔ فیشن سادہ اور کم خرچ بالا نشین تھا۔

بڑی بوڑھیاں اِلگ تھلگ ٹکڑیوں میں پان کھاتی سفید شفون کے دوپٹوں میں ملبوس ریشمی سوٹ نفتے زمانے میں کپڑے نکالے اپنے غیر شادی شدہ بیٹوں کے لیے لڑکیاں تاڑنے اور غیبت کرنے میں مشغول تھیں۔ ان کے جسم ناتواں اور زبانیں بڑی توانا تھیں زندگی کا سارا چسکا بتیس دانتوں کے اندر مقید ہو گیا تھا۔

پیلے کپڑوں میں ملبوس پھولوں کا گہنا پہنے آہستہ آہستہ راحیلہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں باہر شامیانے کی طرف بڑھی۔ چار سہاگنوں نے اس پر گوٹے سے مڑھے سرخ جالی دار دوپٹے کا سایہ کر رکھا تھا۔ ادما اس کے ساتھ ساتھ بازو کندھے کے گرد حمائل سر کو ذرا سا سہارا دیے چل رہی تھی.... شوکت مغل بھی کتنا کٹھور تھا۔ بہن کی شادی پر بھی نہ آ سکا۔ شامیانے کے نیچے لڑکیوں نے ڈھولک پر تھاپ دے کر گانا شروع کر دیا تھا۔

اک ساڈے اوودی برے

ساڈے اوودی برے

جیہڑے سوائی جی اکھواون

سوائی جی اکھواون

سوائی آکھیا نہ جائے

موہنوں اڑ یا نکل جائے

اڑ یا نکل جائے

رنگ ماہیے دا شاوا رنگ ماہیے دا

بارش کی پہلی بوندیں بلقیس باجی کو بازار میں ملیں۔

وہ راحیلہ کے لیے رانی ہار دیکھ رہی تھیں کہ تیز گرم ہوا میں چند چھینٹے سنیارے دولت رام کی دوکان میں بھی گھس آئے۔ باجی بلقیس کو اپنے گھر، بچوں اور خاور کی یاد آ گئی۔

کبھی کبھی جب باجی بلقیس بہت ہی تنگ چڑھی ہو جاتیں اور خود مائی کے مظاہرے ساتویں آسمان پر ہوتے تو خاور بھائی بھی ضد میں آ جاتے۔ وہ بھی باجی بلقیس کو نہ مناتے۔ معافی مانگنے کے بجائے بچوں کو ڈانٹ پیٹ، ناشتے کا ٹرے الٹ، سائیکل گھسیٹتے لاٹ صاحب کے دفتر چلے جاتے۔ ادھر خاور بھائی کا رویہ دیکھ کر ساس بھی دلیر ہو جاتیں اور آنگن میں دائرے سے کاتی کہتیں "ایک تو اس خاور کے دماغ میں بھوسہ بھرا ہے۔ چھ بچوں کا باپ ہے اور عقل چھو نہیں گئی۔ رن مریدی کرتا ہے اور تمنا یہ ہے کہ بیوی پر حکم چلائے۔ اونہہ! اپنے زمانے میں ادھر شیخ جی نے ڈیوڑھی میں قدم دھرا اور اُدھر سے سرو قد کھڑی ہوئی۔ بچے جائیں بھاڑ میں، ہمیں تو شیخ جی کے آرام کی پڑی رہتی تھی۔ مجال ہے کوئی بچہ شور مچائے۔ شیخ جی بیٹھے ہوں اور بچے ضد کریں۔ وہ کھارے ہوں اور بچے نمدیدوں کی طرح گھیرا ڈالے کھڑے ہوں..... چمڑی ادھیڑ دیتی ان سب کی..... یہی خاور ایک دن اکنی کے لیے ضد کر رہا تھا۔ اندر ڈیوڑھی سے آواز دے کر جو شیخ صاحب نے پوچھا..... میں خاور کو کمبل میں لپیٹ کر اندر غسلخانے میں لے گئی آواز نہ نکلنے دی..... ایک یہ بلقیس ہے۔ تو بہ بچوں کو شوہر کی بارات بنا دیا ہے۔ عمر ڈھل گئی پر چونچلوں میں کمی نہ آئی۔ ساری دنیا بہو پر ہنستی ہے۔ اونہہ بوڑھے منہ مہاسے لوگ کریں تماشے!

پتہ نہیں کیوں دولت رام سنیارے کی دکان میں بیٹھے بٹھائے اسے اپنی ساس پر ترس آ گیا۔ بڑھیا کا بھی کیا قصور..... سارے دنیا میں ایک خاور ہی تو رہ گیا تھا۔ خاور کا موڈ ٹھیک ہوتا تو ساس رو رو کر ترس ہو رہتی۔ خاور کو بلقیس پر غصہ آ جاتا تو بول بک کر دل کی بھڑاس نکالتی۔ خاور اپنی بیوی بچوں میں گم رہ جاتا تو ساس انواٹی کھٹواٹی لے کر پڑ رہتی.....

کیا بوڑھی ہو کر میں بھی ایسی ہو جاؤں گی..... بلقیس نے سوچا۔

اس نے لمبی جھرجھری لی۔ رانی ہار اپنے گلے میں ڈال کر سوچنے لگی..... کیا کپڑا لتا زیور میک اپ سب بیکار ہو جائیں گے.....

اسے اپنا گھر یاد آ رہا تھا..... آنگن میں لگی بیری..... کونے میں پڑا تخت پوش۔ اوپر کے کمروں میں جانے والی سیڑھیاں، پہلو کا باورچی خانہ، آنگن کا نلکا، نلکے سے بندھی لمبی تانی..... کھرے میں پڑے جھوٹے برتن، آنگن میں جھاڑو پھیرتی بشتی..... اودھم مچاتے اس کے چھ بچے..... تخت پوش پر آدھی سوئی آدھی جاگتی خاور کی ماں..... فاصلے نے یاد کو چاند کی کرنوں سے اُجال دیا تھا۔

بلقیس باجی کی بڑی بیٹی خورشید ماں کے بجائے دادی کی لاڈلی تھی۔ اس پر ماں کی ہر بات کا الٹا ردعمل ہوتا۔ جو کچھ اسے پتہ چلتا وہ دادی سے جڑ دیتی۔ جونہی یہ لگائی بجھائی زمین دوز مائن پھٹتی۔ گھر کا نقشہ بدل جاتا۔ گالی گلوچ کے فوارے چھوٹتے۔ گھر کی امن سکون والی فضا تتر بتر ہو جاتی۔ شام کو تھکے ہارے خاور بھائی گھر آتے تو ڈیوڑھی سے ہی دھر لیے جاتے۔ اوپر بلقیس باجی تک پہنچ نہ پاتے۔ خورشید کی دادی اپنا پوائنٹ آف ویو بیان کرتیں۔ خاور بھائی تھکے ہارے اوپر پہنچتے تو ادھر معاملہ دگرگوں نظر آتا۔ اگر کبھی خاور بھائی دادی کی طرفداری میں ذرا سا دور نکل جاتے اور مصالحت کے

بجائے اکڑ کی لیتے تو بلقیس باجی اپنا سامان باندھ سٹیشن کا رخ کرتیں۔ اس جھگڑے سے ہرگز یہ مراد نہ ہوتی کہ جھنم چھنا کا ارادہ ہے۔ فقط آب و ہوا کی تبدیلی ایک ہی سی روٹین سے نکل جانے کی خواہش اور بقول ماڈرن لوگوں کے اپنے روزمرہ سے بریک لینے کا ارادہ ہوتا۔ بلقیس باجی سارا سامان یا بچوں کی فوج لے کر میکے گھر نہ جاتیں۔ بس یہی ایک آدھ سوٹ کیس اور سب سے چھوٹا بچہ ساتھ لے کر گاڑی چڑھ جاتیں۔

خاور بھائی چند دن سکھ کا سانس لیتے۔ انہیں گھریلو کاموں سے اکتائی 'بچوں' سے گھبرائی' چولہے چوکے سے دشمنائی والی بلقیس باجی سے کچھ دنوں سے فراغت ہو جاتی۔ وہ بچپن سے اپنی ماں کے گرفتار تھے۔ وہ ان مردوں میں سے تھے جو ماں کو جنت کی کنجی' دنیا کا دروازہ' عاقبت کا راستہ' حال پر مقیم ولی سمجھتے تھے۔ وہ ایسے مرد تھے جن میں ماں سے گہری محبت' موت کی خواہش جگاتی ہے۔ نامردی پیدا کرتی ہے اور اندر ہی اندر کہیں جنسی ہیجان کو لاشعور میں بیدار کرتی ہے۔ بلقیس باجی کی انتہائی آرزو کے باوجود وہ علیحدہ گھر اختیار کرنے پر تیار نہ ہو سکے۔ انہیں بلقیس باجی سے محبت ضرور تھی اور اس کی واحد وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے افق پر اور کوئی عورت انگڑائی لے کر بیدار ہونے پر رضامند نہ ہوئی تھی لیکن وہ ہر لحظہ ہر مقام پر ایک ہی آرزو رکھتے تھے کہ کسی طرح بلقیس مکمل طور پر ان کی ماں بن جائے۔ بلقیس گیندے کا پھول تھی' خوش رنگ تیز خوشبو والی..... ماں گھاس تھی روندے جانے پر بھی نہال..... بہرکیف کچھ شامیں وہ ماں کے پاس بیٹھ کر بلقیس کا تجزیہ کرنے میں صرف کرتا۔ کچھ شامیں دوستوں کے ساتھ کٹ جاتیں لیکن خورشید کی ہمراہی میں بھی پانچ بچوں کا بوجھ زندگی اجیرن کر دیتا۔ چیختی چنگھاڑتی بلقیس یاد آنے لگتی۔

بچے بھی کیسے بچے!

ایک سے ایک بے ایمان..... ایک سے ایک جھوٹا..... ایک سے ایک روندو..... سارا دن ایک دوسرے سے جھگڑتے۔ شام کو صورتیں بگڑی ہوئیں' بال الجھے ہوئے' مٹی میں لت پت' لہولہان دادی کے بس کے نہ خورشید کے قابو میں آنے والے..... شام کو خاور کے سامنے مقدموں کا دربار کھل جاتا۔ دادی سارا دن دھواں دھار پیٹ رہی ہیں۔ سمجھا رہی ہیں۔ گلا پھاڑ رہی ہیں۔ لیکن وہاں کون سنتا ہے کسی کی کنچے' اخروٹ' نیا ناپڑ' پتنگ' کبڈی کا بازار کھلا ہے۔ محلے کے بچے آ جا رہے ہیں۔ چھوٹی لڑکیاں لپ سٹک لگائے بالوں میں رنگین کلپ لگائے بروکیڈ شنیل کے کپڑے پہنے ناخنوں پر تیز گلابی کیوٹکس جمائے پھرتی ہیں۔ وہ تو باجی بلقیس کا وجود تھا کہ بچے ڈر کر سہمے جاتے تھے۔ دادی ماں بیچاری نحیف و نزار عمر اور زمانے کی کھائی کھدری وہ کیا سمجھاتی' کیا بناتی کسی کا۔

جب خاور شام کو رات میں ڈھالتے۔ شکایتوں' مقدموں کا انبار صاف کرتے کرتے تھک جاتے تو جھنجھلا کر اماں سے کہتے..... "اب اماں اگر تم بچے سنبھال سکتیں تو مجھے کیا پڑی تھی کہ اس سانڈنی کو مناتا پھرتا۔"

کبھی کبھی اماں بھی بگڑ کر کہتیں۔ "ہاں جی اس نے بگاڑے بھی تو اسی لیے ہیں کہ سوائے اس کے کوئی سنبھال نہ سکے۔ سارا دن گلی میں اودھم مچائے پھرتے ہیں۔ لڑکیاں ایسی میسنی کہ کھایا پیا اور گندے برتن کھرے میں ڈال چھپت..... مجال ہے جو سوئی میں دھاگا بھی پرو دیں..... جن کے گھر جائیں گی آنکھوں میں مٹھیاں دے دے کر روئیں گے....."

"جو کچھ بھی ہے اماں اس کے بغیر کام نہیں چلتا..... ورنہ میں کیا ایسا اس پر دیوانہ تو نہیں ہوا۔"

آخر خاور میاں کو باجی بلقیس بلوانا ہی پڑتیں۔ انہیں خط لکھنا ہی پڑتا۔ جس میں روایتی قسم کا اظہار محبت ہوتا۔ معافی بھی مانگی جاتی اور آئندہ احتیاط برتنے کی تمنا بھی ظاہر کی جاتی۔ گو ابھی تک خاور کو یہ بھی علم نہ ہو پاتا کہ آخر لڑائی کس بات پر ہوئی تھی۔

باجی بلقیس خط پاتے ہی سسرال روانہ ہو جاتیں۔

اس وقت باجی بلقیس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ ان کی آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی میچ جیت کر آ رہی تھیں۔ ڈاکٹر سرفراز مغل کے کلینک کا جالی دار دروازہ کھول کر انہوں نے بڑے لاڈ سے کہا۔

"پھوپھو جی..... سارا گھر ڈھونڈ نکالا آپ یہاں ہیں۔"

"میں تمہارے پھوپھا جی سے پیسے لینے آئی تھی تو چلو اور تسنیم کہاں ہے۔" بلقیس باجی نے ملک اثر جتھ کی ٹکٹ کا لفافہ ہوا میں لہرا کر کہا..... "اب تو پھوپھی جی! آپ کو اکیلے ہی راحیلہ کا جہیز بنانا پڑے گا..... میں تو گھر جا رہی ہوں....."

"لو ہم تمہیں جانے دیتے ہیں۔ اب تو راحیلہ کی رخصتی تک ٹھہرنا پڑے گا۔"

"لیں آپ خود پڑھ لیں خط۔ لکھتے ہیں بچے بہت یاد کرتے ہیں۔ خورشید تو خیر سیانی ہے لیکن راشدہ اور رانی تو رو رو کر نڈھال ہو جاتی ہیں....."

ڈاکٹر صاحب نے الماریوں میں بھری جن اخبار بچھانے کے بجائے انہیں پڑھنا شروع کر دیا تھا اور وہ ان کی میز پر بے ترتیب پڑے تھے۔

"اچھا ساجدہ میں سکھ جندر سنگھ کے ہاں چلا ہوں۔ انہیں پھر کولک ہو گئی ہے۔ تم سب میاں صاحب کے ہاں چلی جانا۔ مجھے اگر ہسپتال سے فرصت ہو گئی تو میں آ جاؤں گا ورنہ تم میاں صاحب سے معافی مانگ لینا۔"

"اچھا پھوپھا جی خدا حافظ۔" آگے بڑھ کر باجی بلقیس نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے سر جھکا دیا۔

"کیوں بھئی یہ خدا حافظ کیسا۔ ساجدہ تو کہہ رہی تھیں تم بازار جا رہی ہو ان کے ساتھ..... زیور لینے راحیلہ کا....."

"بس جی مجبوری ہے۔ میں نے تو تانگا بھی منگوا لیا ہے۔ میں تو گھر جا رہی ہوں۔ بارہ بیس کی ٹرین سے....."

"بھئی یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بیگم عباس نے محض تمہاری خاطر لنچ کیا ہے۔ تم ہی چلی جاؤ گی تو ان کا دل برا ہو گا۔" ڈاکٹر صاحب نے بیگ اٹھا کر کہا۔

"پھوپھا جی..... میں خدا قسم بالکل معذور ہوں۔ مجھے اس بات کا احساس ہے لیکن حکم حاکم مرگ مفاجات!"

ساجدہ ماں نے مسکرا کر فرش پر نظر ڈالی..... واہ کیا کمینے کار بیوی تھی بلقیس بھی!

"ساجدہ تمہیں کب جانے دیں گی؟" ڈاکٹر صاحب خوشدلی سے بولے۔

"انہیں میں سمجھا لوں گی....."

"اگر ایسی ہی بات ہے تو بھئی خدا حافظ..... خاور کو میرا سلام کہنا اور اماں جی کی خدمت میں بندگی۔"

اور باوجود یکہ راحیلہ اور اوما نے بہت شور مچایا تسنیم نے کاکا ادریس کو گود میں اٹھایا اور غسلخانے میں بند ہو گئیں۔ ساجدہ ماں نے بہت زور لگایا لیکن باجی بلقیس کو تو خط آ گیا تھا۔ وہ فتح کا جھنڈا گاڑ نے اپنے گھر واپس جانا چاہتی

تھیں.....اور بلقیس باجی دولت رام سنیارے کے پاس جانے کے بجائے سٹیشن پر چلی گئیں۔ جہاں انہیں ڈیڑھ بجے کی ٹرین سے لاہور جانا تھا۔

یہ شمالی ہندوستان کی مڈل کلاس عورتوں کا عمومی پیٹرن تھا۔ گھروں میں اخبار آتے تھے لیکن اخبار پڑھنے کا رواج عورتوں میں شاذ ہی تھا۔ ان کے میاں مسلم لیگی ہیں کہ کانگریسی اس میں بھی گھر میں کسی کو دلچسپی نہ تھی۔ گھر کی دہلیز پار الیکشن ہو رہے ہیں کہ جلوس نکلتے ہیں' قتل و غارت کا بازار گرم ہے کہ ہندو مسلمان کوٹھے ملی منڈیروں پر باہم شیر و شکر رہتے ہیں' یہ بھی گھروں کے اندر گھسنے والے مسائل نہ تھے۔ ہندو عورتیں ماتھے پر بندی اور جسم پر ساڑھی لپیٹ کر اپنی جداگانہ شخصیت کا بیڑا اٹھائے پھرتی تھیں۔ مسلمان مڈل کلاس عورت کے لیے شلوار قمیض اور برقعے کافی تھے.....صدیوں پر چلتی آئی پابندیوں نے دونوں دریاؤں کو آپس میں گھل مل جانے کے مواقع بہم نہ کیے تھے۔ مسلمان اور ہندو مڈل کلاس لوگوں میں مال کی وسعت اس قدر نہ تھی کہ وہ بیجا طور پر کھل کھیلے اور وسیع پیمانے پر میل جول کی صعوبتوں میں پڑتے۔ مڈل کلاس' درمیانے درجے کے لوگ دائرے کا سفر کرتے تھے.....وہی صبح و شام وہی روزی کی تلاش' بچوں کی پرورش' ساس بہو کے جھگڑے' رشتہ داروں کی جانب بڑھنا اور غیبت کا سہارا لے کر ان سے چھٹکارا حاصل کرنا.....موسموں کی طرح تبدیلی آتی رہتی لیکن اس یقینی تبدیلی میں کچھ ان ہونے' حیرت افزا' تھپٹ کر دینے والے حالات نہ ہوتے۔ مرد بار بار عشق کی بھٹی میں جلتے اور ہر بار محبت میں بھی کچھ نیا پن نہ ہوتا.....فراق اور وصال کی گھڑیاں حساب کے سوالوں کی طرح عموماً طے شدہ جواب نکالتیں.....نارمل' ابنارمل اور سوپر نارمل میں مڈل کلاس کے انسان کے لیے ایک ہی عافیت کی نئی تھی' وہ اخلاقی اقدار تھیں۔ کچھ Do's Don't تھے.....کچھ Cliches تھے۔ لوک لاج لوک ریت کے سہارے یہ لوگ اپنے پرکھوں کی زندگی بسر کیے جاتے تھے.....ہندو لڑکیاں ستار ہارمونیم بجاتی تھیں۔ مسلمان لڑکیاں کشیدہ کاری کروشیے کے سہارے لمبی دوپہریں کاٹتی تھیں۔ بیت بازی' مشاعرہ' چوری چھپے کی آشنائی' چچازاد ماموں زاد کی قدرتی کشش' مال کی ناعاقبت اندیشی' پڑھائی سے غفلت' میلے ٹھیلے میں دلچسپی ابھی سوسائٹی کا بنیادی شعار تھا۔ کوٹھے اور طوائف ابھی جاندار طور پر آباد تھے..... اینگلو انڈین لڑکیوں سے عشق کرنا معیوب ہونے کے باوجود پرکشش تھا۔ تعلیمی قسم کی سرگرمیاں ابھی شام و سحر کا حصہ نہ تھیں۔ غزل مقبول تھی اور قریباً ہر گھر میں ایسے افراد مل جاتے تھے جنہیں ہزاروں شعر ازبر تھے۔ کرکٹ اور ہاکی کے نام سے لوگ ناواقف تھے۔ ہاں کچھ پڑھے لکھے لوگوں میں بیڈمنٹن' کیرم' شطرنج کا رواج تھا۔ ٹینس بھی اونچے وی آئی پی قسم کے امراء میں کھیلی جاتی تھی۔ سکولوں میں لڑکیاں شوق سے فٹ بال کھیلتی تھیں اور فٹ بال کی ٹیموں میں ڈسٹرکٹ کی سطح پر مقابلے ہوتے تھے۔ سکول کالجوں میں Debates کا ابھی کوئی سرگرمی نہ تھی۔ ڈرامے سٹیج کرنے کا البتہ رواج تھا اور لڑکیاں سارا سال اس سالانہ Activity کا گرمجوشی سے انتظار کرتی تھیں۔ مشنری کالجوں' سکولوں میں اکثریت ہندو لڑکیوں کی تھی۔ مسلمان گھرانوں میں اول تو لڑکیوں کی تعلیم پر ہی توجہ نہ تھی اور اگر سرسید کے ہم خیال بچیوں کو سکول بھیج بھی دیتے تو وہ سرکاری سکول تھے جہاں کی پڑھائی سے لڑکیوں میں انگریزی پڑھنے کا رواج مضبوط نہ ہو پاتا۔

باہر کے حالات کا ابھی اندرون خانہ اثر ہونے پایا تھا اور زندگی آہستہ خرامی سے چل رہی تھی۔ مسائل ایک پود سے دوسری پود تک آہستہ آہستہ سرایت کر جاتے اور ان کا حل بھی وہی ہوتا جو اوپر والی پود بتا دیتی.....انسانی فطرت ہر لحظہ

گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے پر آمادہ نہ تھی..... لیکن بدلتے حالات دستک دے رہے تھے.....

چھٹیوں کا اختتام آ رہا تھا اور راحیلہ حیران تھی کہ اتنی لمبی چوڑی تعطیلات پلک جھپکتے میں کیسے گزر گئیں۔ ابھی اس نے کورس کی کسی کتاب کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ اب وہ کالج پہنچ کر دوسری لڑکیوں کا کیسے مقابلہ کرے گی۔ پروفیسروں نے بڑی تاکید سے کہا تھا کہ سارے کورس کو ایک بار ضرور پڑھ لیں۔ گھر میں مہمان جمع ہو رہے تھے۔ تسنیم باجی تو مہینہ بھر سے آئی بیٹھی تھیں۔ وہ سارا دن ساجدہ ماں کے ساتھ جہیز کی فہرستیں' سامان کی فراہمی' جوڑوں کی تیاری میں لگا تیں۔ ان کی دردسری کی وجہ سے پچھلے گودام میں نئی چپنی جستی ٹرنک' ونج دان' سوٹ کیس جمع ہو گئے تھے۔ ساجدہ ماں اور تسنیم دن میں ایک بار دولت رام سنیارے کے پاس ضرور جاتیں۔ واپسی پر ان کے ساتھ ملکی حالات کی ان گنت کہانیاں ہوتیں۔

کہیں سے باجی بلقیس بھی آ گئی تھیں۔ ان کا آنا بڑی رونق کا باعث ہوا۔ ویسے تو اوما تقریباً دن بھر راحیلہ کے ساتھ کاٹتی تھی لیکن ایک شام اوما چھوٹا سا صندوق اٹھائے یوں وارد ہوگئی گویا گھر سے نکال دی گئی ہو۔ ٹرنک کو راحیلہ کے ڈریسنگ روم میں رکھ دیا گیا۔

اوما کے آنے کی راحیلہ کو بہت خوشی تھی۔

''اچھا تو اب رہو گی ناں.....''

''ہاں رہوں گی..... رہنا پڑے گا۔ ماتا جی اور پتا جی تو برما سدھارے..... میں اور کس کے پاس رہوں..... بھلا..... پر ماتا جی نے ایک بات پکی پکی کہی ہے' میں ماس نہیں کھاؤں گی۔''

راحیلہ نے اوما کا چہرہ دیکھ کر فوراً اس کے گلے میں بازو ڈال دیئے..... ''اوما تم تو ہو ہی ہماری..... ماتا جی سے کہو ناں' وہ تمہیں ڈاکٹر صاحب کو دے دیں..... پھر ہم دو بہنیں ہو جائیں گی۔'' اوما کا چہرہ اداس تھا۔ وہ ساری باتیں راحیلہ کو بتا نہیں سکتی تھی۔ سارے مشورے سارے خدشے بیان کرنا ممکن نہ تھا۔

''پتہ نہیں کچھ لوگوں کا گھر نہیں ہوتا..... ان کا کوئی وطن نہیں ہوتا راحیلہ..... اگر کوئی نہ سنے تو ان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ جانتی ہو کیوں.....''

''ناں.....'' راحیلہ سر ہلا کر بولی۔

''گھر..... وطن' مذہب..... کچھ لوگ ہونے سے ہوتا ہے۔ خالی مکان گھر نہیں ہوتا۔ ایک قوم نہ ہو تو وطن پر وشواس نہیں آتا..... اور ماں باپ اپنا ہاتھ پکڑا کر بھگوان کے ہاتھ میں نہ دیں تو مذہب بھی اچاٹ کر دیتا ہے..... کبھی کبھی مجھے لگتا ہے میرا بھی اس جیون میں اپنا کچھ نہیں ہے..... کبھی موسی کرشنا کے آشرم میں..... کبھی یہاں ماتا جی کے پاس۔ کبھی برما.....''

راحیلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے..... وہ چپکی سی ہو گئی۔

''ماننا چاہو تو سارے دیس تمہارے..... بھگوان تمہارا..... ہر گھر تمہارا..... اوما! پر ماننے کو جی نہ چاہے تو آدمی خالی ہاتھ آیا خالی ہاتھ ہی جائے گا.....''

وہ دونوں اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنی سوچ کو آگے بڑھاتیں لیکن اس وقت باجی بلقیس آتشی گلابی ساڑھی

میں سانڈ جیسی تندرست وارد ہوئیں۔ ان کے ساتھ پیارا سا کاکا۔ اپنا لکڑی کا گھوڑا پکڑے دروازے میں آ کھڑا ہوا.....

بلقیس آپا نے پاس آ کر کہا..... "راحیلہ..... کاکا ادریس ضد کر رہا ہے ساتھ جانے کی۔ ہم لوگ خدا جانے بازار سے کب لوٹیں..... ذرا اس کو بہلا لو....."

راحیلہ نے آگے بڑھ کر کاکے کو گود میں لے لیا۔ اوما اپنا صندوق کھول کر کپڑے نکالنے میں مشغول ہو گئی۔ بلقیس آپا پیچھے سے چپ چاپ کھسک گئی۔

"بھائی یہ تمہارا گھوڑا چلتا نہیں؟"

"نہیں تھالا وی..... گھولا نہیں تلتا....."

راحیلہ نے بہت سنجیدہ منہ بنا کر کہا..... "اچھا..... گھوڑے کو دانہ دیا؟"

"نہیں..... دانہ نہیں دیا....."

"چچ چچ چچ ہائے کاکا جی جب گھوڑا بھوکا ہے تو چلے کیونکر؟ اب اپنے تانگے والا گھوڑا ہے ناں..... کیسا فر فر بھاگتا ہے۔ اگر وہ دانہ نہ کھائے تو ٹھس ہو جائے یوں۔" اس نے گردن لٹکا کر کہا.....

کاکا ادریس ادھر ادھر نظریں گھما کر اپنی اماں کو تلاش کرنے لگا۔

راحیلہ نے اس کی توجہ بٹانے کے لیے دونوں ہاتھ جوڑ کر اگلی پچھلی انگلیاں یوں رکھیں کہ درمیان والی دونوں انگلیاں نیچے غائب کر دیں۔ اب یہ میرا گھوڑا ہے' سامنے والا' خوب دانہ کھا کر پانی پی کر چلا ہے اور یہ پچھلا گھوڑا کاکے کا ہے..... بھوکا پیاسا میرا گھوڑا بھاگتا بھاگتا..... کاکے کا گھوڑا ٹھس..... اس نے پچھلی انگلیاں یکدم بٹھا کر کہا۔

کاکا نے یکدم لکڑی کا گھوڑا پھینک دیا اور اپنی انگلیاں تیز تیز چلا کر کہا..... "کاکے کا گھولا بھاگتا بھاگتا تھالا کا گھولا ٹھس....." کاکے نے ساری انگلیاں بٹھا دیں۔

"نہیں کاکے کا گھولا ٹھس....."

"نہیں تھالا کا گھولا ٹھس....."

کھیل میں ہار کر کاکا بسورنے لگا۔ راحیلہ کو احساس ہوا کہ اس نے بہلانے کا غلط طریقہ اپنا لیا تھا۔

"میں امی کے پاس جاؤں گا....."

"لو لو..... نہیں بھئی رونا نہیں۔ اب آپ کا گھولا بھاگتا بھاگتا خالہ کا گھوڑا ٹھس....."

کاکا راحیلہ کی گود سے کھسک کر دیوار سے لگ گیا اور آنکھیں مسلتے ہوئے کہنے لگا..... "امی..... امی وی تھالا مالق ہے..... اوں اوں..... اوں"

"آؤ بھئی آؤ میرا گھوڑا ٹھس پھس ٹھاہ....."

لیکن کاکا دیوار کے ساتھ لگ کر پھسک پھسک کر رونے لگا۔

اوما نے ٹرنک کے کپڑے چھوڑ دیے اور پاس آ کر بولی..... "بس رلا دیا ناں..... کچھ نہیں آتا تجھے..... آؤ جی آؤ راجہ بھیا..... ہم گھوڑا گھوڑا کھیلیں گے۔ میری کمر پر بیٹھو راجہ جی....." وہ یکدم گھٹنوں کے بل

میں سانڈ جیسی تندرست وارد ہوئیں۔ ان کے ساتھ پیارا سا کاکا۔ اپنا لکڑی کا گھوڑا پکڑے دروازے میں آ کھڑا ہوا.....

بلقیس آپا نے پاس آ کر کہا..... ''راحیلہ.....کاکا ادریس ضد کر رہا ہے ساتھ جانے کی۔ ہم لوگ خدا جانے بازار سے کب لوٹیں..... ذرا اس کو بہلا لو.....''

راحیلہ نے آگے بڑھ کر کاکے کو گود میں لے لیا۔ اوما اپنا صندوق کھول کر کپڑے نکالنے میں مشغول ہوگئی۔ بلقیس آپا پیچھے سے چپ چاپ کھسک گئی۔

''بھائی یہ تمہارا گھوڑا چلتا نہیں؟''

''نہیں تھالا دی..... گھولا نہیں تلتا.....''

راحیلہ نے بہت سنجیدہ منہ بنا کر کہا..... ''اچھا..... گھوڑے کو دانہ دیا؟''

''نہیں..... دانہ نہیں دیا.....''

''چچ چچ چچ ہائے کاکا جی جب گھوڑا بھوکا ہے تو چلے کیونکر؟ اب اپنے تانگے والا گھوڑا ہے ناں..... کیسا فر فر بھاگتا ہے۔ اگر وہ دانہ نہ کھائے تو ٹھس ہو جائے یوں۔'' اس نے گردن لٹکا کر کہا.....

کاکا ادریس ادھر ادھر نظریں گھما کر اپنی اماں کو تلاش کرنے لگا۔

راحیلہ نے اس کی توجہ بٹانے کے لیے دونوں ہاتھ جوڑ کر اگلی پچھلی انگلیاں یوں رکھیں کہ درمیان والی دونوں انگلیاں نیچے غائب کر دیں۔ اب یہ میرا گھوڑا ہے' سامنے والا' خوب دانہ کھا کر پانی پی کر چلا ہے اور یہ پچھلا گھوڑا کاکے کا ہے..... بھوکا پیاسا میرا گھوڑا بھاگتا بھاگتا..... کاکے کا گھوڑا ٹھس..... اس نے پچھلی انگلیاں یکدم بٹھا کر کہا۔

کاکا نے یکدم لکڑی کا گھوڑا پھینک دیا اور اپنی انگلیاں تیز تیز چلا کر کہا..... ''کاکے کا گھولا بھاگتا بھاگتا تھالا کا گھولا ٹھس.....'' کاکے نے ساری انگلیاں بٹھا دیں۔

''نہیں کاکے کا گھولا ٹھس.....''

''نہیں تھالا کا گھولا ٹھس.....''

کھیل میں ہار کر کاکا بسورنے لگا۔ راحیلہ کو احساس ہوا کہ اس نے بہلانے کا غلط طریقہ اپنا لیا تھا۔

''میں امی کے پاس جاؤں گا.....''

''لو لو..... تمہیں بھی رونا نہیں۔ اب آپ کا گھولا بھاگتا بھاگتا خال کا گھوڑا ٹھس.....''

کاکا راحیلہ کی گود سے کھسک کر دیوار سے لگ گیا اور آنکھیں مسلتے ہوئے کہنے لگا..... ''امی..... امی دی تھالا مالتی ہے..... اوں اوں..... اوں''

''آؤ بھئی آؤ میرا گھوڑا ٹھس پھس ٹھاہ.....''

لیکن کاکا دیوار کے ساتھ لگ کر پھسک پھسک کرنے لگا۔

اوما نے ٹرنک کے کپڑے چھوڑ دیئے اور پاس آ کر بولی ..... ''بس رلا دیا ناں..... کچھ نہیں آتا تجھے..... آؤ جی آؤ راجہ بھیا..... ہم گھوڑا گھوڑا کھیلیں گے۔ میری کمر پر بیٹھو راجہ جی.....'' وہ یکدم گھٹنوں کے بل

دونوں ہاتھ ٹیک کر فرش پر ہو رہی۔

"تو بھی پاگل ہے ابھی باجی بلقیس آ کر کہیں گی' کاکا رلا دیا....."

"باجی بلقیس کا بچہ ہے ہی رونا..... ہر وقت ریں ریں ریں ریں.....کبھی تسنیم آپا کے ٹکو کو بھی روتا دیکھا ہے.....ٹکو ٹکو.....او ٹکو بلے....." راحیلہ نے گیلری میں جا کر آواز دی اور ٹکو کا انتظار کرنے لگی۔

باجی بلقیس اپنی پھوپھی کے پاس پندرہ دن کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ انہیں ساجدہ ماں سے کچھ اتنا پیار نہ تھا جتنا وہ ظاہر کرتی تھیں۔ جھپیاں' تعریفیں' باتیں' تحفے.....اضافی حرکتیں تھیں۔ یوں تو وہ سالوں ادھر کا رخ نہ کرتیں لیکن جب شوہر سے سنگین قسم کی کھٹ پٹ ہو جاتی تو یکدم انہیں ساجدہ پھوپھو بے طور یاد آ جاتیں۔ باجی بلقیس نے جب بھی شوہر کے ساتھ دنگا فساد کیا' کھٹ پٹ کے بعد میکے کا رخ کیا' ہمیشہ انہیں منہ کی کھانا پڑی۔ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ بلقیس باجی کی ماں انتظار کرتیں پھر انہیں واپس بھیجنے کی تدبیریں شروع ہو جاتیں اور یوں سسرال میں بلقیس باجی کے وقار کو ٹھیس پہنچنے کا امکان بڑھ جاتا.....لیکن اس بار جھگڑے کے بعد باجی بلقیس میکے گھر نہ گئیں۔ انہیں اپنی ماں کی نصیحتوں سے بڑی چڑ تھی۔ کاکا اور ریس کو ساتھ لیا اور پھوپھی ساجدہ کے پاس پہنچ گئیں.....ملکی حالات گو خراب تھے لیکن گھروں کے اندر کی فضا ابھی بھی پر اطمینان تھی۔ پھر یہاں تو راحیلہ کی شادی کی تیاریوں میں تھی۔ بازاروں کے چکر کپڑے لتے کی تیاری زوروں پر تھی۔

باجی بلقیس چھ بچوں کی ماں تھیں لیکن ان کی تمنا تھی کہ چوتھی کی دلہن کے سے ناز بگھاریں۔ ذرا سی اونچی نیچی بات ہو جاتی تو سر پکڑ کر بستر پر ڈھیر ہو جاتیں۔ پھر شوہر کا دفتر جانا ملتوی' ساس بیچاری دبے پاؤں آنگن میں چکر لگاتی۔ بچے سہم جاتے' لیکن بلقیس باجی جب تک شوہر سے معافی نہ منگوا لیتیں' ان کو قصوروار نہ ٹھہرا لیتیں۔ ان کے ماتھے کی پٹی نہ کھلتی نہ ہی ان کا سر درد جاتا۔

باجی بلقیس کا قد ڈاکٹر سرفراز سے کچھ ہی دبتا تھا۔ ویسے بھی ماشاءاللہ جسم پر چربی ہی چربی تھی۔ اس پر ساڑھی پہننے کا خبط تھا۔ ساٹن اور پالش تک کی ساڑھیاں بنا کر لپیٹ لیتیں۔ پوری چبوترہ سی بنی کمرے سے کمرے ٹہلتی پھرتیں۔ ابھی جب وہ کاکا اور ریس کو چھوڑنے راحیلہ کے کمرے میں آئیں تو کریپ کی ساڑھی زیب تن کیے ہوئے تھیں۔ اس ساڑھی پر جا بجا گوٹے کے پھول ٹکے تھے اور کنارے کنارے چوڑا اناری بارڈر لگا تھا لیکن باجی بلقیس کا دل اس زیبائش سے بھرا نہ تھا۔ آخر وہ ساجدہ ماں اور تسنیم آپا کے ساتھ بازار جا رہی تھیں! اس گلابی ساڑھی کے ساتھ انہوں نے بڑے بڑے پھولوں کے پرنٹ کا ساٹنی بلاؤز زیب تن کر رکھا تھا۔ بلاؤز کی کساوٹ میں ان کی چربی نے جا بجا خربوزوں کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔

تسنیم کے اکلوتے بیٹے ٹکو نے کمرے میں جھانک کر کہا..... "جی راحیلہ خالہ....."

"آؤ جی گھوڑا گھوڑا کھیلیں.....یہ کاکا ہم سے سنبھل نہیں رہا۔"

ٹکو آٹھ برس کا ہو چلا تھا لیکن ایسا سیانا کہ ہر وقت اسے اپنی ماں کا خیال رہتا۔

"خالہ راحیلہ چھٹیوں کا کام بہت ہے اور ماسٹر جی نے کہا ہے....." وہ اپنے سیاہی رنگے ہاتھوں کو دیکھ کر بولا۔

"توبہ ہے.....یہ لڑکا تو نے کس خمیر سے اٹھایا ہے تسنیم آپا.....کتابوں کا کیڑا۔ آ جا کھیلیں' کچھ نہیں کہتا تیرا ماسٹر۔"

کچھ لمحوں کے لیے اس کی نظر کے آگے کالج کی ڈسپلن والی پروفیسریں گھوم گئیں۔ اوما ابھی کاکا ادریس کو بہلانے میں مشغول تھی اور توتلی زبان میں بول رہی تھی۔

''اچھا ٹکو تو نے گھوڑا میں سوار......''

''اچھا جی......''

ٹکو راحیلہ کی پیٹھ پر اکڑ کر بیٹھ گیا اور راحیلہ کی لمبی چٹیا کو چابک کے طور پر استعمال کرنے لگا۔ راحیلہ پلنگوں کے گرد صوفے کے پاس ڈریسنگ ٹیبل سے ٹکرا کر گھڑ سوار کے حکم پر چلنے لگی۔ کاکا ادریس اس کھیل سے محظوظ ہو رہا تھا۔ پہلے اس نے گھوڑے اور سوار کو انکھیوں سے دیکھا۔ پھر اوما کی گود میں ذرا آگے بڑھ کر بولا...... ''تھالا جی...... گھولا...... آ بابا...... تھالا جی گھولا......''

راحیلہ نے ڈریسنگ ٹیبل کے پاس پہنچ کر نعرہ لگایا۔ ''لو جی مال منڈی آ گئی...... جو چاہے خرید لو...... کھیلتے ہو کاکا جی کہ ابھی رونے کا ارادہ ہے......''

کاکا نے اوما کی بھوری چٹیا پکڑ لی۔

''چلو ہو جائے ریس...... چلو گیلری میں...... دیکھیں کون جیتتا ہے۔''

اوما کی پیٹھ پر کاکا ادریس...... اور راحیلہ کی کمر پر ٹکو دونوں ٹانگیں دائیں بائیں ڈال کر چڑھ بیٹھا۔

''لے بھئی گدگدانا نہیں...... یہ فاؤل ہے ٹکو۔''

''ہاں جی مجھے پتہ ہے......''

اوما اور راحیلہ گھوڑے تھے۔ ٹکو اور ادریس کاکا سوار۔ گیلری میں اودھم مچا تھا۔ جب عابدہ اور شاہد گیلری کا دروازہ کھول کر اندر آئے...... شاہد کے دل میں کہیں راحیلہ کی یہ تصویر رہ گئی...... اسی لمحے عابدہ نے بھی محسوس کیا کہ اس قدر حسن کے ساتھ وہ ریکٹ سمیت مقابلہ نہیں کر سکتی۔

☆☆☆

ڈرائنگ روم کے دروازے کے پاس دادا ابا سے جان بچانے کے لیے راحیلہ اور اوما پھر رک گئیں۔

''تمہیں کیا پتہ میں نے اپنی آنکھوں کیا دیکھا ہے...... بتاؤ وہ سب جھوٹ ہے......''

اوما نے کسی معلم اخلاق کی طرح انگلی اٹھائی اور بولی...... ''سنو راحیلہ...... اپنے پریمیوں کے جھوٹ کو اپنی آنکھوں کے سچ سے اچھا جانتے ہیں...... ایسے میں اپنا دل ٹوٹنے سے بچ جاتا ہے...... ماتا جی کہتی ہیں سنو ناں ماتا جی کچھ غلط تھوڑے کہتی ہیں ہاں......''

راحیلہ کوئی تین انچ اوما سے لمبی تھی۔ عمر میں بھی اس سے بڑی تھی۔ اس کی دنیا کے اصول اور تھے لیکن ماتحت وہ ہمیشہ اوما کی تھی۔ وہ اوما کے ہاتھوں میں ایسے تھی جیسے کسی قمار باز شوہر کی بیوی...... جوئے کے لیے زیور نہ بھی دینا چاہتی ہو پھر بھی رو نہ سکے۔

''اللہ اسی طرح اندر چلیں پسینے میں شرابور......'' دروازے میں کھڑی راحیلہ نے پوچھا۔

''ہاں تو اور کیا.....''

''ہائے نہیں.....''

''چلو.....پھر کپڑے بدل آؤ' میں اندر چلتی ہوں.....''

اوما گیلری والے پردے کو اٹھا کر اندر چلی گئی۔

راحیلہ نے سوچا.....اوما کے بارے میں.....اس میں کتنا اعتماد تھا۔ اوما میں کچھ ایسا تھا جو اس میں نہیں تھا۔ وہ حالات کے آگے کھڑی ہو جاتی' بھاگتی نہیں تھی۔

وہ شاہد سے کیا کہے گی؟

سب کے سامنے کیسے کہے گی کہ خان صاحب کی اکلوتی عابدہ تمہاری کون ہے؟ کاش وہ اوما کی طرح آنکھوں میں ہی سارے سوال کر سکتی؟ پھر وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

چاندی کرنیں روشندان میں سے تختے کی صورت اتر رہی تھیں۔ اسی روشنی میں ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی چیزیں اسے صفائی سے نظر آ رہی تھیں۔ باقی سارا کمرہ اندھیرے میں تھا۔ کمرے میں باسی پھولوں کی خوشبو تھی۔ اس نے کلائی پر باندھی گھڑی پر نظر دوڑائی۔ حروف نظر نہ آئے تو اس نے بتی جلائی اور اپنے چہرے کو آئینے میں دیکھا۔

خدا جانے میں اس قدر زرد کیوں دکھائی دیتی ہوں.....

آج تو مجھے غازے کی ضرورت پڑ جائے گی۔ چند لمحے آنکھوں کے حلقوں کو دیکھ کر اس نے الماری کھولی.....

ہینگر پر ٹنگی گلابی رنگ کی قمیض نکالی۔ دوپٹہ کھینچتے ہوئے کئی ریشمی کپڑے آپ ہی پھسل آئے۔ اس نے انہیں تہہ کرنے کی زحمت نہ کی اور واپس الماری میں ٹھونس دیا۔

آج میں کتنی زرد لگ رہی ہوں۔

کیا یہ عابی کا خوف تھا؟

کیا چاندی کرنیں' کپڑوں کا رنگ اس زردی کا باعث تھا؟

کہیں سے اس کے کانوں میں ڈھولک کی آواز پر گیت ابھر رہا تھا.....مہندی کا گیت اور اس کا دل اچھل رہا تھا.....

دعوتیں کرنے کا رواج عام تھا اور خاص کر ہونے والے سمدھیوں کے ناز نخرے اٹھا کر لطف حاصل ہوتا تھا۔ شادی سے پہلے لڑکے والے اور شادی کے بعد لڑکی والے غلام سے نظر آتے۔

بیگم عباس نے بھی ڈاکٹر صاحب کے گھر والوں کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ جب راحیلہ کو شاہد کے لیے منتخب کر ہی لیا تھا تو وہ اہتمام کیسے نہ کرتیں۔ یہ دعوت انہوں نے باجی بلقیس کے اعزاز میں کی تھی لیکن جب دوپہر کے وقت وہ ساتھ نہ آئیں تو بیگم عباس نے دل ہی دل میں سکھ کا سانس لیا۔ بلقیس باجی کو وہ پسند نہ کر پائی تھیں۔

بظاہر رنج کرتے ہوئے انہوں نے کہا.....''لو ساجدہ آپا یہ کیا بات ہوئی' بان' ادھر بھائی صاحب سکھر' سکھر کے سدھارے ادھر اوما نہیں آئی اور بلقیس باجی اپنے گھر سدھاریں' یعنی آج لطف آ چکا.....ہائے۔''

ساجدہ ماں نے ابرو اٹھا کر کہا.....''کیا بیان کروں اپنے قادر میاں کو تو ٹل بھر کو بھی نہیں چھوڑ سکتی۔ پھر اس بار تو

بچے بھی چھوڑ آئی تھی۔ صرف کا کا اور یس ساتھ تھا۔ میری محبت کھینچ لائی۔ چاہتی تھی کہ راحیلہ کے بیاہ تک ٹھہرے پر تو بہ جی خاور نے شور مچا دیا' حالات اچھے نہیں۔ فسادات ہو رہے ہیں۔'' پھر ساجدہ وہاں نے آنکھ مار کر کہا.... ''ہمارا آپ کا معاملہ نہیں ہے۔ چھ بچے ہیں۔ پھر ایسا چاؤ ہے گویا نئی دُلہن ہو.....''

اپنی جمیلہ پر نگاہ ڈال کر بیگم عباس بولیں..... ''اللہ ہر لڑکی کو قدر والوں میں بیاہے ساجدہ آپا..... بھلا عورت کے پاس اور ہوتا کیا ہے..... آیئے چلیں کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے.....''

کھانے کی میز پر سوائے شاہد کے اور کوئی مرد نہ تھا۔ وہ اور راحیلہ میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے اور عابدہ شاہد کے بالکل ساتھ والی سیٹ پر تھی..... اوما ساتھ نہیں آئی تھی۔ اس کے والدین نے جاتے وقت تاکید سے کہا تھا کہ ڈاکٹر سرفراز مغل کی اور بات ہے۔ ان کے گھر بچپن سے آنا جانا ہے۔ کسی اور مسلے کے گھر میں ان پانی کرنے کی پکی مناہی تھی۔

کھانے والے کمرے کی لمبی کھڑکی سے باہر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔

بادل تو صبح سے گھرے تھے لیکن جب وہ سب کھانا کھانے لگے تو بادل پھٹ پڑا..... ایسے کڑاکے کی بجلی گری کہ اس کی روشنی میں سارا کمرہ سفید ہو گیا اور راحیلہ کرسی سے اچک کر ساتھ بیٹھی نسیم آپا سے چپک گئی۔ بادلوں کی گرج چمک کے ساتھ یکدم بوندیں ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگنے لگیں۔ ڈاکٹر صاحب کا تانگہ جس پر سارے آئے تھے پورچ میں کھڑا تھا اور ان کا گھوڑا لان میں دور بندھا تھا لیکن اب اسے بھی پورچ میں باندھنا پڑا۔

بارش اتنی تیز تھی کہ کھانے والے کمرے میں اندھیرا ہو گیا اور بتیاں جلانی پڑیں۔ لڑکیوں پر اس بارش کا اثر ہو رہا تھا۔ وہ چپ چاپ کھانا کھانے میں مشغول تھیں لیکن مغربی تہذیب کی دلدادہ کٹے ہوئے بالوں کو ہلکورے دیتی باتیں کر رہی تھیں۔ راحیلہ کول سی لڑکی جو بات بے بات لاجونتی کی طرح سکڑ جاتی' راحیلہ جو اپنے کپڑوں کو یوں بھینچتی گویا اپنا آپ اندر چھپا لینے کی سعی کر رہی ہے..... دراصل عابدہ اور راحیلہ دونوں ہی جمیلہ کی سہیلیاں تھیں اور اپنی اپنی جگہ ضروری تھیں۔ وہ ان دونوں کے درمیان ایک ایسی کڑی تھی جو آدھی ادھر اور آدھی اُدھر بندھی نظر آتی تھی۔ شرط بندھے رہنے کی نہیں تھی بلکہ کھنچے جانے کی تھی۔ لگتا یونہی تھا کہ بالآخر عابدہ اسے کھینچ لے گی اور مغربی اثرات غالب آ جائیں گے۔

راحیلہ نے شاہد کے پاس بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا اور عابدہ یہ کہتی ہوئی اس کے ساتھ جڑ گئی تھی کہ راحیلہ بے انتہا دقیانوسی ہے.....

بادل پھر زور سے گرجا اور بجلی کڑکنے کے باعث لمحہ بھر کو پھر کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ راحیلہ نے خوفزدہ ہو کر شاہد کی جانب دیکھا۔ ہزاروں جگنو لمحہ بھر کو چمک کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ شاہد نے ان قندیلوں کو دیکھ کر کہا..... ''اللہ بجلی سے سب کو بچائے' سنا ہے جہاں پہ گرتی ہے سب کچھ بھسم کر ڈالتی ہے۔''

تسنیم آپا نے ساتھ بیٹھی راحیلہ کے چٹکی کاٹ لی۔ انہوں نے شاہد کے لبوں کو کانپتے دیکھ لیا تھا۔ جب سارے ہاتھ دھونے کے لیے سنک کی طرف بڑھے تو راحیلہ کے کان میں تسنیم آپا نے کہا..... ''لے بھئی تیری دعا تو پوری ہوئی۔ اب اتنی بارش میں شام تک یہیں ٹھہرنا ہو گا.....''

راحیلہ نے مصنوعی اونہہ کہہ کر منہ پھیر لیا۔

اس کے دل میں عجیب سی کیفیتیں گندمد تھیں۔ شاہد سے ملنے کی خوشی' عابدہ کو دیکھ کر رقابت کی آگ' اوما کی کی' موسم کی خوبصورتی' اماں ساجدہ کی موجودگی میں حجاب' شادی کی تیاریاں اور ان دیکھے خوابوں کی تکمیل بہت کچھ بارش کے ریلوں کی طرح دل پر گزر رہا تھا۔

کھانے کے بعد سب باہر کے کشادہ برآمدے میں جا بیٹھے۔ یہ برآمدہ پورچ سے ملحق تھا۔ نہ تو میاں عباس موجود تھے نہ ڈاکٹر صاحب۔ لڑکیاں برسات سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ جب بارش ہوا کی وجہ سے جھلار کی شکل اختیار کر لیتی تو برآمدے کے اندر تک چھینٹے آتے جن میں بھیگنے سے کوئی بھی نہ گھبراتا۔ چونسا اور قلمی آموں سے بالٹیاں بھری سامنے دھری تھیں اور آہستہ آہستہ چھلکوں کا ڈھیر میز پر دھری ٹرے میں بڑھ رہا تھا۔ آج خلاف معمول جمیلہ میر محفل بنی ہوئی تھی۔ اسے روس ناول بھول چکے تھے اور وہ لاہور کی باتیں سنا کر سب کو ہنسا رہی تھی۔ آج وہ راحیلہ پر دبی دبی چوٹیں یوں کر رہی تھی گویا راحیلہ اس کے گھر کا فرد بن چکی ہو۔ جس طرح لپک لپک کر وہ بالٹی میں سے آم نکال رہی تھی۔ لگتا تھا کہ یہ جمیلہ نہیں میاں عباس کی روح اپنی روح کی تشنگی کو بجھا رہی ہے.....

جب شاہد آخری تنخلی لان میں چلا کر اندر ہاتھ دھونے چلا گیا تو ٹنکو بھی اس کے پیچھے بھاگا اور بیگم عباس بھی ساجدہ ماں کو اپنے کمرے میں لے گئیں تو لڑکیوں میں اور بھی بے تکلفی پیدا ہو گئی.....راحیلہ کو مخاطب کر کے جمیلہ نے کہا.....

''پتہ ہے شاہد اندر کیا کرنے گیا ہے.....سونے گیا ہوگا۔ نیند کا بڑا رسیا ہے۔ اس کا بس چلے تو سارا دن سویا رہے۔ جو اس سے بیاہ کرے گی' بڑے گھاٹے میں رہے گی.....''

''اچھا.....'' عابدہ نے کہا اور بڑی دلچسپ ہنسی ہنسنے لگی۔

راحیلہ نے کانوں تک سرخ ہوتے ہوئے ایک قلمی آم بالٹی سے نکالا اور تیز چھری سے اسے کاٹنے لگی۔ جمیلہ ترنگ میں تھی..... ''اور کیا..... بڑا ایوتی ہے۔ اس رمضان میں اس نے بڑے بڑے تماشے کیے ہیں۔ تسنیم آپا اس بار تو بڑا ہی لطف آیا۔ ڈیڈی کہنے لگے کہ اس بار سب روزے رکھیں گے..... سب کے سب.....شاہد بھیا جان چھپاتے پھرتے تھے۔ کبھی کہتے زکام ہو گیا ہے' کبھی کہتے طبیعت خراب ہے لیکن پہلے روزے ہی دھر لیے گئے.....اور مزیدار بات بتاؤں جب خود روزے کا ارادہ کر لیا تو سحری سے بہت پہلے سب کو جگا دیا اور روزے کی تلقین کرنے لگے۔ سرونٹس کوارٹر میں جا کر مالی کے بچوں کو بھی اٹھا کر روزہ رکھوایا۔'' عابدہ کے سوائے باقی سب ہنسنے لگے۔ راحیلہ کی پلکوں پر برسات کی ننھی ننھی بوندیں کہیں سے آ کر اٹک گئیں.....وہ ہنستی ہوئی جل پری لگ رہی تھی۔

''اچھا تو پھر.....''

جمیلہ نے آم چوسنا چھوڑ دیا اور خوشگوار لہجے میں بولی..... ''بس تسنیم آپا.....چھت پر چڑھ کر یوں ٹین بجایا کہ سارا محلہ جاگ اٹھا ہوگا۔ پھر نیچے آ کر قبر اور حشر کے عذاب سے ڈرانے لگے۔ سب کو ذرا دھمکا کر سحری کھا کر جو سوئے تو شام افطاری سے دس منٹ پہلے جاگے۔''

''کون جاگا افطاری سے دس منٹ پہلے.....''

''تم اور کون؟.....'' جمیلہ نے ہنس کر جواب دیا۔

اس وقت شاہد اور ننگو کے سروں پر اخبار کی ٹوپیاں تھیں اور شاہد نے ننگو کے چہرے پر بھی مونچھیں بنا دی تھیں۔ اس حلیے میں دونوں مسخرے سے لگ رہے تھے..... شاہد بڑا سنجیدہ چہرہ بنا کر جمیلہ کی کرسی کے بازو پر بیٹھ گیا۔ ''روزے تو ہوتے ہی سونے کے لیے ہیں۔ دن بھر آدمی سوئے اور رات بھر جاگے..... سعودی عرب میں بازار بھی راتوں کو کھلتے ہیں۔''

''تم کبھی سعودی عرب گئے ہو.....'' جمیلہ نے سوال کیا۔

عابدہ کا قہقہہ سب سے اونچا تھا۔

''آدھی رات کو کئی لوگ جگانے آتے ہیں۔ ایک وقت آئے گا جب لوگ اس رواج پر ہنسیں گے لیکن آج کل کم از کم پانچ سات آدمی آتے ہیں رات کو..... پہلے حضرت نے گھی کے خالی کنستر میں روڑے اکٹھے کر رکھے ہیں۔ انہیں کھڑکاتا اور چوب سے ٹمن بجاتا ہے۔ اس پر یوں دھمکاتا ہے گویا قیامت کے دن یہی اعمال جانچنے والا ہوگا..... اباجی بھی کمال کرتے ہیں۔ رات کو ہمارے ہاں کوئی کتا بھولے سے نہیں آ سکتا اور یہ روزے کے لیے جگانے والے بے دھڑک آتے ہیں۔ دندناتے ہوئے اور عید کے روز انعام بھی لے کر جاتے ہیں.....''

بارش ہلکی ہوتی جا رہی تھی۔ آموں کی بالٹیاں' چھلکے سب جا چکے تھے۔ پورچ میں ڈاکٹر صاحب کا گھوڑا گھاس کھانے میں مشغول تھا۔ اب ننھی بوندوں کی پھواریں پڑ رہی تھی جیسے آسمان پر حوریں بیٹھی سوجی پھٹک رہی ہوں۔

شاہد نے خواہ مخواہ آواز اونچی کر کے کہا..... ''پھر ایک اور حضرت آتے ہیں۔ یہ ہیں تو چھوٹے سے گھٹ مٹھیا سے مخنی لیکن بڑی کڑک دار آواز میں کہتے ہیں..... ہر دم مولی..... حق اللہ ہو..... ان کے بعد ایک ٹولی آتی ہے..... گاتی ہوئی۔ فلمی گانوں کی دھنوں پر نعتیں فٹ کر کے گاتے ہیں۔''

عابدہ نے یکدم آواز اٹھا کر کہا..... ''ہمارے گھر بھی آتے ہیں پڑھ لا اللہ الا اللہ..... سارے گھر کی بتیاں جل رہی ہیں۔ باورچی خانے میں پناخ پناخ پراٹھے پک رہے ہیں سارا کنبہ جاگ رہا ہے پر یہ کھڑے گاتے چلے جاتے ہیں۔ ایک نقارچی آتے ہیں۔ دے دھیا دھپ ڈھول پیٹتے ہیں لیکن انہیں شاید روزہ رکھنا ہوتا ہے' اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔ فرض نبھایا اور چلے گئے..... لیکن ان کے جاتے ہی ہمارے ہمسائے میں رہنے والا چوہدری بیگاں وارد ہو جاتا ہے۔ جیسے نقارچی کے جانے کا ہی تو منتظر تھا۔

اس کا نزول بگل کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھاٹک سے آواز آتی ہے تو تڑوں..... توں توں..... تڑوں..... تڑوں..... بالکل محشر کا نظارہ آنکھوں کے آگے بندھ جاتا ہے اور جب تک باہر جا کر کوئی اسے یقین نہ دلائے کہ سارا گھرانہ جاگتا ہے' یہ آگے نہیں جاتا۔ نام بنام سب کا پوچھ کر جاتا ہے.....''

عابدہ کی بات کو آگے بڑھا کر شاہد بولا..... ''نعتیں پڑھنے والے' ڈنڈے کوٹنے والے..... اور جانے شہر کے کون کون سے خدائی فوج دار آتے ہیں۔ حتیٰ کہ اذان سے کچھ دیر پہلے وہ فقیر صاحب چلے آتے ہیں جن کا پورا یقین ہے کہ پو پھٹتے ہی قیامت آ جائے گی اور جن کا ایمان ہے کہ سوائے ان کے اس راز کو اور کوئی نہیں جانتا۔ وہ بڑی درد یلی آواز میں اکتارے کے ساتھ گاتے ہیں.....

اٹھ چڑیاں ہنیرے بولدیاں نیں..... اٹھ''

شاہد نے بڑی سریلی آواز میں مصرعہ گایا...... سب چپ سی ہو گئیں تو پھر اس نے یکدم اپنی اخباری ٹوپی سیدھی کی اور مسخروں کی طرح بولا...... ''کوئی نہ تو مصرعہ شعر میں بدلتا اور نہ ہی قیامت آتی ہے۔ میں ان کی درد بھری آواز پر اچانک آنکھیں کھول کر فلسفیانہ نظروں سے گردوپیش کا جائزہ لیتا ہوں اور بڑے سوز کے ساتھ جھرجھری کھاتا ہوں۔ اس کے بعد میری طبیعت اتنی اچاٹ ہوتی ہے کہ میں اپنے آپ کو سمجھاتا بجھاتا سو جاتا ہوں...... جب دوبارہ آنکھ کھلتی ہے تو شام کے پانچ بجے ہوتے ہیں۔ آپ خواتین خود فیصلہ کریں جو سویا ہی صبح پانچ...... تو وہ کب جاگے؟''

شاہد مجسم سوال بنا شرارت سے ہر ایک کی طرف باری باری دیکھنے لگا۔ راحیلہ نے فوراً آنکھیں جھکالیں۔

تسنیم آپا نے ہولے سے کہا...... ''یہ لوگ بھی غنیمت ہیں۔ سب کچھ بدل رہا ہے۔ باہر کی باتیں سنو تو دل نہیں مانتا...... نہ جانے کیا کچھ بدل جائے۔ روزے آئیں پر کوئی جگائے ہی نہیں۔ الارم والی گھڑی بھی خراب ہو جائے...... ابھی تعلق باقی ہے...... لوگ جو کچھ اپنے لیے اچھا سمجھتے ہیں بانٹتے پھرتے ہیں۔ کون جانے تعلق کی یہ شکل کب تک باقی رہے؟''

سوائے راحیلہ کے کسی نے تسنیم آپا کی بات نہ سنی۔ عائی نے یکدم پلکیں جھپکا کر صرف شاہد سے سوال کیا......

''آپ لوگوں کی طرف لوگ زیادہ آتے ہیں۔''

جمیلہ نے تالی بجا کر بات کی...... ''شاہد مبالغہ کرتا ہے...... غلط......''

شاہد کو غصہ آ گیا۔ زور سے گھگو کے بازو پر ہاتھ مار کر بولا...... ''کوئی مبالغہ ہے...... اپنے ابا جی کا حکم ہے۔ ان لوگوں کو منع نہیں کرنا...... یہ برکت والے لوگ ہیں۔ ان پر نکتہ چینی کرنا بڑی معیوب بات ہے......''

عابدہ نے اپنی پتلی پتلی بھنویں سکیڑ کر اوپر اٹھائیں۔ ابرو کے بال ہلکے کرنے کا رواج ابھی عام نہ ہوا تھا......

''اچھا یہ بات ہے......'' عائی بولی۔

''اچھا شاہد تم تو روزہ نہ رکھا کرو...... قیامت آ جاتی ہے۔'' جمیلہ بولی۔

''دیکھو جمیلہ میں لحاظ کیے جاتا ہوں تیرا ہاں......''

''اور جو لحاظ نہ کرو گے تو کیا ہو گا۔''

''پٹے گی اور کیا؟''

جمیلہ جلدی سے اٹھی اور بھاگ کر راحیلہ کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ یوں اچانک اٹھ جانے سے کرسی کا توازن بگڑ گیا۔ کرسی کی بانہہ پر بیٹھا شاہد بمشکل گرتے گرتے بچا۔

''میں کہتا ہوں تو آج پٹے گی جمیلہ۔''

لیکن جمیلہ آج ایک مختلف لڑکی تھی۔ بارش اس کی ہیوست بہا کر لے گئی تھی۔ راحیلہ کے کندھے پیچھے سے پکڑ کر بولی...... ''میں جانتی ہوں شاہد بھیا آج تو ساری باتیں اپنا Impression لوگوں پر ڈالنے کے لیے کر رہا ہے...... پتہ ہے عابدہ! جب بھیا کی آنکھ سہ پہر کو کھلتی ہے تو روزے کی وجہ سے برا حال ہوتا ہے۔ بیچارے ملازم روزے داری حضوری کو ان کے کمرے کے چکروں میں مشغول...... جناب صاحب شاہد تو تکیے کی چادر تان پلنگ پر پڑے ہیں۔ وہ لوگ بھی آتے

ہیں بھی جاتے ہیں۔ بس لحہ کو کروٹ بدل کر فرش پر دیکھ لیا۔ اگر پانی کا پھڑ کاؤ نہ ہو تو قیامت آ جاتی ہے..... بیچارے نوکر دم سادھے پھرتے ہیں..... وہ بات بھی بتا دوں شاہد..... شربت والی..... ''راحیلہ کے پیچھے کھڑی جمیلہ نے نگاہیں نچا کر کہا۔

''جو مرضی ہے بتادے باقی کیا رہ گیا ہے..... میں تو اس سارے گھر سے ہی بیزار ہوں.....''

''خفا کیوں ہوتے ہیں شاہد بھائی' بتائیں ناں جمیلہ آپا شربت والی بات۔'' ننکو نے اصرار سے پوچھا۔

''سورج پہ تھال کا تھال کھڑا ہوتا ہے۔ جب شاہد شربت کی تیاری شروع کرتے ہیں۔ بیس سیر کی سل پڑی ہے برف کی..... بڑے دیگچے میں چینی گھل رہی ہے۔ درجنوں لیموں نچوڑے جا رہے ہیں۔ گھڑے سے پانی انڈیلا جاتا ہے..... پھر سارے نوکروں کو تاکید ہوتی ہے بار بار کہ اذان کے متعلق ایک دم خبر پہنچائے..... ریڈیو الگ گلا پھاڑ رہا ہوتا ہے..... اور شاہد ہتھیلی پر نمک جمائے تیار! جان بکف..... اور سورج صاحب آسمان پر چڑھا جگمگا رہا ہوتا ہے..... ندیدوں کی طرح دیگچے پر نظر رکھتے ہیں یوں.....''

جمیلہ نے آنکھیں کھول کر راحیلہ کو گھورا۔

ایک ہی جست میں شاہد جمیلہ تک پہنچ گیا لیکن جمیلہ باہر لان کی طرف بھاگ گئی۔ یوں بھائی بہن لان میں جمع شدہ پانی میں شپا شپ بھاگنے کودنے لگے..... ان کو دیکھ کر تسنیم آپا' عابدہ اور ننکو بھی پانی میں بھاگ گئیں.....

ننکو بھاگ کر شاہد سے لپٹ گیا..... ''بھیا مجھے کشتی بنادو..... میں اس پانی میں چلاؤں گا۔'' وہ سب کشتیاں بناتے اور اسے بہتے پانیوں میں تیراتے مصروف ہو گئے۔ شام گئے تک یہی کھیل رہا۔

راحیلہ بارش میں نہ گئی..... اسے شاہد کے سامنے بھیگتے ہوئے شرم سی آ رہی تھی۔ زکام کا بہانہ کر کے وہ برآمدے میں بیٹھی رہی..... ابھی حیا کا یہی معیار تھا۔ حجاب' پردہ' شرم ابھی انداز زیست تھا۔ کچھ بڑوں کے اصرار کی وجہ سے پابندی نہ تھی۔

☆☆☆

کچھ چھوٹی لڑکیاں گھر گھر کھیلنے میں مشغول تھیں۔ ان کے ساتھ چند لڑکے بھی شامل باجہ تھے لیکن لڑکوں کو اس کھیل میں قطعی دلچسپی نہ تھی۔

سکینہ نے گھر آئی مہمان تارا سے پوچھا..... ''کیوں بہن جی بال بچے اچھے ہیں؟''

تارا نے نیاز بو کے پتے پر خربوزے کے بیج رکھ کر اسے تکلف سے پان کی طرح لپیٹا اور بولی ''بس جی بچوں کا نہ پوچھیں انہیں تو میں سٹیشن پر چھوڑ آئی۔ ان کے بابا جی کے پاس..... پان کھایئے ناں۔'' تارا نے سکینہ کو پان پیش کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن سٹیشن پر کیوں آخر.....''

''کرفیو لگنے والا ہے جی خطرہ ہے شہر میں..... بلوائی کہیں دھاندلی نہ کریں اس لیے.....''

''بہن جی السلام علیکم..... بیٹی کی شادی مبارک ہو.....'' رشیدہ نے آگے بڑھ کر کہا۔ لڑکے الو سے ادھر اُدھر جھانک رہے تھے۔ ان کا اس سارے ڈرامے میں واجبی سا رول تھا۔

''بہن جی آپ دوپٹہ اوڑھ کر کیوں نہیں آئیں؟''

رشیدہ ٹھنک کر بولی..... ''اس لیے کہ دادی ماں کے دانت نہیں ہیں۔ جب بھی وہ ہنستی ہیں تو شرما کے منہ پر دوپٹہ

لے لیتی ہیں..... میں اگر دوپٹہ چھنوں گی تو میرے بھی دانت جھڑ جائیں گے....." لیکن اب لڑکوں کے صبر کا پیانہ لبریز ہو گیا تھا۔

وہ جھگڑالو انداز میں بولا..... "بھلا ہم لڑکے کیا کریں..... ہمیں بھی تو کچھ بتاؤ ناں سکینہ....."

"بس تم ساتھ ساتھ رہو..... اور کیا....."

"تمہیں گھر گھر کھیلنا نہیں آتا گکو؟....."

"مجھے یہ کھیل ذرا اچھا نہیں لگتا....."

اب لڑکوں میں بغاوت کے آثار پیدا ہو گئے۔ ایک ٹکڑی کی شکل میں سب علیحدہ علیحدہ ہو گئے۔ گکو نے جیب سے سیٹی نکالی اور اسے بجا کر بولا..... "چلو..... کرفیو کرفیو کھیلیں..... چلو چلو....."

لڑکیاں گھر گھر چھوڑ کر لڑکوں کے پیچھے بھاگیں۔ چھوٹے چھوٹے برتنوں میں ترتیب سے رکھے پھول اور پکوان برآمدے میں دھرے رہ گئے۔ کچھ دیر بعد ایک کتا آ کر ان برتنوں کو چاٹنے لگا۔ اندر کمروں سے سیٹی کی آواز ڈھلک کی تھاپ میں ڈوب گئی۔

شامیانے میں لڑکیاں راحیلہ کے اردگرد بیٹھی تھیں۔ بڑے تخت کے پاس قالین پر ڈھولک والیوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ کافی دور باجی بلقیس زیوروں سے لدی چند عورتوں کے جھرمٹ میں چاندی جگمگاتی اپنے نظروں کو ہوا دے رہی تھیں۔ ان کی ہر بات گھوم پھر کر اپنی پُرمسرت ازدواجی زندگی پر آ ٹکتی اور وہ اپنے آپ کو اس قابل سمجھتیں کہ سارے زمانے کو اپنی مثالیں دے کر مرعوب کریں۔ اپنی گھریلو زندگی سے واقعات نکال کر مثالیں دیتیں۔ اول تو انہیں کوئی چیز بات یا انسان قابل تعریف ہی نہ لگتا لیکن اگر تعریف کرنا ہی پڑتی تو پھر اپنے بچوں شوہر یا پھر اپنی ہی ذات کے بارے میں بڑی فراخدلی سے قلابے ملاتیں۔ زیورات وہ شادی بیاہ کے موقعوں پر کھلے دل سے پہنتی تھیں۔ اب بھی بلقیس باجی نے گلے کے نورتن گلوبند دکھانے کی غرض سے سر پر سے گوٹے والا دوپٹہ اتارا اور گلوبند ڈھیلا کرتے ہوئے بولیں..... "لیجیے یہ بھی کوئی موسم ہے زیور پہننے کا۔ ہم لوگ بھی گلے میں پٹے ڈال کر پھرتی ہیں..... ہے ناں؟"

ایک عورت جو بیچاری انگور کھٹے ہیں کا شکار تھی اور زیادہ زیور کپڑا اجتھیا نہ سکتی تھی۔ تھوکڑ واہے کے انداز میں تقریر کرنے لگی..... "بس اسی زیور کپڑے نے مسلمان عورت کو مرد کا دست نگر کر رکھا ہے۔ نہ اس کی ہوس ہو نہ مرد جیل میں ڈال سکے..... میں تو بہن جی زیور کی سرے سے قائل ہی نہیں..... دنیا میں ایک زیور ہے اور وہ ہے علم..... اور جو مجبوراً کبھی شادی بیاہ میں زیور پہن ہی لیا تو ہلکی پھلکی انگوٹھی جھمکے..... بالیاں لیکن زیور بوجھل نہ ہو....." اس وقت اس مرقع سادگی نے زور سے گھٹنے پر ہاتھ مارا۔ ان کے ہاتھ میں کندن کی بھاری سی انگوٹھی تھی۔ بلقیس جہاں نے دیکھا کہ مقرر خاتون کے ناخنوں میں میل جما تھا اور انگوٹھی میں تازہ تازہ گند جمے ہوئے آٹے کے آثار تھے..... ایک دیمک کھائی لڑکی عورت جس کی آواز بھی حلق سے پورے طور نہ نکلتی تھی اپنی پوتی کا ناک صاف کر کے بولیں..... "بی بی یہ سب زیورات تو شوہروں کی محبت کا نتیجہ ہے۔ چاہیں گے تو دلہن سونے میں پیلی رہے گی نہ چاہیں گے تو کڑے چوڑیاں اتروا کر بیسواؤں کے پیروں میں ڈال آئیں گے۔"

قریب بیٹھی ایک دھان پان لڑکی نے ایک سرد آہ بھری۔ وہ ان بجی سجائی عورتوں میں اپنی سادگی کے باعث نمایاں تھی۔ اس کے لب اگر مسکراہٹ سے کھلے ہوتے تو خوبصورت نظر آتے لیکن اب دونوں جانب سے یوں لٹک رہے تھے گویا بوجھل بختی کے دو وزنی سرے۔ اس کی آنکھوں میں خشک آنسوؤں کی چمک تھی۔ بات بے بات وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی۔ لمبی آہ بھرتی اور آسمان کی جانب تکنے لگتی..... "لیجیے شوہروں کو روٹھنے بھلا دیر لگتی ہے کیا۔ کبھی تو یوں آسمان پر چڑھ جاتے ہیں۔ گویا بس ایک بیوی ہی کا وجود تو رہ گیا ہے ساری دنیا میں.....اور.....اور کبھی یوں پاتال میں دھکا دے دیتے ہیں جیسے رہی بیوی کے باعث..... باعث..... باعث....." آواز اس کے حلق میں کہیں اٹک گئی۔ وہ جملہ ختم نہ کر سکی۔ اس کے لب لرز گئے اور اس نے پلکیں جھکا لیں۔

باجی بلقیس جو میر محفل بنی بیٹھی تھیں جھٹ گویا ہوئیں..... "اے جانے دو تمھیں کیا خبر بہن تمہاری عمر کیا ہے یہ باتیں سمجھنے کی.....بس ذرا میاں نے مزاج داری کی میکے چلے گئے..... چار دن تنور کی روٹی کھانے کو ملی میاں کے مزاج ٹھکانے آ گئے.....ہم تو اتنا جانتے ہیں روٹھے بغیر چارہ نہیں.....اور روٹھنا بیوی کا شرعی حق بھی ہے..... یہ تو میرا ذاتی تجربہ ہے۔ جب بھی وہ اکڑے میں روٹھ گئی.....ایک ٹوٹی چارپائی ٹرنکوں والے گودام میں اسی مصرف کے لیے رکھ چھوڑی ہے.....بس اس پر ڈھیر ہو جاتی ہوں.....بس پھر ان کی خوشامد دیکھنے والی ہوتی ہے..... بھئی یہ ہندو لوگ بڑے سیانے ہیں.....رانی کیکئی نے روٹھ کر ہی اپنے بیٹے لکشمن کو تخت و تاج کا وارث کیا۔ راجہ رام چندر کو بن باس دلایا..... یہ روٹھنا بڑے کام کی چیز ہے.....جانتی ہو کتنا فیض ملتا ہے روٹھنے کا..... ہاں۔"

لیکن عجیب سی بات ہے دنیا میں جتنی روحیں اتنے ہی رب کے راستے۔ جس قدر انسان اتنے نسخے زندگی بتانے کے زندہ رہنے اور صحت کے۔ جو ایک پر ٹھیک بیٹھتا ہے دوسرے کے مزاج پر پورا نہیں اترتا.....سادہ سی لڑکی عورت بلقیس باجی کی بات سن کر کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔ لمبی سانس لے کر بولی..... "ناں جی..... آپ کی بات میں نہیں مانتی۔ بہن روٹھ کر میکے آئی تھی ایک بار میاں نے بھولے منہ ایک بار نہ پوچھا۔ آخر چھ ماہ بعد واپس چلی گئی..... جتنی دیر میکے رہی یہی دھڑکا رہا کہ اب دوسرے نکاح کی نوبت....." جملہ پھر اس سے مکمل نہ ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ واقعہ اس کی بہن نہیں اس کی اپنی زندگی کا تھا۔

"ناں آپا بلقیس میں تو آپ سے اتفاق نہیں کرتی۔ خود سے تو روٹھ کر میکے نہیں جانا چاہیے چاہے دم ہی نکل جائے....."

"ابھی بیاہ ہے کتنے دن ہوئے ہیں زیبا....." بلقیس باجی نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

"ابھی تمھیں ان معاملات پر اظہار خیال کرنے کا حق نہیں پہنچتا....."

پچاس تاپی بلقیس باجی نے گہرے قرمزی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ دوپٹہ پر چار چار انگل گوٹا اور ڈیڑھ انچی کرن لگی تھی۔ سارے دوپٹے پر بڑے بڑے گوٹے کے پھول اور ستارے جگمگا رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر لگتا تھا راجہ جی کا ہاتھی نمائش کو نکلا ہے۔

ایک نئی بیاہی نے لمبی جمائی لی۔ اس کی آنکھوں میں بہت سی بے خواب راتوں کا خمار تھا۔ اپنے جی ہی جی میں

اتراتی ہوئی بولی..... "ابھی حالات اچھے نہیں' میں تو ویسے کے لیے نہیں رکوں گی۔ رات ان کا فون آیا تھا کہ خواہ مخواہ مت رکی رہو حالات کسی وقت بھی بگڑ سکتے ہیں۔"

چوڑے ماتھے اور تنگ دہن والی بہت ہی گوری عورت نے کہا..... "کل تو چچا جان بھی سارا خاندان لے کر لاہور چلے گئے..... عابدہ تو بہت کہتی رہی لیکن خاں چاچا مانے نہیں..... کہنے لگا خطرہ بہت ہے یہاں رہنے میں....."

"ہاں جی خاں صاحب کو تو ایک ہی فکر ہے۔ کوئی ان کی کوٹھی نہ لوٹ لے ریواز گارڈنز میں....."

ایک خاتون جو ابھی رواں دواں گفتگو میں منہ پر تالا لگائے بیٹھی تھی۔ بڑے تشویشناک لہجے میں بولی۔ "اچھا ہی کیا آپا نے..... مسلمانوں کا اس علاقے میں کام ہی کیا ہے۔ ہم تو خود پرسوں جا رہے ہیں کراچی..... ہاں جی اقلیت بن کر کوئی کیا جئے گا یہاں آخر؟"

"لیکن اس علاقے میں تو مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ یہ کیسے ہندوستان میں جا سکتا ہے؟....."

"آخر مسلم اکثریتی علاقے ہی تو پاکستان بنیں گے ناں....."

اب گفتگو سیاسی رنگ اختیار کر رہی تھی۔

"آپا جی اور میرے بہنوئی جانے سے پہلے کہہ رہے تھے کہ ہندو نے انگریز کو شیشے میں اتار لیا ہے۔ تم لوگ دیکھ لینا کشمیر جونا گڑھ اور حیدرآباد سے ساری مصیبت شروع ہوگی..... انگریز یکطرفہ فیصلہ کر کے ہندو کو خوش کرنا چاہتا ہے....."

ایک موٹی سی بڑی پیاری خاتون تھوڑا سا گھبرا گئیں۔ انہوں نے کھدر کی ساڑھی بلاؤز اور انگوٹھے والی چپل پہن رکھی تھی۔ اکبر خاں کا سارا گھرانہ کانگریسی تھا اور دور پار سے سرحد والے غفار خاں کے رشتہ دار بھی لگتے تھے..... "دیکھیے اگر ہم یہ علیحدگی پسندی کی تحریک نہ چلائیں تو کیا پچھلے ایک ہزار سال سے ہندو مسلمان اکٹھے نہیں رہ رہے؟ کیا ان کی کوئی سانجھی معاشرت پیدا نہیں ہوئی جس کے طفیل ہم ساتھ ساتھ رہ رہیں؟"

ایک عورت جو بڑے معمولی کپڑوں میں دری پر بیٹھی بار بار بالوں میں کلپ لگا رہی تھی' کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں جانکاری سوجھ بوجھ کی گہری چمک تھی..... "بہن جی..... آپ ہم مسلمانوں کو چھوڑیں..... ہندو کے مشہور دانشور سوامی دھرما تیرتھ جی مہاراج کا کہنا ہے کہ ہندو بڑے گھمنڈی اور متکبر ہیں۔ انہوں نے ایک ایسا معاشرہ بنایا جو کسی غیر ہندو کے ساتھ تعاون کر ہی نہیں سکتا۔ اس علیحدگی پسندی کی وجہ سے ہندو معاشرتی نظام نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ خود ہندو اقوام کے لیے ایک توہین ہے....."

اب ان دونوں خواتین میں ٹھن گئی۔ باقی عورتیں جو زیور' کپڑے رشتے ناطے سے بلند سوچ نہ سکتی تھیں' تحیر میں آ گئیں۔

"لیکن ہر ملک میں اکثریت اور اقلیت ہوتی ہے..... کیا ہر ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے؟" ساڑھی والی بولی۔

"ہاں جہاں بھی اکثریت نفرت پر آمادہ ہو وہاں ملک ٹوٹ جاتے ہیں۔ معاشرہ کی یکجہتی دو امور پر ہے۔ بہن جی..... کھانا پینا اور شادی بیاہ..... جہاں مسلمان ہندو نہ ساتھ کھا پی سکیں نہ ان میں شادی بیاہ ہو سکے' وہاں اکٹھا رہنا کیا معنی؟ ہندو تو ہمیں ملیچھ سمجھتا ہے۔ یا ونا کے نام سے یاد کرتا ہے۔ وہ شودر کو بھی ہم سے بہتر سمجھتا ہے..... یہ دو قومیں ہیں بہن جی

جہاں مسلمان عالمی برادری کا پرچارک ہے۔ مساوات کا داعی ہے اور ہندو چار وان پالتا ہے..... آدمی کی آدمی سے نفرت کو پروان چڑھاتا ہے۔ بھلا بتائیے ناں ہم کیسے اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ جہاں ایک ہنومان ہے اور دوسرا گنا.....''

اس وقت دادا ابا ہاتھ میں ایک عدد تار پکڑے شامیانے تلے آ گئے۔

''معاف کرنا ساجدہ تمہارے ابا جی کا تار ہے' وہ لوگ تو کشمیر سے آ نہیں سکتے' تمہارے بھائی ناصر کا تار ہے' پڑھ لو.....''

ساجدہ ماں نے پلو سے آنکھوں میں آئے آنسو پونچھے اور چپ چاپ دادا ابا کے ساتھ ہی اندر چلی گئیں۔ یکدم اس کا دل نڈھال ہو گیا۔ واقعی ڈاکٹر صاحب ٹھیک کہتے ہیں..... اس معاملے میں پھر ساجدہ نے دیر کر دی۔

راحیلہ کیسری لباس میں ملبوس پھولوں کا زیور پہنے خالی الذہن کی باتیں سوچنے میں مشغول تھی۔ پتہ نہیں سوائے اوما کے اس کی باقی ہندو سہیلیاں کیوں نہ آئیں۔ کوشلیا سمعد را ساوتری وہ ساری کیوں رک گئی تھیں۔ اس نے شامیانے کے اندر قالینوں پر کرسیوں پر بیٹھی عورتوں لڑکیوں بچیوں پر نظر ڈالی۔ آج میری مہندی پر گہما گہمی کیوں نہیں۔ آج ماہیا کے بول ڈھیلے ڈھیلے اور بے سُرے تھے۔ ڈھولک بے تال بج رہی تھی..... لڑکیوں کے چہروں پر تفکر تھا..... راحیلہ نے سوچا ان میک اپ سے لتے پتے چہروں پر رونق کیا ہوئی۔ بھلا لاہور والی پھوپھی جان کیوں اچانک واپس چلی گئیں۔ کشمیر سے دونوں ماموں اور ان کی فیملی اب تک کیوں نہ آئی؟

ابھی تھوڑی دیر میں شاہد کے گھر کی عورتیں مہندی لے کر آنے والی تھیں۔ امی نے گھر والی عورتوں کو خود ٹرنک کھول کھول کر سارا جہیز دکھایا تھا۔ پھر ان گنت خبریں بھی ساتھ ساتھ دی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب بار بار آ کر انتظامات چیک کرتے..... دادا ابا البتہ گم سم تھے۔ انہیں ویسے بھی مہندی کی رسم غیر اسلامی لگتی تھی۔ پھر ان کے اندر کئی قسم کے وسوسے گھومتے رہتے۔ جو مسئلہ ایک بار دماغ میں گھس جاتا مشکل سے نکلتا۔ ملازموں تک یہی خبر گھوم پھر رہی تھی کہ کرفیو لگنے والا ہے۔ فوجی ٹرک جیپیں دیوانہ وار پھر رہی تھیں۔ سارا دن قتل و غارت کی وارداتیں سننے میں آ چکی تھیں۔

قافلے چھوٹی چھوٹی ندی نالوں کی طرح محلوں سے گلیوں سے اٹھ کر سٹیشن کا رخ کر رہے تھے۔ ہوا میں ناراضگی' نفرت اور خوف تھا.....

راحیلہ نے کیسری دوپٹے کے گھونگھٹ میں سے نگاہیں پھرا کر دیکھا۔

لڑکیوں کی ہنسی کتنی سطحی تھی۔

اتنی ہی سطحی وہ امن کمیٹیاں تھیں جو اس علاقے میں قائم کی گئیں۔ اتنی ہی سطحی وہ ظاہری گرویدگی تھی۔ جو سول لائنز میں پچھلے دنوں ہندو مسلمان گھرانوں میں پیدا ہو گئی تھی اور اس سے کہیں زیادہ سطحی وہ عذر لنگ تھا جو اماں جی نے بیاہ کی تاریخ آگے بڑھاتے وقت دیا تھا۔

راحیلہ کے تخیل میں وہ شام گھوم رہی تھی۔

اوما اور راحیلہ ڈریسنگ روم میں تھیں لیکن بینڈ کی آوازیں صاف ان تک پہنچ رہی تھیں۔ بیگم عباس اور ساجدہ ماں تخت پوش پر اس طرح بیٹھی تھیں کہ بیگم عباس کی کمر ڈریسنگ روم کی جانب تھی۔ اوما بھی کبھی ذرا سا پردہ کھسکا کر اندر بھی

جھانک لیتی۔ ساجدہ ماں اس تاک جھانک پر ناخوش تھی لیکن یہ جانتے ہوئے کہ بیگم عباس ان دونوں کی موجودگی سے بے خبر ہیں وہ بھی مطمئن ہو کر باتوں میں مشغول رہیں۔

بیگم عباس نے کہا..... ''لو بہن تمہارے کہنے پر تو میں نے شاہد کو لاہور نہیں بھیجا۔ میری بلا سے لڑکا ایم اے کرے یا نہ کرے..... اب آپ کہتی ہیں کہ کہ کہ.....''

''آپ خود سمجھدار ہیں آپا۔ لڑکی کے بیاہ میں کتنا جھنجھٹ ہوتا ہے۔ بازار بند رہتے ہیں۔ زیور امرتسر بننے کے لیے بھیجا ہوا ہے..... پھر رمضان شریف.....''

بیگم عباس نے ہلکی سی تیوری ڈال کر کہا..... ''ساجدہ یہ رسم و رواج کے چکروں میں نہ پڑو..... ہم دونوں فارغ ہو جائیں تو بچوں کے لیے بہتر ہوگا.....''

''میرا سارا خاندان کشمیر میں ہے اور آپ کو علم نہیں کہ میری بھابھیاں کیسی ہیں۔ پہلا پہلا کام اگر ان کے بغیر کر دیا تو قیامت آ جائے گی.....''

اور جن کی خاطر تاریخ آگے کھسکائی۔ اباجی ٹھیک ہی کہتے تھے رشتہ دار ہمیشہ زندگی کو الجھاؤ میں ڈال دیتے ہیں جن کو مرعوب کرنے کے لیے ہر درخت پر قمقمے روشن کیے۔ کندن کے سیٹ ہیرے کی انگوٹھی بنائی گئی..... اس قدر اہتمام خرچ کیا گیا۔

وہ کشمیر والی بھابھیاں' سری نگر والے بھائی تو آ ہی نہیں رہے تھے۔

ساری عورتوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔

دو رویہ قطار میں کھڑی لڑکیوں نے پھول برسانا شروع کر دیے۔ مہندی کے تھال لیے سسرال والیاں جیوے ہزاعمراں ساریاں گاتی ہوئی داخل ہوئیں۔ سب سے آگے شاہد اور بیگم عباس تھیں۔ راحیلہ کا دل زور سے دھڑکا۔

بس ایک ہی دن تو درمیان میں تھا۔

گورداسپور بھی پاکستان میں ہے۔

ایک ہی دن تو بیچ میں جب شاہد اور مجھ میں ساری دوریاں ختم ہو جائیں گی۔

اس وقت ایک بڑا جتھہ دونوں پھاٹکوں سے ابراہیم لاج میں داخل ہوا۔ وہ کچھ شادی والے گھر کو لوٹنے نہیں آئے تھے۔ وہ ان لوگوں سے بدلہ لینے آئے تھے جنہوں نے ان کی سفاکی سے' ان کی نفرت سے بچنے کے لیے علیحدگی کا مطالبہ کیا تھا۔ جو ہزار سال کے بعد تالوسلام کہہ کر حل سے نکل کر کنیا میں رہنا چاہتے تھے۔ جس وقت گونے لگے دوپٹے کا چھپر کھٹ بنائے راحیلہ ہاتھ گودی میں لیے بیٹھی تھی۔ بیگم عباس نے بڑی پریت سے اس کے ہاتھ پر پان کا پتہ رکھ کر مہندی کا شگن کیا اور اوما کی تھالی میں سے گلاب جامن اٹھا کر اس کے منہ میں رکھا۔

اس وقت دونوں پھاٹکوں سے بلوائی داخل ہوئے۔

ٹھاٹھیں مارتا ایک سمندر تھا جس میں ماتھے پر قشقہ کھینچے ہندو تھے اور ساتھ ہی ہاتھوں میں کرپانیں' پستولیں لیے سکھ بھی تھے..... جلد ہی شامیانے الٹ گئے۔ عورتیں' بچے لڑکیاں چیخیں مارتی ادھر اُدھر بھاگنے لگیں۔ مردوں نے کرسیوں

میز دیگ کے چمچوں سے بیدار ہے۔ کچھ کے ہاتھوں میں شامیانوں کے ڈنڈے آ گئے۔ کچھ خالی پلیٹوں سے لڑے......
ہر طرف پھول ٹوٹی ہوئی بتیاں' مہندی کے تھال' گرے ہوئے دوپٹے تھے۔ برآمدے میں کین کی راکنگ چیئر پر ادھ کٹے گلے کے ساتھ دادا ابایوں پڑے تھے گویا گہری نیند سو گئے ہوں..... شاہد کو ٹانگوں سے گھسیٹتے دو آدمی گیٹ تک لے گئے اور پھر ڈرائیور شاہد کو لاش بنا تا ہوا پورچ تک چلا گیا..... ڈاکٹر صاحب کی نعش سیڑھیوں پر اوندھے منہ گری تھی۔
لڑکیوں کا پتہ نہ تھا۔ عورتیں اپنے بال کھسوٹ رہی تھیں۔ چیخ رہی تھیں۔ مہندی کے کھانے کی خوشبو اور انسانی لہو کے دھبے دور دور تک مارا مار کر رہے تھے۔ اوما کا ہاتھ پکڑ کر چپڑاسی غلام رسول سڑک پر بھاگا جا رہا تھا۔
''آپ راحیلہ کا نام نہ لیں باجی جی' میں آپ کو رفیوجی کیمپ میں چھوڑ آؤں گا..... آپ فکر نہ کریں' حوصلہ کریں.....''
اوما نے چپڑاسی غلام رسول کو بتانا چاہا کہ وہ اپنے چاچا جی کے گھر جانا چاہتی ہے لیکن اس کی زبان بند اور ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہو گئے تھے۔ ایسے میں غلام رسول اسے کندھے پر ڈال کر بھاگا..... بوڑھے آدمی کا سانس پھولا ہوا تھا۔ پھر بھی وہ بھاگتا گیا اور گرلز سکول کے پھاٹک کے اندر اوما کو دھکا دے کر واپس چلا گیا۔
اس گرلز سکول میں مسلمانوں کا قافلہ پاکستان جانے کو تیار کھڑا تھا۔ مسلم اکثریتی آبادی کا گورداسپور ہندوستان میں ضم کر دیا گیا تھا۔ اب مسلمان اقلیتی ہندوؤں کے حوالے اپنا وطن چھوڑ کر ہجرت کر رہے تھے۔ اوما کو پتہ نہ چلا وہ کس وقت پاکستان کی سرحد میں داخل ہو گئی!
ٹھاٹھے باندھے کرپانیں سنبھالے..... ماتھوں پر قشقہ اور تن پر گیروے لباس پہنے وہ ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی طرح آگے بڑھے.....
ہندو مہاسبھا کے چاہنے والے؟
شوسینا کے بالکے؟
ماسٹر تارا چند کے پیارے
یہ سارے وہ لوگ تھے جو دھرتی کو ماتا سمجھتے تھے۔ جو دھرتی کا کوئی حصہ کٹ جائے' اسے ماتا کے اعضاء کٹ جانے کے مترادف سمجھتے تھے۔ انہیں وشال بھارت درکار تھا..... جغرافیہ ان کے لیے اہم تھا۔ اس میں بسنے والے کون تھے اس کی انہیں پرواہ نہ تھی۔
جس وقت شاہد نے بے خبری کے عالم میں چیخ ماری اور کرپان اس کے سینے سے پار ہوئی اوما دہشت میں بھاگی..... لیکن راحیلہ کا ہاتھ ایک سکھ کے ہاتھ میں آ گیا۔ کوئی چیخ کرلائی لیکن کوئی چھڑانے والا نہ آیا۔ اسے بے ہوشی کے عالم میں ان ہی قالینوں پر گھسیٹا گیا۔ جہاں گلاب کی پتیاں موتیا کے ہار اور ڈھولک پڑے تھے۔
شہر کی سڑکوں پر جیپیں باؤلے کتوں کی طرح بھاگ رہی تھیں۔
شہر میں کرفیو لگ چکا تھا۔
ابھی ایک شام پہلے دادا ابا کے پاس ڈاکٹر دویا پرکاش بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ آریا سماجی ڈاکٹر پرکاش ہنس کر

خوش لباس اور دھیرج والے آدمی تھے۔ دادا ابا کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے کہا تھا..... ''مہاراج ہم کبھی کا ساری مسلمان جاتی کو جذب کر لیتے مشکل یہ ہے کہ مسلمان بت کو نہیں پوجتا' ہم لوگ بت پرست ہیں۔ جو اس قدر رحتی سے مسلمان بت شکن نہ ہوتا تو آج یہ ساری علیحدگی کے نعرے نہ ہوتے..... ہم نے نانک جی کا بت بنایا' اس کی پوجا کی..... کیلنڈروں پر نانک جی کی شبیہ چھاپی۔ نانک گرو نہ رہے' ہمارے اور سکھوں کے سانجھے اوتار بن گئے۔ مہاتما بدھ جو بھگوان کے بارے میں چپ تھے' ہم نے خود ان کی پوجا شروع کی۔ بھارت سے لے کر جاپان تک آپ کو مہاتما بدھ کے بت نظر آئیں گے..... دیکھ لیجیے آج کون سا بدھ کا پیروکار ہے جو آپ کو ہندو سا نظر نہ آئے لیکن..... مشکل یہ ہے کہ مسلمان نہ بت کو پوجتا ہے نہ اپنے پیارے پیغمبر کا بت بنانے دیتا ہے..... پھر ہم ان کو جذب کیسے کرتے' اس علیحدگی کو کیسے روکتے جو کسی مسلک کے ماننے والے اپنا تشخص برقرار رکھنے کے لیے سینے سے لگائے ہیں۔''

دادا ابا سن رہے تھے پر آدھے کان سے..... ان کے اندر ایک گھبراہٹ تھی۔ کہیں جو یہ گورداسپور کا علاقہ پاکستان میں نہ آیا تو کیا ہوگا۔ کیا سرفراز ساجدہ راحیلہ اور شاہد پاکستان چلے جائیں گے؟

کیا میں ان کے ہمراہ جا سکوں گا؟

شاید یہ ابراہیم لاج کا چوکیدار بنا کر مجھے یہیں چھوڑ جائیں گے؟

●○●○●○

پانچواں عہد

(الف)

راحیلہ کے خیال کو راوی کے کنارے چھوڑ کر میں سیدھا گاؤں چلا گیا۔ ویراں والے میں میری ایک پھوپھی بیاہی گئی تھی۔ وہ میری سگی پھوپھی تو نہ تھی۔ ابا سرفراز کے رشتے کی بہن تھی۔ میں نے پھوپھی کا نام ابا سے سنا تھا۔ کبھی انہیں دیکھا نہ تھا۔ پاکستان میں قدم رکھنے کے بعد عجیب قسم کی بے گھری تھی۔ جیسے کچھ دن کے لیے چیری بجل پر پڑی رہے۔ اس میں جان تو ہو لیکن کھڑے ہونے کی سکت نہ ہو۔ راحیلہ کے خیال سے ان گنت سوال میرے دل میں کیڑوں کی طرح رینگنے لگے تھے۔ میں واقعہ در واقعہ زماں اور اس میں بسنے والے مکاں سے لے کر اپنے خاندان کے قتل شدہ لوگوں کے متعلق سوچنے لگا تھا۔ کبھی کبھی میں بڑی کا فرحدیں چھونے لگتا۔ مجھے لگتا ساری زندگی کی اساس بے انصافی پر ہے۔ آزمائش امتحان آنسو اصل میں زندگی ہے اور اس میں خوشی اطمینان مسرت فقط کچھ دیر کے لیے پڑاؤ کا کام دیتے ہیں۔

میں پوری طور پر دہریہ تو نہ ہو سکا لیکن یہ وقت مجھ پر ایسے ہی گزرا جیسے کوئی شخص معلق ہو..... عقیدے اور ناعقیدے کے درمیان..... خدا اور انکار خدا میں لڑھکتا ہوا۔

پھوپھی کا گھر تلاش کرنا مشکل نہ تھا۔ سعدیہ پھوپھی کے گھر کی ایک نشانی ابا نے ایسی بتا رکھی تھی کہ میں بس سے اترتے ہی وہاں پہنچ گیا۔ ابا کہا کرتے تھے کہ پھوپھی کا گھر گاؤں سے الگ تھلگ پکی سڑک کے پہلو میں بنا ہوا ہے۔ اس کی شکل چھوٹے سے ڈاک بنگلے سے مشابہ ہے اور گاؤں تک اس لیے کوئی گھر نہیں کہ وہاں تک ان ہی کے تین مربعے ہیں۔ میں سوچتا تھا کہ شاید پھوپھی سعدیہ نے مکان بیچ دیا ہو۔ گاؤں تک پھیلے مربعوں پر کچھ اور مکان بن گئے ہوں لیکن ایسا نہیں تھا۔ خستہ صورت پیلی سفیدی اور سبز دروازوں والا پختہ مکان پھیلے کھیتوں میں تنہا تھا۔ اس کے ارد گرد بیروں سے لدی بیریاں تھیں۔ کچھ مرغیاں دانہ چگنے میں مشغول تھیں اور ایک بوڑھا چارپائی پر بیٹھا حقہ پینے اور بار بار چلم کریدنے میں مشغول تھا۔

"بزرگو..... یہ سعدیہ بی بی کا گھر ہے....."

"کس کا؟....." بوڑھے نے کان کے گرد ہاتھ کا چھجا بنا کر پوچھا..... "السلام علیکم....." میں نے اونچی آواز میں

سلام کیا اور پھر پوچھا..... "بزرگو! یہ کس کی کوٹھی ہے؟....."

"لاٹھی تو بیٹا وہ میں اندر ہی چھوڑ آیا..... بیٹھو کہاں سے آئے ہو؟"

میں ان سے کیا بیان کرتا کہ اتنی چھوٹی عمر میں ہی میرا سفر کس قدر گنجلک ہو گیا تھا۔ ترکِ وطن نے مجھ میں یتیمی کا احساس پیدا کر دیا۔ سارا خاندان قتل ہو گیا۔ وہ جو ایک جانی پہچانی صورت راحیلہ میں ملی تھی' وہ پتہ نہیں کون تھی؟ اوما کہ راحیلہ؟..... ہندو کہ مسلمان۔ بیاہتا عورت کہ محبوبہ..... بہت کچھ سوچنے کے لیے تھا..... ایسے سوال ابا جی کے ہوتے ہوئے سوچنے کی ضرورت کب تھی؟

"بزرگو..... یہاں کون رہتا ہے۔"

بڈھے کے کان گفتگو کو ترسے ہوئے تھے..... جھٹ بولا..... "ہاں کہ ہری کرانے گیا ہے سردارا۔ دیکھ بھئی جوان بیٹھ جا ایدھر اور بات سن میری۔ اب جو میں کہتا ہوں کہ لکی بھینس پھنڈر ہو گئی ہے۔ اس کا لیوا بتاتا ہے اس نے ہری نہیں ہونا۔ پر لالچی اتنی ہے پھر ہری کرانے بھیج دیا ہے..... اسے تو قصائی کے پاس بیچنا چاہیے....."

"جنابِ بزرگو یہ مکان کس کا ہے....." میں نے اشارہ کر کے پوچھا۔

اس بار جیسے ساری بات پہنچ گئی۔

"جوان یہ بنگلہ چوہدری نثار محمد کا ہے۔ تو کیوں پوچھتا ہے؟....."

اب میرے پاس پوچھنے کا کوئی معقول جواب نہ تھا۔

"مجھے جی..... پھوپھی سعدیہ سے ملنا ہے....."

گو بات میں نے کان کے قریب ہی کی تھی لیکن بزرگ کسی اور سمت میں سفر کر گیا تھا۔

"یہ جو کہا یہ جاتا ہے ویران والے کی طرف اس پر تھوڑی دیر ہوئی سردار لکی بھینس نے کر گیا ہے۔ گجروں کے گھر..... پاکستان کیا بنا ہے ان گجروں کی تو لاٹری نکل آئی ہے۔ دے صبح کے وقت ریہڑے پر ریہڑے بھر کر لہور جاتے ہیں دودھ کے..... واپسی پر پوچھو کتنا ناواں ہوا تو کبھی کہتے ہیں راستے میں دودھ پھٹ گیا' کبھی بتاتے ہیں پولیس نے پکڑ لیا تھا۔ پاکستان کیا بنا ہے' لوگ لالچی ہو گئے ہیں۔ اعتبار ہی اٹھ گیا ہے ایک دوسرے پر..... پہلے سارے ویراں والے میں بھائی بھائی رہتے تھے۔ سب کو اندر کا حال معلوم ہوتا تھا۔ اب کندے لگا کر مال گنتے ہیں۔ تم کبھی ویراں وال آئے ہو پہلے؟" میں نے نفی میں جواب دیا لیکن بزرگ نے سنا نہیں۔

"میں بتاؤں کہنے کو تو سید ہے۔ پر اس کے دونوں بیٹے رات کو جا کر لہور کوٹھیوں میں سے سامان لوٹتے ہیں۔ سب لالچ سازشی ہے۔ ڈرتے نہیں کس منہ سے سید بھی۔ باپ دادے کی بندوق لے کر جاتے ہیں لاہور..... مجھے پتہ ہے سارا۔ میں تو رات کو بھی اندر نہیں سوتا۔"

اس وقت پھوپھی سعدیہ ڈاک بنگلے نما گھر سے برآمد ہوئی۔ چوریں سے موٹے بدن کی عورت جس نے کانوں میں سونے کی ڈنڈیاں اور ایک بازو میں سونے کی پھنسی ہوئی چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ وہ اپنا لٹکتا ہوا آزار بند نیفے میں اڑستی ہوئی آگے بڑھی۔ پتہ نہیں کیوں میں نے پھوپھی سعدیہ کو پہچان لیا۔

"السلام علیکم پھوپھی جی....."

"وعلیکم!.....السلام" پھوپھی سعدیہ کے چہرے پر لاعلمی تھی لیکن اس کے باوجود وہ میری جانب بڑھتی آئی۔

"جی میں ڈاکٹر سرفراز.....کا بیٹا ہوں....."

"ہائے میں صدقے جاؤں' قربان جاؤں....."

پھوپھی نے آگے بڑھ کر مجھے سینے سے لگا لیا۔

"سارے کہاں ہیں.....تو اکیلا کیوں آیا.....ابا جی! یہ میرے سرفراز بھائی کا بیٹا ہے۔"

پھوپھی کچھ اس طرح بولی کہ کئی کھیتوں تک اس کی آواز آ گئی۔

☆☆☆

پھوپھی سعدیہ کا سسر بوڑھا اور بہرا تھا اور ابھی تک یہی سمجھتا تھا کہ اس کا بیٹا چوہدری نثار محمد زندہ ہے.....
چوہدری نثار محمد گھوڑے سے گر کر پورے دو سال ہوئے مر گیا۔ پہلے تو بڈھے چوہدری کو سب نے سمجھانے کی کوشش کی لیکن پھر سعدیہ یہی کہنے لگی کہ چوہدری نثار بارڈر سے آنے والے مہاجرین کی خدمت کرنے لاہور گیا ہوا ہے۔ ان دونوں میں دیر تک اونچے اونچے گفتگو ہوتی رہتی۔ وہاں والے پہنچ کر پہلی رات ہی مجھے اس بات کا علم ہو گیا کہ جب انسان کسی بات کو ماننا نہ چاہے تو آنکھوں دیکھی بات کو بھی نہیں مانتا۔ پھوپھی سعدیہ چھینٹ کی چادر سر پر لیے فریم میں جڑے میز پوش پر پھول کاڑھ رہی تھی۔ اس کی جوان سال بیٹی کبھی کبھی مجھے دلچسپی سے دیکھ لیتی اور پھر کروشیا کرنے میں مشغول ہو جاتی۔ چوہدری نثار محمد کا گھبرو جوان بیٹا سینے پر ریڈیو رکھے چارپائی پر عربوں کی طرح سیدھا پڑا تھا۔ اس کے پاؤں فٹ بھر کھلے تھے۔ دونوں بازو سر تلے تھے اور اس کے لیٹنے میں چوہدریوں کی خاص رعونت تھی۔

"نثار نہیں آیا ابھی....." بوڑھے سسر نے شوربے میں بھیگی بُرکی منہ میں ڈال کر کہا۔

"دادا لاہور گیا ہے سیدوں کے ساتھ....."

"آ.....بڑی نیکی کا کام ہے۔ لوگ لٹے پٹے آئے ہیں۔ ان کے لیے کھانے پینے کا انتظام کرتا ہے..... کتنی دیگیں پکائی ہیں آج سعدیہ بہو....."

"تین زردے کی.....چار پلاؤ کی....."

"کتنی....."

نوجوان چوہدری برکت نے گلا پھاڑ کر کہا....." کوئی دیگیں نہیں پکائی دادا.....اللہ کو پیارا ہو گیا ہے ابا....."

"آہستہ بولیں اب دادا اتنا بھی بہرہ نہیں....." رخسانہ بولی۔

"پیارا تو وہ شروع دن سے ہے اللہ کو.....جب وہ پیدا ہوا وہ فصلیں ہوئیں' وہ فصلیں ہوئیں بلے بلے....."

"دادا تو دانت لگوا لے' کھانے میں سہولت ہو جائے گی....." رخسانہ نے پتہ نہیں کیوں میری طرف دیکھ کر کہا۔

"پیسے کا اجاڑ زرا.....دادے نے گنے کھانے ہیں دانت لگوا لے....." چوہدری برکت علی اونچا ریڈیو لگا کر باہر چلا گیا۔

رخسانہ اٹھ کر دادا کے کندھے دبانے لگی.....

"سعدیہ پتر! یہ تو نے کیا بنی پیدا کی ہے..... پورا سورگ کا جھوٹا۔ جس گھر جائے گی سب کو سکھ دے گی....."

پھوپھی سعدیہ مسکرا کر بولی..... "لے بھائی کو تو راضی نہیں کر سکی..... اگلے گھر والوں کو خواہ مخواہ خوش کرے گی....."

"یہی تیری بھول ہے..... سعدیہ ہوا ابھی پھول کھلا نہیں۔ جب کھلے گا تو خوشبو دے گی ناں....."

اب سعدیہ پھوپھی اور بوڑھا سسر بڑی نارمل آواز میں دیر تک باتیں کرتے رہے۔

رخسانہ کھمن گھی پر پلی ہوئی چوڑی چوڑی بھری بھری لڑکی تھی۔ اس کا چہرہ ترکمانی عورتوں کی طرح چپٹا اور چوڑا تھا۔ آنکھیں کالی اور بڑی تھیں، جن پر بھاری پلکوں کا سایہ تھا۔ یوں لگتا جیسے اسے قدرتی سرمہ لگا ہو۔ اگر اس کی کمر پتلی نہ ہوتی تو جسم دیکھ کر ضرور احساس ہوتا جیسے وہ دو بچوں کی ماں ہے۔ رخسانہ سوکھے گھرانے کی سوکھی سی لڑکی تھی۔ اسے آسانی سے محبت، عزت، روٹی، کپڑا، مکان، زیور ملا تھا کہ اسے کسی کو ناراض کرنے یا انجانے میں بھی دکھ دینے کی عادت نہ تھی۔ وہ یوں چلی جا رہی تھی جیسے چھوٹی ندی بڑے دریا سے ملنے جاتی ہے۔ بڑے اعتماد کے ساتھ بڑی بے خبری لیے..... میں کبھی کبھی اسے کام کرتے دیکھتا تو مجھے لگتا اسے میرا احساس ضرور ہے لیکن اس احساس میں نہ حرص تھی نہ جستجو..... وہ مجھے بھی گھوڑوں کے اصطبل میں ایک خوبصورت نسلی اضافہ سمجھتی تھی.....

"کاکا شوکت سارا خاندان وڈ ٹک دیا ہے بے دردیوں نے....." پھوپھی سعدیہ ایک دن اپلے تھاپتی ہوئی مجھے پوچھنے لگی۔

"ہاں پھوپھی..... ابا جی..... اماں..... نانا جی، راحیلہ..... سب....."

"اوئے ہوئے اب تیرا اس جہان میں میرے سوائے اور کون رہ گیا ہے؟"

"کوئی نہیں پھوپھی..... ابا جی تو پہلے ہی کہا کرتے تھے کہ ایک پھوپھی سعدیہ ہے تمہاری ویراں وال میں....."

"یہ جب پلیگ ہوئی تھی ناں تب سارا خاندان ہمارا ختم ہوا تھا۔ تیری دادی بھی پلیگ میں مری تھی کاکا شوکت....."

میں حیران تھا کہ نہ تو کبھی میرے والد نے نہ ہی کبھی میری ماں نے اپنے خاندانوں کے قصے سنائے..... ماں کو بچوں سے فرصت نہ تھی اور ابا کو شاید اسی کا اتنا خیال تھا..... کہ یہ دونوں گم ہو چکے تھے..... ڈاکٹر سرفراز Chawvinistic نہیں تھے۔ جن خاندانوں میں باپ کی حکمرانی ہو وہاں والدین کو بڑی اہمیت ملتی اور جن خاندانوں میں ماں حاکم ہو وہاں بچوں کو اولیت حاصل ہوتی ہے..... ہمارے گھر میں نہ ماں حاکم تھی نہ باپ اس لیے میں اور راحیلہ خودرو گھاس کی طرح بڑھے۔ ہم میں جو جڑی بوٹی تھی اسے نکالنے کا کسی کو خیال نہ آیا۔ اندر کے موسم ہمیں تر و تازہ کر دیتے اور اندر ہی کی رتوں سے گھاس خشک ہو جاتی۔

مجھے پھوپھی کے ساتھ رہتے ہوئے دوسرا ہفتہ تھا کہ ایک رات مجھے چوہدری برکت علی نے آواز دے کر کہا.....

"بھائی ذرا باہر آنا....."

ہم دونوں ڈاک بنگلے سے باہر نکلے۔ گدی کتا خوب زور سے بھونکا لیکن برکت علی کو پہچان کر اس نے چپ اختیار کر لی اور دم ہلاتا ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

برکت علی کے ہاتھ میں ریڈیو تھا۔ اس نے یہ ریڈیو مجھے پکڑا کر کہا.... "بھاجی ذرا تھوڑی دیر کے لیے اسے پکڑنا....."

میں نے ریڈیو پکڑ لیا تو اس نے تہبند خوب کس کے باندھی' کنگارا اور پھینکا اور آہستہ سے بولا..... "ہم ویراں وال سیدوں کے گھر جا رہے ہیں۔ ضروری کام ہے۔"

"ریڈیو گھر نہ چھوڑ جائیں کافی راستہ ہے....."

"نہیں نہیں ریڈیو بڑا ضروری ہے.....ہم کا پتہ چلتا ہے' خبریں چلتی ہیں گھڑی گھڑی....."

چوہدری برکت علی میں ایک جنگلی جانور کا قدرتی تجسس تھا۔ اس کا قد لمبا چہرہ بھاری اور مونچھیں گھنی تھیں۔ اس کے جسم میں کسی چیتے کی سی چستی اور پلا پن تھا۔ برکت علی ہوزمت نہیں تھا' وہ اپنے باپ کی طرح جاگیر بڑی اچھی طرح سنبھالنے کا اہل تھا۔ صرف کہیں اس کے اندر انا کا کٹ تھا جو اسے ہر وقت مور کی طرح ناچنے پر مجبور کرتا۔ اسے بڑے سے بڑا چیلنج اور چھوٹے سے چھوٹا دست پنجہ خوش کر دیتا۔ بیکار زندگی سے بیزاری اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اسے دیکھ کر سمجھ آ جاتی کہ تندرستی کیسے لڑتی ہے۔ آدمی انا کے ہاتھوں کس طرح ناچنے پر مجبور ہے.....

ہم دونوں آہستہ آہستہ کچے راستے پر ویراں وال کی طرف چل رہے تھے۔ دن کے وقت بھربھری پکی سیلی مٹی میں ریڑھے' کے موٹر سائیکل نشان چھوڑ جاتے تھے۔ چاندی کی پھیکی روشنی میں یہ بات صرف اسی کو محسوس ہو سکتی تھی جو ایسی راہوں پر آنے جانے کا عادی ہو۔ چوہدری نثار محمد کے ڈاک بنگلہ گھر سے ویراں وال قریباً پون میل دور تھا۔ راستے میں دونوں جانب گنے کی فصلیں اور بے آباد زمین قطع در قطع پھیلی تھی۔ ہم دونوں نے تہبند اور لمبے کرتے پہن رکھے تھے لیکن سروں سے ننگے تھے۔ برکت علی نے پیروں میں بہاولپوری کھسہ پہن رکھا تھا اور چاندی کی روشنی میں جب وہ ایسے قدم اٹھاتا جیسے کمال ناچنے لگا ہو' یہ کھسہ بڑی پیاری چمک دیتا۔ میں نے کوہائی چپل پہنی ہوئی تھی جس میں سے ہلکی سی چرک کی آواز آتی تھی۔ کچھ دیر بعد ہماری چال میں سمجھوتہ ہو گیا اور ہم دونوں ایک ہی وقت میں دایاں اور بایاں قدم اٹھانے لگے.....

"سنو چوہدری شوکت! یہ چپلی نہیں چلے گی....."

"کیوں.....اس میں کیا خرابی ہے؟....."

"بس ہے ایک خرابی....."

برکت علی مجھے خرابی بتائے بغیر چپ ہو گیا..... اس کی عادت تھی کہ وہ آدھی بات کرتا تھا۔ اپنے مزارعوں کو حیران پریشان رکھنے کے لیے اس نے یہ انداز گفتگو اپنا رکھا تھا۔ جب کوئی شخص پوری بات نہیں سمجھ پاتا تو اسے عقل استعمال کرنا مشکل ہو جاتی ہے اور وہ اندر ہی اندر بے بسی محسوس کرتا ہے.....

"ویراں وال میں سیدوں کا گھرانہ سب سے زیادہ معتبر اور عزت والا ہے۔ سید کا کا اور سید بھائی سے تم ابھی ملو گے.....خیال سے بات کرنا بلکہ بہتر ہے کہ کم سے کم بولو..... وہ تھوڑی بات سے زیادہ جانچنے والے لوگ ہیں۔"

اس کے بعد برکت علی نے خاموشی اختیار کر لی۔ نہ مجھے سید کا کا کے متعلق کچھ علم تھا نہ سید بھائی کے کچھ کوائف معلوم تھے.....

ہم دونوں کچے راستے پر جانچ تول کر قدم دھرتے چل رہے تھے۔ پھر اچانک برکت علی کا پاؤں مڑ گیا۔ کسی پتھر یا چھوٹے سے گڑھے کی وجہ سے توازن بگڑا اور برکت علی لڑھکنی کھا گیا۔

چوہدری برکت علی کو کندھے اور پنڈلی پر چوٹ آئی تھی اور چوٹ خاصی شدید بھی تھی لیکن برکت علی ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو اپنی تکلیف کا اظہار کسی کے سامنے کر سکیں۔ وہ مدد دینے کا اہل لیکن لینے کا نااہل تھا۔ میں نے اسے اٹھانا چاہا تو وہ کسمسا کر بولا۔ ''نہیں نہیں' میں بالکل ٹھیک ہو..... بس بس.....''

اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے جسم سے پرے کر دیے۔

''اس طرح تو ہم ان کھیتوں میں لاکھوں بار گر کر ہی جوان ہوئے ہیں۔''

وہ کچھ دیر بعد تہبند سنبھالتا اٹھ کھڑا ہوا لیکن یا تو پنڈلی کی تکلیف زیادہ تھی یا کندھے میں درد برداشت سے بڑھ کر تھا' وہ ویراں وال تک مشکل سے چلتا ہوا پہنچا۔

ویراں وال ایک چھوٹا سا تیں چالیس گھروں کا گاؤں تھا۔ اس کے راستے کچے' احاطے اور گھر صاف ستھرے اور رہن سہن اچھا تھا۔ ایک چھوٹا سا سکول بھی تھا جس کے ماسٹر صاحب دن کے وقت چوہدری برکت علی کی زمینوں کی منشی گیری کرتے تھے۔ ماسٹر اپنے گھر کے احاطے میں بچوں کو نمازیوں والی چٹائی پر بٹھا کر پڑھاتا۔ مارتا' کان پکڑاتا' مرغا بناتا' اپنی کہانیاں سناتا' سیدوں کے گھرانے اور چوہدری کے ڈاک بنگلے کی باتیں سناتا۔ چوہدری برکت علی کے گھر کو بھی ویراں وال میں ڈاک بنگلہ کہتے تھے۔ اس ڈاک بنگلے کے علاوہ سیدوں کی پرانی حویلی سارے ویراں وال کے گھروں پر چھائی ہوئی تھی۔

سیدوں کے گھر کے اندر پکا کنواں' بیری کا درخت' تو کا' دیوار سے ٹنگی چار پائیاں' دانوں سے بھرے دو بھڑولے تھے۔ گھر پرانی وضع کا دو منزلہ تھا۔ اوپری منزل میں اخروٹ کی لکڑی کے بنے ہوئے جالی دار جھروکے تھے جو ہمیشہ بند رہتے۔ اس حویلی میں بہت سے کمرے' کئی سیڑھیاں' کھونٹیاں' پیڑھیاں' پلنگ' موڑھے ادھر اُدھر نظر آ رہے تھے۔ آنگن سے کمروں تک کمروں سے سیڑھیوں پر ہو کر' اور سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے ملازم' مزارعے' سیدانیاں' کاکے' کاکیاں ان کے دوست' ہمجولیوں کا پھیرا تو رہتا۔ کھیتی باڑی سے منسلک یہ گھرانہ بڑا خوش اور خوشحال تھا۔ زرعی عہد کے اندر ہی سے صنعتی انقلاب نے جنم لیا اور پھر کسان اور کسان کی ساری روایات' رہن سہن' بولی' لباس' رسم و رواج' روایت اور لوک ریت کا حصہ بننے لگے..... جو کچھ دیہاتی تھا' پرانا تھا۔ ہماری جڑوں میں تھا لیکن پتے' کونپلیں' شاخیں' جڑوں کے اعتراف سے بھاگ گئی تھیں۔ سیدوں کے گھرانے میں بھی ہولے ہولے تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ وہ بھی لوک گیت' لوک ریت' دیہاتی رہن سہن سے نکلنے کی آرزو کرنے لگے تھے۔ سیدانیوں کو شہری لباس' وہاں کے کھانے' شادی بیاہ' ہوٹل پسند آنے لگے تھے.....

جب سے سید بھائی نے کار خرید لی تھی' روز روز لاہور جانا ہوتا..... واپسی پر بظاہر سب لاہور کے لوگوں پر ہنستے وہاں کی اشیاء کا مذاق اڑاتے لیکن اس استہزا اور نفرت تلے بھی کسی تبدیلی کے خواہاں تھے۔ کچھ اور کرنے اور نظر آنے کے آرزومند' بننے کیلئے' خوش خوشحالی' بڑھوتری کی جانب قدم قدم بڑھتے ہوئے ان لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ تالاب کا پانی جب بہہ نہیں سکتا تو پھر کنول کے پھول بن کر سطح سے اوپر اٹھ آتا ہے۔ تبدیلی کی خواہش اس گھرانے میں ان کے سیانوں میں کہیں اندر ہی اندر

کنڈی کھنکھنا رہی تھی۔

جب سے سید کا کا اور سید بھائی نے لہور کے بینکوں میں اپنی فصلوں کے پیسے جمع کرا دیے تھے تب سے اچانک انہیں چوڑ ہڑن' اٹھائی گیروں کا خوف رہنے لگا۔ پہلے گھر کی ساری وافر دولت گھڑوں میں بند کر کے زمین میں دفن کر دی جاتی تھی لیکن اب تو آہستہ آہستہ ساری دولت بینکوں میں چلی گئی تھی اور گھر پر سیدوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

سیدوں کی حویلی کے گرداگرد فصیل نما دیوار تھی اور اس دیوار میں ایک بڑا چوبی دروازہ اونچی چوکھٹ پر فٹ تھا۔ گیٹ سے بآسانی گھوڑے پر گھڑسوار اندر جا سکتا تھا۔ رات کو دروازے کے اندر بڑا سا زنجیری تالا لگ جاتا اور چھوٹا بغلی دروازہ استعمال میں رہتا لیکن دن کے وقت سیدوں کی نیلی کار کے لیے پھاٹک کھلتا اور بند ہوتا رہتا۔

جب چوہدری برکت علی شوکت کے ساتھ ویراں وال کی حویلی سے سوگز پر تھا تو آواز گرا کر چوہدری برکت علی نے کہا.....'' سن بھئی چوہدری شوکت! ایک بات ہے۔''

''ہاں جی.....'' شوکت نے کہا۔

''ایک تو میرے گرنے کا ذکر نہیں کرنا.....ایویں آدمی ہینا ہو جاتا ہے اور دوسرے کسی کو بتانا ہی نہیں کہ ہم کس لیے آئے ہیں۔''

''مجھے تو خود علم نہیں کہ ہم کیوں آئے ہیں۔''

''بس پھر ٹھیک ہے.....''

بڑے پھاٹک کے پاس پہنچ کر برکت علی نے کہا..... ''ریڈیو لگا لو.....''

میں نے ریڈیو کا بٹن دبایا۔ امید علی خاں گا رہا تھا۔ برکت علی نے آواز اونچی کرنے کو کہا جو میں نے کر دی.....

''انہیں پتہ لگ جائے گا کہ کوئی ایویں کیویں نہیں.....ریڈیو والے ہیں۔''

اس لاجک کی مجھے سمجھ نہ آئی۔ برکت علی نے زور سے پھاٹک پر اپنی چھڑی سے دستک دی۔ چھوٹے دروازے سے ایک بوڑھا کسان پگڑی سنبھالتے برآمد ہوا.....

''اوہو ہو ماشاءاللہ ماشاءاللہ چوہدری برکت علی آئے ہیں خیر سے.....آؤ جی آؤ.....''

شوکت آگے جانے لگا لیکن چوہدری نے آہستہ سے کھانس کر منع کر دیا۔

''پھاٹک کھول بابا پارس.....''

''ابھی لو جی.....بنے.....بنے بسم اللہ.....''

کچھ دیر بعد پھاٹک کا قفل کھلا۔ بڑے پھاٹک کے پٹ کھلتے ہی چاندنی کی روشنی میں اندر کا آنگن روشن ہو گیا۔

ہم دونوں کوئی کمرے.....دو سیڑھیاں' ایک غلام گردش سے گزار کر بابا پارس اوپر لے گیا۔

سید بھائی اور کاکا بھائی دونوں پلنگ پر بیٹھے اپنے درمیان میں ریڈیو رکھے خبریں سن رہے تھے۔ مصطفیٰ علی ہمدانی کی آواز میں یہ آخری خبریں تھیں۔

ہم دونوں اشاروں سے سلام کرنے کے بعد ہاتھ ملا کر دوسرے پلنگ پر بیٹھ گئے اور اپنا ریڈیو بند کر لیا۔

جب مصطفیٰ علی ہمدانی نے کہا کہ ابھی آپ ریڈیو پاکستان سے اردو میں خبریں سن رہے تھے تو عجیب قسم کی خوشی محسوس ہوئی۔ قیامِ پاکستان کے بعد ریڈیو ابلاغ کا بہترین ذریعہ تھا۔ اس نے لوگوں کو بڑی جاگرتی دے رکھی تھی۔ خبروں سے وابستگی تو تھی ہی لیکن موسیقی سے بھی جانکاری کا یہ عہد تھا۔ ہم کانن بالا' سہگل' جوتھیکا رائے' کملا جھریا' شمشاد اور امراؤ ضیاء بیگم کے عہد سے نکل آئے تھے۔ اب ہولے ہولے نیو تھیٹرز کے گانے' بمبئی ٹاکیز کی فلموں کا تذکرہ کم ہونے لگا تھا۔ پاکستانی لوگوں کے پاس ابھی اپنی فلمیں' اپنے گیت نہیں تھے۔ ریڈیو پاکستان نے عجیب طور پر اس کی کو کلاسیکل موسیقی سے بھرنا شروع کر دیا تھا۔ روشن آرا بیگم' امانت علی' فتح علی' سلامت علی' نزاکت علی' امید علی خان' فشکن' چھوٹے غلام علی' فریدہ خانم ایسے ان گنت نام اب نوجوان سننے والوں میں عام تھے۔ یہ دور ڈرامے کا بھی تھا اور لوگ بڑی توجہ سے ڈرامے سنا کرتے تھے۔

خبروں کے ختم ہوتے ہی سید کاکا نے ریڈیو بند کر دیا اور بڑی پاٹ دار آواز میں بولا..... "تو جی بسم اللہ بڑی مہربانی کی آپ نے..... ہم تو سوچ رہے تھے کہ خود دونوں بھرا آپ کی طرف آئیں۔"

"ان کا نام تو سید گلزار علی ہے لیکن مدت سے ہم تو انہیں سید کاکا کہتے ہیں اور یہ سید بھائی ہیں سید سرفراز علی..... ان کو بھی ساری خلق سید بھائی کہتی ہے....."

ابتدائی تعارف اور گفتگو ہوتی رہی جس کے دوران دونوں ریڈیو ایک دوسرے کے سامنے چپ رہے۔ کچھ دیر بعد دودھ کے لمبے لمبے گلاس اور پتھر کی طرح سخت لڈو آ گئے۔ ان کے بعد تازہ حقہ آیا جس کے کش لیتے ہوئے چوہدری برکت علی کو دوبارہ اتھو لگ گیا۔ وہ ویسے بھی کندھے اور پنڈلی کی درد کو دبانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے آج کچھ ہمارا بھرا اُوازا ہوا سا ہے....." سید کاکا نے کہا۔

"نہیں تو....." برکت علی نے کچھ خفیف سا محسوس کیا۔

سید بھائی نے ہاتھ بڑھا کر برکت علی کی کلائی پر رکھا۔

"کچھ چنڈا گرم ہے....."

●○●○●○

پانچواں عہد

(ب)

وہ بیوی کو مہارانی بنا کر ایسے رکھتا جیسے مغرب میں چھوٹے بچے کو کتے کی طرح زنجیر سے باندھ کر رکھا جاتا ہے.....اس کی بنیادی خرابی یہ تھی کہ وہ روپیہ پیسہ' عورت' بزنس' دوست' رشتہ دار.....ملنے والوں کو اپنی مرضی پر چلانا چاہتا تھا۔ وہ دوسروں کا اس درجہ خیر خواہ تھا کہ ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیتا اور کبھی کبھی وہ نینشے کا ایسا سوپر مین بن جاتا کہ دوسروں کو گندی مکھی سمجھ کر کبھی مار سے ختم کر دیتا۔ وہ بیک وقت یوزنہ جینسس' سوپر سٹار اور جنگل جنگل گھومنے والا جوگی تھا.....لیکن ایک بات طے تھی کہ اس میں malice نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو بھی اسی قدر برباد کرنے کا اہل تھا جس قدر دوسروں کی بربادی کا ضامن۔

سانولی عطیہ صوفے پر گوگموں کے عالم میں بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی وہ تو اتنی آسانی سے اصغر شیخ کی باگ پکڑ لیتی کہ اسے احساس ہوتا یہ سدھایا ہوا تانگے کا گھوڑا ہے اور کبھی کبھی اصغر شیخ ازبکستان کے گھوڑوں کی طرح الف ہو جاتا۔ عطیہ کو اس سے خوف آنے لگتا اور وہ اصغر کے خالی ہاتھوں میں خنجر تلاش کرنے لگتی۔

میں امریکہ میں اپنی ٹیکسٹائل ملز کے بنے ہوئے ریڈی میڈ کپڑوں کے سلسلے میں اصغر شیخ سے ملنے گیا تھا۔ وہ ایک عرصے سے بیگم پاستی امریکہ ایکسپورٹ کر رہا تھا۔ شکاگو میں اس کا ایک پرانا دوست دیوان سٹریٹ پر سٹور چلاتا تھا اور اصغر شیخ کا مین ڈسٹری بیوٹر تھا۔

''میں جانتا ہوں' جانتا ہوں میں.....سندر داس بڑا کمینہ ہے۔ وہ میرا چاول خریدتا ہے۔ پھر اسے تھیلوں میں بھرتا ہے اور اپنے ہندوستان کی مہر لگا کر بیچتا ہے.....میں جانتا ہوں لیکن مجبور ہوں.....''

''کیسے؟.....کیسے مجبور ہیں آپ؟.....'' عطیہ نے دبی زبان میں آنکھیں میچ کر اچانک سوال کیا۔

''کیوں یہ مجبوری نہیں کہ ہمارا تاجر وہاں مقبول نہیں۔ لوگ چائنیز سٹور پر جاتے ہیں۔ کورین سٹور پسند کرتے ہیں لیکن ہمارا تاجر بے ایمان ہے' ہیرا پھیری کرتا ہے۔''

''یہ نہیں ہے ہمارا تاجر مسلمان ہے.....اس کا ایک ہی گناہ ہے۔ وہ.....کلمہ گو ہے.....'' سانولی ہرنی نے نظریں جھکا کر کہا۔

اصغر شیخ رونمد کے عمل میں تھا۔ وہ قالین پر سگریٹ کی راکھ جھاڑتا کسی وکیل کی طرح چل رہا تھا۔

''اچھا اچھا یہ تو میں بہت سن چکا ہوں۔ ہاں بھئی تم نے بکرا خرید لیا.....؟'' وہ یکدم اپنی تجارت' مغرب کے تاجر' عطیہ سب کو بھول چکا تھا اور عید کے لیے بکرے خریدنے میں ذہنی طور پر مصروف ہو چکا تھا۔

''ابھی تو عید وہ فی دن ہیں.....'' میں نے جواب دیا۔

''دن.....کہاں کل پندرہ دن تو ہیں.....اور قربانی کا بکرا خوب دیکھ پرکھ کر خریدنا چاہیے۔'' اس کے بعد وہ شوکت' عطیہ اور باقی تمام گرم استریوں کو بھول کر فون پر جا بیٹھا اور اپنے باپ کو فون کرنے لگا.....''جی ابا جی' کیسے ہیں آپ.....بس جی آؤں گا کسی دن.....بتائیے آپ کیسا بکرا درکار ہے آپ کو۔ کالا.....سفید.....نہیں نہیں جی مجھے یہ سعادت دیجئے.....دو بکرے.....میں اپنے گھر کے لیے پانچ منگوا رہا ہوں.....جی جی آپ کے لیے تین.....بکر منڈی جائے گا میرا پی اے.....آپ فکر نہ کریں تحقیق کر کے لائے گا.....آپ فکر نہ کریں.....جی جی.....بیس سیر سے کم گوشت نہیں ہوگا ابا جی.....اماں کو سلام.....خدا حافظ.....''

اصغر شیخ کو بھول گیا کہ شوکت اس کے پاس کس کام کے لیے آیا ہے؟ وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ عطیہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اب اس کے دماغ پر بکرے سوار تھے۔ وہ جو کام کرتا ممتاز اور افضل طریقے سے کرتا۔ اسے یہ فکر رہتی کہ اس کے حلقہ احباب' رشتہ داروں' گھر والوں میں اس کا کام' پسند' ذوق' عمل نہ صرف نوٹس ہو بلکہ اس کی تعریف بھی کی جائے۔

سر دست عید آ رہی تھی۔ عید پر بکرے ایسے منتخب ہوں کہ محلے میں تو کیا شہر کے نامی گرامی لوگوں میں بھی ایسے قربانی نہ دی جائے۔ وہ نمازیں پڑھتا لیکن نمازوں کا ذکر بھی کرتا رہتا۔ خیرات صدقات بھی اس کے لیے ڈکشن کا باعث ہوتے۔

''مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا.....''

''کہو کہو.....آخر مجھ سے نہ کہو گی تو کس سے کہو گی؟.....''

لیکن عطیہ جو کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اسے سننے کے لیے اصغر شیخ کے پاس اس وقت ٹائم نہیں تھا۔

''اچھا تو میں چلتا ہوں.....'' شوکت نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں بھائی.....ابھی ہمیں چاولوں کے ایکسپورٹ کے متعلق ساری تفصیلات میں جانا ہے۔ میں تمہیں سندرداس کے ساتھ رابطہ بتا دوں گا تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے ٹیکسٹائل کی وہاں ڈیمانڈ ہے.....ہماری کاٹن وہاں سب پسند کرتے ہیں لیکن ہمیں مارکیٹنگ نہیں کرنا آتی.....بس یہ عیب ہے.....''

وہ فون ملا کر پھر کسی چاچا جی سے باتیں کرنے لگا۔ انہیں تفصیل سے بتانے لگا کہ پارٹیشن کے بعد وہ کس طرح زیرو سے یہاں پہنچا۔ اس کے پاس کئی Success stories تھیں۔ کئی سمندر تھے جن میں اس نے اپنے بادبان کھول کر کشتیاں چلائی تھیں۔ کئی ریسوں میں وہ شامل ہوا تھا۔ کئی میچ اس نے جیتے تھے۔ وہ اسٹاک ایکسچینج کا ممبر تھا۔ چاول ایکسپورٹ کرتا تھا۔ اس کی تین فیکٹریاں پروفیشنل منیجر چلاتے تھے۔ ایک فارم ساہی وال کے قریب اور ایک آزاد کشمیر میں تھا۔ اس کی دونوں بیویاں ہم رنگ' ہم شکل' ہم اطوار اور ناکافی تھیں۔ وہ عورتوں کی کمپنی میں تھوڑی دیر کے لیے مسخرہ بن

جاتا۔ لطیفے سناتا' بڑھ چڑھ کر قیام پاکستان اور اس سے وابستہ مسائل پر گفتگو کرتا لیکن پھر یکا یکی اسے چپ لگ جاتی۔

اصغر شیخ عورتوں کی نزاکت' حسن لطافت' مکاری' عیاری' محبت' چاپلوسی' دانائی' سچائی کسی پہلو کو نہ جانتا تھا اور اس کو دھوئیں سے نفرت تھی۔ وہ سب کچھ ٹھیک ٹھیک جاننا چاہتا۔ تعجب کی یہ بات تھی کہ وہ دراصل کچھ بھی نہ جانتا تھا اور سب کچھ صرف اللہ کی رحمت سے اسے مل رہا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آنے والے مہاجرین میں سے بہت کم لوگوں کو اصلی سوجھ بوجھ تھی۔ سب لوگ اپنے اپنے پروفیشن میں ناک ٹوئیاں مار کر سطح آب پر آ رہے تھے۔

"سیٹھ صاحب مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے....."

"ہاں ہاں بتاؤ ناں۔ آخر بتاتی کیوں نہیں....."

"وہ جی بچے اصرار کر رہے ہیں کہ وہ فارم پر عید منائیں گے۔"

"لیکن میں تو پانچ بکرے منگوا رہا ہوں ان کے لیے Stupid تمہارا خیال ہے کہ مجھے بکروں کے لیے فرصت ہے..... میں قربانی دینا چاہتا ہوں پانچ بکروں کی..... عجیب لوگ ہیں یہ بچے' ان کو ہر وقت اور بجنل ہونے کی سوجھتی ہے..... کوئی فارم پر نہیں جا رہا۔ جسٹ ٹل دم....."

وہ ایک بار پھر قالین پر ایسے چلنے لگا جیسے چڑیا گھر کا شیر پنجرے میں چلتا ہے۔ عطیہ خاموشی سے اندر چلی گئی..... ابھی اسے معلوم نہ تھا کہ عید کے تیسرے دن اسے طلاق ملنے والی ہے.....

"اچھا سر میں پرسوں آؤں گا..... ایک جرمن weaver رکھا ہے۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہے....."

"بیٹھو بیٹھو شوکت..... کمال ہے بیٹھو....."

شوکت پھر بیٹھ گیا۔

"پتہ نہیں کیا بات ہے..... شاید یہ قیام پاکستان کے بعد کی تبدیلی ہے..... شاید یہ میری دولت کی وجہ ہے..... شاید میں عمر کے ایسے حصے میں ہوں جب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اللہ اللہ کرنا چاہیے..... بہر کیف کچھ ہے..... جو سب ٹھیک نہیں کہا جا سکتا....."

اصغر شیخ سامنے کھڑا تھا۔

میرا ہمزاد..... میرا معکوس۔

کیا وقت کے ساتھ ساتھ میں بھی اس جیسا بن جاؤں گا؟"

میرے سامنے لاہور کا کامیاب ترین آدمی کھڑا تھا۔ وہ آندھی' بگولا' زلزلہ سب کچھ تھا۔ وہ اپنی ٹوٹ پھوٹ کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بے دریغ توڑ ڈالنے کا عادی تھا۔ اس کے بال اڑے اڑے' شکل بوڑھے کی سی' ہاتھ پاؤں گودے گئے تھے۔ آنکھوں میں لیزر کی دور مار تھی۔ سانپ کی طرح دیکھتا تو بس دیکھے جاتا۔ نہ دیکھتا تو کبھی آنکھوں غائب ہو جاتا۔ گرامر اور تلفظ کی پرواہ کیے بغیر گھنٹوں انگریزی میں بول سکتا تھا۔ پنجابی میں بے دریغ گالیاں دے کر ایسی آسانی سے مقابل کو منا لیتا کہ حیرت ہوتی۔ اردو میں مسلسل بات کرنا اس کے لیے محال تھا۔ وہ یا تو انگریزی بولتا یا پنجابی..... کہیں کہیں merci اور شکرن بھی ملا لیتا لیکن ٹھہر کر روانی کے ساتھ اپنی گھومنے والی کرسی کو گھمائے پھرائے بغیر مسلسل اردو میں

بات کرتے رہنا..... کسی کی بات دیر تک سننا اسے گوارا نہ تھا۔ ایک ہی وقت میں وہ فون سن کر جواب دینے کی اسے عادت
تھی۔ ایک پیالی سے کافی اور دوسری سے چائے پی کر اسے لطف ملتا۔ سٹاک ایکسچینج سے دولت کمانے کا اس نے ریکارڈ قائم
کر رکھا تھا۔ وہ ہمیشہ کرائے کے محل میں رہا اور کئی بار ایک ہی سال میں اس نے تین چار بار اپنی رہائش گاہ تبدیل کی۔ وہ
عورتوں کا شوقین تھا لیکن عورتوں کے ساتھ مستقل رہنا اسے اوب دیتا۔ وہ اپنی پیاری عورتوں کو Spoil کرنے میں بڑی
برتری محسوس کرتا۔ کوٹھی' میز' زیور' کپڑا' بچے عورت کو بخش کر وہ اپنی شادی کا پرانا لباس بڑی سہولت سے بدل لیتا۔ عورت
سے پیچھا چھڑاتے وقت وہ دولت اور عیاری کو بڑی صلاحیت کے ساتھ استعمال کرتا۔

میں اس سے تب ملا جب وہ اپنی دوسری بیوی سے بچھڑنے والا تھا اور ابھی اس کی بیوی کے علم میں بھی یہ بات نہ
تھی کہ وہ عید کے روز شام کو ٹھیک سات بجے اصغر منزل سے روانہ ہونے والی ہے۔

اصغر شیخ اور اس کی سانولی ہرنی سی عطیہ کمرے میں موجود تھے۔ اصغر بڑے خوشگوار موڈ میں قالین پر ایسے پھر رہا
تھا جیسے شیر چڑیا گھر کے پنجرے میں۔ اس کے دماغ میں جاپان سے آنے والا وفد' اصغر منزل سے رخصت ہونے والی عطیہ'
امریکہ بھیجے جانے والے چاول' ملک کے ناپائیدار سیاسی حالات' دوسروں کی بے رغبتیوں کی اور ان گنت باتیں یوں رول
رول کر حلق رہتی تھیں جیسے واشنگ مشین میں گندے کپڑے..... اصغر شیخ کو سمجھنا مشکل' اس کے ساتھ رہنا مشکل تر اور اس کا
دوست بن جانا مشکل ترین تھا۔

جس طرح کھلنڈرے بچے اپنے پاؤں تلے رینگنے والے کیڑے مسل کر خوش ہوتے ہیں۔ ایسے ہی وہ بھی لوگوں
کو دل دل کر اگر خوش نہیں ہوتا تھا تو اتنا ضرور تھا کہ اسے اپنے اعمال پر رنج کرنے کا یا تو وقت نہ ملتا یا پھر وقت ملنے پر وہ اسے
پچھتاوے میں ضائع کرنے کا عادی نہ تھا۔

اصغر شیخ کو سمجھنا بہت ہی مشکل تھا کیونکہ سب کچھ کہہ چکنے' سن لینے کے بعد وہ بچے کی طرح معصوم نکل آتا۔
بالکل ایسے غسل شدہ بچے کی طرح جس نے ڈال پر بیٹھی اپنے سے بھی معصوم بلبل کا ڈیزی گن سے نشانہ بنایا ہو.....

اس کے ساتھ رہنا مشکل تر آزمائش تھی۔ وہ پل بھر میں گئی داتا ہوتا تو دوسرے پل میں یہ بھی پوچھنے کا مجاز ہوتا
کہ وہ ریزگاری کہاں گئی جو میرے سائیڈ ٹیبل کی ایش ٹرے میں پڑی تھی۔

☆☆☆

''آپ باہر جانا پسند نہیں کرتے؟.....''

''باہر؟..... باہر کیا ہے؟.....'' شوکت نے سوال کیا۔

''باہر زندگی ہے..... لوگ ہیں۔ وقت بدلتا نظر آتا ہے۔ صبح سے شام..... شام سے رات پڑتی نظر آتی ہے۔
رات کے سائے بڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔'' میری بیوی کہتی۔

''ہاں ایسے ہی ہے..... باہر وقت گزرتا دکھائی دیتا ہے.....''

''چلیے پارک میں چلتے ہیں۔ آپ کو تو بچے اور فوارے اچھے لگتے ہیں۔'' میری بیوی روہانسی ہو کر بولتی۔

''ہاں لگتے ہیں..... لیکن اب قریب جا کر دیکھنے کو جی نہیں چاہتا.....''

"شوکت!.....آپ کا کیا کرنے کو جی چاہتا ہے؟....." وہ آنسوؤں سے بالکل قریب ہو جاتی۔
"تمہیں رنج ہوگا سن کر....."
میری بیوی پاس آ کر صوفے پر بیٹھ جاتی۔ ڈرتے ڈرتے وہ اپنا ہاتھ میرے گھٹنے پر رکھ دیتی۔ مجھے یوں لگتا جیسے میری پھوہڑ ماں ابھی زندہ ہے.....
"آپ کا جی چاہتا ہے کسی تبدیلی کو.....ہم یہ سارا Set up بدل سکتے ہیں۔ کوٹھی فیکٹریاں بیچ کر ہم گاؤں چلے جائیں....."
"پھر؟....." شوکت نے سوال کیا۔
"پھر وہاں سادہ سی زندگی اختیار کریں.....ایک بار پھر.....سے شروع کریں.....
ایک کری، چارپائی سے ساگ چپاتی سے۔
"اس سے کیا فرق پڑے گا جانِ من....."
"فرق پڑے گا..... پڑے گا کیوں نہیں پڑے گا.....زندگی جدوجہد کا نام ہے۔ ہم الف بے سے شروع کریں گے تو ایک بار پھر توانا محسوس کریں گے۔ ہم میں جینے کی امنگ پیدا ہوگی....."
"اور اگر خدانخواستہ ہم پھر کامیاب ہو گئے تو؟.....ایک بار پھر سارے درختوں کو پھل لگ گیا، ہر کھیتی ہریالی سے لد گئی تو.....انسان کامیاب ہو کر بھی تو مایوس ہو سکتا ہے ناں....."
"دراصل آپ کو سوائے ناشکر گزاری کے اور کوئی بیماری نہیں.....آپ کبھی اپنے سے نیچے نہیں دیکھتے، ہمیشہ اوپر دیکھتے ہیں....."
سعیدہ بڑی سادہ سی عورت تھی۔ وہ اپنے جسم اور اس کی ضرورتوں کے سہارے خوش باش رہ سکتی تھی۔ اسے دیکھ کر کبھی کبھی مجھے خیال آتا شاید یہ اللہ ہی کی مشیت ہو.....اس نے پہلے حضرت آدم کو بنایا.....مضبوط طاقتور کامیاب، تخلیق کرنے والا.....آسمان زمین میں سفر کرنے والا.....اشرف المخلوقات۔
پھر شاید.....شاید.....شاید اللہ کو خیال آیا ہوگا یہ اتنی طاقت سے شاید وہ بچہ نہ پل سکے جو آدم کی آنے والی پشتوں کا ضامن ہو.....ویسے بھی کامیاب مضبوط شخص خوش نہیں رہ سکتا۔ خوش رہنے کے لیے تھوڑی سی بدی، تھوڑا سا احمق پن، ہلکی سی خودسری خودغرضی ضروری ہے.....پھر اللہ نے بشر کی ایک نئی نوع تشکیل کی عورت!
کمزور لیکن بچے کی مانند کھلنڈری.....
عورت اور بچے کو جب چاہیں کھیل پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ اللہ نے یہی چاہا کہ بچہ پالنے کے لیے بچے کی سی صفات عورت میں ہوں۔ مرد بچے کو ذہانت اور طاقت سے پالے تو آدھا گھنٹہ اس کی پرورش نہیں کر سکتا۔ عورت بچے کے ساتھ بچہ ہو رہے تو ساری عمر کی پرورش بوجھ نہیں بنتی۔ اس نئی تخلیق میں اللہ نے وجدان، ہمدردی.....اور رحم ڈالا.....ان تینوں خاصیتوں سے وہ مضبوط طاقتور ذہین مرد کا بھی ہاتھ پکڑ سکتی تھی اور کمزور خوفزدہ بچے کو بھی پروان چڑھا سکتی تھی.....سعیدہ کے لیے بازاروں میں گھومنا، مینا بازار میں دھکے کھانا، پکنکوں پر جانا، فلمیں دیکھنا، کھانا پینا، سونا، لباس پر لباس بدلنا، تیار ہونا،

گرمی سردی سے تن کو بچانا، دوسروں کی تعریف سے خود کو مضبوط پانا، دوسروں کو بیٹا سمجھ کر اپنے کو بڑا جاننا..... چھوٹی چھوٹی منزلیں، چھوٹے چھوٹے کارنامے، اڑے تھڑے مسئلے، ذرا سی بے وفائیاں، کترن سی میٹھی بات بڑی نیچرل تھی۔ ان باتوں سے محظوظ ہونے میں اسے کوئی کوشش کرنا نہیں پڑتی تھی۔

عورت، مرد اور بچے کے درمیان کی کڑی تھی۔ اس کی صلاحیت مرد سے مختلف تھی کیونکہ حیاتیاتی طور پر فطرت اس سے کچھ اور قسم کا کام لینا چاہتی تھی..... اس کی افتادِ طبع بچے کے قریب تھی۔ اسی لیے بچے کے ساتھ ساتھ بڑھنا..... اس کے ساتھ ساتھ نگران بن کر چلنا عورت کے لیے آسان تھا۔

''کیا سوچ رہے ہیں آپ؟..... ''سعیدہ نے سوال کیا۔

''میں؟..... کچھ نہیں.....''

''آپ اس قدر کیوں سوچتے ہیں۔ جس کی کائنات ہے، وہ اس کے متعلق سوچے، آپ خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں۔ بھلا ہمارے سوچنے سے بھی کچھ ہوتا ہے؟''

''ہاں ہوتا تو کچھ نہیں..... ''میں نے جواب دیا۔

''بس آپ day to day کی باتیں سوچا کریں..... کہاں جانا ہے؟ کیا کھانا ہے؟ کس سے ملنا ہے۔''

''کاش میں ایسا کر سکتا..... لیکن میں ایسی بے مصرف زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس انسانی زندگی کا ضرور کوئی بڑا مطلب کوئی بڑی منزل ہوگی..... اتنی بیکار زندگی اللہ کی مرضی سے نہیں ہو سکتی۔''

''سوچ سوچ کر آپ نے اپنی زندگی میں زہر گھول لیا ہے۔ خدا کے لیے سوچیں، ہم کیا تھے؟ کیا ہو گئے؟..... اللہ نے ہمیں کیا نہیں دیا..... دولت اور پھر بے شمار دولت، پاکستان جیسا وطن جس میں پہاڑ، وادیاں، دریا، جھیلیں سب ہی ہیں..... دوست اقارب..... پاک نبی جیسا پیغمبر، اسلام جیسا مذہب..... خلیل جیسا بیٹا۔''

''ہاں..... ہاں سب کچھ ہے..... جو کچھ انسان سوچ سکتا ہے، سب ہے..... لیکن میں آدم کا بیٹا ہوں۔ سعیدہ تم..... سمجھ نہیں سکتیں۔ میرے اندر کہیں جنت سے نکل جانے کی خواہش بھی ہے..... جنت بھی میرے لیے زنجیر ہو سکتی ہے سعیدہ!''

''اُف اللہ خدا کے خوف سے ڈریں..... خلیل پردیس میں ہے..... اس کی خیر مانگیں..... کفر کے کلمات منہ سے نہ نکالیں۔''

سعیدہ کے لیے زندگی کے سادہ جواب کافی تھے۔ وہ بڑے بڑے مسئلوں سے آسانی کے ساتھ نکل جاتی تھی۔

''ٹیلی ویژن لگا دوں.....''

''اچھا.....!''

سعیدہ نے ٹیلی ویژن لگا کر ریموٹ میرے قریب رکھ دیا.....

''میں ابھی آئی..... دھوبی آیا بیٹھا ہے۔ مجال ہے دس منٹ انتظار کرے۔''

وہ مجھے ٹیلی ویژن کا ریموٹ پکڑا کر چلی گئی..... میں نے اب زندگی کو انفرمیشن کے سہارے بسر کرنا شروع کر

دیا۔ صبح اخبار والے جو کچھ کہتے پڑھتا چلا جاتا۔ پھر رسالے' کتابیں دیکھتا۔ شام کو انفرمیشن کا بولتا' جاگتا ڈبہ سامنے آ جاتا..... اس میں رنگ اچھلتے' جگمگاتے' بندوقیں' پستولیں چلتیں' موسیقی کے فوارے نکلتے..... دوسرے ملکوں کی سیر کرائی جاتی۔ گہرے سمندروں کی تہہ میں اگنے والی روئیدگی' مچھلیاں سانپ دکھائے جاتے۔ سائنسی ترقی اور راکٹوں کے سفر' بڑے اہم لوگوں سے ملاقاتیں' طبی مشورے..... رومانس..... اس ٹیلی ویژن کی معرفت گھاس پر چلنے والا ننھا سا کیڑا اور صدیاں پہلے نیست و نابود ہو جانے والے ڈائنا سور سب سے ملاقات ہو جاتی۔ اس انفرمیشن نے زندگی سے حیرت کو ختم کر دیا تھا..... اب معلوم اور نامعلوم کے درمیان حجاب کم ہوتے جا رہے تھے..... ان حجابات کے باعث زندگی میں کچھ بھید تھے۔ الجبرے کے سوال کمپیوٹر کا Data بن گئے تھے۔

میں نے اٹھ کر ٹیلی ویژن بند کر دیا۔ سٹیشن بدلتے بدلتے میں نے محسوس کیا۔ یہ زندگی نہیں تھی۔ Proxy سے Adventure میں حصہ لینا۔ Proxy سے موسیقی کی دنیا میں داخل ہونا زندگی نہیں تھی..... کسی پیراک کو سمندر کی تہہ میں جاتے دیکھنا بچے کے لیے تو کافی تھا لیکن میرے لیے یہ تجربہ جسم پر رینگنے والے اس کیڑے سے زیادہ نہ تھا' جو میری جلد کے اندر داخل نہیں ہو سکتا۔

انفرمیشن کے سہارے آدمی دوسروں سے گفتگو کرنے کے قابل ضرور ہو جاتا ہے۔ وہ سوڈو دانشور بھی بن سکتا ہے..... لیکن زندگی کچھ اور چیز ہے۔ حیرت کے لیے خود کسی ایسے واقعے سے گزرنا اہم ہے جو دنگ کرنے کے قابل ہو..... ! جنگ میں شریک ہونا اور بات ہے جنگ کی باتیں کرتے رہنا ایک اور مستقل عذاب ہے۔ کسی ناطورۂ دلفریب پر عاشق ہونا ایک اور کیفیت ہے اور غزل پڑھنا اور سر دھننا ایک اور قسم کی لذت ہے..... خود بیمار پڑنا اور علاج ڈھونڈتے پھرنا' ہومیو پیتھک سے ایلو پیتھک تک تعویذ گنڈے جادو ٹونے تک کے مراحل سے گزرنا اور بات ہے' بیماریوں کے متعلق انفرمیشن رکھنا ایک اور بیماری ہے۔

میں نے کمرے کی کھڑکی کھولی۔ تازہ ہوا کا جھونکا باریک پردوں سے ٹکرا کر میرے منہ پر محسوس ہوا۔ اس کوٹھی کا لیونگ روم ایسا تھا کہ اس میں گرمیوں میں ایئر کنڈیشنر اور سردیوں میں ہیٹر چلتے رہتے تھے۔ یہ تازہ ہواؤں سے نا آشنا تھا.....

مجھے پاکستان آئے پورے پینتالیس سال ہو چکے تھے۔

اتنے سارے سالوں میں ان گنت تجربات سے گزر کر میں بانسری نہیں بن سکا' پھکنی بن گیا تھا۔ میری سانس اتنی مسموم تھی کہ ہر ایک میں شعلہ سا جل جاتا۔ کسی دل میں ٹھنڈک نہ اترتی۔ کچھ عرصہ سے میں نے فیکٹری جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ دوست بھی اب میرے کسی کام کے نہ رہے تھے۔ انہوں نے دائرے کا سفر مکمل کر کے کئی اور دائرے شروع کر لیے تھے..... نئی شادیاں کر لی تھیں۔ دولت کی طلب نہ ہوتے ہوئے بھی نئی فیکٹریاں لگانے میں مصروف تھے۔ تازہ رابطے ان کے لیے حیرت کا باعث بنتے۔ زمینیں خریدنے کا شغل' کوٹھیاں بنانے کا عمل جاری تھا۔ جیسے شطرنج کے کھلاڑی کے لیے ایک وقت پر آ کر مزید چال چلنا ناممکن ہوتا ہے..... ایسے ہی مجھے ہر طرف سے مات کا شبہ تھا۔ کامیابی نے میرے لیے تجربے کا ہر دروازہ بند کر دیا تھا.....

کیا میں اپنی حالت کا تجزیہ کرنے پر مجبور تھا۔
اگر میں پاکستان نہ آتا؟.....اور وہیں رہتا جہاں سے میری ذات کا پودا اُگا تھا تو کیا کچھ فرق پڑتا؟
اگر ڈاکٹر سرفراز میری پھوپھی ماں میرے دادا زندہ رہتے تو کیا بات بن جاتی؟
اگر.....راحیلہ زندہ ہوتی؟.....
لیکن مجھے تو برس ہا برس سے اپنے خاندان کے لوگ یاد نہیں آئے تھے' دل نے پوجا پاٹ کے لیے کئی بت تراش لیے تھے۔
پھر؟.....
پھر کیا اوما گسم ٹلی نے میرے دل میں کانٹوں کا درخت بو دیا تھا جو ہر رُت میں.....صرف کانٹے اُگا سکتا تھا.....خزاں میں بھی اس میں کانٹے بچتے اور بہار میں بھی اس کی شاخوں پر نئے کانٹوں کا اضافہ ہو جاتا.....
لیکن اوما کی یاد بھی اب کسک نہیں دیتی تھی.....بس وہ ایک یاد تھی.....ایک واقعہ ایک فوٹو جو میرے ذہن کے البم میں کہیں لگی تھی.....اوما یادوں کے سنگھاسن پر بیٹھی ضرور تھی لیکن تصویر کی مانند.....
مجھے زندگی' پاکستان' دوستوں اور گھر والوں نے ہر لمحے بھرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے اللہ نے وہ سب کچھ دیا تھا جو وہ اپنے بندوں کو نعمتوں کی صورت میں دیتا ہے.....میں ناشکر گزار بھی نہ تھا۔
لیکن کہیں میرے اندر ایک ریگستان تھا.....آزردگی کا خوف کا.....میں ہر خوشی کے موقع پر موت کی آرزو رکھتا تھا.....ایسے سرخ سیب کی طرح جس کے اندر کیڑے کلبلاتے ہیں۔
مجھے زندگی سے خوف آتا تھا۔ اس کے پاس جس قدر کھلونے تھے' سب میں ایسے سپرنگ لگے تھے کہ ہاتھ لگاتے ہی وہ کہیں کے کہیں پہنچ جاتے؟
کیا میں بزدل تھا؟
تبدیلی جو زندگی کا حسن بھی تھا اور اس کی قباحت بھی.....کیا تبدیلی کی خواہش اور تبدیلی کا خوف ان دونوں نے مجھے شکنجے میں کس رکھا تھا؟
میں کون تھا.....؟
عمل اور ردِعمل کے درمیان..... ناسازگاری اور کامیابی کے دائرے میں روے لے کی گولی کی طرح بھٹکتا ہوا.....میرا ہاتھ مایا داس کا تھا۔ جس چیز کو چھو لیتا سونے کی بن جاتی اور پھر بھی.....پھر بھی..... کہیں کوئی کمی تھی جیسے پھول میں خوشبو نہ ہو.....
کھلی کھڑکی سے ایک چھوٹی سی زرد تتلی آ کر پردے سے چمٹ گئی.....
میں تتلی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پاکستان آ کر شاید پہلی بار میں نے تتلی دیکھی تھی۔ اس کے پروں کے ساتھ کئی ہلکی سی بند کتنی نازک تھی۔ ایسی تتلیاں' راحیلہ' اوما اور میری زندگی کا کتنا اہم حصہ تھیں.....
اس وقت مجھے اپنے سے باہر رہنے کا سلیقہ آتا تھا۔

شاید رفتہ رفتہ ان سالوں میں..... میں نے خود اپنے آپ کو قید کر لیا تھا۔ اپنے اندر..... اور اب اس کال کوٹھڑی پر لگے ہوئے تالے کی چابی خود مجھ ہی سے گم ہو گئی تھی؟

قریباً ساٹھ برس پہلے ایسے ہی ایک روز میں اور اوما کسم تلنی بھابیہ ایک بڑی خوبصورت تتلی پکڑ لائے تھے۔ اس کے بڑے بڑے پروں پر براؤن اور زردو جیے تھے۔ آپس میں ملے جلے اور عجیب طرح سے علیحدہ بھی جس طرح کے کپڑے آج کل لڑکیاں پہنتی ہیں..... پھر ہم دونوں نے اسے ایک خوبصورت گلاس اوندھا کر کے بٹھا دیا تھا۔

تتلی نے پہلے لمحے سے اس قید کو قبول کر لیا۔ پہلے اس کے پنکھ کھلے تھے۔ پھر سٹ گئے اور پھر وہ ایک پہلو پر ہو کر لیٹ گئی۔ دوسرے دن وہ ہمیں گلاس میں مری ہوئی ملی..... تتلی ناشکرگزار نہ تھی۔ اس نے گلاس کے شیشے سے ٹکرا ٹکرا کر احتجاج بھی نہیں کیا۔ بس دم سادھے قید سے سمجھوتہ کر گئی۔

کیا میں کسی لمحے کا اسیر تھا؟.....

کیا میں ناشکرگزار تھا؟ اپنے رب کا..... اس کی نعمتوں کا؟

کیا مجھ میں کہیں سے حضرت ابراہیم کی روح حلول کر گئی تھی؟ میں کسی چاند ستارے کو اپنا رب کیوں مان نہیں لیتا تھا.....

یہ بے قراری یہ خوف یہ آزردگی کیا تھی؟

سعیدہ اپنے ہاتھ میں فون اٹھائے وارد ہوئی۔ ''شوکت سنیے خلیل کا فون آیا ہے.....''

''کہاں؟.....'' اتفاقاً میرے منہ سے نکلا۔

فون پکڑ کر میں نے کان سے لگایا۔

''ہاں بھئی خلیل! وعلیکم السلام کیا حال ہے..... ہاں آتا تھا..... آتا تھا۔ تمہارے پاس کیا حال ہے ٹورنٹو کا۔ بچے کیسے ہیں؟..... تارا مجھے یاد کرتی ہے؟..... اچھا..... اچھا..... اچھا موسم کھل جائے تو میں اور تمہاری امی آئیں گے..... بس یار اب سفر کرنے کو جی نہیں چاہتا..... جسم ساتھ نہیں دیتا..... ہاں امنگ نہیں رہی..... انسان غفلت کے سہارے جیے تو بڑے کام کر لیتا ہے..... سوچنے لگے کہ آخر اس کا فائدہ تو سب بیکار ہو جاتا ہے..... بھلا تتلی کا کیا فائدہ..... ہاں خلیل غفلت بھی نعمت ہے..... جوان آدمی اسی کے سہارے بڑے بڑے کام کرتا ہے.....''

کچھ دیر میں خلیل سے باتیں کرتا رہا..... بیرونی ممالک سے آنے والے ہر سیل فون کی طرح جو نہی میں بات کرتا' مجھے فاصلوں کا بڑا شدید احساس ہوتا۔ پھر جب میرے بیٹے کی آواز کان میں پڑتی تو فاصلے کم ہونے لگتے..... اس کی آواز میلوں کے فاصلے چیر کر بالکل قریب معلوم پڑتی۔ خلیل کے بعد میری بہو عائشہ نے فون کیا۔ اس کی آواز میں منت سماجت تھی۔ باری باری اس کے تینوں بچوں نے فون پر ہمیں کینیڈا مدعو کیا۔

سعیدہ کی آنکھیں بیٹے کا فون سن کر ہلکی گلابی ہو گئی تھیں۔ ان میں آنسوؤں کی دھمکی تھی۔ میری بیوی کی پرورش دیہات کی تھی۔ اس کی سائیکی میں بارش کا انتظار' فصل کے اُگنے' بار آور ہونے' پکنے تک کا صبر تھا۔ وہ نامحسوس طریقے سے وقت کو مہلت دینے کی عادی تھی۔ ٹرینوں اور ہوائی جہازوں کے ٹائم ٹیبل' وقت پر دفتر' فیکٹری' سکول' کالج پہنچنے کا

اضطراب اس کی پرورش کا حصہ نہیں تھا۔ تالیاں' فصلیں' رہٹ کی آواز' گوبر تھاپنے اور ساگ پکانے میں اس کا بچپن گزرا تھا۔ وہ سکھی سہیلیوں کے ساتھ آزادانہ کیا تانو لکن میٹی پنچ کھیل کر جوان ہوئی تھی۔ نہ اس کا مزاج تانو لاتھا نہ اس کے انداز..... اس کے لیے سونا' کھانا' جنس' آرام سب کچھ جانور کی طرح نیچرل تھا۔ جسم کی زندگی اس میں نہ اضطراب پیدا کرتی تھی نہ ہی احساسِ گناہ.....

''کیا کہتا ہے خلیل؟.....''

''تم نے بات نہیں کی؟.....''

''ہاں کی تھی.....لیکن آپ سے وہ کیا کہتا تھا؟.....''

''بس اصرار کر رہا تھا کہ آپ دونوں فوراً فورنٹو آ جائیں۔ موسم آئیڈیل ہے.....''

''ہاں.....''

سعیدہ نے فون کے چونگے پر ہاتھ پھیرا جیسے۔ وہ خلیل کے بالوں پر پیار دے رہی تھی۔

''مجھے کہہ رہا تھا کہ وہاں ایک خاتون سے اس کی بڑی دوستی ہو گئی ہے۔ جب وہ ہنستی ہے تو بالکل ابو لگتی ہے.....''

شوکت نے ہنس کر کہا.....''دوری بھی عجیب شے ہے۔ مجھے بھی ہر تیسرا نوجوان خلیل لگتا ہے۔''

''ہم.....ڈرائیو پر چلیں.....''

''سعیدہ نے کچھ دیر بعد فون کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ پہلے ہی نہیں رہی تھی۔ میں نے ایک مدت کے بعد اسے دیکھا۔ اس نے مجھے اور میں نے اسے اتنی لمبی شادی میں بڑی عمدگی سے برداشت کیا تھا۔ اسے مجھ سے اور مجھے اس سے کوئی توقع نہ تھی۔ ہم جانتے تھے توقع سے جھگڑے کا آغاز ہوتا ہے۔ بیٹے کا فون سن کر اسے اضطراب نے گھیر لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میں اپنے بیٹے کو نہیں جانتا۔ ہم ایک ہی گھر میں رہے ضرور..... ہم نے اس کی پرورش میں حصہ بھی لیا لیکن ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ اس کے دکھ سکھ میں میری خواہشات اور اضطراب ایسی سرحدیں تھیں جن کو پار نہیں کیا جا سکتا..... ہم نے برسوں ایک ہی ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھایا تھا' چائے پی تھی لیکن وہ ہمیشہ مؤدب رہا۔ میرا انداز مربیانہ تھا۔ میرے لیے بڑھتے ہوئے ہیومن بینگ میں دلچسپی لینا مشکل تھا۔ اس کے لیے کچی پکی باتوں میں اپنے باپ کو شامل کرنا مجھ سے بھی مشکل تھا۔''

سعیدہ نے میرے جواب کا انتظار کیا اور پھر فون کا چونگا اٹھائے اندر چلی گئی۔ شاید وہ رونے کے لیے غسلخانے کی علیحدگی چاہتی تھی۔

میں نے بڑی کھڑکی بند کی۔ پتہ نہیں اتنی دیر میں تتلی کہاں چلی گئی تھی۔ تپائی پر سے چابی اٹھائی اور ماسٹر بیڈروم کی طرف چلا.....

کوریڈور میں بچھے تخت پوش پر اماں جی بیٹھی تھیں۔ اماں کی عمر ستر برس کی تھی لیکن مشرقی معاشرت اور نوکروں کی جی حضوری نے انہیں نوے برس کا لوتھڑا بنا دیا تھا۔ ہم مشرقی لوگ جوشِ محبت اور احترام میں اپنے بوڑھوں سے زندگی کی

بر ست چھین لیتے ہیں۔ ہماری عزت بچانے کے لیے وہ عشق نہیں کر سکتے.....ماحولیات کا علم چونکہ ہمیں زیادہ ہوتا ہے اس لیے ہم انہیں کسی دنیاوی معاملے میں دخل اندازی کرنے نہیں دیتے۔ ان کے مشورے اس لیے بیکار ہوتے ہیں کہ سائنس نے ان کے سارے علم کو صفر کر دیا ہوتا ہے۔ ان کے لیے سوائے تسبیح' نماز کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں رہتا۔ وہ بوڑھے بھی جو ادھر جانا چاہتے ہیں اور وہ رنگین مزاج بھی جو ادھر جانا نہیں چاہتے۔

اماں کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ کئی برسوں سے میں ان کے پاس نہیں بیٹھا۔ ان کی طبیعت ذرا سی گھبرا جائے تو ڈاکٹر حاضر ہوتا ہے لیکن میں حاضری نہیں دے سکتا۔ میں گھر پر بھی رہوں تو بھی ان سے ملاقات نہیں ہوتی۔

شاید وہ میری اصلی ماں نہیں تھی اس لیے۔

شاید خلیل کی طرح ہم دونوں اپنے تجربات اپنی یادیں ایک دوسرے کو بتا نہیں سکتے تھے۔

''السلام علیکم اماں جی.....''

اماں نے تسبیح پھیرنا بند کر دی۔

چھوٹی چھوٹی گدلی آنکھوں سے بڑی پُر امید نظر مجھ پر ڈالی۔ سلام کا جواب دیا اور ہمیشہ کی طرح بڑی دیر تک دعائیں دیتی رہیں۔ ایسی دعائیں جو صرف داماد کو مل سکتی ہیں۔

''کیسی ہیں اماں جی؟.....''

حیرت سے اماں جی نے مجھے دیکھا۔ خود ترسی' تنہائی اور اچانک ہمدردی ملنے پر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے.....

''بالکل ٹھیک ہوں.....کوئی غم نہیں' کوئی تکلیف نہیں.....''

میں نے ان سے کہنا چاہا.....یہی میرا حال ہے' کوئی غم نہیں' کوئی تکلیف نہیں لیکن.....لیکن ہم دونوں کے درمیان ایک گہرا حجاب تھا۔ میں ان کا ہاتھ پکڑ کر دلاسہ نہ دے سکا.....اور وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے تسلی نہ دے سکی تھیں۔

میں آگے بیڈ روم میں چلا گیا۔ اماں جی کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

''سعیدہ.....سعیدہ'' میں نے آواز دی۔ ''کہاں ہو.....''

وہ کمرے میں نہیں تھی۔ میں نے غسلخانے کے دروازے پر دستک دی تو وہ فوراً ہی نکل آئی جیسے دروازے سے لگی کھڑی ہو۔ ابھی بھی فون اس کے ہاتھ میں تھا۔

''ڈرائیو پر چلیں؟.....''

حیرانی سے سعیدہ نے میرا چہرہ دیکھا.....

''موسم بہت خوشگوار ہے..... یہاں بھی اور کینیڈا میں بھی.....''

ایک مدت کے بعد ہم دونوں ڈرائیو کے لیے نکلے۔ ایسے Reserves کے ساتھ جو اجنبی لوگوں میں ہوتا ہے.....

''کالا شاہ کاکو کی طرف چلیں.....''

''اچھا..... میں تو سمجھتا تھا کہ نہر کے ساتھ ساتھ چلیں.....''

گاڑی ڈرائیو وے سے باہر نکلی۔

''ذرا دیکھنا چاہیے کہ جب ہم فیکٹری لگا رہے تھے اور اب جب پروفیشنل لوگوں نے سارا کام Take over کر لیا ہے' کیا فرق پڑتا ہے؟.....''

''فرق اندر پڑتا ہے سعیدہ..... باہر کے فرق تو عموماً معمولی ہوتے ہیں۔ جب میں فیکٹری لگا رہا تھا..... تو عجیب قسم کی امنگ تھی۔ سیمنٹ' بجری' کیل برنجی سے لے کر مشینری تک ہر چیز کا مجھے علم تھا۔ میں Involved تھا بری طرح سے ہر تفصیل میں ہر کام میں..... لیکن اب مجھے پتہ چلا کہ پروفیشنل انجینئر' پلاننگ کے لیے ایم بی اے لڑکے..... مارکیٹنگ میں مارکیٹنگ کے ماہر..... یہ لوگ مجھ سے بہتر سوچتے ہیں۔ زیادہ اچھا کام چلاتے ہیں وہ..... آج سے تیس سال پہلے میں کام نہیں کر رہا تھا صرف Involved تھا۔ اپنی انا کو بوسٹ کر رہا تھا..... میں اس قدر زندہ تھا کہ کسی ڈکٹیٹر کی طرح مشورہ میری جان پر کانوں پر گراں گزرتا تھا۔''

''بڑی عجیب سی بات لگتی ہے سعیدہ! لیکن فیکٹری بھی ٹھیک چل رہی ہے۔ جواد بھی وطن سے دور' ہم سے دور اطمینان کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ ہم زندگی کے بہاؤ میں کچے گھڑے کی طرح بہہ رہے ہیں اور زندگی کے بہاؤ کو کوئی فرق نہیں پڑتا..... ہم نہ ہوں گے تو کوئی ہم سا ہوگا..... انسان کے لیے یہ بات ماننا اتنا آسان نہیں کہ اس کی Replacement اتنی جلدی اور اس سے بہتر ہو جاتی ہے..... عورت کو غالباً مرد سے بہت پہلے جوانی میں ہی اس بات کی سمجھ آ جاتی ہے کہ ہر قدم پر اس جیسی اس سے بہتر موجود ہے۔''

سعیدہ نے میری بات کا جواب نہ دیا۔

کار نہر کی طرف مڑ گئی۔ پوپلر کے درخت نہر کنارے تالیاں بجا رہے تھے۔ انہیں زندہ رہنے اور مر جانے کا احساس نہ تھا۔ وہ حال کی گھڑی پر زندہ اور مسرور تھے۔

کیا آدم میں اللہ کی پھونکی ہوئی روح کا یہ فساد تھا؟

حادث کو قدیم کی خواہش تھی؟

فانی کو امر ہو جانے کی تمنا؟

کیا آدمی میں چھپی ہوئی انا نے یہ سارا مسئلہ کھڑا تھا؟

انسان کیا یہی چاہتا تھا کہ وہ ناگزیر ہو؟ وہ نہ ہو تو تلافی نہ ہو سکے؟ خلا رہ جائے..... ایک بار میں شکاگو میں سیئرز (Sears) کی بلڈنگ میں گیا تھا۔ دنیا کی سب سے اونچی بلڈنگ میں کم از کم وہاں کے گائیڈ نے یہی بتایا تھا جب میں اوپر سے شکاگو شہر کے چوپھیرا مناظر دیکھ کر لفٹ سے اترا تو میں نے وہ تختی دیکھی جس پر اس بلڈنگ کے آرکیٹکٹ کا نام درج تھا.....

تخیل کی آغوش میں اتنی اونچی بلڈنگ کھڑی کر دینا کتنا بڑا معرکہ تھا..... لیکن باتھوں میں کون' آئس کریم

پکڑے منہ میں چیونگم دبائے لوگ بلڈنگ دیکھ رہے تھے..... لفٹ میں چڑھ رہے تھے اتر رہے تھے..... تختی دیکھ کر آپس میں نام بھی دوہرا رہے تھے.....

لیکن ان کے لیے یہ نام بامعنی نہ تھا..... کون؟..... کہاں؟

نہر کے پانی بہتے جا رہے تھے۔ کچھ ہم سے آگے..... کچھ ہمارے پیچھے' کچھ ساتھ ساتھ..... ان میں تسلسل تھا۔ قومیں کچھ ہم سے پیچھے تھیں' کچھ آگے' کچھ ساتھ ساتھ..... چہرے کچھ آگے تھے' کچھ پیچھے' کچھ ساتھ ساتھ.....

لیکن کوئی کہاں تھا' کیوں تھا..... اس دھرتی پر قلیل قیام کرنے والوں کو اس بات سے کہاں تک فرق پڑتا تھا کہ ان کا نام سدا رہا..... آنے والی نسلوں کے دلوں پر ان کے نام مرتسم ہوئے..... کیا ہونے والا امر ہو جانے کی خواہش سے چھٹکارا پا لیتا ہے؟

سعیدہ نے منہ اپنی کھڑکی کی جانب کر رکھا تھا۔

میں نہ تو اس کی مسکراہٹ نہ آنسو دیکھ سکتا تھا۔

عورت کتنی خوش نصیب ہے۔ ہمیشہ اپنے سے باہر کسی اور میں زندہ رہ سکتی ہے۔ بیٹی بن کر' باپ کی حوالگی سے..... عاشق کے حوالے سے خود تقویت پکڑتے جانا بیٹے کی ذات سے پھلنا پھولنا.....

جب تک سعیدہ رہے گی اسے زندگی ملتی رہے گی۔ بیٹی کی خوشی میں' پوتے کی شکل میں..... وہ بانجھ نہیں مرے گی..... عورت اور دھرتی اگر بنجر بھی ہو تو بھی بانجھ نہیں ہوتی۔ اس میں روئیدگی کی خواہش کلبلاتی رہتی ہے.....

اور میں کہاں تھا؟

کسی مسلک' مشن' آئیڈیا کسی عشق کا سہارا کب تک..... دائرے نامحسوس طریقے سے ختم ہو جاتے تھے' دائرے کے اندر نیوکلس میں بند ہو جانا آزادی اور خوشی کی موت تھی۔

''ہم تو پھر بڑی سنسان جگہ پہنچ گئے سعیدہ..... ملتان روڈ چلیں.....؟''

''چلیے.....''

''اب آپ اپنے پرانے دفتر' کبھی نہیں جاتے.....''

''وہاں منیجر دیانتدار ہے۔ سارا حساب کتاب لے کر آ جاتا ہے..... ویسے بھی ٹیلی فون پر بات ہوتی رہتی ہے۔''

''پھر بھی شوکت..... اپنے بزنس میں دلچسپی لینا ضروری ہے۔ اس طرح اپ ٹو ڈیٹ انفرمیشن رہتی ہے..... کام دوسروں پر مکمل طور پر چھوڑ کر کبھی کبھار بڑے گھپلے کھانے پڑ جاتے ہیں.....''

سعیدہ ٹھیک کہتی تھی۔ اس میں بارس سنس تھی..... عارفہ دنیا کو معلوم تھا۔ دنیا کیسے سیدھی کی جاتی ہے؟ کس کس مقام سے بچ کر نکل جانا ممکن ہے۔

''بات تمہاری ٹھیک ہے لیکن اب نہ تو میڈی فیئر جانے کو جی چاہتا ہے نہ شوکت کیمیکلز میں قدم دھرنے کو۔''

''کبھی اپنے آپ کو ہمت سے اٹھانے کی ضرورت پڑتی ہے شوکت..... آپ نے تو بالکل ڈھیری ڈھا دی ہے۔ ایسے کب تک..... کب تک.....''

وہ اپنے لب کاٹ کر خاموش ہو گئی۔
سعیدہ خوبصورت نہ تھی۔ عمر بھی کافی تھی۔ پھر بھی اس کا بت نسوانیت میں ڈھلا تھا۔ کولہے' کندھے اور سینہ کشادہ اور بلاوے بھرے تھے۔
محلے داروں کے باغ سے میں نے کار کو پھر شہر کی جانب موڑ لیا۔ سامان سے لدے ٹرک لاہور کی مارکیٹ کی جانب رواں تھے۔ سواریوں سے لدی بسیں شہر کی جانب جا رہی تھیں۔ کاریں اوورٹیک کر رہی تھیں۔ موٹر سائیکل جان بچائے آنکھیں چرائے اس ٹریفک میں گھنڈے ڈالتے جا رہے تھے۔
''شوکت.....''
''ہاں.....''
سعیدہ نے ڈرتے ڈرتے اپنا دایاں ہاتھ میرے گھٹنے پر رکھ دیا۔ اس کے ہاتھوں میں گرمی تھی۔ خالص گندم' دیسی گھی اور قدرتی کھاد پھل سبزیوں کی گرمی۔
''ہم.....ایک اور بچہ نہ پیدا کر لیں.....اس کے کام ہوں گے۔ اس کے مسائل ہماری زندگی کے خلا کو بھر دیں گے.....ابھی ہم اتنے بوڑھے تو نہیں ہوئے.....''
میں سوچنے لگا.....یہ بھی کتنی بھولی ہے.....
بچہ اس کے خلا کو پُر کر دے گا.....بلکہ وہاں خلا ہے ہی کہاں۔ وہ تو صبح و شام جواد میں جیتی ہے۔
اور میں.....؟ میں بچے کو لے کر کیا کروں گا۔ جب تک میں عورت نہ بن جاؤں' بچہ میرے کس کام کا؟
یتیم خانے سے کچھ پہلے میڈی لیٹر کے سامنے میں نے کار روک لی۔
جب پاکستان نیا نیا بنا تھا تو میں نے پہلے پہل اس دفتر میں کام کیا تھا۔ اس میں ایک مقامی تاجر کام کرتا تھا۔ وہ ٹائپ رائٹر ریڈیو مجھ سے روزگار نیلی فون منگوایا کرتا تھا۔
مولا چن کھوکھر کی یہ دکان بڑی اگڑم بگڑم تھی۔ سارا سامان الماریوں میں بے ترتیب ٹھنسا دھرا تھا۔ سڑک سے اڑنے والی مٹی اسباب پر تہہ در تہہ جمتی رہتی۔ جب بھی کھوکھر صاحب کسی کو سامان دکھاتے تو لیے سے چیز کو صاف کرنا پڑتا۔ مجھے کبھی سامان آسانی سے نہ ملا لیکن جونہی میں چوہدری صاحب سے پوچھتا' وہ فوراً سامان برآمد کر لیتے۔
چوہدری مولا چند کھوکھر گرمیوں میں تہمد' قمیض' سردیوں میں قمیض شلوار اور دھسہ پہنتا تھا۔ اس کے بھاری جسم کو گرمیاں' سردیاں بہاولپوری کھسہ برداشت کرتا تھا۔ چوہدری کھوکھر موٹی آنکھوں' موٹے ہونٹوں' بھاری گالوں اور چھوٹے کانوں سے سجا تھا۔ گاہک پر مہربان ہو کر کبھی کبھی بے تحاشا رعایت کر دیتا.....کبھی کاؤنٹر پر رکھی گھنٹی گاہک کے آگے رکھ دیتا.....اس تکون گھنٹی پر ایک جانب لکھا تھا ''ادھار قطعی بند ہے.....'' اور دوسری طرف رقم تھا ''قیمت فکسڈ'' وہ ہر وقت اپنے ہاتھ استعمال میں رکھتا.....عینک اتاری پھر بغیر صاف کیے پہن لی۔ ماچس کی تیلی سے کان کی کھجلی مٹائی..... کاؤنٹر پر پڑی ہلکی سی مٹی صاف کر لی۔ ناک کے چوہے نکالے اور کرسی کے نیچے چپکا لیے۔ دانتوں کو ناخنوں سے کھرچ لیا۔ ہونٹوں سے گھوڑے کی سی آواز نکالتے ہوئے کان میں انگلی پھیر لی۔ ایک ہاتھ کے ناخنوں سے دوسرے ہاتھ کے

ناخن صاف کر لیے..... کبھی انگلیوں سے وی بنا کر گاہک کو خوش کر دیا۔ کبھی کسی کو انگوٹھا دکھا کر رخصت کر دیا۔ الماری کے تالے کھولنے کے لیے چابی کے بجائے انگشت شہادت کی مدد لی۔ وہ اپنے ہاتھوں چلتا رہتا تھا۔ مجھے اچھی طرح اس سے پہلی ملاقات یاد ہے۔ میں ضرورت مند تو اس قدر نہیں تھا جس قدر مجھے کسی کام میں گم ہو جانے کی آرزو تھی۔ میں اس کی دکان میں داخل ہونے والی لکڑیوں کی سیڑھیاں چڑھا۔

''آؤ آؤ..... اچھا' السلام علیکم۔''

''والسلام علیکم چوہدری صاحب.....''

''وعلیکم وعلیکم..... سنو بھئی کون ہو تم؟''

''مجھے سید بھائی نے بھیجا ہے چوہدری صاحب۔ آپ کو دکان کے لیے آدمی درکار ہے.....''

''اچھا اچھا تمہارا نام شوکت ہے.....''

''جی سر.....''

''بی اے کیا ہے تو کوئی نوکری کیوں تلاش نہیں کرتے سرکاری.....''

''بس جی..... میں بزنس کرنا چاہتا ہوں۔''

''اچھا اچھا' تمہارا بزنس کا شوق ہے لیکن سید بھائی تو..... یہاں کچھ اور قسم کا بزنس کرتے ہیں۔''

میں حیرانی سے ان کا چہرہ تکتا رہا۔

چوہدری جی نے مجھے آنکھ مار کر کہا..... ''وہ کوٹھیوں سے ریڈیو ٹیلی فون ملتے ہیں ناں..... میرے پاس چھوڑ جاتا ہے..... جب مال بک جاتا ہے تو ہم لوگ طے کر لیتے ہیں۔ میں نے کبھی بے ایمانی نہیں کی..... کیا نام بتایا تم نے؟.....''

''شوکت انصاری جی.....''

''مہاجر ہو کہ مقامی؟.....'' کان میں انگلی پھیرتے ہوئے اس نے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز ہونٹوں سے پیدا کی.....

''مہاجر چوہدری صاحب.....''

''خاندان آ گیا ادھر سے صحیح سلامت.....''

''نہیں جی' کوئی نہیں بچا۔''

وہ کچھ دیر دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے ہونٹ بجاتا رہا۔ اس کے چہرے سے لگا' وہ اونچے اونچے رو دے گا.....

''کتنے بہن بھائی تھے.....''

''صرف ایک بہن تھی.....''

''ہلا..... ماں باپ.....''

''دونوں مارے گئے.....''

پتہ نہیں اسے دکان پر کسی کی ضرورت تھی بھی کہ نہیں' بہر کیف اس نے میری طرف پیٹھ کر لی اور الماری کا شیشہ

صاف کرنے لگا۔

''میں بڑا سخت آدمی ہوں۔ میرے ساتھ کام کرنا آسان نہیں ہوگا۔ میں ساری دُکان ٹچن صاف رکھتا ہوں' کہیں گرد نہ ہو..... کوئی کاغذ لفافہ نہ گرے۔ گاہک کو ناراض نہیں کرنا' حساب کتاب میں رکھوں گا۔ تم گاہک سے Deal کرنا.....''

چار سو ماہانہ کے عوض نوکری مجھے مل گئی۔ جتنی دیر کھوکھر صاحب زندہ رہے۔ ایک دن انہوں نے مجھے کسی گاہک سے بات نہیں کرنے دی۔ رفتہ رفتہ میں ان کی عادت سمجھ گیا۔ ریڈیو کتنے بینڈ کا ہے' کس میٹر بینڈ پر کون سا سٹیشن آتا ہے' میڈیم Wave پر کون کون سے سٹیشن سنے جا سکتے ہیں۔ رات کو بی بی سی کس جگہ سنا جا سکتا ہے..... قیمت پہلے کیا تھی' اب کیوں بڑھ گئی..... وہ گاہک سے بولتا رہتا اور ٹیپ کے بند کی طرح کہتا بھی جاتا..... ''میری عادت نہیں لمبی بات کرنے کی' آپ کی مرضی ہے خرید لیں۔ آپ کی تسلی نہ ہو تو رہنے دیں..... آپ نہیں تو کوئی اور گاہک آ جائے گا.....'' میں صرف سامان لاتا' سجاتا' پیک کرتا' کیش میمو دیتا اور گاہک کو سپرد کرتا۔ دریں اثناء چودھری صاحب یا ہاتھوں سے چلتے یا بولتے رہتے۔

گاہک کے جاتے ہی عموماً ایک جملہ اس کی زبان پر ہوتا..... ''یہ کان کھا جاتے ہیں۔ سامان لینا ہے تو لو..... نہیں تو راستہ دیکھو..... پر گاہک کو تو بیماری ہوتی ہے بولنے کی.....''

چودھری مولا چند کھوکھر کا پورے تین سال بعد پتے کے آپریشن کا شکار ہوا۔ تب مجھ میں بزنس کی کچھ ایسی سوجھ بوجھ پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن پھر بھی میں نے یہ دُکان خرید لی۔

آج ملتان روڈ پر یہ تین منزلہ عمارت پختہ اور خوبصورت کھڑی تھی۔ اوپر کی منزل میں سٹور تھا۔ دوسری منزل پر میڈی فیئر کی دوکان تھی اور نچلی منزل کی دوکانیں کرائے پر تھیں۔ شروع میں تو بہت سادہ الیکٹرو میڈیکل Equipment منگوایا' پاکستان کی میڈیکل انڈسٹری ابھی زیادہ Sophisticated نہیں ہوئی تھی۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ میں فوٹو میٹر' بلڈ سیل کاؤنٹرز' ای سی جی کی مشینیں' ایکسرے مشینیں' مائیکروسکوپ' سی ٹی سکین' بچوں کے Blood Cell Counters'Oxineters'Incubators بھی منگوا لیے۔ 'Centrifuges Patient Monitors'Ultra-sound منگوانے لگا۔ اس وقت میرا فیئر جو بڑے کام کا ایم پی تھا' اس چکر میں تھا کہ جاپان سے کینسر کی مشینیں امپورٹ کرے۔

''آپ اندر نہیں جا رہے؟.....'' کچھ دیر کے بعد سعیدہ نے سوال کیا۔

میڈی فیئر کی تین منزلہ عمارت پر میں نے نظر ڈالی۔ گراؤنڈ فلور پر سیمنٹ سے لدی دُکان' جوالا سویٹ ہاؤس' درزی خانہ' دن کے وقت جلتے بجھتے فانوسوں سے لدی دوکان' سٹیشنری اور بچوں کے رنگین رسائل' عورتوں کے رسائل بیچنے والا کتب فروش اور پچھواڑے میری تین منزلہ بلڈنگ کی گراؤنڈ فلور پر آباد تھے۔

''اندر نہیں جائیں گے شوکت؟.....''

میں نے گرے ماربل کی بیرونی سیڑھی والی تین منزلہ بلڈنگ کو دیکھا۔ میڈی فیئر کا لیبل اور نچلی دوکانیں' ان سب سے میرا کیا تعلق تھا۔ ہاں ایک درخت سے میری شناسائی تھی۔ یہ پیپل کا وہ بھاری درخت تھا جس کے ساتھ میں نے

اس روز ٹیک لگائی تھی جب چوہدری مولا چند کھوکھر کی دوکان میں پہلے دن میرا انٹرویو تھا۔ تب یہ درخت جوان تھا۔ میرے زخموں کی طرح میں نے اس کے تنے سے کندھا لگا کر سوچا تھا۔

پرانے اور نئے وطن کے بارے میں۔

پرانی راحیلہ اور نئی راحیلہ کے ضمن میں

پرانی بے فکری اور نئی ذمہ داری کے سلسلے میں

نئے اجنبی واقف کاروں اور پرانے دوستوں کی شناخت کے بارے میں۔

تب میری یہ دیہہ بھی جوان تھی۔ اس کی تمام جسمانی خواہشیں تازہ امرود کی طرح خوشبو سے بسی تھی۔

کہیں کوئی دلائل' جواز' معنی نہ تھے۔

ہر خواہش پنڈ کشتی کے کھلاڑی کی طرح توانا اور تر نت تھی۔

میں نے جیب سے چاقو نکالا تھا اور پیپل کے تنے پر راحیلہ کا نام گود دیا تھا۔ تب مجھے خیال نہ تھا کہ یہ حرکت کچھ Sentimental بے ہنگم ہے..... میں اب کسی کو بتا نہیں سکتا کہ میں نے بھی ایک روز کسی لڑکی کا نام کسی درخت کے تنے پر بچپن کے خیال سے گاڑ دیا تھا۔ پھر جب بھی مجھے وقت ملتا' میں اس نام کو گہرا کر دیا کرتا۔

اب اس درخت تلے ڈوریں بنانے والا سیٹھ بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے سنگ مرمر کی چھوٹی سی سِل پر سبز لال لئی پڑی تھی۔ ایک موم کا ڈھیلا تھا۔ ارد گرد کچھ بے ترتیب خاکی لفافے تھے جن میں چپڑا لاکھ میدہ شیشے کا برادہ' موم' گوند پرانی ناکیاں پڑی تھیں۔ سیٹھ اس وقت سرخ رنگ کی جرسی اور میرون رنگ کا مفلر لپیٹے سواتی ٹوپی سر پر ماتھے سے ذرا اوپر اٹھائے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے سلاد اور پکوڑے پڑے تھے جنہیں وہ بڑی چاہت سے کھانے میں مشغول تھا۔ پیپل کے درخت میں ان گنت کھلیاں ٹھونک کر ان پر ڈوریں باندھی گئی تھیں۔ بلڈنگ سے کوئی دس فٹ پہلے دو تین درختوں کے خشک تنے مضبوطی سے گاڑے ہوئے تھے اور ان میں بھی لکڑی کی کھلیاں نصب تھیں..... پیپل کے درخت سے لے کر ان مضبوط تنوں تک ڈوریں پھیلی تھیں اور چار پانچ لڑکے بڑی مستعدی سے ڈوریں بنا رہے تھے۔

ایک لڑکا سفید دھاگہ پیپل سے لے کر خشک تنوں تک جاتا' وہاں اسے مضبوطی سے کھلی کے گرد گھماتا اور پھر درخت کی طرف لوٹتا۔ وہ صرف سفید تاریں لگانے پر مامور تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ایک نالی پر مانجھا لگا کر سفید تاروں کو رنگ بھی دے رہا تھا اور مانجھا بھی چڑھا رہا تھا۔ اس کے انداز میں نرت تھی جیسے وہ اسٹیج پر ہو اور ناظرین کے لیے Perform کر رہا ہو۔ تیسرے نوجوان نے چرخی ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی اور بڑے حساب سے اس پر تیار سبز رنگ کی ڈور لپیٹتا جا رہا تھا۔ گرے سویٹر اور نیلی جینز والے نے کاغذوں کا پنا پکڑ رکھا تھا اور ریل میں سے تیار ڈور گزار کر پنے پر چڑھا رہا تھا۔

پتہ نہیں شام تک یہ لوگ کتنے میل چل چکتے تھے۔

کیا انسان اسی لیے پیدا ہوا تھا کہ وہ ڈوریں بناتا رہے اور چلتا رہے۔

پتنگ کچھ اور لوگ اڑائیں اور وہ صرف ایسا نرت کرتا رہے جیسے سیٹھ تو کیا بازار والے بھی نہیں دیکھتے؟

انسان کے کان میں کس نے پھونک رکھا تھا کہ وہ نت نئے کام ایجاد کرے اور پھر ان میں کھو جائے۔ کیا یہی

انسان کی معراج ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی شے' کام' انسان میں ضم کر کے اپنے آپ کو بھول جائے؟ اپنے خالق' اپنے مصرف کا اسے علم نہ ہو؟

''میں ابھی آیا۔'' میں نے چابی کار میں رہنے دی اور بلڈنگ کی طرف چلا۔

پیپل کے درخت کی جلد کھردری اور بوڑھی ہو گئی تھی۔ تنے پر وارث نجومی اور اللہ بخش کباب کے جستی بورڈ بڑی مضبوطی سے ٹھکے تھے۔ تنے میں ان گنت مورے کر کے ان میں ٹکیاں ٹھونکی گئی تھیں۔

میں نے تنے کو غور سے دیکھا۔ وہاں راحیلہ کے نام میں لکڑی کی ایک کلی اندر جا چکی تھی۔ صرف چھوٹی سی ''ر'' باقی تھی جسے میں نے انگلی سے چھو کر چھوڑ دیا۔

ہاں ''رے'' سے کیا بنتا ہے۔ رہین..... ریختہ..... ریلا..... رولا..... واقعی ارد گرد رولا ہی رولا تھا..... کیا صرف شور فتنے فساد کے سر پر ہی زندگی قائم ہے؟ رام رولا نہیں رہتا تو پھر انسان کا کیا بچتا ہے.....؟ میں درخت سے واپس لوٹ آیا۔

''آپ گئے نہیں اندر.....''

''ہاں بس.....''

''اب کہاں جائیں؟.....'' سعیدہ نے پوچھا۔

''کالا شاہ کاکو چلیں؟.....''

اس نے شکستہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا..... ''چلیں؟ آپ اکتا تو نہیں جائیں گے؟''

''نہیں..... جی چاہتا ہے کہ..... کہ کالا شاہ کاکو جا کر شوکت کیمیکلز کا راؤنڈ کیا جائے.....'' سعیدہ چپ رہی۔ اسے اپنے مسائل چپکے چپکے سلجھانے کی عادت تھی۔ کئی رنگ کے الجھے ہوئے دھاگے سلجھانے میں مہارت رکھتی تھی۔

جب لاہور شہر سے نکل کر ہم قدرے کھلی فضا میں آگئے اور بھاری بھاری ٹرک ہماری کار کو اوورٹیک کر کے دائیں بائیں گزرنے لگے تو مجھے اپنے نتھنوں میں سینے میں سانس کا کھلی فضا کا احساس ہونے لگا۔ آسمان کی نیلاہٹ' زمین کی ہریالی نے زندہ رہنے کا اور زندہ رہ کر مسرت کا احساس دلا دیا۔

''سعیدہ! بھلا ہم واپس کیوں نہیں جا سکتے گاؤں میں.....''

اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے دو تے کرنے کے قریب ہے.....

''بھلا درخت اپنی اتری ہوئی چھال میں' سانپ کینچلی کے اندر کیسے جا سکتا ہے؟''

میں چپ ہو گیا۔

سرسوں کے زرد کھیت نگاہوں سے اتر کر کہیں اندر رنگ بکھیر رہے تھے.....

مجھے برسوں پہلے ہولی کا ایک دن یاد آ گیا۔

ڈاکٹر سرفراز' اماں اور میں بازار سے گزر رہے تھے۔ جب سامنے سے ایک آدمی بانس کی پچکاری اٹھائے آیا۔ وہ نیلے لال بسنتی رنگوں کا مکی ماؤس بنا ہوا تھا۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے ایسی پچکاری داغ دی کہ اماں کا کشمیری دوشالا' ڈاکٹر

صاحب کا سواتی فرغل' میری چینٹ قمیض پیلے داغوں سے بھر گئی۔

اماں بولنے لگیں تو ابا نے کہا..... "چپ رہو..... ان کا تہوار ہے..... یہ اکثریت میں ہیں۔ پوچھے بغیر سب کو رنگ دینے کا اختیار رکھتے ہیں۔"

ہم تینوں اپنے اپنے کپڑوں کے دھبوں کو دیکھتے' چڑھائی چل رہے تھے۔

بڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب بولے..... "اسی لیے تو کہتا ہوں' یہ بھلے ہولی منائیں لیکن ہمیں نہ رنگیں۔ یہ اپنے مذہب کو ہم سے بڑا جیسے سے لگائیں' ہم اپنا دین چلائیں..... چلیں تو بھائی چارے کے ساتھ۔ اکثریت کی دھونس نہ ہو..... ہم اقلیت نہ کہلائیں۔"

وہ بولتے گئے لیکن شاید اماں بھی ان کی بات نہیں سن رہی تھیں۔

میری اماں گھریلو عورت تھی لیکن بڑی پھوہڑ۔ گھر میں کبھی لہسن نہ ہوتا' کبھی پیاز کم پڑ جاتا۔ گوشت بھونتے وقت تو گھی ندارد۔ بستروں پر چادریں کبھی پھٹی کبھی ادھڑی نکلتیں۔ جہاں دیواریں ملتیں' وہاں مکڑی کے جالے ضرور ہوتے۔ غسل خانوں میں پھسلن ہوتی۔ قمیض پہن کر پتہ چلتا کہ کالر پھٹا ہوا ہے۔ میز پوشوں پر داغ ہوتے۔ دوپٹوں کی لیسیں ادھڑی ہوتیں۔ اماں کی بوائیاں پھٹی ہوتیں اور ہاتھوں پر سبزی کاٹتے رہنے سے انگوٹھے پر چھری سے پڑی ہوئی لکیریں ہوتیں..... دھوبی کا حساب منہ زبانی ہوتا جس سے دھوبی اور اماں کے درمیان لمبی تکرار چلتی۔ اماں اصرار کرتیں کہ دھوبی کپڑے کم لایا ہے۔ دھوبی مُصر رہتا کہ وہ کپڑے حساب سے زیادہ لایا ہے..... اس تکرار کے باوجود نہ اماں دھوبی چھوڑتیں نہ دھوبی صاحب اماں کا کام چھوڑنے پر راضی ہوتے۔ جن الماریوں میں سامان تھا' اس پر کبھی تالا نہ ہوا۔ جہاں الماری خالی پائی جھٹ نمبروں والا تالا لگا دیا۔ پھر لطف یہ کہ سارا کام منہ زبانی' تالا لگاتے ہی اماں کو نمبری تالے کے ہندسے بھول جاتے جو اتفاقاً کبھی تالا کھولنا ہی پڑ جائے تو باری باری مالی' باورچی' چوکیدار' ڈاکٹر ابا سب تالا کھولنے کو آتے اور آخر میں تالے کو ہتھوڑی سے توڑ دیا جاتا۔ ڈاکٹر ابا اصرار سے کہتے..... اس بار چابی والا تالا لگاتا..... لیکن اماں نہ مانتیں۔ ان کا خیال تھا کہ نمبروں والے تالے میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ چور نمبر نہیں جانتا اور گھر والے نمبر بھول چکے ہوتے ہیں..... چور بھی اماں کے اردگرد تھے۔ کبھی باہر سے نہیں آتے تھے۔ کبھی کشمیری دوشالہ غائب ہو گیا' کبھی کانوں کے بُندے جاتے رہے۔ ہزاروں روپیہ گم ہو جائے اماں صابر و جامد رہتیں اور پانچ روپے کے لیے فساد پڑ جاتا۔ سودا لوٹایا جا رہا ہے۔ ملازموں کو جھڑکیوں سے نوازا جا رہا ہے۔ سارے گھر کے بستر الماریاں جھاڑی جا رہی ہیں۔ پانچ روپے کی تلاش میں ایسی تفتیش ہو رہی ہے جیسے خون کا مقدمہ ہو۔ کبھی کبھی اماں کو جوش آ جاتا تو وہ منتظم بن جاتیں۔ بوتلوں پر کاغذ چپکا کر جلی حروف میں لکھتیں کس میں دھنیا ہے' کس میں سفید زیرہ' کس بوتل کو کھولیں تو ثابت سرخ مرچیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ باورچی خانے کا منہ سر دھو دھلا کر ایسا کیا جاتا جیسے بچی کو بر دکھوے کے لیے سجایا جاتا۔ پھر مرچ مسالے کی بوتلیں' آٹے کے ٹین' سبزیوں کی ٹوکریاں' روٹیوں کے چھابے' چھوٹی بڑی دیگچیاں' کھلی بڑی کڑاہیاں' آٹے' چاول کے ٹین' گندم کی بوریاں' گھی کا کنستر' اچار کے مرتبان' چینی کے ٹین' دارجیلنگ چائے کا ڈبہ' استعمال کے چمچ کانٹے' پلیٹیں پلیٹر' چائے کے برتن' مٹی کی ہانڈیاں سب دھو دھا کر سجائی جاتیں..... لیکن اماں کا جوش مسلسل نہ تھا۔ بس دنوں میں بوتلیں خالی ملنے لگتیں۔

بڑی دیر بعد سعیدہ بولی..... "آپ گاؤں واپس کیوں جانا چاہتے ہیں شوکت؟"

"مجھے یوں لگتا ہے میں نے بلاوجہ بہت سا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ کئی غیر ضروری لوازمات..... کچھ عادات جو غیر ضروری ہیں۔ ان گنت ذمہ داریاں جن کا تعلق صرف انا سے ہے..... زندگی کا ایسا وطیرہ جو نہ سادہ ہے نہ آسانی کا احساس دلا سکتا ہے۔ شاید زندگی سادہ ہو خوشیاں معمولی ہوں تو..... مردہ روح جاگ اٹھے..... سمجھ آنے لگے۔ میں یہاں کیوں آیا تھا۔ مجھے اصل میں کس چیز کی تلاش ہے.....؟"

"پانی جس پل سے گزرتے ہیں شوکت اس پل تلے سے پھر نہیں گزر سکتے..... مینڈک تالاب چھوڑ کر سمندر کی سیر کو جائے گا تو پھر تالاب کنارے بسر نہیں ہوگی..... ہم..... ایسی زندگی کے عادی ہو چکے ہیں۔ نوکر چاکر ہیٹر ایئر کنڈیشنر..... دوست احباب' کلچرل لائف' بیرون ملک کی سیریں۔ لگتا ہے کہ سب کچھ چھوٹ جائے گا لیکن آسائش لہو کا حصہ بن جاتی ہے۔ اس کے بغیر جیا نہیں جا سکتا....."

"کچھ لوگ تو..... آسانی سے....."

"مثلاً..... مثلاً..... کون لوگ۔"

"ابراہیم ادھم..... مہاتما بدھ....."

"یہ تو خاص لوگ ہیں شوکت..... عام آدمی کو کبھی کبھی شک گزرتا ہے کہ وہ خاص ہے لیکن وہ مغالطے کا شکار ہوتا ہے..... ہم جہاں ہیں..... وہیں ٹھیک ہیں۔ ہم اتنی اونچی اڑانوں کے پرندے نہیں ہیں....."

یہ اچھا طمانچہ تھا.....!

چند لمحے میرے آگے سڑک پر..... سڑک سے لے کر پچھلے درختوں اور کھیتوں میں ایک سراب تھرتھرا رہا تھا..... ہرے دروازے کھڑکیوں والا چھوٹا سا گھر..... بان کی چارپائی پر کھیس اوڑھے حقے کی نے تھامے بیٹھا شوکت' ہوا میں ٹیری کی آواز..... آم کے بور کی خوشبو..... زبان پر تازہ مکھن اور ساگ کا مزہ.....

سب سراب تھا..... سانپ کا کینچلی میں گھسنے کا خواب

پانی گزرے ہوئے پل سے بہنے کی خواہش.....

مینڈک کی سمندر سے لوٹ کر تالاب کنارے پھدکنے کی تمنا.....

آہستہ آہستہ مجھ پر یہ حقیقت بھی کھلی کہ درست باتوں کو جان لینا کافی نہیں ہوتا۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو باقاعدگی سے قرآن پڑھتے ہیں۔ اس پر بحث کرتے ہیں۔ دلائل پیش کرنے میں ان کا ثانی نہیں ہوتا لیکن ان سے عمل نہیں ہوتا۔ ماننا اور عمل ہے اور جاننا اور شے ہے۔ سائنس کے اصول جان کر بھی آدمی نہ تو سائنس دان بن سکتا ہے نہ Technician۔ دین کا عجز خار بن جانے پر بھی پیاسا رہ جانے کا ڈر ہے۔ عشق کی کیفیتوں پر سات دیوان قلمبند کرنے والا شاید عاشق نہیں ہوتا۔ تھیوری اور پریکٹس دو مختلف سمتیں ہیں۔ مثل دونوں ہاتھوں کے کہ تنہا ایک ہاتھ دھونا ممکن نہیں۔ جاننا قلب اور ذہن کو اعتراف کے قریب لاتا ہے لیکن اگر دونوں قائل نہ ہوں تو عمل پیدا نہیں ہوتا۔ بسا اوقات صرف ذہن قائل ہو جاتا ہے قلب پر اثر نہیں ہوتا۔ علم پر دوہری ضرب نہ پڑے تو عمل جنم نہیں لیتا.....

بقول صوفیائے کرام انسانی قوتیں عقل' قلب' روح' حواس خمسہ اور سر سے خارج ہوتی ہیں اور ان ہی اعضا کے تابع رہتی ہیں۔ عقل نہ ہو تو انسان دین کا اور اک اللہ کی ذات کا فہم نہیں پال سکتا۔ دیوانہ آدمی' سویا ہوا شخص' کم آئی کیو کا انسان فاتر العقل کسی صورت بھی نفس مطمئنہ کا راستہ اختیار نہیں کر سکتا۔ عقل دونوں جانب سفر کرتی ہے۔ نیک راستہ بھی دکھاتی ہے اور بدراہی کے امکانات کو بھی کھولتی رہتی ہے۔ اب عقل سلیم کی پہلی شرط پیدا ہوتی ہے کہ اس کے بغیر کاملیت کا سفر ممکن نہیں۔ ہر انسانی بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ وہ سلامتی اور راستی کی راہ پر ہی رہنا چاہتا ہے۔ پھر اس کے والدین یا پرورش کرنے والے اسے یہودی عیسائی اور نصرانی بناتے ہیں۔ کبھی کبھی انسان خود تلاش حق کا متلاشی ہوتا ہے اور اپنے استدلال سے تجسس اور فیصلے سے مذہب تبدیل کرتا ہے۔ نئے مسلک اختیار کرتا ہے۔ اس طرح عقل کے بنیادی وصف استدلال' تجسس اور فیصلہ صادر کرنا ٹھہرتے ہیں۔ عقل کی آماجگاہ دونوں ابروؤں کے درمیان ہے اور اس کا رنگ نیلگوں ہوتا ہے۔

قلب بھی عقل کی طرح ہی نیک اور بد افعال کی طرف مائل کرتا ہے اور امام غزالی سمجھتے ہیں کہ دراصل قلب ہی تمام اعمال وافعال کی تحریک پیدا کرتا ہے۔ یہ نفس امارہ کا دوست بن جائے تو خواہشات کی پیروی میں لگ جاتا ہے۔ نفس مطمئنہ کا ساتھی ہو تو آدمی نیک عمل کرتا ہوا راہ حق پر گامزن ہوتا ہے۔ قلب کا مقام دیندار لوگوں کے نظریے کے مطابق بائیں پستان سے دو انگل نیچے ہے اور اس کا رنگ سبز ہے۔

اسی طور روح دائیں پستان سے دو انگل نیچے ہے اور رنگ اس کا نیلا آسمانی ہے۔

حواس خمسہ مقام نہیں رکھتے اور جسم میں ان اعضاء سے وابستہ ہیں' جہاں جہاں ان کا فنکشن ہے۔ مثلاً کان سنتے ہیں زبان ذائقہ محسوس کرتی ہے۔ انسانی جلد لمس کو محسوس کرتی ہے۔ ان سے وہی افعال اور اعمال سرزد ہوتے ہیں جن کے لیے یہ مخصوص ہیں۔

سر کا مقام دماغ میں ایک نکتے کی طرح ہے اور یہ مقام بھید سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسے خواب' رویا' مکاشفات الٰہی کا نزول' غیر شعوری طور پر احساس کا جاگ اٹھنا اسی نکتے پر مرکوز ہوتے ہیں اور اس جگہ کا رنگ یا Aura سیاہ ہے' مثل خانہ کعبہ کے غلاف کے..... کیا یہ وہی پنیل Gland ہے جس کے متعلق ڈیکارٹ نے کہا تھا کہ انسانی جسم میں یہ جگہ Conscience کی سیٹ ہے اور مثل ایک گھڑی کے ہے جہاں اللہ انسان کے ساتھ اپنا اور اس کا وقت درست کرتا ہے۔

یہ بھی صوفیائے کرام کا خیال ہے کہ یہ رنگ ان مقامات یا ان افعال سے نہیں نکلتے بلکہ جس طرح مصور مہاتما بدھ' کرشن جی' حضرت عیسیٰ' بی بی مریم اور دوسرے بزرگان دین کی تصویر تخلیق کرتے وقت ان کے سروں کے گرد روشنی کے ہالے بناتے ہیں اور ان میں مناسب رنگوں کی آمیزش کرتے ہیں۔ اسی طور ان مقامات میں بھی خاص رنگوں کے Aura ہیں۔

عقل' قلب' روح' حواس خمسہ اور سر یہ سارے مقامات افعال اور اعمال کا باعث بنتے ہیں۔ یہ اعمال مثبت بھی ہو سکتے ہیں اور منفی بھی کیونکہ ان کے ساتھ ساتھ نفس بھی سفر کرتا ہے۔ نفس انا کی شکل بھی ہو سکتی ہے اور خودی کی راست Interpretation بھی ممکن ہے۔ نفس کا سفر بھی اعمال کے اعتبار سے منفی بھی ہے اور مثبت بھی۔ سارے بکھیڑے اسی

نفس نے پھیلائے ہیں اور اس کا سفر ہی دراصل انسانی سفر ہے..... یہ نفس مطمئنہ کی جانب لے جائے تو انسان کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کی اکمل ترین تصویر رسول اللہ کی شکل میں نظر آتی ہے۔ کمتر ہو تو نٹشے کا سوپر مین بنتا ہے اور اس سے گھٹتا چلا جائے تو وقت کے نابغۂ روزگار نظر آتے ہیں۔

نفس کی نچلی ترین سطح نفس حیوانی ہے جہاں بندہ جانوروں کی طرح حواس خمسہ کے سہارے فقط اپنی اشتہا کے سہارے زندگی بسر کرتا ہے۔ کھانے کو چاہا کھا لیا۔ کسی کے ساتھ سونے پر راضی ہوئے تو سو لیے۔ چھین جھپٹ کر اپنی منوا لی۔ سیدھی انگلی گھی نکل آیا تو صحیح..... اسی حیوانی سطح پر نہ قلب چالو ہوتا ہے نہ روح اطمینان میں رہتی ہے۔ عقل کی استدلالی قوت بھی زائل ہو جاتی ہے اور تجسس پیش پیش رہتا ہے.....

نفس کی دوسری سیڑھی نفس امارہ ہے۔ یہاں خواہشات حیوانی سطح پر نہیں ہوتی لیکن مکمل طور پر انسان کے اعمال وافعال پر خواہش کا دور دورہ ہوتا ہے۔ خواہشات کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتیں۔ ایک پوری ہوتی ہے تو ترنت ہی دوسری جنم لے لیتی ہے۔ نفس عقل کو اندھا کر کے قلب کو جل دے کر ساتھ ملائے رکھتا ہے اور خواہشات کے بازار میں گھسیٹے پھرتا ہے۔ خواہشات کی ایک فصل کٹ چکتی ہے تو دوسری پنیری سر نکال لیتی ہے۔

نفس کی تیسری سیڑھی نفس لوامہ ہے۔ یہاں کشاکش کا دور دورہ ہوتا ہے۔ انسان عجب طور پر بڑھتا اور پلٹتا ہے۔ کچھ کرنے اور آگے بڑھنے کی خواہش اسے دھکیلتی اور کھینچتی ہے۔ عموماً یہی نفس کا مقام ہے جہاں انسان ذہنی مریض بنتا ہے کیونکہ وہ نیکی اور بدی دونوں دریاؤں کا پیراک بن جاتا ہے۔ ڈپریشن' سکون قلب' مردم بیزاری' مدح وذم کی شدید خواہش..... یافت اور پھر یافت کو گنوا دینے کی شدید خواہش آدمی کو گھیرے رہتی ہے..... یہی وہ گہرے پانی ہیں جن میں جنم جنم کے تیراک ڈوبتے ہیں اور کبھی کبھی کسی خوش نصیب کو ایسا تختہ مل جاتا ہے جس پر سوار وہ صدیوں کی منزل لمحوں میں طے کرتا ہے۔ نفس لوامہ ہی سے مرشد ملاتا ہے۔ یہی مقام ہے جہاں دماغ کے سیاہ نکتے سے روح کو ہدایت ملتی ہے۔ اللہ کی توفیق' انسان کی اپنی استعداد اور مرشد کی منشا شامل ہو تو پھر مرشد بہت جلد ذکر' فکر' شغل' استغراق' ریاضت سے پہلے تو مرید کو یکسوئی عطا کرتا ہے۔ اس سے کثیر المقاصد منزلیں ہٹا دیتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ تفکرات جاتے رہتے ہیں۔ انتشار کی منزل ختم ہوتی ہے۔

ذکر فکر شغل اور ریاضت دراصل پریکٹس کی شکلیں ہیں۔ جس طرح باڈی بلڈنگ والے اپنے پٹھے مضبوط کرنے کے لیے لڑکیاں خوبصورت جسم کی خواہش میں ورزش کرتی ہیں۔ ایسے ہی سالک نفس مطمئنہ کو حاصل کرنے کے لیے ذکر فکر کو اختیار کرتا ہے۔ اس میں فکر اللہ کی چاشنی ملاتا ہے۔ حواس خمسہ کے اعمال اور اذکار سے چھٹکارا پانے کے لیے ریاضت کرتا' روزے رکھتا ہے کہ بھوکا آدمی اور کچھ نہیں تو شہوت سے دور ہونے لگتا ہے اور پیٹ میں ہر دم ایندھن ڈالنے سے جسمانی تعلق کی اشتہا بھی بڑھتی جاتی ہے۔

ذکر کی پہلی سٹیج ایسی ہے کہ انسان سے محبوب دور ہو اس کا تصور بھی دھیان میں نہ آئے لیکن سالک محبوب کا جپ تپ کرتا رہے۔ دوسرے مقام پر محبوب کو دیکھا جا سکے لیکن فاصلے کے باعث محبوب کا فراق قائم اور یاد تازہ رہے..... تیسرا مقام اپنے وجود سے غافل ہونے کا ہے کہ محبوب سامنے ہو لیکن سالک استغراق کے باعث محو ہو..... آخر میں ذکر شغل'

ریاضت' انسان کو ایسی محویت میں لے جاتے ہیں کہ من وتو کا فرق مٹ جاتا ہے۔ انسان محبوب سے اس درجہ واصل ہو جاتا ہے کہ نہ اپنی خبر ہوتی ہے نہ محبوب کی۔ مکمل سکون مل جاتا ہے۔ آپ اللہ سے راضی' اللہ آپ سے راضی..... فنا فی اللہ

"کیا سوچ رہے ہیں شوکت۔ کیمیکلز تو بہت پیچھے رہ گئے....."

میں نے کار موڑی' ایک ٹرک سے ٹکر ہوتے بچی۔

"بس سوچ رہا تھا....."

"آپ بہت سوچتے ہیں۔ آخر اتنی سوچ کیوں؟ کوئی مشکل ہو غریبی' بیماری' ناداری..... کوئی مشکل ہو تو آدمی سوچے بھی..... ایویں شوقیہ اداس رہنا یہ تو بڑی ناشکر گزاری ہے....."

"ہاں سعیدہ تم ٹھیک کہتی ہو لیکن جب یہ مشکلیں ختم ہو جاتی ہیں تو کہیں سے ناشکرگزاری اور نافرمانی کا دوموہی سانپ دل کو ڈسنے لگتا ہے....."

"خواہ مخواہ! آپ باقاعدگی سے نماز پڑھا کریں..... اور اس کے احکامات مانا کریں....." سعیدہ بڑی سادہ سی عارف دنیا تھی۔ جب بھی اس کی دنیا سیدھی ہو جاتی' وہ اللہ کا دل سے شکر کرتی۔ اسے قلب اور روح کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔

"میں بھی احکامات ماننا چاہتا ہوں سعیدہ..... میں اس ریس میں بہت علم حاصل کر چکا ہوں۔ استدلال' تجسس اور فیصلے کی حد تک عقل کو قائل کر چکا ہوں..... لیکن کیا کروں جب تک قلب پر چوٹ نہ پڑے عمل پیدا نہیں ہوتا..... میں ذہنی طور پر تمہاری طرح سوچتا ہوں لیکن تمہاری طرح عمل کو جنم نہیں دے سکتا....."

وہ چپ ہو گئی۔ کار شوکت کیمیکلز کو بہت پیچھے چھوڑ گئی اور بڑی دیر تک ہم دونوں نے کوئی بات نہ کی۔

"وہ ہماری فیکٹری نہیں آئی..... اب تک تو آ جانی چاہیے تھی....."

"بہت پیچھے رہ گئی شوکت کیمیکلز..... قریباً سات کلومیٹر....." میں نے کار ایک بار پھر موڑنا چاہی.....

"رہنے دیں' پھر کبھی سہی....." سعیدہ نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں رہنے دیں....." میں نے جواب دیا۔

بڑی دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے سے نہ بولے۔

"زندگی..... انسان کی زندگی اتنی بے معنی نہیں ہو سکتی سعیدہ..... اللہ تو ہر وقت اشیاء کو Recycle کرتا ہے۔ نائٹروجن کا سائیکل کیسے مسلسل چل رہا ہے۔ کیسے صدیوں دبے رہنے والے درخت' جانور پٹرول میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اشیاء بدلتی نہیں ہیں۔ بس جون بدل لیتی ہیں۔ کیا انسان بار بار جنم لیتا ہے..... کیا وہ بھی ایک زندگی سے کسی دوسری زندگی میں منتقل ہو جاتا ہے..... مابعد کیا ہے؟....."

"بس بس..... ہمیں آواگون سے کیا لینا ہے شوکت! ہمیں جو بتایا گیا ہے وہی کافی ہے..... روزِ حساب اور پھر دوزخ یا جنت..... آپ خواہ مخواہ کفر کی باتیں نہ سوچا کریں....."

سادہ لوگوں کے سادہ جواب!

"سنا ہے سعیدہ! ایمان سے پہلے کفر ضرور آتا ہے؟....."

"اور کچھ حالتِ کفر میں ہی مر جاتے ہیں استغفار پڑھیں....."

سادہ عورت کا سادہ آرڈر۔

کار پھر فراٹے بھرتی چلنے لگی.....سڑک کا ایک ٹکڑا نیا نیا بنا تھا۔ ٹھیکیدار نے شاید کولتار کم بچھائی تھی یا رولر بچھانے میں کچھ سستی کی تھی۔ چھوٹی چھوٹی بجری ٹائروں سے لگ کر دور دور اڑ رہی تھی۔

"یہ سڑک خیر سے نئی بنی ہے اور یہ حال ہے ایک برسات نہیں چلے گی۔ نہ لُک ڈالی ہے نہ رولر پھیرا ہے۔ یہ تو حال ہے ہمارے ملک کا۔ نفسا نفسی نفسا نفسی۔ پتہ نہیں یہ دیانتداری سے کام کیوں نہیں کر سکتے؟.....کیا یہ دیانتداری کو جانتے نہیں؟....."

"جانتے ہیں۔ جانتے ہیں۔ مجھ سے تم سے زیادہ جانتے ہیں لیکن صرف عقل سے تجسس کی خاطر گفتگو کی حد تک دوسروں پر الزام دھرنے کے لیے.....ان کا دل دیانتداری کو نہیں جانتا.....اور جب تک دل اور دماغ دونوں نہ مانیں..... عمل پیدا نہیں ہوتا....."

وہ چپ ہو گئی۔ جیسے بچے حکم پا کر چپ ہو جاتے ہیں۔

کار قریباً دو کلومیٹر آگے بڑھ گئی.....ہم دونوں میں سے کوئی نہ بولا.....

"شوکت اگر ایک اور بچہ ہوتا ناں.....تو زندگی اتنی اداس نہ ہو.....کوئی کام ہو کرنے کو بکھیڑا.....ہو کوئی.....مسئلہ سلجھانے کو.....ہم دوبارہ زندگی میں داخل ہو جائیں.....یہ تو موت ہے۔" .....کہیں میں نے پڑھا تھا مرنے سے پہلے مر جاؤ تو حیات از ممات کا بھید کھل سکتا ہے؟ ہمیں اگر Recycle ہونا تھا تو اس کی صورت کیا تھی.....ہمیں اگر ہمیشگی کی زندگی ملنے والی تھی تو کوئی مرنے والا ہمیں آ کر بتاتا کیوں نہیں.....ڈاکٹر سرفراز.....میری پھوپھو، ماں، راحیلہ یہ سب لوگ کہاں تھے۔"

کچھ دیر اور کار رواں رہی۔ پھر سعیدہ نے کہا....."چلیے جواد کے پاس چلتے ہیں۔ وہاں چھوٹے بچے ہوں گے....."

کیا خوش نصیب تھی سعیدہ! وہ کسی اور میں زندہ رہ سکتی تھی.....

عورت کتنی آسانی سے اپنے آپ کو Recycle کر لیتی ہے۔ اسے بچے کے سہارے زندگی ملتی رہتی ہے۔ دنیا سے اس کا دل اچاٹ نہیں ہوتا۔ جب تک بچہ ہے، وہ کبھی اپنے آپ کو فالتو نہیں سمجھتی۔ اس کے سارے جھگڑے بچے کے لیے ہیں۔ اس کے تمام آنسو اسی کے لیے بہتے ہیں۔ آج کے دور میں عورت نے اپنے لیے جینا سیکھ لیا ہے۔ وہ اپنے غم اپنی خوشیاں خالی کھوکھے اور سیپی کی طرح چن رہی ہے.....اب وہ بھی خالی ہونے لگی ہے۔ بچے کے ساتھ اس کی زندگی توام تھی، اب وہ مرد کی طرح تنہائی سے لڑنے لگی ہے.....

شاید وہ بھی سوچنے لگی ہے کہ اسے کیوں بنایا گیا؟ اس کا مصرف کیا ہے؟ یہاں سے اسے کہاں جانا ہے.....؟ اور اگر جانا ٹھہر ہی گیا ہے تو پھر اتنی دیر کیوں..... یہاں کی سزا کم کیوں نہیں ہو سکتی؟

●○●○●○

پانچواں عہد

(پ)

یونین کے چکر' لیبر لاز کی گرفتیں' رشوت لینے اور دینے کی شرمناکیاں' بلاوجہ قیمتیں بڑھانے کی لت' مارکیٹ کی ازچیں' بینک کے قرضوں کی Evasion اور اس کو ادا کرنے کا متزلزل ارادہ' ٹیکس کی زیادتی اور اس کی ادائیگی کے راؤنڈ اباؤٹ طریقے' گھر کا تشنداخ ماحول' بیوی اور اس کے درمیان دوری اور فاصلے' نئے وطن میں دوستوں کی کمی اور سوشل لائف کی زیادتی' ان گنت مسائل میں گھر کر شوکت مغل کہیں بھاگ جانا چاہتا تھا۔ روز مسائل کی فوج یاجوج ماجوج کی طرح بڑھتی' دیوار چین کی طرح ابھرتی اور سارا دن اسے ڈھانے میں صرف ہو جاتا..... جب بھی وہ چند لمحوں کے لیے بھی تنہا بیٹھتا تو اباجی' داداجی' ساجدہ ماں..... اور راحیلہ آنکھوں میں گھومنے لگتے۔ ان کی تصویریں ابھی دھندلائی نہ تھیں..... وہ چاہتا تھا کہ جیسے وہ نئے وطن میں گڑ گیا ہے' ویسے ہی نئے لوگوں میں نیا باغ تعمیر کرے لیکن یہ چہرے اس کے اندر آندھیوں کی طرح چلتے اور وہ ریت کے بے کی طرح اڑتا پھرتا۔ اس کی یادداشت میں اتنے واقعات' چہرے' لمحات ریکارڈ ہو چکے تھے کہ ان کو مٹانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

اوما کے متعلق وہ سمجھ نہ سکتا تھا کہ اس کے اندر کیسی سوچ ہے۔ کبھی اسے خیال آتا کہ اگر اوما اس کی زندگی میں رہتی تو بہت مسائل پیدا ہو جاتے۔ ایک بار پہاڑوں میں اوما اور شوکت مغل چٹانوں پر بیٹھے تھے۔ نوبالغ اپنے اندر کے جذبات چھپائے چھپائے وہ عجیب قسم کی گفتگو کرنے لگے۔

"داداجی کہا کرتے ہیں ہمارے مذہب میں نہ جبر ہے نہ اکراہ....."

"اکراہ کے کیا معنی ہیں شوکی....."

"زبردستی..... تم خود دیکھو مغل بادشاہ اگر چاہتے تو آج ہندوستان میں کوئی ہندو نہ ہوتا۔ کچھ کو دولت سے رام کر لیتے تو کچھ کو زبردستی..... ہندوستان کے لوگ تو پہلے ہی طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان کو تو اکثریت میں ملانا اور بھی آسان تھا۔ اگر شودر ویش کو مغل بادشاہ ذرا سی تھپکی دیتے تو تم دیکھتیں جوق در جوق لوگ مسلمان ہوتے..... لیکن اسلام سلامتی کا مذہب ہے' اس میں جبر نہیں....."

"اور وہ جو تمہارا محمود غزنوی یہاں آیا تھا..... جس نے سترہ حملے کیے تھے....."

''کمال ہے اوما! یہ چھوٹی سی حقیقت ہے کہ بادشاہ اول و آخر بادشاہ ہوتا ہے۔ اپنی دولت اور ملک میں توسیع چاہتا ہے...... جو شخص اپنی ذات کو آگے بڑھانا چاہے وہ مسلک کا پیروکار نہیں ہوتا......''

''تم تو اس وقت پورے وداوا جی لگ رہے ہو......''

''چلو ہندوستان کی مثال چھوڑو...... چین میں بادشاہوں نے عوام کو زبردستی مسلمان نہ کیا۔ اگر ذرا سا بھی دباؤ ڈالا ہوتا تو آج چین میں ایک بھی عیسائی نظر نہ آتا......''

پتہ نہیں کیوں اوما اٹھ گئی اور رسونت کی جھاڑی سے جیٹگنی رنگ کی رسونت اتار اتار کر کھانے لگی۔

''ہمارے مذہب میں تو گندھرب وداہ کی اجازت ہے...... جب پریمی اور پریمکا کسی بت کے آگے سوگند کھا کر ایک ہو جاتے ہیں تو وداہ ہو جاتا ہے......''

آج تک شوکت مغل سمجھ نہ پایا تھا کہ اوما نے یہ بات کیوں کی۔ اس کا اشارہ کیا تھا' کیوں تھا۔ یہ بات آگے بھی نہ بڑھ سکی کیونکہ راحیلہ ان دونوں کو مثال (پرندہ) دکھانے لے بھاگی..... اب کسی کسی دن وہ اوما کے متعلق' گندھرب وداہ کے متعلق بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا۔

لیکن دیر تک وہ اپنی راکنگ چیئر پر بیٹھ کر پرانی سوچوں میں گم ہو جاتا۔ خیالات کا ہجوم اسے بے قرار کر دیتا اور وہ کمرے میں گھومنے لگتا۔ مسائل اس کے اندر چوروں کی طرح بھاگتے اور وہ پولیس سپاہی کی طرح ان کے پیچھے بھاگتا..... اتنے برس گزر جانے کے باوجود نیا وطن اور بیوی کے ہوتے ہوئے بھی اوما کہیں سے نکل آتی۔

بشریٰ نے ایک دن بڑی لجاجت سے کہا..... ''دیکھیں شوکت صاحب! آپ بہت پریشان رہتے ہیں۔ کبھی میں سوچتی ہوں کہ شاید یہ میری وجہ سے ہے۔ آپ مجھے میری دیہاتی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے ناپسند کرتے ہیں..... کبھی خیال آتا ہے کہ فیکٹریوں نے آپ کو بھی پرزہ بنا دیا ہے..... اور آدمی پرزہ بن کر زندہ نہیں رہ سکتا..... آپ کو اپنا لائف سٹائل بدلنا چاہیے..... ہمیں اتنی دولت نہیں چاہیے.....'' دو بیٹوں کی ماں اپنے گھر کے لیے باپ مانگ رہی تھی اور اسے علم نہ تھا کہ یہ بھیک کیسے مانگی جاتی ہے؟

''پھر؟..... پھر کیا کریں؟.....''

''آپ ہی سوچیں! آپ ہی بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔''

''میں کسی ایسی جگہ جانا چاہتا ہوں جہاں ٹیلی فون نہ ہو..... اخبار نہ آتا ہو..... ٹرین کا ٹریک نظر نہ آئے۔ پکا راستہ نہ ہو..... جس پر کار آ جا سکے..... کمپیوٹر کی آواز نہ آئے..... رات کو ٹیلی ویژن دیکھنے کو نہ ہو......''

بشریٰ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا..... ''تو ویراں وال چلے چلیے' وہاں یہ سب کچھ نہیں ہے......''

ویراں وال جانے کا فیصلہ شوکت مغل نے کچھ بشریٰ کے کہنے پر نہ کیا تھا۔ وہ اس دلدل سے کسی قیمت پر بھی نکلنا چاہتا تھا۔ وہ فیکٹریاں تو گولڈن ہینڈ شیک کے ساتھ پیچھے سے اتر گئیں۔ کچھ بزنس دوسروں کے سپرد کر کے وہ فارغ ہو گیا۔ بیٹوں کے لیے جو بھی اثاثہ تھا' اگر وہ دونوں ہاتھوں سے لٹاتے رہتے تو بھی کم نہ ہوتا۔ ویراں وال میں جب وہ دونوں بڑی حویلی میں اترے تو شوکت مغل نے اطمینان کا سانس لیا لیکن اندر ہی اندر بشریٰ خوفزدہ ہوئی۔ اسے معلوم تھا کہ گاؤں میں

دن بہت لمبا ہوتا ہے اور شہری آدمی لمبے دن کا عادی نہیں ہوتا..... اس کا دن گھنٹوں میں، سال مہینوں میں گزرنا چاہیے۔

گاؤں کے جس گھر میں شوکت مغل اور بشریٰ رہے ایک پرانا سا گھر تھا۔ چاروں طرف پانچ چھ کمرے تھے۔ آگے برآمدے اور درمیان میں کھلا صحن۔ اس صحن میں جا بجا چھوٹے چھوٹے بیری، نیم اور دھریک کے درخت تھے۔ ٹوٹے اور ثابت تخت پوش۔ مٹی کے چولہے، چولہوں پر رکھے بڑے بڑے توے جن پر آٹھ دس روٹیاں ایک بار پک جاتی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں بشریٰ کو بیگم صاحب سے چودھرائن بنتے دیر نہ لگی۔ وہ اپنے پرانے پیٹرن میں ایسے ڈھل گئی جیسے گلاس میں پانی..... شوکت مغل ایک بار پھر ہجرت کا شکار ہو گیا..... آنگن میں سارا دن روٹی پکتی، دانے پھٹکے جاتے، اناج کی بوریاں آتی جاتیں۔ پرانے تخت پوشوں پر کھیس دریاں بچھائی اٹھائی جاتیں۔ کہیں سے بچے آ کر صحن میں کھیلنے اور شور مچانے لگتے۔ رسی ناپی جاتی، روڑے مار مار کر بیر اتارے جاتے..... بشریٰ کا لباس، گفتگو نشست و برخاست سب بدل گیا۔ وہ پہلے ڈیفنس کی بڑی کوٹھی میں ملازمین پر حکم چلاتی تھی۔ اب یہاں مزارع، کی کمین، مراثی مراثنیں اسے گھیرے رکھتیں لیکن شوکت مغل کسی طور پر بھی زمینداری میں کھبنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے ویراں وال کی ساری عملداری، حکومت، رعب داب، چودھرائن کو سونپ کر شوکت مغل اپنے آپ کو آزاد کرنے اور رکھنے کی سعی میں مشغول ہو گیا..... وہ تن تنہا کھیتوں میں نہر کنارے سرکنڈوں کے اردگرد جہاں چڑیاں جھولتی رہتیں، پھرتا رہتا..... رفتہ رفتہ چاندراتوں میں بھی وہ باہر نکل جاتا۔ فصل کٹی زمین، سویا جاگا گاؤں، کھیت، درخت رہٹ، کچے راستے اس کے پیروں کو بھلے لگتے، بھوبھل والی جگہوں میں کبھی کبھی پنڈلیوں تک اس کے پاؤں دھنس جاتے..... نہر سے کچھ ہٹ کر ریتلی زمین کے پاس پہنچ کر وہ اپنے اطالوی جوگر زاتار دیتا اور چاندنی سے منجھی ہوئی ریت پر پیروں کے نشان چھوڑتا ویراں وال سے کافی دور چلا جاتا۔ گرگٹ، چڑیاں، بلبلیں اس کی آہٹ پا کر نکل جاتے۔ کبھی کبھار کوئی سرسراتا سانپ جھپاک سے نکل جاتا۔ اسے سورج چاند ستاروں سے بچھڑے ایک مدت گزر چکی تھی۔ جانوروں کے ریوڑ بھی اُسے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ کبھی کبھی وہ دودھیل گائے بھینسوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں سے مسحور ہو جاتا۔ بکروال جب بکریوں کے اجڑ لے کر گزرتے تو وہ دیر تک اور دور تک ان کو دیکھتا چلا جاتا۔ وہ سوچتا کہ شاید یہی وہ آخری پروفیشن ہے جو شوکت مغل کے مطلب کا ہے..... گاؤں کی لڑکیاں آنکھیں جھکائے اسے سلام کر کے راستہ چھوڑ دیتیں تو وہ حیران ہو کر اپنے آپ سے پوچھتا، کیا واقعی میں اس قدر بوڑھا ہو چکا ہوں..... ان لڑکیوں کو کیسے پتہ چلا کہ میں ان کے کام کا نہیں..... ویراں وال ایک اور عہد میں جی رہا تھا۔ جہاں وقت فصلوں، کھیتوں، پھلوں کی نشوونما کے اعتبار سے گزر رہا تھا..... یہاں جتنی دیر میں بچہ پل کر جوان ہوتا، اسی قدر وقت بھی ہولے ہولے چل کر ساتھ آتا۔ جوانی میں بڑھاپا اور بڑھاپے میں جوانی کا عمل قریب قریب ناپید تھا۔ بچوں والی عورتیں جب نانیاں دادیاں بن جاتیں تو خود بخود چارپائیوں پر بیٹھ کر سروں پر پٹیاں باندھتے تو جوان لوگوں کو مشورے دینے لگتیں..... یہاں کوئی جنریشن گیپ نہیں تھا کیونکہ بوڑھا جوانی گزرنے پر جوان رہنے کا شوق چھپ چھپا کر پالتا تھا..... رونا دھونا ہنسنا فطری عمل تھا۔ اسے لٹریچر، فلم، الیکٹرونک میڈیا نے نہ تو سجایا اور نہ ہی انگیخت کیا تھا..... لوگ اگر جذبات کے دباؤ میں رہتے تو اس سے نکلنے کے راستے بھی نیچرل تھے..... یہ لوگ اپنی معصومیت میں جانوروں کے قریب تھے۔ ان کی جبلتیں بھی آسائش زیبائش سے بہت دور تھیں..... فطرت نے انہیں آپس میں کھیتوں کی طرح ساتھ ساتھ جوڑ رکھا تھا اور ان کے درمیان آڈ، منڈ، روٹ کو

با آسانی ناپا جا سکتا تھا۔ جھگڑے فطری لالچ کے تحت ابھرتے لیکن مقدمے کم تھے۔ ابھی بزرگ جوانوں کو ڈانٹ سکتے تھے۔ بچے ماؤں سے ڈرتے تھے۔ مار پیٹ دنگا فساد ناراضگی تھی لیکن ان باتوں کے باوجود خاندان کا یونٹ سختی سے جڑا تھا۔ چاچا بھتیجا آپس میں زمین کی خاطر مقدمہ لڑنے ایک ہی تانگے میں سوار سٹیشن تک جاتے تھے۔ ساس بہو جانی دشمن ہو کر بھی ایک ہی گھر میں سما سکتی تھیں..... بدی ضرور تھی لیکن بدی انسانی رشتوں کو توڑنے کی طاقت سے عاری تھی..... یہاں لوگ نفرت اور محبت کے ازلی جذبے پر زندہ تھے..... ابھی شہری زندگی نے انہیں منی پلانٹ نہ بنایا تھا کہ وہ ایک ہی ٹھہرے پانی میں سانس لیتے۔ موسم یہاں تو اس کا محور بن کر آتا..... کھیتوں کے سبز رنگ' آسمان کی نیلاہٹیں' چاند تاروں کی روشنی' سورج کی کرنیں بدل جاتیں..... سارے دیہاتی بدلتے موسموں کی روشنیوں سے خوب واقف تھے۔ وہ ہوا روشنی پرندے دیکھ کر بتا دیتے کہ بہار آنے والی ہے۔ سردیاں رخصت ہوئیں۔ کھیتوں کی رنگت دیکھ کر جان جاتے کہ بارشیں کم ہوں گی کہ زیادہ..... انہوں نے اپنی روزمرہ زندگی سے ایک سائنس تشکیل دے رکھی تھی۔ اکھان بنا لیے تھے۔ لوک گیتوں میں ان کے تجربات رچے بسے تھے۔ رسم و رواج میں رہن سہن میں صدیوں کی آپ بیتی منجمد ہو گئی تھی۔ دیہات کی زندگی اتنی بھی سادہ نہ تھی جس قدر شوکت مغل کا خیال تھا۔

جو اس ست روی کے علم کا ادراک رکھتے تھے' اور جانتے تھے کہ حیات کیسے راستے بناتی ہے' وہ ساری عمر اندر اور باہر کے موسموں' رشتوں اور ان کے سوالوں کا جواب نکالتے گزار دیتے تھے..... لیکن شوکت مغل کے پاس شہری زندگی کی ڈائریکٹری تھی۔ وہ ایک اور قسم کی سوجھ بوجھ اور علم اپنے ساتھ شہر سے لایا تھا۔ وہ مادی ترقی کے راز جانتا تھا۔ اقتصادیات کو اپنی مرضی کے تابع اور دولت کو اپنے آرام کے لیے بہت سہولت کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ قدم قدم پر وہ سوچتا کہ کیسے ان مٹی کے گھروں کو سیمنٹ کے پختہ گھروں میں با آسانی بدلا جا سکتا ہے۔ نالیاں پکی کر کے غلاظت کے نکاس کو حقیقت بنایا جا سکتا ہے..... چھوٹا سا سکول' چھوٹا سا ہسپتال' منڈی سامان لے جانے والے ٹرک' ویگنیں' کھیتوں کی آبیاری کے لیے ٹیوب ویل..... اپنی سوچ میں بڑھتے بڑھتے ایک بار پھر دیہات کو چھوٹا سا فعال شہر بنانے میں کامیاب ہو جاتا جہاں ڈاک خانہ' ہوائی جہاز اترنے کا چھوٹا سا ہوائی اڈا..... سواریاں اٹھانے والی بسیں' ویگنیں' ٹیلی فون' رنگین ٹی وی اور کمپیوٹر..... پھر انٹرنیٹ.....

تو یہ تو یہ جگہ تو پھر جرائم' کرپشن' اقربا پروری سے پُر ہو جائے گی جیسے باسی انجیر کے اندر ننھے ننھے کیڑوں کی بھرمار ہوتی ہے۔

بہت جلد گاؤں کے سادہ مسائل سے اس نے سمجھوتہ کر لیا اور ہر بار جب وہ یہاں کچھ بہتر کرنے کے خیال سے بھر جاتا تو جلد ہی سر جھٹک کر اپنے آپ کو سمجھاتا..... یہ اس گاؤں کی معصومیت کو برباد کرنا ہوگا..... یہ گاؤں وقت میں کیوں اٹک گیا ہے..... زمانے کا دھارا کہیں کا کہیں نکل گیا ہے..... اور اس بہتے دھارے نے کہیں ساحل پر اچھال کر دیہات کو ساکت کر دیا..... یہاں وقت ٹنگی تصویر کی طرح ایک ہی منظر پیش کرتا رہتا ہے۔

شوکت مغل نے نچلی منزل پر اپنے لیے ایک کشادہ کمرہ لے لیا تھا۔ جب بشریٰ صحن کی زندگی میں مصروف ہوتی وہ اس کمرے میں بیٹھ کر دروازے سے صحن میں آنے جانے والی رونق کو دیکھ سکتا تھا۔ کھیتوں سے گنے' سبزیاں' اناج' پھل

لا کر چودھرائن بشریٰ کے تخت کے آگے لا کر ڈالنا مزارعوں کا کام تھا۔ اناج پھٹکنا' اشیا تولنا' توے پر ڈھیروں روٹیاں پکانا' درانتی سے ساگ سبزیاں کترنا' کوٹنا مسلنا' سب مزارعوں کی گھروالیاں' بیٹیاں کرتی تھیں۔ دعائیں دینا' اناج وصول کرنا' سانپ سپیرے کا شو کرنا' بندر بندریا کو چودھرائن کے آگے نچوانا ایسے کئی کام کی کمین مسلی حضرات کے تھے۔ بشریٰ جس طرح شہر میں مصروف رہتی تھی بہت جلد وہ اپنے آبائی انداز زیست میں الجھ کر اپنی ماں کا روپ بن گئی۔ اس کے کانوں میں سونے کی بالیاں' ناک میں بڑا ہیرے کا کوکا' ہاتھوں میں سونے کے کنگن' پاؤں میں پازیبیں' کھسے' سر پر کھدر کی پھلکاری' جسم پر رنگ بھرے کپڑے آ گئے۔ وہ تالاب کی مچھلی تھی' پرانا ماحول پا کر اور بھی مسرت سے شامل ہو گئی..... لیکن صحن میں ہونے والے ڈرامے' ڈراپ سین کے بعد لمبے خاموشی کے وقفے' چھاننے پھٹکنے کا شور سب شوکت مغل کے لیے نیا تھا۔ وہ گہری دلچسپی سے اس ماحول کی تبدیلیاں دیکھتا رہتا۔ بہت جلد اسے احساس ہونے لگا کہ جن دیہاتی عورتوں کو وہ ان پڑھ' غلیظ اور جاہل سمجھتا رہا ہے' وہ اپنا ایک سا اجلا پن' عقلمندی اور حسن رکھتی ہیں۔ دیہاتی عورتوں کے جسم ورزش اور کام نے بنائے تھے اور ان کے مڑنے بیٹھنے' کھڑے رہنے کے بعد چلنے میں مچھلی کا سا سڈول پن اور لچک تھی۔ وہ کبھی کبھی دلچسپی سے کسی دیہاتن کا جسم دیکھ کر لاحول پڑھتا اور سوچتا کیا میں ابھی تک عورتوں کو دیکھنے کا اہل ہوں' کیا مرد اس عارضے سے کبھی شفایاب نہیں ہوتا۔

وہ اپنا بستر لپیٹ کر نواڑی پلنگ کی پائنتی بڑے سے گاؤ تکیے کی شکل میں رکھ کر اس پر اپنی کمر ٹیک کر بیٹھ جاتا اور کئی باتیں سوچتا۔ ہولے ہولے ماضی کو پھرولتا حال پر غور کرتا۔ وہ فلسفیانہ انداز میں سوچنے لگتا۔ ملک کی تقسیم نے اس کے ہم عمروں کی سوچ میں کئی قسم کے ڈنٹ اور ابھار پیدا کر دیے تھے۔ وہ بدلتے حالات میں مرد اور عورت کے تبدیل ہوتے رابطے کے متعلق بھی تا دیر سوچتا رہا..... مرد کو ہرجائی بنا کر فطرت کا مقصد کیا تھا؟ مرد کے ہرجائی بن جانے نے عورت کو بڑے زخم دیے تھے۔ کیا یہ زخم مشیت کے مطلوب تھے یا اس ہرجائی پن سے قدرت کا کوئی بڑا کام چلتا تھا کیونکہ اب تک وہ جان گیا تھا کہ انسان کے خمیر میں جو بھی اصل تھا' وہ اللہ میاں کی رضا سے تھا۔ بہت دیر سوچتے رہنے کے بعد وہ سوچ کے اس نتیجے پر پہنچا کہ مرد کو خدا نے مثل بیج کے بنایا' وہ ہوا کے دوش پر اڑے۔ ہاتھوں سے بڑے اہتمام سے بیجا جائے' گر کر خود روئیدگی کا باعث ہو' اس کا کام فطرت کی جانب سے فقط کھیتی تک پہنچنا ہے' کھیتی بنجر' رتیلی' دلدلی' بھربھری' نم کیسی بھی ہو اسے اس بات سے غرض نہیں۔ عورت موٹی' کالی بھدی' پاگل' خوبصورت' کیسی بھی کیوں نہ ہو' مرد کو روئیدگی سے غرض ہے کیونکہ یہی اس کا Biological فنکشن ہے۔ خوبصورت' دلکش' سڈول عورتیں شاید مرد کی محبت کی تو اہل ہوتی ہیں لیکن جنس کے معاملے میں وہ عام عورت کی طرح معمولی ہیں۔ اگر فطرت کی منشا ہوتی کہ فقط خوبصورت عورت ہی بچے جنے تو شاید جنسی طور پر مرد بھی باوفا ہوتا لیکن قدرت تو بھدی' موٹی' بھینگی' کالی ہر عورت کی گود میں بچہ دیکھنا چاہتی ہے..... وہ بلاامتیاز ہر ذی روح کا تسلسل قائم رکھنے پر مصر ہے۔ اسی لیے مرد کی ذات جہاں تک جنس کا تعلق ہے' مجبور ہے۔ جس کام کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے' اسے بلاامتیاز کیے جاتا ہے اور بے وفا ہرجائی' چھچھورا' رنڈی باز' بے حیا کہلاتا ہے۔ اس کا جنسی فنکشن کبھی عورت سے عورت تک کا فرق جان نہیں سکا..... یہاں عورت مرد کے ہاتھوں مجروح ہوتی ہے' پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا زخم مرد کی بے وفائی ہے کیونکہ عورت کا اصل بچے کا حاصل کرنا اور بچہ پالنا ہے۔ اس فعل میں کئی برس

سکتے ہیں۔ وہ بچے کی خاطر اس کے باپ سے بھی باوفا رہتی ہے۔ اس کا سفر بے سمت نہیں۔ مالک بظاہر کتے کی زنجیر پکڑ کر چلتا ہے' لیکن جاتا ادھر ہی کو ہے جدھر کتا کھینچتا ہے۔ عورت بظاہر اپنی زندگی گزارتی ہے لیکن تابع اولاد کے ہوتی ہے...... جس قدر مرد کو سمت معلوم کرنا مشکل ہے' اسی قدر عورت کے لیے منزل کا تعین آسان ہے۔ اسی Dichotomy اور تضاد کے باعث نسل در نسل صدیوں سے مرد اور عورت کا کھیل نہ پرانا ہو چکتا ہے نہ ختم ہوتا ہے۔ ہر عورت چاہتی ہے کہ وہ اپنے عاشق کی منزل ہو۔ ہر مرد کچھ دیر کے لیے اسے اپنی منزل بنا بھی لیتا ہے لیکن خدا مرد کو عورت میں ضم نہیں ہونے دیتا۔ نہ ہی وہ مرد کو عورت کی منزل بناتا ہے...... ایک ہوا میں پولن کی طرح اڑتا ہے' دوسرا کھیتی کی طرح ساکت وصامت اپنے اوپر درخت اگتے دیکھتی ہے اور درخت کی جڑیں اپنے وجود کے پاتال میں اترتے دیکھتی ہے۔ دونوں فنکشن کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہیں۔

لیکن کبھی کبھی جب محبت کا خمیر مرد کو لگ جاتا ہے......

اور کبھی کبھی جب عورت تن من دھن سے کسی مرد کو چاہنے لگتی ہے تو پھر Phenomena نیچر کی منشا کے مطابق نہیں چلتا...... جیسے روز ورکھ کر آدمی از خود کھانے پر راغب نہیں ہوتا۔ مرد قدرت کے ہاتھ میں اس کی منشا کا اوزار نہیں رہتا۔ ہر مرد زندگی میں کبھی نہ کبھی محبت سے دوچار ہوتا ہے لیکن عموماً خوشبو کی مانند یہ محبت کچھ مہینے' سال' مدت کے بعد اپنی خوشبو کھو دیتی ہے اور وہ اپنے نارمل فنکشن کی طرف راغب ہو جاتا ہے' جتی ستی نہیں رہ سکتا...... لیکن کئی بار مرد عشق مجازی میں اس درجہ یک سمتے ہو جاتے ہیں کہ پھر انہیں دوسری عورتیں نظر آنا بند ہو جاتی ہیں۔ غبارہ آہستہ آہستہ محبت کی گیس سے اوپر اٹھتا ہے...... ہولے ہولے...... آہستہ آہستہ...... فضاؤں کو چیرتا یک سمت اڑتا عموماً ایسے ہوتا ہے کہ راستے میں کہیں عشق مجازی ایک بار پھر سمت بدل کر عشق حقیقی میں بدل جاتا ہے۔ اس بار عورت کسی عورت سے بازی نہیں ہارتی بلکہ اسے خدا کے روپ میں اپنے رقیب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شوکت مغل سوچتا...... عورت اور خدا کی پرانی کھٹ پٹ ہے...... جب سے مائی حوا نے حضرت آدم کو ورغلایا اور ابلیس کی مدد سے جنت سے نکلوایا تب سے اللہ بابا آدم سے تو کم ناراض ہے' بی بی حوا کی سزائیں کم نہیں ہوئیں...... ابلیس نے جو منتر حوا بی بی کے کان میں پھونکا وہ یہی تھا کہ جب تک تم جنت میں ہو' بابا آدم مکمل طور پر تمہارے نہیں ہو سکتے۔ اللہ میاں ہر وقت ساتھ ہیں۔ جتنی جلدی شجر ممنوعہ سے کھاؤ گی' اسی تیزی سے اس جنت سے نکالی جاؤ گی...... تم ہو گی اور بابا جی...... پھر درمیان سے تیسرا غائب ہو گا تو تم پوری طرح سے بابا آدم پر راج کرنا...... دنیا میں آ کر ہر عورت اپنا علیحدہ گھر بنا کر اس میں شہزادہ گلفام کو قید کرنا چاہتی ہے...... گلفام قید بھی ہو جاتا ہے...... پھر کہیں سے اللہ میاں انحد باجہ بجاتا ہے...... اور روح بالیدگی کی طرف اٹھنے لگتی ہے۔ کہیں سے قدرت مرد کو اپنے حیاتیاتی فنکشن کی طرف بلاتی ہے اور عورت کسی دوسری عورت سے جوا میں بابا آدم ہار جاتی ہے۔ عورت ہمیشہ خالی ہاتھ رہتی ہے اور مرتی ہے...... وہ اگر کسی دوسری عورت سے نہ بھی ہارے تو بھی مرد خوشبو کی مانند ہاتھ سے نکل کر ملکوتی فضاؤں میں بکھر جاتا ہے...... یہ ازلی کھیل ہے' یہ ازلی تثلیث ہے...... عورت' عورت اور مرد۔

عورت' اللہ اور مرد

جس طرح باون پتوں سے آج تک تاش کے کھلاڑی کھیلتے چلے آئے ہیں ایسے ہی اس تثلیث کے زاویے

بدلتے رہتے ہیں۔ حیثیت کبھی چھوٹی کبھی بڑی ہوتی ہے..... لیکن بحکون کے زاویے جمع کریں تو وہی تین سو ساٹھ ڈگری..... یعنی سارا Linear اور Horizontal سفر کا انجام..... یہاں بھی اگر ایک مرد اور ایک عورت کا سارا عمودی اور Linear سفر جمع کیا جائے تو ہمیشہ °360 ڈگری کا ہی سفر ہوگا۔ دائرے کے مرکز میں ہی بس اسی قدر زاویے جا سکتے ہیں۔

شوکت مغل سوچتا..... مرد اور عورت کے مابین جھگڑا محبت پر ہوتا ہے کہ انا کے مجروح ہونے پر قیامت برپا ہوتی ہے..... یہ جھگڑا حصول کے مشروط ہونے کی بنا پر ہوا کرتا ہے کہ ان کے مابین تیسرے کی شرط ازل سے اندھے شیشے کی طرح موجود ہے.....

دھیان ادھر لگا کر کبھی کبھی شوکت مغل کے خیال میں آتا..... اگر کبھی ایسے ہو کہ کسی عورت کو مرد کی محبت کا گیان ہو جائے..... وہ تن من دھن سے بچے کی جگہ مرد کی ذات میں کھو جائے..... حتیٰ کہ ستی ہو جائے پھر؟..... ہندو دیو مالا میں سیتا، دمیتی، ساوتری جیسی کئی ستی عورتیں تھیں جو پتی دھرم میں ایسی ڈوب گئیں کہ پھر انہوں نے رانجھا رانجھا کرتے اپنے آپ کو رانجھا ہی سمجھ لیا..... ایسی عورتیں ایک بے سود منزل کی جانب بڑھتے بڑھتے یکدم خود منزل بن گئیں۔ اپنی توڑ نبھاتے نبھاتے کانٹوں بھرا سارا رستہ گلزار بن گئیں..... وہ سوچنے لگا اسی لیے پنجابی شاعری میں صوفی نے عورتوں کا روپ دھار کر محبت کی ہے..... رام نام کا چرخا کاتتے کاتتے انت آ گیا..... ساری رات کا جگراتا پی کی جوتیاں سیدھی کرنے میں گزر جاتا ہے۔

یہ وہ غلامی ہے جو کسی دباؤ سے حاصل نہیں ہوتی..... یہ وہ مقام ہے جب خود انسان خوشی سے اللہ کے امر پر اپنے نفس کو قربان کر دیتا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب خواہش کے مینڈھے کو ذبح کر کے انسان اپنے لیے محبوب کی رضا کو پا لیتا ہے..... وہ فقط اللہ کا ہو جاتا ہے۔

شوکت مغل کے دھیان میں پھر ایک اور سوال اٹھتا..... تو کیا محبت کے راستے میں سب سے بڑا روڑا حد سے اونچی دیوار انسان کا اپنا ارادہ ہے؟ اس کی اپنی خواہش؟ رضا؟ کیا اپنی Will کو surrender کرنا محبت کی معراج ہے؟ بابا ابراہیم نے بیٹے جیسی قیمتی خواہش کو اللہ کے امر پر قربان کرنا چاہا؟..... یہ پیغمبر لوگ کیا چیز ہیں۔ یہ اپنے نفس کو کس آسانی سے اللہ کی رضا پر بھینٹ چڑھا کر خوش ہوتے ہیں.....

اسی سرزمین پر ستی ہونے کا بھی رواج تھا۔ نہ جانے وہ کونسی عورتیں تھیں جو خوشی خوشی چتا پر چڑھ جاتی ہوں گی.....؟ ایسی عورتوں نے اپنے بچوں کے متعلق کیا سوچا ہوگا؟ وہ پتی دھرم کے نشے میں میرا بائی بن کر ناچتی ہوں گی.....

کچھ کچے پکے خیال، کچھ چھوڑی ہوئی منزلیں، ان گنت چہرے جو وقت نے کھا لیے، اس کے ارد گرد گھومتے رہتے..... دادا ابا، ڈاکٹر سرفراز، ساجدہ ماں، راحیلہ..... اور پھر اوما..... جیسے کسی دھند میں لپٹے یہ چہرے ہولے ہولے اس کے دل پر دستک دیتے..... وہ صحن میں گھومتی پھرتی بھاری سرین اور کندھوں والی بشریٰ میں جینا چاہتا تھا..... لیکن پتہ نہیں وہ کس ہاتھ کی تیلی تھا۔ چاہتا تو ضرور کہ اپنی مرضی سے ساری ڈوریاں توڑ کر آرام سے بیٹھ رہے لیکن اس کی پچھلی بھرپور زندگی اس کے راستے روکے رکھتی۔ گاؤں میں سارا دن کچھ بھی قابل ذکر نہ ہوتا لیکن وہ اتنی الجھی ہوئی Exposed زندگی بسر کر چکا تھا کہ اس کے سائے آ کر پڑتے اور بے قرار کر دیتے۔ بزنس کا کیا ہوا ہوگا، اسے واپس جا کر چکر لگانا چاہیے۔

راحیلہ کہاں ہے؟..... مجھے پتہ کرنا ہوگا..... میری بہن کا کیا حال ہے۔
کبھی وہ صحن کی جانب دیکھنے کے بجائے کھیتوں کی جانب کھلنے والی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگتا۔ کھڑکی کے آگے لوہے کی سلاخیں تھیں۔ کنڈی مشکل سے لگتی تھی لیکن یہاں شہر کی طرح کی فکریں نہ تھیں..... کوئی چیز بگڑ جاتی تو اسے فوراً ٹھیک کرنے کا فکر کسی کو نہ ہوتا۔ یہاں معاملات' حالات' برسوں سلجھانے کا کسی کو خیال بھی نہ آتا۔ کئی مسئلے اپنی موت مر جاتے یا مسئلے والے کا پروانۂ اجل آ جاتا..... جس طرح شہری لوگ کسی نہ کسی مسئلے کے سہارے جیا کرتے ہیں' ایسے ہی یہ لوگ ہر مسئلے کو دبا کر زندہ رہنے کا گر سیکھ چکے تھے۔
کھیتوں کی جانب گھورتا وہ سوچتا رہتا..... کہ انسان زرعی عہد میں کتنے قانع اور پُرسکون ہوں گے۔ عورت بچہ پا کر کھیتی بیج چھپا کر کیسی آسانی اور پریم سے انتظار کر سکتی ہے..... زرعی عہد میں مرد بھی آسمان کو دیکھتا' موسموں کے بدلنے کا انتظار کر سکتا تھا۔ صبر اور انتظار موسموں کا لوگوں کا مسئلوں کے سلجھاؤ کا فطرتی حل..... امن دراصل صبر اور انتظار کا وقفہ ہے۔ امن ان ہی دو کیفیتوں کو سینچنے سے پیدا ہوتا ہے.....
شوکت مغل ابھی وجود کے کوڑا کو صاف کرنے کے عمل میں تھا۔ وہ سوچ کا جھاڑو پکڑ کر پھیرتا۔ کئی نظریے کئی وافر لوگ کئی خواہشیں روز باہر نکالتا لیکن یاجوج ماجوج کی طرح یہ کوڑا کرکٹ پھر رات کو کہیں سے آ نکلتا۔
اس کا اپنا وجود کسی اونچے درخت میں ٹنگی پتنگ کی طرح آرزومند تھا کہ کوئی ڈھیلا اسے پھاڑ دے' کوئی ڈھانگا اسے اتار لے..... کوئی درخت پر چڑھ کر اسے اتارے اور بھاگ جائے لیکن ڈالیوں میں ابھی پتنگ رات کو بھیگ جاتی اور صبح کے وقت ہولے ہولے سوکھنے لگتی.....
کبھی کبھی ماسٹر اللہ وسایا اس کی کھڑکی کے آگے سے گزرتا اور اسے باہر جھانکتا پا کر سلام کر دیتا۔ ماسٹر اللہ وسایا ڈھانگے کی طرح لمبا اور پتلا تھا۔ اس کا مٹی رنگ چہرہ فطری خاموشی سے ساکت تھا۔ کم مسکراتا۔ بولتا تو مدہم آواز..... آنکھیں..... خالی تھیں..... ان میں مسکراہٹ اور آنسوؤں کا عکس موجود نہ تھا۔ ماسٹر اللہ وسایا عموماً سفید کپڑوں میں ملبوس ہوتا۔ اس کے پاؤں میں زری کی سرخ جوتی ہوتی اور قمیص کی اوپر والی جیب میں نیلے چیک کا رومال ہوتا۔ ماسٹر اللہ وسایا کسی طرح بھی دوسرے دیہاتی لوگوں سے مختلف نہیں تھا لیکن ایک بات ضرور تھی۔ وہ بن بلائے کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ وہ شوکت مغل کی دولت کے چرچوں سے مرعوب تھا نہ خوفزدہ..... ایک امیر آدمی اس کے گاؤں میں پکی حویلی میں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ یہ اس امیر آدمی کی مجبوری تھی کہ خواہش..... سکول کے بچے کبھی کبھی شوکت مغل کی باتیں ماسٹر جی سے کرنا چاہتے۔ وہ فقط ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش رہنے کی تلقین کرتا۔ ماسٹر اللہ وسایا نہ تو گپ میں دلچسپی رکھتا تھا نہ غیبت میں..... اس لیے اس نے شوکت مغل کے معاملے میں بھی کوئی ٹوہ نہ رکھی..... کبھی کبھی وہ کھڑکی کے سامنے سے سکول چلا جاتا اور کبھی کافی دور کے کھیتوں سے ہو کر اپنے گھر کی راہ لیتا..... ماسٹر اللہ وسایا شادی شدہ نہ تھا اس لیے گھر کا چولہا جلانا' کپڑے دھونا' او وائن کسنا' برتن دھونا اسی کا کام تھا.....
ایک روز جب وہ کھڑکی کے سامنے سے گزر رہا تھا تو شوکت مغل سے منہ بھیڑ ہو گئی۔ شوکت مغل نے یہ رویہ بنا رکھا تھا کہ وہ گاؤں والوں سے الگ تھلگ رہتا۔ شوکت مغل ایک بار پھر مباحثے' مذاکرے' سوشل ناک' سوشل لائف کا حصہ

بننا نہ چاہتا تھا..... وہ گاؤں میں امن تنہائی اور اپنی تلاش میں آیا تھا۔ ادھر ماسٹر اللہ وسایا کے پاس بھی کچھ وجوہات تھیں جن کی بنا پر وہ کسی شخص سے بات بڑھانا نہ چاہتا تھا۔

''السلام علیکم سر.....'' نظریں جھکا کر ماسٹر جی بولے۔

''السلام علیکم ماسٹر جی.....''

ماسٹر اللہ وسایا نے اپنی رفتار کم نہ کی۔ اپنی نگاہیں نہ اٹھائیں۔ اس کے چہرے پر ایسے کوئی آثار نہ تھے کہ وہ شوکت مغل نامی کون سے رابطہ بڑھانا چاہتا ہے۔

یہ بات شوکت کے لیے نئی تھی..... کیونکہ اب تک وہ کسی ایسے شخص سے نہ ملا تھا جو اس کی توجہ کا طالب نہ رہا ہو۔

''ماسٹر جی ذرا رکیے.....'' شوکت بولا۔

ماسٹر رک گیا لیکن مڑا نہیں..... شوکت مغل نے اپنے قدم موڑے اور ماسٹر کے تعاقب میں چند قدم آگے چلا گیا۔

''آپ کے پاس اخبار آتا ہے؟.....''

''کبھی کبھی.....''

شوکت اپنے پر حیران رہ گیا۔ اسے تو اخبار کی ضرورت نہ تھی اور اگر ہوتی تو وہ ہر روز آسانی سے منگوا سکتا تھا۔

''اپنے مطالعے کے بعد مجھے عنایت کر دیں تو میں مشکور ہوں گا.....''

''بہت خوب.....''

چند لمحے خاموشی کے گزرے۔ دونوں نے بات آگے نہ بڑھائی۔ شوکت مغل دوسروں سے خوشامد اور توجہ کا عادی تھا۔ اس کے لیے ماسٹر کا رویہ حیران کن ثابت ہوا۔ اس دبلے پتلے گہرے سانولے آدمی کا چہرہ دیکھنے کی خواہش شوکت میں جاگی..... چند دن بعد کچھ دنوں کا پرانا اخبار شوکت کی کھڑکی میں سلاخوں میں ٹنگا نظر آیا۔ اخبار پڑھے اور ایک بار پھر اخبار کی وساطت سے سٹاک مارکیٹ' چاندی سونے کے بھاؤ' کرپشن کی خبریں' ٹیکس کے الجھاؤ' مہنگائی کی صورتحال' ایکٹرسوں کی تصویریں' سیاست دانوں کے دعوے' فارن پالیسی کی اڑچنیں' کشمیر کا مسئلہ' آئی ایم ایف کی رسہ کشی اور ملکی حالت کی ابتری کا نقشہ نظروں کے آگے پھر گیا..... اس پُرامن ماحول میں اخبار ایک لایعنی بکواس تھی جس کا کوئی اثر کہیں مرتب نہ ہو سکتا تھا لیکن شوکت مغل چونکہ شہری زندگی کا حصہ رہ چکا تھا' وہ بھی وی وی آئی پی طبقے کا حصہ۔ وہ ان خبروں سے ٹھیک ٹھیک جگہ پر خیال کا نشانہ بٹھا سکتا تھا۔ کچھ دیر وہ رول کیے ہوئے بستر پر ٹیک لگائے بغور اخبار پڑھتا رہا۔ اس کی توجہ اس انفرمیشن کی اتنی بھوکی تھی کہ وہ اشتہار ضرورت رشتہ خرید و فروخت کی انفرمیشن بھی بغور سطر سطر پڑھ گیا..... یہ سارا دن اس نے دیہاتی ماحول میں چلتے پھرتے شہری سوچ میں بسر کیا۔ اس کی سوچ اخبار کے پڑھتے ہی شہری مسائل میں الجھ گئی۔

اس رات سونے سے پہلے شوکت مغل نے اپنی دوائیوں کی تھیلی میں سے نیند کی گولی نکالی لیکن اس کے باوجود اسے دیر تک نیند نہ آئی..... اس دن کے بعد وہ آہستہ آہستہ گاؤں میں رہنے کے باوجود پُرامن نہ رہ سکا.....

ماسٹر اللہ وسایا ہفتے میں دو ایک بار کھڑکی کی سلاخوں میں اخبار ٹانگ جاتا۔ ا[illegible]

چاہا جواب با آسانی بڑھ سکتا تھا۔ یہ بات شوکت مغل کے لیے اچنبھے کا مقام تھا۔

ایک شام جب ماسٹر اللہ وسایا سلاخوں میں اخبار پھنسا رہا تھا تو کمرے کے اندر موجود شوکت مغل نے اسے اندر آنے کی دعوت دی۔ ماسٹر اللہ وسایا کچھ دیر بعد صحن میں وارد ہوا۔ عورتیں لڑکیاں جو صحن میں موجود تھیں انہوں نے کھی کھی کرکے آدھے پورے سلاموں کے ساتھ ماسٹر جی کا خیر مقدم کیا..... لیکن ماسٹر اللہ وسایا نے ان پر توجہ نہ دی۔ وہ اونچی شلوار پہنے لمبے لمبے قدم مارتا شوکت مغل کے کمرے کی دہلیز پر جا رکا۔

''اجازت ہے؟.....''

نہ سرکار نہ جناب نہ عالی جاہ نہ حضور۔ یہ کیسا شخص تھا؟ شوکت مغل نے سوچا۔

''آئیے آئیے پلیز تشریف لائیے۔''

ماسٹر اللہ وسایا نے ایک ہی جملہ بول کر تعین کر دیا کہ اسے کس قسم کے رابطے کی امید ہے؟

''بیٹھئے بیٹھئے زہے نصیب.....''

ماسٹر اللہ وسایا شوکت کے سامنے والی چارپائی پر بیٹھا۔ لمحہ بھر کو بھی اسے خیال نہ آیا کہ یہ بشریٰ کا پلنگ ہے اور لوگ اس پر بیٹھنے کی عام طور پر جرأت نہیں کرتے۔

''آپ نے مجھے بلایا؟.....''

''بالکل بالکل آپ جانتے ہیں مجھے؟''

''کچھ کچھ..... لوگوں کی زبانی.....'' جواب ملا۔

''غائبانہ طور پر؟ امیر لوگوں کا یعنی زمیندار لوگوں کا خیال ہے کہ آپ دیوانے ہیں۔ کچھ دیر قیام کے بعد بھاگ جائیں گے اور غریب مزارعے' کی کمین مسلی آپ کے متعلق کچھ سوچ کر وقت ضائع نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے جسے اللہ دیتا ہے اس سے کوئی کچھ چھین نہیں سکتا.....''

''آپ نے بھی میرے متعلق کوئی تجسس نہیں رکھا۔ میں شوکت مغل پانچ فیکٹریاں' تین پلازے' سٹاک مارکیٹ کی ممبر شپ چھوڑ کر یہاں ایک اجاڑ سے ویراں وال میں آ کر بستا ہوں۔ ایسے گاؤں میں جس کی ٹوٹل آبادی چھ سو افراد سے زیادہ نہیں..... کیا یہ اچنبھے کی بات نہیں؟ کبھی آپ کے دل میں میرے متعلق کوئی تجسس نہیں ابھرا؟ آپ نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں کون ہوں؟''

''میرے نزدیک کسی اور شخص پر وقت ضائع کرنا بے سود ہے..... یہی وقت اپنے آپ کو سمجھنے پر لگانا چاہیے۔''

چند لمحے شوکت مغل پر بھاری گزرے..... ''ماسٹر جی..... مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ میں ایسے کیوں کر رہا ہوں لیکن مجھے لگتا ہے کہ شاید آپ مجھے سمجھ جائیں اور یہاں کی تنہا زندگی میں کبھی کبھی میری جانب دوستی کا ہاتھ بھی بڑھا سکیں.....''

''میری ایک چھوٹی سی لائبریری ہے۔ میں نے اپنی تنہائی کا علاج کتابوں میں تلاش کیا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو اپنی کتب ادھار دے سکتا ہوں.....''

شوکت مغل مسکرایا..... پھر تعجب سے ماسٹر اللہ وسایا کی جانب دیکھ کر بولا۔ ''کتابوں نے آپ کا اور کچھ فائدہ کیا

ہو یانہ کیا ہو آپ کو composed ہونا ضرور سکھا دیا ہے..... بڑی بات ہے۔"

"اچھا جی اب اجازت؟....."

"کیوں اتنی جلدی کیوں؟ کوئی چائے پانی لسی....."

"ویراں وال میں ایک چھوٹا سا سکول ہے' پاکستان بنے اڑتالیس سال گزر گئے' وہاں تیسری پود تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ ابھی تک سارے طالب علم چٹائیوں پر بیٹھتے ہیں اور تختی اور سلیٹ پنسل استعمال کرتے ہیں۔ میں کم از کم ان کا وقت چرانا نہیں چاہتا....."

ماسٹر اللہ وسایا سروقد کھڑا ہو گیا۔

"اچھا جی اس توجہ کا شکریہ....."

ماسٹر اللہ وسایا اپنی قمیض کو درست کرتا' سیاہ کوٹ کے بازو ہاتھ کی جانب کھینچتا صحن کی جانب چلا گیا۔ شوکت مغل میں عجیب قسم کا تجسس جاگا۔ یہاں کھیتوں میں چہکتی چڑیاں' کچے راستوں پر گردن اٹھائے ساہنے' درخت پر چڑھتے گرگٹ' ڈاروں میں لوٹتے جانور اور پرندے اس کے دل پر ایک خاص قسم کی اداسی چھوڑنے لگے تھے۔ لمبے دن اور راتیں بہت طویل ہو گئے تھے۔ گھڑی کے بغیر ہی وہ جان جاتا کہ جب دھوپ دہلیز سے فٹ بھر پرے رہ جاتی ہے تو ایک بجے کا عمل ہوتا ہے۔ شام کی سرخی صحن کی دیواروں سے اترنے لگتی ہے تو شام کے چھ بجتے ہیں۔ چاندنی راتوں میں پہلے وہ سیر کو نکلا کرتا تھا لیکن اب آہستہ آہستہ یہ معمول کم ہونے لگا۔ گاؤں کے آوارہ کتے دیر تک اور دور تک اس کا پیچھا کرتے۔ اسے لگتا جیسے یہ کتے اس شہری زندگی کی بازگشت ہوں' جو وہ چھوڑ آیا تھا..... میری زندگی میں اتنی ہجرتیں کیوں ہیں شوکت مغل سوچتا۔ کیا ایسا شخص جو یتیم ہو یا رہ جائے' کبھی کسی جگہ قیام نہیں کر سکتا۔ کیا قیام فقط ماں باپ کے دم قدم سے ہے؟

شوکت مغل کا خیال تھا کہ ہر شخص اپنے تحفظ کے لیے اپنے ماں باپ کی تلاش میں رہتا ہے۔ ایسے ماں باپ جو ہر غلطی کے بعد سینے سے لگا لیتے ہیں۔ ان کا سب کچھ آپ کا ہوتا ہے۔ کبھی کچھ مانگتے نہیں' الزام تراشی نہیں کرتے۔ اپنے نقصان اور آپ کے نفع کا بل پیش نہیں کرتے۔ دعائیں آپ کے لیے کرتے ہیں اور بلائیں اپنے سر لیتے ہیں۔ قریب ہوں یا دور ان کا دھیان آپ پر مرکوز رہتا ہے۔ خود ڈوب جائیں لیکن آپ کو کنارہ نصیب ہو تو اسے اپنی خوش قسمتی شمار کرتے ہیں۔ جو برکت کا تعویذ' حالات پر تیل' زمانے کے خلاف محاذ کی شکل میں چلتے پھرتے ہیں..... شاید اسے ابھی بھی ڈاکٹر سرفراز اور ساجدہ ماں کی تلاش تھی..... وہ ان دونوں سے اس قدر اچانک بچھڑا کہ ابھی تک اسے اندر کی فضا درست کرنے کی فرصت ہی نہ ملی۔

پتہ نہیں اس روز وہ تنہائی سے پیچھا چھڑانے نکلا تھا کہ اسے کسی معجزے کی تلاش تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی اس کے اندر کی زنجیر کی گمشدہ کڑیاں آپس میں جوڑ دے۔ وہ دھوبن چڑیا کو تلاش کرنے والا شوکی بھیا بن جائے۔ کہیں سے راحیلہ اور اوما آ نکلیں اور اسے علم نہ ہو سکے۔ وہ راحیلہ اور اوما میں سے کس کے زیادہ قریب ہے۔ موسموں میں پہاڑوں کی خوشبو ہو..... پرندوں کی آوازیں آ کر کانوں پر ٹکرائیں۔ اسی طرح ایک رات وہ بشریٰ کو سوتا چھوڑ کر سرسوں کے کھیت میں جا نکلا۔ چاندنی رات سرد بھی تھی اور خنک بھی۔ کچھ نظر نہ آنے والے کیڑے سرسوں کے کھیت میں سرسراتے نکل جاتے تو

پودوں میں سرسراہٹ پیدا ہو جاتی۔ دور کہیں آسمان میں تیتری چاندی کی جانب اڑتی نظر تو نہ آتی تھی لیکن اس کی آواز میں ہجر کی شق کر دینے والی کوک تھی۔ شوکت مغل کھیتوں کے ساتھ ساتھ چلنے والی آڈ کے ہمراہ گاؤں سے بہت دور نکل گیا۔ اچانک اس کی نظر کچے راستے کے کنارے کے نیچے سے بہتے پانی پر گئی۔ یہاں پانی بڑے نوے کی شکل میں بہہ رہا تھا اور اس کے اوپر بنا ہوا چھوٹا سا پل صاف دکھائی دیتا تھا۔ دو فٹ اونچی دیوار جو کچے پکے پل کے دو اطراف موجود تھی' چاندنی میں پُراسرار نظر آ رہی تھی..... اسے اس دیوار پر بیٹھا کوئی شخص نظر آ رہا تھا۔ پانی کے ساتھ ساتھ چلتا شوکت مغل ذرا سی چڑھائی چڑھ کر پل پر وارد ہوا۔ پل کی دیوار پر ماسٹر اللہ وسایا چاندنی میں آسیبی مخلوق نظر آتا تھا۔

''السلام علیکم.....''

''السلام علیکم.....'' ماسٹر اللہ وسایا نے حیران ہو کر شوکت مغل کو دیکھا۔

''کیا میں تھوڑی دیر آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں؟''

''ضرور..... ضرور.....'' ماسٹر کی آواز میں تھوڑے سے آنسوؤں کی نمی تھی۔ لمبے سیاہ کوٹ کے کالر اٹھائے وہ چاند کی جانب دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر وہ دونوں چپ رہے۔ اندر ہی اندر وہ ایک دوسرے کی جانب ہاتھ بڑھا رہے تھے۔

''آپ کا کیا خیال ہے کہ خدا ہم لوگوں سے امید رکھتا ہے؟..... ہم کیا کریں؟ کیسے ہو جائیں؟ کیا ہمارا بنیادی مسئلہ ہے کہ وہ ہمیں قبول کرے یا ہمیں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ ہم اسے..... اس ایک طاقت کو بلا شرکت غیرے مانیں اور مانتے چلے جائیں..... منوانے کا مسئلہ ہے کہ ماننے کا؟''

شوکت سر جھکا کر بیٹھا رہا۔

''پہلی شرط تو یہ ہے کہ..... کیا خدا ہے؟ کیا کوئی ایسی طاقت ہے جو ہمیں آخری کھائی میں گرنے سے بچا سکے..... کیا انسان اتنی بڑی کائنات میں اپنی بے مائیگی اپنی تنہائی کے ہاتھوں مجبور ہے.....''

''جی..... مجبور ہے کہ وہ کسی ایسی طاقت کی طرف ہاتھ بڑھائے جو اس کا چھوٹا پن ختم کر دے..... ندی سمندر میں گرے بغیر اپنی تنہائی سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتی.....''

ماسٹر اللہ وسایا دیر تک خاموش رہا.....

''آپ کا کیا خیال ہے کہ کائنات کو اس بات کی پرواہ ہے کہ کوئی ستارہ..... کوئی سیارہ پاش پاش ہو کر کائناتی فاصلوں میں ناپید ہو جاتا ہے۔ نظامِ فلکی کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت ہے کہ فلاں Species یکسر معدوم ہو گئی؟..... فلاں قوم نیست و نابود ہوئی؟..... جب قومیں اس کے نزدیک اہمیت نہیں رکھتیں' تو فرد کیسے اہم ہو گا؟ انسان مکمل طور پر نا امیدی سے دوچار ہے اور خوش فہمی کا یہ عالم ہے کہ وہ نجات کی دائمی زندگی کا خواہش مند ہے.....''

''آپ کیا خدا پر ایمان نہیں رکھتے۔ مابعد کے متعلق پُر امید نہیں؟''

''ایمان رکھنے یا نہ رکھنے سے انسان کی بے بسی کم نہیں ہوتی..... اس کی حالت پر آپ کو ترس نہیں آتا..... فطرت تو بے رحم ہے ہی.....''

شوکت پر یکدم جاگ جانے کی کیفیت نے حملہ کیا۔
''انسان کی حالت قابلِ ترس نہیں ہے کیونکہ وہ ایک بڑی طاقت سے وابستہ ہے اور یہ وابستگی اسے کمزور ہونے کے باوجود کمزور ہونے نہیں دیتی۔''
ماسٹر ہولے ہولے ہنسنے لگا۔
''آپ ایسی خوش فہمی میں مبتلا رہ سکتے ہیں کیونکہ فطرت کی بے عقل سخاوت نے آپ کو ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا جہاں پہنچ کر فراوانی بھی بے معنی ہو جاتی ہے..... لیکن ان سے پوچھیے جن کو ساری عمر کی مشقتوں کے عوض ڈھنگ سے روٹی' آرام کی زندگی میسر نہ آئی۔ ان پر ترس کھانے کوئی نہ آیا۔ کسی جانب سے ان کے لیے کمک نہ پہنچی.....''
کچھ دیر شوکت مغل خاموش رہا پھر بولا..... ''آپ کی سوچ Bitterness سے پیدا ہوئی ہے۔ ایسی سوچ سے کمیونزم جنم لیتا ہے۔ وہ زبردستی جبراً مساوی بانٹتا ہے یا مساوی کرنا چاہتا ہے..... فلاح کا راستہ یہ نہیں ہے۔ اپنی مرضی' ارادے اور Volunatarily اپنا سب کچھ دے ڈالنا اور بات ہے۔ خود مار یا تھریسا بن جانا اور عمل ہے اور جبراً رو بن ہڈ کی طرح ایک کو لوٹ کر دوسرے کو بھرنا اور طرح کی زبردستی ہے۔ جب انسان کی مرضی کے خلاف کچھ نیک کام بھی وقوعہ ہو تو انسان کے اندر بغاوت 'چڑ' بے چینی جنم لیتی ہے..... پھر نہ تو فرد فلاح پا سکتا ہے نہ معاشرہ۔''
ماسٹر جی نے ناک میں کچھ اوپرے سانس لے کر سُوں سُوں کی آواز نکالی..... ''میں انسان کی نہیں خدا کی بات کر رہا ہوں' وہ ہماری کمزوری..... مجبوری بے کسی کے لمحوں میں مدد کو کیوں نہیں آتا؟''
''آتا ہے' آتا ہے' ہمیشہ آتا ہے..... کبھی کبھی ہم خود اسے آنے نہیں دیتے جیسے کوئی ضدی بچہ' اپنے آپ کو کمرہ میں بند کر کے اندر چٹخنی لگا لیتا ہے اور والدین کو اندر آنے نہیں دیتا۔ ایسے ہی کچھ لوگ آنکھیں' کان' لب بند کر کے چیختے ہیں کہ وہ ہماری مدد کو نہیں آیا.....''
''کیا وہ ہر چیز پر اختیار نہیں رکھتا۔ کیا وہ بند کان' لب' آنکھیں کھول نہیں سکتا.....''
چاند نے ترس کھا کر چند لمحے کے لیے بادلوں میں منہ چھپا لیا۔ اسے انسان کی حالت پر اس کی سمجھ بوجھ پر ہنسی بھی آ رہی تھی۔
''پھر تو انسان کی ضرورت ہی نہ تھی۔ حضرت آدم نے جنت میں اسی بغاوت کا اعلان تو کیا تھا کہ وہ..... اس قدر بھی تابع نہیں۔ وہ اپنی مرضی سے بھی کچھ فیصلے کر سکتے ہیں۔ یہی تو ایک فسوں پھونکا تھا شیطان نے ان کے کان میں کہ تو کیا اس قدر تابع ہے کہ اپنی مرضی سے کھا پی بھی نہیں سکتا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب تقدیرِ آدم پر مہر ثبت کی گئی۔ یہی وہ گھڑی تھی جب بابا آدم کو صاحبِ اختیار وارادہ بنایا گیا..... تم اپنی مرضی سے میری طرف آتا' اپنے ارادے سے رجوع کرنا ورنہ اللہ اور تم میں جدائی دائمی ہو گی۔ جو اللہ کی مانیں گے توفیق کی آرزو رکھیں گے۔ حضرت ابراہیم کی طرح جانیں گے کہ اگر وہ رہنمائی نہ کرے تو گمراہی ہی گمراہی ہے..... اسی بات پر تو ابلیس خوش ہوا کہ صاحبِ اختیار انسان کو وہ اپنی سیٹی پر لگائے گا۔ جہاں چاہے گا لے اڑے گا' آزاد آدمی کو بہکانا ابلیس کے لیے مشکل کام نہیں..... وہ لمحوں میں اس کے کان' آنکھیں لب بند کر سکتا ہے۔ اسے خدا کی رحمت سے ناامید کر سکتا ہے؟ اس کے لیے راستہ صاف بھی تھا اور آسان بھی لیکن علیمِ مطلق جانتا تھا کہ

اللہ کے ایسے نیک بندے ہر عہد میں ہر زمانے میں ہر جگہ موجود ہیں جو اپنے نفس کو اللہ کے امر پر قربان کرتے ہیں۔ فلاح پاتے ہیں۔ ماسٹر جی! آپ تو مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں۔ آپ دہریہ کیسے ہو گئے..... اچھے یا برے حالات کا مایوسی سے کیا کام بلکہ میں تو کہوں گا کہ اس ساری زندگی ہی کا انسان سے کیا رابطہ؟ یہ تو ایک امتحان ہے' کھیل ہے۔ فقط اس قدر کہ کون اپنی مرضی اور ارادے سے اللہ کو تلاش کرتا ہے؟....."

"آپ پر پڑی نہیں' اس لیے آپ جانتے نہیں۔ بڑی کمفرٹیبل زندگی گزار کر لاکھوں بٹور کر بینک میں جمع کر کے حکومتی سکیورٹیوں میں جمع کر کے بیرون ممالک کے Reserve میں Billions جمع کر کے آپ ایک ایسی سکیورٹی کے حوالے سے سوچتے ہیں جہاں خدا کو آپ نے ایک اضافی Luxury بنا لیا ہے..... وہ آپ کے لیے موم بتی کی روشنی نہیں جس کی روشنی میں ایک بیوہ بچے کو پڑھاتی ہے..... وہ ایک فانوس ہے جسے جلا کر آپ ہم چشموں میں ایک چکاچوند کا سماں پیدا کرتے ہیں۔ سب کچھ پا کر اگر خدا بھی مل جائے تو کیا حرج.....؟ خدا آپ کی ضرورت نہیں' آپ کے کوٹ کا کارنیشن پھول ہے....." ماسٹر اللہ وسایا اٹھ کھڑا ہوا۔

چند ثانیے شوکت مغل پلی پر بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر اس نے اللہ وسایا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ دونوں سفید چاندنی میں روحوں کی طرح نظر آئے۔

"ماسٹر جی..... یوں مت سمجھیے کہ امیر آدمی کو خدا کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ میں تو سمجھتا ہوں جب ضرورتیں پوری ہوتی چلی جائیں' خواہشیں آپ ہی آپ consume ہوں' دولت ہر قفل ہر دروازہ گیٹ کھولنے پر قادر ہو جائے تو اصلی سوالات جنم لیتے ہیں۔ مہاتما بدھ کی طرح ہر امیر آدمی کو ایسے سوالات گھیر لیتے ہیں جن کا علاج خواہش میں نہیں ہوتا۔ وہ خواہش سے ماورا سوچنے لگتے ہیں۔"

"ماسٹر جی..... میں نے زندگی بھر بڑی آسودہ زندگی دیکھی۔ میں اور میری بہن راحیلہ' ہم اپنے ڈاکٹر باپ کے ساتھ پہاڑوں میں رہتے تھے..... وقت تتلی کی طرح اڑتا تھا۔ آہستہ آہستہ رنگوں کے ساتھ..... ہم بھی اس کے ساتھ غم و ملال آسیب و خوف سے بچ کر ست رو وقت کے ساتھ قوس قزح جیسی رنگین زندگی بسر کرتے تھے..... پھر بیٹھے بٹھائے اباجی نے اس جنت کو چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ ہم لوگ اپنے آبائی شہر میں آ گئے لیکن....."

شوکت مغل اپنے ماضی میں کھو گیا۔ وہ سوچنے لگا" پچھلا وطن چھوڑنے کے بعد پھر میں لاہور آ گیا ایم اے کرنے..... لیکن ہر انسان کے پاس ایک فیصلے کا لمحہ آتا ہے..... اس میں ساری باتوں کے فیصلے اچانک بہت اچانک ہو جاتے ہیں۔ ان دنوں لاہور میں غصہ شدت پر تھا۔ لوگ مار پیٹ لوٹ کھسوٹ پر آمادہ تھے۔ شاہ عالمی میں جگہ جگہ آگ لگی تھی۔ سیاسی حالات دگرگوں تھے..... ڈاکٹر ابو نے ہم دونوں بہن بھائیوں کو فوراً واپس بلایا..... یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے اپنا فیصلہ کیا..... میں سٹیشن پر راحیلہ کو چھوڑ کر لاہور میں ہی رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے امتحان دینا ضرور چاہیے اور پھر یہ موقع نہیں آئے گا..... عجیب سی بات ہے کہ نہ تو میں امتحان دے سکا اور نہ ہی اپنے گھر جا سکا..... پھر ساری کہانی کا رنگ بدل گیا..... ادھر سے اُدھر کی کہانی علیحدہ ہو گئی..... میرے دادا' ماں باپ' راحیلہ ایک اور زمانے کی کہانی ہو گئے..... ماسٹر جی ایسے حادثوں سے دوچار ہو کر میں پتھر تو ہو گیا..... لیکن اللہ سے بچھڑا نہیں'..... سوال میرے دل میں بھی اٹھے۔ سخت جان میں

بھی ہوا..... لیکن..... شاید میں تو اللہ کو بھی چھوڑ ہی دیتا..... جب انسان مدد کے لیے پکارے اور مدد نہ آئے تو سخت جانی نیچرل ہوا کرتی ہے..... لیکن میں کچھ زیادہ خوش نصیب ہوں' بزنس میں ہاتھ ڈالا..... ایک سے سو ہو گیا' سو سے ہزار..... میں سمجھتا ہوں' یہ میری سمجھ بوجھ سے نہیں ہوا بلکہ اوپر والے نے مجھے نہیں چھوڑا..... ہر مشکل سے گزرا' ہر بدی مجھ پر گزر گئی لیکن کسی سوراخ سے میرے ایمان کو سانس آتا رہا..... میں اسے اپنی کرامت یا کرشمہ نہیں سمجھتا۔ بس اوپر والے نے میرا ہاتھ پکڑے رکھا..... اب بھی کبھی جی چاہتا ہے وہ مجھے گود اٹھالے۔ ہاتھ پکڑ کر چلنا میرے بس کا نہیں رہا....."

چاندنی رات میں ان دونوں کے چہرے ڈریکولا کی طرح سرد اور نیلگوں دکھائی پڑتے تھے۔ پلی کے نیچے سے بہنے والا پانی آوازیں نکالتا جھلملاتا چلا جا رہا تھا۔ آسمان پر چاند کے گرد بڑا سا ہالا ساکت تھا جس کے سامنے ایک تیزی بولتی جا رہی تھی۔ ماحول میں اسرار بھی تھا اور سردنی بھی..... سارا منظر چپ بھی تھا لیکن کسی اسرار سے بوجھل بھی تھا۔ گویا دھرتی کسی ہونی کی منتظر تھی۔ صاحب شفا و کرامت کی آرزومند تھی جو نیم اندھیاروں کو اُجلا کر دے۔ غیر واضح کو حقیقت میں تبدیل کر کے روشنی میں بدل دے۔

ماسٹر جی نے دونوں بازو پھیلائے اور شوکت کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اسے خود یاد نہیں آ رہا تھا کہ پچھلی بار کب اور کہاں وہ کسی ذی روح سے بغلگیر ہوا تھا۔

"میں ابھی تک کسی ایسے انسان سے نہیں ملا تھا جو آپ جتنا امیر بھی ہو شکستہ روح بھی ہو اور اللہ کو بھی مانے..... میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ....."

"ماسٹر جی..... لیکن ابھی تو مجھے شک گزر رہا تھا کہ آپ..... یعنی دہریے ہیں اور اللہ کی ذات کو نہیں مانتے....."

"وہ تو میں آپ کو پٹڑی سے اتار رہا تھا..... آزما رہا تھا آپ کو..... ہم ماسٹر لوگ ہیں۔ ہم تو دونوں قسم کی Debates کر سکتے ہیں۔ فار اینڈ against..... قائدایوان کی تقریر بھی ہم ہی لکھواتے ہیں اور حزب مخالف کی Speech بھی ہم نے ہی گائیڈ کی ہوتی ہے....."

شوکت مغل حیران رہ گیا۔

"آپ کون ہیں' کیا ہیں؟..... ماسٹر جی....."

"بتا دیں گے بتا دیں گے شوکت مغل صاحب۔ ایک دن ضرور سارا کچھ بتلا دیں گے....."

ماسٹر نے کوٹ کے کالر اوپر کیے اور ہلکا سا خدا حافظ کہہ کر مڑ گیا۔ بڑی دیر تک بنجر زمین میں چلتا رہا اور پھر گنے کے کھیت میں اچانک مڑ کر غائب ہو گیا۔ ایک عرصہ سے شوکت کی زندگی کو کسی انسان' واقعہ یا حادثے نے حیرت میں نہ ڈالا تھا..... ماسٹر سے مل کر وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

یہ شخص کون ہے؟

اس کا ماضی کیا تھا؟

مستقبل کے متعلق اس کے کیا پلان تھے؟

لیکن ماسٹر کے متعلق کچھ جاننا اپنی مرضی سے ممکن نہ تھا۔ وہ آپ کے چہرے پر دروازہ بند کر سکتا تھا۔ دیر تک

شوکت مغل ماسٹر کے متعلق سوچتا رہا۔ پھر وہ گھر آ گیا۔ آہستہ سے دروازہ کھولا۔ کمرے میں بجھے دیے کی بو تھی۔ کھڑکی سے چاند کی روشنی بشریٰ پر پڑ رہی تھی۔

یہ بشریٰ اصل میں کون تھی؟ وہ پورے تیس سال بشریٰ کے ساتھ رہا تھا۔ لیکن وہ دونوں ایک زبان بولنے کے باوجود اجنبی تھے۔ بشریٰ دیہات تھی اور وہ شہر..... دونوں کے مسائل مختلف تھے۔ بشریٰ بنارسی ساڑھی پہن کر بیوٹی کلینک سے اپنے آپ کو مکمل طور پر اوور ہال کروا کر سوئس صوفے پر ٹانگیں کھول کر بیٹھتی اور مولیاں نمک مرچ لگا کر کھانے کی عادی تھی۔ اسے کھیرے، مولیاں، گاجریں، کچے تازہ شلغم، مکئی کے بھنے ہوئے بھٹے، گوبھی کے ڈنٹھل پسند تھے۔ وہ کچی سبزی کسی وقت بھی کھا سکتی تھی۔ اس کا یہ ذوق بچپن میں پختہ ہو چکا تھا۔ وہ گنے چوستے، لسی پیتے، بھنگڑا ناچنے والی لڑکی تھی اور عورت بن گئی۔ کملو میں سونے کے باوجود وہ کھیس رضائی یاد کرتی رہتی۔ گڑ، ساگ، مکئی کی روٹی، بھنی کے دانے اسے نہ بھول سکے..... نہ ان باتوں میں کوئی خوبی تھی نہ خرابی۔ یہ رہن سہن کا طریقہ وہ دیہات سے لے کر آئی تھی۔ اس نے شہری لباس کی تراش خراش اختیار کر لی لیکن اندر سے وہ دیہات رہی..... شوکت مغل کی پرورش دادا ابا، ڈاکٹر سرفراز، سکول، کالجوں نے کی تھی۔ وہ خیال، خواب، سائنس، ترقی، مکالمہ، فلاسفہ کا ملغوبہ تھا۔ تبدیلی کا خواہاں، لیکن استقلال پر مرنے والا کئی قسم کے تضادات کا شکار تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ مسلم معاشرے کو مغربی کلچر، ہندو سبھیتا کے اثرات قبول کرتے دیکھا۔ سائنس کی دوڑ میں تیسری دنیا کے دیوانے پن کو غور سے دیکھا۔ اپنے فائدے کے امکانات کا جائزہ لیا۔ ملکی نقصانات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے نہایت خوبصورت دفتر کی گھومنے والی کرسی میں سات ٹیلی فون اٹینڈ کرتا ہوا اپنے آپ کو اکٹھا کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ بشریٰ کی بے فکری اس کا انداز سوچ نہ اپنا سکا۔ ویراں وال واپس آ کر بشریٰ یوں ہو گئی گویا مچھلی اپنے پرانے تالاب میں لوٹ آئی۔ اس کے بال جن میں بیوٹیشن نے Streaks ڈالی تھیں، کسی ہوئی چوٹی میں بندھ گئے۔ کھلی بڑی بڑی بالیاں، رنگ برنگے ٹھپوں والے کپڑے، کہنی تک سونے کے کنگن، چوڑیاں، منہ کھولے، ٹانگیں رضائی سے باہر نکالے وہ خراٹے لیتی سو رہی تھی۔ اس گوبھی کے پھول کو معلوم نہ تھا کہ نرگس کا اندھا پھول اندر باہر کسی خوشبو سے دیوانہ ہو چکا ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ اس قدر اندھا کیوں ہے؟ وہ اپنی ذات کے مفہوم کو سمجھ کیوں نہیں سکتا؟ وہ یہاں کیوں ہے؟ اس کا اصلی مقصد کیا ہے؟ کیا زندگی کے کوئی معنی کہیں ہیں ہی نہیں؟

ماسٹر کو کئی بار شوکت نے کھڑکی کے سامنے سے گزرتے دیکھا لیکن سلام سے آگے بات نہ بڑھی۔ کبھی کبھی اسے اخبار رسالوں میں لٹکا ہوا مل جاتا، کچھ کتابیں بھی۔ ان دونوں میں کتابیں ایک رابطے کا آغاز ہو سکتی تھیں لیکن شوکت مغل بھانپ گیا کہ ماسٹر جی اپنی زندگی کو سب سے چھپا کر بسر کرنا چاہتا ہے۔ شوکت بھی اب لوگوں کے جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اتنی بات وہ ضرور سمجھ گیا تھا کہ ہر رشتہ کسی ضرورت پر استوار ہوتا تھا۔ جب ضرورت ختم ہو جائے چاہے وہ جذباتی ہی کیوں نہ ہو رشتہ رابطہ بے کار ہو جاتا تھا۔ پھر اپنی تنہائی کو منانے کی خاطر مکڑی کی طرح جالا تان کر بیچارے ماسٹر اللہ وسایا کو مکھی کی طرح پھنسانا اسے کمینگی لگی..... وہ تو اس حد تک یکطرفہ ہو چکا تھا کہ ویراں وال میں خریدی ہوئی حویلی اور زمین اس نے بشریٰ کے نام کر دی تھی۔ وہ بزنس ٹائی کون سے جاگیردار بننے کی ہوس لے کر لاہور سے نہیں آیا تھا۔ بشریٰ ویراں وال پہنچتے ہی چودھرائن بن گئی تھی۔ لیکن شوکت نے گاؤں میں قدم رکھتے ہی اس پر واضح کر دیا تھا کہ وہ نمبردار، چودھری

صاحبان سید گھرانے اور ویراں وال کے دوسرے با اثر لوگوں سے تال میل نہیں بڑھائے گا..... بشریٰ کے لیے دیہاتی بھائی چارے کھیتی باڑی کے مسائل اناج کی فراہمی کنٹرول منڈی کا اخراج سٹور کرنے کے طریقے سب سمجھے سمجھائے تھے۔ وہ ان میں مشغول ہوئی اور بیٹوں کو بھی یک درجہ بھول گئی۔ بشریٰ اور شوکت مغل نے زندگی کا یہ لمبا سفر محبت یگانگت سمجھ بوجھ کے سہارے نہ گزارا تھا بلکہ شرافت کی بنا پر وہ بڑے ہی سید ھے سجاؤ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے چلے آئے تھے۔ یہ شادی بچوں کی خاطر تھی۔ اس میں جو بھی اونچ نیچ آئی وہ بچوں کی وجہ سے تھی۔ آپس کی زندگی میں انہوں نے دو لائنیں بچھا رکھی تھیں۔ ایک شوکت مغل کی پرائیویٹ اور پبلک لائف تھی دوسری بشریٰ کی سوشل اور گھریلو زندگی تھی۔ یہ دونوں لائنوں کی طرح ساتھ ساتھ تو بچھے تھے لیکن کوئی نقطۂ اتصال کہیں نہ تھا۔ یہاں گاؤں میں پہنچ کر وہ اور بھی واضح طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے بھی الگ الگ زندگیاں بسر کرنے لگے۔

ایسے ہی سارا بستر گول کر کے نواڑی پلنگ کی پشت کے ساتھ لگا کر شوکت مغل کھڑکی سے باہر پھیلے سرسوں کے کھیتوں کو دیکھ رہا تھا کہ ماسٹر اللہ وسایا اُدھر سے گزرا۔ اس نے سفید کھدر کا شلوار قمیض اور اس کے اوپر کالا کوٹ پہن رکھا تھا۔ گہرے سانولے چہرے پر منجمدی کیفیت تھی۔ آج حسب معمول اس کے سر پر سفید پگڑی نہ تھی۔ شوکت مغل نے ماسٹر اللہ وسایا کی طرف دیکھ کر سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا تو پہلی بار ماسٹر صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔

"کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟....." ماسٹر اللہ وسایا نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھا کر پوچھا۔

"زہے نصیب زہے نصیب..... آیئے آیئے۔"

کچھ دیر بعد ماسٹر اللہ وسایا اس کی دہلیز کے باہر جوتیاں اتار رہا تھا۔

"جوتیاں اتارنے کا تکلف نہ کیجیے آیئے....."

ماسٹر اللہ وسایا نے جوتیاں پہن لیں اور آ کر بشریٰ کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"میں جا رہا تھا..... سوچا..... آپ سے مل ہی لوں آخری بار....."

"آخری بار..... کیا معنی؟"

"میں جا رہا ہوں....."

"کہاں؟....."

"معلوم نہیں پر کہیں بھی....."

"لیکن تعین کے بغیر..... آپ کہاں جا سکتے ہیں۔"

"جب انسان بہت دیر جنت میں رہ لیتا ہے اور اس میں پھیلنے ابھرنے بڑھنے کی تمام قوتیں دم توڑنے لگتی ہیں۔ جب وہ سبزی کی طرح بند گوبھی پھول گوبھی ٹینڈا کریلا بننے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو اسے سوچنا پڑتا ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے اور وہ نباتات اور جمادات کی زندگی بسر کرتا ہی چلا جاتا ہے۔ یہ اس کی فطرت کے خلاف ہے شوکت صاحب....."

پہلی مرتبہ ماسٹر اللہ وسایا نے اس کے لیے صاحب کا لفظ استعمال کیا۔

"میں آپ کی بات سمجھا نہیں....."

"انسان تبدیلی کا خواہاں رہتا ہے جس قدر اسے استقلال کی خواہش ہے..... اتنی ہی وہ تبدیلی پر جان دیتا ہے۔ یہی اس کا بنیادی تضاد ہے..... وہ اگر ہمیشہ بچہ نہیں رہ سکتا تو ہمیشہ کے لیے پُرامن بھی نہیں بنایا جا سکتا..... وہ جنت میں بھی رہتے رہتے اوب جائے گا۔ امن سے شانتی اور پریم سے بھی اس کی طبیعت بھر جائے گی۔ کہیں اندر ہی اندر جنت سے نکل جانے کی خواہش خودرو ککرمتے کی طرح راتوں رات جاگے گی..... اگر نیکی انسان کو امن کی جانب راغب کرتی ہے تو بدی کا بھی اپنا رول ہے۔ بدی انسان کو تبدیلی پر آگے بڑھنے کی جانب کھینچتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ انسان کی اپنی روح میں نیکی اور بدی جڑواں بچوں کی طرح رہتے ہیں..... وہ جہاں بھی جائے گا اس تضاد کو ساتھ لے جائے گا....."

"اور اگر یہاں سے نکل کر پھر یہاں کی یاد آئی تو..... پھر....."

ماسٹر اللہ وسایا نے اپنے سر کو کھجایا اور آہستہ سے بولا..... "یہ..... تو ہوگا..... جب دل میں صرف ایک بچہ رہ جائے تو وہ دوسرے جڑواں ساتھی کے لیے روتا تو ضرور ہے..... جب نئی تبدیلی سے تھک جاؤں گا تو لوٹ آؤں گا شوکت صاحب پہلی جگہ....."

"لیکن کب تک جاتے اور آتے رہیں گے....."

"جب تک اوپر والے کو منظور ہوگا..... جب تک جسم کی طاقت ساتھ دے گی ایک سفر سے دوسرے سفر کی جانب روانہ رہوں گا....."

"آپ کون ہیں ماسٹر جی۔ آپ کی بیک ہسٹری کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کسی کو بہت قریب سے جان لینے کا تجسس بدتمیزی ہے لیکن پھر بھی..... آپ کون ہیں؟"

"میں؟..... میں ایک بہت ذہین آدمی ہوں شوکت صاحب! اور ذہین آدمی خود اپنے وجود کے لیے بہت بڑا عذاب ہوا کرتا ہے..... انسان عقل ہی سے اشرف المخلوقات بنتا ہے اور عقل ہی اسے اسفل السافلین بناتی ہے..... یہ بھی دو دھاری استرا ہے۔ دونوں جانب چلتا ہے اور سارے تضادات بھی اسی کی دعا برکت سے جنم لیتے ہیں۔ یہی ہم میں مستقل مزاجی پیدا کرتا ہے اور اسی کے طفیل انسان تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے..... میں ایک ذہین آدمی ہوں شوکت صاحب! بدنصیبی یہ ہے کہ ابھی تک میں اپنی عقل پر کاٹھی نہیں ڈال سکا....."

"آپ مجھے اپنی ذات کے متعلق کچھ نہیں بتائیں گے ماسٹر جی....."

"باقی سب کچھ بنی نوع انسان کا سانجھا کھاتا ہے..... غریبی' امیری' بھائی' بہن' عاشق کے چند واقعات' حالات تھوڑے سے ہیر پھیر کے ساتھ سارا سفر ایک سا ہوتا ہے لیکن..... یہ عقل سفر کو بھول بھلیوں میں بدل دیتی ہے..... کبھی شاہراہ پر ڈال دیتی ہے..... اسی سے سارا فرق پڑتا ہے۔"

"آپ کی باتیں بہت دلچسپ ہیں ماسٹر جی....."

"یوں سمجھئے کہ انسان زندگی کے جنگل میں یکا و تنہا داخل ہوتا ہے۔ اس کے پاس جنگل سے باہر نکلنے کے لیے روشنی دکھانے کے لیے کئی چیزیں ہوتی ہیں۔ کبھی وہ حواس خمسہ کی ٹارچ لے کر جنگل کے راستوں پر چلتا ہے۔ کبھی عقل کا

پیٹرومکس جلاتا ہے لیکن جنگل بہت گھنا اور گہرا ہو جاتا ہے۔ پھر روح کی قندیل روشن کرتا ہے۔ وہ بھی کئی بار دور تک دیکھ نہیں پاتی..... جب جنگل کا جنگل بہت گہرا اندھیرا اور گھنا ہو جاتا ہے تو عموماً نہ کوئی لالٹین..... پیٹرومکس یا بجلی کام آتی ہے..... ایسے میں جنگل کی دوسری جانب ازخود روشنی ہو جاتی ہے..... اور یہ اللہ کی رحمت کا نور ہوتا ہے۔ جیسے کسی اجنبی کو شہر کی روشنی سے راستہ مل جائے..... یہ روشنی ہم پر Insight کی شکل میں وارد ہوتی ہے..... ہم اس روشنی پر لبیک کہتے زندگی کے جنگل سے نکل جاتے ہیں جیسے جانور شکار کی خوشبو پر شکار کرنے کا اہل ہوتا ہے۔"

"آپ بہت پڑھے لکھے ہیں ماسٹر جی! ہے ناں....."

"جی نہیں....."

"آپ کسی صوفی کی صحبت میں رہے ہیں....."

"یہ پہلی بار ہے کہ کسی صوفی سے ملاقات ہوئی ہے شوکت صاحب۔" ماسٹر جی مسکرا کر بولے۔

"آپ کی ذرہ نوازی ہے' شکریہ..... میں تو اپنے آپ کو صوفی نہیں سمجھتا....." مسکرا کر شوکت بولا۔

"اچھا جی خدا حافظ....." ماسٹر جی نے ہاتھ بڑھایا۔

شوکت مغل کھڑا ہو گیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ ماسٹر اللہ وسایا کتابوں سے اخذ کی ہوئی دانش نہیں ہے۔ اس نے لہروں کی طرح ساحلوں پر اپنے وجود کو پنک پنک کر کچھ حاصل کیا ہے۔

"آپ مجھے اپنے ماضی کے متعلق کچھ نہیں بتائیں گے....."

"میں کسی کو اپنے متعلق اس لیے کچھ نہیں بتاتا شوکت صاحب! کہ مجھے سمجھ نہیں آتی' میں کہاں سے شروع کروں۔ کیا سننے والا میرا نکتہ نظر سمجھ پائے گا....."

"شاید کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے حالات یا واردات قلبی پورے طور پر سمجھ نہیں سکتا لیکن کوشش ضرور کی جا سکتی ہے۔"

●○●○●○

پانچواں عہد

(ت)

مسجد کے عین پیچھے ایک چھوٹا سا پرائمری سکول تھا۔ ان میں چوہدری صاحب مدرس تھے۔ سکول مسجد کی دیوار کے سائے میں لگتا تھا۔ دس بیس لڑکے گھیر گھار کر پڑھانے کی ریت قائم تھی۔ ظہر کی اذان تک نیم کی اکلوتی کرسی پر بیٹھ کر ننھے ننھے بونوں کو تعلیم و تربیت دیتے' پھر مسجد میں چلے جاتے۔ ان قصباتی بچوں میں اگر انسانی خصلتیں ہوتیں تو انہیں سیدھے راستے پر لگانا کوئی ایسی بڑی مہم نہ ہوتی لیکن ان بچوں کے اندر کسی بندر' اجاڑو ستری' تھیٹر کے بھانڈ اور کسی منچلے نوکر کی شیری روح دھینگا مشتی کرتی رہتی تھی۔ ادھر چوہدری جی کے ہاتھ ساکن ہوئے' ادھر ان میں سے ان روحوں کا نزول جاری ہو جاتا۔ ادھر ماسٹر جی ذرا دیر غائب ہوئے تو اس چھوٹے سے میدان میں ایسی اتھل پچل رتی گویا نادر شاہی حکومت کے سپاہی بستیوں کو اجاڑ رہے ہیں۔ ان بچوں کو سدھارتے سدھارتے چوہدری جی کی روح بوسیدہ ہو گئی تھی۔ گویا سمندر کی موجوں نے ساحل کنارے کھڑی چٹانوں کو اپنے تھپیڑوں سے گھسا رکھا تھا۔ ان کے سیاہ بالوں میں سفیدی نے دھاوا بول دیا۔ دانت بھی ساتھ چھوڑنے لگے..... لیکن ترقی نہ ملی تھی نہ ملی۔ کمیٹی کی طرف سے پینتیس روپے ملتے تھے' ان میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ کبھی کبھار جوش میں آ کر چوہدری جی کوشش کرتے تو الٹا نکال دینے کی دھمکی ملتی۔ یہ رقم بھی غنیمت تھی لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب الگ ناخوش رہتے۔ سارا کام چوہدری جی کے سپرد تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب زیادہ وقت اپنی چھوٹی سی بزازی کی دوکان چلاتے۔ سکول کا چکر لگاتے رہتے اور ڈانٹ ڈپٹ کر واپس قریبی دوکان پر لوٹ جاتے..... بس ماسٹر صاحب کی بیوی حمیدہ بڑی دیندار عورت تھی۔ اس صبر کے ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر چوہدری جی کو بھول جاتا کہ زندگی کا وطیرہ ان کے ساتھ کچھ اچھا نہیں رہا۔ شوہر کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر بیوی کا چہرہ مکمل انفعال میں بدل جاتا۔ کبھی دستِ سوال دراز نہ کیا۔ جو ملا بسم اللہ کہہ کر وصول کیا۔ محلے کی عورتوں نے بڑی لگائی بجھائی کی' نئے فیشن سمجھائے۔ غیبت میں شامل کرنا چاہا لیکن بیوی نے کبھی طعن و تحریض کا ساتھ نہ دیا۔ جب بھی بات کرتی ایک قول ضرور گفتگو میں آتا "بہن کسی کا سنورے تو جگ بگڑتا ہے اور بگڑے تو بگاڑنے کو بہت....." انہوں نے سنی سبھی کی لیکن کی وہی جو صبر نے تلقین کی۔ سارا دن صحن میں اُگے امرود تلے چرخا چلتا' سوت کاتا جاتا..... دوپٹے کاڑھتیں اور دو مچھری مشین بین کرتی اونچا بولتی چلاتی رہتی لیکن بی بی کا ہاتھ نہ رکتا۔ ان کے باورچی خانے دو چار نئے برتن نظر آ جاتے۔ چنگیر میں ایک دو روٹیاں فقیر کے لیے بچ رہتیں..... لیکن پھر یہ نیک

خاتون اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ چوہدری صاحب نے ان کے بھلاوے دوسری شادی کر لی۔ ماسٹر جی کے بھاویں عورتوں کی ایک ہی قسم تھی۔ ان کو گھر کے سکون کی ایسی جلدی تھی کہ شکل دیکھی نہ عقل۔ جھٹ ایک خاتون سے نکاح کر لیا۔ یہ بیوہ خاتون اپنے بیٹے کو سکول داخل کرانے آیا کرتی تھی۔ کچھ دیر بچہ پڑھتا رہتا۔ پھر وہ اپنے مائیکے لاہور چلی جاتیں۔ بچہ پڑھائی چھوڑ دیتا۔ سال دو سال بعد واپس آتی تو پتہ چلتا کہ بچے امتحان دے کر اگلی جماعت میں جا چکے ہیں۔ کئی سال سے وہ ہر بار تیسری میں داخلہ لیتا۔ کچھ دیر پڑھتا اور پھر اماں کے پاؤں میں کھلبلی ہوتی اور لاہور کے شب و روز یاد آنے لگتے..... ناصرہ بی بی تو لاہور کی ہو رہتی لیکن یہاں اس کے مرحوم میاں کی دو کلے زمین تھی جس کو وہ چھوڑ نا بھی نہ چاہتی تھی۔ بالآخر اس نے اس مسئلے کا حل یہی نکالا کہ بچے کی زندگی تو ماسٹر جی کی وجہ سے سدھر جائے گی زمین کو دیکھنے سنوارنے والا بھی مفت میں مل جائے گا..... ماسٹر جی ان بھول آسمان کی اذان سے پاتال کے کیچڑ میں دھنس گئے۔

ناصرہ سے شادی بعد میں ہوئی۔ اس سے پہلے وہ ایک تکلیف دہ دور سے گزرے..... حمیدہ کے ہوتے ہوئے ماسٹر جی کو کوئی منہ نہ لگاتا تھا' زیادہ سے زیادہ مسجد میں وقت گزرتا۔ اب ہر طالب علم کی ماں انہیں زر خرید سمجھتی۔ بچے ماسٹر جی ماسٹر جی کہہ کر پیچھا نہ چھوڑتے۔ دہلیز میں کھڑی ہیں' ماسٹر جی آنکھیں جھکائے گزرے تو دھر لیے گئے۔ تقاضا ہوا کہ بازار سے کپڑا خرید کر لا دیجیے..... "وہ" مہنگا لاتے ہیں۔ ماسٹر جی پیدل بازار گئے جو کافی دور تھا۔ کپڑا لائے تو رنگ پسند نہ آیا۔ رنگ بدلوانے گئے تو قیمت زیادہ نکلی۔ قیمت کا بٹا کرائے تو اتنی دیر میں طالب علم کی والدہ ارادہ بدل چکی تھیں۔ جیسے تیسے نقصان جھیل کر کپڑا لوٹایا اور آئندہ کے لیے قسم کھائی کہ شاگردوں کے گھر والوں سے سلام تک وصول نہ کروں گا..... خیر کپڑا نہ خریدا تو طالب علم کو ہسپتال لے جانا پڑا۔ تانگے کی چٹی مفت میں پڑ گئی۔ اگر واپسی پر صاحبزادے کا بخار تیز ہوا تو محلے میں یہ بات گونج اٹھی کہ ماسٹر جی کے ساتھ گیا تھا انہوں نے احتیاط نہیں کی..... اسی طرح خلق خدا میں اپنے آپ کو ضم کر کے وہ حمیدہ بی بی کے غم کو بھلانے کی کوشش کرتے۔ ان کے پاس کوئی قارون کا خزانہ تو تھا نہیں کہ خیرات کی مد میں سے نکال کر لوگوں کی خدمت کرتے..... جب شاگردوں کے مسائل اور گھریلو اخراجات نے ہلہ بول دیا تو چوہدری صاحب نے جھٹ پٹ دوسری شادی میں اپنے مسائل کا حل ڈھونڈ نکالا۔ پہلے مہینے جب پنشن میں سے بھی پچھلے ادھار دے کر وہ سترہ روپے لائے اور ناصرہ کے ہاتھ پر رکھ کر بولے..... "لو بھئی اللہ اس میں برکت دے گا۔"

حمیدہ بیگم ہوتیں تو بسم اللہ کہہ کر اس رقم کو مشین کے اندر یوں رکھتیں کہ کیا کوئی بیگم اپنی تجوری بند کرتی ہو گی لیکن نئی دلہن بھڑک اٹھی اور قہر بھری نظروں سے دیکھ کر بولی۔

"یہ بھی کاہے کو دیتے ہو؟ انجمن حمایت اسلام کا چندہ کیوں نہیں مقرر کر دیتے؟"

اس کے بعد وہ ٹیوشنیں تلاش کرنے لگے۔

زمین ان کے بس کی بات نہ تھی لیکن بیوی کا منشی بن کر انہیں راحت ملنے لگی۔ سکول میں اتنا عرصہ رہ کر وہ ایک بات ضرور سیکھ گئے تھے کہ ہیڈ ماسٹر سے ڈرنا اور بچوں کو دھمکانا اچھے ماسٹر کی نشانی ہے..... ناصرہ میاں سے ننگی تلوار تھی۔ دن ایسے جا رہے تھے کہ انسان کی قیمت دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی تھی۔ قتل کے نام پر اب کوئی نہ بدکتا۔ بسے بسائے گھر اجڑتے۔ مہاجروں کی کہانیاں روز مرہ کی گفتگو تھی۔ ایک روز ناصرہ نے دیکھا کہ ماسٹر جی بیٹے کو پڑھانے بیٹھے ہیں۔ ناصرہ برقعہ اتار

رہی تھی چونک گئی۔

ماسٹر جی نے پوچھا..... '' بھئی تمہارا محافظ کون ؟ کون تمہارا محافظ ؟..... کہو اللہ ..... کہو اللہ..... ''

ناصرہ بھڑک اٹھی چلا کر بولی..... '' واہ ماسٹر جی واہ..... اللہ نے اس زمین پر آپ کو محافظ بنایا۔ آپ پھر اللہ کو سونپتے ہیں۔ قہر خدا کا ماسٹر جی..... میں تو پہلے ہی اللہ کے سپرد تھی۔ پھر آپ نے پنگا کیوں لیا؟..... عجیب آدمی ہیں آپ بھی..... ''

مسجد کے پیچھے جہاں صبح کے وقت سکول لگتا تھا' اسی شاملات میں شام کے وقت لڑکیوں کے لیے ملٹری ٹریننگ کا انتظام تھا۔

قیام پاکستان کے بعد کچھ ادارے اور فرد اس بات پر مصر تھے کہ پاکستان کی عورتوں کو اسلحہ استعمال کرنا آنا چاہیے اور گو سرکاری طور پر ایسی کوئی کمیٹی یا سکیم نہ بنی تھی۔ پھر بھی کچھ لوگوں نے لڑکیوں کو ٹریننگ دینے کا انتظام کر لیا تھا۔ لڑکیاں پریڈ میں ذوق وشوق سے حصہ لیتیں۔ کاشن ٹھیک طور پر سمجھتیں۔ بندوق کی شست لگا کر عین بل آئی میں نشانہ لگا سکتی تھی۔ لائننگ لوڈ اور گن رکتا جیسے کاشن سن کر گراؤنڈ تھرا جاتی۔ جب '' اٹ واز '' سن کر لڑکیاں ٹھپ سے پاؤں علیحدہ کرتیں تو یکبارگی ٹھپ کا شور اٹھتا۔

اس گراؤنڈ کے آخر میں چھوٹا سا پولیس تھانہ تھا جس کی دیواریں گیروے رنگ کی تھیں۔ راستے پر بھی گیرو پڑا رہتا۔ درختوں کے تنوں پر سفیدی کا لیپ ہوتا اور دروازوں پر سال بہ سال ہری پالش ہوتی۔ اسی گراؤنڈ میں مغویہ عورتوں کے ٹرک اور بسیں بھی کبھی کبھار آ کر رکتی تھیں۔ مسجد کے سامنے کھلا راستہ تھا جس پر نمازی آتے جاتے تھے اور اسی راستے پر عین مسجد کے سامنے پکے گھروں کی قطار تھی۔ ان گھروں میں سب سے اونچا شیخ صاحب کا پختہ مکان تھا۔ شیخ صاحب کو کاموں سے فرصت نہ ملتی۔ وہ ڈی سی صاحب کے دفتر میں کلرک تھے۔ دفتر سے واپسی پر سودا سلف خریدتے اور جب سورج اونگھ رہا ہوتا تو ان کی واپسی ہوتی۔ ساری زندگی کلرکی کی نذر ہو گئی۔ عین بڑھاپے کی دستک سے پہلے شیخ صاحب نے بیاہ کر لیا۔ شیخ صاحب خود کہتے تھے کہ اپنی اہلیہ کو انہوں نے گودوں کھلایا تھا۔ ان کے مولوی قدیر کے ساتھ پرانے مراسم تھے۔ شیخانی جی مولوی صاحب کے رشتے کی بھانجی تھیں اور یتیم رہ جانے کے بعد مولوی جی نے انہیں پالا تھا۔ جب بھی شیخ صاحب مولوی جی کے گھر جاتے' وہ یتیم سکینہ کو گود میں لے کر دو پیسے کی کھٹی میٹھی گولیاں کھلاتے' پھر بازار کے چکر لگاتے اور مطمئن گھر کو لوٹتے۔

لیکن سکینہ کے جوان ہوتے کچھ تو شیخ صاحب کا التفات بڑھا۔ کچھ مولوی جی کا احساس ذمہ داری۔ پھر شیخ صاحب کو ازدواج کا ایسا شوق چرایا کہ دنوں میں بیٹھے بٹھائے چھل پھل ہو گئی۔ شیخ صاحب کی کھچڑی پکی داڑھی میں نیلا مائل سیاہ خضاب چھا گیا۔ دو نئے دانت بھی منہ میں فٹ کرا لیے۔ کپڑوں میں نفاست اور صفائی جھلکنے لگی۔ اب سودا سلف کے ساتھ کبھی کبھار ایک آدھ پلاسٹک کے رنگین کلپ اور پہلی تاریخ کے لگ بھگ ریشمی بنیان بھی آنے لگی۔ سکینہ اگر یتیم نہ ہوتی اور اس کی پرورش مولوی صاحب جیسے اصول پرست انسان نے نہ کی ہوتی تو شاید گھر میں لطف کا اضافہ ہوتا لیکن سکینہ نے کم عمری میں ہی اپنی ساری خوشیاں شیخ صاحب کے رومال میں باندھ دیں۔ اس راضی برضا پالیسی اور ان مجنونوں کی

بدولت جو شیخ صاحب پھانکتے' کھاتے اور چباتے رہتے تھے' پانچ سال کے اندر اندر کُربل کُربل کرتے پانچ بچے سکینہ کے گھر میں مینڈکوں کی طرح اچھلنے لگے۔ بڑا بچہ بخوبی بات نہ کر سکتا تھا۔ ننھے میاں ابھی گود میں تھے اور منجھلے صاحبزادے ابھی ماں کو تاں اور اباجی کو باجی کہتے تھے کہ صاحبزادوں کے درمیان وہ دو ننھی سی لڑکیاں بھی رینگنے لگیں جن کے ناک کی ٹلکیاں سارا دن بہتی رہتیں اور جنہیں نالی سے مٹی اکٹھا کر کے کھانے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ گلی کے نوجوان آپس میں باتیں کرتے "خدا قسم ایسے بڈھوں کو شوٹ کر دینا چاہیے۔ اگر کل کلاں یہ بڈھا مر گیا تو یہ سارا لشکر کہاں سے کھائے گا۔ ایسے کھوسٹ کو پھانسی کے تختے پر چڑھا دینا چاہیے۔"

کوئی دوسرا منچلا کہتا..... "ٹھیک کہتے ہو۔ یہ بڈھے اپنا شوق پورا کرتے ہیں اور اولاد کو اپنے بہن بھائی پالنا پڑتے ہیں۔ اب اگر یہ کھوسٹ مر جائے جیسا کہ ظاہر ہے' یہ مرے گا ہی تو بڑے لڑکے کو ہی باپ بننا پڑے گا۔ اس گروہ کو اور کون پالے گا؟ اس بیچارے کی تو زندگی حرام ہو گئی ناں....."

گفتگو میں ایک اور شامل ہو جاتا..... "سارا قصور مولوی صاحب کا ہے۔ اگر اتنا بوجھ تھا تو زہر دے دیتے۔ کوئی ہم عمر ملتا تھا تو اس سے بیاہ دیتے۔ یہ حال تو نہ کرتا مولوی بیچاری کا....."

پھر کوئی نرم دل کہتا..... "بھائی کسی نوجوان نے بھی تو بڑھ کر مولوی صاحب کا بوجھ ہلکا نہ کیا..... اب ان پر تو سارا الزام نہیں دھرا جا سکتا۔"

کوئی نئی روشنی کا دلدادہ بول اٹھتا..... "اب ایسے بچوں کی تربیت کیسے ہوگی۔ فوج کی فوج....."

واقعی ان بچوں کی تربیت کا تو سوال ہی نہ اٹھتا تھا۔ شیخ صاحب کی تنخواہ اور چھوٹی موٹی بخششیں ان بچوں کا پیٹ بھرنے میں صرف ہو جاتیں۔ سکینہ کا سارا دن چولہے کی نذر ہو جاتا۔ کپڑے دھونے بیٹھتی تو ہاتھ سفید نکل آتے۔ بچے جانے کہاں کے ازلی بھوکے تھے کہ سارا دن منہ چلاتے' پھر بھی ان کی آنکھوں سے حرص اور بھوک جھانکتی رہتی۔ ابھی گھی کے ٹین میں انگلیاں ڈوبی ہیں تو پھر آٹے کو چینی سمجھ کر پھانکا جا رہا ہے۔ کبھی گلی کی سیڑھیوں پر بیٹھے مکئی کے دانے چبا رہے ہیں۔ کبھی بھٹیارن سے لو لگائے ندیدوں کی طرح بیٹھے ہیں۔ زمین سے بالشت بھر اونچے نہیں ہوئے تو توندیں ناک سے بھی آگے جا نکلی تھیں۔ دانت پوری طرح نکلے نہیں اور میل کی تہیں ان پر جم کر رہ گئی تھیں۔ ایک نے دوسرے کو چھو لیا تو جیسے آتش بازی چھوٹ گئی۔ مارنے والا ڈر کے مارے روتا چلا جاتا ہے۔ مظلوم کا فریاد کرتے گلا سوکھتا ہے۔ تیسرا اپنی بے قصوری ثابت کرنے کو آنسو بہائے جاتا۔ باقی دو نا سمجھ نہ جانے کیوں اس موسیقی کے لوازمات بن کر چاں پاں کیے جاتے ہیں۔ سکینہ کبھی مارتی ہے۔ کبھی چولہے میں پھونکیں مارے جاتی ہے۔ اس موسیقی کی اس قدر عادی ہو چکی ہے کہ اس چیں پیں کے بغیر گھر سونا لگتا ہے۔ شیخ صاحب کے تھکے ہارے جسم و ذہن پر شاید شور ناگوار گزرتا ہے لیکن انہوں نے کبھی کسی بچے کو نہ تو جھڑکی دی' نہ مارا۔ نہ شیخانی سکینہ سے بحث کی۔ نہ اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔ دفتر سے واپسی پر ان کے تھیلے میں ویسی ہی رنگین میٹھی گولیاں ہوتیں جو وہ تیس سال پہلے سکینہ کے لیے لایا کرتے تھے۔ چارپائی پر بیٹھ کر وہ عینک اتار کر قمیض کی جیب میں ڈالتے۔ پھر ہر ایک بچے سے مخاطب ہو کر پکارتے..... "آ جاؤ حمید بیٹے..... وقاص کہاں ہو بھائی..... لولو..... وقار النسا بی بی بھلا روتی کیوں ہو..... ارے رے رے ننھے میاں گولی لو اور سلیوٹ کرو..... فوجی سلیوٹ..... آئی ے.....

آئی ہے..... بھلا ہماری بنی کیوں لوئے....." شیخ صاحب کے ہاتھ بڑھتے رہے۔ ان کی تربیت لاڈ پیار دھرا کا دھرا رہ جاتا۔ گولیاں ختم ہوتے ہی چھینا جھپٹی گالی گلوچ شروع ہو جاتا اور صحن کارزار بن جاتا۔ شیخ صاحب ان کو چھڑانے منانے سمجھانے میں شام کو رات میں بدل دیتے۔ دوسرے دن زیادہ گولیاں لانے کا وعدہ کر کے اس فوج میں عارضی صلح نامہ کروا دیتے۔

سمجھوتہ اور فرمانبرداری شیخ صاحب کی زندگی کا عنوان ہو کر رہ گئی تھی۔ کلرکی کے لاتعداد سال اگر انہیں کچھ سکھا گئے تو یہی بات سکھا گئے کہ زندگی ہتھیار ڈالنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر لوگ ہنستے ہیں تو ہنسنے دیجئے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ہنس ہی تو سکتے ہیں' مذاق ہی تو اڑا سکتے ہیں۔ آخر ہر مذاق ہر انفرمیشن بوسیدہ ہو جاتی ہے۔ ہر لطیفہ پرانا ہو جاتا ہے اور انسانوں کو مذاق اڑانے کے لیے کوئی نئی راہ' لطیفہ' انسان' انفرمیشن تلاش کرنا پڑتی ہے۔ اسی فلسفے کی بدولت شیخ صاحب کی باتوں میں بڑی گھمبیرتا اور دانائی آ گئی تھی اور اسی طرزِ خیال کی بدولت ان کے ہم پیشہ ان کے صلاح مشورے کی قدر کرتے تھے اور انہیں بے ضرر انسان تصور کرتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ضرر پہنچانے کے طریق ان کے ہاں ذرا مختلف تھے۔ شیخ صاحب کی یادداشت اچھی تھی اور دیر تک وہ اپنی تکالیف نہ بھول سکتے تھے۔

ابھی ایک سال پہلے کا واقعہ ہے۔ جب ان کے ہاں آخری بچہ آیا تو متعدد دن انہیں شیلانی سکینہ کی دیکھ بھال کرنا پڑی۔ رات رات جاگ کر وہ زچہ بچہ کی خبر گیری کرتے۔ صبح کا ناشتہ کرنا اور کرانا بھی معمول میں شامل ہو گیا۔ پھر برتن دھو مانجھ کر وہ سائیکل دوڑاتے دفتر پہنچتے تو دیر ہو چکی ہوتی۔ ہیڈ کلرک دو تین مرتبہ تنبیہ بھی کر چکا تھا' پر وہ بڑے معذور تھے۔ ایک دن پیشی ڈپٹی کمشنر صاحب کے پاس ہو گئی۔

"ویل شیخ صاحب! آپ ہر روز لیٹ آتے ہیں' کیوں....."

"جی حضور..... حضور میرے گھر پر بیمار ہیں..... بچی آئی ہے....."

"دیکھیے بابو جی..... بچی آئے یا بچہ اس سے دفتر کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں کا کام suffer نہیں کرنا چاہیے۔"

"لیس سر....."

"آپ کی ساری Casual Leave بھی ختم ہو چکی ہے....."

"لیس سر....."

"اور ابھی سال کا پہلا سیشن بھی ختم نہیں ہوا....."

"لیس سر....."

"شٹ اپ شیخ صاحب! یو آر اے فول..... اسی لیے ان پندرہ سالوں میں آپ کی پروموشن نہیں ہو سکی....."

"جی حضور....."

"کل سے آپ وقت پر آئیے ورنہ میں Written Explanation لوں گا..... آپ جانتے ہیں میں کسی Slacker کو اپنے دفتر میں برداشت نہیں کر سکتا....."

"جی سر......"

"Be lost شیخ صاحب!You aggravate me.....".

بظاہر شیخ صاحب مسکراتے ہوئے خوشامدی چہرہ لیے دفتر سے نکلے۔ انہوں نے جھڑکیوں کو عام روٹین سمجھ کر بھلا دینا چاہا لیکن بدقسمتی سے انکا حافظہ بڑا تیز تھا اور وہ برسوں پہلے کے زخم بھی تنہائی میں چاٹتے رہتے تھے..... دوسروں کو بغلی گھونسہ مارنا' چغلی' غیبت' کام میں ڈنڈی مارنا' فائل چھپا کر افسر کو کھپانا' سروس رولز جتا جتا کر افسر کی روح قبض کرنا' سائلوں کی سنی ان سنی سے انہیں طول رکھنا' ہر فائل کو ڈوں' مینوں' التوا میں رکھ کر ضرورت مندوں کو پھیرے لگوانا' چھوٹے سے کام کو مہم بنانا ان کے بدلوں کا روپ تھا۔ انہیں زندگی نے آسانیاں عطا نہ کی تھیں۔ ان کا کنواں محبتوں کے پانیوں سے خالی تھا۔ اسی لیے وہ ازچنیں پیدا کر کے' سوتیں چھین کر چھپا کر خوش ہو لیتے۔ وہ بڑا جرم کرنے کے اہل نہ تھے لیکن چھوٹی تکلیف دینے میں نہ چوکتے۔ جب بھی کسی پر مہربانی کر بیٹھتے تو اپنی بے عزتی کی طرح یہ مہربانی بھی ان کے دل سے نہ اترتی۔ ذاتی طور پر ان کا یہ بھی خیال تھا کہ مولوی صاحب کی بھتیجی سے نکاح کر کے انہوں نے مولوی صاحب پر بڑا احسان کیا ہے۔ کان بھرنے سے بھی وہ کبھی نہ چوکتے.....ان کا خیال تھا کہ ہیڈ کلرک صاحب ہی ان کے خلاف موقع بے موقع کان بھرتے رہتے ہیں۔ ابھی ڈپٹی کمشنر صاحب کی جھڑکی کا اثر باقی تھا۔ جب ہیڈ کلرک چھٹی پر چلا گیا تو یہ سنہری موقع شیخ صاحب کیسے گنوا سکتے تھے۔ ایک دن صاحب کا موڈ بھانپ کر وہ وایک بار دفتر میں گئے' پھر نکل گئے۔ صاحب کچھ متوحش ہو گیا۔

"بابو جی! یہ بار بار آپ بغیر کچھ کہے چلے جاتے ہیں کیا بات ہے؟ کیا آپ کو اس کیس کے متعلق کچھ علم ہے؟"

"کونسا کیس سر؟....."

"مسجد کے پچھواڑے جو شاملات ہے' اس میں سکول والوں نے ایک کمرہ بھی چھت لیا ہے۔ کچھ آپ لوگوں کو فکر ہے کہ نہیں.....یہ Evacuee پراپرٹی نہیں ہے کہ جو چاہے گا ہتھیا لے گا۔"

انتہائی مظلوم چہرہ بنا کر شیخ صاحب بولے....."حضور! ہیڈ کلرک صاحب اس کیس کو ڈیل کرتے ہیں.....میں تو کچھ عرض نہیں کر سکتا....."

"کچھ تو علم ہو گا آپ کو.....سکول چل رہا ہے۔ پکا کمرہ تعمیر ہو گیا ہے ہیڈ ماسٹر کے لیے.....آخر پہلے ڈی سی صاحب کی اجازت ہو گی ناں.....میں تو نیا نیا آیا ہوں....."

پہلے شیخ صاحب نے آنکھیں جھکائیں' پلکیں جھپکائیں.....تھوڑی دیر ہاتھ ملے۔ جب وقفہ خاموشی خاطر خواہ بوجھل ہو گیا تو کھنکار کر بولے....."مجھے کچھ کہنا تو نہیں چاہیے لیکن نیا نیا ملک بنا ہے۔ ہم تو اس ملک کے بہی خواہ ہیں....."

صاحب کا تجسس بڑھا کر وہ خود خاموش ہو گئے۔ ڈی سی صاحب نے عینک ٹھیک کی۔ فائل پر سے نگاہیں اٹھائیں اور تجسس سے پوچھا....."ویل اصلی بات کیا ہے؟"

"وہ سر.....ہیڈ کلرک صاحب کے مراسم ہیں سکول والوں سے۔ وہ وعدہ بھی کر چکے ہیں کہ.....شاملات کی زمین بالآخر قائداعظم کی سالگرہ یا برسی کے موقع پر یا ایسے ہی کسی قابل ذکر واقعہ پر سکول کی نذر کی جائے گی.....آخر قوم کے بچوں کا فائدہ ہے۔"

اس چھوٹی سی بات سے ہیڈ کلرک صاحب کی پرانی بنیادوں کو جنبش ہوئی۔ ہولے ہولے شیخ صاحب نے اپنی سلجھی ہوئی غیبت کے ٹیکے لگانا شروع کر دیے۔ جھوٹ سچ کی آمیزش سے کچھ ایسا پلستر کیا کہ جب ہیڈ کلرک صاحب لوٹے تو سارا انتظام ہی بدلا ہوا نظر آیا۔ صاحب کی تیوری چڑھی ہوئی' گفتگو تند اور انداز بے پرواہ تھا۔ ہیڈ کلرک نے بڑی کوشش کی۔ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا تو صاحب نے سنی ان سنی کر دی کہ ہیڈ کلرک صاحب کو نہ صرف تبدیلی ہی کروانا پڑی بلکہ ساری عمر کے لیے وہ جونیئر کلرکوں سے محتاط ہو گئے اور ترقی کی لمبی چھٹی پر نہ جائیں گے۔

شیخ صاحب کا مزاج تھا کہ اگر سیدھی انگلی سے نکلتا بھی ہو تو بھی وہ ٹیڑھی انگلی ہی استعمال کرتے تھے۔ وہ درخت کی ڈالیوں کو بھی نہ کاٹتے ہمیشہ جڑوں کو گزند پہنچاتے لیکن سکینہ کے معاملے میں انہوں نے تاش کے سارے پتے ہی میز پر ڈال دیے..... وہ سکینہ کے تابع فرمان تھے۔ اس کے ساتھ کسی قسم کے ہیر پھیر یا زیادتی کے متعلق وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے..... گھریلو ماحول میں ان کا رویہ بالکل بدل جاتا۔ منہ اندھیرے اٹھتے' سکینہ کا چہرہ دیکھ کر خدا کا شکر بجا لاتے۔ وضو کرتے نماز پڑھتے' ابھی خاصہ ملگجا اندھیرا ہوتا۔ جب باورچی خانے کی بتی ٹمٹمانے لگتی۔ شیخ صاحب کو تڑکے چائے پینے کی عادت تھی۔ وہ شادی کے بعد اس عادت کے خلاف ناکام جہاد بھی کر چکے تھے لیکن نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا تھا۔ پہلے تو سکینہ نے اٹھ کر چائے بنانے کی کوشش کی لیکن رفتہ رفتہ شیخ صاحب نے اسے اتنی صبح اٹھنے سے منع کر دیا۔ ان کی خیر خواہی کا آخر کار یہ نتیجہ نکلا کہ سب کا ناشتہ بنانا خالص ان کی ذمہ داری بن گئی۔ چولہے میں پھونکیں مارتے ہوئے ان کی آنکھیں بلیوں کی طرح کشادہ اور ہیبت ناک نظر آتیں۔ راکھ اڑ اڑ کر ان کی ڈاڑھی میں افشاں کے چھینٹے چھوڑتی' کپڑوں پر جا بجا کالک کے نشان لگ جاتے۔ سردیوں میں جب وہ ڈھیلا ڈھالا گاؤن پہنے اور صرف چہرہ اس ٹوپی سے جھانکتا تو ان کا حلیہ عجیب و غریب ہوتا۔ شلوار قمیص پر جا بجا دھبے' گرم کرنے والا بوسیدہ سویٹر پیروں میں کھڑاویں' اس حلیے میں مسلسل کھانستے' لگا تار پھونکیں مارتے کہ شاید آگ بھڑک اٹھے اور چائے جلد تیار ہو جائے۔ سردیوں میں چائے کی طلب بہت بڑھ جاتی۔ خوراک اس قدر ناقص تھی کہ بوڑھے جسم میں حدت پیدا نہ کر سکتی' چائے پر اکتفا کرتے۔ بیچارے شیخ صاحب گھر پر کوٹ اس لیے نہیں پہن سکتے تھے کہ پھر دفتر کیا پہن کر جائیں۔ جوں جوں سردی بڑھتی ان کی تشویش میں اضافہ ہوتا۔ شروع سردیوں میں صرف سویٹر کام آتا۔ پھر سکینہ کی شال لپیٹے نظر آتے۔ جوں جوں سردیاں ٹھٹھرنے لگتیں' ان کا وجود بھاری فوجی کمبل میں لپٹ جاتا۔ پھر جب سردیوں کی بوندا باندی شروع ہوتی تو دھوئیں بھرے باورچی خانے میں صبح منہ اندھیرے سر ڈھانپے یوں چوکی پر نظر آتے گویا چھوٹا سا خیمہ نصب ہو۔ ہر بار جب خیمہ پھونک مارنے کے لیے جھکتا تو رضائی کے بوسیدہ کناروں سے روئی جھانکنے لگتی۔

ادھر سکینہ دھوپ چڑھے بچوں کو لے کر کوٹھے پر جا چڑھتی۔ بچے ہیں کہ روئے چلے جاتے ہیں۔ بچے کوئی گھٹنوں' کوئی ہاتھ پاؤں پر رینگ رہے ہیں۔ ایک کا رونا بند کراؤ تو دوسرا بھڑک جاتا ہے۔ بڑا لڑکا پھٹا پرانا پتنگ جو کوٹھے سے چار فٹ اوپر نہیں جاتا' اڑانے کی سعی کیے جاتا ہے۔ سکینہ بچوں سے پیچھا چھڑا کر الگ جڑ سے ڈھیلی مشین پر بچوں کے بے ڈھنگے کپڑے سینے کی کوشش کرتی ہے تو ہر بچے کا اصرار ہوتا ہے "میں ہی وہی چلائے گا۔ اس کی نظر بچا کر بچے شٹل نکال لیتے ہیں۔ مشین کا دھاگہ گم ہو جاتا ہے۔ بٹن دھاگے میں پرو کر کھیل بنا لیتے ہیں۔ سوئی سے ایک دوسرے کو چھونے کا کام

لیتے ہیں۔ قینچی کاغذ کاٹنے کے کام آتی ہے۔ نہ سکینہ کو اس مشغلے سے کوئی روکتا ہے' نہ بچے بدلتے ہیں۔ ایک گلی پیچھے قصائی کی دوکان تھی۔ سارا دن چیلیں سکینہ کے گھر کے اوپر منڈلاتی رہتی ہیں۔ چھٹی والے دن کہیں سے شیخ صاحب چند دیسی گنے لے آتے۔ پھر وہ مشین کے پاس موڑھا کھینچ کر گنے چوسنے لگ جاتے۔ مکھیاں نہ جانے کہاں سے یورش کرتیں۔ ایک ایک پوری پر دس دس ہاتھ شیخ صاحب کی طرف لپکتے۔ شیخ صاحب کے اپنے ہاتھ میں کچھ نہ آتا لیکن وہ مسکرائے چلے جاتے۔ سمجھوتے کروائے چلے جاتے اور سمجھتے وہی گنا چوس رہے ہیں۔ ان کی عادات قابل تعریف اور صبر قابل پرستش تھا لیکن سکینہ انہیں دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتی۔ پتہ نہیں اس کے کون سے خواب چکنا چور ہو چکے تھے۔ وہ اپنے خوابوں کو اپنے سے بھی چھپا کر دیکھتی تھی۔ مولوی صاحب نے اس کی تربیت دنیا کی اونچ نیچ سمجھا کر کی تھی اور وہ نہ تو گلہ گزاروں میں تھی نہ ناشکر گزاروں میں اس کا شمار ہو سکتا تھا۔ بس ایک بات تھی کبھی کبھی یہ ان دیکھے ان سلجھے خواب ساون کی بدلی بن کر قلبی افق پر چھا جاتے۔ کبھی کبھی سکینہ گھریلو کام کاج' بچے' شیخ صاحب سب کو چھوڑ کر چارپائی پر گر جاتی۔ پتہ نہیں یہ یتیمی تھی.....؟ لاوارث حالات تھے..... پتہ نہیں خواہشات کے سانپ تھے یا محرومی کا احساس تھا۔ ہولے ہولے اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے اور وہ کبھی کبھی سوچنے لگتی کہ ایسی بے ثمر زندگی کا بھی کیا فائدہ..... پھر مولوی جی کی تربیت غالب آ جاتی' وہ کانوں کو ہاتھ لگاتی۔ استغفار پڑھتی اٹھتی اور اپنے روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہو جاتی۔

مسجد کے پچھواڑے شاملات تھی اور سامنے گلی کا کھلا راستہ جو آگے تنگ ہوتا جاتا تھا۔ مسجد کے اندر ایک جانب دو پکے کمرے اور غسل خانہ تھا۔ ان کے دروازے کھڑکیاں مسجد کے باہر کھلی گلی میں کھلتی تھیں۔ ایک مولوی جی نے کھلے میدان کی طرف ایک چھوٹا سا صحن بھی گھیر لیا تھا۔ بیچ میں ہتھی والا نلکا' چھوٹا باورچی خانہ اور ایک کھڈا نما ایسا کمرہ تھا جس کا کوئی دروازہ نہ تھا۔ اس میں بوسیدہ' ناکارہ سامان اس قدر ٹھنسا ہوا تھا کہ اسے درست کرنے کی جگہ بھی نہ ملتی تھی۔ اس صحن کا دروازہ بھی کھلی گلی میں کھلتا تھا۔ دروازہ پر سبز پینٹ تھا اور جب بھی یہ کھلتا ایک دلدوز سی چیخ اس کے وجود سے نکلتی.....

اس گھر میں اب نئے مولوی صاحب' اس کا جوان بیٹا جمیل اور مولوی صاحب کی بوڑھی ماں رہتے تھے۔ مولوی صاحب کی بیوی جمیل کی پیدائش کے کچھ سال بعد بیٹھے کے عارضے میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئی۔ اماں نے اٹھ کر گھر سنبھال لیا اور جمیل کی پرورش مولوی سبقت اللہ سے بڑھ کر کی لیکن اب اماں کی صحت جواب دینے لگی تھی۔ گھٹنوں کا درد بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا تھا۔ مستزاد یہ کہ آنکھیں بھی جواب دے رہی تھیں اور دانتوں کا بھی کوئی اعتبار نہ تھا۔ آج ایک گیا تو کل دو..... کھانے پینے میں دقت آنے لگی تھی۔

مولوی سبقت اللہ تحریکوں والے سیاست پسند مولوی نہ تھے۔ یہ درست ہے کہ طاقت حاصل کرنے کے لیے اجتماعی اور انفرادی فائدوں کے لیے گروہ بنانا' اسے دولت' طاقت اور ہتھیاروں سے آراستہ کرنا اپنے لیے راہوں کو آسان کرنے کا بڑا ہی آزمودہ نسخہ ہے لیکن مولوی صاحب اللہ میاں کے ایک کمزور پیادے تھے۔ وہ پانچ کینڈل پاور کا بلب تھے اور اسی میں خوش تھے کہ جس قدر روشنی پھیلانے کا حکم انہیں ملا تھا' اس میں وہ کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ سردیاں گرمیاں ہمیشہ انہوں نے وقت پر اذان دی۔ سردیوں کی سرد راتوں میں یخ پانی سے وضو کر کے وہ ٹھٹھرتے ہوئے مسجد میں چلے جاتے۔ سردیوں میں نمازی نسبتاً کم آتے اور باوجودیکہ مولوی صاحب کہتے رہتے کہ نماز نیند سے بہتر ہے' اہل قصبہ [illegible]

کے بلاوے کا اثر کم ہوتا۔ مولوی صاحب نے نہ تو کسی نمازی کی سرزنش کی نہ ہی انہوں نے کبھی اپنے آپ کو اس قابل سمجھا کہ وہ کسی شخص کو گمراہی سے بچا سکتے ہیں۔ وہ بس دو ہی مقامات پر فعال تھے۔ ایک تو اللہ کے پیام کو لوگوں تک پہنچا دینا اور دوسرے ہر شخص کو اپنے سے بہتر تسلیم کرنا۔ مولوی صاحب کچھ اس درجہ خاکسار طبیعت کے مالک تھے کہ وہ کسی کو کہنی یا ہاتھ سے پکڑ کر نصیحت کرنے کے قابل ہی نہ تھے۔ خطبہ دیتے وقت وہ تھوڑی دیر کے لیے کڑک دار آواز نکالنے پر قادر ہو جاتے۔ ان کا خیال تھا کہ خطبہ وثوق سے دینا چاہیے تاکہ لوگ متوجہ ہو جائیں اور صراط مستقیم کی طرف ان کا دھیان ہو۔ جھڑک آمیز آواز میں جو للکار تھی' وہ مولوی سبقت اللہ کی اپنی ذات منوانے کے لیے نہ تھی بلکہ وہ جذبۂ جہاد کے تحت تلوار سی آبدار آواز میں اس لیے خطبہ دیتے تھے کہ نہ خوشامدی کہلائیں نہ کمزور۔ اپنے معاملے میں تو وہ ایک درماندہ حقیر حکم کا بندہ تھے جو جمعرات کی روٹیاں بٹورنے کو اپنے لیے اعلیٰ فعل سمجھتے تھے۔ انگریز نے انہیں نچلی ذاتوں کے ساتھ بریکٹ کر کے ان کی انا کو ورق کی طرح کوٹ کے دھر دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ انگریز سرکار نے انہیں شودر' فقیر اور گانے بجانے والوں کے ساتھ ساتھ ہی مقام عزت بخش دیا تھا۔ یہ بات انگریز کو بذات خود تو معلوم نہ تھی لیکن اونچی جاتی کے ہندوؤں کے ساتھ تال میل رکھ کر اور اکثریت کی زبانی ملکی حالات جان کر وہ بھی نیلے لہو اور کالے لہو کی شناخت کرنے پر مجبور تھا۔

مولوی صاحب جو ایک مدت سے سختیاں جھیل کر مذہب کی پاسبانی میں مشغول تھے اور اللہ کے احکامات کے مقابلے میں ہرگز کسی اور حکم یا قانون کی پرواہ نہ کرتے تھے' خود تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لیے بھی پس ماندہ رجعت پسند اور جہالت پذیر تھے۔ جب تعلیم یافتہ امیر لوگوں کو اسلامی عقائد سخت گیر لگتے تو وہ یا تو اجتہاد کا نعرہ لگاتے یا پھر مولوی کو کوستے جو غالباً اپنی مرضی سے اسلام کو سخت پیش نہیں کرتا بلکہ وہ ان سرحدوں کو بیان کرتا تھا جس کو مسلمان از روئے شریعت الانگ نہیں سکتا۔

مولوی سبقت اللہ کی عادات سادہ' گفتگو دھیمی' اٹھنے بیٹھنے میں تحمل اور طبیعت میں انکساری تھی۔ وہ اسراف کو گناہ شمار کرتے تھے اور پیوند لگے کپڑے اور مرمت شدہ جوتے کو خوشی سے پہنتے تھے۔ انہیں دنیاوی ترقی یا سائنس سے کوئی چڑ نہ تھی۔ موجودہ ایجادات میں سے سائیکل' عینک' مائیکروفون' ریڈیو ان کی املاک میں شامل تھا۔ کبھی کبھی وہ خطبے میں مہلک ہتھیاروں کے خلاف بات کرتے تھے لیکن ان ایجادات کے متعلق بات کرنے کی غرض صرف اس قدر تھی کہ انہیں انسانیت کش ادویات اور ہتھیار کی ایجادیں اشرف المخلوقات کے خلاف سازش نظر آتی تھیں۔ مولوی سبقت اللہ کا بیٹا جمیل بائیس برس کے لگ بھگ تھا۔ اس کی رنگت سفیدی مائل گندمی' آواز بے دھمک' قد لمبا' جسم دبلا اور بات کرنے کا انداز سہا ہوا تھا۔ کبھی کبھی مولوی جی اسے دیکھ کر کہتے۔

"ادھر آؤ جمیل....."

جمیل اس طرح سامنے آتا گویا پلے بیک فلم چل رہی ہو۔

"جی ابا جی....."

"بیٹھو....."

وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ جاتے۔ دونوں کی نظریں نیچی اور انداز شرمیلا ہوتا۔

"سنا ہے کل تم پینگن منگنے لے آئے تھے....."

"جی....."

"اور تمہاری دادی چاہتی تھی کہ تم مہر دین کو پینگن واپس کر آؤ....."

"جی....."

"لیکن یہ بھی سنا ہے کہ تم نے پینگن واپس کرنے سے انکار کر دیا۔"

"جی....."

"کیوں.....؟"

"وہ ہمیشہ میرا تمسخر اڑاتا ہے۔"

"پھر؟..... اگر تم پینگن واپس کرنے نہیں گئے تو کیا تمسخر کم ہو گیا؟"

"جی نہیں....."

"بیٹا جمیل..... زندگی میں صرف اللہ سے ڈرو..... کوئی انسان اتنا طاقتور نہیں کہ تمہیں خوفزدہ کر سکے..... اسی کی ذات کریم پر بھروسہ کرو..... اچھے دنوں میں بھی اور برے دنوں میں بھی..... میں تمہیں جھگڑا کرنے' فساد ڈالنے کے لیے نہیں کہہ رہا لیکن درست بات کو شائستگی سے ادا کرنے میں تو کوئی حرج نہیں۔"

"جی....."

"سنو حق کی خاطر دھرنا دینا' احتجاج کرنا' فساد پھیلانا منع ہے۔ حق کے لیے بولنا اور جان دینا برحق ہے..... فرق سمجھ رہے ہو..... حق اور شے ہے اور فساد اور چیز ہے۔"

جمیل چلا گیا تو مولوی صاحب نے اپنے اندر ٹٹول شروع کر دی۔ وہ اول تو اپنے آپ کو دوسروں کو تربیت دینے کے مجاز ہی نہیں سمجھتے تھے لیکن اگر کبھی جمیل کو سمجھانا ہی پڑ جاتا تو وہ پھر خرابی کو اپنے اندر بھی ٹٹولتے اور اپنے وجود کے لان میں سے جڑی بوٹیاں نکالنے سے دریغ نہ کرتے.....

مولوی صاحب جانتے تھے کہ خلق کے معاملے میں وہ بھی بہت کمزور ہیں۔ معاملہ آ پڑنے پر وہ اللہ سے زیادہ مخلوق سے ڈرتے تھے۔ انہیں فوجی افسر' پولیس آفیسر کو دیکھ کر لرزہ سا چڑھ جاتا۔ اپنی مسجد میں کسی رئیس آدمی کو دیکھ کر وہ خواہ مخواہ آبدیدہ سے ہو جاتے۔

لیکن اپنی اس کمزوری پر مولوی صاحب نے اس قدر تابو ضرور پا لیا تھا کہ وہ اس کا اظہار کسی سے کرتے نہیں تھے اور اللہ سے استدعا کرتے رہتے کہ وہ انہیں مدح و ذم کے چکر سے نکالے اور اپنی ذات کے علاوہ کسی سے خوفزدہ نہ رکھے۔

جمیل کی کمزور وضع قطع دیکھ کر بھی مولوی صاحب نے اندر ہی اندر جمیل کے لیے وہی دعا کی جو وہ اپنے لیے کرتے چلے آئے تھے۔ بہت سال گزرے مسجد سے ملحق ایک نیا گھر بنا تھا جس کی چٹھ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی تھی۔ اس میں ملک دلدار آ کر بسے تھے۔ چٹھ کے روز سارے گھر پر بجلی کے قمقمے روشن کیے گئے۔ شامیانوں میں مہمان ٹھنسے رہے۔ سپیکروں پر اونچے اونچے نور جہاں' لتا' شمشاد بیگم اور رفیع کے گانے بجتے رہے۔ کچھ نمازیوں نے اعتراض بھی کیا کہ ملک صاحب کو

مسجد ہی کا خیال کر لینا چاہیے تھا لیکن مولوی صاحب نے اس جملہ بازی کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ ان کا خیال تھا کہ اللہ نے اتنے رنگوں کی خلقت بنائی ہے کہ اعتراض کی گنجائش نکلے ہی نکلے۔ وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

جلد ہی شیخ صاحب کو علم ہوا کہ اُن کے ساتھ والے گھر میں ملک دلدار صاحب آ بسے ہیں۔ تب ملک صاحب اپنی نو بیاہتا بیوی وحیدہ کے ساتھ نئے مکان میں اترے تھے۔ آٹھ دس سال کے بعد ایک اور نیا ماڈل آ گیا اور اوپر والی منزل بس گئی۔ اب پرانی بیوی نچلے گھر میں رہتی تھی اور تیسری بیگم دیہات میں تھی۔ جہاں سیروں والی سے ملنے کے لیے اور اپنی زمینوں سے آئی گندم، چاول، گڑ، سبزیاں لانے کے لیے ملک صاحب مہینے میں ایک آدھ بار چلے جاتے۔ ملک صاحب اپنے دو تین مزارعوں کے ساتھ سیدھا سودا ٹریں یا کار پر جاتے۔ پھر وہاں ان کا تانگہ منتظر ہوتا اور وہ اپنے گاؤں اسی رئیسی تانگے پر سوار روانہ ہو جاتے..... زمینوں کے علاوہ انہوں نے اچھرے میں ایک تین منزلی پلازہ بھی بنا لیا تھا جس کی نچلی منزل میں دو کانیں اور اوپر والی دو منزلوں میں رہائشی کمرے تھے۔ اس کا کرایہ وصول کرنے کے لیے انہوں نے ایک دبلا پتلا منشی رکھ چھوڑا تھا جو ملک صاحب کی جھڑکیاں بڑی خوشی سے برداشت کرتا اور تھوڑے بہت گھپلوں کے ساتھ کرایہ وصول کر کے آ جاتا۔

ملک صاحب کی طبیعت میں رنگینی، اسراف، طاقت کے مظاہرے اور شیخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ دونوں بیگمات ان کی طبیعت کے یہ سارے رخ بڑی اچھی طرح سمجھتی تھیں۔ ملک صاحب کا خیال تھا کہ اسلام نے چار شادیوں کی اجازت نہیں دے رکھی بلکہ یہ حکم ہے کہ ہر مرد چار شادیاں کرے۔ مشکل یہ تھی کہ ملک صاحب اتنی سی بات نہ سمجھ پائے تھے کہ یہ اجازت بوقت مجبوری استعمال کرنے کا حکم تھا۔ چوری چھپے کی آشنائی سے بچنے کے لیے اور عورت کو بدنامی سے بچانے کی خاطر چار شادیوں کا حکم آیا تھا۔ یہ زندگی کا کمپلسری پرچہ نہ تھا اختیاری مضمون تھا جس میں انصاف کی کڑی شرط تھی۔ ملک صاحب نے اس انصاف کو بھی اپنی ضرورت کے مطابق Interpret کر لیا تھا۔ جو لطیفہ وہ کوٹھے پر سناتے وہی نچلی منزل میں بھی دوہرایا کرتے۔ جس شئے کو بڑی ملکانی کے آگے بگھارا جاتا وہی دبلی پتلی ناصرہ کے آگے بیان کرنا ضروری تھا۔ ملک صاحب نے اپنی سہولت اور احکامات کی پابندی کے لیے ایک کیلنڈر لٹکا رکھا تھا۔ اوپر والی منزل کا نشان رائٹ تھا اور نچلی منزل کو کراس سے ظاہر کیا جاتا۔ اس طرح مہینے کے بعد وہ حساب کرتے کہ انہوں نے دونوں گھروں میں برابر کا وقت بسر کیا..... ان تین شادیوں کے علاوہ وہ اپنا دل پشاوری کرنے کے لیے وہ کبھی کبھار گانا سننے بھی چلے جاتے اور اس نورا چھیری کو اعلانیہ دونوں بیگمات کے سامنے بیان کر دیتے۔ وہ دونوں بھی خاموش ہو رہتیں کہ ملک صاحب کی بدولت وہ اور ان کے بچے خاصی آرام دہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ گھر پر ملک صاحب ریشمی تہبند پہنتے۔ اس کے اوپر کلیوں والا کرتا اور واسکٹ ہوتی۔ پیروں میں پشاوری چپل یا بہاولپوری کھسہ ہوتا۔ پگڑی انہوں نے ایک عرصہ ہوا چھوڑ دی تھی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ پگڑی والے جاگیردار وہ لوگ تھے جنہوں نے سرکار انگلشیہ کی طرفداری کر کے مربعے ہتھیائے تھے۔ ان جاگیرداروں کی ذہنیت غلامانہ تھی۔ ملک صاحب کو اس بات پر بہت مان تھا کہ وراثت میں ان کو ملے ہوئے مربعے کسی بادشاہ یا صاحب بہادر کی دان دکشنا سے حاصل نہ ہوئے تھے۔ وہ اوپر والی منزل میں بیٹھ کر شیخی بگھارتے۔

"فیروزہ..... ہم بناوٹی جاگیردار نہیں ہیں۔ انگریزوں کے نے پالک۔"

ایک وقت تھا کچلی منزل کی بیگم صاحب کو پختہ یقین تھا کہ ملک ولدار حسین جسمانی' ذہنی' جذباتی طور پر اس کی ملکیت ہیں اور اس پر نظر ٹھہرنے کے بعد یہ نگاہ کسی پر نہیں ٹھہرے گی لیکن ملک صاحب کی بھی مجبوری تھی۔ دولت کمانے سے فراغت' پڑھنے بڑھانے کا ان کو شوق نہ تھا۔ وقت کٹی کے لیے کوئی ہابی نہ تھی۔ باتیں کرنا' خواب دیکھنا' دوسروں کو کمتر ثابت کرنا ان کے ذاتی مشغلے تھے۔ وہ جبلی زندگی کے قریب تر تھے۔ اچھا کھایا' پیا' خوب سوئے' دوسروں کے لیے متجسس رویہ اور اپنے اعمال کو بھید رکھنا ان کا معیار تھا.....

یہ بات بھی ضرور ہے کہ کچھ فطرت نے ہی مرد اور عورت کی ساخت ہی مختلف نہیں بنائی۔ ان کے جبلی تقاضوں کی وجہ سے جذباتی وابستگیاں بھی مختلف تھیں۔ آفرینش بڑھوتری چاہتی ہے..... نسل در نسل بڑھوتری جس میں عورت کو بچے کی پرورش میں اس قدر محو کر دیا ہے کہ کالا نیلا پیلا' لنگڑا لولا' دیوانہ ہر قسم کا بچہ ماں کی گود میں سما جاتا ہے۔ وہ فطرت کی طرح بے انصاف ہو کر اولاد پالتی ہے..... اپنے بچے کے مقابلے میں اسے کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ اسی لیے سوتیلی کہلاتی ہے۔ عورت کے لیے اپنے بچوں کے علاوہ کچھ موجود نہیں ہوتا۔

اسی طرح مرد کے ذمے دھرتی میں بیج بونا ہے..... بنجر' ریتلی' میدانی پہاڑی ہر قسم کی زمین پر اس کا بیج گرتا ہے۔ اللہ نے اس میں ایک ایسا اندھا جذبہ سمو رکھا ہے کہ وہ کبھی یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ کھیتی بیج کے قابل ہے بھی یا نہیں..... موٹی' کالی' ٹھگنی' ہوتق..... سات سال کی کہ ستر برس کی..... پاگل یا مجذوب' ہوش مند کہ احمق..... جذبہ تخلیق کے سامنے وہ مجبور ہے..... بار آور کرتے وقت وہ تمام حز' اچھل کود کر کے زندگی کے بہاؤ میں شامل ہو جاتا ہے..... مرد کا شعوری حصہ وفادار ہونا چاہتا ہے۔ عورت کا عقلی وجود اسے انصاف پسند دیکھنا چاہتا ہے..... لیکن دونوں اپنے اپنے جبلی رول کے ہاتھوں مجبور رہتے ہیں۔ عورت مرد کی بے وفائی سے کڑھتی ہے اور مرد عورت کی ماںتا سے بے زار رہتا ہے۔ پھر بھی دونوں فطرت کو بدل نہیں سکتے۔ عورت کی ہمہ وقتی ماںتا کو دیکھ کر اور مرد کے ہرجائی پن ثابت ہو جانے کے بعد میاں بیوی برسوں ساتھ رہیں یا علیحدہ ہو جائیں۔ ان دونوں کو سکون نہیں مل سکتا..... عورت مرد پر بھروسہ نہیں کر سکتی اور مرد عورت پر اعتبار نہیں کرتا۔ ہندو مرد نے عورت کی محبت کو آزمانے کے لیے ستی کی رسم ایجاد کی۔ پتی پوجا اور پتی دھرم کو رائج کیا لیکن اعتبار راجہ رام چندر کو آیا نہ کرشن جی مہاراج کو..... یہ شک کا کھیل ہی ہے جسے کھیلتے کھیلتے بڑھاپا آ جاتا ہے..... مرد عورتوں کے پیچھے پھر بھی بھاگتا رہتا ہے اور انہیں دولت کا جبلی عکس دکھا کر باتوں میں ورغلا کر عورتوں کی ہمدردی میں مخمل کر غزل الغزلات کی فضا قائم رکھنا چاہتا ہے..... عورت بچوں کو بیاہ کر ہاتھوں سے گنوا کر ہیر پھیر سے ان پر قابض رہنا چاہتی ہے..... یہ کھیل لامتناہی ہے۔ بے اعتباری' شک اور بڑھوتری کا کھیل اور نسل در نسل اسی کی بدولت زندگی کی رنگینی' اداسی اور بے اطمینانی جاری رہتی ہے..... مشکل یہ ہے کہ فطرت کا کام تو مفت چلتا ہے لیکن مرد اور عورت چکی کے پاٹ بن کر ایک دوسرے کو پیستے چلے جاتے ہیں۔

ملک ولدار صاحب چونکہ جبلی زندگی بسر کرتے تھے اور خواہشات پورا کرنا اور نئی خواہشات کو جگانا ان کا شعار بن گیا تھا۔ وہ عورتوں کو دلچسپی سے دیکھتے' اگر جی چاہتا تو بار بار دیکھتے' آنکتے' پھر لطیفے سنا کر ہنسانے کی کوشش کرتے۔ ابھی تک ان کا ایمان تھا کہ ہنسی اور پھنسی۔ تحفے دینے میں بھی شیر تھے۔ ان کا فلرٹ کرنے کا انداز گو دیہاتی تھا لیکن شہری عورت اس چینذ وپنے سے بہت جلد متاثر ہو جاتی تھی۔

بہت جلد ملک صاحب کو علم ہو گیا کہ نچلی منزل میں ملکانی نے ایک جوان نوکرانی رکھ لی ہے۔ ملکانی عموماً نوکرانیوں کو ملک صاحب سے اوجھل رکھا کرتی تھی لیکن اس کم نصیب کی طرف سے نہ جانے کیوں ملکانی بھی بے خوف ہو گئی تھی۔ ایک روز ملکانی پلنگ پر بیٹھی تھی۔ پشت کی جانب نوکرانی بالوں میں تیل لگا رہی تھی کہ ملک صاحب آ گئے.... نوکرانی نے تیل کی کٹوری کندھے پر پڑا تولیہ اٹھایا اور جانے کی تو ملکانی بولی....''نی راحیلہ ذرا ملک صاحب کے لیے چائے تو بنا لا.....''

''کیوں بھئی مالک کو سلام کرنا نہیں سکھایا تمہاری بی بی جی نے.....''

راحیلہ نے سر اور آنکھیں جھکا کر کہا.....''سلام علیکم ملک صاحب.....''

جب راحیلہ چائے بنانے چلی گئی تو ملک صاحب بولے.....''یہ کب بھرتی کی تم نے؟''

''بس ہفتہ دو ہوئے ہیں۔ بیچاری بڑی بدقسمت ہے۔ قافلے کے ساتھ آ رہی تھی کہ ماں باپ بچھڑ گئے.....''

''اچھا اچھا مہاجر ہے.....''

''ہاں جی مہاجر بھی ہے اور پڑھی لکھی بھی ہے.....''

''یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ اس سے بھانڈے کم منجوایا کرو اور بچے ضرور پڑھایا کرو.....گھر بیٹھے بٹھائے ٹیوشن والی استانی مل گئی.....''

''اپنے آپ کو کسی ڈاکٹر صاحب کی اولاد بتاتی ہے.....''

''یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ تربیت اچھی کرے گی تمہارے بچوں کی.....''

ملکانی نے چند لمحے توقف کیا.....''مجھے تو اچانک مل گئی بازار میں۔ ایک آدمی اسے چھیڑ رہا تھا۔ یہ بھاگ کر میرے پیچھے چھپ گئی۔ شکل ہی ایسی ہے کہ نظر کو کھینچتی ہے۔''

''اچھا میں نے غور نہیں کیا.....''

حالانکہ سر سے پاؤں تک ملک صاحب نے راحیلہ کے چہرے اور جسم کی پیمائش کر لی تھی۔ وہ اس کے چہرے کی ملاحت اور جسم کے بانکپن سے متاثر بھی ہوئے تھے۔

''اچھے گھر کی لگتی ہے.....''

''اچھا چھوڑو ہمیں کیا بڑے بڑے گھرانوں کے لوگ اجڑ کر آئیں۔ لوگ ایسے کٹ کائے گئے ہیں جیسے جانیں گنے میں کھڑکتی ہیں۔ جیسے اللہ رسول کو منظور.....''

''یہ تو واقعی ٹھیک ہے۔ پر مقامی لوگوں کی بڑی آزمائش ہے ملک جی۔ لاکھوں لوگ اجڑ کر آئے ہیں۔ ان کے بسانے کا بوجھ ہم پر بھی تو ہے ناں.....''

''ہاں حکومت نے ادارے بنائے ہیں۔ جو لوگ جائیداد زمین چھوڑ کر آئے ہیں انہیں الاٹ ہو جائے گی کوٹھیاں زمینیں.....''

''پر ایک ڈر ہے ناں ملک جی..... کچھ مقامی لوگ بھی چالاکی سے جائیداد الاٹ کرا لیں گے.....[illegible]

پیچھا تھوڑی چھوڑتا ہے.....''

''ہاں.....یہ بھی تم ٹھیک کہتی ہو.....''

''اور پھر یہ بھی ہوگا کہ ایک مربعے والا دس مربعے الاٹ کرالے گا.....دس مرلے کے گھر والا کوٹھی کا مالک بن جائے گا.....''

''یہ بھی تیری بات ٹھیک ہے.....''

''میں بتاؤں کیا کرنا چاہیے؟.....''

''بتاؤ بتاؤ.....''

''جو جائیداد زمینیں' ملیں ہندو سکھ چھوڑ گئے ہیں' وہ سب کی سب حکومت کی رہیں۔ بس جو مہاجر انہیں استعمال کرے' کرایہ دے.....''

''اور جو کرایہ دینے جوگا نہ ہو وہ.....وہ ملکانی.....''

''اسے حکومت قرض دے' پر مفت کسی کو کچھ نہ دے.....''

ملک اور ملکانی دیر تک مہاجروں کے حالات پر گفتگو کرتے رہے۔ مہاجروں کے مسائل کی دونوں کو جو تھوڑی بہت خبر تھی' وہ سنی سنائی تھی۔ ملک صاحب گو ایف اے تک پڑھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' بھی لگوا رکھا تھا لیکن موٹی سرخیوں کے علاوہ انہیں اخبار بینی کا شوق نہ تھا۔ وہ بڑی کمفرٹیبل زندگی بسر کرتے تھے۔ اس لیے دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونا ان کے بس کی بات نہ تھی لیکن ملکانی کا دل نرم تھا۔ معاف کر دینا' دوسروں کے حالات کو سمجھنے کی کوشش کرنا اور لوگوں سے خاص کر نوکرانیوں سے نرمی برتنا ان کی طبیعت تھی۔

ایک روز ملک صاحب مغرب کے وقت آئے تو ملکانی اور راحیلہ دونوں تخت پوش پر کھڑی نماز پڑھ رہی تھیں۔ ملک دلدار کچھ فاصلے پر بیٹھ کر ان کو دیکھنے لگا۔ راحیلہ کا قد لمبا' رنگ کھلا کھلا' ناک پر بڑا سا تل اور پاؤں بڑے خوبصورت تھے۔ اس نے کانوں کی دونوں جانب دوپٹہ اڑس رکھا تھا اور اس وقت وہ ایشیائی لگنے کے بجائے کچھ یمنی' کچھ لبنانی' تھوڑی سی مراکش کی لڑکی لگتی تھی۔ جب وہ رکوع میں گئی تو نہ جانے کیوں ملک صاحب کو گندے گندے خیال آنے لگے۔ انہوں نے لاحول پڑھی اور پھر وضو کرنے کے ارادے سے غسلخانے میں چلے گئے۔

ملک صاحب جب نماز پڑھ کر واپس آئے تو راحیلہ باورچی خانے میں جا چکی تھی۔

''یہ تمہارے ساتھ نماز پڑھتی ہے.....''

''کون؟.....''

''یہ نئی نوکرانی؟ کیا نام بتایا تھا تم نے؟''

''راحیلہ.....''

''ہاں راحیلہ.....''

''عجیب سی بات ہے کچھ دن ہوئے میں نے پوچھا راحیلہ تم نماز نہیں پڑھتی ہو.....تو گھبرا گئی۔ میں نے اصرار

سے پوچھا تو کہنے لگی بی بی جی مجھے نماز پڑھنی نہیں آتی۔"

"ہیں......؟"

"بڑی دیر بیٹھی مجھے بتاتی رہی کہ.....جی میرے اباجی پکے کانگریسی تھے۔ انہوں نے اپنے ہندو دوستوں کی وجہ سے نماز پڑھنا ہی بند کر دی تھی۔ کہا کرتے تھے مسلمان جیسی نماز پڑھتے ہیں اس کا تو کہیں قرآن میں ذکر ہی نہیں.....اللہ اگر چاہتا تو بتاتا ناں کہ نماز میں کیا پڑھو؟....."

"کچھ بدنصیب مسلمان اپنا اپنا دین الٰہی بنانے میں لگے رہتے ہیں۔ چندرے اپنی عاقبت کا نہیں سوچتے..... ہندو مسلم اتحاد کے فکر میں گھلے رہتے ہیں.....اچھا ہو گیا پاکستان بن گیا اب اس اتحاد سے تو جان چھوٹی.....ہندو جانے اس کا بھگوان جانے.....ہم جانیں ہمارا خدا جانے....."

"راحیلہ بتا رہی تھی کہ اس کے ڈاکٹر ابا نے اسے کالج میں پڑھایا لیکن نہ قرآن سکھایا نہ نماز.....بیچارے ڈاکٹر صاحب کانگریس سے اپنی وفاداری نبھاتے رہے....."

"پھر تم اسے قرآن پڑھا دو....."

"ہاں قاعدہ منگا لیا ہے.....روز پڑھاتی ہوں.....اب تو نماز بھی فر فر پڑھنے لگی ہے....."

"اور بچوں کو پڑھاتی ہے کہ نہیں وہ بھی ضروری ہے....."

"ہاں جی..... پڑھاتی تو ہے۔ پر بچے اسے بہت ستاتے ہیں اور جب ستاتے ہیں تو یہ رونے لگ جاتی ہے۔ مجھے بڑا ترس آتا ہے۔ میں بچوں کو بھگا دیتی ہوں....."

یہ ملکانی کا مزاج تھا وہ خدا ترس تھی۔ ملک اب ملکانی کی طرف رغبت محسوس نہیں کرتا تھا لیکن ملکانی کو جواب دینا بھی اس کے بس میں نہ تھا۔ ملکانی وحیدہ اسے ہمیشہ اپنی ماں کی یاد دلاتی۔ ماں نے اپنی عمر کچھ بڑے ملک صاحب کے سہارے نہ گزاری تھی۔ اندر باہر کی زندگی بالکل علیحدہ تھی۔ ماں نے اپنے لیے نیک اور صالح عمل چن لیے تھے.....جہیز بن رہے ہیں۔ اللہ کے نام پر دیگیں پک رہی ہیں۔ یتیموں کی پرورش پر توجہ دی جا رہی ہے..... بیوہ عورتوں کے وظیفے مقرر کیے جا رہے ہیں۔ ملک دلدار کی ماں نے اپنے آپ کو دوسروں کے غم میں ضم کر دیا تھا۔ اس نے کبھی بڑے ملک صاحب سے نہ پوچھا مردانے میں کیا گزرتی ہے اور کیوں گزرتی ہے۔ بس اپنی ایک کائنات بسا لی۔ اس میں ماں خوش رہی یا ناخوش اس نے کبھی اندر کا بھید کسی کو نہ بتایا۔

ملکانی وحیدہ شہری عورت تھی۔ اس کا باپ ٹھیکیدار تھا اور اس نے حلال کے راستے بڑی کمائی کی تھی۔ ٹھیکیدار نے چھ کنال کی کوٹھی اپنی رہائش کے لیے تعمیر کی تھی اور اس میں اپنی بیوی اور تین بیٹیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ بچیاں سکول جاتیں تو تانگے کے پچھلے طرف چادر کا پردہ کیا جاتا لیکن اگر ٹھیکیدار صاحب اور ان کی بیوی رئیسی تانگے پر سیر کو نکلتے تو بچیاں چادریں اوڑھ کر ساتھ جاتیں۔ پاکستان بننے سے بہت پہلے ٹھیکیدار صاحب کے گھر کی عورتیں برقعے پہنتی تھیں لیکن کوٹھی میں آنے کے بعد ماڈرن ہو گئے تھے اور ماں اور بیٹیوں نے برقعے کی جگہ چادریں اوڑھ لی تھیں۔

ملک دلدار ایک شام ٹھیکیدار صاحب سے ملنے آئے تو اس وقت تینوں بیٹیاں اور ٹھیکیدار صاحب تانگے پر سوار

تھے۔ لڑکیاں چادروں میں ملبوس تھیں لیکن چہرے ننگے تھے۔

اسی روز ملک صاحب نے اپنی گاؤں والی بیوی کو دل میں خدا حافظ کہہ دیا تھا اور سوچ لیا کہ اگر شہری بود و باش اختیار کرنی ہے تو شہری عورت کے ساتھ رہ کر ہی نئے معاشرے کی سوجھ بوجھ پیدا ہو سکتی ہے۔ ادھر ٹھیکیدار غلام نبی کی بڑی بیٹی وحیدہ طلاقن تھی۔ تیس برس کی ہو کر اس کی مارکیٹ بھی ماند پڑ چکی تھی۔ انہوں نے بھی ملک صاحب کے کسی قول یا فعل کو زیر بحث لائے بغیر جلدی جلدی کوٹھی تعمیر کی اور بیٹی کو رخصت کر دیا۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب پچھلے شاملات میں لیگ کے جلسے ہوا کرتے تھے اور مائیکروفون پر اونچے اونچے نعروں کی آوازیں آتیں۔ لوگ اونچے اونچے للکارتے پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ..... ملکانی وحیدہ کو یاد ہے وہ کوٹھے پر چڑھ کر خالی منزل سے مسجد سے پار دیکھنے کی کوشش کیا کرتی تھیں لیکن دوسری منزل سے کھلے میدان کا بہت ہی تھوڑا حصہ نظر آتا تھا۔

ملک صاحب کی تیسری بیوی اچانک آئی۔ ملک صاحب ٹائیفائیڈ کے علاج کے لیے بڑی فورڈ میں لاہور جا رہے تھے کہ شیخوپورہ کے قریب حادثہ ہو گیا۔ ملک صاحب کو جلدی ہسپتال پہنچایا گیا جہاں جا کر پتہ چلا کہ پنڈلی کی ہڈی کا بھی فریکچر ہو گیا ہے۔ یہاں ہسپتال میں ملک صاحب کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ وہ نئی جگہ میں اپنے ہونے سے پرائے گھر میں خوف پیدا کر کے اور اجنبی لوگوں کے ساتھ خوش خلقی کا مظاہرہ کر کے ہمیشہ اپنی عزت کا انتظام کر لیتے تھے۔ ہسپتال کے چھوٹے عملے کو مٹھائی، پھل پھول اور وافر بخششیں دے کر انہوں نے بہت جلد اپنی رعایا بنا لیا۔ نرسوں میں ایک نرس فیروزہ البتہ بڑی کم گو اور الگ تھلگ رہتی تھی۔ وہ نہ تو ملک صاحب کی باتوں پر ہنستی نہ کبھی ٹپ قبول کرتی۔ وہ صرف اپنے کام سے غرض رکھتی اور پھر بغیر سلام دعا کے رخصت ہو جاتی۔ ملک صاحب ایسے رویے کے عادی نہ تھے۔ اس انوکھے لاڈلے کو ایسے خشک انداز کی عادت نہ تھی' سٹپٹا گئے..... ایک روز جب ملک صاحب نے اندازہ لگا لیا کہ فیروزہ ہی ڈیوٹی پر ہے تو انہوں نے اپنے پرانے مزارعے سیلے کو باہر سگریٹ لینے کے لیے بھیج دیا اور گھنٹی بجائی۔

فیروزہ تھی تو سانولی لیکن نین نقشہ کسی ایکٹرس کا تھا۔ کمرے میں آئی تو کلف شدہ ٹوپی' سفید لباس میں وہ ملک صاحب کو پری سی لگی۔

''جی سر.....''

''میرا دل بہت گھبرا رہا ہے..... مجھے لگتا ہے دل کا دورہ پڑا ہے مجھے.....''

فیروزہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ پہلے تھرما میٹر لگایا' پھر سٹیتھو سکوپ سے چھاتی کو چیک کیا۔ بلڈ پریشر دیکھا۔ اس دوران ملک صاحب فیروزہ کو ٹکٹکی لگا کر دیکھتے رہے۔ فیروزہ نے رتی بھر نوٹس نہ لیا اور کام کرتی رہی۔

''کیوں ہے ناں دل کا دورہ.....''

''سب کچھ نارمل ہے..... شاید بخار اترنے والا ہے تبھی اتنی گھبراہٹ ہو رہی ہے.....'' فیروزہ کے جانے سے پہلے سیلا سگریٹ لے آیا..... وہ اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے بھاگتا گیا اور بھاگتا آ گیا۔ ملک دلدار کو سیلے پر بہت غصہ آیا لیکن بیچارے چپ رہے۔

''بھاگتا گیا جی اور بھاگتا آیا ملک صاحب.....''

اندر دل میں ملک صاحب نے "لعنے منہ" کہا لیکن اوپر سے سگریٹ سلگالی۔

"ابھی ڈاکٹر صاحب راؤنڈ پر آئیں گے تو آپ اپنی تکلیف بتادیں....."

سمیلا پائنتی بیٹھ کر بائیں ٹانگ کو دبانے لگا جس پر پلستر نہ چڑھا تھا۔ اگر وہ موجود نہ ہوتا تو شاید وہ فیروزہ سے اپنی تکلیف کا ذکر بھی کر دیتے لیکن سمیلا کی موجودگی میں اپنے Image کو خراب کرنا ملک صاحب کے لیے ممکن نہ تھا۔

"وہ سرکار لٹی پٹی خلقت اس طرح آرہی ہے جیویں کھالا ٹوٹ جائے۔ دیکھا نہیں جاتا لوگوں کو....."

"تو ایسے کر سمیلے۔ باہر جا اور ملکانی صاحب کو فون کر کہ ابھی بخار نہیں ٹوٹا۔ ڈاکٹر صاحب کچھ دن اور ہسپتال میں رہنے کو کہہ رہے ہیں....."

سمیلا اٹھا اور کمرے میں پڑے فون پر نمبر ملانے لگا.....

"اوئے الو کے پٹھے باہر دفتر سے جا کر فون کر..... میں بے آرام ہوتا ہوں۔" سمیلا مؤدب باہر چلا گیا۔ ایسی جھڑکیاں اس کے لیے تمغۂ شکر تھیں۔

ہر جھڑکی ملک دلدار کے ساتھ اس کا رابطہ مضبوط کرتی تھی۔ جس قدر بے عزتی ہوتی' اسی کے تناسب سے بعد میں ملک احساسِ جرم میں مبتلا ہو کر بخشش دیتا۔ دھول دھپے کی صورت میں تو کئی بار ہزاروں مل جاتے۔ ملک کے اندر بھی دراصل دو شخصیتیں رہتی تھیں۔ دبدبے والا باپ اور خدا ترس ماں۔ ان دونوں شخصیتوں میں سرد جنگ جاری رہتی اور ملک بھی کبھی ایک کو دل سے بھگاتا کبھی دوسرے کو۔

سمیلا کے جانے سے پہلے فیروزہ رخصت ہو چکی تھی۔ اس بات پر ملک دلدار کو بہت غصہ چڑھا۔ اس نے نرس بلانے کے لیے لال بتی جلائی۔ کافی دیر تک کوئی نرس نہ آئی۔ پھر بتی جلائی' نرس نہ آئی۔ تیسری مرتبہ جب بتی لال ہوئی تو ملک دلدار خود آگ بھبھوکا ہو چکا تھا۔ فیروزہ کو دیکھ کر پارہ اور بھی چڑھ گیا۔ آج تک وہ ہر عورت کو بکاؤ مال ہی سمجھتا آیا تھا۔

"اوئے تین گھنٹیاں بجا چکا ہوں' کوئی آتا ہی نہیں۔ ہسپتال ہے کہ جیل خانہ....."

"ذرا آہستہ بولیں ملک صاحب۔ ساتھ والے کمرے میں ہارٹ کا مریض ہے....."

"میں کسی کی پروا نہیں کرتا..... مر جائے جسے مرنا ہے....."

"جی فرمائیے' کیا بات ہے؟"

"میرے پیٹ میں ہوا بھر گئی ہے۔ بیڈ پین لاؤ....."

"میں ابھی فقیرے کو بھیجتی ہوں۔" فیروزہ واپس جاتے ہوئے بولی۔

"فقیرے کو کیوں بھیجتا ہے' تمہارے ہاتھ ٹوٹے ہوئے ہیں۔ ادھر غسل خانے میں پڑا ہے بیڈ پین....."

فیروزہ نے منہ بنا کر کہا..... "یہ میری ڈیوٹی نہیں ہے سر۔"

"کیوں نہیں تمہاری ڈیوٹی' کم چور فربین..... جو کام کہو آگے سے بہانہ بنا دیتی ہو..... آ کر میرا بازو دباؤ....."

"یہ بھی میری ڈیوٹی نہیں سر....."

فیروزہ بغیر بات کیے کمرے سے نکل گئی۔

یہ ملک صاحب کی پوری انسلٹ تھی۔ وہ منہ بسورے موڈ بگھارنے کی کسی کو اجازت دیتے ہی نہ تھے۔ مشکل یہ تھی کہ ایک تو وہ چل پھر نہ سکتے تھے دوسرے ڈاکٹرز سنتے سب کی تھے لیکن اپنی مرضی کو مقدم جانتے تھے۔ اس واقعے کے بعد فیروزہ ملک صاحب کے کمرے میں نہ آئی۔ کئی بار شپٹا شپٹا کر ملک نے گھنٹی بجائی لیکن ہر بار موٹی سی سسٹر آئی اور کچھ خوشامدی باتیں کر کے چلی گئی۔

یہ ملک صاحب کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا۔ انہیں سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیسے فیروزہ کو بلائے۔ وہ تو دل ہی دل میں معافی مانگنے پر بھی تیار تھے لیکن فیروزہ نہ آئی۔ دو دن ایسے ہی گزر گئے تو پھر سمیلا کی مدد لینا پڑی۔ اسے رازداں بنا کر پانچ سو کا نوٹ اس کی جیب میں ڈالا اور بولے..... "میں ایسی ہزار فیروزائیں جوتی تلے مروڑ دوں۔ پر مجھے اس چھپکلی پر ترس آتا ہے۔ اگر سیکرٹری ہیلتھ سے رپورٹ کر دوں تو نوکری چلی جائے گی۔ فیروزہ بنی پھرتی ہے..... آگے سے۔"

"ابھی لاتا ہوں جی آپ فکر نہ کریں..... بس جب وہ آئے تو آنکھیں نہ کھولیں..... نہ بات کریں۔ بس ہائے ہائے جاری رکھیں....."

سمیلا تو یہ مشورہ دے کر چلا گیا۔ ملک دلدار کے لیے انتظار کرنا مشکل ہو گیا۔ آج تک لوگ ہی ملک کا انتظار کرتے رہے۔ ماں تھی تو گرم توے پر روٹی ڈالنے کا انتظار کرتی رہی۔ سوانی آئی تو ساری عمر راہ دیکھتی کہ کب ملک صاحب زنانے میں آئیں۔ عورت صابر تھی نہ کبھی گلہ کیا نہ اصرار۔ مزارعے ویسے ہی راستہ دیکھنے کے عادی تھے۔ ملک کے لیے تو یہ آدھا گھنٹہ گزارنا قیامت ہو گیا۔ جس وقت فیروزہ کو لے کر سمیلا آیا ملک کو اس قدر غصہ چڑھا ہوا تھا کہ اسے ہائے ہائے کرنا اور چپ رہنا بھی دشوار تھا۔

"کیا ہوا ملک صاحب کو....." فیروزہ ملک صاحب کی بے قراری دیکھ کر بولی۔

"پتہ نہیں جی ابھی خیر تھی۔ بس مجھ سے کروٹ بدلوائی جیسے کوئی نس کھچ گئی ہے سسٹر جی۔"

"تم بھاگ کر جاؤ' ڈاکٹر ارشد راؤنڈ پر ہیں' انہیں مردانہ وارڈ میں سے بلا لو....." سمیلا نے موقع غنیمت جانا اور باہر جا کر ایلسٹر کی باڑھ کے سامنے بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ اچانک ملک صاحب کا رازدان بن جانے کی اسے بڑی خوشی ہوئی تھی۔ اب وہ دن اپ ہو گیا تھا۔ کسی کا رازدان بننے سے جو برتری حاصل ہوتی ہے' اسے وہ کئی مقامات پر استعمال کر سکتا تھا۔

فیروزہ ملک صاحب کا بلڈ پریشر چیک کرنے میں مشغول تھی۔ زیادہ دیر ملک صاحب ایکٹنگ جاری نہ رکھ سکے۔ فیروزہ کے بازو کو ہولے سے پکڑ کر ملک صاحب بولے" پاگلے کب تک مریضوں کو ٹونیاں لگاتی رہے گی..... کوئی گھر بسا لے اپنا....."

فیروزہ کی دکھتی رگ پر ملک صاحب نے ہاتھ رکھ کر ظلم کیا۔ اچانک اندر والی یتیم' بے سہارا غریب لڑکی برآمد ہو گئی۔ ایک آنسو اس کی گال پر جادو سے آ بیٹھا۔

"ہم جیسی لڑکیوں سے سب فلرٹ کرتے ہیں ملک صاحب۔ جاتے جاتے ہمیں سو پچاس پکڑا جاتے ہیں۔

شادی کوئی نہیں کرتا۔ وقت گزاری گی سب کرتے ہیں۔"

ابھی تک ملک صاحب بھی یہی کچھ کر رہے تھے۔ یکدم ان کی مردانگی کو للکارا گیا تو وہ شادی کے لیے سنجیدہ ہو گئے۔ سنجیدہ بھی اس قدر ہوئے کہ انہیں یقین آ گیا کہ وہ پہلی ویدی سے فیروزہ کو مناکحت میں لینے کے آرزومند تھے۔

"سن کڑیئے..... میرے گھر میں پہلے دو سوانیاں موجود ہیں۔ پر سب کا الگ الگ ٹھکانہ ہے۔ سب کو برابر کا رزق ملتا ہے۔ میں نے کبھی ڈنڈی نہیں ماری۔ میں نے چوری چھپے نہ کوئی رکھیل رکھی ہے نہ کسی سے آشنائی کی ہے۔ اللہ کے حکم بموجب کیا ہے۔"

ملک صاحب ایسے ماننے والے تھے جو چار شادیوں کو حکم سمجھتے تھے۔ انتہائی مشکل کے عالم میں مسئلے کا حل نہ سمجھے تھے۔ انہوں نے نگاہیں نیچی کرنے کا حکم کبھی نہ مانا' رزق ضرور برابر دیا لیکن وقت کو ناپ تول کر دینا بھولے رہے۔ جدھر جھکاؤ ہوا' ادھر ہی بسیرا ڈال لیا۔ وہ رغبت اور احسان کے رشتوں میں انصاف کرنے کی شرط کو پورا کیے بغیر شادیوں کو حکم سمجھتے رہے۔ اسی لیے ان کے لیے فیروزہ سے شادی کرنا آسان تھا۔ وہ کسی قسم کے احساسِ جرم کے بغیر فیروزہ کو لے کر گھر آ گئے۔

ایک لمحہ کے لیے بھی نہ تو انہیں کسی قسم کی ذہنی تکلیف ہوئی۔ نہ ہی وحیدہ ملکانی پر ترس آیا۔ انہیں معلوم ہی نہ تھا کہ چار نکاح کے ساتھ جو انصاف کی شرط ہے' وہ اگر ناممکن نہیں تو کچھ ایسی آسان بھی نہیں..... سال بھر سے وہ زیادہ تر وقت اوپر ہی گزارتے تھے۔ نرس نے ان کے قلبی' ذہنی' دیدہ نادیدہ کئی زخم مندمل کر دیے تھے۔ اوپر والے گھر میں بچہ آ جانے کے بعد فیروزہ کی مصروفیات میں تبدیلی آ گئی تھی۔ ملک صاحب کو بچے کبھی بھی اچھے نہ لگے۔ دیہات میں جو دو بیٹیاں اور ایک بیٹا پروان چڑھ رہے تھے' ان کے لیے مالی اعانت کا بندوبست وافر تھا لیکن جذباتی وابستگی اور باہمی رابطہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ وحیدہ ملکانی کے دونوں بچے' سکول' بستے' یونیفارم' رپورٹیں' مس نے یہ کہا' مس نے وہ کہا میں اس قدر رچے بسے تھے کہ ملک صاحب کو ان کی صحبت سے وحشت ہوتی تھی۔ وحیدہ ملکانی کے لیے علیحدہ کار اور ڈرائیور کا انتظام تھا۔ بچے کچھ سکول' کچھ گھر پر پڑھتے نظر آتے تھے۔ ملک صاحب اوپر والی منزل سے اترتے چڑھتے ان کے چہرے دیکھ کر خوش ہو لیتے اور اپنی ملکیت میں اضافے پر نازاں ہو جاتے۔ اس سے زیادہ کے وہ متحمل تھے نہ روادار..... لیکن جونہی فیروزہ کے گھر کا کا آ گیا' ملک صاحب کو الجھن سی ہونے لگی۔ تاروں پر لٹکے فراک' نیپی' تولیے' بچھونیاں اندر کمروں میں دودھ کی بوتلیں' گرائپ واٹر' جھولنے' بے بی کی پنگھوڑی' کمروں میں باسی دودھ اور فنائل کی ملی جلی خوشبو' بستروں پر ربڑ اور پلاسٹک کے ٹکڑے..... اوپر والی منزل کا تو موسم ہی بدل گیا تھا۔ ملک دلدار ایک تو Leo تھے دوسرے بچپن سے وہ مرکز میں رہ کر اپنی اہمیت کے علاوہ کسی دائرے میں کسی کو اہم نہ سمجھتے تھے۔ ادھر فیروزہ بیٹے پر کاکے کو لٹا کر سلانے میں مشغول ہوتی۔ ادھر ملک صاحب بہاولپوری کھسہ پیروں میں اڑس کندھے پر دھسہ لپیٹ نیچے چلے جاتے۔

ملکانی وحیدہ بھی ڈیڑھ سال سے بے پرواہی کا شکار تھی۔ اس نے بھی ملک کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سکولی بچوں کو راحیلہ کے سپرد کر کے وہ ملک صاحب کے گھٹنے سے لگ بیٹھی۔ پھر غٹرغوں غٹرغوں شروع ہو جاتی۔

"تمہیں کوئی کام تو نہیں وحیدہ؟"

''کام گیا چولہے میں..... آپ سے بڑا کونسا کام ہے.....''

''وہ بچوں کا ہوم ورک کراتا ہوگا؟''

''ناں جی اب مجھے اس کام سے چھٹی..... راحیلہ بڑا اچھا پڑھاتی ہے..... بچے بھی اس سے مل گئے ہیں۔''

ملکانی کے بیڈروم سے تیسرے کھانے کے کمرے میں عموماً راحیلہ پڑھاتی نظر آتی۔ دبلی پتلی لمبی نابلی کی تازہ شاخ سی لچکدار ہاتھ جب اشاروں میں بدلتے تو نرت کا سماں پیدا ہو جاتا۔

ملکانی وحیدہ کو شبہ بھی نہ تھا کہ ملک صاحب بید کی کرسی میں کیوں بیٹھتے تھے۔ اس کرسی کو سرکانا اٹھانا آسان تھا۔ وہ کسی کی مدد لیے بغیر ہیجان سرکاتے رہتے اور شکار کو نظروں کی بندوق میں شدھ رکھتے۔ ایک روز جب وحیدہ ان کے کسی مذاق پر ہنس رہی تھی تو راحیلہ نے ان اونچے قہقہوں سے ڈسٹرب ہو کر بیڈروم کی طرف نگاہ کی۔ ملک صاحب کو محسوس ہوا گویا نگاہ میں مسکراہٹ تھی۔ قدرے بے تاب ہو کر وحیدہ سے بولے ''مہاجر ہے یہ لڑکی؟.....''

''ہاں جی مہاجر ہے.....''

''کوئی بچے وغیرہ.....''

وحیدہ نے مسکرا کر کہا..... ''ایک تو آپ کو یاد کچھ نہیں رہتا۔ گورداسپور کی مہاجر ہے۔ لاہور میں پڑھ رہی تھی کالج میں۔ جب پاکستان بنا ہے۔ کہتی ہے کہ کالج کے قریب آگ لگ گئی۔ سب لڑکیاں گھروں کو بھاگیں۔ یہ بھی رکشہ لے کر سٹیشن کے لیے نکلی۔ رکشے والے نے پتہ ہے کیا کیا؟ اسے قصور والی بس میں سوار کرا دیا کہ یہ سیدھی سٹیشن لے جائے گی..... پتہ نہیں لوگ ترس بھی نہیں کرتے..... اوپر سے ایسی افراتفری اور اس نے پتہ نہیں کیوں ایسے کیا؟..... کسی اچھے گھر کی بیٹی ہے۔ میری امرتسر والی خالہ ساجدہ کی لڑکی راحیلہ کی اس مہاجر لڑکی سے بڑی شباہت ملتی ہے۔ میں نے راحیلہ کو آخری بار تب دیکھا تھا جب وہ سکول جایا کرتی تھی۔ پتہ نہیں اب وہ لوگ کن حالوں میں ہوں گے اس لیے میں تو اس مہاجر لڑکی کو راحیلہ کہہ کر ہی بلاتی ہوں۔''

اس بے ربط گفتگو سے ملک صاحب نے کچھ نتیجہ اخذ نہ کیا کیونکہ وہ راحیلہ کو دیکھنے میں مشغول تھے۔ راحیلہ کی شکل وصورت میں کچھ ایسی تمکینی اور ملائمت تھی کہ یہ دیکھنا ہی آ بیل مجھے مار کے مصداق ہو گیا۔

''کسی اچھے گھر کی لگتی ہے تو تم اس سے زیادہ کام نہ لیا کرو وحیدہ.....''

''باورچی خانہ بھی سنبھال رکھا ہے..... مجھے تو کچھ کرنے ہی نہیں دیتی.....''

''تنخواہ کتنی دیتی ہو وحیدہ.....''

''لیں ملک صاحب وہ تنخواہ لے تو میں دوں ناں۔ میں نے تو دل میں سوچ رکھا ہے کہ کوئی اچھا رشتہ مل جائے تو بیٹی کی طرح بیاہ دوں گی.....''

ملک صاحب کے دل میں لمحہ بھر کو دھلک سی لگ گئی۔

''بیاہ تو دو گی پر تب تک تنخواہ بھی تو دو ناں.....''

''لیں اللہ رسول کو منہ دکھانا ہے۔ میں اس کی تنخواہ جمع کرتی جا رہی ہوں اپنے پاس۔''

ملک صاحب اٹھ کر کھانے والے کمرے میں چلے گئے۔ راحیلہ دونوں بچوں کو حساب پڑھانے میں مشغول تھی۔ اس نے ملک صاحب کو دیکھ کر سر پر دوپٹہ لیا۔ پھر سلام کر کے بچوں کو پڑھاتی چلی گئی..... ملک صاحب نے بھی سوچا' بات کرنا مناسب نہیں۔ واپس آ کر وحیدہ کے پاس بیٹھ گئے۔

''پڑھاتو ٹھیک رہی ہے.....''

''کالج تک پڑھی ہے..... کبھی کبھی پرانی باتیں بتاتی ہے تو بڑا دکھ ہوتا ہے۔ جب جب بادشاہیاں الٹتی ہیں ملک صاحب! اشرافوں کا برا حال ہوتا ہے۔ انگریز آیا تو مغل شہزادیاں مانگتی پھرتی تھیں بازاروں میں.....''

''بس یہ اللہ کے کام ہیں۔ اپنے بندوں کو آزمانے کے لیے نت نئے کھیل سجاتا ہے.....''

''میں تو کہتی ہوں ملک صاحب چرند پرند جانور نباتات کیا مزے کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ نہ کوئی امتحان' نہ کوئی آزمائش۔ مزے سے اس جہاں میں آئے..... اور جتنی دیر رہے نہ کوئی فکر نہ فاقہ..... مرنے میں دیر نہ لگی۔ کسی گھوڑے کو سکول جانے کی فکر نہیں۔ کوئی تتلی درزی کے جا کر خوبصورت لباس نہیں بناتی..... بنے بنائے لباس میں آتی ہے۔ ہر جگہ خوبصورت کہلاتی ہے..... پہاڑوں کو پتہ ہی نہیں کہ کہیں جا بھی سکتے ہیں۔ ساری مصیبت ہی انسان کے لیے ہے۔ ساری عمر اپنے آپ کو بدلنے ہی میں کاٹتا ہے..... کبھی سکول پکڑتا ہے' کبھی مرشد..... کبھی ماں باپ کو سجدہ کرتا ہے تو کبھی یار دوستوں کے مشورے لیتا ہے۔ آج چور ہے تو کل قطب..... اس بچارے کا کچھ ٹھیک نہیں..... نہ خدا کا مظہر بنتا ہے نہ انسان کا..... بس ہر وقت تبدیلی تبدیلی.....''

''اوئے اشرف المخلوقات جو ہوا۔ کس نے کہا تھا کہ عقل کا بوجھ اٹھائے؟ کس نے کہا تھا کہ دنیا کی امامت کا بیڑا اٹھائے؟ اب چوپے گئے..... پنگے لینے کا مزہ اٹھائے؟.....'' اس وقت راحیلہ کھانے کے کمرے سے اٹھ کر ادھر آئی.....

''بی بی جی چائے بنادوں؟.....'' راحیلہ نے پوچھا۔

''نہیں بھئی کھانے کا وقت ہونے والا ہے' اس وقت چائے کیسی؟.....''

ملک صاحب اٹھ کر بولے..... ''آج میں اوپر کھانا کھاؤں گا۔ فیروزہ نے پائے پکائے ہیں۔'' اس بات پر وحیدہ دل میں تلملائی لیکن چپ رہی۔ اس نے دل کے سنگھاسن سے ملک صاحب کو اتار کر بیٹے بٹھا لیے تھے۔ اب وہ ملک صاحب کے آنے جانے پر آنسو نہیں بہاتی تھی۔ وہ زیور کپڑے کو اپنی عاقبت سمجھ کر اسی میں مشغول رہتی۔ روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ ملک صاحب سے فراغت پا کر رسم و رواج میں دلچسپی بڑھ گئی۔ بچوں کی آمین' سالگرہ' شادی بیاہ کے شور شرابے' داتا دربار کے پھیرے' سہیلیوں کی آمدورفت' پیری مریدی' میلاد کی محفلیں' قرآن خوانی کی بابرکت مجلسیں..... وحیدہ بیگم کی زندگی سے نکل کر ملک صاحب کو تو کچھ نہ ملا لیکن وحیدہ بیگم کی نیک نامی اور عزت میں بڑا اضافہ ہوا۔ وقت بچ جانے کے باعث وہ رفاہی کاموں میں بھی حصہ لینے لگی۔ ریفیوجی اور مطوبہ عورتوں کے مسائل اور ان کے سلجھاؤ۔ لاوارث بچوں کی دیکھ ریکھ کے ادارے۔ اجڑ کر آئی لڑکیوں اور عورتوں کی گھر بسائی کی تجاویز پر عمل درآمد..... وحیدہ کا افق اتنے کاموں سے بھر گیا کہ اسے بچوں سے بات کرنے کا وقت بھی نہ ملتا۔ راحیلہ کے آنے پر بچوں کی طرف سے مکمل اطمینان تھا۔ وہ بچوں کو وقت پر تیار کر کے سکول بھجوا دیتی۔ واپسی پر کھانا کھلا کر گھڑی دو بعد گھیر گھار کر پڑھانے بیٹھ جاتی۔ وحیدہ کو تو

ایسی فراغت ملی کہ نہ کوئی کپڑا استری کرنا پڑتا نہ بستر بچھانا پڑتا۔ بس کپڑے نکالنا اور بار بار میچ کرنا' پھر زیور کے ساتھ اسے میچ کرتے رہنا۔ جوتیاں بھی کافی وقت لے لیتی تھیں۔ میک اپ بھی اب توجہ سے ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ راحیلہ لباس اور تیاری میں بھی دخیل ہو گئی۔ کبھی کھجوری چوٹی بن رہی ہے۔ کبھی مہارانی سیتا کا جوڑا باندھا جا رہا ہے۔ کبھی دو چوٹیوں میں ربن ڈالے جا رہے ہیں۔ بالوں میں مہندی لگائی جانے لگی۔ اب ناخن بھی صاف ستھرے ہو گئے۔ ناخن فائل کرنے کے بعد اندر سفید پنسل بھی پھیری جانے لگی۔ کپڑوں سے میچ کر کے ناخنوں کی کیوٹکس کا رنگ بدلا جاتا..... ان دنوں ابھی کونٹیکٹ لینز نہیں آئے تھے لیکن نقلی پلکیں ایجاد ہو چکی تھیں۔ انہیں لگا کر وحیدہ ملکانی اپنے آپ کو سلیپنگ بیوٹی سمجھتی۔ غرضیکہ راحیلہ کے آنے سے نچلی منزل جاگ اٹھی۔ اس چندن کی چنگی نے سارے ماحول کو خوشبودار بنا دیا۔ اس فرق کو سب سے پہلے ملک دلدار نے محسوس کیا۔ ملک دلدار میں فعال متخیلہ کی کمی نہ تھی۔ اگر وہ جاگیردار نہ ہوتا تو شاید شاعر ہوتا۔ نئے خوابوں نے اس کے دماغ پر بسیرا کر لیا۔ اٹھتے بیٹھتے وہ کھلی آنکھوں اپنے تخیل کی رسی کھلی چھوڑ دیتا۔

پھر ایک دن نہ جانے کیوں ملک صاحب موتیوں میں گندھا ایک موباف' چوڑیاں اور گرم سوٹ راحیلہ کے لیے لے آئے۔ اس وقت وہ باورچی خانے میں غلط سلط روسی سلاد بنانے میں مشغول تھی۔ ملک صاحب نے پہلے تحقیق کر لی تھی کہ وحیدہ ملکانی ہمسائے میں کسی میلاد پر گئی ہوئی تھی۔ تحفے لے کر دندناتے باورچی خانے میں پہنچے۔ ابھی تک جذبات کی ہماہمی میں ملک نے یہ نہ سوچا کہ اگر وحیدہ ملکانی کو پتہ چل گیا یا اوپر والی فیروزہ تک اطلاع پہنچی تو پھر معاملات کہاں تک الجھیں گے۔ مقدمے اور پیشی ملک صاحب کی عادت ثانیہ تھی۔ اگر کچھ دن آرام راحت سے گزرتے تو ان کے سارے جسم میں اینٹھی لگ جاتی۔ اکتاہٹ میں بلاوجہ چلتے رہتے۔ آواز گلے سے نہ نکلتی۔ آنکھوں سے غیر حاضری جھلکتی۔ خیال چمگادڑ کی طرح ذہن میں الٹا لٹک جاتا..... پھر کوئی زمینوں کا مقدمہ کورٹ میں پیشی' سرسری نالش' سرقہ خفیف پیش آ جاتا۔ کئی بار چھوٹے موٹے جھگڑے کی صورت میں گاؤں جانا پڑتا۔ ملک صاحب کے حواس ٹھکانے پر آ جاتے۔ تحفے کو چھاک کی طرح لے کر وہ باورچی خانے تک پہنچے۔ دروازہ میں کھڑے ہو کر مصنوعی چھینک ماری۔ راحیلہ متوجہ ہوئی تو بڑی مصنوعی لاتعلقی سے آگے بڑھے۔

"السلام علیکم' ملکانی کدھر ہے؟....."

راحیلہ نے سر پر مؤدب انداز میں دوپٹہ لیا۔ پلکیں رخساروں پر چسپاں کیں اور بڑی ادب بھری آواز میں بولی..... "جی آج تحصیلدار صاحب کے گھر میلاد تھا' وہاں گئی ہیں۔"

"لو میں اس کے لیے تحفہ لایا تھا' وہ ہو گئی غائب....."

"آپ مجھے دے دیجئے' میں بی بی جی کو دے دوں گی....."

"ہاں جی ہاں..... اب اس کی سزا ہے کہ میں اس کا تحفہ تمہیں دے دوں' آئندہ وہ خیال رکھے گی' مجھ سے پوچھ کر باہر جائے گی....."

راحیلہ نے اس سوال کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔

"[illegible]"

کسی سے نہ کرے گی۔

"تجھے کچھ پتہ ہے کب آئے گی ملکانی؟"

"پتہ نہیں جی' کچھ بتا کر نہیں گئیں....."

"چائے کی پیالی بنادے گی.....چلو اچھا میں اوپر جا کر پی لیتا ہوں۔"

"ہاں جی.....ابھی لاتی ہوں آپ بیٹھیں۔"

پہلے وہ کھائیوں' گھاٹیوں اور نشیبوں میں اترتا چلا گیا۔ ارد گرد پھیلے جنگلوں میں سے جانی انجانی خوفناک آوازوں نے اس کا پیچھا کیا۔ کئی سائے اس کے تعاقب میں تھے۔ جس تال کے پانیوں نے اسے نشیب میں اترنے پر آمادہ کیا تھا' وہ دور دور کہیں نہ تھے۔ ہر طرف سفید چمکدار پتھروں کے ڈھیر تھے جو سنگ مرمر کی طرح چمک رہے تھے۔

پھر وہ اوپر چڑھتا چلا گیا.....آوازوں نے اسے گھیر کر ابدی نیند سلا دینا چاہا.....سائے اس کے اندر باہر آتے جاتے۔ غائب ہو کر نفس میں رہ کر موجود رہے۔ پھر عین چوٹی پر پہنچ کر اس نے اپنے بازو آسمان کی جانب اٹھائے اور بڑی عاجزی سے بولا.....

"اے میرے تخلیق کرنے والے.....اے میرے رہبر و ہادی! تو نے مجھے جس طور پر تخلیق کیا ہے کہ میرے اندر ہر لحظہ دو ارادے' دو آرزوئیں.....دو خیال' دو جنگیں جاری رہتی ہیں۔ میری قوت ہاں میں بھی پنہاں ہے اور ناں میں بھی..... اے کائنات کے بنانے والے! مجھے تضاد سے گھڑنے والے! میں آخر ایک ہی راستے پر کیوں نہیں چل سکتا؟ کیا ساری کائنات میں صرف تو واحد ہے.....؟

اگر میرے قلب میں صاف اور گندا لہو بیک وقت سما سکتا ہے تو پھر میرے آقا..... میرے محسن' میرے تخلیق کار..... مجھ پر نیت کی شرط کیوں؟ جب میں بنا ہی دوئی سے ہوں تو پھر میری نیت میں یکجائی کیسے؟.....بتا..... میں کہاں تک قصوروار ہوں میرے آقا! اور کہاں تک نردوش؟"

●○●○●○

چھٹا عہد

والٹن کیمپ میں دُور دُور تک پناہ گزین بیٹھے تھے۔

کچھ ٹکڑیوں میں..... کچھ الگ تھلگ..... مختلف علاقوں سے آئے اپنے ہم زبان لوگوں کی تلاش میں تھے۔ کہیں موت کا سا ٹھہراؤ تھا، کہیں طوفانی لہروں سی اُمڈ تھی۔ بچے اس ساری قلوق سے بے خبر کھیلنے میں، ماؤں کی گود میں چھپنے اور جو کچھ حاصل تھا کھانے میں مشغول تھے۔ مائیکروفون پر بار بار اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی گمشدہ رشتہ داروں کی۔ مائیکروفون ناقص تھے اور آواز اُونچی ہو کر بھرا سی جاتی تھی۔

"ایک آٹھ، نو سال کی بچی جس کا رنگ گورا ہے امرتسر سے آئی ہے اس کا نام جمیلہ ہے۔ سبز رنگ کا جوڑا پہنے ہوئے..... اپنے باپ کا نام بوٹا بتاتی ہے..... ابھی جو کونوائے یہاں پہنچا ہے اس میں جمیلہ آئی ہے..... متوجہ ہوں..... بوٹا صاحب بوٹا صاحب..... متوجہ ہوں....."

اس خلق خدا میں ہزاروں بوٹے تھے۔ کچھ ٹنڈ منڈ کچھ بغیر پتوں کے..... کچھ کی شاخیں ٹوٹ چکی تھیں..... کچلے ہوئے خشک، ادھمرے آدھے زندہ..... کہیں گاچی سمیت کہیں جڑ غائب۔ جنہیں اس نئی سرزمین میں ازسرِ نو اپنی روئیدگی کے لیے کوشش کرنا تھی۔

وہ کھسکتی کھسکاتی والٹن کی بیرکوں تک آ پہنچی۔ یہاں پر نام درج کرنے والے کلرک، لنگر تقسیم کرنے والے ہمدرد شہری، ہلپر، مائیکروفون پر اناؤنسمنٹ جاری رکھنے والے لوگ آباد تھے۔

اُس کے پیٹ میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ اب اُس کی ٹانگیں بوجھ برداشت کرنے سے قاصر تھیں۔ دیوار کا سہارا لے کر اُس نے اندر بے سروسامانی میں پڑی بوریاں، کنستر، جھلنگا، چارپائی پر نظر ڈالی۔ ایک کلرک ٹین کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ سامنے پڑی لمبی میز پر ان گنت رجسٹر تھے۔

"فرمایئے میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟....." نوجوان نے پوچھا۔

"شاید اگر اُسے خبر ہو تو..... مجھے لینے آ جائے"

"کون لینے آ جائے بی بی؟....."

"شوکت مغل..... میرا بھائی..... شوکت مغل....."

نجم نے جلدی سے رجسٹر کھول کر قلم سنبھالا..... "آپ کا نام؟"
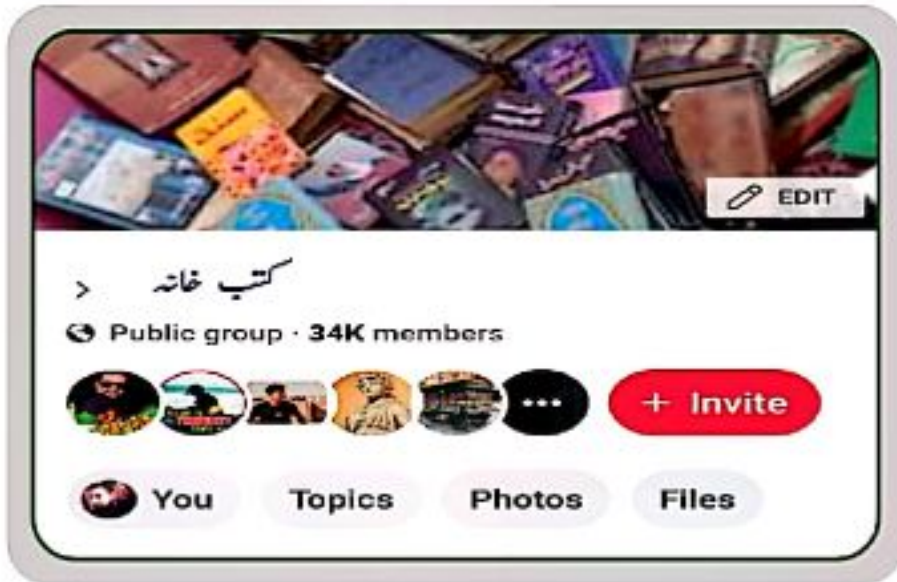
"راحیلہ.....راحیلہ مغل....."

"باپ کا نام....."

"ڈاکٹر سرفراز مغل....."

"آپ کس علاقے سے آئی ہیں راحیلہ ؟"

"گورداسپور سے.....سول لائنز.....ابراہیم لاج.....اگر آپ اناؤنسمنٹ کروا دیں پلیز....."

کچھ دیر بعد وہ عزم کر کے یہاں تک پہنچی تھی ورنہ اُس کا جی بُری طرح سے متلا رہا تھا۔ رینگتی رینگتی وہ اُس کمرے میں پہنچی جہاں آ کر چند مہاجرین نے قبضہ کر لیا تھا۔

وہ دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی پیٹ مسوستی ہوئی بولی....."ماسی.....پانی"

قریب بیٹھی عورت نے اُس کی رتی بھر پرواہ نہ کی اور اپنے بچوں کو اچار کے ساتھ روٹی کھلاتی رہی۔

ہندوستان سے وہ جس گروہ کے ساتھ تھی وہیں سے راحیلہ نے اس عورت کو ماسی کہنا شروع کر دیا تھا ماسی اس لڑکی کو اپنے ساتھ لینا نہ چاہتی تھی لیکن راستے میں باتیں کرنے اور وقت کٹی کے لیے اُس نے بھی راحیلہ کو قبول کر لیا تھا۔

"ماسی.....ماسی جی.....پانی....."

مالش کرتی طبیعت پر قابو پاتے ہوئے راحیلہ نے کہا اُسے لگتا تھا کہ اندر کچھ آٹے کی مشین چلنے کی کیفیت تھی پھر یکدم راحیلہ نے دیوار کے ساتھ دونوں ہاتھ لگائے اور قے کرنے لگی۔

"ہیضہ....."ایک آدمی چلایا۔

"ہیضہ ہیضہ....."

"کیمپ میں ہیضہ پھیل گیا ہے....."

"ڈاکٹر کو بلاؤ ہیضہ....."

ماسی اپنے بچوں کو دھکیلتی کمرے سے نکل گئی۔

ایک مونچھوں والا آدمی دفتر کی جانب ڈاکٹر کی تلاش میں چلا گیا۔ جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے باہر سے مٹی اڈ کرتے پر ڈالی.....کمرے میں اس وقت کوئی موجود نہ تھا.....نہ جانے وہ کتنے گھنٹے سوئی یا بے ہوش رہی جب اُس کی آنکھ کھلی تو شام کے دھندلکے گہرے ہو رہے تھے ٹوٹے ہوئے کواڑ اور کھلے دریچوں میں سے رات کی سیاہی دبے پاؤں اندر گھس رہی تھی.....یہ بلڈنگ کسی پرائمری سکول سے مشابہہ تھی۔ پلستر اُکھڑے ہوئے، دروازوں کے کواڑ غائب اور کنوئیں کا پانی متعفن تھا۔ شاید ان کمروں میں بچے مل مل کر آموختہ یاد کیا کرتے ہوں گے۔ دیواروں پر چارٹ، نقشے، بلیک بورڈ آویزاں ہوں۔ سٹول بنچیں ٹاٹ سب غائب تھے۔ اب دیواروں کے ساتھ بوریاں، کھیسوں میں لپٹے بستر، ٹوٹی چارپائیاں، ٹوٹے پھوٹے ٹرنک، ختہ سے تختے تھے۔ ان مردوزن چیزوں کے علاوہ وہ متفکر چہرے تھے جن پر قتل و غارت کی حکایت لکھی جا چکی تھی۔ وہ بچے تھے جو واقعات کے باوجود پُر اُمید معصومیت کے ساتھ اپنے میں مگن تھے اور وہ جوان صورتیں تھیں جو حالات کی کروٹ دیکھ کر پتھرا گئی تھیں۔

کمرہ اس وقت بھی خالی تھا۔

دالان میں کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھے چند دیہاتی اب بھی وقت واقعات کے اُلٹ پھیر پر زور و شور سے بحث کر رہے تھے۔ کسی عورت نے منڈیر سے اینٹیں اُکھاڑ کر دالان میں چولہا بنالیا تھا دھوئیں کے مرغولے میں چولہے کے اردگرد بیٹھے بچوں کے چہرے سنولا رہے تھے۔ کمرے میں صرف حبس ہی کار فرمانہ تھا بلکہ پسینے کی بو، اچار کی باس، باسی قے کی بساندھ، انسانی زخموں کے تعفن کے بھبکے اُٹھ رہے تھے کمرہ کسی غلیظ اصطبل کی مانند تھا۔ اس کمرے میں رہنے والے اس پچھلی غلاظت سے نا آشنا تھے وہ تو اس عافیت کو ماں کی آرام دہ آغوش سمجھتے تھے۔

راحیلہ..... کہیں بھاگ جانا چاہتی تھی۔

کہیں اور..... جہاں یہ بے سر و سامانی نہ ہو۔ جہاں یہ تعفن نہ ہو......

کوئی پوچھنے والا اُس کی کس مپرسی سمجھنے والا ہو۔

رات کافی جا چکی تھی۔ اب کیمپ میں چلت پھرت بھی بند ہو چکی تھی۔

راحیلہ نے کھڑکی کے باہر دیکھا دالان میں جلنے والی لالٹین پھاٹک سے باہر والے بجلی کے کھمبے کی روشنی سے گلے مل رہی تھی۔ نیند کے حصار میں آیا سپاہی ٹین کی کرسی پر بیٹھا کافی آگے کھسک گیا تھا۔ اُس کے چپکیلے پھسلتے چہرے سے تھکان، ظاہر تھی۔ راحیلہ کو لگ رہا تھا کہ وہ مر چکی ہے اور یہ دنیا سے ماوری کوئی اور جگہ ہو۔ اُس کا جسم اُس راحیلہ کا جسم نہ تھا جو پہلے ہوا کرتا ہے اس نے اپنے ہاتھوں کو ملا، وہ ٹھنڈے بے جان تھے۔ اُس کا سارا دھڑ پسینے میں شرابور تھا۔ پاؤں میں چیونٹیاں سی چل رہی تھیں اُس نے پہلے دوپٹے سے ماتھا پونچھا اور چارپائی کی طرف دیکھا ابھی صبح تو یہ کھاٹ موجود نہ تھی اب رسیوں کا بان اُس کی کمر میں چبھا جا رہا تھا اور سخت پٹی پر دیر تک منہ رکھنے کی وجہ سے اُس کے چہرے پر جا بجا لکیریں پڑ گئی تھیں جیسے سمندری لہریں ساحل کنارے اپنے نقش قدم ثبت کر گئی ہوں۔

اُسے کون کھاٹ پر ڈال گیا ؟

ماسی کہاں تھی.....؟

ماسی کون تھی ؟ اُس نے کونوائے کے سفری راستے میں اُسے اپنے بچوں کے ساتھ کیوں شامل کر لیا تھا ؟ وہ بڈھا کہاں تھا جو دادا ابا کی طرح بات کرنے سے پہلے مسکراتا تھا ؟..... یہ ساری خلقت کیا کسی بڑے پلان تلے اس Exodus پر مجبور تھی کہ کائنات والے کو پرواہ نہ تھی اور چیونٹیوں کی طرح وہ سارے کے سارے خود کردہ علاج میں پسے جا رہے تھے۔

راحیلہ کروٹ بدل کر کھڑکی کی جانب ہو گئی۔

اب سوال اُس کی ذات سے اُوپر اُٹھنے لگے۔

وہ دراصل کون تھی ؟

مجبوریاں انسان کو اس قدر خوفزدہ، مجبور اور بزدل کیوں بنا دیتی ہیں..... کیا انسان فقط اپنی بقاء کے ہاتھوں مجبور ہے؟ خدا کہاں تھا؟ کس سمت میں تھا ؟ کس کی طرف تھا ؟ کیا اُسے مجبور خوفزدہ بزدل لوگوں کی پرواہ تھی؟..... اسے

سے ان گنت سوال پوچھتے پوچھتے وہ اُونگھ گئی..... آنکھ کھلی تو رات کافی جا چکی تھی۔ باہر بجلی کے کھمبے تلے ایک سپاہی بندوق کندھے پر دھرے لوہے کی کرسی پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور بندوق ڈھلکی ہوئی تھی۔ اُس کے چکنے پھسلنے چہرے سے تکان ظاہر تھی۔ راحیلہ کو محسوس ہوا وہ مر چکی ہے۔ وہ اپنے جسم سے وراء کوئی شے ہو۔ کوئی ایسی شے جو جسم نہ رکھتی ہو۔ اُس نے اپنے ہاتھوں کو ملا۔ وہ بے جان تھے اُس کا اوپر والا دھڑ پسینے میں شرابور تھا۔ لیکن نچلے حصے میں چیونٹیاں سی چل رہی تھیں اُس نے دوپٹے سے منہ پونچھا اور کروٹ بدلی۔ کھاٹ کا کھردرا بان اُس کی کمر میں گھسا چلا جا رہا تھا۔ سخت پٹی پر منہ رکھ کر نیم بے ہوشی میں پڑے رہنے سے اُس کے رخسار پر ایسے نشان پڑ گئے تھے جیسے سمندری لہریں ساحل کنارے اپنے نقش ثبت کر گئی ہوں۔

اُس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ پرانی یادیں نئے واقعات آپس میں گڈمڈ تھے۔ اتنا کچھ اتنی جلدی بدل گیا تھا کہ اُسے سمجھ نہ آتی تھی..... کیوں کب کیسے وہ اس کمرے میں آ گئی..... یہاں سے اُسے کہاں جانا تھا؟

''ماسی.....ماسی''

نیم اندھیرے میں اُس کی آواز ڈوب گئی..... ماسی غالباً بیٹے کے خوف سے اپنے بچوں کو دھکیل کر کہیں اور چلی گئی تھی۔ کچھ دیہاتی مرد اور دو عورتیں بیٹھے کھسر پھسر کر رہے تھے جب کوئی حقے کا کش لگاتا چلم میں پھول چٹخنے لگتے۔

بڑی نقاہت سے اُس نے کہا..... ''پانی.....جی.....''

درمیانی عمر کی ایک عورت نے کہا..... اک ای آپے رڑ پڑ گئے اک دو جے لوکاں تمیاں وے سیاپے نئیں مکدے.....''

عورت کی چاندی کی بالیاں، سفید دانت اندھیرے میں چمکے اور پھر گم ہو گئے.....

ایک بوڑھا کانپتے ہاتھوں میں سلور کا کٹورہ لے کر راحیلہ کے پاس آیا..... ''بس کر بیٹا..... اتنا پانی پیئے گی تو پیٹ پھول جائے گا..... گھونٹ گھونٹ کر کے پی..... بیٹے میں اتنا پانی نہیں پیتے، اچھا!.....''

لیکن راحیلہ سارا پانی غٹاغٹ پی گئی۔ پھر پیاسی نظروں سے اُس نے کٹورے کی تہہ میں دیکھا اُس کا حلق خشک تھا۔ سارا بدن بخار میں پھنک رہا تھا اور اندر پیٹ میں کہیں آگ لگی تھی۔ بوڑھے بابے نے اُسے تیل ایسا بدذائقہ پانی دیا..... اُس کا جی چاہا کہ دمٹو میں خوب برف کوٹ کر اُسے پلائی جائے۔

لیکن برف کہاں تھی؟ دمٹو کہاں سے آئے؟

''باباجی ؟.....''

''ہاں بیٹا.....''

''باباجی.....''

''کہہ بیٹا ؟..... کیا بات ہے ؟''

کھمبے کے بلب کی روشنی، دالان میں پڑی لالٹین، چاندی کی مٹی مٹی روشنی... سب کمرے میں گھسنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس ملی جلی روشنی میں راحیلہ نے دیکھا کہ بوڑھے کی ان گنت جھریوں میں آہستہ آہستہ آنسو بہہ رہے تھے۔ اور اُس

کے اعضاء یوں کانپ رہے تھے گویا وہ ملیریا بخار کے نرغے میں آ گیا ہو.....

"بابا جی..... ماسی کہاں..... اُس نے تو کہا تھا کہ..... وہ مجھے نہیں چھوڑے گی....."

"ہاں..... انسان سمجھتا ہے کہ وہ نہیں چھوڑے گا..... پر چھوڑ دیتا ہے..... شاید اُسے کچھ رشتہ دار مل گئے ہوں ..... بیٹا کوئی کسی کا ساتھ کب تک دے سکتا ہے بھلا ؟ "

"لیکن سارا راستہ تو وہ..... میرا سر گود میں رکھے آئی تھی....."

"مجبوری..... بیٹا مجبوری..... مجبوری جانے کیا کچھ چھڑا دیتی ہے..... سو جا..... میں دفتر میں کہہ آیا ہوں صبح ڈاکٹر آئے گا..... سو جا....."

اس جواب کے ساتھ ہی بابا واپس کونے میں جا بیٹھا۔ اُس کی گالوں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں رخساروں کا گوشت جھریوں میں بدل گیا تھا۔ ان جھریوں میں ایک زمانہ سویا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عرصے کی ایسی یادداشتیں دفن تھیں جو اُسے بھی اب یاد نہ رہی تھیں وہ اپنے سوکھے چرخ گھٹنوں کے گرد بازو حمائل کئے آہستہ آہستہ آگے پیچھے مل رہا تھا۔ اُس کے لب لرز رہے تھے اور سپاٹ ماتھے پر ایک موٹی سلوٹ نمارگ اُبھر آئی تھی..... جوان بہو معصوم پوتے، دو بیٹے..... گرانڈیل بھائی سارے کے سارے اس سفر میں اُس سے بچھڑ گئے تھے یوں لگتا تھا جیسے بوڑھا اپنے آنسوؤں میں بہہ جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

سلاخیں لگی کھڑکی سے آنے والی روشنی میں اُس نے دیکھا ایک بوسیدہ کیلنڈر دیوار پر لٹک رہا تھا۔ اس کیلنڈر پر بھگوان کرشن کی تصویر تھی۔ پھر ٹھنڈی ہوا چلنے لگی، فرش پر لیٹی عورت نے کروٹ لی اور اُس کی ٹانگیں پنڈلیوں تک ننگی ہو گئیں۔ سونے والی کی بے خبری کا یہ عالم تھا کہ اُسے اپنے وجود کا احساس تک نہ تھا..... بادل کے ایک ٹکڑے نے چاند پر ہاتھ رکھ کر روشنی گل کر دی۔

یہ سب یکلخت اتنی جلدی کیسے ہوا.....؟

وہ اس کیمپ میں کب سے ہے.....؟

شاید ابھی آئی ہے شاید ازل سے تھی۔

وہ سول لائنز جس میں ساتھ ساتھ بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں حقیقت ہی نہ ہو..... مایا ہو، یہ کون سی جگہ ہے..... اُسے کالے پانی میں کس نے لادا.....؟....."

یکدم اُسے ماسی پر بہت غصہ آنے لگا۔ جب وہ ٹرک میں سوار ہوئی تھی تو اُس میں ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے والی ماسی نے اُسے یکدم گلے سے لگایا تھا۔ وہ بخار میں تپ رہی تھی۔ سارا راستہ ماسی نے اُس کا سر اپنی گود میں رکھا تھا۔ ماسی کا رنگ تپتے ہوئے کندن کا سا تھا اور اُس کی آنکھیں کرنجی تھیں۔ ماسی اس کی طرح سنہری بالوں والی اُس کی بچیاں اور بیٹا بھی گھبرے سانولے تھے۔ پتہ نہیں ٹرک کن راستوں سے یہاں پہنچا۔

وہ اس کیمپ میں کب سے تھی ؟

راستے کا سفر کیسے کب اور کتنی دیر میں طے ہوا؟

یہ مختلف قسم کے لوگ اس کس مپرسی کے عالم میں یہاں کیوں جمع تھے.....ان کے رشتہ دار کون تھے؟.....میں کون تھی ؟

کیا انسان اپنی انتہائی مجبوری میں تنہا ہے ؟

اُس نے ادھر اُدھر نظریں دوڑا کر خالی الذہن ہونا چاہا۔

وہ ٹکر ٹکر ہر شے کو دیکھے جا رہی تھی۔ اُس کے جھونجھ بال گندے کپڑے اُجڑی صورت دیکھ کر لگتا گویا وہ پاگل ہو۔ اُس کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ تھا۔ چہرے پر کسی قسم کے کرب کے نشان نہ تھے۔ اُس کے احساس پر ٹھمبر جم چکی تھی اور سارا وجود مجسم سوال بن کر ہر ایک سے اپنے متعلق استفسار کر رہا تھا.....

پتہ نہیں کچھ دنوں کی بات تھی۔

شاید ہفتہ بھر پہلے

یا شاید کچھ سال گزرے

اُن کا کونوائے ادھر پہنچا تھا ماسی نے جلدی سے پھسل پھسل کر ٹرک کے باہر اپنے بچوں کو اُتارا تھا۔ پھر راحیلہ کا بازو پکڑ کر اُسے بھی باہر گھسیٹا۔

لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ وہ یہاں کیوں اور کیسے آئے ہیں ٹرک واپس جا رہے تھے۔ واپس جانے کی تمام راہیں مسدود ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

ماسی وہیں نئی سرزمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی اور اپنے گاؤں کو یاد کر کے واویلا مچانے لگی۔ کئی پشتوں سے وہ اپنے گاؤں سے باہر نہ نکلی تھی۔ نئے حالات آشکارا ہونے سے پہلے وہ ان کے لیے تیار نہ تھی۔

''ہائے کوئی مجھے بھیج دے.....لوگو میرا سائیں مر گیا میں ان بچوں کو کیسے پالوں گی؟ میری زمین میں چاول کی کھیتیاں نسری کھڑی ہیں۔ ہائے ہائے کون ظالم اُن کو کاٹے گا.....میرا بڈھا باپ راستے میں رہ گیا.....کوئی جائے اُسے لائے.....''

وہ دو ہتڑ مار مار کر اپنا سینہ پیٹ رہی تھی۔ پھر ایک سپاہی جو دفتر کی طرف کھڑا تھا۔ ماسی کے پاس آیا اور گن کا بٹ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا..... ''چپ کر جا مائی نہیں تو سر توڑ دوں گا.....''

سب نارمل حالات سے بچھڑ کے نئے حالات سے دوچار ہو کر گڑبڑا گئے تھے۔

''اُٹھیں اُٹھیں ماسی جی.....اندر چلیں آئیں.....'' سپاہی کی خوفناک آنکھیں دیکھ کر راحیلہ، ماسی اور اُس کے بچوں کو ادھر کمرے میں دھکیل لائی تھی۔ ماسی کسی تحصیل دار کی بیوی تھی اور اُس نے بڑے اچھے دن دیکھے تھے اُس کے بالوں میں ابھی تک گوٹے کناری سے مڑھا موباف پڑا تھا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے راحیلہ نے پلٹ کر سپاہی کی طرف دیکھا اُس کا بڑا سا سر، وردی بھرے جسم پر آئس مین کی طرح ٹکا تھا۔ اور اُس کی بتیسی یوں کھلی تھی گویا کوئی کتا گوشت کو دیکھ کر غرانے لگے۔

راحیلہ نے اُن نگاہوں سے بچنے کے لیے سر جھکا اور کہنی ٹیک کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی اُسے مہندی کی رات

یاد آنے لگی.....اُس رات بھی ہوا میں کچھ تھا۔ چاند کے گرد روشنی کا ہالا بڑا ہو گیا تھا.....دادا ابا کا چہرہ اُن کی ڈاڑھی میں بہت خوفناک نظر آتا تھا.....جب چھرا جی غلام محمد اُسے ہاتھ سے کھینچتا باہر نکلا تو ساری ڈاڑھی خون میں بھیگی ہوئی تھی اور دادا ابا جو چوری چوری ڈاڑھی کو خوشبو لگایا کرتے تھے اپنے ہی خون میں ڈاڑھی رنگے بے سُدھ پڑے تھے۔ دادا ابراہیم بڑے حکیم تھے.....کسی نے اُنہیں قتل کر دیا تھا اور علاج کی مہلت بھی نہ دی تھی.....

رات کی تاریکی ویسے ہی رہی.....راحیلہ نے سوچا یہ سب خواب ہے۔

ابھی جب آنکھ کھلے گی تو سامنے دھولی دھار کا پہاڑ نظر آئے گا.....سریندر.....روی.....اوما.....بیوہ وہ سب آکھے اور جنگلی جیکے توڑنے جا رہے ہوں گے، جھاڑیوں پر سوت کے دانے پک کر گہرے کاسنی ہو چکے ہوں گے۔

پھر اُس کی نظر میں ایک نوجوان کا چہرہ گھوما جس کی کار میں غلام محمد نے اُسے دھکیل دیا۔

"کیمپ میں پہنچا دیں.....کیمپ"

راحیلہ کے دن اُس کے بعد سوتے جاگتے میں گزرے۔

ہوش اور بے ہوشی کے درمیان بھی کچھ ایسا فاصلہ نہ تھا۔

اُسے دیر تک تیز بخار میں پھنکنا پڑا۔ اُس بخار میں اُسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں ہے کون ہے؟

لیکن جب کونوائے پاکستان کی سرحد میں داخل ہوا تو یکدم اُس نے دیکھا ہر طرف سرخوشی تھی لوگ اونچے اونچے نعرے لگا رہے تھے....."پاکستان زندہ باد..... پاکستان زندہ باد....."

یکدم اُسے احساس ہوا تھا کہ لوگ اس سرزمین کو سجدے کر رہے ہیں۔ نفلیں پڑھ رہے ہیں۔ ان گنت جانوں کی قربانی دے کر جو لٹے پٹے یہاں آ گئے تھے، جن کا نہ ماضی رہا تھا نہ حال، وہ اپنی ذات کے تحفظ کے لیے ایک خواب سے وابستہ ہو گئے تھے۔ موت کے چنگل سے چھوٹتے ہی قافلوں میں زندگی دوڑنے پھرنے لگی تھی۔

کھڑکی سے اب ٹھنڈی ہوا آنے لگی اُس کے سارے کپڑے پسینے میں بھیگے ہوئے۔ اور وہ سخت بیمار انسان کی کابوسی نیند سوئے جا رہی تھی.....اُس کے خوابوں میں کانٹے چھچ بجنے لگے۔ پتلے فرانسیسی کانچ کے گلاسوں میں برف کی قاشیں تیرنے لگیں جیسے ایسٹمر ویم رنگین فلموں میں کبھی ذوحق کبھی سطح آب پر اُبھرتی ہو۔ پھر کانٹے مچھلیاں بن گئے.....کڑاہے سے نکلتی تلی ہوئی مچھلیاں، پیاز کے لچھے، املی کی چٹنی!.....ہری ہری دوب پر ابراہیم لاج میں دسترخوان بچھ گئے۔ کیلے کے پتوں پر پوریاں حلوہ.....چاندی کے طشتوں میں پلاؤ زردے.....

پھر کہیں سے تیز ہوا چلی زردے، پلاؤ، قاشوں سمیت گلاس قالینوں پر لوٹنے لگے۔ راحیلہ نے سارا اتھل پتھل کھانا حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر کیلے کے پتے ٹفن کریئر بن گئے۔ ان میں قیمے کے پراٹھے، کباب اور تلے ہوئے انڈے تھے۔ وہ ٹفن کریئر کھولنے کی سعی میں تھی۔ پر کوئی ڈھکنا نہ کھلا۔ ہر ٹفن کریئر ہنستا رہا۔ بچوں کے کارٹونوں کی طرح.....سب کے سب اُس کے دشمن تھے۔ کھلکھلاتے رہے، ہنستے رہے لیکن ٹس سے مس نہ ہوئے۔

اُس نے شدت کرب سے اپنے بال نوچ لئے۔

اُس کی کنپٹی کے قریب شدت کا درد اُٹھا۔ نچلا لب کاٹنے کے باعث لہو آلود تھا۔

اُس نے دو دن سے سوائے پانی کے اور کچھ نہ کھایا تھا۔ وہ خوابوں میں کھانوں کا ہی تعاقب کرتی رہتی۔ کمرے میں سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

اپنے سکڑے سے پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اُس نے اپنے آپ کو رونے سے بچایا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں مرچیں لگ رہی تھیں اور بخار پھر تیز تھا اور اُسے لگتا تھا جیسے وہ ایک عرصہ پانی کی تہہ میں رہی ہے۔

وہ یہاں کیوں لائی گئی؟..... کیسے پہنچائی گئی؟۔ کچھ بھی اچھی طرح واضح نہ تھا۔

بوڑھا اپنے گھٹنوں پر جھکا بیٹھا تھا۔

جب سے وہ والٹن کیمپ میں آئی تھی۔ یہ بوڑھا اُسے دیکھے بغیر اُس کی حفاظت کئے جا رہا تھا۔ کیمپ میں جا بجا خیراتی کھانا بٹ رہا تھا۔ لاہور والوں نے جی کھول کر منوں من روٹیاں، دیگیں بھیجی تھیں۔ کھانا مفت تقسیم ہو رہا تھا۔ لیکن راحیلہ ہاتھ آگے نہ بڑھا سکی۔ پھر جھریوں والے بوڑھے نے اپنی جھولی میں چاول لیے اور اُس کی طرف بڑھا دیئے..... وہ مٹھیاں بھر بھر کھاتی رہی حتیٰ کہ کھانے کی حاجت نہ رہی اور کمرے میں آ کر ٹاٹ پر ڈھیر ہو گئی۔

بابا اس جہاں میں مہمان سا نظر آتا تھا۔ اُس کی گردن زیادہ وقت ہلتی رہتی۔ آواز میں کرختگی تھی۔ ہاتھوں پر ناڑیں اُبھر آئی تھیں۔ ماسی جب سے بچوں کو لے کر بھاگ گئی تھی۔ بابا فاصلے پر بیٹھ کر غائب حاضر اُس کی نگرانی میں مشغول تھا۔ پھر وہ آہستہ سے اُٹھا اور اکڑوں اُس کے پاس بیٹھ کر دیر تک راحیلہ کو تکتا رہا۔ اپنے خشک پتھریلے ہاتھوں سے ماتھا چھوا اور بولا۔

"بک با بخار پھر تیز ہو گیا....."

وہ چپ چاپ اُدھر کو چلا آیا جدھر دفتر تھے اور بھونپو پر گمشدہ رشتہ داروں کی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ راحیلہ نے آنکھیں کھول کر بساند بھرے کمرے کا جائزہ لیا۔ اُسے دھوپ کی تیز روشنی بھی ناکافی لگی۔

ایک بچے نے اپنی ماں کا دامن کھینچ کر کہا..... "بے بے گھر چل ناں..... اپنے بیری والے گھر....."

ماں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور چھوٹے بچے کو دودھ پلانے لگی.....

"بے بے رانی ہمیں ڈھونڈتی ہو گی..... وہ تو ابھی ٹوبے سے واپس نہیں آئی تھی..... بے بے ہم اُسے ساتھ کیوں نہیں لائے، اُس نے کیا قصور کیا تھا بے بے..... وہ تو ایویں بولتی رہتی تھی بے بے۔"

"چپ کر جا..... اتنی باتیں نہیں کرتے دوسرے دیکھ رہے ہیں"

"بے بے لسی پیتی ہے میں نے..... اپنی بھوری بھینس کی لسی..... ہم گھر کیوں نہیں جاتے بے بے۔"

اس عورت سے کچھ ہٹ کر ایک پٹواری کا کنبہ بے آسرا پڑا تھا۔ بیوی کے سر پر نہ دوپٹہ تھا نہ پاؤں میں جوتی۔ کرتا جگہ جگہ سے جواب دے گیا تھا۔ اور اُس کی سنپولیے جیسی چمکدار جلد چمک رہی تھی۔ پٹواری کے کرم خوردہ دانتوں پر پان کے داغ پرانے زنگ کی طرح چپکے تھے ..... وہ شین قاف سے درست اردو میں رہتک کے میو کو اپنے احوال بتا رہا تھا.....

"بھائی صاحب ایک طوطا رہ گیا واللہ بڑا یاد آتا ہے..... قسم خدا کی وہ وہ باتیں کرتا تھا۔ وہ بے پر کی ہانکتا تھا کہ

افسردہ سے افسردہ طبیعت بھی بحال ہو جاتی..... جو یہاں ہوتا تو آدھا غم ہرن ہو جاتا۔''

رجنگ کے میو نے ہنکارا ابھرنے کے انداز میں سر ہلایا اور ہم خیالی میں بہتا ہوا بولا

''کیسے نہ یاد آوے اپنا طوطا بھائی صاحب..... اُدھر رجنگ ماں بکری تھی اپنی دونوں پاؤں کندھے پر رکھ دیوے پیارا ماں..... جرا جو بُرا لگے..... کبھی پوتے کو کندھے پر نہ بیٹھایا میں نے پر وہ بکری گوروں چڑھی ہووے سارا وقت ..... رات کو بھی پائنتی باندھا کروں..... جو کوئی ادھر اُدھر باندھے تو رات کو میمائے..... نہ سوئے نہ سونے دے..... جانے کس حال میں ہوگی..... ساتھ تو لائے نہیں۔''

بابا ہولے ہولے دفتر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کچھ سال پیچھے تو وہ ترنت ہی ہر جگہ پہنچ جاتا تھا لیکن اب اُسے ہر کام میں دیری ہو جاتی.....

نجم وین میں بیٹھا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے اُس نے اتنی ساری اناؤنسمنٹ کی تھی کہ گلا جواب دے گیا تھا۔

''ڈرائیور صاحب میں ذرا دفتر تک جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر آپ بھی ریسٹ کر لیں۔ پچھلی طرف سے چھلانگ لگا کر نجم دفتر کی جانب چلا۔ ڈرائیور نے کلچ پلیٹ دبائی تو گرج کی سی آواز آئی چھت پر لگا بڑا بھونپو ڈولا۔ ڈرائیور نے موڑ کاٹ کر وین سیدھی کی اور پھر ریڈیو کا سوئچ دبایا تو کسی کی آواز آئی..... ''او گورے گورے

او بانکے چھورے

کبھی میری گلی آیا

او گوری گوری او بانگی چھوری

چاہے روز بلایا کرو.....''

نجم نے دفتر کی جانب دیکھتے ہوئے سوچا..... پبلسٹی آفسر..... اونہہ پبلسٹی آفسر..... بھونپو کہیں تو اچھا.....!

سارا دن وہ دفتر سے وین..... اور وین سے دفتر کے چکر لگاتا رہتا۔ گمشدہ لوگوں کے حوالے..... شہر.......... ایک خلقت اپنی اپنی اناؤنسمنٹ کرانے آتی۔ وہ کل تین آدمی تھے۔ دو کلرک اور ایک وہ پبلسٹی آفسر..... اس کے علاوہ کچھ نفری Volunteers کی بھی آتی رہتی لیکن ایک جم غفیر کے لیے یہ چند لوگ ناکافی تھے..... وہ دفتر میں لوٹا تو ڈاکٹر قیصر اپنے سفید کوٹ اور سٹیتھسکوپ لٹکائے نظر آیا۔

''یار ان کتوں کا کچھ کرو..... پہلے چند ایک تھے اب تو غول کے غول ہو گئے ہیں''

''کبھی میرے ساتھ رات کو چلیں ان کی غراہٹ سے جان نکل جاتی ہے.....'' نجم بولا۔

قیصر نے فلسفیانہ انداز میں کہا..... ''بازاری اور نسل در نسل پیڈی گری کتے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ کسی صاحب کا نامی ہو تو چاق و چوبند کان اُٹھائے ساتھ ساتھ سر کشتی کو لٹکاتا ہے۔ اُس کی رفتار باوقار..... آنکھوں میں راہ گیروں کا لحاظ..... ہر حرکت میں رکھ رکھاؤ، بھونکے گا تو مالک کو مطلع کرنے کے لیے..... ایک ہم لوگ ہیں۔ کتا پال لیا تو روٹی میسر نہیں، اگر سیر پر لے جاؤ تو ہر راہ چلتے پر حملہ..... ہر جھاڑی سونگھ رہا ہے، ہر ہر ٹیلے پر ٹانگ اٹھا رہا ہے، اگر کسی منچلے نے

بیٹی بچاری تو یہ مالک بھول بھلا کر ساتھ ہولیا..... اس کیمپ کے کتے تو جناب مجم اور بھی خونخوار نظر آتے ہیں۔ یوں نہ ہو کسی وقت یہ آدمی خور ہوجائیں.....''

اس وقت بابا دفتر کی سیڑھیاں چڑھ کر بولا.....

''سرکار تکلیف نہ ہو تو میرے ساتھ چلئے مجھے لگتا ہے وہ مرنے والی ہے..... اتنا تیز بخار ہے اتنا پنڈا اچھک رہا ہے.....''

''بابا جی..... میرے دیکھنے سے کیا ہوگا..... دوائی کا انتظام کیسے ہوگا.....؟ ''

''جیسے اُس نے تیرا انتظام کر دیا ڈاکدار صاحب ویسے وہ دوائی کا بندوبست کر دے گا..... آپ جناب چلو تو سہی .....'' ہاتھ باندھ کر بابا کھڑا ہوگیا۔

''کہاں لے جا رہے ہو بابا جی ؟.....'' مجم نے اپنے دوست قیصر کو آنکھ مار کر پوچھا۔

'' سرکار..... ہیضہ لگتا ہے..... پانی پیتی ہے اور قے کرتی ہے..... پھر پانی پیتی ہے اور قے کرتی ہے۔ ہم دو چار بوڑھے ادھر رہ گئے ہیں۔ ورنہ تو سارے لوگ ہیضے کے ڈر سے بھاگ گئے.....''

ڈاکٹر قیصر نے اپنا بیگ اُٹھایا اور بابا کے ساتھ چلنے لگا۔

''یار اس کیمپ میں تو اتنی بیماری ہے اتنی بیماری ہے تم کس کس کو دیکھو گے یہ حکومتوں کے کام ہیں.....''

''بڑے کام ہمیشہ فرد کرتا ہے مجم..... یہ ملک ایک ایسے کمزور بیمار آدمی نے بنایا ہے کہ ملک بنانے کے بعد سال بھر زندہ نہ رہ سکا۔ وژن ایک کا ہوتا ہے تعبیر میں سب زندہ رہتے ہیں دیکھو.....''

''اکیلا چنا کیا بھاڑ جھونکے گا ڈاکٹر قیصر ؟.....'' مجم کی آواز قدرے دُور سے آئی۔

ڈاکٹر قیصر نے پلٹ کر اُسے جواب دیا.....'' مجم محاورے اچھے ہوتے ہیں۔ لوگوں کی وزڈم کا ثبوت ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ان کے برعکس بھی ہو جاتا ہے.....''

چلتے چلتے بابے نے کہا..... '' یہ بیگ آپ مجھے پکڑا دیں ڈاکدار صاحب.....''

''نہیں بابا جی آپ راستہ بتا دیں یہی کافی ہے.....''

'' پتہ نہیں وہ کون ہے ؟ بس ہم ایک ہی ٹرک میں آئے ہیں۔ میرا اُس کا رشتہ مرجانی تکلیف کا رشتہ ہے..... اُسے بھی ابھی تک کوئی لینے نہیں آیا..... مجھے بھی..... میرے پنڈ والوں نے تلاش نہیں کیا..... ایسے ہی روز قیامت ہوگا ڈاکدار صاحب نفسا نفسی..... نفسا نفسی..... آپا دھاپی.....''

بابا کے جانے کے بعد راحیلہ نے چارپائی کی پٹی سے سر اُٹھا کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ آب وتاب کے ساتھ سارے کمرے میں پھیلی تھی۔ اندر کوئی نہ تھا۔ اُس نے دل میں کسی پردے کی خواہش کی جو اس کھڑکی کی دھوپ روک دے..... ایسے ہی جب غلام محمد اُس کا بازو گھسیٹتا الحیر کی باڑ میں گھسیٹتا باہر نکلا تھا تو اُس نے خواہش کی تھی کہ ابراہیم لاج کے تو اسی ہی نہیں، مہندی لانے والی عورتیں اور شادی ہی نہیں..... ساری کائنات محفوظ رہے..... پھر غلام محمد نے پھاٹک کھول کر راحیلہ کو اندر دھکیل دیا۔ اس میں پچھلی سیٹ پر چند انجان عورتیں بچے دھنسے ہوئے تھے، ان میں ماسی

اور اُس کی سنہری بالوں والی لڑکیاں بھی تھیں..... اُس نے پلٹ کر ابراہیم لاج کو دیکھا جہاں سے چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہڑبونگ مچا تا۔ غم وغصہ کی آگ میں نعرے لگا تا ایک گروہ شامیانے اُکھاڑ پچھاڑ اندر داخل ہو رہا تھا۔

پھر بڑی دیر کے بعد اُس نے ٹرک چلانے والے کا چہرہ دیکھا..... مانوس اجنبی شرمیلا سا لڑکا.....وہ کون تھا جو عورتوں کو اجنبی کیمپ میں لے آیا۔ کاش وہ وہیں رہ جاتی..... وہاں جہاں مہندی کے تھال اُجڑ گئے تھے، اُس کا دولہا زانو پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا، لیکن اگر مگر اور کاش سے زندگی نہیں بنتی..... تخیل کی عمارتیں تعمیر کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ ماسی نے اُسے سہارا دے کر کیمپ کے اندر داخل کیا۔ اب یہاں سے وہ تنہا تھی بالکل تنہا.....

بابا اور ڈاکٹر آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے۔

راحیلہ نے بخار میں تپتی آنکھوں کو ذرا سا کھول کر ڈاکٹر پر نظر ڈالی۔ اُسے یہ چہرہ بڑا ہی مانوس لگا۔ ماتھے کی سلوٹیں، بالوں کا چھتہ دیکھا بھالا سا لگا، وہ دونوں بازو آگے بڑھا کر چیخی..... "شاہد..... شاہد..... خدا کے لیے مجھے بچالو شاہد میں مر رہی ہوں....."

یہ چیخ اتنی دلدوز تھی کہ قیصر نے راحیلہ کو کندھوں سے پکڑ کر تھپکی بھری آواز میں کہا

"آپ کو آرام کی ضرورت ہے پلیز لیٹ جائیں....."

راحیلہ کے سارے جسم میں ملیریا بخار کی کپکپاہٹ تھی وہ قیصر سے لپٹ کر بولی..... "میں..... کہاں ہوں شاہد ..... یہ سب لوگ کون ہیں؟....." پھر اُس نے آنکھ کی جھری سے دیکھ کر اجنبی قیصر سے لجاجت کے ساتھ کہا..... "معاف کیجئے..... میں آپ کو کوئی اور..... سمجھی تھی..... میں..... بڑی مجبور ہوں"

"جی کوئی ہرج نہیں..... میں ڈاکٹر قیصر ہوں..... آپ فکر نہ کریں..... میں وہی ہوں جس کا آپ نے نام لیا ....."

راحیلہ تفصیلات سے بچ کر قیصر کو بتاتی رہی، ابراہیم لاج کے متعلق..... اپنی مہندی اور شامیانوں کے بارے میں وہ بخار میں ہذیان بکنے والوں کی طرح اپنی باتیں کئے جاری تھی۔ پھر ایک گدے پر کچھ دیگیں اور روٹیاں آگئیں ..... بابا اُن دونوں کے پاس سے اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ لوگوں نے جھولیاں پسار پسار کر اپنا اپنا راشن سمیٹ لیا۔

راحیلہ نے ڈاکٹر قیصر کی طرف پیٹھ کر لی۔ اب اُسے پتہ چلا کہ جس سے وہ دیر تک بولتی رہی تھی وہ شاہد نہ تھا۔ ابراہیم لاج میں شادی مقرر ہونے سے پہلے کبھی کبھی رات گئے وہ ایک خواب دیکھا کرتی تھی۔ گہری رات اور ستاروں کی روشنی اس خواب کو اور بھی پُراسرار بنا دیتی۔ اُس کا جی چاہتا شاہد کہیں چلا جائے، کسی دُور دراز ملک کو روانہ ہو جائے، وہ اُس کی راہ دیکھتی دیکھتی تھک جائے..... لیکن ثابت قدم رہے، اُس کی گالوں پر چھائیاں پڑ جائیں اور بال برف ہو جائیں، وہ ہر روز پہاڑی کے سرے پر کھڑی شاہد کا انتظار کرتی رہے..... سامنے دھولی دھار پہاڑ برف پوش ہو..... مڑ کر دیکھے تو بیاس کا دریا چمکتی ریت میں ست رو بہتا چلا جائے۔ پھر اچانک ترائی کی جانب سے شاہد لوٹ آئے۔ اُس کی شیو بڑھی ہو ..... کپڑے پھٹے ہوں اور آنکھوں میں برسوں کی صعوبتیں سلگ رہی ہوں۔ وہ بھاگ کر شاہد سے لپٹ جائے..... اور بچوں کی طرح روئے..... یہ خواب اُسے تسنیم آپا نے عطا کیا تھا۔

تسنیم آپا کو اپنا آدرش بنانے کے بعد وہ وصل سے بھی زیادہ فراق کے خواب دیکھنے لگی تھی..... اس خواب کے کرب سے اُس کا سارا وجود جل جاتا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے..... پھر وہ تکیے کے گرد بازو حمائل کر دیتی..... اس خواب کے موسم بدلتے رہتے..... دور تک کہُر نظر آتی، کبھی بادلوں سے پُر، کبھی پھولوں سے لدی..... ساری خواہش دم توڑ چکی ہوگی اور پھر قوسِ قزح کی طرح شاہد آ نکلے گا۔ بارش کا پہلا چھینٹا..... روشنی کی پہلی کرن!

تسنیم باجی، ننکو، ساجدہ ماں..... اباجی..... دادا ابراہیم..... یہ لوگ بھی خواب کے آس پاس نہ آئے..... پھر وہ سوچتی، میں یہ ہندوستانی فلموں کے سین کیوں بناتی رہتی ہوں اپنے ذہن میں.....؟

ابھی لحہ بھر پہلے اُس نے اسی خواب کی تعبیر دیکھی تھی۔ ابھی خواب پورا ہوتا ہوتا رہ گیا تھا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچا یہ خواب نہیں تھا..... پیش گوئی تھی، شاہد سے بچھڑ جانے کا اُس نے وقت سے بہت پہلے اپنے لیے فراق کا وجدان حاصل کر لیا تھا۔ یکدم اُس نے پلٹ کر قیصر کی طرف دیکھا..... وہی رنگت وہی بال..... وہی آزردہ سی مسکراہٹ.....

راحیلہ نے قیصر کے زانو پر سر رکھ کر سسکی بھری.....

"اب مجھے نہ چھوڑ جانا..... میں..... تسنیم آپا نہیں ہوں..... میں یادوں کے سہارے نہیں جی سکتی..... شاہد..... مجھے اس جگہ نہ چھوڑ نا پلیز میں مر جاؤں گی....."

یرقان کے مریض جیسی زرد آنکھوں میں نا اُمیدی نے دیوانہ پن پیدا کر دیا تھا۔ اُس کے گہرے براؤن گندے بالوں میں مٹی اور پھوس لپٹا ہوا تھا۔ وہ قیصر کی جانب ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی زخمی کتا آخری بار اپنے پیٹنے والے کی طرف دیکھ رہا ہو۔ قیصر نے اُسے کندھوں سے پکڑ کر ہولے سے جھنجھوڑا اور بڑی تسلی دینے کے انداز میں کہا

"آپ ٹھیک ہو جائیں گی فکر نہ کریں....."

"ٹھیک..... وہ کیا ہوتا ہے..... ٹھیک..... اُس سے بچھڑ کر کوئی ٹھیک ہوا ہے کبھی؟"

قیصر نے غور سے راحیلہ کو دیکھا۔

وہ تو وہی تھی جس کو وہ برسوں سے جانتا تھا۔ تھوڑی سی ایوا گارڈنر..... کچھ کچھ مینا کماری..... کچھ کچھ وہ لڑکی جو اُس کے ساتھ ہاؤس جوب کیا کرتی تھی..... اس بیار لڑکی کی کس میری پر اُسے رونا آ گیا؟

کیا واقعی انسان حق و باطل کی جنگ کی شکار گاہ تھا۔

پیدائش سے موت تک احساسِ جرم، گہری تکلیف اور پھر اس صعوبت سے نکل جانے کا خواب ہمیشہ ساتھ کیوں رہتا تھا؟ قیصر نے سامنے کھلے دروازے سے ٹھاٹھیں مارتے بے سروپا لوگوں کے سمندر کو دیکھا..... ٹھیک کیا ہے اور غلط کیا؟ اس دیوانی سی لڑکی پر نگاہ ڈال کر اُس نے سوچا..... یہ تو کسی عمل کی پاداش میں یہاں تک نہیں پہنچی؟..... پھر جب یہ قصوروار ہی نہیں تو اس قدر کڑی سزا کیوں؟

یکدم قیصر کو خیال آیا کہ بہت سے ایسے سوال ہیں جن کے جوابات کے لیے زمان و مکاں سے گزر کر روزِ قیامت تک پہنچنا ہوگا۔ آدمی کا علم بھی ہے ضرور لیکن اتنا قلیل ہے کہ سارے سوالوں کا شافی جواب نہیں مل سکتا؟

اُس نے اپنے اندر ٹٹولا.....

کیا میں اس لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گیا ہوں۔

کیا میں دکھی انسانیت کے کرب میں گرفتار ہو کر مٹھی بھر کرب سینے سے لگانا چاہتا ہوں۔ جو کچھ میرے اندر ہے اُسے میں صاف صاف کیوں سمجھ نہیں سکتا ؟

میری اپنی نیت مجھ پر واشگاف کیوں نہیں ہوتی ؟

اُس نے بڑی بے چارگی سے راحیلہ کی نبض پر ہاتھ رکھا.....

پتہ نہیں وہ ایک دن تھا کہ وہ مہینہ تھا۔ وقت اُس سے بچھڑ چکا تھا۔

کیمپ میں ماسی نے اُسے گھنگناں دی تھیں۔ وہ ایک نوالے چبانے کے بعد اُس کا جی متلانے لگا وہ ننگے فرش پر ٹانگیں سکیڑ کر بیٹھ گئی اور ہاتھ میں پکڑے دانے بکھر گئے..... جنہیں سنہری بالوں والی لڑکیوں نے جلدی سے سمیٹ لیا۔ لیکن اُسے پرواہ نہ تھی۔ وہ تو چاہتی تھی کہ زندگی کے باقی ماہ و سال بھی اسی طرح بکھر جائیں۔

شام کو کیمپ کے آگے ٹرک جمع ہو رہے تھے۔ گھبرائے ہوئے ڈرائیور، اپنی بندوقوں کے باوجود پریشان اور خطرے میں نظر آتے تھے..... گورکھا سپاہی ایک دوسرے کو میلا تیلا کہہ کر اونچے اونچے ہدایات فائر کر رہے تھے لوگ بھاگ بھاگ کر کانوائے کی طرف بڑھنے لگے۔ بستر ٹرنک سرکنے لگے، بچے سارے میں دوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔

اُس نے پانی مانگنے کے لیے لب کھولے تو یکدم اُسے خیال آیا کہ پانی اب کہاں۔ کسی سر پھرے نے مخلوق کو ختم کرنے کے لیے کنوئیں میں زہر ملا دیا تھا..... گھڑے گھڑونچیاں خالی تھیں..... کربلا ایک بار پھر آزمانے کو وقت میں تلوار کی دھار بن کر گزر رہا تھا۔

پھر اُس نے باہر ٹرکوں کی آواز سنی اُسے بڑی پیاس لگی تھی۔

کیمپ میں کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ لوگ اپنی اپنی چیزیں کھول رہے تھے..... دو ایک سفید پوش بزرگ ایک بوری میں کچھ چمکدار چیزیں جمع کر رہے تھے۔

''بھائیو اپنی رضا سے ہتھیار دے دو ورنہ کوئی تمہیں کانوائے میں نہیں لے جائے گا..... تلاشی ہوئی کوئی ہتھیار ملا تو گولی سے مار دیں گے..... یہاں ڈال دیں..... بوری میں.....''

تیشے..... کلہاڑیاں، چاقو..... بوری میں گرتے ہوئے حفاظت کے ہتھیار چھنا کے کے ساتھ احتجاج کر رہے تھے۔

بستر بند کھلنے لگے۔

عورتیں اپنے کپڑوں سے چاقو برآمد کرنے لگیں۔

یہاں اُسے ایک بڈھے بابے کی شکل نظر آئی۔

''بی بی.....؟ .....''

''جی بابا جی.....''

''بیٹا اگر کوئی ہتھیار ہے تو مجھے دیدے..... ابھی گورکھا ملٹری تلاشی لینے والی ہے اگر کسی کے پاس کوئی ہتھیار نکلا

تو وہ سید ھا جیل بھیج دیں گے..... جلدی کر کوئی چاقو چھری....''

اسی وقت راحیلہ کو بے ہوشی کا پہلا دورہ پڑا.....

اس کے بعد اُسے کچھ یاد نہ تھا کب کسی نے اُسے ٹرک میں پھینک دیا کب قافلہ روانہ ہوا۔ راہ میں جب اُس کی آنکھ کھلی تو اُس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔

بابا فضل کھلے دالان میں کھانا لے کر پہنچا تو راحیلہ نیم بے ہوش تھی اُس کے سارے جسم پر اگست کی دھوپ پڑ رہی تھی۔

'' لو بیٹا جی میں کھانا لے آیا ''

ڈاکٹر قیصر نے ایک نوجوان کو آواز دی راحیلہ کی چار پائی اُٹھا کر چھاؤں میں ڈالی اور پھر اُس کا معائنہ شروع کیا۔

پتہ نہیں یہ لڑکی کب سے اگست کی دھوپ میں پڑی اپنے بچھڑے ہوؤں کو یاد کر رہی تھی۔

'' تے کب سے گی ہے بابا جی.....؟ ''

'' کئی دن ہو گئے جی..... بار بار بے ہوش ہو جاتی ہے پھر گھنٹوں اسے ہوش نہیں آتا ''

'' آپ کی بیٹی ہے .....؟ ''

بابا نے نفی میں سر ہلایا.....'' پر اب تو..... اصلی رشتے نہیں رہے ڈاکٹر صاحب..... اب نئے وطنی رشتے دار ہیں۔ نیا رشتہ نکل آیا ہے سب کا..... بیٹی ہی سمجھیں..... آپ ''

ڈاکٹر قیصر نے بلڈ پریشر چیک کیا۔ آنکھوں کی پتلیاں اُلٹا کر دیکھیں۔ تھرمامیٹر لگا کر بخار کا اندازہ کیا۔ اس کو نیل سی لڑکی کا نڈھال جسم، پتھرائی براؤن آنکھیں، نیلے ہوتے ہونٹ دیکھ کر پہلی بار قیصر نے دل میں سوچا۔ مرتی عورت میں بھی بڑی کشش ہوتی ہے..... مرد کے اندر کچھ جگا دیتی ہے۔ اُسے بیدار کر کے کفالت پر آمادہ کر دیتی ہے..... اُسے یقین تھا کہ یہ لڑکی صرف چند گھنٹوں کی مہمان ہے..... پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ یہ لڑکی اُس کے گھر میں مرے کہیں اپنے جیسوں سے اُس کے کندھے کو سہارا ملے.....

'' کیا آپ میرے ساتھ چل سکتے ہیں ؟.....''

'' میں ؟.....''

'' میرے گھر چلیں..... آپ دونوں..... آپ اور آپ کی بیٹی..... وہاں ان کو آرام ملے گا، شاید یہ بچ جائے! شاید والی بات ہے.....'' قیصر نے کہا۔

بوڑھے کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اُس کے لیے کسی گھر کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ اس بے ہوش نیم مردہ لڑکی کے لیے کوئی اچھا بستر..... کھانا..... آرام مل سکتا ہے.....''

'' لیکن آپ اتنی تکلیف کیوں کر رہے ہیں ؟.....''

'' ایک نئے ملک کے نئے رشتے ہیں باباجی..... انصار اور مہاجر کے رشتے..... یہ خوابوں کی بستی ہے، یہاں

امکانات بھر.....انسان کی رگوں میں بہنے والی نیکی کی قدرتی سرحدوں تک ہم اپنے ideals کو پالیں گے....."

بوڑھا کچھ بھی نہ پایا۔

"آپ میرا انتظار کیجئے میں کار لے کر آتا ہوں....."

بابے نے راحیلہ کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کہا۔

" ڈاکٹر صاحب دیر نہ کرنا..... بابے قائداعظم نے ایک ہی بھلا کام کیا.....جلدی کی.....ایک نسل کی قربانی دے کر آنے والی جانے کتنی نسلوں کو بچالیا۔ بابے قائداعظم کی طرح جلدی کرنا.....

پتہ نہیں کیوں قیصر اس دھان پان سی بیمار لڑکی کو گھر لے جانے پر اچانک آمادہ ہو گیا۔ اُس نے نجم سے مشورہ کرنا چاہا لیکن نجم ایک بار پھر وین سے گمشدہ رشتہ داروں کی اناؤنسمنٹیں کرنے میں مصروف تھا۔ جب بھی اناؤنسمنٹ ہوتی لوگ دیوانے سے ہو جاتے۔ انہیں لگتا اب بچھڑے رفیق مل جانے کا یقینی امکان ہے۔ اس کھلبلی میں آواز ڈوب ڈوب جاتی ٹھیک سے پتہ بھی نہ چلتا کہ کس کا کون مل گیا ہے.....لیکن کبھی کان ادھر متوجہ ہو جاتے راحیلہ کہنی کے بل تنی.....شاید شوکت مغل؟.....اُسے لگا کہ بھونپو پر آواز آئی....." شوکت مغل اپنے خاندان کے افراد کی تلاش میں آئے ہیں۔ دفتر میں رابطہ کریں ڈاکٹر سرفراز.....ساجدہ ماں.....راحیلہ.....شوکت مغل صاحب آئے ہیں....."

چارپائی سے راحیلہ نے اترنا چاہا لیکن بے ہوشی نے اُسے قیصر کے بازوؤں میں اُتار دیا۔ قیصر کار کو سامنے لے آیا تھا۔ اُس نے باباجی کی مدد سے راحیلہ کو پولے پولے کار کی پچھلی سیٹ پر نیم دراز کیا ابھی تک اُسے معلوم نہ تھا کہ وہ راحیلہ کو کیوں اور کتنی دیر کے لیے اپنے گھر لے جا رہا تھا؟۔

ان قافلوں کو دیکھ دیکھ کر ڈاکٹر قیصر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ساری انسانی ہسٹری میں یہ بات انتہائی اہم تھی کہ انسان عموماً مجبور محض ہے اور کبھی کبھی اس مجبوری سے اُبھر کر مختار کل بھی بن جاتا ہے۔ اتنے لوگ جو انبوہ کثیر کی شکل میں یہاں پہنچے تھے، ان کی مجبوری کہیں اور طرف سے لکھی لکھائی آئی تھی

کار اندرون شہر کی جانب رواں تھی۔

قیصر سوچ رہا تھا کہ اُس نے اس لڑکی اور بابے کو کیمپ سے یوں اغواء کر کے اچھا نہیں کیا۔ پھر اُسے یہ بھی یقین تھا کہ نجم اس سلسلے میں اُس کی مدد ضرور کرے گا.....اس وقت تک اُس کی صرف ایک آرزو تھی کہ لڑکی بچ جائے، اُس نے یہ سوچا بھی نہ تھا کہ کسی ایک فیصلے سے کئی اور فیصلے خود بخود ہو جایا کرتے ہیں۔ دو دن بعد وہ اور نجم بڑی رات گئے کیمپ سے گھر پہنچے۔ دور تک کتوں نے قیصر کی کار کا تعاقب کیا تھا۔ قیصر اپنے دوست کو راحیلہ کے متعلق بتانا چاہتا تھا اور ساتھ ہی کچھ بتانے کے لیے سرا نہ مل رہا تھا۔ گلی کی اینٹیں ہلکی بارش میں بھیگی ہوئی تھیں۔ نجم اور قیصر دبے پاؤں گلی میں جا رہے تھے۔ پھر بھی اُن کے بوٹوں کا شور ہولے ہولے ٹکا ٹک پیدا کر رہا تھا۔

" یہ کب کا واقعہ ہے؟....." نجم نے سوال کیا

" دو دن ہوئے میں کل دوپہر کے وقت لڑکی اور بابے کو گھر لے آیا تھا۔" اُس نے تیراک کی طرح اونچے مقام

سے چھلانگ لگا دی۔

"تو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟ میں تو رات دو بجے کیمپ سے گھر لوٹا تھا....."

"بہت تلاش کیا یار لیکن تم ملے نہیں....." ڈاکٹر قیصر نے کہا۔

" یار ویسے تو تم نے اچھا ہی کیا۔ کسی اچھے گھر کی لڑکی لگتی ہے لیکن یار خانہ پُری کی بھی ضرورت ہوتی ہے ناں .....اس لڑکی کا اندراج ہو چکا ہے ہمارے کھاتے میں۔ وہاں کیا لکھوں ؟ اسے کون لے گیا..... بھائی؟ چاچا؟ شوہر؟ "

"جو مرضی ہے لکھ دو.....جونہی لڑکی ٹھیک ہو جائے گی میں اسے واپس کیمپ میں چھوڑ جاؤں گا "

"ڈاکٹر یار لیکن تم اُسے اپنے پاس رکھو گے کیسے؟ محلے والے کیا کہیں گے..... کس حیثیت میں ؟ نہ ماں نہ ماسی .....تیرے گھر پر اس ٹوٹی پھوٹی نوکرانی کے علاوہ اور ہے کون ؟....."

"جو مرضی ہے کہیں.....مجھے ان باتوں سے کیا لینا ہے، میری نیت صاف ہونی چاہیے....."

"یار قیصر ایک بات بتاؤں یہ کبھی کبھی برائی سے نیکی اور نیکی سے برائی کیوں جنم لیتی ہے؟۔ یہ کیسا چکر ہے..... انسان ایک ہی دائرے کا سفر کیوں اختیار نہیں کر سکتا ؟.....اب تم اتنی بڑی نیکی کر رہے ہو.....لیکن تمہیں اس کے بدلے میں بڑی بدنامی بھی مل سکتی ہے.....تمہاری پریکٹس پر اس کا بُرا اثر بھی پڑ سکتا ہے.....لوگ کچھ اور بھی سمجھ سکتے ہیں "

"مثلاً کیا ؟....."

" تمہارے گھر والے گاؤں میں رہتے ہیں۔ تم خود بھی ابھی تک چھڑے ہو.....گلی میں رہنے والے تنگ کمروں میں قید.....آپس میں جڑی دیواروں کے باسی جو کانوں سے سنتے نہیں اور زبان سے اختراع کرنے لگتے ہیں....."

"کیا اختراع کریں گے ؟....."

" اکیلا گھر.....ایک بوڑھی نوکرانی .....تنہائی .....کیمپ سے لائی ہوئی نوجوان لڑکی .....اُس کا بوڑھا باپ .....قریب المرگ حالت .....بے سروسامانی ..... بدی کے بغیر کہانی میں حسن پیدا نہیں ہوتا۔ تم بھی عجیب احمق انسان ہو .....جب تک ڈرامہ نہ ہو ہیرو بھی نہیں بنتا..... باکس آفس پر ہٹ ہونے والی فلم اور ہوتی ہے آرٹ مووی اور چیز..... باکس آفس پر گاندھی ہٹ ہوتا ہے.....قائداعظم کی نیکی کو کوئی سمجھتا ہے، کوئی انجانے میں خلاف ہو جاتا ہے.....کوئی سمجھ بوجھ کر .....جہاں ڈرامہ نہ ہو وہاں مزہ نہیں آتا یار....."

" یہ ساری بکواس ہے نجم .....عمل کا تعلق نیت سے ہے.....اگر میرا عمل بُرا ہے لیکن نیت اچھی ہے تو میرے بُرے عمل کو بھی نیکی کے کھاتے میں ڈالنا چاہیے....."

" یہ کام اوپر والا کر سکتا ہے.....ہم پاپی لوگ نیت کو کب دیکھ سکتے ہیں۔ لڑکی کو ذرا سی صحت آ جائے تو واپس کیمپ لے آنا کون جانے اُس کے وارثین کب آ جائیں۔ " نجم نے کہا۔

"اگر بچ گئی تو....."

اس کے بعد دونوں خاموشی سے گلی کی پھسلنی اینٹوں پر قدم جماتے اپنی اپنی سوچ میں گم چلتے رہے۔ پہلی بار قیصر کو احساس ہوا کہ شاید اُس نے راحیلہ کو بچانے کی خاطر گھر لا کر ہمیشہ کی طرح ایک پنگا ہی لیا ہے۔

چلتے چلتے یک دم نجم رُک گیا۔ وہ کسی سوچ کو قابو میں لانا چاہتا تھا۔

" یہ نیت ..... یہ نیت آخر کیا چیز ہے ..... آج جمعے کے خطبے میں مولوی صاحب زور وشور سے نیت پر واعظ کر رہے تھے ....."

" نیت ہر تبدیلی کی سمت ہے "

" لیکن میں سمجھتا ہوں کہ خواہش تبدیلی کا باعث ہوتی ہے ..... اگر خواہش پیدا نہ ہو تو آدمی صدیوں ایک سے جمود میں پتھر بن کر وقت گزار سکتا ہے ..... خواہش Catalyst ہے "

قیصر نے چند لمحے گلی کی پھسلن پر نظر ڈالی پھر بولا ..... " تبدیلی خواہش ہی سے جنم لیتی ہے لیکن جب تک نیت کا یقین نہ ہو ..... تبدیلی کی سمت متعین نہیں ہوتی۔ منفی اور مثبت سمتیں نیت کے اندر موجود ہوتی ہیں "

" بات کچھ اتنی واضح نہیں ہوئی قیصر ....."

قیصر رُک گیا ..... " مثال کے طور پر اگر کوئی شخص گڑھا کھودے۔ پہلی بات ہے خواہش گڑھا کھودنے کی دوسری بات ہے نیت کی۔ جس وقت وہ گڑھا کھود رہا تھا تو کیا اُس کی نیت تھی کہ اُس کا پڑوسی اس میں گر جائے ؟ یہ منفی نیت ہے ..... یا پھر اُس کا Motivational force تھا کہ گلی میں رُکا ہوا پانی گڑھے میں جمع ہو جائے اور لوگ خشک راستے سے آ میں جا ئیں ..... ایک ہی کام کے لیے خواہش تو شائد ایک ہو لیکن نیت منفی بھی ہو سکتی ہے اور مثبت بھی ....."

" اچھا اب یہ بتاؤ کہ تم راحیلہ کو کس نیت سے یہاں لائے ہو ..... ؟ "

" فی الحال میری صرف اتنی نیت ہے کہ وہ تندرست ہو جائے ..... اور میں اُسے واپس چھوڑ آؤں ....."

" اور اگر ..... اگر بالفرض اُس نے واپس جانے سے انکار کر دیا تو ؟ ....."

ڈاکٹر قیصر چند منٹوں کے لیے چپ ہو گیا۔

" اتنی دُور تک تو میں نے سوچا ہی نہیں۔"

" سوچنا چاہیے تھا ناں ..... یہی تو اہم بات تھی ..... کچھ دیر بعد ..... ایک اجنبی لڑکی ..... وہ ..... اُس کا بھی تو کوئی ردِعمل ہوگا ناں ، ساری بات تم تک تو ختم نہیں ہو جاتی ..... ایک پارٹی وہ بھی ہے جس سے تم نے مشورہ ہی نہیں کیا ....."

یکدم جیسے قیصر کو سانپ سونگھ گیا۔

" پھر اب ؟ ..... اب کیا کریں ؟ ....."

نجم نے کوئی جواب نہ دیا اور ذرا تیز ہو کر ڈاکٹر قیصر سے آگے چلنے لگا۔

وہ سوچ رہا تھا .....

کہیں کسی انگریزی کتاب میں اُس نے پڑھا تھا کہ ہوا آکسیجن اور کاربن کا مجموعہ ہے یہ ہوا یوں ہی جامد رہ سکتی ہے ..... لیکن جوں ہی اس میں ہائیڈروجن ملتی ہے تو تبدیلی آتی ہے پانی کا قطرہ بنتا ہے اب اس قطرے میں کئی امکانات ہیں۔ اس میں زہر ملا کر بھی پلایا جا سکتا ہے اور اس میں کسی مرتے آدمی کو دوا ملا کر بھی دی جا سکتی ہے۔ جب تک تیسرا عنصر شامل نہ ہو کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی ..... قیامت تک ایک ہی صورت رہا جا سکتا ہے ..... لیکن تیسرا عنصر ملتے

ہی جامد مانع بن جاتا ہے۔

عمر کی تبدیلی

خواہش کی تبدیلی

رابطوں کی تبدیلی

سب نیت بدلنے کا موجب ہو سکتی ہیں۔

اپنی چابی سے بڑا پھاٹک کھول کر قیصر اور نجم دالان میں داخل ہوئے۔ایک نالی پھلانگ کر پانچ سیڑھیاں چڑھ کر وہ بڑے پھاٹک تک پہنچے تھے۔

" یہ گھر ہے ؟....تو گھر والا ہے ؟.....بیوقوف جہاں کوئی بھی تیرا انتظار نہیں کرتا وہ گھر کیسا ہو جب یہ تو فقط حویلی ہے۔"

دونوں صحن پار کر کے باورچی خانے تک پہنچے..... باورچی خانے کے جالی دار دروازے کے پاس ایک آوارہ بلی بیٹھی تھی۔شور سن کر وہ اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بھاگنے لگی۔ پھر نہ جانے اُسے کیا سوجھی، واپس آ کر وہ قیصر کے پیروں سے لگ کر غرانے لگی..... بوڑھی زینب چوکی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ اُس کی سفید پشم جیسی رنگت، سفید بال دیکھ کر برفانی ریچھ یاد آنے لگتا۔

" کیا پکایا ہے زینو.....؟ "

"ڈاکٹر صاحب آپ تو کچھ بتا کر نہیں گئے تھے۔ بی بی سے اُدھار لے کر دال پکائی ہے "

"چلو اچھا..... بی بی کو یخنی پلا دی تھی..... "

"بی بی کو بھی یخنی پلائی ہے اور بابے کو بھی..... وہ بھی مانگتا تھا "

" چلو بھئی آج تم نے دوپہر کو بھی دال کھائی تھی اس وقت بھی دال ہی سہی..... اماں زینو کھانا لگا دو..... بڑی بھوک لگی ہے..... "

" ابھی لائی ڈاکٹر صاحب ابھی..... وہ بی بی کی تو تے ابھی تک نہیں رُکی جی..... "

قیصر منزل ایک پرانی حویلی تھی جس کے باسی شائد ہندوستان یا لندن چلے گئے تھے۔ قیصر نے اسے نیلامی میں خریدا تھا۔ اس گھر کی فضا جامد تھی۔ نجم کو لندن کا ایک پرانا محل یاد آ گیا جس میں زائرین میں سے جو داخل ہوتا اُس کے آنسو نکل آتے چاہے وہ ذہنی فلاسفر ٹائپ ہوتا، چاہے حساس تخلیق کار..... آنسو سب کے نکل آتے۔ قیصر منزل کو دیکھ کر نجم کا بھی یہی ردِعمل تھا، اس کی تنہائی دیکھ کر اُس کے بھی آنسو نکل پڑے۔

قیصر اور نجم دونوں بائیں جانب چلے گئے۔ قیصر کے بیڈروم کا بڑا سا لکڑی کا دروازہ بند تھا۔ قیصر نے اس کا تالا کھولا اور دونوں دوست اندر چلے گئے۔ اندر کی بتی جلائی تو پرانی وضع کا ایک کمرہ روشن ہو گیا۔ یہ خواب گاہ کافی کشادہ تھی۔

کمرے کے وسط میں سرخ رنگ کا ایرانی قالین تھا۔ دروازے کے سامنے لمبی دیوار کے آگے ایک بڑا سا نواڑی پلنگ تھا۔ جس کی سیاہ شیشم کی لکڑی اور شیشے جڑی پشت ظاہر کرتی تھی کہ اس کی بنوائی پر خاصی لاگت آئی ہوگی۔

لمبی دیوار پر پلنگ سے ہٹ کر کئی کھونٹیاں تھیں جن پر قمیصیں، ٹائیاں پینٹ بے ترتیب لٹک رہی تھیں۔ پلنگ پر دھوبی سے آئے کپڑے تھیں، چادریں گڈمڈ تھیں غسلخانے کی جانب جو خوبصورت ڈریسنگ ٹیبل تھا۔ اس پر صبح کی شو کا سامان ابھی لدا تھا۔ مگ میں شیو کا پانی صابن سمیت پڑا تھا۔ ریزر پر جھاگ جم کر سوکھ چکی تھی۔ کنگھی میں بال تھے جن کا کوئی کوئی تار سفید تھا۔ الماری کے دونوں پٹ ویسے ہی کھلے تھے جیسے صبح قیصر چھوڑ گیا تھا۔ ہر چیز بے ترتیب تھی۔ دیواروں پر دھول اور جالے تھے۔ کمرے کی بے ترتیبی دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ اسے کسی دیکھ ریکھ کرنے والے کی اشد ضرورت ہے.....

"قیصر.....؟" نجم بولا

"جناب....."

"اس گھر کو کسی عورت کی ضرورت ہے۔"

"ہے تو سہی اماں زینو ....."

"اتنی بوڑھی عورت تو اپنے جوگی نہیں تمہارا کیا سنوار سکتی ہے ؟"

"اماں تو حویلیاں سے آ نہیں سکتیں.....؟" قیصر نے لجاجت سے کہا۔

"پھر کوئی ہمت والی جوان ملازمہ ہی رکھ لو ....."

"کوئی ایسی عورت ملتی نہیں....."

نجم نے دل میں سوچا کہ جب راحیلہ کو پتہ چلا کہ قیصر یوں تن تنہا رہتا ہے تو کیا وہ بھی بھاگ نہیں جائے گی ؟۔

ایک چھوٹے سے فیصلے نے بڑے مسئلے کو جنم دے دیا تھا۔ ہاتھ دھونے کے لیے قیصر غسلخانے کی طرف بڑھا۔ سنک کے اوپر دیوار میں لگے شیشے پر نگاہیں ڈالیں۔ تو اس کا وجود آئینے میں جم کر رہ گیا۔ صبح شیو کرتے وقت اس کی بائیں گال پر ریزر سے چھوٹا سا زخم پڑ گیا تھا۔ پھر اس زخم سے رینگ کر اس کی نگاہ بالوں پر گئی۔ دونوں کنپٹی پر سفید بال بیلوں کی طرح اوپر چڑھ رہے تھے۔ چہرے پر دس برس پہلے والی شگفتگی نہ تھی۔ کندھے بھی خمیدہ ہونے پر مائل تھے۔

وہ اپنی ہی شبیہ سے گھبرا کر باہر آ گیا۔

"میں بوڑھا ہو گیا ہوں یار نجم..... یہ دیکھ..... میرے بال سفیدی مائل"

نجم نے اپنی گول گول آنکھیں گھما کر پوچھا "بھلا وہ کیسے؟"

"وقت کے ساتھ بہہ کر..... بھلا اور کیسے....."

نجم نے بنکھا تل سیٹ چھوڑ دیا تھا اور اس کی آواز میں قیصر اونچا بولنے پر مجبور تھا۔

"میں سوچتا ہوں کہ زندگی کو امارت کے ترازو میں تولنا ٹھیک نہیں..... جینے کے لیے کچھ اور بھی چاہیے..... میں نے تو مر مر کر یہ قیصر منزل خریدی..... ساری خوشیوں کو بائی پاس کر کے "

نجم نے ایک لمبی سانس لی اور پلنگ پر اپنے لیے جگہ بنا کر لیٹ گیا..... "تم ٹھیک ہی کہتے ہو قیصر..... جینے کے لیے..... خوشی سے جینے کے لیے ایک ایسی تیسری چیز بھی چاہیے جس کا اقرار تم اور میں دونوں کرتے ڈرتے ہیں "

"یہ آج تمہیں کیا ہو گیا.....؟ " قیصر نے کہا۔

" اس گھر سے آج پہلی بار نسوانیت کی خوشبو آ رہی ہے..... یوں لگتا ہے..... جیسے رُکے ہوئے گھر میں ہوا چلنے لگی ہو۔"

" یہ آثار اچھے نہیں ہوتے..... احساسِ شکست نہیں ہونا چاہیے خاص کر بے نام سا۔"

اس وقت اماں زینو..... ٹرے میں کھانا پروسے اندر آئی۔ اُس نے ڈریسنگ ٹیبل پر جگہ بنا کر ٹرے رکھ دی اور اپنے آپ سے باتیں کرتی لوٹ گئی۔

قیصر کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ اکہرے بدن کا تیز رفتار آدمی تھا اُسے دیکھ کر اُس کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اُس کی آبدار تلوار اُس کی گفتگو تھی۔ اُس کا پروفیشنل تجربہ، مشاہدہ، باریک بینی اُس کی گفتار میں یوں ڈھلتی جیسے کسی کمہار کے ہاتھوں میں چکنی مٹی ! وہ نگاہیں جھکا کر رُکتا سوچتا باتیں نہ کرتا بلکہ سامع کی نگاہوں میں گہرا دیکھتے ہوئے مخاطب کا جائزہ لیتا۔ اُسے اپنا نکتہ نظر سمجھاتا، ٹٹولتا اور پھر اُس کے متعلق ایک رائے قائم کر لیتا۔ لیکن یوں بے محابا دیکھتے ہوئے بھی اُس کی آنکھوں میں کبھی بے باکی کی لہروں نے جنم نہ لیا۔ کبھی اُن میں تمسخر یا طنز کی کرنیں نہ پھوٹی تھیں۔

قیصر کا قد بمشکل پانچ فٹ آٹھ انچ تھا لیکن اُس کی شخصیت ہی ایسی رعب داب والی تھی کہ قد آور مردوں میں بھی وہ ممتاز نظر آتا اور اُس کی بات حکم کا درجہ رکھتی۔ سر کے بال اب پیچھے سے ذرا کم نظر آ رہے تھے ماتھے کے کونے اوپر کو چڑھ رہے تھے لیکن وہ کسی طور پر بھی گنجا نہ لگتا تھا۔ ناک کے نتھنے تنگ اور ہونٹ نیچے کو جھکی ہوئی تھی۔ لگتا وہ اپنی اندر کی بات کسی سے نہیں کرتا۔ جب بھی مریض کی حالت خراب ہوتی اور تیماردار اُسے تنگ کرتے تو یہی نتھنے از خود لرزنے لگتے اور مونچھوں کی جڑوں میں پسینے کے قطرے جمع ہو جاتے.....

قیصر عمر میں بڑھ رہا تھا اُس کے تجربے اور عمر نے مل کر اُسے زندگی کو سمجھنے میں تو بڑی مدد دی لیکن فیصلے وہ ابھی تک لاابالی انداز میں کسی وقتی قوت محرکہ کے تحت کیا کرتا۔ اور بہت بعد میں اپنی نیت کو ٹٹولتا رہتا۔ حویلیاں کے قریب ہی اُس کا چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اُس کی ذہانت دیکھ کر والدین نے اُسے لاہور کے سب سے بڑے کالج میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ وہ بھی سال بہ سال پالا مارتا پاس ہوتا ترنت ڈاکٹر بن گیا تھا۔ پھر وہ اسی کالج میں ترقی کرتا رجسٹرار بن گیا اور شام کو اندرون شہر ایک چھوٹا سا کلینک بھی بنا لیا..... نجم کی دوستی میں آ کر اب وہ کیمپ میں بھی دوسرے تیسرے چکر لگاتا۔ مفت دوائیاں تقسیم کرتا پٹیاں باندھتا تسلیاں دیتا۔ اُس کی مصروفیات رفتہ رفتہ یوں بڑھیں کہ اُسے علم ہی نہ ہو سکا کہ وہ کب چالیس کے لگ بھگ ہو گیا.....

حویلیاں کوئی بھولی بسری جگہ تھی۔ شروع میں والدین نے اصرار کیا کہ وہ شادی کا جھنجھٹ پال لے لیکن وہ شادی کے لیے تیار نہ تھا۔ کہیں اندر ہی اندر وہ قائداعظم کو اپنائے بیٹھا تھا وہ سمجھنے لگا تھا کہ ذاتی خوشی ایک حصار ہے جو لوگ

ذاتی خوشی کے قلعے میں محصور ہو جاتے ہیں اُن کے لیے بڑے کام کی گنجائش نہیں رہتی۔ وہ چھوٹے چھوٹے دائروں میں تو چکر لگا سکتے ہیں کسی رتن بائی کی زندگی میں تو خوشی لا سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کے قائد نہیں بن سکتے..... پاکستان نہیں بنا سکتے۔ مہاتما بدھ یشودھرا کو تو خوش کر سکتے تھے لیکن..... گھر سے قدم باہر ڈال کر ہی وہ نروان کا نسخہ حاصل کر سکتے تھے ..... اُسے رات کو جب بھی وقت ملتا وہ بڑے لوگوں کی آپ بیتیاں پڑھتا رہتا۔

آئین سٹائین..... نیوٹن..... سقراط..... گاندھی..... جناح..... یہ ایک اور مخلوق تھی۔ اُنہوں نے ذاتی خوشی کا باغیچہ مقفل کر دیا تھا اور لوگوں کے منظر لامتناہی کر دیے تھے۔ ویسے بھی قیصر پچھلے بیس سال سے اپنی نیس مسلم لیگ کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہ آدرشوں سے منسلک، آدرشوں سے محبت کی زندگی تھی۔ ایک خواب کے حصول اور حصول کے بعد اُس کی پرورش کا خواب تھا..... وہ اسی خواب کے پیچھے بھاگتا بھاگتا چالیس برس کا ہو گیا تھا۔

نجم سے اس کی واقفیت کیمپ میں بڑھی۔ ویسے تو کبھی کبھی گلی میں اُن دونوں کی مڈھ بھیڑ ہو جاتی تھی لیکن دوستی نہ ہوئی تھی۔ نجم کیمپ میں ایک کھوکھوں سے بنے Cell میں سارا دن بسر کرتا تھا۔ یہاں اُس کے پاس ایک مائیکروفون پن اور نیلی فون تھا۔ وہ سارا دن گم شدہ رشتہ داروں کے پتے نام مائیکروفون پر سناتا رہ جاتا۔ شروع میں گلا رندھ جاتا تو منہ میں گولی ڈال لیتا۔ فون پر اُسے خبریں ملتی رہتیں۔ اور وہ یہ خبریں پڑھ کر سناتا رہتا۔

قیصر کچھ ایسی باقاعدگی سے کیمپ نہیں جاتا تھا لیکن پھر نجم کی شخصیت نے اُسے گرویدہ کر لیا۔ وہ بڑا ذہین اور پڑھا لکھا تھا۔ اس دوستی کے باعث قیصر باقاعدگی سے کیمپ جانے لگا۔

اب اُس کے پاس دوست کم ہو گئے تھے۔ دوستوں کے لیے اُس کے پاس وقت ہی نہ تھا۔ کبھی کبھی لگتا کہ وہ بڑی مدت سے اپنے آپ کو بھی مل نہیں پایا۔ ذاتی غم و خوشی دونوں حلقوں سے نکل کر وہ ایک مشینی سی زندگی میں ڈبکیاں لگا رہا تھا۔ جس میں سے ابھی کچھ دیر پہلے پل بھر کے لیے اُس نے اپنے سفید بال دیکھ لیے تھے.....

وہ دونوں قالین پر درمیان میں ٹرے دھرے ٹھنڈا کھانا کھانے لگے۔ سارا محلہ قبرستان کی طرح خاموش تھا۔ بلی پھر کہیں سے سرکتی رینگتی اُن کے ارد گرد منڈلانے لگی نجم نے ایک بوٹی دروازے سے باہر پھینکی تو لپک کر بلی ادھر بھاگی..... نجم نے کلبلاتے ہوئے کہا..... " بس میرا جی چاہتا ہے کسی دن بھابھی کو اٹھا کر لے جاؤں..... کسی پہاڑی علاقے میں..... کسی اندھیری گھپا کے اندر..... اُسے کسی چٹان سے باندھ دوں اور بندھی ہوئی رسی میں پھولوں کی مالائیں پرو دوں ..... وہ کہیں نہ جا سکے..... کسی اور کو دیکھ نہ سکے..... پھر اُس کے پیر چوموں..... وہ دیوی میں پجاری۔ میں اُسے جنگلی پھل کھلاؤں..... اُسے گرم کرنے کے لیے الاؤ جلاؤں..... اُسے خوش کرنے کے لیے بہار گاؤں..... اور اگر وہ پھر بھی نہ مانے ..... تو پھر میں اُسے ماروں..... اتنا پیٹوں..... اتنی اذیت دوں کہ اُس کا ذہن ماؤف ہو جائے۔ اس پر ماضی کی یادیں حرام ہو جائیں اور..... صرف اُس کا جسم رہ جائے..... صرف جسم..... "

" بہترین جگہ سیف الملوک ہو گی وہاں پہلے بھی ایسا تجربہ ہو چکا..... شہزادہ گلفام کو پری اُٹھا کر وہیں لے گئی تھی..... "

" پھر..... پھر.....؟ "

'' پھر پری کو بالآخر شہزادہ وگلفام رہا کرتا پڑا..... انسانی جسم کو قید کیا جا سکتا ہے مجم لیکن روح اپنی مرضی سے قید ہو سکتی ہے..... زبردستی روح پر نہیں چلتی یہ خود مختار ہے '' ڈاکٹر قیصر نے دہی چکھتے ہوئے کہا۔

'' میں مکمل طور پر اُس کی محبت میں غرق ہو چکا ہوں '' مجم نے کہا '' اور تم جیسے لٹھ سرے میری محبت کو سمجھتے نہیں..... ویسے بھی میں نے دیکھا ہے یہ ڈاکٹر لوگ بڑے Callous سرد مہر ہوتے ہیں ''

'' یہ محبت نہیں ماس خورہ ہے..... کبھی کبھی سرجری کرنی پڑتی ہے ایسے حالات میں..... ''

مجم نے پانی کا لمبا گھونٹ پیا پھر انگلی اُٹھا کر بولا..... میں خطرناک محبت کو ہی محبت سمجھتا ہوں۔ تم جیسے لوگ شفقت برتتے ہو مہربانی چاہتے ہو..... ان باتوں سے کام نہیں چلتا..... آج تک کبھی نہیں چلا..... گرمیوں میں نلکے کا پانی ہے شیر گرم..... نیم ٹھنڈا..... پیاس نہیں بجھتی ایسے پانی سے..... میں کسی دن..... اچانک اُس پر برفانی ریچھ کی طرح حملہ کروں گا..... پھر اُسے اتنا ماروں گا..... اتنا..... کہ اُس کا ذہن جامد ہو جائے..... جو کچھ بچے گا میرا ہو گا..... خدا بھی اُس میں شریک نہ ہو گا۔

ایک آنسو ٹپ سے مجم کی آنکھ سے گر کر گلاس کے پانی میں شامل ہو گیا۔

'' تم اسے زندگی سمجھتے ہو..... یہ گھر ہے قیصر؟ اب یہاں اگر ہماری بھابھی ہوتی تو اور بات تھی ! یہ تو ایک نالائق قسم کا ہوٹل ہے..... ''

قیصر ہولے سے بولا..... '' یہاں اگر تمہاری بھابھی آج ہوتی تو پھر بھی یہ ہوٹل ہوتا..... جہاں کوئی عورت اکیلی مالک بن کر رہتی ہے وہ جگہ ہوٹل بن جاتی ہے..... وقت پر گھر آؤ..... وقت پر کھاؤ..... وقت پر سو جاؤ..... آزادی..... اختیار..... مفقود !..... قرار عنقا..... سکون ناپید..... بس اصول و قواعد۔ میں ذاتی خوشی کے لیے روح کو قید نہیں کر سکتا مجم میں خواب دیکھتا ہوں..... بڑے خواب ''

'' تم مسلم لیگ Incarnate ہو..... تم نے قائد اعظم کے کریئر کو اتنا Follow کیا ہے کہ اب تم ایک Fake پجاری بن گئے ہو..... جو کرتا تو سب کچھ وہی ہے جو پجاری کرتے ہیں۔ لیکن اندر سے کھوکھلا ہوتا..... ہے..... ارے تم سے تو تمہارے قائد اعظم اچھے ایک بار رتی بائی سے محبت تو کی..... دارجیلنگ تو جا کر رہے دو ماہ..... پیرس کے نرسنگ ہوم میں وہی کچھ کھایا جو رتن بائی کھاتی تھیں..... گھڑ سواری تو کرتے رہے..... تم جیسے کاٹھ کے گھوڑے کا کیا کام خوابوں سے..... خواب دیکھنے والے ایسے ہوتے ہیں تمہارے جیسے لوہے کے..... چابی سے چلنے والے گھوڑے۔ ''

مجم کے علاوہ قیصر کا کوئی دوست نہ تھا۔ یا اُس کے پاس اس قدر وقت ہی نہ تھا کہ وہ کسی کے قریب ہو جاتا یا اُسے قریب آنے دیتا۔ پتہ نہیں سفید بالوں کی یورش تھی کہ مجم کی باتوں کا اثر تھا۔ وہ اندر سے زندگی Revise کرنے پر مجبور ہو گیا۔

ایم اے پاس ناٹے جسم اور تیکھے نقوش کا مجم سانولا تو ضرور تھا لیکن اُس میں بڑی کشش تھی۔ وہ کبھی اپنی ناک کو سیدھے سبھاؤ پکڑنے کا عادی نہ تھا۔ ہر بات میں گرہ ڈال لیتا۔ کسی مسئلے میں اگر گانٹھیں نہ ہوتیں وہ مسئلہ اُسے متاثر نہ کر سکتا۔

نجم مشکل پسند اور اذیت طلب ہی نہ تھا بلکہ اگر اُسے یہ احساس ہو جاتا کہ کوئی اُس کے لیے آسانیاں پیدا کر رہا ہے تو آسانیاں پیش کرنے والے سے اُسے نفرت ہو جاتی۔ اُس نے جب بھی محبت کی ایسی عورت کو چنا جو اُسے دھتکارتی اور احمق بنانے والی ہو۔ اگر خدانخواستہ رابطے کے دوران وہ مائل ہی ہو گئی تو پھر نجم نے کبھی اُس راہ گزر کی سار ہی نہ لی۔ اُس کی طبیعت میں پیچ در پیچ ایسے اُلجھاؤ تھے جو اُس کے گندے گھونگھریالے بالوں سے کہیں زیادہ گنجلک تھے۔ کبھی کبھی اُس پر مذہب حاوی ہو جاتا۔ پھر وہ گھنٹوں عبادات میں مشغول رہتا۔ روزے رکھتا، سجدے کرتا، گناہوں کی تلافی کے لیے مزاروں پر حاضری دیتا۔ کنوئیں میں اُلٹا لٹکنے کے منصوبے بناتا۔ جب احساس گناہ کی معیاد بھگت چکتا تو نشے میں ڈھت کیمپ کے کتوں کی معیت میں راتیں گزارتا۔ کبھی بن ٹھن کر نوکری کو نکلتا اور کبھی جواریوں کی محفل میں ڈوب کر اُبھرتا۔ پارے کی طرح کبھی کبھی سارے لاہور کی کنسوئی لیتا پھرتا اور کبھی نور جہاں کے مقبرے میں معتکف ہو جاتا۔ قیصر سے اُس کی دوستی بھی ایک طرح کا ذہنی تجربہ تھی۔ وہ قیصر کی بھلائیوں کو بہت قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ گماں رکھتا تھا کہ ایسا اچھا انسان کتابی وجود تو رکھتا ہے لیکن گوشت پوست کی صورت میں اس بُت کی قسمت میں بھی بالآخر شکست و ریخت ہی ہو گی۔

پتہ نہیں کیوں کیمپ کی اس مختصر دوستی نے نجم کے اندر ایک انفعال کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ وہ بھی اب اپنے پنڈولم کو درمیان میں ساکت کرنا چاہتا تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ قیصر کی صحبت اُسے کسی نئی وابستگی سے آشنا نہ کر دے..... انسانیت سے وابستگی کسی ٹھہرے ہوئے آدرش سے وابستگی وہ اندر ہی اندر سب سے زیادہ اسلام سے خوفزدہ تھا۔ وہ خوفزدہ تھا کہ کہیں چلتا چلتا وہ مولوی نہ بن جائے..... لمبی چھگی ڈاڑھی ٹخنوں سے اُونچا پاجامہ..... بات بات پر کسی آیت کی تلاوت..... ہر خوشی سے نفرت..... ہر لمحہ راہب بننے کی خواہش۔ اپنے لیے اس انجام کا تصور بھی اُسے بوکھلا دیتا۔

نجم نے دل میں سوچا شاید میں بوڑھا ہو رہا ہوں اس کیمپ میں اناؤنسمنٹ کر کر کے میری سیماب پائی ختم ہو رہی ہے۔ غم و غصے کا ایک سیلاب اُسے اندر باہر گھیرے رکھتا.....شاید مجھے سکون کی تلاش نے گھیر لیا ہے۔ شاید کوئی بڑی تبدیلی مجھے مار گرائے گی..... میں زیادہ دیر جی نہ سکوں گا.....

"کتنے پریشان کن حالات ہیں آج کل.....خدا جانے کہاں کہاں کی مٹی جمع ہو رہی ہے یہاں....." قیصر نے آہستہ سے کہا۔

"ہوں....." نجم نے بمشکل تمام کہا۔

"کیسے کیسے لوگ.....کیا کیا صورتیں.....کتنے انمول رتن....."

"کوئی رتن وتن نہیں.....کوئی صورت نہیں.....تیری بھی کوئی صورت ہے لیکن مقدر ہاتھ کی لکیریں.....راج کرتا ہے راج.....ایویں فلسفی نہ بنا کر.....سب اوپر والے کے کام ہیں"

"ہاں ہاں کچھ وہ بھی.....کبھی کبھی خیال آتا ہے زندگی کی بائی کلاس جو ہے آج کل اس کی سمجھ بوجھ کے بڑے طریق نکل آئے ہیں۔ لیکن بڑی سے بڑی جیت میں کہیں نہ کہیں ہار کا پہلو قائم رہتا ہے۔ اس میدان میں بڑی جی داری کی ضرورت ہوتی ہے..... میں نے ہمیشہ اپنے بازوؤں پر تکیہ کیا، بڑے لوگوں کی Biographies پڑھیں اور اپنی زندگی

کوان کی نیچ پر ڈھالا...... ہمیشہ اپنی رائے کو صائب سمجھا..... تمہیں معلوم ہے قائداعظم کے والد جناح بھائی کہا کرتے تھے ...... بیٹا سیکھنے کے دو طریقے ہیں یا تو وہی کرو جو تمہارے والدین تمہیں بتاتے ہیں۔ حرف حرف اُن کی مانو..... یا پھر اپنے فیصلے پر اعتماد کرو مکمل اعتماد اپنے تجربے سے سیکھو....."

"اور تمہارے قائداعظم نے کیسے سیکھا.....؟" مجم نے سوال کیا۔

"اپنے تجربے سے..... اپنے تجربے سے سیکھنے والا کبھی کسی پر الزام نہیں دھرتا..... میں اپنے ماں باپ کا مطیع ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ایک بار حویلیاں چھوڑ آیا تو بس..... میں نے ڈاکٹری پڑھی، گولڈ میڈل لیا...... ہاؤس جوب، نوکری ...... کلینک سب کچھ میں نے اپنے اوپر بھروسہ کر کے حاصل کیا..... کسی کی سیڑھی لگا کر اوپر چڑھنا میرے مسلک میں ہی نہ تھا۔"

"کمال ہے....."

وہ دونوں کافی پی رہے تھے اور اچانک ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔

"ماں میرا بیاہ کرنا چاہتی تھی۔ میں زبردستی کی شادی نہیں کر سکتا..... میں ہر کام میں آزاد انتخاب کا قائل ہوں۔ قدرت نے آزادی کا جو خمیر ہم میں رکھا ہے وہ ہمیں اپنے اعمال اپنے افعال کا ذمہ دار بناتا ہے..... دوسروں کی ماننے والے دراصل اپنے کئے کی ذمہ داری نہیں اُٹھانا چاہتے۔ اپنے قول و فعل کی ذمہ داری اُٹھانے والا ہی بالآخر اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق ہے....." قیصر نے پھر گہری سوچ میں جا کر کہا۔

"بالکل بالکل..... عین عین..... یہی کچھ میں بھی کہا کرتا تھا۔ لیکن حضرت اگر تمہاری نظرِ انتخاب مجھ بدنصیب کی طرح اپنی ہی بھابھی پر جا پڑتی تو..... تو..... تو میاں جی..... پھر یہ ساری باتیں تمہارا احساسِ گناہ..... احساسِ جرم نہ دھو سکتیں ..... اب تو قیصر..... بڑا بنا پھرتا ہے فلسفی پھر آنے والی کے بھاؤ کا پتہ چلتا..... یہ سارے مقدر کے کھیل ہیں۔ ان ریکھاؤں کے کرتب ہیں..... کامیابی، سید حارات، نیکی..... سب قسمت کا چکر ہے، جناب کا مقدر اچھا نہ ہوتا تو بڑے تابعدار بن کر واپس گاؤں چلے جاتے، وہیں بیاہ کر لیتے جہاں ماں باپ کہتے اور پھر اُسی لڑکی کے پاؤں پر ماتھا رگڑتے..... کامیابی کیا حاصل کر لی..... سارے زمانے کے اصول مرتب کر لیے..... جا بے! اونہہ" مجم نے جل کر کہا۔

دونوں خوش دلی سے ہنس دیے۔

بلی دبے پاؤں واپس آئی اور پلنگ پر چڑھ کر نیچے جانے لگی۔

"یار بڑا ہی بُرا حال ہے کیمپوں میں..... سارا دن سانس لینے کا وقت بھی نہیں ملتا..... بچھڑے لوگوں کا ایک سیلاب ہے، میں کہاں تک ان کا دُکھ سمیٹ کروں....."

"صبح سے شام تک ہم بھی مارے مارے پھرتے ہیں مجم" قیصر نے لجاجت سے کہا..... "کبھی ہسپتال، کبھی کیمپ ..... کبھی کلینک....."

"اور ہزاروں ہو رلاتے ہو..... ڈاکٹر"

"اپنا اپنا مقدر..... اپنی اپنی قسمت....." اُس نے ہنس کر کہا۔

وہ دونوں چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گئے۔ نجم کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن ہچکچا رہا تھا۔

قیصر کچھ بتانا چاہ رہا تھا لیکن خاموش تھا......

''کسی کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی ہے وہ......'' نجم بولا۔

''ہاں......''

''شائد شادی شدہ ہو......اپنے شوہر سے بچھڑی ہو تازہ تازہ......'' نجم نے گہری نظر ڈال کر اندازہ لگایا۔

قیصر کو ہلکا سا رنج پہنچا...... '' شائد شادی شدہ ہو......''

'' کیسے کیسے انمول رتن......کیسے کیسے'' کہنے کو قیصر نے کہا۔

''قلم انمول گھڑی تو میں تجھے دکھلاتا ہوں اس وقت میرے پاس دس روپے ہیں......لیکن انمول رتن تو تیرے پاس ہے......'' نجم نے شرارت سے کہا۔

''زرا بکواس ہے تو بھی......''

'' بکواس نہ کروں تو دل پھٹ جائے......یار یہ جو تو کیمپ والوں کو چیک کاٹ کاٹ کر دیتا ہے تو مجھے کیوں نہیں پال لیتا......مجھے سارا مہینہ کام کرنے کے بعد کل ڈھائی سو روپیہ ملتا ہے۔ ڈیڑھ سو اماں لے لیتی ہے......لا یار پچاس روپے میری ہتھیلی پر بھی رکھ......''

''نہیں......بالکل نہیں'' قیصر نے وثوق سے کہا۔

''کمال ڈھٹائی سے کہہ دیا نہیں......اچھا ادھار سہی......قسم خدا کی اگلی تنخواہ پر......لے لینا ''

''تیرا حساب اتنا طویل ہے کہ مجھے بھی یاد نہیں کل کتنی رقم ہے اچھا بھلا یہ پچاس روپے کیوں درکار ہیں ؟''

لمبی سانس لے کر نجم نے ٹانگیں پھیلا دیں...... '' یار......بس وجہ کوئی نہیں......تمہارے لئے شائد اہم بھی نہ ہو......مگر میری زندگی اجیرن ہو گئی......میں تو درست طریقے سے آج اتنا وسمٹیں بھی نہیں کر سکا......''

''ہوا کیا آخر ؟......''

''بھائی وسیم مری جا رہے ہیں۔ میں بھی جانا چاہتا ہوں ساتھ......''

'' الو کہیں کا......گدھا......یوں بھابھی کا پیچھا کرتا پھرے گا تو وہ وسیم بھائی سے شکایت کر دے گی۔ پھر ساری عمر کا جھنجھٹ چھٹا......تمہاری ولر بابھابھی تم سے متنفر ہو جائے گی۔''

''متنفر؟......'' نجم جلال میں آ گیا...... ''متنفر ؟ او وہ بھائی ہابیل قابیل کا قصہ کچھ ایسا پرانا نہیں ہے قیصر......'' نجم نے آنکھیں سکوڑ کر اپنے آپ سے گویا کہا...... '' میں اُسے جان سے مار ڈالوں گا......اُس کی آنکھیں میرے ہاتھوں کی گرفت میں باہر اُبل پڑیں گی......اور پھر بھابھی عقیلہ میری بانہوں میں مرنے لگے گی......میں اُسے بھگا کر کسی ایسی جگہ لے جاؤں گا جہاں خانہ بدوش بستے ہوں گے۔ اُسے ہیروں کے سردار کی طرح رکھوں گا، ہر روز اُسے ماروں گا......اتنا اتنا کہ بھائی وسیم اُس کے دماغ سے نکل جائیں گے، جیسے عامل لوگ بھوت نکالتے ہیں......پھر وہ تنہا رہ جائے گی......بالکل تنہا ......اور عقیلہ کا جو کچھ باقی بچے گا میرا ہو گا صرف میرا......''

"ایک تو مہاجرین کا ساتھ..... دوسرے کیمپ کی نوکری..... تیسرے یہ بھابھی صاحب کا عشق..... تیرا تو دماغ خراب ہو گیا ہے نجم....."

یکدم نجم نوٹ لے بیٹے کی طرح بیٹھ گیا..... "اماں بھی یہی کہتی ہے..... وہ صرف بھائی وسیم کی ماں ہے۔"
لمبی سانس لے کر اُس نے اپنے آپ کو قالین پر گرا دیا۔
"یہاں حبس ہو رہا ہے، اوپر چلیں۔" قیصر بولا۔
"نہیں..... جب میں چلا گیا تو پھر تم اوپر چلے جانا....."
"اس وقت کہاں جائے گا..... یہیں سو رہ....."
"نہیں..... اب یہاں ہوا میں کسی..... عورت کی خوشبو ہے....."
"تم نہیں جانتے یہ لڑکی کس قدر بھابھی آمنہ سے ملتی ہے..... یہاں میں خطرہ محسوس کر رہا ہوں اپنے لیے....."
لحظہ بھر کو قیصر کے لیے یہ مماثلت تکلیف کا باعث بن گئی۔
"ابھی جب میں تمہاری سائیکل لے کر جاؤں گا اور وسیم بھائی کے گھر کے پاس سے گزروں گا تو سائیکل سے اُتر کر میں چھت کی طرف دیکھوں گا، وہ..... وہاں سوتی ہے اوپر والے کوٹھے پر، اُس کا گھڑا گھڑونچی پر نظر آتا ہے..... میں اسی تمنا میں کھڑا رہوں گا کہ شاید اُسے پیاس لگے..... وہ اُٹھے اور گھڑے سے کٹورے میں پانی نکالے..... لیکن اُسے بھی پیاس نہیں لگتی قیصر..... کئی بار میں گھنٹوں کھڑا رہتا ہوں..... تم سمجھ نہیں سکتے قیصر..... یہ راحیلہ کو گھر لا کر تم نے اچھا نہیں کیا ..... ایسی صورتوں سے سوائے انتشار کے کبھی کسی کو کچھ نہیں ملا..... پھر بڑے وقفے کے بعد بولا.....
"راحیلہ کو دیکھ کر دل میں عجیب سی خواہش جاگی۔ میرا جی چاہا کہ اس لڑکی کو کسی درخت کے ساتھ باندھ کر اتنے ہنٹر ماروں کہ وہ بے دم ہو جائے اُس کی زبان باہر نکل آئے اور اُس کے تن پر زیبرے کی سی لکیریں پڑ جائیں..... اور اور....."

یکدم قیصر نے لپک کر اُس کا کالر پکڑا اور چنگھاڑا..... "بک نہیں کتے....."
نجم نے ایک لمحہ قیصر کی نگاہوں میں اپنی بے بسی بھری نظریں ڈال کر کہا ..... "تو کیا تمہارا دل بھی یہی کچھ کرنے کو چاہتا ہے؟"۔
قیصر کے ہاتھ سے کالر چھوٹ گیا اور اُس نے بڑی لجاجت سے کہا..... "نہیں..... نہیں..... میں تو چاہتا ہوں..... وہ زندہ رہے..... سہولت کے ساتھ، جانے کن آنکھوں کا چراغ ہے..... اُن تک پہنچ جائے اور ..... صحت مند ہو جائے اور اپنے گھر چلی جائے۔"
"اگر تمہیں بھی اپنی بھابھی سے محبت ہوتی..... وحشی، خطرناک، مایوس محبت۔ جس میں کرب کے ساتھ ساتھ صرف مایوسی ہی مایوسی ہوتی تو تم بھی میری طرح سوچتے..... تم ہر اُس شخص کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے جو تمہاری بھابھی کی طرح ہوتا اور تمہارا نہ ہو سکتا..... تم بھی میری طرح سوچتے منفی سوچیں..... آخری گناہ کی باتیں....."
وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔

"اگر یہی بات ہے تو نکل جا کمینے....."

نجم اور بھی پلنگ پر لمبا ہو کر بولا...." قیصر جب میں سائیکولوجی کے فلتھ ایئر میں تھا تو ان دنوں ہمارے ایک پروفیسر صاحب ہمیں یونگ پڑھایا کرتے تھے..... یونگ کا خیال ہے کہ ہر انسان کے دو رُخ ہیں، ایک تو اُس کا پرسونا ہے وہ image ہے جو وہ لوگوں کو پیش کرتا ہے..... ایسی شخصیت جس کی وجہ سے اُس کی سوسائٹی میں عزت ہوتی ہے..... یہ اُس کا شعوری سیلف ہوتا ہے اور دوسرے اُس کی شخصیت کا وہ لاشعوری رُخ جس کا اُسے خود بھی کبھی کبھی احساس نہیں ہوتا اس لاشعوری حصے میں وہ سائے ہوتے ہیں جو اُس کی شخصیت کا منفی رُخ ہیں..... حرص، لالچ انا، غصہ، طیش، قتل و غارت گری کا شوق، ان گنت نا آسودہ خواہشیں..... بدنصیب فرائیڈ صرف نا آسودہ جنسی خواہشات کی ٹوہ لگا سکا..... بھائی قیصر صاحب لاشعور تو سانپ کی پٹاری ہے اس میں تو ان گنت کوبرے، کوڑیالے، سنگ چور، اُڑنے سانپ ہیں..... کبھی کبھی لاشعور کا دروازہ کھل جاتا ہے..... اور پھر چل سو چل..... انسان چاند کا دوسرا رُخ بھی دیکھ لیتا ہے۔"

"ہمارے سائے ہمیشہ ہی دُکھ دینے والے ہوتے ہیں کہ لاشعور میں کچھ پناہ بھی ہے انسان کے لیے" قیصر نے سوال کیا۔

"نہیں وہاں سائے بھی ہیں، آبدار موتی، نگینے، جواہرات سے لدی تھیلیاں بھی ملتی ہیں..... سارا فائن آرٹ' شاعری..... آرکیٹیکٹ وہیں سے نکلتا ہے..... مذاہب کی پیروی..... مابعد کے ساتھ گٹھ جوڑ..... جو لوگ سایوں میں اُلجھ جاتے ہیں اور میری طرح انہیں لاشعور کو handle کرنا نہیں آتا وہ بھی آخر میں پاگل ہو جاتے ہیں..... شیزوفرینیا کے شکار جو خواص اس میں تیرنا سیکھ جاتے ہیں اور انہیں موتی لانے کی مشق آ جاتی ہے وہ دنیا کے بڑے آدمی بن جاتے ہیں۔" نجم بولا۔

"جب اتنی ساری باتیں تو سمجھ جاتا ہے..... اور ان کو ایک قابل آدمی کی طرح ڈسکس کر سکتا ہے تو پھر اپنی ایک چھوٹی سی لغزش، بیوقوفی پر قابو نہیں پا سکتا....." قیصر نے سوال کیا۔

"نہیں....."

"لیکن آخر کیوں.....؟" قیصر بولا۔

"میں سمجھتا ہوں ..... غالباً اور لوگ بھی سمجھتے ہوں گے میری بات، اور میری طرح ہی سوچتے ہوں گے ..... انسان اپنی Conflict اتنی آسانی سے سلجھا نہیں سکتا..... ان کا Source بہت دُور..... کہیں آسمانوں میں اُس جگہ سے چلا ہے جب ابلیس نے انسان کو بہکایا تھا اور اُس میں پہلی Conflict جاگی۔ انسان باغِ بہشت میں جانوروں کی مانند تھا..... مکمل طور پر معصوم اور آگہی سے آزاد..... اُس کے اندر نیکی اور بدی دونوں موجود تھیں لیکن وہ جانوروں کی طرح ان دونوں کے احساس سے خالی تھا۔ شعوری طور پر جانور مارتا ہے لیکن اُسی قدر جس کا حکم ہوتا ہے وہ غصہ، کینہ، بدلہ لینے کے لیے کسی دوسرے جانور کے آزار کا باعث نہیں بنتا..... وہ اپنی سرشت پر حکمِ الٰہی کے مطابق چلتا ہے، اسے اپنی عقل کے مطابق، اپنی مرضی کے تحت استعمال نہیں کرتا..... پھر..... ابلیس نے حضرت آدمؑ کی انا کو جگایا اُن میں نیک و بدی کی تمیز اُبھاری' صاحبِ اختیار اور اپنی will کا استعمال سکھایا۔ یہاں سے پہلا گناہ اور پہلی Conflict شروع ہوئی جانِ من....."

''اس قدر مت سوچا کر، دیکھ تو کتنے بے گھر لوگ آتے ہیں اس دھرتی پر..... اُمید کے ساتھ، اُجالے کی تلاش میں..... دیکھ تو سہی ideals کی ایک دھرتی تیار ہوئی ہے..... اور اپنی عقل، دانش، اپنی Ego اپنی will بھی تو ساتھ لائے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کی بستی کو اپنی مرضی سے بسائیں گے لیکن بہت جلد انہیں من وسلویٰ راس نہیں آئے گا، یہ پیاز، لہسن اور مسری دال مانگیں گے..... وہی Conflict ہے، بابا آدم کی جسے ابلیس نے جگایا تھا..... انسان کی انا جب بھی جاگتی ہے، جب بھی وہ صاحبِ اختیار ہوتا ہے اُس میں دو جذبے جاگتے ہیں۔ کمتری کا احساس اور تکبر..... کمتری اور تکبر یہی دو جذبے ہیں جن کی وجہ سے اُس میں تضاد پیدا ہوتا ہے، جب وہ رب بننا چاہتا ہے تو اپنی کمتری کا بھید کھلتا ہے، جب اپنے آپ کو دیکھتا ہے تو تکبر جنم لیتا ہے..... تم نہیں جانتے جب تک میں بھابھی سے نہیں ملا تھا۔ میں اپنے علم کی وجہ سے بڑا فرعون تھا۔ میری دانش اتنی زیادہ تھی کہ مجھ میں سماتی نہیں تھی پھر..... بھابھی آمنہ کہیں سے اس بت کو توڑنے آ گئی..... مجھے معلوم ہوا میں تو کچھ بھی نہیں ایک مسکراہٹ مجھے فنا کرنے کو کافی ہے.....''

'' کسی سیانے کو نبض دکھاؤ..... یہ بخار تو اور قسم کا ہے۔ کسی سائیکو جسٹ سے ملو سائیکو analysis کراؤ''

''پچاس روپے ہیں قیصر.....'' یکدم لہجہ بدل کر وہ ملتجی ہوا۔

بٹوہ کھول کر نوٹ گنتے ہوئے قیصر نے بڑا ادا سا محسوس کیا۔ پھر میز پر رکھی سائیکل کی چابی اُٹھا کر نجم کو دی.....

''یہ سائیکل لے جا..... اب سائیکل ہضم نہ کر جانا.....''

'' ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے.....''

سائیکل کا ہینڈل پکڑ کر نجم نے خوش دلی سے کہا.....'' دوست اگر مصیبت کے وقت کام نہ آئے تو دوست کب کہلائے..... قیصر زندہ باد..... تا..... تا.....''

قیصر نے خوش دلی سے ہاتھ ہلایا لیکن کہیں سے ایک بھنبھناتی سوچ اُس کے ضمیر پر آ بیٹھی تھی.....

راحیلہ کو گھر لاتے وقت اُس نے یہ باتیں سوچی نہ تھیں۔

اور اب اُسے واپس کیمپ میں لے جانا اُس کے بس کی بات نہ تھی.....

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ یکدم رُک گیا۔ واپس آیا بلی اُٹھائی اور چھت پر چلا گیا۔ چھت والے بڑے کمرے کی بتیاں بند تھیں اور لگتا تھا راحیلہ سو گئی ہے۔ اُس کے دروازے کے سامنے بچھی چارپائی پر بابا فضل گھوک سو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر منڈیر پر کہنیاں ٹکا کر کھڑا رہا۔ گلی کے موڑ پر سائیکل کی گھنٹی بجی اور اُس کی نگاہوں کے سامنے نجم کی شرارتی آنکھیں گھوم گئیں۔ والٹن کیمپ میں سارا دن مہاجرین کے نام پتے لکھنے والے اس نوجوان کو قیصر جان نہ پایا تھا۔ مسکراتی ہنستی آنکھوں کے پیچھے کتنے آنسو تھے اس بات کا وہ صحیح اندازہ نہ لگا سکا تھا..... پھر اُس نے آسمان کی طرف نگاہ اُٹھائی۔ رات گرم تھی، دُور دُور آسمان پر کوئی بادل نہ تھا۔ وہ اندر جا کر راحیلہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ خدا خبر بخار اُترا ابھی تھا کہ وہ ابھی تک نیم مردہ حالت میں پڑی ہو گی تھی۔

وہ واپس سیڑھیوں کی جانب مڑنے لگا..... اُس کی نگاہوں میں کیمپ کے بے مصرف بے سمت، دیوانگی سے ہمکنار، بے گھر، بے در..... فرد..... گروہ گھومنے لگے..... وہ ان لوگوں سے ملنے، اُن کے معائنے کرنے قریباً مہینہ بھر سے

جار ہا تھا۔ یہ لوگ اُسے بچپن کی یاد دلاتے..... جب دھان کی پنیری کھیتوں میں لگا کرتی تھی۔ وہ بار بار ابے سے پوچھتا۔

''ابا یہ ساری پنیری لگ جائے گی رات تک ؟.....''

''ہاں لگ جائے گی.....''

''اور جو نہ لگ سکی تو ابا.....؟ ''

''لگ جائے گی بچوا لگ جائے گی.....''

''اور جو.....''

''تو پھر سوکھ جائے گی.....''

''اللہ وارث بچوا..... اللہ وارث.....''

مہاجرین کے اس ہجوم کو دیکھ کر کبھی کبھی وہ دل میں کہتا..... اللہ وارث بچوا..... اللہ وارث..... پھر وہ آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر دل ہی دل میں پوچھتا کیا یہ ساری پنیری لگ جائے گی آقا..... تو کہیں سے جواب ملتا..... ہاں لگ جائے گی بچوا..... لگ جائے گی..... جس کی پنیری ہے وہ لگائے گا تو کیوں سوچتا ہے۔ ایسے ہی جب راحیلہ کو وہ چھت والے کمرے میں لے آیا تھا اور اپنی اماں کے پلنگ پر تکیوں کے سہارے اُسے لٹایا تھا تو راحیلہ نے پوچھا تھا۔

'' یہ کونسی جگہ ہے صاحب ؟ ہم یہاں کیوں لائے گئے ہیں.....؟ ''

قیصر واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بلی کو باہر والے صحن میں چھوڑ دیا تھا لیکن وہ اندر آنا چاہتی تھی دُم اُٹھائے اپنے بدن سے دروازے کو رگڑتی میاؤں میاؤں کئے جا رہی تھی۔

انسان بند دروازے کو کیوں کھولنا چاہتا تھا ؟ حالانکہ باہر جگہ بھی کھلی تھی اور آزادی بھی زیادہ تھی..... وہ سارے مہاجرین..... بند گھروں کی تلاش میں تھے جن گھروں کے باہر پھاٹک اور اندر مقفل کرنے کو چٹخنیاں، کنڈیاں اور ارل ہوں..... انسان مردہ حالت میں بھی بند کیسے اور تنہا قبر میں رہنے کا متقضی تھا..... حالانکہ فلاح اور خوشی دوسروں سے وابستگی میں تھی..... اُن سارے مہاجرین کو جلدی تھی..... وہ کہیں نہ کہیں پہنچ کر اپنے آپ کو کسی پابندی، حراست، اسیری میں مقید کرنا چاہتے تھے۔

انسان کھلے آسمان سے خوفزدہ تھا۔

کپڑے تبدیل کئے بغیر وہ بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ وہ گرمیوں میں کوٹھے پر سونے کا عادی تھا لیکن اب بابا افضل اور راحیلہ اوپر والے کمرے میں رہتے تھے اور اُس نے اوپر کی جگہ چھوڑ دی تھی۔ شاید نجم کی صحبت کا اثر تھا یا پھر والٹن کیمپ کی بے سروسامانی کا، وہ سوچنے لگا انسان معنویت سے بے معنویت کی طرف کیوں سفر کرتا ہے ؟

مثبت سے منفی کے رُخ

اندھیرے سے اُجالے کی جانب

نیکی سے بدی کی طرف

کیا اس Polarity کے بغیر زندگی کا کرنٹ جاری نہیں رہ سکتا۔ سورج، چاند اور دھرتی..... چاند ہی ساری

تبدیلی لاتا تھا۔ قرآن ہی تیسرا زُکن تھا۔ تبدیلی تیسرے عنصر کے بغیر نہیں آسکتی، اللہ، قرآن اور پھر نبی کریم ﷺ۔
کیا زندگی ٹھہراؤ Balance، استحکام میں قائم نہیں رہ سکتی؟ کیا انسان کبھی درمیان میں رہ سکتا ہے۔
قیصر کو نیند آ گئی......

خواب میں اُس نے دیکھا وہ کھیتوں میں چلتا چلتا ایک کنوئیں کے پاس جا کر رُک گیا۔ یہ کنواں بہت گہرا تھا۔ پانی نیچے تارا سا نظر آتا تھا۔ یہ کنواں اُس کی ماں کی طرح گہرا، ٹھنڈا اور رازوں سے لبریز تھا۔ اُس کی ماں بھی بالکل ایسی تھی۔ کہیں دور سے اُس کی ٹھنڈک آتی تھی لیکن اس کنوئیں کے پانیوں کی طرح وہ اُسے چھو نہ سکتا تھا۔ پھر اس کے تال سے آوازیں آنے لگیں

''بچاؤ.....بچاؤ.....کوئی ہے جو مجھے بچائے۔'' کنویں کی منڈیر سے جھک کر قیصر نے دیکھا، نیچے گہرے پانیوں میں نجم ڈوب رہا تھا، اُبھرا اُبھر کر چلا رہا تھا۔ وہ دیر تک منڈیر سے جھکا نجم کو یکتا رہا، اندر چھلانگ لگانے کی ہمت نہ کر سکا۔ اس جھکائی سے اُس کی کمر میں ٹیس سی اُٹھی اور اُس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ پلنگ پر اس طرح اوندھا لیٹا تھا کہ آدھا دھڑ پٹی سے نیچے جھکا ہوا تھا۔ گردن، ماتھا، سر کے بال پسینے میں بھیگے تھے۔ بلی نیچے پریشان غرا رہی تھی۔ چند لمحے کے لیے وہ سمجھ نہ پایا وہ کہاں ہے۔ واٹمن کیمپ میں.....راحیلہ کے کمرے میں یا حویلیاں میں، جہاں اُس کا بچپن، بابا جھانسا کے کنویں کے آس پاس اپنے مستقبل کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ بچاؤ بچاؤ کی صدائیں ابھی بھی اُس کے کانوں میں آرہی تھیں۔ اُس نے سگریٹ سلگانا چاہی لیکن تکیئے تلے سے ماچس نہ ملی۔ قیصر میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ماچس تلاش کرنے کے لیے اُٹھتا.....نجم کے متعلق سوچتا سوچتا ایک بار پھر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

وہ پھر گاؤں میں تھا۔ بابا جھانسا کے کنوئیں کے آگے آموں کا باغ تھا۔ گھنا باغ جس میں دوپہر کے وقت شام کا وقت لگتا..... یہاں ایک چھوٹے سے کھلے قطعے میں سانپ ہی سانپ تھے۔ چھوٹے بڑے کوڑیالے، بسنتی، کوبرے، سنگچور، راڑنے، اژدہا، افعی.....ان میں گھری ایک لڑکی چیخ رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ فضا میں سانپوں کی طرح اُٹھ رہے تھے اور منہ سے کف جاری تھی۔ اُس کے لباس نے ادھ کھلی، ادھ ڈھانپی لڑکی کا ساتھ جگہ جگہ چھوڑ دیا تھا.....غور سے قیصر نے دیکھا تو یہ نازک لڑکی راحیلہ تھی جس کی پتلیاں بخار تپتی راحیلہ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں اور یہ دیوانگی کی سرحد پر کھڑی مدد کے لیے پکار رہی تھی.....کچھ دیر قیصر سوچتا رہا پھر وہ سانپوں کے میلے میں گھس گیا۔ سانپوں نے اُس پر حملے کیے لیکن کوئی بھی اُسے گزند نہ پہنچا سکا، وہ سانپوں کو لتاڑتا، رگیدتا، ٹھڈے مارتا راحیلہ تک پہنچا پھر اُس نے تھبا بھر کر راحیلہ کو اُٹھایا کندھے پر ڈالا اور بھاگنے لگا.....سانپ اُس کے تعاقب میں آئے لیکن کوئی اُس تک پہنچ نہ پایا، وہ آموں کے باغ میں نہ جانے کتنی دیر بھاگتا رہا.....اور آخر میں ایک درخت پر چڑھ گیا اُس نے راحیلہ کے تن سے لپٹے دو تین سانپ کھینچ کر علیحدہ کیے.....آخر میں جب وہ راحیلہ کی لمبی چٹیا سے سانپ اُتار رہا تھا تو ایک دلدوز چیخ سے اُس کی آنکھ کھل گئی.....

اُس کے ہاتھ میں بلی کی دُم تھی!.....

قیصر نے اُٹھ کر منہ ہاتھ دھویا، وضو کیا.....پھر نماز پڑھی۔ اُسے نماز پڑھے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ وہ خدا سے دور تو نہ تھا۔ لیکن مذہب کی بیرونی پابندیوں سے وہ کافی دور تھا۔ گھر پر وہ تنہا رہتا.....اپنے پیشے کے اعتبار سے وہ لوگوں کے تال

میل سے فیض یاب ہوتا لیکن یہ ایسے ہی تھا جیسے کسی لوک ناچ میں شرکت کرنے کے بعد سب گھر وگھری چلے جائیں.....نماز پڑھنے کے بعد اُس نے راحیلہ کے کمرے میں اوپر جانا چاہا لیکن جب وہ اور بلی صحن میں آئے تو قیصر کو خیال آیا کہ ابھی پوری طرح صبح بھی نہیں ہوئی کون جانے راحیلہ سوتی ہے کہ جاگتی......بلی سیڑھیوں پر چڑھ کر سورج اور دودھ کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ قیصر دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ تو کبھی اتنی سویرے جاگا ہی نہ تھا۔ اُسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ اگر کوئی صبح سویرے جاگ جائے تو نماز پڑھنے کے بعد وہ کیا کر سکتا ہے؟

کچھ دیر جاگنے کے بعد وہ پھر سو گیا.....اُس کی سانسوں میں تھکن کی یکسانیت آ گئی۔ وہ پھر گاؤں میں تھا۔ ہر طرف جنگل تھے۔ اُس کے بالوں میں سفیدی نے دھاوا بول دیا تھا۔ اور اُس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اُس کے ہاتھ میں تانگے والوں جیسا ہنٹر تھا اور درختوں کو کوڑے مارتا اس گھنے جنگل میں آدھا دیوانہ آدھا سیانا چل رہا تھا۔ ہر درخت پر جہاں اُس کے کوڑے پڑتے چھال اُتر جاتی اور سیاہ دھبے پر چمکدار لکیریں پڑ جاتی.....پھر ایک بیمار لڑکی نے آگے بڑھ کر اپنے نازک ہاتھ میں کوڑا پکڑ لیا.....اور اسے پرے پھینک دیا۔ ہنٹر فرش پر پڑتے ہی سارے درخت پانیوں میں بدل گئے۔ ہلکی ہلکی لہروں پر وہ دونوں چلنے لگے.....ہلکی لکڑی کے گویا بجرے ہوں.....قیصر نے دل شکستہ انداز میں اپنا ہاتھ بڑھایا تو راحیلہ نے اس ہاتھ کو پکڑ لیا.....قیصر نے آہستہ سے کہا..... "راحیلہ میں اتنا بوڑھا نہیں ہوں صرف شوگر کی وجہ سے.....اس ذیابیطس کے باعث....."

خواب میں بھی وہ چپ ہو گیا..... پتہ نہیں وہ اپنے سفید بالوں کا جواز راحیلہ کو کیوں پیش کرنا چاہتا تھا؟۔

جب اُس کی آنکھ کھلی تو سورج کی شعاعیں جالی کے دروازے سے چھن کر اندر پلنگ اور قالین پر پڑ رہی تھیں۔ کہیں دور گلی میں تانگے کے پہیے، گھوڑے کے گھنگھرو اور ٹاپوں کی آواز آ رہی تھی۔ باورچی خانے سے کچھ پکنے کی خوشبو آ رہی تھی، پھر اماں زینو نے جالی کا دروازہ کھٹکھٹا کر کہا..... "چائے لے آؤں صاحب جی......؟"

"ہاں بھائی لے آؤ لیکن پہلے شیو کا پانی دے دو....."

"اچھا بیٹا....." زینو بولی۔

"اوپر والوں کو ناشتہ کرا دیا....." پتہ نہیں کیوں وہ راحیلہ کا نام نہ لے سکا۔

"راحیلہ بی بی نے تو صرف دودھ پیا ہے۔ بابا فضل نے انڈہ پراٹھا کھالیا ہے جی....."

"اچھا.....یخنی پلانا نہ بھولنا.....میں رات دیر سے آؤں گا، ہسپتال کے بعد کیمپ چلا جاؤں گا، مریض کا خیال رکھنا....."

پتہ نہیں کیوں وہ راحیلہ کا نام اپنے منہ سے ادا نہ کرنا چاہتا تھا گویا کسی چوری کے پکڑے جانے کا احتمال ہو۔

•

بابا فضل اب راحیلہ کا روحانی باپ بن چکا تھا۔

راحیلہ کی شکل میں باپ کو جینے کا جواز مل گیا تھا۔ جب وہ قافلے میں شامل ہوا۔ تب اُس کی جوان بہو اور بیٹی اُس کے ہمراہ تھے پھر سرحد کے قریب پہنچتے پہنچتے بلوائیوں نے قافلے کی شکل تتر بتر گروہوں کی کر دی۔ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں

بے سروسامانی کے عالم میں اپنی اپنی گٹھڑیاں، صندوقچے اور ہلکے پھلکے سامان کے ساتھ، اپنے وجود کو کسی دارالامان میں گرانا چاہتے تھے، جہاں گر کر وہ اپنی ساری تکان نیند کے حوالے کر دیں۔

جس وقت بابا فضل پاکستان میں داخل ہوا اُس کے ساتھ ایک ٹوٹی پھوٹی چٹائی اور مٹی کا بدھنا تھا..... بیٹی اور بہو کیا ہوئیں؟ بابا فضل یہ بھی نہ بتا سکتا تھا کہ کس مقام پر کس وقت وہ اپنی عزتوں سے فارغ ہو گیا..... کسی نے اُسے دھکیل کر ایک ٹرک پر چڑھا دیا.....اور جب وہ واپس ہوش میں آیا تو وہ والٹن کیمپ میں پڑا تھا جیسے چڑیا گھر کا جانور ہو ..... روٹی مل رہی تھی لیکن اُسے معلوم نہ تھا کہ وہ کون ہے ؟

راحیلہ نے سوپ پی کر کمرے میں نظر دوڑائی۔

پھر باہر والی چارپائی پر بیٹھے بابا فضل پر نگاہ ڈالی.....اس نئے ملک میں آتے اُسے پتہ چل گیا تھا کہ اوپر والا دیتا ہے سبب کے ساتھ بھی اور بغیر سبب کے بھی.....

''باباجی.....''

''جی بیٹا.....''

''میرا خیال ہے.....اب تو میں کافی صحت مند ہو گئی ہوں.....اب مجھے یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے.....''

''کہاں جائیں بیٹا.....؟''

''کب تک ڈاکٹر قیصر کی نرم دلی کا فائدہ اُٹھاتے چلے جائیں.....؟ اگر وہ جانے کو نہیں کہتے تو.....اس کے یہ معنی تو نہیں کہ.....ہم ہمیشہ کے لیے یہاں پسر جائیں.....''

''تمہارا کوئی ٹھکانہ ہے.....؟''

''ہے تو سہی.....میں کالج واپس جا سکتی ہوں.....وہاں سے کسی نہ کسی کا پتہ چل جائے گا۔ کسی سہیلی کا.....کسی دوست کا.....''

''ہاں.....میں تو صرف کیمپ واپس جا سکتا ہوں، میرے تو ماں باپ بھی زندہ نہیں کہ اُن کے پاس لوٹ جاؤں.....'' بابا فضل بولا۔

'' آپ میرے ساتھ رہیں گے جہاں میں وہاں آپ..... یہ تو بستی ہی نئے رشتوں کی ہے باباجی.....میں تو آپ کو کبھی بھی نہ چھوڑوں.....''

بابا فضل نے دل میں سوچا، ایسے ہی میری بیٹی بھی کہا کرتی تھی.....جب وہ قافلے میں شامل ہوئے تو بابے نے اپنی رنڈی بہو سے کہا تھا.....''میں تم دونوں کو نہیں چھوڑوں گا بس تم ساتھ ساتھ رہنا.....اودھر اُدھر نہ ہو جانا.....''

پر حیاتی تو اور چیز تھی.....وہ ادھر اُدھر کرنا خوب جانتی تھی.....آدمی کے بس میں کچھ نہیں تھا۔ اُس کا عمل تو سارے کا سارا نیت کے ترازو میں تلنے والا تھا.....جہاد میں مرنے والا شہید، جنت کا باسی.....اور کسی انسان کو اپنی غرض سے مارنے والا ساری انسانیت کا قاتل.....چوری چھپے کی آشنائی کرنے والا زانی.....اور بیاہ کی دوہری چھتری تلے آسرا دینے والا کفیل.....اپنے پر بے جا اسراف کرنے والا دوزخی.....اور دوسروں پر جائز ناجائز خرچ کرنے والا سخی داتا جنتی.....انسان کا

عمل تو وہی رہتا ہے صرف نیت اُسے جلا دیتی ہے.....نیک و بد کی تفریق بتاتی ہے.....عمل کی مادی شکل ہمیشہ سے ایک رہی ہے.....جانور مار گرائے، چیر پھاڑ کر کھا جائے تو نہ گناہ ہے نہ ثواب، وہ اپنی سرشت کے مطابق بغیر آگہی کے عمل کر رہا ہے.....

لیکن انسان آگاہ ہو چکا۔ حضرت آدمؑ نے نیک و بد کی آگاہی اُسی وقت حاصل کر لی جب شجرِ ممنوعہ سے کھایا..... پھر اللہ نے اُن کی نیت دیکھی کہ بہکانے میں آ گئے تھے سو معاف کیا اور صرف اتنی سزا دی کہ باغِ بہشت سے نکل جاؤ اور نیچے جا کر اپنے اعمال کے چکر کو نیت کے دھرے پر چلاؤ.....اگر نیت درست ہوئی تو کوئی عمل بُرا نہیں اور جو کہیں نیت میں فتور ہوا تو پھر ہاویہ زاویہ ہے.....جانچے جاؤ گے پرکھے جاؤ گے اور سزا پاؤ گے۔

بابا فضل ایسی علمی باتوں سے آگاہ نہ تھا۔ اُس نے ساری عمر چھوٹی سی زمین پر کھیتی باڑی کر کے اپنے اکلوتے بیٹے اور بیٹی کو پالا تھا۔ وہ ایک سادہ دل و دماغ کا آدمی تھا۔ جس گاؤں میں وہ رہتا تھا وہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ کنوئیں سے پانی لیتے وقت وہ اپنے گھڑے ذرا دور رکھتا اور اگر کنوئیں پر کوئی نہ ہوتا تو کبھی کبھی نچلی آڈ میں جمع شدہ پانی سے گھڑے بھرتا۔ تنہائی میں بھی کبھی اُس میں یہ جرأت پیدا نہ ہوتی کہ کنوئیں میں ڈول ڈال کر اپنی ضرورت بھر پانی نکال لے.....

جب کبھی گاؤں کی اونچی ذات والی چند نانیاں کنوئیں پر آتیں تو وہ اپنے گھڑے اُٹھا کر درختوں کی اوٹ میں چلا جاتا، مویشی اور نیچی ذات والوں کے لیے کنوئیں کا پانی استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اُن کے لیے علیحدہ چہ بچہ تھا۔ جب رہٹ چلتا تو یہ چھوٹا سا چہ بچہ اور کھیتوں کو جانے والی آڈ پانی سے بھر جاتی باقی وقت ہندو آبادی اپنے لیے ڈول ڈال کر پانی کھینچ لیتے.....کوئی مسلمان قریب نہ پھٹک سکتا۔

صدیوں سے بابا فضل کے بڑے کا اسی طرح پانی بھرتے آئے تھے.....کھیتوں کے کچے راستوں پر تنگ گلیوں میں جب کبھی ماتھے پر تلک لگائے لوگ گزرتے بابا فضل اور اُن کے گھر والے راستہ چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے اور ہندو جاتی کے مہان پُرشوں اور استریوں کو گزر جانے کی مہلت دیتے۔ شادی بیاہ پر اوّل تو بلائے ہی نہ جاتے اور جو بلا بھی لئے جاتے تو اُنہیں کچی رسد ملتی یا پھر بھاجی پوری پتوں پر ڈال کر دور سے اُن کی جھولی میں پھینک دی جاتی..... بابا فضل کبھی کسی ہندو کے برابر نہ بیٹھا تھا.....نہ ہی کبھی اُس نے اپنے آپ کو ان مہان لوگوں کے برابر سمجھا تھا۔

برصغیر کی بدنصیبی ہی یہ تھی کہ یہاں قومیں آباد نہ تھیں بلکہ اونچ نیچ کا کھیل جاری تھا۔ کچھ لوگ اپنی ذات کی بنا پر بہتر تھے کچھ کمتر..... ویسے تو انسان روزِ ازل سے اس درجہ متکبر ہے کہ کسی دوسرے کو اپنے برابر سمجھ ہی نہیں سکتا، اسی لیے غیبت کا سہارا لے کر دوسروں کے بخیے اُدھیڑتا رہتا ہے..... بابا فضل اور اُن کے بڑوں میں اور عیب ضرور تھے لیکن تکبر کا عیب نہ تھا۔

بابا فضل نے نہ تو کبھی ہندوؤں کے رویے کے متعلق سوچا نہ ہی کبھی اس رویے کے باعث اُن سے کوئی گلہ کیا، نہ ہی ایسی نفرت پالی جس کی بنا پر انہیں کبھی بدلے کا خیال آیا ہو.....اُن کے بھاویں سب کچھ اللہ سچے کا بھانا تھا، وہ جس کو چاہتا جو کچھ چاہتا دے ڈالتا.....اور جو کچھ بابا فضل کے نصیب میں تھا وہ اُسے مل رہا تھا اور وہ اُس پر صابر شاکر تھا۔

بابا فضل نے راحیلہ سے پرے دیکھتے ہوئے کہا..... "ہم اب کہاں جانے جوگے ہیں بیٹی یہیں کہیں پڑ رہیں گے یہ تو اللہ کی پاک بستی ہے..... بابے قائداعظم نے بڑی ستھری نیت سے بنائی ہے اس میں اونچ نیچ نہیں ہوگی۔ دیکھ لینا ..... یہاں بندہ بندے کا ویری نہیں ہوگا..... میں تو وہاں بھی خوش تھا پُتر ا..... میرا بیٹا شہر دودھ لے کر گیا ناں تو واپسی پر بابے قائداعظم کا کلینڈر خرید لایا۔ میرے پلنگ کے ساتھ دیوار پر کلینڈر لگا کر بولا..... "ابا ہم سب پاکستان جائیں گے بابا قائداعظم ہمیں نئی بستی میں لے جائے گا وہاں سب برابر ہوں گے....."

بابا فضل کہتا تھا قائداعظم تو ساری عمر کوشش کرتا رہا جو ہندو مسلم ساتھ رہیں۔ لیکن ہندو لیڈر نہ مانے..... امرتسر میں جو جلیانوالہ باغ کا سیاپا ہوا ہے ناں جگہ جگہ یہ پھانسیاں لگیں..... بابا قائد نہیں چاہتا تھا ہم انگریز کے خلاف ستیہ گرہ کریں..... تنگ کی تحریک میں شامل ہوں..... جلیانوالہ باغ میں جا کر احتجاج کریں۔ آخر وہ ہمیں الگ کرنا چاہتا ہے..... ہندو سے، انگریز سے تو مان نہ مان میں تو پاکستان چلا جاؤں گا..... اور جب ہم قافلہ بنا کر گاؤں سے نکلے تو ہم پانچ چھ گھر کے لوگ تھے غلام محمد ہمارے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ میرا پوتا اسمٰعیل میرے کندھے پر تھا، ابھی ہم نے بڑی سڑک سے پہلے سوئے کا پل پار کیا تھا کہ..... کہیں سے بلوائی آ گئے..... میرے بیٹے غلام محمد کو مار کر سوئے کے پانی میں بہا دیا..... میری بہو نے بھی پانی میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی لیکن زینب اور میں نے اُسے پکڑ لیا..... پھر..... ہم چلتے رہے جدھر سے لوگ آتے نظر آتے ہم چھپ جاتے..... لیکن باڈر پر میں اکیلا پہنچا..... پتہ نہیں وہ دونوں کس وقت کیسے اِدھر اُدھر ہو گئیں ؟ کون جانے وہ بھی آ گئی ہوں کسی اور راستے سے ؟"

"ہاں جی..... آپ کے پاس کچھ پیسے ہوں گے بابا جی....."

"ہاں ہیں تو سہی..... پر مجھے بتا کیا چاہیے میں لا دوں گا؟....."

"چاہیے کچھ نہیں بس اپنے پاس رکھتے ہیں"

پتہ نہیں کیوں وہ بابا فضل کو بتانا نہیں چاہتی تھی کہ وہ کالج پہنچ کر اپنی سہیلیوں کا اتہ پتہ معلوم کرنا چاہتی تھی..... جب بابا فضل دوپہر کو سو گیا تو وہ دس روپے ہتھیلی میں دبا کر آہستہ سے باہر نکلی..... اُسے لگ رہا تھا کہ وہ یہاں رہ گئی تو پھر کبھی کہیں نہ جا سکے گی اور شاہد سے ملنے کے تمام امکانات ختم ہو جائیں گے۔

کیا شاہد پاکستان آ گیا ہوگا؟

کیا وہ اُسے تلاش کر رہا ہوگا؟

کیا کوئی صورت اُس سے ملنے کی تھی؟

بڑی مشکل سے راحیلہ کالج کے پھاٹک تک پہنچی ابھی اُس کا جسم اتنا مضبوط نہیں تھا کہ ایسی گرمی کا مقابلہ کر سکتا۔ پھاٹک کی گول گول گراریاں چرچرائیں اور اس کے پٹ ضد کرتے ہوئے کھل گئے۔ جب وہ یہاں طالب علم تھی تو پھاٹک ہر روز یوں کھلتا تھا جیسے کسی لق و دق صحرا میں کوئی مہمان نواز اپنی پانی سے لبریز صراحی سنبھالے سر راہ کھڑا ہو اور آتے جاتے مسافروں کے حلق تر کرے۔ پھر رات کو جب پرنسپل راؤنڈ کو نکلتیں تو یہی پھاٹک یوں بند ہو جاتا جیسے کوئی سانپ اپنی پھن اُٹھائے سونے کی دیگ پر بیٹھا ہو۔

سارا کالج بروگ کی صدا بن کر اکیلا کھڑا تھا

ہر طرف خشکی، خاموشی اور گرمی کا احساس تھا۔ لان کے وسط میں لگے آڑو کے درخت جھونجھے سے نظر آرہے تھے۔ اونچی عمارتیں طالبات سے خالی تھیں۔ جن برآمدوں میں جہاں لڑکیوں کی جوتیوں کی ٹکاٹک، سرگوشیاں سنائی دیتی تھیں ویران تھیں، وہ پرنسپل کے دفتر اور اُس سے ملحق کلرکوں کے آفس کی طرف بڑھنے لگی۔ اُس کی ٹانگوں میں چیونٹیاں چلنے لگیں اُسے احساس ہوا کہ زمین آگے بڑھ رہی ہے اور اُس کے قدم آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی طرف جارہے ہیں۔ ابھی چند ماہ پہلے یہاں کتنی رونق تھی۔ ان دیواروں، درختوں سے کتنی آوازیں ٹکرایا کرتی تھیں..... گھنٹی کی آواز کتنی معجزہ نما تھی کہ ہر لڑکی خود بخود جماعتوں کی طرف لپکنے لگتی۔ شام کے وقت لان پر ان گنت رنگ پتنگوں کی طرح ڈولتے پھرتے.....سدا بہار ٹائپ رائیٹر کی طرح جوتیوں کا شور گیلری، برآمدے میں مسلسل چلتا.....اسی جگہ اُس کی سہیلیوں نے کہا تھا۔

''جب ہم ڈگری لینے آئیں گے تو یہاں تصویریں کھنچوائیں گے.....ان سیڑھیوں پر.....''

اب یہ سیڑھیاں تو باقی تھیں.....لیکن سب کے اکٹھے ہو کر تصویریں کھنچوانے کا خیال خام تھا۔ ڈگریاں کہاں تھیں؟.....سہیلیاں کون تھیں.....؟ راحیلہ نے اپنے گوشہ چشم کو دوپٹے کے کونے سے پونچھا۔ وہ یہاں کیوں آئی بیٹھی تھی۔ راحیلہ نے اپنے ہوسٹل کی جانب نظر کی، اُسے ٹینس کورٹ کے قریب مالی کام کرتا نظر آیا، وہ کورٹ کے قریب مشین سے گھاس کاٹ رہا تھا۔ اُس نے قمیض اُتار رکھی تھی اور پسینے کی گیلاہٹ، سورج کی روشنی میں کالی کینچلی سی چمک رہی تھی۔ اُس کی نظر راحیلہ پر پڑی تو اُس نے مشین وہیں چھوڑ دی اور اُس کی جانب بڑھا۔ مالی کی ایک ٹانگ میں شائد نقص تھا۔ اسی لیے وہ سیدھے راستے پر ایسے چل رہا تھا گویا سیڑھیاں اُتر رہا ہو......

آتے ہی گرجا..... '' ادھر کیا کرت ہے چھوری ؟ .....''

''کلرک سے ملنا ہے دو ایک ایڈریس لینے ہیں ''

راحیلہ جلدی سے سیڑھیوں پر سے اُٹھی نہ جانے کیوں اُسے مالی کے لیے بھی اُٹھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

'' جا ری اُٹھو.....کلرک کو ملت رہی.....وہ تیرا کون ہوت رہی.....ابھی یہاں سے چیج وستو لے کر بھاگ رہے بھانت بھانت کے لوگ آتے رہے یہاں.....کسی کا کیا اعتبار.....چل نکل.....'' مالی نے اُسے دھکا دے دیا۔

ابراہیم دادا کی لاڈلی راحیلہ کا یہ پہلا دھکا تھا۔

''چھٹی ہوئے رہی کالج ماں.....چلتی ہو''

راحیلہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے.....لیکن اُس نے مالی کی درشتی کی پرواہ نہ کی اور بڑے حلم سے استفسار کیا۔

'' مالی جی وارڈن صاحب کہاں ہیں؟''

'' نوکری چاکری یہاں ہے نہیں تو کیا مانگت ہے چھوری.....مہاجرین کو وارڈن صاحب نہیں رکھت چل نکل.....''

راحیلہ نے کرخت مالی پر نظر دوڑائی اُسے لگا کہ کالج بھی آنا ویسے ہی بے کار تھا جیسے وہ شوکت منزل کو تلاش کرنے کرشن نگر گئی تھی.....وہاں بھی بڑا سا تالا پڑا تھا۔

پتہ نہیں شوکت وہیں تھے ؟ لیکن آخری بار جب اُس نے شوکت کو دیکھا وہ شامیانے کے پاس کھڑا تھا۔

پتہ نہیں دادا ابا..... ساجدہ ماں اور شوکت بھیا کہاں تھے؟

شاید وہ بھی بچ بچا کر سرحد کراس کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوں اور کرشن نگر میں اپنے فلیٹ میں رہنے لگے ہوں؟

وہ قیصر منزل واپس جانا نہیں چاہتی تھی پتہ نہیں کیا اندیشہ تھا جو اُسے ستا رہا تھا کہ اگر آج وہ واپس چلی گئی تو پھر وہاں نہ نکل سکے گی۔ قیصر کی مہربانی اُسے لے ڈوبے گی۔

پھر شاہد کا کیا ہوگا ؟

پھر وہ اُسے کب ملے گا ؟

اُسے خوف تھا کہ اپنے آپ سے کیے ہوئے وعدے وہ یاد نہ رکھ پائے گی۔ تسنیم آپا جو ایک عرصہ اُس کا آدرش رہیں اُسے بھول جائیں گی..... شاہد کے بھورے بال اور آنکھیں، بڑے بڑے مضبوط ہاتھ اور چوڑا سینہ سب کہیں اُس کے لاشعور کا حصہ تو ہوں گے پر شعوری ذہن سے اتر جائیں گے..... وہ عورتوں کی اُس کیمپ کا حصہ بننا چاہتی تھی جس کا سپہ سالار تسنیم آپا تھی معاً اُسے یاد آیا کہ کیمپ میں بیمار ہونے سے پہلے بابا فضل کے سائے تلے آنے سے پہلے بھی اُس نے قیصر کو دیکھا تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے وہ کیمپ میں مدد دینے کی غرض سے نہیں بلکہ کسی قسم کی مدد لینے کی خاطر آیا تھا۔ وہ جگہ جگہ رُکتا پینٹ کی جیب سے بٹوہ نکالتا اور لوگوں کی مدد کرتا اُس کے ساتھ ایک چھوٹی سی ڈنگل بیرو تھی جس پر خشک دودھ، صابن، بچوں کے لیے میٹھی گولیاں، بسکٹ وغیرہ تھیلوں کی شکل میں جمع تھے وہ انہیں بانٹتا شکریہ اور دعائیں وصول کرتا ادھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ پھر وہ راحیلہ کے آگے آ کر چپ ہو گیا۔ نہ اُس کا ہاتھ بٹوے کی طرف بڑھا نہ ڈنگل بیرو کی جانب..... جیسے اس کی آنکھیں التفات کی بھیک مانگ رہی ہوں، وہ خود مدد کی تلاش میں کیمپ آ پہنچی ہوں۔

بڑی دیر وہ دونوں چپ کھڑے رہے، پھر قیصر نے کسی ایکٹر کی خوبصورت آواز میں پوچھا

" آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ؟ ....."

" جی نہیں....."

نیم بیہوش راحیلہ نے اُس سے کچھ پیسے اُدھار لینا چاہے لیکن پتہ نہیں کیا چیز مانع رہی... بچپن کی تربیت ؟ خودنگری کی عدت..... عالی نسبی کا احساس ؟

آہستہ سے راحیلہ بولی ..... " جی مجھے....."

قیصر نے جلدی سے بٹوہ کھولا جیسے راحیلہ نے اُس سے مخاطب ہو کر اُسے کسی شہری اعزاز سے نوازا ہو......

" یہ لیجیے....." سارا بٹوہ اُس کی طرف بڑھا کر قیصر بولا۔

راحیلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے..... بہت سی اقدار اس سفر میں کھو چکی تھیں۔ لیکن ابھی کسی مرد سے پیسہ لینا اور خود طوائف ہونا ایک ہی سکے کے دو رخ تھے۔

یکدم راحیلہ سکڑ گئی ..... " جی مجھے روپیہ نہیں چاہیے ..... میں ..... مجھے آپ یہ بتا دیجئے کھوئے ہوئے رشتہ داروں کا پتہ کہاں سے چل سکتا ہے ..... " یہ کہہ کر وہ پھر بے ہوش ہو گئی۔

قیصر چالیس کے لگ بھگ تھا۔ ابھی درخت نہ خمیدہ ہوا تھا نہ بوجھل ..... صرف اس کے بالوں کی روئیدگی میں سفید تار ..... دانتوں پر ہلکی زردی اور سائیڈ برنز میں سفیدی آ گئی تھی ..... پچھلے بیس سال سے وہ بڑی سختی سے اپنی تنہائی کے ساتھ زندہ رہنے کی کوشش میں نڈھال ہو گیا تھا۔ اُس نے مسلم لیگ کے لیے اپنی جان وقف ضرور کر دی تھی۔ قائداعظم کے خواب کی تعبیر تلاش کرنے میں اپنی ذاتی خوشی کا بلیدان دے دیا تھا لیکن وہ قائداعظم نہیں تھا اور پاکستان اُس کا خواب نہ تھا۔

پھاٹک سے باہر نکل کر وہ کالج کے سامنے سے گزرنے والے چھوٹے سے خشک نالے کی پلی پر بیٹھ گئی۔

وہ ورنگی سے سوچنا چاہتی تھی۔

خدا خبر اُس نے کیمپ میں قیصر کو دیکھا بھی تھا کہ نہیں ؟

اللہ جانے وہ کب سے بیمار تھی؟ مہندی کی رات سے جب اندیشے اُس کے تعاقب میں تھے۔ یا اُس وقت سے جب وہ مہاجروں کے کیمپ سے ٹرک میں سوار ہوئی تھی واقعات نے اتنی جلدی جلدی پلٹا کھایا تھا کہ اب اُسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ حقیقت کیا ہے ؟ اور وہ کیا کچھ اپنے دل سے تخیل سے گھڑ رہی ہے .....

ابراہیم دادا ؟

ڈاکٹر سرفراز مغل؟

ساجدہ ماں؟

اور پیاری تسنیم آپا اور نکو؟

اوما کا تو وہ وطن تھا..... وہ تو اپنے گھر آرام سے چلی گئی ہوگی۔

شاہد کا نام ..... وہ اپنے لبوں پر اپنے ذہن میں بھی نہیں لانا چاہتی تھی ..... اندر ہی اندر اُس نے دعا مانگی اللہ وہ بچ جائے میری زندگی کا حصہ ہو یا نہ ہو شاہد اُسی طرح رہے جیسے میں نے آخری بار اُسے گلے میں گلاب کا ہار پہنے جمیلہ اور عابدہ کے ساتھ شامیانے میں آتے دیکھا تھا۔ لڑکیاں مہندی کے تھال اُٹھائے چلی آ رہی تھیں بیگم عباس آگے آگے کسی راجہ کے ہاتھی کی طرح سج بڑھ رہی تھیں اُس کے سسرال والوں پر پھولوں کی پتیاں گر رہی تھیں پھر پھاٹک کی طرف سے ایک خونخوار چیخ اُٹھی تھی گویا زلزلہ ہو پہاڑ پھٹے یا بادلوں سے بجلی کڑکے صبح نماز کے بعد جب قرآن کھول کر اُس نے پڑھا تھا تو پہلی سطر جو اُسے ملی یہی تھی۔ " اور وہ قوم ہم نے ایک چیخ کے ساتھ ختم کر دی۔ "

راحیلہ بڑی وہمی لڑکی تھی ..... وہ مشرقی لوگوں کی طرح اپنے آباؤ اجداد کی زندگیوں سے اپنے آپ کو علیحدہ نہ کر پائی تھی۔ رسم و رواج، شگون، بدشگونی، ماں باپ کا عطا کردہ علم، لوک کہانیاں، اکھان، فوک وزڈم سب کہیں اُس کے اندر رچ بس گئی تھیں ساری Collective Consciousness اُس کے لاشعور کا حصہ تھی ..... پتہ بھی ہلتا تو اُس کے

لیے کئی معنوں کے دروازے کھل جاتے.....دل میں اُس نے سوچا اگر اب کوئی کار سڑک سے گزری تو وہ واپس اندرون شہر
چلی جائے گی فی الحال اُس کی ٹانگوں میں اتنی سکت نہ تھی کہ اُسے کہیں بھی لے جاسکتیں۔

اُس کی نگاہوں میں ساجدہ ماں گھوم گئیں.....جانے کیوں وہ اُنہیں اماں یا امی کیوں نہیں پکارتی تھی۔ وہ اوما
کے ساتھ باہر سے آتی تھی اُن کے بازوؤں میں جنگلی گلاب، آڑو اور کینتھ کے پھولوں کی شاخیں تھیں اس شگوفوں کی وجہ
سے اُن کے ساتھ ہی بہار کمرے میں آگئی۔

ساجدہ ماں نے ایک کڑی نظر راحیلہ پر ڈالی اور پھر خاموش ہوگئیں جب اوما رخصت ہوگئی تو ساجدہ ماں نے
پکارا۔

''راحیلہ.....''

''جی ساجدہ ماں۔''

ساجدہ ماں نے سر پر دوہری ہکل لے کر اُسے پاس بلایا ''دیکھ بیٹا سر پر دوپٹہ، اوڑھنی لے کر پھرا کر.....میں
جانتی ہوں تجھے عادت نہیں ہے لیکن ابھی سے سر ڈھانپے گی تو عادت بھی ہو جائے گی۔''

''لیکن اوما تو دوپٹہ نہیں لیتی موسی تو اُسے کچھ نہیں کہتیں.....''

ساجدہ ماں جب بھی بچوں سے بات کرتیں اُن کا چہرہ عجیب سا ہو جاتا جیسے ابھی رو دیں گی ابھی ہنسنے پر آمادہ
ہو جائیں گی۔

''اُن کی مرضی بیٹیا.....ہم جس راستے پر ہیں ناں وہاں اپنی زیبائش چھپانے کا ہی حکم ہے.....ہم ترغیب کا
باعث نہیں بن سکتے.....وہ جس مارگ پر ہیں وہاں کے حکم احکام میں نہیں جانتی.....وہ اپنے احکام کا پالن کریں تم اپنے ماں
باپ کا حکم مانو.....ہے ناں.....''

راحیلہ نے منہ سا بنالیا.....بڑی مشکل سے وہ دوپٹے کو کندھے پر گھسیٹتی پھرتی تھی اب مواہ سر پر بھی اوڑھنے
کا حکم آ گیا۔

''دیکھو ناں.....راحیلہ.....سارے ماں باپ کا حکم ماننا مشکل ہے ناں.....بس تم میری اور ڈاکٹر صاحب کی سن لیا
کرو....''

''اور دادا جی.....وہ ؟.....''

''وہ تو سب سے پہلے بیٹی سب سے آگے، بڑے تو پھر سب کے بڑے ہیں''

راحیلہ نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا اور پلی پر یوں جم کر بیٹھ گئی گویا یہی اُس کا مسکن ہو جی میں اُس نے
سوچا.....

''اور ساجدہ ماں.....یہاں سے مجھے کہاں جانا ہے؟ یہ آپ کیوں نہیں بتاتیں؟.....دادا بابا آواز دے کر
سمجھائیں ناں، گیارہ برس کی عمر میں سر پر اوڑھنی پہننے والی اب ننگے سر، بے آسرا کہاں جاؤں؟.....مجھے تو اس شہر کے
راستے بھی اچھی طرح سے معلوم نہیں اور جب میں کسی سے راستہ پوچھتی ہوں تو وہ مجھے گھورتا.....میرے جسم کا ناپ نظروں

کی ٹیپ سے لیتا ہے۔"

لمحہ بھر کے لیے اُس کی نگاہوں کے آگے نجم کی شکل آ گئی.....وہ بیمار تھی۔اور کیمپ میں تھی۔ بابا فضل کھانا مانگنے باہر گیا تھا.....دالان میں کوئی نہ تھا۔ پتہ نہیں باقی لوگ کہاں تھے؟ اس اندھیر نگری میں کبھی کوئی آ جاتا اور معاً کوئی چلا جاتا۔ کچھ سامان کھلتا اور کچھ سامان بن کھلے ہی غائب ہو جاتا۔ اس پر سب کا حق تھا اور کسی کا بھی حق نہ تھا۔ یہ جگہ ملکیت کسی کی نہ تھی اور دھونس بھی جمار ہے تھے۔

اندھیرا کچھوے کی سست رفتاری سے بڑھ رہا تھا۔ اور شفق کی لالی بھی کی معدوم ہو چکی تھی لیکن ابھی پیپل کے پتے اس روشنی میں کھڑ کھڑاتے نظر آ رہے تھے۔ کچھ عورتیں اینٹوں کے چولہے بنا کر ان پر روٹیاں پکا رہی تھیں اور دھواں آبی لہروں کی طرح ڈولتا نظر آتا تھا۔

راحیلہ کا بخار تو تیز تھا لیکن تے کچھ دیر کو تھمی ہوئی تھی۔ پیٹ میں کچھ نہ تھا۔ جسم میں درد کے علاوہ اور کسی کیفیت کا اُسے احساس نہ تھا۔ اُس کے لباس میں پسینے کی وجہ سے کھٹی سی باس ناقابل برداشت تھی۔ اُس نے ماتھا پونچھنے کے لیے کمر کے نیچے سے دوپٹہ کھسکایا تو وہ پھٹ کر اُس کے ہاتھ میں آ رہا۔ اچانک اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اُس کا جی بے قرار ہو گیا.....وہ اس کیمپ سے بھاگ جانا چاہتی تھی..... کسی ایسی جگہ جہاں پنکھا چلتا ہو، برف ملا پانی مل سکے اور اردگرد شور نہ ہو.....اچانک نجم ادھر وارد ہو گیا اُس کی سکڑی سکڑی آنکھوں میں دبے دبے شعلے تھے..... چیتے کی سرخی آمیز آنکھوں سے مشابہ۔ راحیلہ خوف سے گٹھڑی بن گئی اُس کا جی چاہا کہ جلدی سے کوئی آ جائے.....

"تمہاری مشابہت میری ایک عزیزہ سے اس قدر ہے کہ جب بھی میں تمہیں دیکھتا ہوں مجھے وہ یاد آ جاتی ہے.....اور جب بھی اُسے دیکھ پاتا ہوں تمہارا چہرہ نظروں کے آگے اُبھر آتا ہے....."

"جی....." راحیلہ نے دوپٹے سے چہرہ پونچھ کر کہا۔

"کیمپ میں کب تک پڑی رہو گی نہ تو تمہارے بھائی نے تمہارا پتہ لیا نہ تمہارے منگیتر خبر لینے آئے.....کیا لاہور میں کوئی اور رشتہ دار نہیں ہے"

"جی نہیں.....ہمارے زیادہ رشتہ دار تو وہیں تھے سرحد پار..... کشمیر میں۔"

"کوئی سہیلی.....جاننے والے لوگ.....؟"

"جاؤں گی جی ذرا بخار اُتر جائے تے تھم جائے....."

نجم جو پروگرام بنا کر آیا تھا وہ بری طرح گڈمڈ ہو رہا تھا اُسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ اصل مدعا کس طرح بیان کرے وہ اپنی خواہشات کا بھی ٹھیک طور پر تجزیہ نہ کر سکا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ ایک رات کا قرب وہ کسی نہ کسی طور خریدنا چاہتا تھا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ وہ اس رات کیا کرنے والا ہے؟ عین ممکن ہے کہ واقعی درخت سے باندھ کر راحیلہ کو پیٹنے کی سعی کرے یہ بھی ممکن تھا کہ راحیلہ کو صرف صاف کپڑوں میں ملبوس دیکھنے کی خواہش تھی۔ اُس کے بعد کیا ہو گا اس کی تفصیل ابھی اُس کے ذہن نے تیار نہ کی تھی.....فرض کرو یہ میرے ساتھ چلنے پر رضامند ہو گئی تو؟ کیا میں اسے اپنی پرانی اقدار پر ایمان رکھنے والی مسلمان قسم کی ماں کے پاس لے جا سکوں گا؟ کیا بھابھی آمنہ کے پاس؟ کسی ہوٹل میں..... سٹیشن کے کسی ویٹنگ روم میں.....

باغ جناح کی بنچ پر بیٹھ کر؟.....اور سب کچھ تو الجھا ہوا تھا ایک بات بالکل طے تھی وہ اپنا مدعا عرض کیے بغیر نہیں جا سکتا تھا۔
نجم نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور آہستہ سے بولا.....'' میرے ساتھ چلو گی؟''
''جی کیوں.....کیا کام ہے؟''
''یونہی.....تفریح کی خاطر.....اس ماحول سے نکل کر.....تم ہلکا محسوس کرو گی.....''
''پھر بھی جی کام کیا ہے؟'' اُس نے بخار میں تپے چہرے سے پوچھا۔
''میں تمہیں سو روپے تک دے سکتا ہوں.....آسانی سے.....''
راحیلہ نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔
اُس کی آنکھوں میں دادا ابراہیم کا نورانی چہرہ گھوم گیا۔ اُس نے لمحہ بھر کو حیرانی سے نجم کی طرف دیکھا پھر اُس کے لب لرزے اور موٹے موٹے آنسو اُس کی گالوں پر رواں ہو گئے۔
'' جی میں ویسی لڑکی نہیں ہوں.....تفریح والی.....'' وہ جملہ مکمل نہ کر سکی۔
اس کی سسکی نے نجم کو وہاں ٹھہرنے کی مہلت نہ دی.....وہ جلدی جلدی قدم دھرتا وین کی طرف ہو لیا جہاں اُسے کھوئے ہوئے رشتہ داروں کے نام چپے بڑے بھونپو سے نشر کرنے تھے۔ اُسے عجیب قسم کی معذوری اور شرمساری نے گھیر لیا تھا۔ وہ ہرگز اُس نہج پر نہیں سوچ رہا تھا جس کا دھیان دل میں لا کر راحیلہ روئی تھی.....وہ ایک عرصے کے بعد دو حصوں میں بٹ کر سوچ رہا تھا کیا ایک ہی آدمی مارنے والا اور بچانے والا بھی ہو سکتا ہے؟
کیا واقعی چور اور قطب ایک ہی جسم کے محتاج ہیں؟
آدمی دو راہوں پر چل کر کیا کسی شاہراہ پر بھی پہنچ سکتا ہے؟
اپنی آزادی حاصل کرنے کے لیے اتنا گناہ، خون وکشت، بے گھری کیوں؟ یہ لوگ جو جان کی بازی لگا کر اپنا سب کچھ گنوا کر ایک آدرش کی خاطر یہاں پہنچے ہیں کیا یہی لوگ اپنے آدرش کا گلا بھی گھونٹ سکتے ہیں ؟
کیا دوہرا راستہ بھی ایک تھا ؟
راحیلہ کی آنکھوں سے جھڑی لگی تھی، اُس کے پیروں میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ بھاگ جاتی۔ اُس کی نگاہوں میں نجم ایک سہارے کی طرح اُبھرنے لگا۔ وہ اُس کی مدد کر سکتا تھا سٹرونیپٹ، بڑی بڑی بے باک آنکھوں میں کہیں اندر چھپی ہوئی شرماہٹ شاید نجم سے پیسے اُدھار لیے جا سکتے تھے.....شاید وہی اُس کا نجات دہندہ تھا.....؟
کیمپ کی بے سروپا زندگی سے چھٹکارا مل سکتا تھا.....اُس کے بزدلانہ آنسوؤں نے یہ راستہ بھی بند کر دیا۔
راحیلہ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور جم کر یوں بیٹھ گئی گویا یہی کیمپ اُس کا مسکن ہو، یادوں کے جو بنانے اُس کے ذہن میں رہ رہ کر چھوٹ رہے تھے وہ انہیں بند کرنے کے متعلق سوچنے لگی کیسے ہو کہ پرانی یادوں پر قفل ڈالا جا سکے وہ وقت بے وقت دھاوا نہ بھول سکیں۔
سڑک آباد تھی۔ سائیکل سوار آ جا رہے تھے۔ موٹروں کے ہارن اُس کے کانوں میں بجتے رہے۔ لوگ گزرتے رہے۔ راحیلہ سڑک کی جانب ملتفت نہ تھی، وہ اندر کے کچے پکے راستوں پر سرخ بتیاں نصب کرنا چاہتی تھی۔ کالج کا

بڑا اچھا تنگ اب بند تھا سہ پہر ہونے والی تھی۔ راحیلہ نے محسوس کیا کہ اب جلد ہی اُسے کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔

وہ کہاں جائے؟

شوکت مغل کے فلیٹ کا دروازہ بند تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا وہ کون ہے اور کہاں ہے؟

شاہد.....؟

دادا ابراہیم، ڈاکٹر سرفراز

اور پھر ساجد وہاں؟

یکدم اُسے خیال آیا کہ یہ جگہ بیٹھنے کے قابل بھی نہیں۔ جانے کتنے سڑ وہیت پہنے آوارہ قدم مجھ سی نہتی کمزور عورتوں کی تلاش میں نکلے ہوں گے۔

کس اعتماد پر..... کس بھروسے کی ڈھال لے کر.....

ہاں کیمپ ہی بہتر ہے۔ چلتی چلاتی، پوچھتی پچھاتی وہ کیمپ پہنچ سکتی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ وہاں شاہد اُسے تلاش کرنے آنکلا ہو؟ راحیلہ نے بہت رومانٹک ہوکر سوچا کہ.....کہ میں اپنا آپ شاہد کی آغوش میں اُنڈیل دوں اور سفر حیات ختم ہوجائے.....اور کائنات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تھم جائے.....

وہ آہستہ آہستہ سڑک کے کنارے چلنے لگی اُس نے دل میں سوچا کہ شائد عافیت اسی میں ہے کہ وہ بابا فضل کو ساتھ لے کر کیمپ کی طرف لوٹ جائے.....سڑک کی جانب پیٹھ کیے ایک آدمی اکڑوں بیٹھا تھا۔ پھر اُٹھ کر اُس نے ازار بند باندھنا شروع کر دیا راحیلہ نے خوف محسوس کیا اور قدم جلدی جلدی اُٹھانے لگی..... بابا فضل کا ہونا ضروری ہے۔ اُن کے بغیر کیمپ بھی غیر محفوظ ہوگا.....بس وہ کیمپ میں ہی رہے گی جب تک اُسے کوئی لینے والا نہیں آجاتا۔ لینے والا کب آئے گا؟ اس کے متعلق سر دست اُس نے سوچنے سے انکار کر دیا۔

"سوہنیو کدھر جانا ہے میں پہنچا آؤں....." پیچھے سے کھڑک دار آواز آئی۔

اُس کے قدم تیز ہوگئے..... یکدم اُسے قیصر یاد آنے لگا..... جب سے وہ قیصر منزل میں بیمار پڑی تھی۔ ڈاکٹر قیصر باقاعدگی سے صبح شام اُس کی خبر لینے آتا لیکن کبھی پانچ منٹ سے زیادہ کمرے میں نہ ٹھہرتا۔ کچھ دنوں سے اُس نے راحیلہ کا بلڈ پریشر چیک کرنا چھوڑ دیا تھا۔ بخار اُتر جانے کے باعث اب نبض دیکھنا بھی ضروری نہ تھا۔ قیصر جب بھی اُس سے بات کرتا نگاہیں جھکا کر بڑی شائستگی سے طبیعت کا پوچھتا۔ اس کی شائستگی، مودب انداز اور الگ تھلگ رہنے کے طریقے نے راحیلہ کو بڑے تحفظ کا احساس دلایا تھا۔

موڑ کاٹتے ہی نرسری کے آگے ٹین کی کرسی پر ایک آدمی بڑی بے حیائی سے بیٹھا تھا۔ اُس کی شلوار پر پان کے دھبے تھے ہاتھ میں پتلی سی چھڑی تھی اُس کا ایک سلیپر پاؤں میں اور دوسرا فرش پر تھا۔ اُس نے اپنے بہت سارے پیلے دانت نکال کر کہا

"بی بی اکیلی کدھر؟"

اکیلے گھومنے پھرنے میں ایک یہ بھی مشکل تھی!

دو سائیکل سوار اُسے تاڑتے ہوئے پاس سے گزر گئے۔ لیکن ایک طرح سے وہ مددگار ثابت ہوئے پیلے دانتوں والا ڈھٹھ کر اندر نرسری میں چلا گیا..... اپنی راہ چلتی راحیلہ سوچنے لگی وہ تنہا ہے بالکل تنہا..... اور جا بجا سبز وہیٹ والے، پیلے دانتوں والے، سائیکل سوار پھرتے ہیں۔ اور بھوک اندر سے پریشان کرتی ہے اور بے گھری کا تصور چین سے چلنے نہیں دیتا۔ یاس کسی اندھے کنوئیں کی طرف دھکیلتی ہے.... خوف ہر منظر کو چکرا دیتا ہے۔ جینے کی کوئی آبرو آمیز صورت نہیں اور مرنے کے لیے کوئی مناسب جگہ نہیں ملتی..... یکدم اُس نے اپنے بھائی شوکت مغل کے متعلق سوچنا چاہا.... کون جانے وہ کہاں تھا؟

شاید کسی ہسپتال میں ایسی لاشوں کے ڈھیر میں پڑا ہو جن کو شناخت کرنے کوئی نہ آیا تھا ؟..... وہ سب کہاں تھے؟ شاہد، ساجدہ ماں، دادا ابراہیم..... یکدم اُسے احساس ہوا کہ اُس کا جی متلا رہا ہے۔ وہ کسی جگہ بیٹھ کر سانس برابر کرنا چاہتی تھی۔ ایک کار اُس کے پاس سے گزر گئی۔ پھر کار بیک کرکے اُس کی طرف بڑھنے لگی۔ راحیلہ ایسے ڈری کہ اُس کا سانس پھول گیا۔ وہ چھپ جانا چاہتی تھی لیکن کوئی درخت قریب نہ تھا۔ اُس نے چیخنا چاہا لیکن ساری سڑک سنسان تھی اُس کی آواز سینے میں ہی کہیں ڈوب گئی۔ یوں لگا جیسے وہ مفت بک جائے گی پھر اُس کے قدم لڑکھڑا گئے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ وہ یہ دیکھ نہ پائی کہ سامنے سے قیصر آ رہا ہے۔ وہ پینٹ سوٹ میں ملبوس ایک مرد کو دیکھ کی..... گھبرا کر اُس نے ہاتھ جوڑ لیے اور چلائی.....

''جناب میں مہاجر لاوارث نہیں ہوں میں ڈاکٹر سرفراز مغل کی بیٹی ہوں، حکیم ابراہیم مغل کی پوتی ہوں جی..... ایویں کیویں نہیں ہوں جی.....''

قیصر نے اُسے کندھوں سے پکڑ کر جلدی سے کہا..... ''راحیلہ..... راحیلہ جی..... بیٹھئے آپ اکیلی کیوں آئیں..... باباجی کو ساتھ لے آتیں ''

لیکن راحیلہ آنکھیں بند کیے سر دائیں بائیں پاگلوں کی طرح ہلاتی بولتی گئی..... ''جی میں ویسی لڑکی نہیں ہوں..... جی میں نہیں ہوں.....''

''مجھے پہچانو راحیلہ مجھے.....''

پھر قیصر نے راحیلہ کو تھپا بھر کر اٹھا لیا اور فرنٹ سیٹ پر لا ڈالا۔ راحیلہ نے مکوں اور تھپڑوں سے قیصر کا مقابلہ کیا لیکن کار چلتی رہی اور قیصر آہستہ آہستہ اُسے تسلیاں دیتا رہا۔ پھر راحیلہ نے یکدم چلا کر کہا..... ''کار روک لیں قیصر..... مجھے قے آئی ہے.....''

اب قیصر کو راحیلہ نے پہچان لیا تھا۔ اور اُس کی بے بسی آنسوؤں میں ڈھل گئی تھی کچھ لمحوں کے لیے شاہد کا چہرہ قیصر میں ڈھل گیا تھا..... اُس نے ہولے سے قیصر کے ونگل والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا۔

''مجھے کہیں چھپا لو قیصر..... مجھے کہیں لے چلو..... میں..... یوں..... نہیں رہ سکتی..... بے سہارا۔''

اس کے بعد وہ سارا راستہ خاموش رہے۔ دونوں اپنے اندر چلے گئے تھے۔

اُس کی نظروں میں تسنیم آپا گھومنے لگیں۔ وہ چاہتی تھی کہ شاہد کے ساتھ ویسی ہی وفا کرے جیسی تسنیم آپا نے

اپنے شوہر کے ساتھ کی تھی.....لیکن اُسے پرانی وفا پر نئی خوشی کو قربان کرنا نہیں آرہا تھا.....آدرشوں کی پاسبانی کیونکر کی جاتی ہے؟

پرانے لوگ، پرانا وطن ... پرانی محبت.....تبدیلی کہیں سے آ چکی تھی۔ اور اپنا لوہا منوانے پر تلی ہوئی تھی.....وہ گم سم قیصر منزل میں جذب ہونے لگی۔ اب وہ صحت مند ہو کر کچھ کچھ ماضی کو بھولنے لگی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد اُس کا خون دھیرے دھیرے اُس کے دماغ کی طرف بھی گردش کرنے لگا، اُس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک آ گئی اور تھکتے ہوئے ذہن پر واقعات کی اصلی نوعیت کھلنے لگی تھی۔ جب وہ قیصر منزل میں داخل ہوئی تو اُس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے اور غنودگی اور بے ہوشی کا سا عالم طاری تھا لیکن قیصر کی بانہوں کے سہارے جب وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو اُسے کمرے سے ویسی ہی باس آئی جیسی اباجی کے کمروں سے آیا کرتی تھی، پلنگ کے پاس ڈرپ کا سٹینڈ پڑا تھا۔ اور تپائی پر دوائیوں کی بوتلیں دھری تھیں۔

معاً اُسے گاڑی والا واقعہ یاد آ گیا۔ یہ یادداشت اُس کے ذہن میں یوں ہتھوڑے لگانے لگی گویا لکڑی کے دروازے میں لکڑی کی کیل بلا تکلف اترتی جا رہی ہو۔ راحیلہ نے چہرہ دوسری جانب کر لیا۔ اُس کے اندر بین کرتی سول لائنز گھوم گئی۔ پھر اُس سڑک پر ابراہیم لاج جو نیم حویلی، نیم کوٹھی تھی جس کے پورچ میں گولائی سے سڑک داخل ہوتی ہوئی نیم دائرہ بناتی باہر چلی جاتی تھی۔ سامنے کشادہ لان تھی۔ جس میں ایک طرف بیڈمنٹن کورٹ بنا تھا۔ سڑک سلیٹی بجری اور اُس پر کرکراتی آنے والی شاہد کی پرانی فوٹ.....گیراج کو کبھی پالش نصیب نہ ہوئی تھی۔ پھر بھی وہ بڑا اکلاسیک لگتا تھا۔

اُسے ڈرائنگ روم یاد آ گیا جس میں کریتوں کے سبز پردے اور زنتھ کا ریڈیو تھا۔ اونچی پشت والے صوفے ...اور کونے میں پڑا دیوان جس پر بھاری بھرکم گاؤ تکیے لدے تھے.....اُس کے کمرے کا بھاری بھرکم کالے شیشم کا پلنگ اور کپڑوں سے لدی الماری.....وہ تو جس وقت بھی ابراہیم منزل گئی اُسے یہی احساس ہوا کہ یہی آخری بسیرا ہے.....میرا گھر ہے.....یہاں سے کسی کو کہیں نہیں جانا.....اُس نے اپنے کمرے کو نئی طرح آراستہ کیا تھا۔ وہ اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ کر اُس وقت کو یاد کرنا چاہتی تھی جب شامیانے کے اندر شاہد داخل ہوا تھا۔ اُس کے اردگرد مہندی سجے تھال اُٹھائے بیگم عباس اور جمیلہ تھیں.....اور پھر.....اور پھر.....؟

"آپ نے چہرہ کیوں ڈھانپ رکھا ہے.....؟" قیصر نے آہستہ سے پوچھا۔

"میں.....مجھے کیا ہو گیا ہے؟ ......میں .....؟ کیا میں بیمار ہوں ڈاکٹر صاحب؟"

قیصر نے پلنگ کے آخری سرے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ کو کچھ نہیں ہوا.....دراصل یہ Nervous exhaustion.....اور.....تھوڑی سی weakness تو اس حالت میں ہو ہی جاتی ہے....."

"کیسی حالت میں.....آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"جب میں آپ کو کیمپ سے یہاں لایا تھا تو مجھے صرف شبہ تھا میں sure نہیں تھا لیکن اب بلڈ رپورٹ آ گئی ہے ویسے بھی لیڈی ڈاکٹر آپ کو دیکھ چکی ہیں۔"

وہ اُچک کر بیٹھ گئی۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟....."

"آپ حاملہ ہیں۔ ساتھ ہی آپ کو ہیضہ بھی ہو گیا تھا کیمپ میں.....لیکن.....اب آپ کو فکر نہیں کرنی چاہیے۔

you are in safe hands

وہ کچھ بولنا چاہتی تھی پوچھنا چاہتی تھی.....کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا کب ہوا؟.....بہت سارے سوال اُس کے ذہن میں جاگ اُٹھے تھے.....

"آپ زیادہ پریشان نہ ہوں.....ایسے ہو جاتا ہے.....آپ اس قدر بیمار تھیں کہ آپ کو علم نہ ہوا.....یہ بچہ....."

لیکن اس کا باپ کون ہے ڈاکٹر صاحب.....یہ کس طرح ممکن....."

"یہ بچہ نہ آپ کا ہے.....نہ کسی اور کا.....یہ حادثات کی اولاد ہے.....کبھی کبھی کسی شخص میں شیطان یوں وارد ہو جاتا ہے جیسے گلاس میں شراب۔ کبھی گلاس سے کسی نے پوچھا کہ وہ شراب کو قبول کرتا ہے کہ نہیں؟ آپ اپنے آپ کو دُکھ نہ دیں سوچ کر.....جب جنگیں ہوتی ہیں.....نئے ملک بنتے ہیں جب لوگ exodus کی حالت میں نکلتے ہیں تو بہت کچھ ہوتا ہے قوموں میں حالات، حادثات کا عمل پھر جاتا ہے.....اگر آپ.....مان جائیں تو قیصر منزل ہم دونوں کا گھر بن سکتی ہے.....اور اس بچے کا بھی جو ہم دونوں میں سے کسی کا بھی نہیں....."

راحیلہ نے سر جھکا لیا.....اُس نے شکستہ دل ہو کر پوچھا.....بھلا اب میں شاہد کا انتظار کیسے کر سکتی ہوں ؟

"کیا آپ مجھے قبول کر لیں گے .....؟ "

قیصر نے آگے بڑھ کر اُس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔" اُس بھیڑیے کے متعلق مت سوچیں جس نے آپ کی بے ہوشی کا فائدہ اُٹھایا.....اُس مسرت کے متعلق سوچیں جو یہ بچہ ہم دونوں کو دے سکتا ہے۔ خدائی مہمان کے لیے ہم دونوں کو کھلے بازو لے کر آگے بڑھنا چاہیے.....آپ اُس شخص کو بھی معاف کریں جو اس ایذا کا باعث بنا.....کبھی کبھی مرد اس قدر حسن دیکھ کر دیوانہ بھی ہو جاتا ہے۔"

اور شاہد؟

اور تسنیم آپا؟

کیا اپنے آپ سے کیے گئے وفا کے آدرش کا پالن کیا جا سکتا ہے؟

" میں جانتا ہوں ابھی تم قیصر منزل کو اپنا سمجھنے سے قاصر ہو ابھی تم مجھے بھی اپنا نہ سکو گی.....میں جانتا ہوں ایسی باتوں میں بہت وقت لگتا ہے.....ایک عمارت تعمیر کرنے میں وقت لگتا ہے یہ تو پھر دلوں کی ویرانی ہے اسے آباد کرتے تو عرصہ لگ جائے گا لیکن تبدیلی انسانی تقدیر کا ایک لازمی جزو ہے، آدمی کو ضد سے ایک ہی مقام پر کھڑے نہ ہو جانا چاہیے.....ہمیں ہر صورت آگے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا ہو گی.....

قیصر نے ہاتھ چھوڑ دیے اور جلدی سے لوٹ گیا۔

بابا فضل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر قیصر نے کہا..... " بابا جی..... جو واقعہ آج ہوا ہے وہ دوبارہ نہیں ہونا چاہیے۔ راحیلہ کو کہیں اکیلے آنے جانے کی عادت نہیں ہے۔ اگر وہ کہیں جانا چاہے تو آپ اُن کے ساتھ رہیں..... "

بابا جی نے لمبا سانس بھرا..... " میرے جیسے تو اُس کے ملازم ہوتے ہوں گے ڈاکٹر صاحب میں اُسے کیا کہہ سکتا ہوں۔ "

" اُسے بہت آرام کی ضرورت ہے..... وہ کئی قسم کے حادثات سے گزر رہی ہے اُسے خود بھی معلوم نہیں کہ اتنی ڈھیر ساری مصیبتوں کا وہ کیسے مقابلہ کرے۔ "

" مصیبت تو ہم سب پر سانجھی پڑی ہے ڈاکٹر صاحب لیکن بابائے قائداعظم نے ہماری آنے والی نسلوں کو بڑی مصیبتوں سے بچا لیا..... ہم وہاں رہتے ہندوستان میں تو بھی اوکھے رہتے یہاں آئے ہیں تو بھی مشکلیں ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتیں لیکن یہ میرا ایمان ہے..... آنے والے لوگ سر اُٹھا کر چلیں گے ڈاکٹر صاحب وہ سید ھا دیکھیں گے کسی کے آگے سچ بولنے سے نہ ڈریں گے۔

بابا فضل کی طرف ہلکی سی نظر ڈال کر قیصر نے کہا " میں اس محلے میں کچھ ایسا مقبول بھی نہیں ہوں بابا جی اور گاؤں سے اتنی جلدی گھر والے نہیں آ سکتے۔ محلے والی عورتوں کو راحیلہ پر زیادہ دباؤ نہ ڈالنے دیں اُسے آرام کی سخت ضرورت ہے..... "

بابا فضل نے بڑی محبت سے قیصر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور آواز گرا کر بولا..... " بیٹا تو نے بہت ہی اچھا کیا..... جانے کس اونچے گھرانے کی لڑکی ہے اس کے گھر والے زندہ بھی ہیں کہ نہیں اور پھر..... اتنی بیمار رہی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا تھا کہ اسے کچھ بھی یاد نہیں نہ اپنا گھر بار نہ گھر والے نہ اپنا نام..... اچھا کیا اچھا کیا..... اللہ اجر دے گا..... وہ کارساز ہے مسبب الاسباب ہے۔ "

سورج ڈوب چکا تھا۔ راحیلہ بہت دیر کے بعد سو کر اُٹھی تھی اُس نے اپنے ہاتھ دیکھے اُن پر مہندی رچی تھی۔ اُس کے جسم پر سرخ لباس تھا۔ باہر لڑکیاں ڈھولک پیٹ رہی تھیں۔ یہ گانے والیاں کون ہیں۔ میں نے عروسی لباس کب اور کیسے پہنا..... لمحہ بھر کو اُسے لگا جیسے ابھی شاہد اندر آئے گا۔ اُس نے اپنے ہاتھ چوم لیے اور پھر اُنہیں گالوں سے لگا لیا.....

پھر سر جھٹک کر راحیلہ نے حقیقت کو سمجھنا چاہا۔

یہ سب کچھ میں نے کیسے قبول کر لیا ؟ میں بار بار سب کچھ کیوں بھول جاتی ہوں؟

میں..... میں کون ہوں؟ یہ قیصر منزل ہے کہ ابراہیم لاج..... یہ کس کا بیاہ ہے..... یہ جوڑا تو ابراہیم لاج میں ہینگر پر ٹنگا تھا۔ کس ارمان سے تسنیم آپا اور ساجدہ ماں نے اُس گلابی ارغوانی جوڑے کو بنایا سجایا تھا۔

اُس نے غور سے سننے کی کوشش کی۔ گیت مانوس تھا لیکن اس کا مفہوم اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے سوچا ان عورتوں کی آواز میں اس قدر دُکھ کیوں رچا بسا ہے..... آواز آ رہی تھی۔

سوئے وے چیرے والیا مَیں کل تو ڑی وا

بانہہ تیرے وے ماہیا کسے نہیں لوڑی وا

ٹھہرو..... ٹھہرو..... ذرا رک جاؤ..... تمہارے علاوہ بھی پچھلے دنوں میں نے کچھ چیزوں کی ضرورت محسوس کی ہے..... میں نے ہوش و حواس کی خواہش کی ہے..... لوگوں کی حریص نگاہوں سے پناہ مانگی ہے..... میں نے اپنے جسم کو زندہ رکھنے کے لیے خوراک کی تلاش کی ہے، دواؤں کی آرزو کی ہے..... میں نے مرنا نہیں چاہا۔ میرا سب سے بڑا گناہ ہی یہ ہے کہ سب سے بچھڑ کر میں نے مرنے کی تمنا نہیں کی..... اپنی حیات کا جس سلسلہ نہیں توڑ سکی..... زیست سے یہ محبت میرے دل میں کیوں پیدا ہوئی۔ ذلت کی آخری دیوار سے ٹکرا کر بھی میں نے جینا چاہا..... یہ گتھی میں سلجھا نہیں سکی کہ میں نے یہ فیصلہ اپنے لیے کیا کہ کسی اور کی جان بچانے کو..... کیا دنیا میں نئی آنے والی روحیں بھی انسانوں سے کچھ فیصلے کرا لیتی ہیں کیا اُن کا اختیار ہم پر چلتا ہے..... خود میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تو میں تمہیں کیا سمجھاؤں کیمپ میں کسی نے مجھ سے کیا حرکت کی؟..... کیا جواز پیش کروں اس بے وفائی کا جو وفا سے کم نہیں۔

اُس کی زبان چپ تھی لیکن اندر مکالے مسلسل چل رہے تھے۔ دو لڑکیاں اُس کے پلنگ پر بیٹھی تھیں ایک لڑکی سرخ رنگ کی نیل پالش اُس کے پیروں پر ایسے لگا رہی تھی کہ انگلیوں پر جا بجا دھبے پڑ رہے تھے جن کو وہ روئی کے پھائے سے گھسیٹ پونچھ کر صاف کر رہی تھی۔

شاید کیا تم آشنا ہو کہ بھوک کیا ہوتی ہے؟ بے ہوشی میں خواب میں تم نہیں تھے بلکہ روٹیاں تھیں، کانٹے چمچے بجنے کا شور تھا میں یہ شور ایسے سنتی تھی گویا کوئی مدت کا ترسا ہوا قیدی آزادی کا پروانہ سنتا ہے..... ہاں بھوک..... ایسی بھوک جو دل و دماغ کے سارے گوشوں سے لہو کھینچ کر پیٹ میں لے جاتی ہے..... محبت، التفات، خلوص سب بے معنی لفظ ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں حیات اپنے آپ کو برقرار رکھنے کے لیے ساری ذلتوں سے گزر جاتی ہے، جن لوگوں نے کبھی کچھ نہیں مانگا ہوتا وہ آدھی روٹی کے لیے جھولی پھیلاتے ہیں، تمہیں کیا معلوم میں ہوش اور بے ہوشی کے کن لمحوں سے گذری ہوں..... تم اس وقت کیوں سمجھ نہیں پا رہے کہ میں کوئی ارفع و اعلیٰ شے نہیں ہوں..... فرشتہ نہیں ہوں، انسان ہوں گوشت پوست کا..... میں آپا تسنیم نہیں ہوں جو آدرش کی خاطر بڑی سے بڑی خوشی کو چھوڑ سکتی تھی۔

کیا میری حالت میں تسنیم آپا بھی میری طرح ہتھیار ڈال دیتی..... تسنیم آپا جو بڑے غرور سے کہتی تھی..... محبت ایک ابدی جذبہ ہے راحیلہ، میرے شوہر کی موت کے یہ معنی تو نہیں کہ میں..... اُس کے منہ موڑتے ہی میں ایک اور آغوش تلاش کر لوں..... اگر کوئی روزِ محشر ہوا..... تو میں اُسے کس منہ سے جواب دوں گی..... کیا جواز دوں گی میں اپنی بے وفائی کا؟"

اگر تسنیم آپا میری طرح کیمپ میں بے سدھ پڑی رہتی..... اگر بھوک سے اُس کا سارا بدن بغاوت پر آمادہ ہو جاتا۔ اگر..... اُس کے جسم میں کوئی اور روح پل رہی ہوتی اور اُسے علم بھی نہ ہوتا کہ اس روح کو لانے والا کون ہے؟..... تو..... تسنیم آپا کے گرد تو تقدس کا ہالہ تھا..... شاید..... وہ مر جاتی..... لیکن تسنیم آپا کو بھی تو سکھ کل کنین اُس کی آنکھوں کے سامنے گھسیٹ کر لے گئے تھے..... شاید وہ بھی اپنی وفا کی پاداش میں گینگ ریپ تک پہنچی..... اچھا ہی ہے اُس نے دل میں سوچا تسنیم آپا یہاں نہیں ہیں۔

لڑکیاں باہر ڈھولک کی تھاپ پر گا رہی تھیں

"نماں نماں دیوا بلے..... کنڈیاں دے اُس پار"

یہ نماں نماں دیا تسنیم آپا تھیں جو اُس کے ذہن کے کسی گوشے میں جل بجھ رہا تھا۔ جو اُسے غلطی کا احساس دلا رہا تھا۔ وہ غلطی جس کے بارے میں وہ نہیں جانتی تھی اور وہ غلطی جواب کر رہی تھی۔

''راحیلہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ یہ قیصر منزل.....؟''

'' آپ مانیں گی تو نہیں پر میں زندہ رہنا چاہتی ہوں..... آخری بار اُسے دیکھنے کے لیے..... میں شاہد کو دیکھے بغیر مر نہیں سکتی تسنیم..... آپا اور اگر میں یہ شادی نہ کروں..... تو میں زندہ نہیں رہ سکتی.....''

لیکن اندر کے مکالمے سے خود اُس کی تسلی نہیں ہو رہی تھی شاہد اُس کی کسی بات کا یقین کیونکر کر سکتا تھا ؟ اُس نے کیچس کرنے والی لڑکی سے پاؤں چھڑائے اور اُٹھ کر ایک صوفے پر الگ تھلگ بیٹھ گئی۔ وہ اونچے اونچے رونا چاہتی تھی لیکن اُسے اچھی طرح سے حالات سمجھ نہ آ رہے تھے وہ حقیقت، خواب، تخیل کی ایسی سرحد پر تھی جب تلازمہ خیال، کشف کی حدود کو چھونے لگتا ہے، بڑے تخلیق کاروں کی طرح وہ فعال متخیلہ کو چھونے لگی تھی اب اُس کے اردگرد کا ماحول دھندلانے لگا تھا اور وہ ابراہیم لاج میں تخت پوش پر بیٹھی تھی تسنیم آپا اُس کے سامنے دھاری دار نیلی قمیص پہنے سراپا استفسار کھڑی تھی.....

''سنو راحیلہ یہ سب مسخرہ پن کیا ہے؟ اگر کسی وقت شاہد نے تمہیں ڈھونڈ لیا، وہ تم تک آ پہنچا تو وہ تمہیں کسی اور کے پہلو کی زینت بنے دیکھ کر کیا محسوس کرے گا..... سوچو تو کیا وہ یہ بے وفائی برداشت کر سکتا ہے ؟ بولو.....''

اُس پر حقیقت اور تخیل باری باری دھاوا ڈال رہے تھے۔ راحیلہ نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ جب تسنیم آپا بھی سمجھ نہ پا رہی تھی تو شاہد کیونکر سمجھ پائے گا؟ اُس نے ہوش اور بے ہوشی کے درمیان اپنی ساری کائنات کو گڈمڈ دیکھ لیا تھا۔ اُس کے اندر مسلسل چینی کے برتن ٹوٹ رہے تھے پھر اُس نے پانی مانگا جو ترنت ایک لڑکی نے پیش کر دیا۔

اُسے لگا پہلی بار اُسے عمر قید کی سزا دی گئی ہے اور اُس نے بخوشی، رضا و رغبت کے ساتھ اسے قبول کر لیا ہے۔

ایک بار پھر وہ مڑی اور صوفے میں دھنس گئی، آہستہ آہستہ آنسو اُس کے چہرے پر گرنے لگے۔

''باجی چپ کر جائیں..... باہر نکل کر دیکھیں کتنی عورتیں بے گھر ہوئیں ہیں۔ کون کون اپنوں سے بچھڑ گیا ہے..... آپ تو پھر خوش قسمت ہیں آپ کو ڈاکٹر قیصر پوچھنے کو مل گئے..... ایسی بھی ہیں جن کو نہ گھر ملا..... روئیں ناں اللہ کا شکر کریں باجی.....'' کندھا تھپتھپانے والی نے امید کی طرف اُس کا بازو گھسیٹا۔

ہاں رونے سے کیا حاصل ہوگا ؟ یہ برسات اُن منظروں کو تو نہ دھو سکے گی جو اُس کی فعال قوت متخیلہ نے جگا دیے تھے۔ اُن زخموں کو تو نہ مندمل کر سکیں گے جو عزیزوں کی فرقت کے عطا کیے تھے۔

اُسے خیال آیا..... ہاں شاہد تو اس افراتفری میں مر چکا تھا شائد فسادات میں نوجوان قتل ہو چکے تھے اور عورتیں زندہ تھیں اپنے زخمی وجود کے ساتھ..... دوسروں کے گناہوں کا بوجھ اُٹھائے..... وہ گھوم رہی تھیں ماضی حال اور مستقبل کے درمیان ابابیل کی صورت چنگاریاں بن کر.....

ہاں تو شاہد مر چکا ہوگا کسی نے اُس پر حملہ کر دیا ہوگا..... وہی شاہد جو بڑے شوق سے دھوئیں کے مرغولے اُڑایا کرتا تھا۔ وہی شاہد جو مولسری کے درختوں تلے اُس کا انتظار کیا کرتا تھا۔ پھر او ما اور وہ اکٹھی باہر نکلتی تھیں..... وہ شاہد جو

زرد کپڑوں میں ملبوس مہندی کی رات شامیانے تلے کھڑا تھا۔ کتنے اصرار سے بیگم عباس نے ساجدہ ماں کو منایا تھا کہ وہ مہندی کی رات ضرور شاہد کو ساتھ لے کر آئیں گی..... ہال کی گھری سے سانجن کے گاؤں تک صرف ایک سڑک کا فاصلہ تھا ..... ایک دن کا..... پھر یہ مسافت پھیل گئی..... مہندی والی رات بھی اس نے تسنیم آپا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا .....

"یہ سب سچ نہیں ہو سکتا۔ آپا تسنیم..... مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا..... یہ..... اتنی ساری خوشی میں کیسے برداشت کروں گی..... یہ جھوٹ ہے، خواب ہے میرا....."

اور تسنیم آپا نے اُسے سینے سے لگا کر کہا تھا..... "بے ہا جھلی۔"

وہیں تسنیم آپا کے ساتھ لگ کر وہ سسکنے لگی تھی۔ اُس کے دل کے کسی نامعلوم گوشے سے ناگہانی ان گنت خوف پھنکارتے ہوئے نکل آئے تھے۔ اُس نے ان دیکھے مستقبل میں اپنے لعال تخیلی کی مدد سے جھانک کر دیکھ لیا تھا۔ گھر چھوڑنے کا غم نہ تھا۔ تسنیم آپا سے بچھڑنے کے آنسو نہ تھے..... ساجدہ ماں کی جدائی کا رونا نہ تھا..... بلکہ اُس کے اندر کسی اندھے شگون کی طرح یہ غم چکر لگا رہا تھا کہ وہ اور شاہد کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے..... کوئی انجانی طاقتیں اُن کے درمیان دیوار اُسار رہی ہیں..... وہ بچھڑ کر رہیں گے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے..... قدرت اتنی خوشی کی اجازت کب اور کسے دیتی ہے؟ کوئی خوف اُس کے اندر قہقہے لگا رہا تھا۔ کیا آج صبح تمہاری کانچ کی زرد چوڑیاں ٹوٹ نہیں گئی تھیں؟ کیا دودھ کا گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر نہیں گرا تھا؟..... بتاؤ کیا کالی بلی تمہارے عروسی جوڑے سے نہیں نکلی کل رات؟ رامیلہ..... دیکھ لو سوچ لو..... یہ سب کچھ سچ نہیں ہو سکتا۔ اپنے نوشہ کو زرد کپڑوں میں آخری بار دیکھ لو..... یہ سب کچھ اتنا حسین ہے کہ سچ نہیں ہو سکتا..... اتنی ساری محبت کا انجام خوشی پر منتج نہیں ہو سکتا۔ قدرت آج تک کسی پر اس طرح مہربان نہیں ہوئی....."

اپنے مہندی رنگے ہاتھوں پر، عروسی جوڑے پر نگاہ ڈال کر رامیلہ نے سوچا..... اور یہ قیصر کون ہے؟..... ضرور قیصر کو معلوم ہو گا کہ شاہد مر چکا ہے۔ جب بلوائی شامیانے تلے کوندے تھے مہندی کے تھال رو دیا گیا ہے کے ہاتھ سے تھے جب لڑکیاں ڈھولک اور عورتیں بچے چھوڑ کر بھاگی تھیں تو وہ بلوائی شاہد کی طرف بڑھتے تھے اُن کے ہاتھوں میں کرپانیں تھیں اور وہ انسانی مخلوق نہیں لگتے تھے۔

ہاں وہ مر چکا ہو گا۔

پھر کسی نے اُسے اپنے کندھے پر اُٹھایا تھا..... وہ مالا کا بھائی تھا۔ اور اُسے کندھے پر اُٹھائے وہ شامیانے سے بھاگ نکلا تھا۔ مالا کے بھائی کاش تم مجھے اُسی کانت تم نے مجھ پر بلوائیوں سے زیادہ ظلم کیا۔ ہاں محسن اس جرم کے پردے میں تم نے مجھے تباہ کر دیا۔ کاش میں اپنے دولہا کے قدموں میں موت سے ہمکنار ہو جاتی آنکھوں سے آنسو پونچھتی ہوئی اُس نے جی میں کہا..... جو کچھ اب ہو رہا ہے اُس سے بدتر اور کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ وہ زبردستی کا اغوا تھا اور اب میں اپنی مرضی سے اپنی رضامندی سے اغوا ہونے پر تیار ہوں۔

دیکھو شاہد میں دنیا کے کسی گمنام کمرے میں پڑی سسک رہی ہوں اور تم جانے کہاں ہو تو زندہ ہو..... سارا میلوڈراما نہیں ہے۔ جیپ چہاتی جذباتیت نہیں ہے مجھے تم سے خوف آ رہا ہے شاہد..... اگر تم زندہ ہوئے تو پھر میں تمہارے غصے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ تم روٹھ جایا کرتے تھے تو ساری سہیلیاں خود بخود دم گھوٹ کر مر جاتی تھیں تم ناراض

ہو جایا کرتے تو دنوں دن سورج نہ نکلتا.....سنو شاہد.....سنو.....میں تمہیں کیسے بتاؤں میرے اندر پلنے والا بچہ کس کا ہے.....؟ جب میں خود نہیں جانتی تو تمہیں کیا بتاؤں؟

وہ صوفے سے یکبارگی اُٹھی اور بانہیں پھیلا کر قالین پر آگے بڑھی لیکن اس دیوانگی کو سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔ اُس کا دل دماغ سے ان گنت اُلجھتے سوال پوچھ رہا تھا۔ وہ لوگ کہاں ہیں جن سے ہم نے محبت کرنا سیکھی۔ وہ ادھوری مدفن کہاں ہیں جن پر ہم دنوں دن پھول برساتے رہے ہیں۔ وہ یادیں کہاں ہیں جن سے زندگی کی خزاں بہار میں بدل جاتی ہے.....وہ لوگ جن پر ہم نے بھروسہ کرنا سیکھا۔ دماغ کی تھکی ماندی کوشش نے دل کو سمجھانا چاہا کہ یہیں کہیں.....یہیں کہیں تمہارے پاس.....یہیں۔

پھر بابا فضل نے اُسے سمیٹ لیا۔

''یہ پھر بے ہوش ہو گئیں.....جلدی سے پانی لاؤ کوئی.....پھر بے ہوش ہو گئی ہے۔''

ڈاکٹر قیصر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اُس کے جسم پر نہ کوئی شیروانی تھی نہ گلے میں ہار.....برات کو نہ کہیں جانا تھا نہ کہیں سے آنا تھا۔ نیچے گلی میں کچھ ہمسائے اکٹھے ہو چکے تھے۔ گھر کے پچھواڑے دیگیں کھنکنے کی آواز آ رہی تھی۔ پتہ نہیں کون بیاہ رچا رہا تھا۔

قیصر کے سامنے نجم بھی گم سم بیٹھا تھا۔

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا قیصر۔ پہلے اُسے کیمپ سے اغوا کیا اب زندگی سے بیزار ہے ہو۔ کل کلاں اگر کوئی جائز وارث آ گیا.....اُس کا شوہر، باپ، بھائی.....پھر؟.....''

''اُس کا کوئی شوہر نہیں ہے.....وہ کنواری ہے.....''

یکدم.....قیصر اپنے اس جملے پر خود حیران رہ گیا.....اگر یہ بچہ جو.....راحیلہ کے بدن میں پل رہا تھا اُس کے جائز شوہر کا ہوا تو پھر.....

''اول تو.....یہ لڑکی عجیب دفریب ہے...شائد اس عہد کی ساری لڑکیاں ہی عجیب ہیں لیکن.....راحیلہ.....''

''خیر.....خیر.....لیکن مجھے یوں لگتا ہے اس کی دماغی حالت ٹھیک نہیں.....اسے ذرا نارمل ہو جانے دیتے..... مجھے تو اس کی آنکھوں میں وحشت نظر آتی ہے۔ پاگلوں کی سی.....کون جانے جب.....یہ اس Trauma سے نکلے، اس وحشت سے حقیقت میں آئے تو کیا بتائے۔ تمہیں اس قدر جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے تھا۔''

قیصر نے نجم کو بتانا چاہا کہ ایک اور ذی روح کو بھی اس دنیا میں ویزے کی ضرورت تھی وہ بھی جینے کے لیے کچھ سیدھی سادی شناخت چاہتا تھا۔ لیکن پہلی بار قیصر اور نجم میں ایک راز نے جنم لیا۔ وہ کسی قیمت پر بھی نجم کو بچے کی آمد کے بارے میں بتانا نہ چاہتا تھا۔

کیا صرف بچہ اس فیصلے کا ضامن تھا؟

کیا شربتی ہونٹوں والی شہد رنگی آنکھوں والی راحیلہ وجہ نہ تھی؟ قیصر اپنے اندر شرمندہ سا محسوس کر رہا تھا۔ آج تک

اُس نے نجم سے کوئی راز نہ چھپایا تھا۔ لیکن اب اُسے لگتا تھا گویا وہ اپنے اندر کی نیت پر خود پر پوری طرح اعتماد نہیں کرسکتا اس اچانک فیصلے کے پیچھے کونسا جذبہ تھا؟.....راحیلہ کا بچہ؟

وہ اس معاملے کو سمجھنا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کی نیت خود پوری طرح اُس پر عیاں تھی۔

مرد عام طور پر کھدر کا لباس پہنتے تھے۔ کھردرا، آرام دہ، ڈھال نما، منفعت بخش، لیکن یونہی اکھڑ، حقیقت پسند، کو کسی عورت سے محبت ہوجاتی ہے وہ ساٹن کا ٹکڑا بن جاتا ہے۔ ریشمی، ملائم، چمکدار، لُس لُس کرتا، ہاتھوں میں پھسل جانے والا، محبت رات بھر کی ہو یا لمبی مسافت کا نادیدہ سفر یہ تبدیلی کم ہو یا زیادہ خود مرد پر واضح ہو یا غیر واضح.....وہ خوش آئند نتائج کا آرزو مند ہو یا جاہ کُن مستقبل سے خوفزدہ۔ محبت کی جادوگری، محبت کی چاندنی مرد پر بکھرتے ہی اُس کی شخصیت کو چند ماہ میں بدل دیتی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں دلآویز چمک، ملائمت اور نمی آجاتی ہے جس کا بظاہر اُس کی معروضی، حقیقت پسند اکھڑ زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اُس کی طاقت، قوت فیصلہ، تختی، کمزوری میں بدلنے لگتی ہے۔ وہ بدلا بدلا سا نظر آنے لگتا ہے۔

یہ محبت معاشرے کی حدود کا احترام کرے، یا مذہب کی حدود سے نکل جائے..... جائز ہو کہ ناجائز.....سود مند ہو کہ تخریب کی ضامن.....مرد پر محبت سردیوں کی ہلکی بارش کی طرح پھوار بن کر گرتی ہے جس میں وہ اندر ہی اندر لرزنے لگتا ہے۔ محبت میں مبتلا مرد عموماً ایسے لگتا ہے جیسے کسی اجنبی گھر کے بڑے پھاٹک پر معذرت خواہ کھڑا ہو.....اپنے آنے کا جواز پیش کرنا چاہے پر چپ رہے.....اندر داخل ہونا چاہے پر ہو نہ سکے۔ محبت کا نوگرفتار کبھی اپنا راز چھپانے کو بہت باتیں کرتا ہے۔ کبھی چپ کا تالا یوں پڑ جاتا ہے جیسے وہ اندر کوئی پہیلی سلجھا رہا ہے.....وہ زیادہ عیاں بھی ہونا نہیں چاہتا اور ہوئے بغیر رہ بھی نہیں سکتا۔ مجوب، مضطرب، انکار کے تصور سے خوفزدہ مرد میں اندر ہی اندر ایک انفعالی کیفیت پیدا ہو جاتی جو ڈھانپے ہوئے کو برہنہ اور برہنہ کو چھپانے پر اُکساتی ہے۔

قیصر گو اندر یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ راحیلہ کے بچے کو سہارا دے رہا ہے لیکن کہیں بہت اندر اُس کے لاشعور میں محبت کا بیج بویا گیا تھا۔ ابھی اس محبت کا اعتراف اُس کے دل نے بھی نہیں کیا تھا.....لیکن ڈاکٹر قیصر کے سارے جسم میں نرت کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ اُس کی عینک چہرے پر سجنے لگی۔ ہونٹوں پر نرمی، نمی، شرمیلا پن واضح ہوگیا۔ لباس پھبنے لگا۔ گھٹنے پر گھٹنہ دھرے نجم کے سامنے معمولی انداز میں بیٹھے اُس پر کسی خوبصورت مرد کا شبہ ہوتا تھا نجم بھی سمجھ نہ پا رہا تھا کہ کیا بدل گیا ہے اور کیونکر.....اتنی بات ضرور تھی کہ نجم کو احساس تھا جیسے قیصر اُس سے علیحدہ ہوگیا ہے۔ یہاں سے اس لمحے کے بعد وہ قیصر سے پھر کبھی مل نہ سکے گا۔ یہاں سے اُن دونوں کے راستے علیحدہ تھے۔ وہ ایک پیار، کجی، vice جیسی محبت میں پکڑا گیا تھا۔ اور اس پھندے کی گرفت سے نکلنا اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ قیصر شفاف پانیوں میں تیرنے کے لیے جسم کی غلاظت، روح کی بالیدگی بخشنے کے لیے کنارے پر تیار کھڑا تھا۔

محلے کے ایک معمر مرد نے دروازے پر دستک دی اور آدھا پٹ کھول کر کہا..... ''ڈاکٹر صاحب باہر آجائیے نکاح کی کارروائی کریں.....''

ڈاکٹر اور نجم دونوں حقیقت سے دوچار ہو کر سرو قد کھڑے ہو گئے۔

"چلئے.....''

معمر مرد نے آواز گرا کر قیصر کے کندھے سے پوچھا..... ''ڈاکٹر صاحب.....لڑکی کا وکیل کون ہے؟''

''بابا فضل.....''

''بابا فضل؟''

ابھی صحن میں مسلسل ڈھولک پر تھاپ پڑ رہی تھی۔ لڑکیاں بے سُرے انداز میں گلا پھاڑ پھاڑ کر گا رہی تھیں۔ لیکن بچوں کا شور کم ہو گیا تھا..... کمرے میں سے وہ دونوں لڑکیاں غائب ہو گئیں تھیں۔ اور اُس کے پلنگ پر دو پیارے سے بچے سو رہے تھے۔

راحیلہ یہی بابل کی نگری ہے اور یہی ساجن کا گرام ہے..... یہاں سے اب تمہیں کہیں نہیں جانا.....کل میں..... ایک مکمل شادی شدہ عورت بن جاؤں گی۔ یہ آج اور کل میں اس قدر بُعد کیوں ہوتا ہے؟

انسان کے اندر اور باہر میں مطابقت کیوں نہیں ہوتی؟

جن فیصلوں کو مجبوری کا نام دیا جاتا ہے کیا واقعی وہ مجبوری سے جنم لیتے ہیں کہ خود غرضی سے۔

وہ از سرِ نو اپنے اندر کے فیصلے کو ٹٹولنے لگی..... سچ سچ میں نے یہ فیصلہ کس نیت کے تحت کیا..... اپنا آپ بچانے کی خاطر..... کہ اُس بچے کی خاطر جو بغیر باپ کے زندہ در گور ہو جائے گا۔

اگر آج تک شاہد سے محبت کرنا گناہ نہ تھا تو اچانک .....کل اُس کے تصور کیوں گناہ میں بدل جائیں گے ..... بھلا انسان اتنے تھوڑے عرصے میں اتنا زیادہ تبدیل کیسے ہو سکتا ہے..... نکاح کے چھوہارے ابھی اُس کی تپائی پر ان کھائے پڑے تھے۔ لیکن اُسے گہری شام کا وہ وقت یاد نہ آ رہا تھا جب بابا فضل ایجاب و قبول کی منزلیں طے کرنے ہمسائے کے معتبر آدمی کے ساتھ آیا تھا۔

یہ میرا ذہن سارے اہم واقعات سے چشم پوشی کیوں کرتا ہے؟

اپنے حصے کی ذمہ داری سے بھاگ نکلنے کا طریقہ اُس کے ذہن نے نسیان ہی کو قرار دیا تھا۔ راحیلہ نے دل میں سوچا میں ناگوار واقعات کو اتنی جلدی کیسے بھول جاتی ہوں ؟ بھول جانے میں میری شعوری کوشش کہاں تک ہے اور لاشعور میری مدد کو کس طرح پہنچتا ہے۔

اگر بالفرض محال اس وقت شاہد آ جائے اور مجھے چلنے کو کہے..... اور وہ اُسے گھسیٹ کر ستاروں کی ضیاء میں..... دور بہت دور..... ڈھولک کی دھپ دھپ سے دور..... عروسی جوڑے کو پھاڑ کر..... دوپٹے کو پیروں سے مل کر..... فضا کی پہنائیوں میں..... تو کیا..... وہ چلی جائے گی..... ڈاکٹر قیصر کی منکوحہ ہو کر کیا یہ ممکن ہو گا.....؟

راحیلہ کی آنکھیں بند تھیں اور پورا یقین تھا کہ جب وہ آنکھیں کھولے گی تو شاہد قالین پر بیٹھا ہو گا..... پھر اُس نے کلمہ پڑھ کر آنکھیں کھولیں..... پنکھا حسبِ معمول گزگزا رہا تھا۔

راحیلہ کا دل بیٹھ گیا۔ کیمپ تک وہ آزاد تھی۔ وہ کسی سے مل سکتی تھی کم از کم تصور میں ایسا ضرور ممکن تھا۔ بھلا اُس نے انتظار کیوں نہ کیا..... یہ زندگی کا پکا اُسے کیسے پڑ گیا ؟ اُس کی مہاتما بدھ جیسی آنکھیں نیند میں بھی ادھ کھلی تھیں اور آنکھ کی پتلی ہولے ہولے گھوم رہی تھی.....

یہ زندگی کا تسلسل کیا چیز ہے؟

کیا ایک ہی انسان امر ہو کر جیتا جاتا ہے یا پھر ایک زندگی نئی زندگی کے ہاتھ میں اپنی گرفت ڈھیلی چھوڑ کر تسلسل کا باعث بنتی ہے ؟ اُس کے اندر بچے کی حدت اعتبار کی تھی.... بھروسے کی ..... میں زندگی کا ہاتھ ایسے کیوں پکڑ نہیں سکتی..... مکمل اعتماد کے ساتھ.....

اُسے لگا وہ پھر بے ہوش ہو جائے گی۔

کاش یہ دل کچھ نہ پوچھے..... ذہن کبھی سوال نہ کرے کہ اُس کی نیت کیا ہے ؟..... اچھی یا بری کسی شے کی دھجیاں نہ ادھیڑے..... اب تو وہ قول ہار چکی۔ واپس پلٹ جانے کی ساری راہیں بند ہو گئیں..... کیوں ؟ اگر مگر کا وقت جا تا رہا..... پھر وہ بار بار کیوں اپنے اندر اپنے حالات کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے میں مشغول تھی۔

اب تو کوئی دوراہا سامنے نہ تھا۔ اُس کی رفتار تیز رہے یا آہستہ اُسے اسی ڈگر پر چلنا تھا۔ کسی ماضی کی جانب کوئی راستہ نہ جاتا تھا۔ پھر بھی ذہن نئی تجاویز پیش کر رہا تھا۔ قلب اپنے تبصرے جاری رکھ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ ہمیشہ کے لیے بے ہوش ہو جائے۔ اُسے کسی مستقبل میں اپنی پرائی منزل تلاش کرنے کا اب کوئی حق نہ تھا..... لیکن کہیں آگے چل کر اگر شاہد آملا۔ تو؟

اُس نے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔ بچے کی سانس بڑی تواتر سے آ رہی تھی۔ راحیلہ نے آنکھیں بند کر لیں..... نہیں۔ شاہد بہت اچھا ہے وہ جانتا ہوگا کہ زندگی میں سکون کے چھن جانے کے باوجود بھی حالات کے سنورنے کی تمنا ہوتی ہے۔ انسان کشمکش کے پھندے سے نجات چاہتا ہے..... وہ میرا دروازہ کھٹکھٹانے نہیں آئے گا..... اب مجھے نئے فیصلے کرنے پر نہیں اُکسائے گا۔

بچے نے اُس کے ہاتھ کے بوجھ تلے ذرا سا کسمسا کر جیسے ہلکی سی سسکی لی اور کروٹ بدل کر چھوٹے چھوٹے خراٹے لینے لگا۔ اچانک اُسے ایک پرانی یاد آ گئی جب زندگی سیاسی حالات سے، معاشی اور معاشرتی ہنگاموں سے متاثر نہ تھی۔ عجیب سی بات تھی کہ چند دنوں کا بیتا ہوا واقعہ اُسے یاد نہ آتا تھا اور ماضی کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات یوں ذہن میں آتی تھیں کہ پس منظر بھی مکمل ہو جاتا تھا۔

ابراہیم لاج میں بیڈمنٹن کھیلی جا رہی تھی۔ سوشل لائف ابھی بہت سست رفتار تھی۔ کیروم بورڈ، تاش، لوڈو بیڈمنٹن زندہ کھیلیں تھیں۔ لوگ سکواش، کرکٹ، بیس بال، باکسنگ سے نا آشنا تھے۔ کھیلوں نے ابھی کمرشل زون میں قدم نہ رکھا تھا۔ ڈھیلے نٹ پر بڑی دلچسپی سے بیڈمنٹن جاری تھی۔ جمیلہ اور شاہد ایک طرف تھے۔ تسنیم آپا اور راحیلہ دوسری جانب..... ساجدہ ماں اور بیگم عباس فالسے کا شربت پینے میں مشغول تھیں۔ اور قریب پڑے پیڈسٹل فین میں اُن کے کھچڑی

جیسے بال اُڑ رہے تھے۔
ڈاکٹر صاحب اور میاں عباس روش پر ٹہل رہے تھے۔ اُن کے بوٹ بجری پر پڑتے تو کرچ کرچ کا شور بلند ہوتا۔ دونوں کے درمیان ہمیشہ کی طرح کانگریس اور مسلم لیگ زیرِ بحث تھی اور وہ دونوں ہی ہندو مسلم اتحاد اور پاکستان کے امکانات پر زور و شور سے کھپ رہے تھے۔ ایک ہی بات کرتے ہوئے بھی اُن کی آواز میں جھگڑا سا ٹپکتا تھا۔
راحیلہ کی قوتِ متخیلہ نے اُس دن کی تمام باتیں اُجال دی تھیں۔ وہ اُس شام کو ازسرِ نو بسر کر رہی تھی۔ جمیلہ بڑے تیز و طرار انداز میں کھیل رہی تھی اور اُس کے ہر شاٹ کا تختۂ مشق راحیلہ بنی ہوئی تھی لیکن شاہد جب بھی سروس کرتا یا ریٹرن میں چڑیا لوٹاتا تو راحیلہ کو لگتا جیسے سفید گلاب کا پھول پھینک رہا ہو۔ جب بھی راحیلہ چڑیا واپس کرنے میں کامیاب ہو جاتی تو شاہد کے چہرے پر مسکراہٹ آ جاتی۔ وہ خود ہار کر راحیلہ کو جتانا چاہتا تھا۔
اندھیرا بڑھ رہا تھا اور شٹل کاک نظر آتی تھی۔ پھر تسنیم آپا نے بڑے ڈھیلے انداز میں چڑیا کو اُونچے پھینکا جمیلہ اُچھل کر اس پر جھپٹی۔ اور اس زور سے شوٹ مارا کہ زد میں کھڑی راحیلہ آنکھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئی۔ سارے اُس کی طرف بھاگے اور جمیلہ نے آئی ایم سوری کی رٹ لگا دی۔ راحیلہ کی دونوں آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ تسنیم آپا نے دوپٹے کی گدی بنا اور راحیلہ کی آنکھ پر رکھ کر اپنی گرم سانس سے سینک کرنے لگی۔
شاہد اپنے ریکٹ کو گھمائے چلا جا رہا تھا اُس کے چہرے پر پھیلی پھیکی سی مسکراہٹ بڑی بناوٹی تھی۔ چند منٹوں کے بعد راحیلہ نے اپنی سُرخ آنکھ کھول کر کہا......
''بس جی ٹھیک ہے سب کچھ...... چلیے گیم پوری کریں۔''
اس وقت شاہد اُس کے قریب آ کر بولا...... '' اچھا ادھر دیکھیں؟''
راحیلہ نے شاہد کی طرف دیکھا۔ آنکھ واقعی کافی سُرخ تھی۔ شاہد نے اپنی دونوں انگلیاں اُس کے چہرے کے آگے پھرا کر پوچھا......''اچھا راحیلہ یہ کتنی انگلیاں ہیں؟''
راحیلہ نے ہنس کر کہا...... '' چار......''
''بہت خوب چلیے خدا کا شکر ہے آنکھ بچ گئی......''
''اندھیرا ہو رہا ہے اب شٹل نظر نہیں آتی۔ رمی کھیلتے ہیں اندر چل کر......'' راحیلہ نے مشورہ دیا۔
وہ چاروں اندر چلنے لگے۔ ساری شام تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد شاہد کا چہرہ اُتر جاتا اور اُس کے اطوار سے لگتا گویا وہ کھویا گیا ہے......
آنکھ کے سرخ ہو جانے کا ملال شاہد کے چہرے سے ظاہر تھا...... پل پل اُس کی زندگی بسر کرنے والا اگر کہیں وہ آ گیا تو...... نہیں نہیں اب وہ کہیں سے آ جائے تو؟ ہزیمت خوردہ راحیلہ کو کچوکے لگانے ازل کول شاہد کیسے آ سکتا ہے؟
وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا بیٹھی...... ہاں اس طرح شکست خوردہ، غمگین صورت وہ بڑی قابلِ ترس لگ رہی تھی۔ شٹل کاک نہ لگنے کے باوجود اُس کی دونوں آنکھیں سُرخ تھیں۔ کبھی کبھی وہ کالج میں ایسا سُرمہ استعمال کیا کرتی تھی جس سے آنکھوں میں سرخ ڈورے اُبھر آتے تھے اور آنکھیں خوبصورت لگنے لگتی تھیں...... لیکن آئینے میں نظر آنے والی پیر

بوٹی جیسی سرخ آنکھوں میں آج اُسے کوئی خوبصورتی نظر نہ آئی۔ یہ خون آشام آنکھیں تو سارا البوپی کر بھی سیر نہ ہوئیں اُسے اپنی صورت ڈراکیولا سی نظر آئی۔

اُس نے اپنے رومال سے پھیلے ہوئے کاجل کو صاف کیا۔ عطر حنا کی تیز خوشبو سے اُس کی طبیعت گھبرا گئی۔ وہ تو صرف ایوننگ ان پیرس اور شینل نمبر فائیو پسند کرتی تھی..... خدا جانے لوگ شادی بیاہ میں اس قدر بھاری بھر کم چیزیں کیوں پسند کرتے ہیں۔ گوٹے کناری سے لدے دوپٹے، زرتار منقش جوڑے..... ہلکی پھلکی معنی خیز خوشبو نہیں بلکہ تیز دماغ میں گھس جانے والا عطرِ حنا..... شائد دماغ کو ماؤف کرنے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہو.....

ہر مشکل مقام پر خالی الذہن ہونا ضروری ہے..... شائد وہ پھر خوابوں میں چلی گئی۔

اُسے لگا لڑکیوں نے باہر صحن میں ایک بار بلک کرتان اُٹھائی

نہ کر گمان گورے رنگ وا

گوڑے سنگ وا..... گورئیے۔

اُس نے جیسے برسوں بعد اپنا عکس غور سے دیکھا۔ اُس کے چہرے پر روج کی بدنما سرخی تھی۔ اگر اُس کے چہرے پر یہ غازہ، پاؤڈر نہ ہوتا تو اُس کی قدرتی جلد ہاتھی دانت کی طرح دکھتی..... یکدم اُسے خیال آیا کہ اب اُس کی آنکھوں تلے تسنیم آپا کی طرح سیاہی مائل ہلکے پڑ چکے ہیں اور گالوں کے اوپر چھائیوں نے یورش کر دی ہے۔ ماتھے پر پڑی ہوئی لکیروں کو اُس نے اچنبھے سے دیکھا..... بھلا ایسے بوڑھے ماتھے پر لڑکیوں نے ٹیکا کیوں سجا دیا۔

یہ لپ سٹک کب اور کس نے لگائی؟

عطر حنا، غازہ پاؤڈر کیسے اُس کے چہرے پر آیا.....؟

یکدم اُس کی نگاہ بالوں پر پڑی..... ایک پوری لٹ سفید ہو چکی تھی اور کسی لڑکی نے اسے چھپانے کی غرض سے سیاہ بالوں کے نیچے پن سے بند کر دیا تھا.....

میں اتنی جلدی بوڑھی کیسے ہو گئی..... تبھی تو میری یادداشت مجھے الو بناتی ہے، دھوکے دیتی ہے، میں نے دنوں میں سالوں کا سفر کر لیا ہے۔ پھر اُس نے کمرے کو ایسے دیکھا جیسے پھانسی کے حکم کے بعد قیدی پکی کوٹھی کو دیکھتا ہے.....

ذرا سا پردہ ہلا.....

''اجازت ہے.....'' قیصر کی آواز آئی۔

دولہا سادہ سی پینٹ قمیض میں ملبوس تھا۔ اُس کے چہرے پر محبت نے بڑی ملائمت کا غازہ پھیلا دیا تھا۔

جب بھی عورت کسی پرانی محبت کو دفن کر کے نئی محبت میں مبتلا ہوتی ہے..... اُس کا روپ بے روپ ہو جاتا ہے۔ جیسے بنجر زمین پانی مانگے اُس میں محبت ایسے کھبتی چلی جاتی ہے جیسے مکھن میں گرم چھری۔ وہ محبت کی افتاد کو کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی، جوں جوں وہ اس جذبے کو چھپاتی، صبر کا لبادہ اوڑھتی ہے، توں توں ذور تک بنجر زمین کی دراڑیں گہری ہوتی جاتی ہیں۔ عورت کی ذات، اُس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی درشتی، تختی، کڑا پن آ جاتا ہے، جیسے سپاہی میدان جنگ

میں جا تا ہو۔ چھپنے چھپانے کے مرحلوں سے گزرتی، خوفناک سوچوں سے آشنا، خاص قسم کی کرختگی کا مظاہرہ کرتی ہے.....
محبت جائز ہو کہ ناجائز، وقتی ہو کہ دیرپا، محبت شرارت سے اُبھرے یا غم سے، دوسری محبت کا اثر عورت پر موت کا سا ہوتا ہے۔ ضم ہونے سے پہلے، اپنا آپ بھلا دینے کے لیے، سب کچھ ارپن کرنے سے بہت پہلے، وہ ہارتی ہے اور ہار کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں پاتی، جب بھی محبت کا بھالا اُس کے دل میں اُترتا ہے وہ زخمی پرندے کی طرح جال تلے آنے کے بعد لڑنے کے لیے تڑپتی ہے۔

گرفتاری دینے سے پہلے گپ چپ، گم سم عورت یوں نظر آتی ہے.....جیسے دریدہ لباس، بے رنگ پھول، بند دروازوں والا گھر.....محبت تادیر اُس میں شگفتگی، ملائمت اور سوجھ بوجھ پیدا نہیں کرتی بلکہ سوچوں کا دریچہ کھول دیتی ہے.....اُس کا چہرہ، وجود اس بات کا مظہر ہوتے ہیں، جیسے کچھ ہونے والا ہے.....زلزلہ.....طوفان یا قیامت ؟

راحیلہ نے بھی پابند سلاسل ہونے سے پہلے ایک آخری نظر اپنے ماضی پر ڈالی.....اور چٹختی ہوئی بنجر زمین کی طرح دُور دُور تک اُس میں دراڑیں پڑ گئیں ایسی زمین جو پیاسی ہو کر پانی مانگے.....

راحیلہ کا وزن بڑی تیزی سے بڑھنے لگا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ سیڑھیاں چڑھنے میں کامیاب ہوتی اوپر سے گلی دُور تک نظر آتی تھی اس کوچے میں قیصر منزل سب سے ممتاز گھر تھا۔ راحیلہ اس گھر پر ذرا سی نازاں ہوگئی۔

کوٹھے کی چھت پکی تھی اور جالی دار اونچی منڈیر میں چار شہ نشین رنگدار سیمنٹ کی بنی ہوئی تھیں۔ جن پر چڑھ کر گلی میں آنے جانے والے صاف نظر آتے تھے۔ منڈیر کے ساتھ ساتھ دیسی گھی کے پرانے کنستروں میں چنبیلی کے جھاڑ، نیاز بو کے پودے، مکوہ کی جھاڑیوں اور موتیا کے بوٹے لگے تھے۔ کچھ تو دھوپ کے باعث اور کچھ پانی کی قلت کی وجہ سے پودے مرجھائے ہوئے نظر آتے تھے۔ پہلے وہ یہیں کوٹھے پر رہا کرتی تھی لیکن اب اُس کا کمرہ بابے فضل کے پاس تھا۔ اور وہ دن کا زیادہ حصہ سو کر اور رات جاگ کر کاٹتے تھے۔ اُس نے کئی بار سوچا کہ آخر بابا فضل کا اس گھر پر کیا حق تھا لیکن پھر وہ دل ہی دل میں اس بات پر شرمندہ ہوگئی۔ وہ کئی بار باباجی کو کہنا چاہتی تھی کہ وہ بیٹھک کے ساتھ والے کمرے میں چلے جائیں اور کچھ نہیں تو اس طرح چوکیداری کے فرائض ہی اُن کے سپرد کیے جا سکتے تھے لیکن قیصر عجیب سوچ کا آدمی تھا۔ اُس کے لیے پاکستان کی تشکیل ایک خواب کی تعبیر تھی اور وہ کمینگی، خود غرضی سے اس تعبیر کا چہرہ بگاڑنا نہ چاہتا تھا۔

ایک روز جب راحیلہ نے دبی زبان میں اپنے خیال کا اظہار کیا تو قیصر نے کہا تھا..... "نہیں نہیں راحیلہ..... یہ انصار اور مہاجر والا نسٹ ہے ہمیں اپنا سب کچھ مہاجروں کے ساتھ بانٹ لینا ہوگا..........اس طرح وہ اس ملک کو اپنا سمجھ سکیں گے ....."

" اور جو مہاجروں نے ہر چیز پر قبضہ جما لیا جیسے.....جیسے بابا فضل میرے کمرے پر قابض ہوگئے ہیں تو.....؟"
"دھیرے دھیرے بھوک مٹ جائے گی ضرورت باقی نہ رہے گی.....تم فکر نہ کرو بابا فضل تمہارا کمرہ خود ہی چھوڑ دیں گے ایک دن....."

وہ چپ ہوگئی .....اندر کہیں اُسے یقین آچکا تھا کہ ڈاکٹر قیصر خوابوں سے، آدرشوں سے، انسانیت سے، محبت

کرنے والا شخص تھا۔ حسب معمول بابا فضل سونے پر دراز، پنکھا چھوڑے گہری نیند سو رہا تھا...... نہ جانے کیا بات تھی، اب راحیلہ کو بابا جی پہلے جتنے زیادہ اچھے نہ لگتے تھے۔

راحیلہ کو قیصر نے زیادہ کام کرنے سے منع کر رکھا تھا۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ بچے کا وزن خاطر خواہ بڑھ نہیں رہا۔ پھر بھی احتیاط کے ساتھ راحیلہ شہ نشین پر چڑھ گئی اور نیچے گلی میں نظر ڈالی۔

سامنے والے مکان سے کپڑے دھونے کی آواز آ رہی تھی اور جھاگ سے اٹا پانی دوسری منزل سے اُترنے والی نالی سے شپا شپ گر رہا تھا۔ گلی کی نالی رُکی ہوئی تھی اور گلی میں جھاگ اور پانی پھیل رہا تھا۔ پھر ایک مولوی صاحب نما آدمی اس پانی سے بچتا بچاتا گزرنے کی کوشش میں گزرا۔ اُن کا پاؤں پھسلا، لمحہ بھر کو وہ ڈولے اور پھر اُس ریڑھی والے سے جا ٹکرائے جو با آواز بلند گنڈیریاں بیچ رہا تھا۔ پھیری والے نے مولوی صاحب کو دھکا دے کر اُس پانی کی زد میں دھکیل دیا جس کی بوچھاڑ سے بچ کر وہ ادھر کو لپکے تھے۔ مولوی صاحب کے کپڑوں پر صابن، میل اور کیچڑ کے دھبے پڑ گئے اور وہ استغفر اللہ کا ورد کرتے آگے نکل گئے۔

یکدم راحیلہ کو مولوی صاحب کی ہیت کذائی پر ہنسی آ گئی اور اُسی وقت اُس نے اپنے آپ کو جھڑکا۔ میں بھی کتنی رذیل ہوں، ادھر مولوی صاحب گر گئے، ادھر میں اُن کے گرنے پر محظوظ ہو رہی ہوں۔ انسان اس قدر کمینہ کیوں ہے..... لمحہ بھر بعد اُس کا جی چاہا کہ وہ بابا فضل کو ایک بار پھر کیمپ کی دلدل میں پھینک آئے۔ پھر دل میں اُس نے استغفار پڑھی اور سوچا کیا ہم کبھی بھی پوری طرح نیک نہیں ہو سکتے..... یا رب یہ کون ہے جو ہمیشہ ہمارے دل میں شکوک، وسوسے، کمینگی کا بیج بو دیتا ہے اچھے خیالات پر برائی کیوں غالب آ جاتی ہے..... یہ کیا گورکھ دھندا ہے میرے خدایا.....

راحیلہ نیم بے ہوشی کے عالم میں مولوی صاحب کا حشر دیکھ رہی تھی اُٹھ کر پھر جھروکے میں گئی۔ معاً اُس کی نگاہ لکڑی کے جھروکے پر پڑی۔ یہ جھروکا گندے پانی والی نالی کے ساتھ دائیں ہاتھ والے گھر کی زینت تھا۔ اس خوبصورت جھروکے میں بی ہمسائی کھڑی آلو چھیل رہی تھیں اور اس کے چھلکے بڑی بے پرواہی سے نیچے گلی میں پھینک رہی تھیں۔ جھروکے والی نے چھری سمیت ہاتھ اُٹھا کر راحیلہ کو سلام کیا۔ پھر کندھے پر ریشمی دوپٹہ ٹھیک کیا اور بڑے تپاک سے بولی۔

"میں تو شروع سے جانتی ہوں میری آپ کی دوستی ہو گی جی۔ شیخ صاحب بڑے سخت ہیں کسی کے گھر جانے نہیں دیتے لیکن وہ کہتے ہیں، ہاں ڈاکٹر صاحب کے گھر چلی جایا کرو کوئی حرج نہیں۔"

بی ہمسائی نہ ڈھنگ سے آلو چھیل پائی نہ دوپٹہ ہی جگہ پر بیٹھا لیکن گفتگو کا ایک لامتناہی سلسلہ چل نکلا۔

"جی جی آپ ضرور آیا کریں....." راحیلہ نے پڑھی لکھی لڑکی کے سے تکلف سے کہا۔

"جی اب تو میں آیا کروں گی، آپ کو دیکھ کر تو میں عاشق ہو گئی ہوں....."

ہمسائی نے دوپٹہ ٹھیک کرنے کے بہانے اور بھی ڈھلکا دیا اور کھلکھلا کر ہنس دی راحیلہ بھی ہلکا سا ہنسی۔ لیکن سب سے زیادہ محظوظ وہ تھانیدار صاحب ہوئے جو قیصر منزل کے ساتھ والے گھر میں رہتے تھے اور اس وقت کھڑکی میں کھڑے سامنے آلو چھیلنے اور دوپٹہ ڈھلکنے کا منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ بار بار سر کھجلاتے تھے اور ان کی آنکھوں سے شعلے سے نکل رہے

تھے۔ وہ کھڑکی کی سلاخوں سے قریب قریب آدھے باہر آ چکے تھے۔

''مجھے کام کاج سے زیادہ فرصت نہیں تھی..... سارے گھر کا کام اور میں اکیلی، بس آپ کوٹھے پر آجایا کریں ناں..... یہیں ملاقات ہو جائے گی'' اَنبلے پن سے آنکھ مار کر ہمسائی بولی..... ''میرا نام نرگس ہے بچی میرے میاں بڑے سخت ہیں۔ کہیں آنے جانے نہیں دیتے بچی.....''

باتوں کا سلسلہ طویل ہو گیا۔ ہمسائی صاحب تھیں تو پردہ نشین اور اُن کے شوہر نامدار کا خیال تھا کہ تاروں نے بھی اُن کی ضیا نہ دیکھی ہوگی۔ لیکن اس وقت اُن کی آواز کسی روئی بیچنے والے کی طرح ساری گلی میں گونج رہی تھی۔ اس کھلی پاٹ دار آواز کے مخزن کو دیکھنے کے لیے راہ گیروں کی نگاہیں کوٹھے کی جانب اُٹھے بغیر نہ رہ سکتی تھیں۔ تھانیدار صاحب تو کھڑکی کے جنگلے سے چپک کر رہ گئے تھے اور نرگس بی بی بھی کچھ ڈوری میں مچھلی پھنسانے کی کم کوشش نہ کر رہی تھیں۔

راحیلہ کے لیے شہ نشین پر یوں کھڑے رہنا ممکن نہ تھا۔ وہ اپنی جان چھڑانا چاہتی تھی۔ اُس نے جانے کی اجازت مانگی لیکن ہر بار نرگس نے کچھ ایسا لمبا قصہ نکالا کہ نہ تو راحیلہ جا سکی نہ تھانیدار صاحب.....

نرگس اُسے سارے محلے والوں کے حالات تعارفی انداز میں سنا چکی تو اُس کی آرزو ہوئی کہ راحیلہ بھی اپنے ماضی اور حال کو اُس کے سامنے بے نقاب کرے۔ لیکن راحیلہ اپنی کہانی محلے کی اتنی عورتوں کو سنا چکی تھی کہ اب اس کے ذکر سے اُسے کوفت ہوتی تھی۔ وہ اپنے اور محلے والیوں کے درمیان کچھ فاصلہ رکھنا چاہتی تھی۔ پہلے تو عورتیں مارے تجسس کے آئیں۔ پھر کیمپ سے لائی ہوئی اس شائستہ سی دولہن کے متعلق شکوک جاگنے لگے، چہ میگوئیاں ہوئیں، پھر کہانیاں پھیلیں۔ اول اول تو محلے والیوں نے قیصر منزل کو چڑیا گھر سمجھا۔ کنوارے ڈاکٹر صاحب کے گھر سوائے مجم کے کوئی نہ آتا تھا۔ پھر خاص و عام پر قیصر منزل کے اسرار و رموز کھل گئے۔

عورتیں، لڑکیاں، بچے آتے.....

اب راحیلہ ایک عرصہ بعد تندرست تھی لیکن قیصر سے رابطہ ابھی بھی قائم نہ ہوا تھا۔

ہمسائے والیوں سے تفصیلی بات چیت ہوتی، راحیلہ سے کرید کرید کر ماضی کو دریافت کیا جاتا۔ راحیلہ سے گہرے بہناپے کی توقع لے کر عورتیں رخصت ہوتیں۔ پھر کسی محلے والی کے گھر جمع ہو کر راحیلہ کے وجود، لباس، گفتگو پر تبصرہ ہوتا۔ اپنی اپنی رائے دی جاتی۔ ڈاکٹر صاحب کی دولہن کے نقائص بیان کیے جاتے۔ اُس کی خوبصورتی پر ناک بھوں چڑھایا جاتا۔ گفتگو مہاجروں، پناہ گزینوں سے رینگتی راحیلہ تک آ جاتی۔

''اونہہ ذرا رنگ کالا ہوتا تو ڈائن لگتی ڈائن..... رنگ راجاتی، رنگ راجا۔ ڈاکٹر صاحب بھی کیا انتخاب کر کے لائے..... کیمپ سے۔''

دوسری کہتی..... ''لو جی رنگ بھی کوئی خاص صاف نہیں صرف شکل من لگتی ہے۔ ہاں یہ میں نے سنا ہے اپنی صورت کا مان بہت ہے..... پھر مزاج بھی بہت سخت ہے پر ہم کیوں کسی کی بدگوئی کریں ہے ناں جی پر سنا ہے'' ساری محفل مجسم استفسار بن جاتی۔

''بھئی کہو ناں کیا بات ہے؟ کیا سنا ہے تم نے .....؟''

''نہ جی ہم کیوں کہیں ہمارا کیا بگاڑا ہے بے چاری نے.....''
اخبار کا رول ادا کرنے والی اپنی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اور آگ لگانا چاہتی، اُس کے لیے چپ رہنا مشکل ہو جاتا۔
''لو یہاں غیر کون ہے..... کہو تو سہی۔''
محترمہ اخبار آواز گرا کر بڑی پُر اسرار آواز میں سرگوشی کرتی..... '' سُنا ہے ولیی عورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب اسے کسی کیمپ شیمپ سے نہیں لائے..... اُدھر سے لائے ہیں ٹبی کے بازار سے.....''
ہائے او ئی نے سب کے دل بھر جاتے۔
''میں تو اسی لیے اپنی بیٹی فاطمہ کو ڈاکٹر صاحب کے گھر نہیں لے جاتی، سنتے ہیں خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے..... بعد میں فاطمہ کو میں کہاں سمجھاتی پھروں گی۔''
''میرا او یو ر دوست ہے نجم صاحب کا.....''
''کون نجم صاحب.....؟''
''وہی بھئی سانولا سا گھونگھریالے بالوں والا..... بھئی وہی جو بھوپو والی وین میں آتا تھا۔ جب سے یہ شادی ہوئی ہے اُس نے بھی آنا چھوڑ دیا ہے.....''
''ہاں جی وہ بے چارہ شریف آدمی ہے وہ اب کیوں آئے..... پر کیا بھولی بھالی شکل..... انگریزی بھی خوب فر فر بولتی ہے..... زمانہ ہی بدل گیا اب کوٹھے والیاں پڑھی لکھی بھی ہونے لگیں۔''
ایسی افواہوں سے عورتوں کے نورے پھیرے کم ہوگئے۔ راحیلہ سرد مہری سے بھرے حلم سے پیش آتی لیکن محلے والیوں کو گمان گزرتا کہ وہ کوئی بھید چھپا رہی ہے۔ راحیلہ پرانے اور نئے کی چھان پھٹک کرنا چاہتی تھی۔ اُس کا شعور اور لاشعور آپس میں گتھم گتھا تھے۔ اُسے تنہائی کی ضرورت محسوس ہوتی۔ دوسروں سے گفتگو کرنے کے بجائے تلاوت وجود کو پسند کرتی۔ اُسے تو بابا فضل کی اُن باتوں سے وحشت ہونے لگتی جب وہ قافلے میں شامل ہونے کی داستان 'چھوٹے ہوئے وطن کی کہانیاں سنائے چلا جاتا۔
بے شمار بار یہ کہانیاں سن لینے کے بعد وہ بابا فضل کے پاس بیٹھی بیٹھی گم ہو جاتی۔
نرگس ابھی بھی بولے جا رہی تھی۔ اب وہ اپنے اُن رشتہ داروں کی باتیں کر رہی تھی جو لدھیانے سے اُجڑ پجڑ کے اب گجرات میں جا بیٹھے تھے اور جن کی چھوٹی موٹی مدد کے اُس کے پاس بہت سے قصے تھے، جنہیں تھانیدار صاحب کو بھی سنانا ضروری تھا۔
بالآخر راحیلہ نے زور سے کہا..... '' آئی جی ابھی آئی..... اچھا جی اجازت دیجئے وہ بلا رہے ہیں۔''
نرگس نے آنکھ میچ کر قہقہہ لگایا..... ''جی ہاں شوق سے جائیے..... ابھی نیا نیا چاؤ ہے..... ہاں جی ضرور جائیے.....''
راحیلہ دیر تک اس قہقہے پر تلملاتی نیچے اُتر آئی..... وہ اس قسم کی چھیڑ چھاڑ کی نہ تو عادی تھی اور نہ ہی ایسے مذاق کی گنجائش ہوتی.....

گھر بڑا خاموش تھا۔ سیڑھیوں کے ساتھ ہی باورچی خانے میں زینو خاموشی سے ہنڈیا بھون رہی تھی اور اُس کی بچی بیٹھ کر سپارہ پڑھنے میں مشغول تھی..... راحیلہ نے فخر سے سوچا یہ میرا گھر ہے..... میرا اپنا۔ یہاں کی ہر چیز اُس کی تھی۔ یہاں ہر کام اُس کے حکم کے مطابق ہوگا..... یہاں کے تمام قوانین وہ بنائے گی..... یہاں کی ہر چیز اُس کی اپنی ہے۔

راحیلہ اپنی اہمیت کے احساس سے چونکی ہوئی۔ قیصر منزل کے تمام کاموں کو اُس کے صلاح مشورے کی ضرورت تھی اُس نے زینو کو آواز دی۔ زینو چولہے کی جلتی لکڑیاں ذرا باہر نکال کر بھاگی آئی.....

"جی بی بی جی..... نہ جی بیگم صاحب....."

"بھلا یہاں کی جھاڑ پونچھ کون کرتا ہے ؟....."

زینو کے ہاتھ میں کفگیر تھی اور بالائی ہونٹ گھی کی چکناہٹ سے آلودہ تھے۔

"جی بیگم صاحب؟..... صفائی تو میری بچی کرتی ہے..... یہ عالیہ۔"

"دیکھو بالا خانے کے تمام شیشے کھڑکیاں گرد سے اٹی ہوئی ہیں۔ ویسے بھی شہ نشینوں پر کباڑ کے ڈھیر لگے ہیں۔ اسے کہو پہلے جا کر انہیں صاف کرے اور اگر مدد کی ضرورت ہو تو..... فضل بابا سے کہے کہ وہ..... لیکن خیر انہیں رہنے دے وہ سو رہے ہیں۔"

خدا جانے وہ اچانک بابا فضل کے متعلق کچھ غلط سا حکم لگانے والی تھی جسے پر اپنے آپ کو ٹوک دیا۔ ورنہ زینو تو پہلے ہی کئی بار راحیلہ سے فضل بابا کی شکایتیں کر چکی تھی.....

انسان کسی کا پوری طرح شکر گزار کیوں نہیں رہ سکتا؟

شکر گزاری کے دائرے سے نکلنے کے لیے نقص بین نکتہ چیں اور کمینہ ہونے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟ وہ کسی محسن، ماں باپ اور رب کے بارے ایک ہی موسم ایک ہی رائے رکھنے پر قادر کیوں نہیں؟..... ناشکر گزاری کا سانپ رینگ کر کدھر سے آتا ہے؟ ابھی وہ اپنے اندر کی ناشکر گزاری کا اصلی جواز ڈھونڈ نہ پائی تھی کہ چاچا جی نہایت مُربہ پائی سے صحن میں آ کر کھڑے ہو گئے۔

"السلام علیکم۔"

"آیئے آیئے....."

زینو نے چاچا جی کے لیے بید کی کرسی لگا دی۔

راحیلہ نے قیصر منزل کی مالکہ بننے کے کافی دیر کے بعد چاچا جی کو دیکھا تھا۔ قیصر کا کوئی اور رشتہ دار اُن سے ملنے کبھی نہ آیا۔ ڈاکٹر صاحب کو اُن کے وجود سے بھی وحشت ہوتی تھی۔ جتنی دیر یہ قیام کرتے قیصر نچلا نہ بیٹھ سکتا۔ کبھی کرسی پر بیٹھتا تو کبھی میز پر ٹک جاتا۔ کبھی بھوکے شیر کی طرح صحن میں گردش کرنے لگتا اور کبھی تھک ہار کر بستر پر یوں ڈھیر ہو جاتا۔

ایک دن راحیلہ نے پوچھا تھا..... "چاچا جی کو دیکھ کر آپ کو کیا ہو جاتا ہے..... کہیں قرار ہی نہیں آتا۔ آم کاٹتے ہوئے آج آپ نے انگلی کاٹ لی۔ پھر کمروں میں چکر لگاتے رہے....."

قیصر نے بڑی محبت سے راحیلہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا..... "ایک وقت آئے گا جب تم میری کمزوریوں کی کتاب مرتب

کرنا چاہوں گی تو سرورق پر میری اُس نفرت کا اشتہار لگا نا..... جو مجھے اپنے خاندان سے ہے۔ پہلے مجھے ان سے محبت اور نفرت دونوں جذبے کار فرما تھے۔ اب صرف نفرت باقی بچی ہے..... اماں ابا نے..... تو..... خیر وہاں تو کوئی وجہ تھی روٹھ جانے کی لیکن چاچا جی سے تو بظاہر روٹھنے کا بھی کوئی جواز نہیں ملتا۔ بس چاچا جی مجھے اچھے نہیں لگتے..... ضروری تو نہیں کہ ہر آدمی آپ کو اچھا لگے؟....."

"تعجب ہے.....؟"

"ہاں واقعی حیرانی کی بات ہے کہ جو آپ کو بہت اچھا لگتا ہے اُس کی بھی کوئی خاص وجہ یا خوبی نہیں ہوتی۔ سوچتا ہوں تو..... جب میں گاؤں سے آیا تھا..... اور میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تھا تو..... میرے پاس کوئی گھر نہ تھا۔ میں چاچا جی کے پاس پناہ مانگنے گیا..... تو چاچا جی گھبرا گئے۔ اُنہوں نے اپنے ایک دوست کے گھر مجھے ٹھہرا دیا لیکن اپنے گھر نہیں رکھا..... میں نے..... چاچا جی کو معاف کر دیا ہے وہ معذور تھے..... میں جانتا ہوں وہ ابا جی کا عتاب کیسے مول لیتے..... چھوڑو چاچا جی کے قصے کو..... چاچا جی کو کسی تقصیر کی وجہ سے میری نفرت نہیں ملی ..... بس نفرت تو ہو جاتی ہے..... جیسے..... محبت..... اس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا کبھی بھی۔"

چاچا جی نے کھنگار کر کہا..... "کیا سوچ رہی ہے بیٹی؟....."

"کچھ نہیں جی..... آپ چائے پییں گے کہ لسی.....؟"

"جو بھی مل جائے....."

چاچا جی کی صحیح عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اُن کا سر گنجا تھا۔ دانت بھی بہت سے گر چکے تھے۔ لیکن کاٹھی جوانوں کی طرح مضبوط تھی۔ ڈاڑھی سفید لیکن مونچھوں پر خضاب کا استعمال کرتے تھے۔ سر کے سارے بال مہندی سے سرخا سرخ تھے۔ اُن کا چہرہ دور سے جلتے الاؤ کا سا لگتا۔ چاچا کی عینک مختلف حادثات میں ٹوٹ چکی تھی اور اب گھریلو مرمت بازی کی وجہ سے کہیں دھاگہ کہیں تار اور کسی جگہ ٹیپ سے لپٹی نظر آتی تھی۔ ناک پر کچھ دیر ٹکی رہتی۔ پھر آپی ڈھیلی ہو کر پھننگ تک کھسک آتی اور وہ عینک کے اوپر سے دیکھ کر بڑے فخر سے کہتے

" راحیلہ بیٹی..... دیکھو اس عینک کو میں نے خود مرمت کیا ہے۔ بھلا وہ کونسا کام ہے جو آدمی کر نہیں سکتا..... اگر وہ چاہے، نیت ٹھیک ہونی چاہیے....."

چاچا جی کے جھریوں زدہ چہرے پر عموماً شرارت میں گھلی ملی پر سکون مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ اس مسکراہٹ کی وجہ اُن کے تسلی بخش حالات نہ تھے بلکہ ایک حد تک اُن کی سادہ لوحی اور ناعاقبت اندیش معصومیت تھی۔ اُن کی کرنجی آنکھوں میں بچوں کا سا بھولپن تھا۔ کبھی کبھی سنجیدہ گفتگو کے دوران بھی وہ مسکراتے رہتے اور انہیں احمق سمجھے بغیر کوئی چارہ نہ رہتا..... شبہ ہوتا کہ وہ Senile ہو چکے ہیں۔ عموماً اُن کی مسکراہٹ لوگوں کی رضا جوئی کے لیے ہوتی۔ اس میں خوشامد، خوش دلی کو وہ ڈھال کی طرح استعمال کرتے۔

چاچا جی نے قیصر منزل کے صحن میں نظر دوڑائی۔ فرش دُھلا ہوا تھا۔ دروازے صاف تھے۔ کرسیوں پر تازہ پالش کی چمک تھی۔

''ہاں اس.....گھر کو عورت کی بڑی ضرورت تھی.....''

''بیٹھئے چاچا جی.....'' راحیلہ بولی۔

شلوار پر جا بجا سالن کے دھبے تھے۔ پنجابی جوتی گرد سے اٹی تھی اور پھٹے ہوئے بائیں جوتے سے چھنگی انگلی باہر کو سرک آئی تھی۔ چاچا جی نے نلکے کے پاس کرسی کھینچ لی اور صحن میں بیٹھ گئے۔ وہ جب بھی آتے صحن میں ہی بیٹھ کر رخصت ہو جاتے۔

''قیصر نہیں آیا.....سکینہ.....''

چاچا جی غلط نام استعمال کرنے کے عادی تھے۔ کبھی کبھی تو ایک جملے میں ایک ہی شخص کو تین ناموں سے مخاطب کر جاتے اور حیرت کی یہ بات تھی کہ اُن کی بات سننے والے تک ٹھیک ٹھیک پہنچتی اور غلط فہمی کا امکان بھی پیدا نہ ہوتا.....

''بس ابھی آتے ہوں گے..... پہلے کلینک جاتے ہیں پھر مسلم لیگ کے دفتر اور وہاں سے کیمپ کا چکر لگا کر آتے ہیں گھر.....دیر ہو ہی جاتی ہے۔''

لیکن چاچا جی اپنی بات کہنے کے بعد غائب ہو جانے کے عادی تھے۔

''مجھے تم سے ایک بڑا ضروری کام تھا.....راحیلہ۔''

''جی.....جی فرمایئے.....''

لیکن وہ ضروری کام بھول گئے۔ کان میں انگلی ڈال کر دیر تک فر فر کرتے رہے۔ انہیں ضروری کام سرے سے بھول گیا۔

''وہ.....وہ.....وہ بلی پال رکھی تھی ڈاکٹر نے.....وہ.....''

''ہاں جی.....یہیں ہے.....''

''پہلے تو بھاگ کر گود چڑھ جاتی تھی.....''

''اب وہ ڈاکٹر قیصر کو نہیں چھوڑتی.....''

راحیلہ کچھ دیر کے لیے اندر خفیف ہو گئی۔ وہ بابا فضل کو اپنا رشتہ دار ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی۔ اُس کی نظروں میں اوپر والی منزل کا اپنا کمرہ پھر گیا۔ کس مزے سے عربوں کی طرح ٹانگیں کھول کر بابا فضل ڈبل بیڈ پر پڑے تھے اور اسی مگر مچھ کے سرہانے ایک چھوٹی سی بلی تکیے پر سر دھرے خراٹے لیتی سویا کرتی تھی۔

''لے ضروری کام یاد آ گیا۔ اب تو نے میری مدد کرنی ہے۔ یہ..... تیرا ڈاکٹر ماں باپ سے روٹھا ہوا ہے۔ ماں باپ سے نہ بگڑے تو اور کس سے بگڑے.....لیکن اب وہ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ اس کی انتظاری کرتے ہیں۔ اس نے اپنی مرضی سے ڈاکٹری کر لی.....ٹھیک ہے وہ اس کی مدد کر سکتے تھے اُنہوں نے نہیں کی.....یہ بڑے دھکے کھا کر بڑا آدمی بنا ہے میں مانتا ہوں..... پر اب غصہ تھوک دے.....اس کے ماں باپ سمجھتے تھے کہ واپس گاؤں پرت جائے گا..... پر یہ بھی بڑا زوراور ہے۔ بڑا کینہ ور.....مر جائے گا پر بھولے گا نہیں..... تیرے ساتھ بڑا اچھا ہے.....تو میری مدد کر.....''

راحیلہ نے سر جھکا کر سوچا.....انسان بھی کیا چیز ہے کسی کے ساتھ اچھا کسی کے ساتھ برا.....کیا عجب آ بات

ہے جو قیصر مجھے تیوری ڈال کر بھی نہیں دیکھا وہ ماں باپ کے لیے اس قدر سخت ہے.....

''نہ سوچی جا.....نہ سوچی جا الویں۔ عورت بہت کچھ کرا سکتی ہے۔ بچپن کی ہٹ دھرمی چھوڑ دے ماں باپ بھی تو اُس کا بھلا چاہتے تھے ناں؟ وہ کوئی اس کے دشمن تھوڑی تھے اس کی دو بہنیں ہیں۔ انہیں بڑا ارمان تھا ڈاکٹر کی شادی کا.....منانے آئیں، ہاتھ جوڑے، نہ ہاں کرے نہ ناں.....ضد پر قائم.....بہنوں سے بھی نہیں ملتا۔ وہ اس کی شادی کرانا چاہتی تھیں، کوئی زہر تو نہیں دے رہی تھیں.....نہ گاؤں جاتا ہے، نہ خط لکھتا ہے.....یہ کوئی اچھی بات ہے۔ بوڑھے ہیں اس کے ماں باپ.....''

''اچھی بات تو نہیں ہے.....''

راحیلہ نے پھر سر جھکا لیا اور جی سے پوچھا.....بھئی یہ تو بتا ذرا اچھی بات ہوتی کیا ہے؟

''میں بتاؤں مجھ سے بھی پرہیز کرتا ہے۔ دو گلی چھوڑ میرا گھر ہے۔ وہاں سے راستہ چھوٹا پڑتا ہے لیکن چکر کاٹ کر لمبا راستہ اختیار کر کے آتا ہے.....اپنے چھوٹے بھائی وحید کی خبر بھی نہیں لیتا.....''

''میں پوچھوں گی جی.....آپ فکر نہ کریں چاچا جی.....'' راحیلہ نے اپنے سلیپروں پر نظریں جما کر کہا۔

وہ جانتی تھی کہ کسی سے اُس کے عمل کے بارے میں تحقیق کرنا عموماً کتنا رائیگاں ہوا کرتا ہے۔ ہر شخص اپنے عمل کے بارے میں مستعدی سے کتنے جواز پیش کر سکتا ہے.....اصلی سچ کہاں ہوتا ہے.....عمل میں کہ سوچ میں؟

''ہاں بھئی تم ذکر نہ کرنا سمجھانا اسے.....جوانوں کی اور بات ہے لیکن بوڑھے ماں باپ سے روٹھے رہنا کہاں کی شرافت ہے؟ ماں باپ کا بڑا ادب آیا ہے ہماری کتاب میں۔ یہ کون سے ڈھنگ کی بات ہے کہ تجھے تو عیش میں رکھا ہوا ہے، کیمپوں میں خدمتیں کرتا پھرتا ہے اور ماں باپ سوکھی زمین کی طرح ترستے ہیں۔ ماں باپ کے متعلق تو آیا ہے کہ ان کو اُف نہ کرو.....یہ سمجھتا ہی نہیں.....بتا اس کی نیکی جو یہ کیمپوں میں کماتا پھرتا ہے.....کیا ہے؟.....اس کو نیکی کے کھاتے میں ڈالیں کہ بدی میں.....؟''

انسان بھی عجیب چیز تھا۔ جو چاہتا کرتا تھا.....جزا و سزا.....نیکی اور بدی کا اُس کی مرضی پر رعب نہیں چلتا تھا۔ شائد اُسے صاحبِ اختیار بھی اسی لیے بنایا گیا کہ وہ اعمال اپنی مرضی کے مطابق چنے اور اُن کا جواب دہ ہو۔

''کیا سوچ رہی ہو راحیلہ .....جوانوں کی اور بات ہے لیکن بوڑھوں سے روٹھنا کہاں کی شرافت ہے.....تمہیں معلوم نہیں جب کاکے.....کیا نام ہے ڈاکٹر کا.....کامران نے ڈاکٹر بننے کا رنا ڈالا تھا تو گھر کی کیا حالت ہوئی تھی۔ ایک ہنگامہ برپا تھا۔ سارا دن کہرام مچا رہتا تھا۔ جس کمرے میں جاؤ بحث بحثی.....جدھر جاؤ گالی گلوچ.....سنا ہے اس کے ماں باپ تو پاگل ہو گئے تھے بے چارے.....ہر وقت روٹھنے منانے کی محفلیں قائم رہتیں۔ ابھی بھابھی مانی ہیں تو قیصر روٹھا پھرتا ہے.....اور پھر جو بھائی جی اکڑے ہوئے ہیں تو بھابھی موم بنی پھرتی ہیں۔ توبہ توبہ.....جب یہ گھر سے نکلا قیصر۔ جب یہ گھر چھوڑ کر بھاگا ہے.....تو اُس روز بارش ہو رہی تھی۔ تین میل پر سٹیشن تھا یہ راتوں رات سٹیشن پہنچا.....ہاں تو.....''

یکدم انہیں ساری بات بھول گئی وہ ناک کھجانے لگے۔ پھر دیر تک ناک میں انگلی ڈال ٹریدٹرید کر چوہے نکالنے لگے۔ کافی دیر بعد بولے۔

"ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں؟....."

"تین میل پر سٹیشن تھا....." راحیلہ نے اطلاع دی۔

"ہاں تو..... تین میل نہیں بھئی سوا چار میل دور سٹیشن تھا۔ پیدل چلا گیا لیکن ڈاکٹر کی ماں سخت دل کی عورت ہے۔ صبر کا پہاڑ، نہ کسی کو اُس کے پیچھے بھیجا۔ میں اتفاقاً گھر پر تھا۔ میں نے کہا بھابھی دیکھو لو وحید کے سر پر لاہور سوار ہے، میں اُس کی ضد پوری کرنے کو لاہور بیٹھا ہوں۔ جوان بیٹے پر دباؤ ڈالنا اچھا نہیں۔ مجھے اجازت دو میں سٹیشن پر جاؤں منا کر لاؤں۔ لیکن قیصر کی ماں تو دیوانی ہے..... نہیں مانی، بس اکڑ کر بولی۔ کسی کو اُسے منانے کی ضرورت نہیں کوئی اُس کے پیچھے گیا تو میں سر پیٹ لوں گی..... یہ جو ڈاکٹر ہے ناں نرا پُرا اپنی ماں ہے وہی نقشہ وہی چال ڈھال وہی ضد.....ابھی آیا نہیں بڑی دیر کر دی ڈاکٹر نے....."

"ابھی.....اب اب آتے ہی ہوں گے"

"کام تھوڑا تو نہیں کرتا۔ اب اکیلا جو مارا مارا پھرتا ہے.....تو....."

قطع کلام کرتے ہوئے راحیلہ بولی۔ "بس جی کام بھی زیادہ ہے .....وہ جی مہاجر لوگوں کی ذمہ داری بہت محسوس کرتے ہیں۔ زیادہ وقت تو کیمپ میں ہی گزرتا ہے۔"

چاچا جی نے کان کی مرمت پھر انگلی سے شروع کر دی اور غراتے ہوئے بولے۔ "چلو ماں باپ سے بول چال بند ہو گئی.....رکھتا بول چال بند..... لیکن دادی بے چاری اللہ بخشے اُس سے مل کر ہی نہیں آیا۔ وہ اسے اُڈیکتی ہی مر گئی۔ جان چھڑکتی تھی قیصر پر..... معذور تھیں اماں، کوٹھے پر رہتی تھیں۔ سارے بچوں میں سے قیصر کو اوپر بلواتیں۔ دل کی تکلیف رہتی تھی اوپر سے گھٹنے کا ورم بھی دائمی ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کو گود میں لے کر لوریاں سناتیں باتیں کرتیں۔ یہ اُن کے بال نوچتا، وہ ہنستی رہتیں۔ دوپٹہ تن سے بھی جدا نہ ہوا..... لیکن یہ قیصر اُن کا دوپٹہ کھینچ کر پگڑی بندھواتا وہ مسکراتی رہتیں۔ پھر دوپٹے کا کھیدو بنا کر پیروں سے ٹھڈے مارتا بھی نہ ٹوکتیں..... قیصر کی بہنوں کو دادی کے پلنگ پر بیٹھنے کی اجازت نہ تھی..... اکیلا یہ ڈاکٹر اُن کی گود میں گند گراتا اور وہ ہر بات برداشت کرتیں۔ اس کامران کے لیے چھپا کر چھابے میں پھلیاں کھانے رکھتیں۔ اگر کبھی مانگ لیتے تو کہتیں تو بچہ تھوڑی ہے.....لو جی بے چاری اس کے غم میں مر گئیں ہک ہا....."

چاچا جی خاموش ہو گئے۔ اُن کی آنکھوں میں کسی دُکھی بچے کا کرب تھا۔

پتہ نہیں یہ ساری انفرمیشن کیسے انہوں نے جمع کی تھی یا یہ ساری باتیں تقسیم ہندوستان سے پہلے کی تھیں۔

"ہاں جی بُرا کیا۔ ماں باپ سے اتنی بھی کیا ضد....." راحیلہ بولی۔

"میری ماں اچھی بھلی تھیں، پچانوے سے اوپر عمر تھیں لیکن سارے کام ٹھیک ٹھاک کر کرتی تھیں..... جب یہ تمہارا شوہر چلا آیا تو خوب روئیں..... بھابھی نے کھانا بھیجا لوٹا دیا۔ دودھ لے کر گئے، انہوں نے منہ نہ لگایا۔ بھابھی اُوپر گئیں تو بلک کر بولیں وہ بھی تم تکلیف نہ کیا کرو۔ بس جتنا کھانا تھا کھا لیا اب ہوس نہیں رہی۔ پہلے اُن کی عادت تھی جس چیز کی ضرورت ہوتی منڈیر پر سے آواز دے کر منگوا لیتیں..... لیکن جب چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا۔ کسی سے گفتگو کی روادار نہ رہیں۔ میری بیوی سے کہتیں اس چندری کی وجہ سے قیصر چلا گیا ورنہ وہ مجھے چھوڑ کر کبھی نہ جاتا۔ مرتے دم تک نہ بھابھی کو

منہ لگایا نہ بھائی صاحب سے گفتگو کی ایک روز بھائی جی ماں کا حال پوچھنے اوپر گئے تو آواز سن کر خوش ہو گئیں پپوٹے بھاری ہو گئے تھے انہیں انگلیوں سے اُٹھا کر بولیں آ گئے قیصر..... چلو اچھا ہو گیا..... ماں باپ کو معاف کر دے پاگل ہیں ان کو کیا پتہ جب دل کو آگ لگ جائے تو کیا ہوتا ہے..... جب قیصر کے والد نظر آئے تو منہ پھیر لیا۔ بین کرنے لگیں وے ظالماں مجھے دوہری بار رنڈی کیا تو نے..... ذرا خیال نہ کیا..... روز آدھ سیر دودھ رات کو پیتی تھیں۔ قیصر کے جانے کے بعد نہ دودھ کو ہاتھ لگایا نہ اَن پانی ڈھنگ سے کیا.....''

چاچا جی نے اپنی عینک اُتاری اور قمیض کے دامن سے آنسو پونچھ لئے۔

''مجھے بڑا افسوس ہوا جی یہ باتیں سُن کر'' راحیلہ بولی۔

''تمہیں کیا علم بیٹی کیسا پیار تھا پوتے سے۔ پہلے دماغ کمزور تھا پھر چل نکلا۔ آخری رات کا ذکر ہے۔ رات کافی ڈھل چکی تھی، مجھے کوٹھے پر کسی کے چلنے کی آواز آئی میں سمجھا کوئی چور ہوگا، بھائی جی کو جگایا گشت کی آواز آئی جائے، سردی ایسی بیٹا راحیلہ کہ لحاف سے باہر ہاتھ نکالنے کو جی نہ چاہے۔ جب ہم باہر پہنچے تو دیکھا لاٹھی کے سہارے اماں چل رہی تھیں۔ نہ تن پر دوپٹہ نہ گرم چادر بس اپنے سے باتیں کرتی جائے وادی۔ کبھی اپنی شادی کا ذکر..... کبھی بھابھی جی کی برائی۔ ٹیپ کا بند وہی قیصر قیصر قیصر..... حیلے بہانے کر کے اندر لے گئے، اندر دیکھا تو چارپائی پر نہ لحاف نہ رضائی پوچھا تو کہنے لگیں لے وہ تو میں نے قیصر کو دے دیا۔ ابھی آیا تھا میرے پاس کہنے لگا اماں جی تین کپڑوں میں دھکا دے دیا، سردی لگتی ہے..... وے ظالمو..... ایسے تو کوئی کسی مزارے کو بھی گھر سے نہیں نکالتا..... اس چندری کا شروع سے غصہ ایسا تھا۔ بھائی جی سے بڑی محبت تھی پر اُس رات انہیں دیکھ کر تھوک دیا..... بات ہی نہ کی ایک ہی رٹ تھی..... او وے ہوئے قیصر کو تین کپڑوں میں نکالا۔ ان پر تو میں تھوکتی بھی نہیں صبح اُن کی رضائی اور گدا سڑک پر گرے ہوئے ملے.....''

پھر گلی میں سے کسی کی بارات نکلی۔ باجے کے شور میں چاچا جی کی آواز دب گئی۔ جب بارات دُور چلی گئی تو چاچا جی نے بڑی کھینگلی اور لجاجت سے کہا۔

''بیٹیا یہ کوٹ دھلوا دینا۔ میرا دھوبی تو وقت پر نہیں آتا۔''

پھر وہ شرمندگی سے مسکرائے۔ راحیلہ نے کوٹ سنبھال لیا۔ کوٹ سے، بڑھاپے، پرانے پن اور دیسی صابن کی ملی جلی خوشبو آئی۔

''میرا یہ سب کچھ بتانے سے مطلب تھا کہ اب اگر یہ اپنے باپ سے معافی مانگ لے تو.....''

''قیصر تو کہتے ہیں کہ اُن کا قصور ہی نہیں.....''

''چلو نہ سہی قصور۔ ماں باپ کی ہٹ دھرمی سہی، ضد سہی..... لیکن اب وہ بڈھے ہیں۔''

''قیصر کہتے ہیں..... کہ اماں کبھی معاف نہیں کریں گی۔ وہ میری شادی زبردستی کر دیں گی کسی گنوار کے ساتھ۔''

''میں چلوں گا ساتھ..... دیکھوں گا کیسے نہیں ملتی معافی..... تم کوشش کرو راحیلہ..... جتنا وہ ماں باپ کے معاملے میں ظالم ہے اتنا ہی تمہارے معاملے میں نرم ہے..... کیا کروں اُس کا دل میری طرف سے بھی تو صاف نہیں..... میں جانتا ہوں.....''

''نہیں جی..... یہ آپ کو یونہی وہم ہے جی.....''

"میں جانتا ہوں..... میں کوئی الو کا پٹھا نہیں، بیوقوف نہیں..... میں خوب جانتا ہوں "

صحن میں نظریں پھرا کر چاچا جی نے ابرو اٹھا..... کر کہا..... " ہاں اس گھر کو عورت کی بڑی ضرورت تھی..... مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن محلے والوں سے بھی تو بالآخر پتہ چل ہی جائے گا....."

وہ پھر کان میں انگلی پھیرنے لگے۔

"کیا جی..... کیا بات ہے؟....."

" وہ سنا تھا کہ کسی بازاری عورت سے تعلقات تھے قیصر کے..... قیصر بھی کیا کرتا آخر اتنی عمر ہو گئی..... عورت کی ضرورت تو تھی ناں۔ اوپر سے بڑوں کا سایہ نہ تھا.....

راحیلہ یکدم قیصر منزل میں اجنبی سی ہو کر رہ گئی۔

" اب تو سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ تم اس کا حساب کتاب رکھو..... راتیں تو باہر نہیں گزارتا ناں۔ تم بھی ابھی نادان ہو نا سمجھ..... اُس سے کہو مجھے پرایا نہ سمجھے"

چاچا جی کے لب و لہجے میں خوشامد اور کمینگی آ گئی.....

" ہم دونوں مل کر قیصر کو قابو میں لائیں گے لیکن ڈاکٹر تو میرا آنا جانا بھی پسند نہیں کرتا..... کم از کم تمہیں سمجھانا چاہیے۔ مجھے تو اللہ ہی اللہ کرنے سے فرصت نہیں۔ سارا دن اللہ ہی اللہ....." وہ چلنے کو تیار ہو گئے۔

"بیٹھے..... جی اب تو قیصر آتے ہی ہوں گے۔"

"نہیں بھی نہیں..... لو بھائی اللہ حافظ!"

جس قدر گڑبڑائی سے چاچا جی آئے تھے اسی طرح چپ چاپ گڑبڑائی سے چلے گئے۔

راحیلہ ماضی سے بیر تو نہ کر سکتی تھی لیکن چاچا جی کی باتوں سے چوکنی ضرور ہو گئی تھی۔ وہ اجنبی گھر میں لاوارث سی اُٹھی اور اندر جا کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد زینو نے آ کر کہا۔

"بی بی جی اوپر والے کمرے صاف کر دیے ہیں عالیہ نے، چل کر دیکھ لیں۔"

راحیلہ کو اس وقت نہ بالا خانے میں دلچسپی تھی نہ صفائی میں۔ اُس کی آنکھوں میں ننھے ننھے آنسو اکٹھے ہو رہے تھے..... ان آنسوؤں میں اچانک کہیں سے شاہد کی شبیہ جھلملا جھلملا کر لوٹ رہی تھی..... نہ جانے پرانے رشتے کہاں بچھڑ گئے.....

راحیلہ اور زینو چپ چاپ دونوں اوپر والی منزل کی طرف چل دیں۔

●○●○●○

ساتواں عہد

''ہاں ہو سکتا ہے.....'' قیصر نے دھیرے سے جواب دیا اور راحیلہ کو دیکھنے لگا۔ وہ سر جھکائے اپنے ناخنوں سے کھیل رہی تھی۔

''دیکھ یار کبھے..... معاف کرنا بھابھی! ہم بچپن سے اس کا یہی نام پکارتے آئے ہیں۔'' طاہر نے جلدی سے معذرت طلب کی۔

''اور اپنا نام تو بھول گیا ہوگا چھمن سیاں۔'' قیصر نے ہنس کر پوچھا۔

''نہیں بھولا تو نہیں لیکن میری تمنا تھی کہ تجھے بھول جائے۔'' طاہر نے کان کھجاتے ہوئے سریلی سی آواز میں کہا۔

''یاد ہے کبھے جب ہم دونوں اس صاحب کے ساتھ گئے تھے؟''

''ہاں! ان دنوں تو ایک ہی گدھا تھا چھمن۔''

راحیلہ کو بات سمجھ نہ آئی تو اس نے ذرا استفسارانہ نظروں سے قیصر کی جانب دیکھا۔

''ہوا یوں تھا معصومی!'' قیصر اسے سمجھانے لگا۔

''میں بتاتا ہوں بھابھی جان۔ قیصر اور میں بچپن کے دوست ہیں۔ ہمارا گھر ایک ہی گلی میں تھا۔ پڑھتے بھی ایک ہی سکول میں تھے اور ساری دوپہریں بھی اکٹھی ہی گنواتے تھے۔'' طاہر نے لمبے لمبے ہاتھ کھول کر بات کی۔

''تو نے مجھے راہِ بد پر لگایا تھا چھمن!'' قیصر بڑے دُلار سے بولا۔

''تو چلو اچھا ہی کیا' تیری آنے والی سات پشتیں سنور گئیں۔ ہاں تو بھابھی! ہم دونوں بے شمار اور بے حد کھیلا کرتے تھے۔ سارا سارا دن ہمیں تانگہ گھوڑے کھیلتے بیت جاتا تو رات گئے تک کبڈی کے میدان میں سانسیں چھوڑتے پکڑے جاتے۔ ہماری ماؤں کو وضع داری کا بڑا خیال تھا۔ کیوں ہے نا قیصر؟ بروقت پیامات چلے آتے۔ بس کرو۔ ہاں تو بھابھی! ایک دن ہماری گلی کے کنارے ایک کار آ کر رکی۔ اس میں سے ایک صاحب برآمد ہوا۔ شاید بیچارہ Tourist ہوگا۔ وہ تو اتر کر تصویریں لینے لگا اور ہم گلی کے بچے اس کی کار کے گرد ہو گئے.....''

بات کاٹتے ہوئے قیصر بولا..... ''سب تیری شہ پر۔''

''ہو سکتا ہے لیکن اس کا کتا بڑا پیارا تھا۔ میں تو اسے دیکھنے گیا تھا۔ یاد ہے کبھے! لمبے لمبے پشم ایسے ملائم کان اور

ڈبڈبائی ہوئی موٹی موٹی آنکھیں گویا صاحب سے چند لمحے کی جدائی بھی برداشت نہ کرسکتا ہو۔ یاد ہے بیگمے! کیسے وہ منہ کھول کر ہم سب کو دیکھتا تھا؟''

''ہاں!.....شاید کوکر سپنیل تھا۔'' قیصر نے اندازہ لگایا۔

''اب کوکر سپنیل تھا کہ فوکس ٹیریئر یہ تو بہتر جانتا ہے۔ اپنی نسل کیسے بھولتی ہے؟'' طاہر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اور حضور تو شاید ڈارون کی گمشدہ کڑی ہیں؟'' قیصر نے پوچھا۔

''بات کا سارا لطف یوں برباد ہوتا ہے۔ قیصر خواہ مخواہ ٹانگ اڑانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہاں تو بھابھی! جب صاحب تصویریں لے چکا تو سیٹی بجاتا ہوا واپس آ گیا۔ میں اور قیصر حیران تھے کہ آخر اس نے تصویریں کس کی لی تھیں؟ دو تین عورتیں تنور تاپے بیٹھی تھیں۔ دو چار گندے بچے نالیوں پر بیٹھے تھے اور ایک کمہار گدھوں پر مٹی لادے جا رہا تھا..... لیکن خیر! جب وہ اپنے کتے کے پاس بیٹھ گیا تو ہمیں کیا سوجھی ہم اس کے کیریئر پر چپ کر بیٹھ گئے۔''

''ہمیں نہیں تمہیں سوجھی تھی۔'' قیصر نے پھر قطع کلام کیا۔

''اچھا! مجھے ہی سہی بابا۔ اب موقع کا گواہ کوئی موجود نہیں ہے جو بھابھی کو سمجھائے کہ یہ ایسا فرشتہ نہ تھا جیسا اس وقت نظر آتا ہے.....''

''تو پھر کیا ہوا؟'' راحیلہ نے پوچھا۔

''پھر جی ہم دونوں کھی کھی کرتے ہوئے چھپ رہے تھے کہ موٹر چل دی۔ کبھی کبھی اُچک کر ہم صاحب بہادر کا جائزہ بھی لے لیتے۔ اس کے منہ میں سگار تھا اور کتا حضور منہ کھولے کھڑکی سے چہرہ نکالے بدیس کی View دیکھ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ گاڑی کی رفتار تیز ہوگئی تو.....''

''تو طاہر کا جی کانپنے لگا.....'' قیصر نے لقمہ دیا۔

''اپنی کہہ میری جان!..... یہ جملہ اس نے حفظ ماتقدم کے طور پر کہا ہے کہ کہیں میں نہ کہہ دوں کہ یہ ڈرتا تھا..... میں تو کہتا تھا بھابھی جان! کہ کار چونگی پر آ کے رکے گی تو اتر جائیں گے لیکن قیصر تو ابھی تک اپنی امی سے ڈرتا تھا۔ تب ابھی میری ٹریننگ مکمل نہ ہوئی تھی۔ ہاں تو بھابھی! جب کار شہر سے ذرا باہر نکلی تو طاہر کہنے لگا چل یار چھلانگ لگا دیں۔ میں انکار کرتا رہا اور یہ ڈبڈبائی ہوئی نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ ابھی یہ بحث جاری تھی کہ سامنے ایک تانگہ اور گدھا کچھ یوں سڑک پر رینگتے ہوئے آ گئے کہ صاحب کو اپنی کار کی لگام کھینچنا پڑی۔ جونہی رفتار ذرا کم ہوئی' میں نے چھلانگ لگا دی.....'' طاہر بولا۔

''جھوٹ!..... بالکل جھوٹ پہلے میں کودا تھا.....'' قیصر یکدم منمنایا۔

''اچھا بھئی تو ہی سہی!..... یوں کودنے سے جو قلعے سر ہوئے ان کا سہرا تیرے نام بس؟ اونہہ بڑا سورما تھا جیسے۔ لو بھابھی! ہم دونوں نے جو چلتی گاڑی سے چھلانگ لگائی تو دور تک لوٹنیاں کھاتے کچے راستے کی ڈھلوان پر اتر گئے۔ شکر ہے اس تانگے کے نیچے نہیں آ گئے۔ اٹھے' کپڑے جھاڑے تو میں نے دیکھا قیصر کے ماتھے سے خون جاری تھا۔''

''قیصر کے؟'' راحیلہ نے جلدی سے پوچھا۔

"کیوں جی کیوں نہیں؟ کیا یہ پلاسٹک کا بنا ہوا ہے؟" طاہر نے بناوٹی سنجیدگی سے پوچھا تو راحیلہ اور قیصر ہنسنے لگے۔

"میری شلوار جا بجا سے پھٹ گئی تھی اور لہو رواں تھا۔ یاد ہے قیصر پھر ہم نے کیا کیا تھا؟" طاہر نے اپنی بات جاری کی۔

"چلو اب راحیلہ کو بور نہیں کرو۔" قیصر بولا۔

"بات ہی اب کام کی آئی ہے۔ اب تک تو محض تمہید تھی۔ اچھا تو بھابی جان! ابھی ہم چار قدم بمشکل چلے ہوں گے کہ قیصر صاحب بولے یار طاہر میری قمیض لہو سے بھر گئی ہے اسے دھولیں تو گھر چلیں۔ میں نے پوچھا کیوں حضرت؟ پر وہ کیوں؟ تو فرمانے لگے اماں ناراض ہوں گی۔ میں نے ڈانٹ کر کہا اماں شرینی نہیں بانٹیں گی کہ لڑکا مرتے مرتے بچ گیا۔"

"میں نے یوں تو نہ کہا تھا۔" قیصر نے مدافعت کی۔

"کسی طرح بھی کہا تھا مقصد یہی تھا۔ بھابی! یہ لڑکا ایسا ڈرپوک تھا ایسا ڈرپوک جیسے چھچھوندر ہوتی ہے۔ اماں سے پوچھ لوں؟ اماں کو بتا آؤں؟ یہ تو اس کا تکیہ کلام تھا۔ گھر سے نکلتا تو دھوئے دھائے کپڑوں کی یوں حفاظت کرتا گویا واپسی پر بیچنے ہیں۔ سارا دن سکول میں کچھ نہ کھیلتا۔ اور بھابی پھر میں نے اسے ایسا کر دیا کہ اماں پوچھتیں کہاں چلا؟ تو جواب ملتا آپ کو غرض؟..... کپڑے صبح تبدیل ہوتے لیکن شام کو تیلی کی صدری اور باورچی خانے کے جھاڑن ایسے ہو جاتے۔ پھر تو ایسا گیا تھا کہ سٹیشن والے شیڈ کے پاس میرے ساتھ گنڈے تک لوٹنے چلا جاتا..... یاد ہے نا قیصر؟" طاہر نے پیٹھ پر ہاتھ مار کر پوچھا۔

"تو نے بگاڑا تو حالات بگڑے۔" قیصر نے منہ سا بنا کر جواب دیا۔

"قیصر میری سنوار سے تو انسان بنا۔ ورنہ تو رہن پڑے ہوئے زیور کی طرح ہو جاتا۔ نہ تجھ سے کسی کی بانہیں سجتیں نہ کسی کی مانگ میں سندور اترتا نہ کسی کے لبوں پر مسکراہٹ آتی.....اور تو الگ پڑا سڑتا رہتا....."

قیصر نے راحیلہ کی جانب لمحہ بھر کو دیکھا لیکن نہ تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور نہ ہی اس پر بیاہتا عورت کا گمان ہوتا تھا۔ وہ تو کسی پلیٹ فارم پر بیٹھی گاڑی تبدیل کرنے کا سوچتی نظر آتی تھی۔ قیصر نے منہ پھیر کر پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر بڑے تحمل سے طاہر سے بات کی..... "اچھا طاہر تیرا سامان کہاں ہے؟"

"سامان..... کونسا سامان؟"

"وہی سامان جس کے ساتھ شریف لوگ سفر کیا کرتے ہیں۔" قیصر بولا۔

"فلیٹیز میں اور کہاں؟ دنیائے خدا تنگ نیست۔"

"اچھا یہ بات ہے کراچی میں رہ کر تو نے یہی کچھ سیکھا ہے؟" قیصر ابرو اٹھا کر کہنے لگا۔

"یہ تو بہت بری بات ہے۔" راحیلہ بھی بددلی سے بولی۔

"بھابی! برا نہ ماننا لیکن میں شادی شدہ لوگوں کے ہاں ٹھہرا نہیں کرتا۔ مجھے جب سے اطلاع ملی کہ قیصر کا [illegible]

ہو گیا' میں لاہور ہی نہیں آیا۔ مجھے ایسے گھروں میں بڑے خطرناک جراثیم نظر آتے ہیں.....'' طاہر نے گھنے ابرو ناک کے اوپر اکٹھے کرتے ہوئے جواب دیا۔

''آخر کب تک بچتا رہے گا طاہر؟'' قیصر نے سوال کیا۔

''اگر تم ایسے لوگوں سے متاثر یا تو زیادہ دیر تک نہیں۔'' طاہر بولا۔ قیصر نے جلدی سے اپنی نگاہیں چادر پر جمالیں اور راحیلہ نے گفتگو میں اثر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''دیکھیے آپ کو میرا خیال نہ کرنا چاہیے تھا۔ قیصر آپ کے دوست پہلے تھے اور میرے شوہر بعد میں بنے ہیں۔ دوستوں کے بڑے حق ہوتے ہیں۔ آپ کو یہیں ٹھہرنا چاہیے۔''

''بھابی! بھئی معاف کرنا میں ویسے بھی گھروں میں قیام کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ جتنی دیر مہمان گھر پر رہتا ہے جانبین کی روح سولی پر ٹنگی رہتی ہے۔ عموماً یوں ہوتا ہے کہ مہمان صبح اٹھنے کا عادی ہے لیکن میزبان گیارہ بجے تک جمائیاں لینے کے حق میں ہیں۔ ادھر مہمان صبح اٹھ کر بھی سوتا بنا رہتا ہے۔ ادھر گھر والی کا صبح سویرے اٹھنے سے بند بند ٹوٹتا ہے۔ مہمان سینما جانا چاہتا ہے' گھر والوں کے ہاں بچے کے عقیقے ہو رہے ہیں۔ گھر والوں کو سیر کی عادت نہیں اور مہمان صاحب ڈنڈ پیل کے بغیر جی نہیں سکتے۔''

''یعنی تم میزبانوں کے سامنے ان کی برائیاں کرو گے؟'' قیصر نے ہولے سے تنبیہ کی۔

''نہیں یار میں کوئی تازہ وارد کے حق میں ووٹ نہیں دے رہا۔ میں تو یہ کہتا ہوں کسی کے ہاں خواہ مخواہ ٹھہرنا بڑی زحمت کا باعث بنتا ہے۔ مہمان کے لیے بھی اور میزبان کے لیے بھی۔ خود ہی ذرا خیال کرو۔ کیا مصیبت سی آئی رہتی ہے۔ ادھر مہمان سو رہا ہے' ادھر گھر والا جوتی اتارے پھرتا تھا۔ بی بی باورچی خانے کے برتن یوں اٹھاتی ہے گویا کاغذی بتاشے ہوں اور بچے تو صبح سویرے ہی نوکر کے ساتھ دفان کر دیا جائے۔ کرسیاں یوں سرکائی جاتی ہیں گویا پہلے پہل پوتے میاں پاؤں پاؤں چلنا سیکھ رہے ہیں۔ نانی اماں کا ورد وظیفہ قطعی بند اور سروتا تو وہ ڈھونڈتی بھی پھریں تو کبھی نہ ملے۔.....'' طاہر نے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''آپ تو خواہ مخواہ مبالغہ کرتے ہیں۔'' راحیلہ بولی۔

''مبالغہ؟ بھابی جان! مبالغہ کچھ اور ہی چیز ہوتی ہے! میں تو خود اتنا بڑا مبالغہ ہوں کہ مجھے گفتگو میں اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔''

صبح سے دوپہر ہوئی۔ دوپہر کے بعد دھیرے دھیرے سائے طویل ہوئے' پھر کندنی دھوپ کا رنگ اڑنے لگا.....لیکن قیصر اور طاہر کی باتیں جاری تھیں۔ باتوں کے باوجود قیصر کا بخار ہلکا تھا اور اس کے چہرے کی سلوٹیں نظر نہ آتی تھیں۔ ناک کے اردگرد کی کھائیاں مسکراہٹوں میں ڈوب گئیں اور چہرے پر شگفتگی کے ایسے آثار آ گئے جو پہلے کبھی اگر نظر بھی آئے تو پل بھر کے بعد اوجھل سے ہو گئے۔ راحیلہ آرام کرسی میں بیٹھی ہولے ہولے جرسی بن رہی تھی اور سوچتی جا رہی تھی کہ آخر قیصر اس طرح کیوں نہیں رہ سکتا۔ اس کی مسکراہٹیں یوں ہی کیوں نہیں چٹکتیں؟ اور یہ اسی طرح مسرور کیوں نہیں رہتا؟ طاہر نے اپنے کپڑوں کی پروا نہ کی تھی۔ جوتا اور کوٹ اتار کر وہ قیصر کے ساتھ پلنگ میں لیٹا تھا۔ اس کے ہر بلند و بالا قہقہے کے ساتھ پلنگ میں ایک زلزلہ سا آ جاتا۔ وہ قیصر کے ساتھ لپٹ جاتا۔ اس کے سیاہ بال بکھر جاتے اور قیصر کا سر اس

کے سینے پر تک جاتا..... ان چند لمحوں میں قیصر کی پیشانی بالکل سرد ہو جاتی۔ اس کے سارے دکھ دور ہو جاتے۔ ذیابیطس کا پھنکارتا ہوا سانپ گیدڑ بھبکی بن جاتا۔ لپکتے ہوئے بڑھاپے کے قدم تھم جاتے اور سامنے بیٹھی ہوئی راحیلہ اس کی بر مافرنٹ پر بہت جلد ملنے والی اپنی محبوبہ بن جاتی۔ ایسی محبوبہ جو اس کے خوابوں کی حسین تعبیر بھی تھی!

خاموشی کا ایک بڑا سا وقفہ گفتگو پر چھا گیا۔ کنڈی دھوپ خیالی سی روشنی بن گئی۔ راحیلہ نے سلائیاں تکلائی چھوڑ دیں اور اٹھ کر قیصر کا بخار لیا۔ اسے دوائی پلائی اور پھر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر چند لمحے کے لیے اسے دیکھتی چلی گئی۔ قیصر نے کسی جواں سال لڑکے کی طرح نگاہیں جھکالیں اور آہستہ سے کہنے لگا ''نہیں سب ٹھیک ہے' تم فکر نہ کرو۔''

طاہر کی ہنستی آنکھوں میں نامعلوم سی نمی آ گئی۔ اس کے مسکراتے ہونٹ دونوں طرف سے لٹک گئے اور لحاف پر پڑا ہوا ہاتھ ٹانکے ادھیڑنے لگا۔ پھر اس نے قیصر کی طرف دیکھا۔ مسکرایا اور سگریٹ جلا کر دھوئیں کے مرغولے چھوڑنے لگا۔ مارکو پولو کی خوشبو اور سپرٹ کی تیز باس صحن میں لہرانے لگی۔ راحیلہ نے اس خوشبو میں گہرا سانس لے کر کہا۔ ''کتنی خاموشی ہو گئی تھی ابھی۔ کوئی فرشتہ قریب سے گزرا ہے۔''

''ہاں ابھی یہاں سے گزرا تھا۔'' قیصر نے راحیلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

طاہر نے دونوں کی طرف دیکھا اور پھر بڑی بناوٹی آواز میں ایک انگریزی گیت گنگنانے لگا۔ قیصر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور ہنستے ہوئے کہا..... ''بس صاحب بس! ہم نے مانا آپ یورپ پھر آئے ہیں لیکن یوں بور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''اچھا تو نہ سہی!.....'' طاہر نے لب سکوڑتے ہوئے جواب دیا اور ایک بار پھر خاموشی چاروں طرف پھیل گئی۔

قیصر نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور پھر بڑی توجہ سے اس کا کندھا جھنجھوڑ کر پوچھا ''کیا ہوا طاہر؟ یوں کیوں بیٹھے ہو؟''

طاہر نے ایک لمبی سی سانس لی اور پھر بڑی روہانسی آواز میں بولا۔ ''میں نہ کہتا تھا' شادی شدہ لوگوں کے گھر میں میری جا نہیں ہے؟''

''کیا؟''

''ہاں قیصر یہ گھر ہے..... اپنا گھر..... ہمارا گھر بستا گھر..... اور..... اور..... تم مجھ سے بہت آگے نکل گئے ہو قیصر۔ تمہاری بیوی ہے' تمہارا گھر ہے۔ جلد ہی بچے والے بھی ہو جاؤ گے۔ اور میں؟ میں سردیوں میں آتشدان کے قریب بیٹھ کر سگریٹ کے ہالے بنایا کروں گا اور اسی دھوئیں سے محبت کروں گا جو ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ خدا جانے میں نے کبھی بیاہ کو اہمیت کیوں نہ دی؟ لیکن اب جب کبھی میں کسی بیمار شوہر کے قریب اس کی اداس بیوی کو بیٹھا دیکھتا ہوں تو مجھے اپنا گھر ہوٹل نظر آتا ہے۔ مجھے یہ بات بیکار سی نظر آتی ہے کہ میں دنیا کے گرد چار چکر لگا چکا ہوں.....''

''چار بار.....؟'' راحیلہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

''جی بھابھی! اور ان گنت دوست اس دنیا کے کونوں کھدروں میں چھوڑ آیا ہوں۔ ایسے دوست جن کی شخصیتوں سے میں متاثر ہوا اور جنہوں نے مجھ سے اثر لیا۔'' لمبی سی آہ بھر کر طاہر بولا۔

"بکواس بند!..... "قیصر نے اپنے روہانسے دوست کے گھٹنے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "اگر ایسی باتیں کرے گا تو رات کو کھانا نہیں کھلاؤں گا....."

طاہر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "نہیں یار میں بکواس نہیں کر رہا' سچ کہہ رہا ہوں۔ تمہیں اپنی زندگی کا سب سے بڑا المیہ سنا رہا ہوں۔ بھابھی! شائد تمہیں یقین نہ آئے لیکن مجھ جیسے آدمی سے ان گنت لڑکیوں نے شادی کی فرمائش کی اور میں نے ازدواجی زندگی کو اپنی آزاد روح کا بندھن سمجھا۔ میں ان سے جان چھڑاتا کتراتا رہا۔ میں نے اپنے سفروں پر بڑے معرکے کے رومان لڑائے لیکن میں محبت کو قریب سے جان نہ سکا۔ ایسی محبت جو وصل کے منہ آ سکے..... میرے پاس ایسی دوست بھی ہیں جو برسوں پہلے مجھے اتفاقیہ ملی تھیں اور اتفاقیہ روپوش ہو گئیں لیکن مجھے ان کے خط آتے ہیں..... ایک امریکن لڑکی کو میں بس میں ملا تھا۔ چند گھنٹوں کی معمولی سی ملاقات..... اور جب میں یہاں واپس آیا تو اس سے خط و کتابت کرتا رہا۔ اس نے بیاہ کیا..... طلاق لی اور آج وہ جوان نہ ہوگی۔ شاید میں اسے پہچان بھی نہ سکوں لیکن مجھے اس کے ابھی بھی خط آتے ہیں..... ویسے ہی! کبھی کبھی ہم بڑے لمبے وقفوں کے لیے ایک دوسرے سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور پھر اچانک یہ ناتا آپ سے آپ بندھ جاتا ہے۔ کسی دن ڈاک میں اچانک اس کا لفافہ ہوتا ہے۔ وہی بغیر تاریخ کا خط جس کی پہلی سطر ہمیشہ کی طرح یہی ہوتی ہے۔ مجھے حیرانی ہے کہ آخر میں تمہیں کیوں خط لکھ رہی ہوں؟ تم سے تو میری ملاقات چند گھنٹوں کی بھی نہیں ہے..... بھابھی! میں سوچتا ہوں۔"

"بس کر یار بس کر....." قیصر نے اپنے دوست کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کہا۔

"محبت کے لیے ملنا ملانا کچھ ایسا ضروری تو نہیں ہوتا قیصر۔ کیوں تمہارا کیا خیال ہے؟" طاہر نے آہستہ سے پوچھا۔

قیصر نے محض ایک ثانیے کے لیے راحیلہ کی جانب دیکھا اور پھر بڑی لاپروائی سے بولا..... "ہاں شاید؟ کچھ ایسا ضروری بھی نہیں ہے..... پر شاید؟..... بھئی کچھ کہا نہیں جا سکتا..... ہاں وثوق سے تو کچھ بھی کہا نہیں جا سکتا!"

راحیلہ نے اپنے ہاتھوں پر نظریں جمالیں اور جلدی جلدی بولی "آپ کس الجھیڑے میں پڑ گئے ہیں طاہر صاحب۔ کوئی اور بات کیجیے نا۔ میری امی کہا کرتی تھیں کہ جب دو وقت ملتے ہوں تو ایسی باتیں نہیں کیا کرتے....."

"کوئی اور بات..... یعنی؟" طاہر نے پوچھا۔

"جیسی باتیں آپ صبح کر رہے تھے۔ جیسی باتیں دوپہر کو ہو رہی تھیں۔"

"اوہ اچھا!..... لے قیصر ٹانگ اٹھا' میں بستر سے نکلوں۔ بھابھی کو چند ٹرکس (Tricks) دکھاتے ہیں۔ یہ اپنا کدو سا سر میری جانب سے اٹھا..... اچھا تو لو بھابھی۔" طاہر بستر میں سے باہر نکل آیا۔ اس کی قمیض پینٹ سے باہر تھی اور پینٹ میں جا بجا اتنے بل تھے کہ وہ شلواری نظر آتی تھی۔ بوٹوں میں پیر اڑستا ہوا وہ دور کھڑا ہو گیا۔

"بے ہوائے آنکھیں بند کر کے مت لیٹو! ہمیں ڈر لگتا ہے..... اچھا بھابھی! یہ ٹرک میں نے برما فرنٹ میں سیکھا تھا۔ بے ہوائے پھر وہی حرکت! آنکھیں کھولو!" پھر اس نے بڑے تکلف سے ایک سگریٹ نکالا۔ ہتھیلی سے سگریٹ کیس پر ٹھپایا اور پھر قیصر کے منہ میں دیتے ہوئے بولا "لے بکے! تو سگریٹ پی!"

"خوامخواہ! جلتی ہو تو بات بھی ہے۔" قیصر نے بھینچے ہوئے ہونٹوں سے بند بند بات کی۔

"مدیدہ کہیں کا! بے اعتباری آدمی!..... جل بھی جاتی ہے صبر تو کر۔ لو دیکھو بھائی! میرے ہاتھ خالی ہیں۔ دیکھ لے بکے! پھر بعد میں سب سے پہلے تجھے ہی اعتراض ہوگا..... خالی ہیں ناں! تسلی ہوگئی؟ اچھا اب میں ایک جلتی دیا سلائی اپنی ول پاور Will power سے پیدا کروں گا....." اس نے چند لمحوں کے لیے افق پر نظریں جمالیں۔ بڑا سنجیدہ سا چہرہ بنایا اور پھر بایاں ہاتھ اپنی پینٹ کی جیب میں ڈال لیا..... چند لمحے ہاتھ اندر رہا۔ اس کی آنکھیں سکڑ گئیں اور پھر ایک جلتی سلائی انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے درمیان ہتھیلی کی طرف بھڑکتی ہوئی باہر نکلی..... "شوں!..... لے قیصر!....." قیصر کا سگریٹ جلاتے ہوئے طاہر بولا۔

"یہ ٹرک ہے؟ دیا سلائی پہلے پینٹ میں موجود تھی۔ بڑی ٹرک تھی برما سے سیکھنے کی..... کوئی جلتے کوئلوں پر چلنا سیکھا ہوتا تو بات بھی تھی..... دیا سلائی تو پہلے جیب میں تھی۔ اگر ہمیں پہلے جیب دکھائی ہوتی تو بات تھی....." قیصر نے سر ہلا کر کہا۔

"اچھا!..... تو حضرت موجود ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ یہ لو دیا سلائی تم جلا کے دکھاؤ جی۔" طاہر نے ماچس پلنگ پر پھینکتے ہوئے بات کی۔

"میں نے کوئی پینٹ پہن رکھی ہے جو یہ ٹرک لڑا سکوں؟" قیصر نے ہنس کر بات ٹالی۔

"اور جو مصر کے تم پینٹ پہن کر مارا کرتے ہو وہ ہم خوب جانتے ہیں۔ چل بکے! میرا سگریٹ واپس کر۔" طاہر نے جلتی سگریٹ قیصر کے منہ سے نکال لی اور آرام سے اسے پینے لگا۔

دھوپ مٹ گئی۔ شام کے اندھیارے بڑھنے لگے اور نیچے اترنے کی تیاریاں ہونے لگیں تو طاہر بھی چلنے پر بضد ہوگیا۔ قیصر اور راحیلہ نے بہت روکا لیکن وہ رومال سے بوٹ جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور جاتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہتا گیا..... "نہیں میں شادی شدہ لوگوں کے ہاں کبھی نہیں جاؤں گا..... کبھی نہیں کبھی نہیں..... میں پھر امریکہ جاؤں گا..... پھر ہوائی کے جزیروں کو دیکھوں گا۔ جاپان جاؤں گا لیکن ایسے گھروں میں پھر قدم نہیں رکھوں گا..... کبھی نہیں کبھی نہیں....."

طاہر کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد قیصر کا بخار پھر تیز ہوگیا.....

☆☆☆

راحیلہ قیصر سے قریباً پندرہ سال چھوٹی تھی۔ قیصر نے بڑے سال ماں باپ سے جھگڑتے انہیں مناتے اور پھر ان سے اپنا راستہ علیحدہ کرنے میں لگا دیئے تھے۔ لاہور آ کر بھی اسے بڑی مشکل سے ایک پرائیویٹ کالج میں داخلہ ملا تھا۔ جہاں اسے لوگ عمر کی وجہ سے چھیڑتے تھے لیکن قیصر جب اندر کچھ فیصلے کر لیتا تو پھر اسے اپنی منزل سے ہٹانا مشکل ہوتا۔ ایف ایس سی میں اس کی ملاقات نجم سے ہوئی۔ قیصر اور نجم شاید عام طالب علموں کی طرح مختلف راستوں پر نکل جاتے لیکن ایک ہی گلی میں رہنے کی وجہ سے گاہے بگاہے ملاقات ہو ہی جاتی تھی۔ ان دونوں نے رُک رُک کر سال گنوا کر اپنی اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ پھر قیصر میو ہسپتال میں ہاؤس جاب کرنے لگا اور صبح سویرے "زمیندار" "سول اینڈ ملٹری گزٹ" اور "احسان" اخبار دیکھ دیکھ کر اس کا دوست نجم خالی آسامیوں کی عرضیاں ٹائپ کرنے لگا۔ نوکری کی تگ و دو کے علاوہ کتابوں

کی دکان کو کھنگالتا۔ مسجد میں نماز پڑھنے کو ترجیح دیتا اور روسی ناول پڑھنے میں وقت صرف کرتا۔ اپنے گھر والوں سے وہ بچپن میں ہی کٹ چکا تھا۔ رات کے وقت وہ ''مشرق'' اخبار میں کبھی کبھی خصوصی نمائندے کی رپورٹ لکھ دیتا۔ یہ ہوائی رزق ظلِ تسلی کے لیے تو کافی تھا لیکن وقت کٹی کے لیے قطعی نامناسب تھا۔ آمنہ سے دھیان ہٹانے اور توجہ کو کسی مثبت مرکز پر مرکوز کرنے کے لیے اس نے بہت پاپڑ بیلے لیکن اندر ہی اندر وہ پریشر ککر میں سٹیم ہوتا رہا۔ اس کا کوئی رازداں نہ تھا۔ وہ اپنی پشیمانی پر اکیلا ہی کھولنے کا عادی تھا۔

وقت گزرتا گیا۔

نجم اور قیصر ملک سلیک سے آگے نہ بڑھے۔ عمر، پیشہ اور طبیعتوں کا فرق انہیں فاصلے پاٹنے نہیں دیتا تھا۔ ان دنوں ایمرجنسی میں آگ میں جھلسے ہوئے فسادیوں کے ہاتھوں زخمی، نظریاتی اختلافات میں پھنس کر لوگ بڑی تعداد میں ہسپتالوں میں آنے لگے تھے۔ ابھی قیامِ پاکستان وجود میں نہ آیا تھا۔ جس طرح جائیداد بانٹنے سے پہلے بھائیوں میں مقدمے، لڑائی جھگڑا، غیبت، مباحثے، کیچڑ اچھالنے کا ایک Phase آیا کرتا ہے، ایسے ہی ایک بڑی پریشان کن تھرتھراہٹ سارے ہندوستان میں پھیلی تھی۔ کانگریس اور لیگ اب کھلم کھلا حریف صورت آمنے سامنے تھے..... لیکن نجم نہ تو اس up-heaval کا حصہ تھا نہ ہی کسی بیرونی انتشار کا۔ وہ تو ایک اور ہی مخمصے میں پھنس کر ایمرجنسی میں جا پہنچا تھا۔

یہ واقعہ اچانک ہوا۔

نہا دھو کر ہمسائے کی جمیلہ دھوپ سینکنے کی غرض سے کوٹھے پر جا نکلی۔ پھر اس نے چارپائی پر بیٹھ کر دوپٹہ پائنتی پر رکھا اور اپنے سال بھر کے بچے کو دودھ پلانے میں مشغول ہو گئی۔ اس وقت نجم دوستوفسکی کا ناول ہاتھ میں اٹھائے کوٹھے پر آیا اور جلدی سے اس نے چٹخنی لگا دی۔

اس وقت نجم کو معلوم نہ تھا کہ جمیلہ بھی دھوپ سینکنے اوپر آئی بیٹھی ہے۔ وہ صرف نیچے کے شور سے بچنے کی نیت سے اوپر آیا تھا۔ وہ شیر گرم دھوپ میں بیٹھ کر برورز کیرامازوف پڑھنا چاہتا تھا لیکن اس کے آتے ہی جمیلہ بچے کو سینے سے لپٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اس وقت کوٹھا ایک جنگل نظر آیا جس میں وہ ہرنی صفت اکیلی تھی۔ زور کی ہواؤں میں درخت جھول رہے تھے اور شیر ہلکے پنجے جماتا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چٹخنی کے لگتے ہی جمیلہ کی عقل نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

''آہا..... آپ یہاں ہیں.....'' نجم نے خوش دلی سے کہا۔

''جیسے تم جانتے نہیں؟''

عورت کا غصہ چڑھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنا دوپٹہ پکڑنا چاہا لیکن نجم اس سے پھرتیلا تھا۔ اس نے دوپٹہ جلدی سے اٹھا کر اپنی پشت کی جانب کر لیا اور شوخی سے چکر لگانے لگا.....

''اب دوپٹہ لے کر دیکھیں..... اب دوپٹہ لے کر دیکھیں.....''

جمیلہ کا سر گھومنے لگا تھا۔ بچے کو اس نے اتنی سختی سے سینے سے بھینچ لیا کہ وہ ہولے ہولے رونے لگا۔

''دو میرا دوپٹہ..... فوراً..... میں نیچے جانا چاہتی ہوں.....''

''اور اگر میں نہ دوں تو..... ہیں جی نہ دوں تو.....''

"تو..... تو میں شور مچادوں گی..... تمہارے بھائی آ جائیں گے۔"

"اور اگر میں نے شور نہ مچانے دیا تو....."

اب تک مجم کی نیت معصوم تھی۔ وہ جمیلہ کو ستانے بھڑکانے سے آگے کچھ بھی سوچ نہ سکتا تھا۔ وہ ایک دھونس کے رشتے کی تلاش میں تھا جہاں پر گناہ کی غلطی کی ہر Trespass کے بعد معافی ہی معافی تھی' پیار ہی پیار تھا۔

مجم نے جمیلہ کی جانب قدم بڑھایا تو جمیلہ ایک اور موڈ میں تھی۔ ایسی کھلاڑیوں کے کئی واقعات پہلے بھی ہو چکے تھے لیکن کوٹھے والے دروازے کی کنڈی لگتے ہی اس کے اندر ایسی کھلبلی مچ گئی گویا قلعہ فتح ہونے سے پہلے قلعے کے باسی آخری زور لگا رہے ہوں۔

"جمیلہ..... سوچ لو..... بھائی ابھی بازار گئے ہیں اور نیچے بھی گھر پر کوئی نہیں۔ سب میلاد کی محفل پر رخصت ہو گئے ہیں....."

یہ جملے بھی محض چھیڑنے کے لیے تھے۔ بھی گھر پر تھے۔ اس وقت جمیلہ نے پورے ہاتھ کا زنانے دار تھپڑ مجم کے چہرے پر جڑ دیا۔ مجم چونکہ اس تھپڑ کے لیے تیار نہ تھا' اس کے ہاتھ سے دوپٹہ چھوٹ گیا۔ جلدی سے دوپٹہ اٹھاتے ہوئے جمیلہ چلائی..... "شہر جا بدمعاش' کمینے' کتے..... میں تو پہلے دن سے چھوٹا دیور سمجھ کر لاڈ کر رہی ہوں..... تیرے دماغ میں جانے کون کون سے خلل پرورش پا رہے ہیں حرامزادے..... بدنیت بدنیت..... جب تیرے بھائی کو بتایا ناں تب وہ تیری چمڑی ادھیڑیں گے بدنیت..... اوپر سے کچھ اندر سے کچھ حرامی..... بدنیت۔"

جمیلہ پیر پٹخ پٹخ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ ہوا میں ایک ارتعاش رہ گیا..... بدنیت..... بدنیت..... بدنیت.....

مجم نے جمیلہ کے تعلق میں اپنے آپ کو کئی تالوں میں مقفل کیا۔ اپنے آپ کو مار مار کر ہلکان کیا۔ بڑی سزائیں دی تھیں اپنے آپ کو..... لیکن آج تک اس نے اپنے آپ کو بدنیت نہیں سمجھا تھا..... وہ حدود پار کر کے چرانے کا عادی نہ تھا۔ ہر طرف سے اس کے لیے بدنیتی کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ مسجد کے مائیکروفون پر اذان کے بجائے بدنیت..... بدنیت..... بدنیت کے جملے ابھرنے لگے.....

رات کو گھر والے اسے ایمرجنسی میں لے گئے۔ مجم نے بڑی مقدار میں سلیپنگ پلز کھائی تھیں..... جمیلہ نے ایک بار بھی دل میں تاسف نہ کیا..... اس معاملے میں اُس کی نیت صاف تھی بلکہ اس نے ہر لمحے یہی سمجھا کہ اس نے دشمن کی یلغار کو بڑی خوبی سے روک دیا۔

مجم کی زندگی کا یہ ایک نیا Phase تھا۔

قیصر نے نہ صرف اسے طبی مدد فراہم کی۔ ہسپتال اور دوائیوں کے بل ادا کیے بلکہ ساری ساری رات جب مجم کو ڈرپ لگی رہتی وہ اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا رہتا۔ رات کے پچھلے پہر ایک دوسرے کی محرومیوں پر ٹھوڑیاں رکھے ان کی سانسیں قریب آ گئی تھیں۔ پچھلی رات کے رابطے ویسے بھی سنجیدہ اور سنگین ہوا کرتے ہیں۔ چور دم سادھے چوریاں کرتے ہیں۔ عاشق دبی آواز میں باتوں کی شیرینی گھولتے ہیں۔ مائیں سجدوں میں خاموش آنسوؤں سے بڑے آقا کی زنجیر

جہانگیری کھینچے جاتی ہیں..... آخری رات کے وقت انسانی سائیکی قہقہے نہیں لگا سکتی۔ شور مچانا' دندنانا' اچھل کود اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا..... یہ وقت رازداری' پردے داری اور حساب داری کا ہوتا ہے.....

ایسے ہی وقتوں میں قیصر نے نجم کے اندر جھانکا اور پھر جھانک کر اس شبنم میں بھیگتا چلا گیا جو نجم کے آنسوؤں میں جنم لیتی تھی۔ نجم شفایاب ہو کر بھی قیصر کے ساتھ ساتھ منتقل ہو گیا۔ تین گلیاں چھوڑ کر قیصر نے ایک ہی تھا کلینک بھی کھول رکھا تھا۔ شام کو اس کلینک پر وہ پرائیویٹ مریض دیکھتا۔ اب نجم انتظار گاہ میں بیٹھا رہتا۔ جب قیصر فارغ ہو جاتا تو وہ دونوں اکٹھے گھر واپس آتے..... قیصر کی ہمدردی نے نجم کے ٹپت جذبوں کو زبان دے دی تھی۔ وہ جلد مشتعل ہو کر اونچی اونچی بولنے لگتا۔ کبھی کبھی چیزیں توڑ دیتا' کاغذ پھاڑ کر پھینک ڈالتا۔ سگریٹ جلا کر اسے پیروں تلے مسل دیتا..... سب سے پہلے قیصر نے گھر چھوڑنے پر اصرار کیا..... پہلے تو نجم نہ مانا لیکن پھر قیصر نے ایک کمرہ اور غسلخانہ کرائے پر لے کر نجم کو اس میں منتقل ہو جانے پر مجبور کر دیا..... اب قیصر باقاعدگی سے اس گھر کا کرایہ بھی دینے لگا۔ مستقل نوکری کی تلاش میں نجم پہلے والٹن کیمپ میں افسر رابطہ بننا نہیں چاہتا تھا لیکن اس نوکری پر بھی قیصر ہی نے اس کے پاؤں جمائے۔ نجم ایک ذہین آدمی تھا۔ کچھ دیر جھگڑا کرنے کے بعد اسے نظر آنے لگتا..... حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی صلاحیت اس میں موجود تھی.....

لیکن حالات کیا تھے' کیونکر تھے اس کی سمجھ بوجھ صرف قیصر میں تھی..... دیہات سے شہر تک' تعلیم سے ڈاکٹری تک..... کئی مرحلے تھے۔ قیصر منزل خریدنے' ڈاکٹری بنی کو Establish کرنے تک اس نے کئی قسم کی ٹیکنیکس بدلی تھیں۔ وہ لوگوں کے تجربے سے سیکھا تھا۔ نجم کی تربیت کتابوں نے کی تھی۔ اس کا علم کتابی' سائیکی زخم خوردہ' شخصیت' احساس کمتری میں بھیگی ہوئی' قسمت تاریک اور حالات ناگفتہ بہ تھے۔ قیصر لوگوں کے تال میل سے سیکھا تھا۔ وہ انسانی تجربے سے نتائج حاصل کرنے کا اہل تھا۔ اس کی روح تازہ دم' فیصلے چٹے اور شخصیت مثبت تھی.....

لیکن انسان بنیادی طور پر ناشکرا ہے۔ جب وہ شکرگزاری کا بھاری گٹھڑ سر پر اٹھائے تھک جاتا ہے۔ جب شکریہ' خوشامد اور تعریف کے عمل سے گزر گزر کر اس کا سانس بند ہونے لگتا ہے تو اس کی سائیکی' اس کا نفس اس بوجھ سے رہائی چاہتا ہے۔ نجم بھی قیصر کا احسان مانتا آیا تھا لیکن اب اس احسان مندی کی پنڈ اُس سے اٹھائی نہیں جاتی تھی..... وہ بغاوت کرنا چاہتا تھا جس طرح بیوی بہت لاڈ پیار کرنے والے شوہر کی Invisible ہتھکڑیاں اتار پھینکنا چاہتی تھی۔ قیصر اسے اپنی پالتو بلی کی طرح پالتا رہا..... اور نجم کو احساس ہوا جہاں اتنی زیادہ Dependency ہو وہاں بھی دھونس کا رشتہ پنپ نہیں سکتا۔

ناشکرگزار عموماً شکرگزاری کا جوا اتار پھینکنے کے لیے ایک حربہ استعمال کرنے لگتا ہے۔ وہ غور سے اپنے محسن کی حرکات اور کردار پر کڑی نظر رکھتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے نقائص پر بڑے بڑے الزام گھڑتا ہے۔ تلاوت الوجود میں محسن پر ناحق ہونے' اپنی زندگی کو برباد کرنے اور سکھ کا سانس نہ لے سکنے کی ساری ذمہ داری اس پر لگاتا ہے حتیٰ کہ ماں باپ' دوست' نوکری دلانے والا حتیٰ کہ اللہ بھی ناشکرگزاری کی تکنیک تلے بڑے بڑے الزامات تلے آ جاتا ہے۔ نجم کو جب قیصر میں دھونس والا رشتہ مل گیا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کی ساری آزادی سلب ہو گئی ہے۔ وہ شکرگزاری کی رسیوں میں بندھا آزادانہ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ایک بار راز دان بنانے کے بعد وہ کوئی بات قیصر سے چھپا نہیں سکتا تھا۔ ایک بار ہالی

حاصل کرنے کے بعد اس مدد سے انکار کرنا قیصر سے رابطہ توڑنا ممکن نہ تھا۔

صبح جب ایک اجنبی شاہد اس کے پاس واٹن کیمپ سے آیا تو اس گریک اپالو کو دیکھ کر اس میں ایک امید نے جنم لیا۔ وہ شاہد کی چنگاری قیصر منزل میں ڈال کر قیصر کی ساری خوشیوں کو بم دھماکے سے اڑا سکتا تھا۔ کبھی کبھی برسوں خدمت کرنے والا مرید جس کی ہر صدا بجا ارشاد ہوا پر ختم ہوتی ہے اسی Trawma سے گزرتا ہے۔ وہ مرشد کے حضور میں اپنے نفس' انا' سیلف کو اس درجہ پامال کر دیتا ہے کہ پھر اپنے پیروں پر کھڑا ہونا' فیصلے کرنا اور اپنی زندگی آپ گزارنا بے ادبی اور گستاخی میں شمار ہونے لگتا ہے۔ اسی لیے شاید اللہ نے ایسی اطاعت سوائے اپنی ذات کے کسی اور کے لیے منتخب نہیں کی۔ خود نظروں سے اوجھل ہونے کی وجہ سے وہ انسان کے مشاہدات کی نذر نہیں ہو سکتا۔ مرشد کو مرید بڑے غور سے دیکھتا ہے۔ اس کے ہر قول و فعل کو جانچتا اور تضاد کا متلاشی رہتا ہے۔ اسی طرح کئی سال نجم قیصر کی زنجیر سے بندھا چھوٹا کتا بنا رہا۔ پھر اس کے نفس نے بغاوت کر دی اور آج جب وہ شاہد سے ملا تو اسے یقین ہو گیا کہ آج اس کے ہاتھ میں زنجیر کاٹنے والی تیز دھار آری آ گئی ہے۔ وہ مرچ مسالے لگا کر شاہد کا ذکر قیصر سے کرنا چاہتا تھا کہ قیصر ایک بار پھر اپنے خول میں چلا جائے۔ راحیلہ کو بھی وہ شاہد کے ذکر سے جگانا' ابھارنا' ستانا چاہتا تھا۔ اب تک نجم کے سارے راز قیصر کے پاس تھے۔ آج ترپ کا یکہ نجم کے ہاتھ میں آ جانے پر اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔

وہ بغلی گلی سے ہو کر قیصر منزل کے صحن میں کھلنے والے چھوٹے دروازے تک پہنچا۔ یہاں سے ملازم اور بہت بے تکلف رشتہ دار آیا کرتے تھے۔ آج وہ راحیلہ سے اس کے ماضی کے متعلق کرید کرید کر بہت باتیں کر سکتا تھا۔ اپالو کو بڑھا چڑھا کر قیصر کے مستقبل کو متاثر کر سکتا تھا..... شکر گزاری کا جبہ اتار کر پھینکنے کی لذت سے آشنا ہو سکتا تھا۔ آج اس کی آزادی کا دن تھا۔

پہلے تو راحیلہ نے سوچا کوئی پرندہ دروازے سے ٹکرا کر چلا گیا۔

پھر وہ اپنے بوجھل جسم کو خوبصورت شال میں لپیٹتی دروازے تک آئی۔

''کون ہے؟.....''

باہر سے کوئی آواز نہ آئی تو اس نے ذرا سا دروازہ کھولا۔ نجم ایک شوخ مسکراہٹ کے ساتھ کھڑا تھا۔

''جی ڈاکٹر صاحب گھر پر نہیں ہیں.....''

نجم کی مسکراہٹ میں دوغلا پن تھا۔ ''بھلا کب تک لوٹ آئیں گے؟.....''

راحیلہ نے نظریں پرے کر کے کہا..... ''واٹن کیمپ گئے ہیں' پتہ نہیں کب آئیں گے۔''

''میں وہیں سے آ رہا ہوں' ابھی تک پہنچے نہیں تھے۔''

نجم نے سر کھجا کر پوچھا..... ''کیا میں ان کا انتظار کر سکتا ہوں؟''

راحیلہ نے لمحہ بھر کو سوچا اور پھر بولی'' پتہ نہیں جی' وہ کب آئیں۔ بہتر تو یہی ہے کہ آپ وہیں ان سے مل لیں کیمپ میں۔''

راحیلہ مڑنے کو ہوئی تو نجم نے لجاجت سے کہا..... ''سنیے' ذرا ٹھہریے.....''

وہ بڑے ناپاک ارادے سے ساگانے بھڑ کانے آیا تھا۔ اپنے محسن کو عام آدمی کے روپ میں دیکھ کر خوشی حاصل کرنے کی نیت سے آیا تھا لیکن جمیلہ کی ہم شکل اس کے سامنے کھڑی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اس نے شاہد کے ذکر کو رول بیک کر دیا۔ وہ حیا کے سارے پردے چاک نہیں کر سکتا تھا۔

"آپ نے مجھے معاف تو کر دیا ہے؟" نجم نے لجاجت سے کہا۔

"جی.....!"

"پھر قیصر مجھے گھر کیوں نہیں لاتا۔ حالانکہ کیمپ میں ہم سارا وقت اکٹھے ہوتے ہیں۔"

"مجھے اس بات کا کوئی علم نہیں.....اور کچھ؟"

"بس ایک بات بتانا تھی آپ کو.....لیکن خیر پھر بھی سہی۔ جب میں قیصر کے ساتھ آؤں گا پھر....."

"ٹھیک ہے جی' خدا حافظ....."

مزید بات بڑھائے وہ لوٹنے لگی۔ اس میں ذرا سا تجسس بھی نہ جاگا کہ نجم اس سے کیا کہنا چاہتا ہے؟ نجم نے بغل سے اخبار نکال کر کہا..... "یہ "زمیندار" اور "احسان" لایا تھا قیصر کے لیے' دے دیجیے گا۔"

راحیلہ نے اخبار پکڑ لیے۔ "شکریہ....."

"آپ کا بھی شکریہ.....معاف کر دینے کا.....خدا حافظ۔"

اس بار نجم جلدی سے گلی میں جا نکلا۔ وہ اپنے آپ کو مزید گفتگو کی مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔ کیا پتہ اس کے اندر والا کس طور پر بات کرے؟ جب انسان خود bitter ہو تو پھر اس سے کسی کی خوشی دیکھی نہیں جاتی۔

بقول جمیلہ وہ ایک بدنیت شخص تھا۔ کوٹھے والی ملاقات تک وہ اپنے رذیل' بدمعاش' دہشت زدہ ہمزاد سے واقف نہ تھا۔ اس کے لاشعور میں چھپے دو سینگوں اور دو لمبے دانتوں والے ڈریکولا سے اس کی شناسائی نہ تھی۔ جمیلہ کے تھپڑ نے پہلی بار اسے اپنے ارادوں کی ناپاکی کا احساس دلایا۔ اسے بڑی دیر تک یقین نہ آیا کہ ایم اے پاس' مسجد میں باقاعدگی سے نماز پڑھنے والا' گلی میں گزرنے والے ہر بوڑھے کو سلام کرنے والا بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا بھی ہو سکتا ہے۔

بظاہر نجم پُرامن ہو گیا تھا لیکن جمیلہ کے خیال میں قید رہنے کی سزا وہ بھگت چکا تھا اور وہ ایسے ہی ممکن تھا کہ قیصر جیسے عظیم انسان کے بت کو کسی طرح منہ کے بل گرا دے۔ وہ قیصر کے وجود میں حسد کا اگن بان کیسے چھوڑے۔

جس طرح اچانک اس پر ایک تھپڑ سے یہ آگاہی جاگی تھی کہ وہ دراصل ڈریکولا ہے' ایسے ہی ایک جھٹکے سے واقعے سے اس پر ایک اور حقیقت بھی کھلی۔ چلتے چلتے کہیں سے ایک بلبل اس کے کندھے پر آ کر بیٹھ گئی۔ نجم نے اس کی جانب دیکھا۔ بلبل عام طور پر ایسی گلیوں کا رخ نہیں کرتی' وہ کھلے درخت دار علاقوں کا پرندہ ہے لیکن یہ بلبل جانے کتنی مسافت طے کر کے آئی تھی۔ نجم نے آسمان کی جانب دیکھا۔ شاید کوئی شکرا' باز اس کے تعاقب میں تھا۔ نجم نے کندھے پر بیٹھی ہانپتی بلبل پر ہاتھ رکھا' وہ کسمسائی لیکن آزاد ہونے کی کوشش نہ کی۔ پھر نجم نے اس کو دلاسہ دینے کے انداز میں مساس کیا۔ ہاتھ کا چلو بنا کر پانی پلایا۔ بڑی سڑک تک آتے آتے بلبل کے حواس درست ہوئے۔ اس نے ایک بار نجم کی جانب شکر گزاری سے دیکھا اور پھر فضا میں اڑ گئی.....

راحیلہ بھی جانے کن مسافتوں کی تھکی ہاری تھی۔ کیمپ میں پہنچنے تک نہ جانے کن لوگوں نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ قیصر منزل میں وہ آسودہ تھی بھی کہ نہیں..... اس کا ماضی کہاں تک اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا..... کیا وہ اپنے مستقبل سے پُرامید تھی۔ نجم نے دل میں سوچا..... قیصر کی مسلسل شکرگزاری سے آزاد ہونے کے لیے کوئی اور ترکیب سوچنا پڑے گی..... وہ ماڈرن آدمی تھا۔ شگون پر یقین نہیں رکھتا لیکن بلبل نے جیسے اسے ایک نئی سوچ عطا کر دی تھی۔

وہ راحیلہ جیسی بلبل کو اپنے شر سے آزاد کر سکتا تھا۔

اسے لگا جیسے ڈریکولا ڈبکی لگا کر لاشعور میں گھس گیا اور اس کی جگہ سفید لباس میں سفید ریش والے کسی بزرگ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ نجم نے مڑ کر دیکھا۔ گلی ویران تھی۔ نجم نہیں جانتا تھا کہ اس کے اندر یہ بھی خوبی بھی موجود تھی۔

قیصر کم گو آدمی تھا۔ اس کی Self-made زندگی میں یہ خاموشی ڈھال بھی تھی اور تلوار بھی۔ تکیہ بھی تھی اور لحاف بھی..... سواری بھی تھی اور سوار بھی۔ کئی بار وہ گھنٹوں خاموش رہتا۔ راحیلہ بھی اسے بلانے کی جرأت نہ کر سکتی۔ قیصر سر کرسی کی پشت سے جما کر دونوں ٹانگیں سامنے والی دیوار کے ساتھ ٹکا لیتا۔ اس کی آنکھیں بھنچ جاتیں۔ دونوں بازو لٹکائے منہ میں سگریٹ دبائے ساکت وجامد وہ دیر تک بیٹھا رہتا۔ راحیلہ ان بیٹھکوں کے متعلق اندازہ نہ لگا سکتی تھی کہ ایسے ازلی چپ لمحوں میں وہ کیا اور کیوں سوچتا ہے۔ جس دیوار پر اس کے بوٹ ٹکے ہوتے بالکل اسی دیوار کی طرح اس کا چہرہ جذبات سے معرا ہوتا۔ وہاں نہ خوشی ہوتی نہ رنج..... نہ تاسف کے رنگ ابھرتے نہ انبساط کی چھوٹیں۔ اس کا چہرہ ساکت پانیوں کی طرح خاموش رہتا۔ آنکھوں پر ایسے دبیز پردے گر جاتے کہ کوئی جھانک کر اندر نہ دیکھ سکتا۔ کبھی کبھی راحیلہ کو شبہ ہوتا کہ قیصر کھلی آنکھوں گہری نیند سو رہا ہے..... لیکن کبھی کبھی وہ اس عجیب وغریب خاموشی سے ڈر جاتی..... اسے لگتا یہ اجنبی مرد اندر ہی اندر اس کے قتل کے منصوبے بنا رہا ہے۔ ان خلوتوں میں قیصر کبھی کسی ساتھی کو لے کر نہ گیا۔ وہ تنہا جاتا اور اکیلا ہی پلٹ آتا۔

راحیلہ پوچھتی..... ''سچ سچ بتائیں ابھی آپ کیا سوچ رہے تھے؟.....''

''کچھ نہیں..... تم سمجھ نہیں پاؤ گی.....''

''کوئی پرانی یاد؟..... کوئی واقعہ؟..... بچھڑا ساتھی.....''

قیصر سوچتا پھر کسمسا کر جواب دیتا..... ''مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں دو دنیاؤں کا باشندہ ہوں..... میں گاؤں میں بھی رہتا ہوں اور اس شہری گلی میں بھی..... میں تمہارے سایہ دار درخت تلے بھی رہتا ہوں اور ان لوگوں کے ساتھ بھی جو قافلہ در قافلہ چلے آ رہے ہیں۔ ان درماندہ تھکے ہارے لوگوں کے اتنے مسائل ہیں راحیلہ..... نہ ان کے گھر ہیں نہ اثاثہ نہ ان کی روزی طے ہے نہ آسرے..... بس اٹھتے بیٹھے ان مسائل میں اضافہ ہوتا ہے..... پتہ نہیں وہ سچے ہیں کہ تم..... یہ خوشی جو مجھ میں احساس جرم کو جنم دیتی ہے یہ..... آنند کب تک رہے گا۔ ان مہاجروں کے مسائل وقتی ہیں کہ دائمی.....''

''دیکھیے ایک مسئلہ تو آپ سلجھا سکتے ہیں۔ آپ گاؤں چلیں وہاں امی ابا سے ملیں.....''

''وہ اب اس دنیا میں کہاں..... ساری زمین پر میرے بہنوئی قابض ہو گئے۔ وہاں جا کر کیا لینا ہے؟''

راحیلہ چپ ہو گئی لیکن چاچا جی تو کہتے تھے کہ ماں باپ بڈھے ہیں اور منتظر ہیں۔ قیصر اور چاچا جی میں کون سچا

ہے اور کون جھوٹا؟

"آپ اس قدر خاموش ہو جاتے ہیں کہ آپ کا چہرہ خوفناک ہو جاتا ہے..... یہ پُر اسرار اداس خاموشی مجھے ڈرا دیتی ہے۔"

"بڑی سوچنے والی باتیں ہیں راحیلہ..... آج والا بچہ..... ذیابیطس..... بڑھاپا..... موت اور پھر راحیلہ! بڑھاپے کا عشق..... بنجر زمین پر برسات کا پانی....."

وہ دونوں ہنس دیے۔ ابھی راحیلہ تصفیہ نہ کر سکی تھی کہ قیصر واقعی کیا سوچتا ہے۔ چاچا جی نے ان خلوتوں کے متعلق اسے مشکوک کر دیا تھا۔ اپنی فرصت کے وقت وہ کیا سوچتی رہتی ہے۔ اس کے بارے میں اسے کوئی شبہات نہ تھے۔ اس کے تخیل میں کئی انہونی کہانیاں حقیقت بن کر اترتی تھیں۔ کئی کھوئی ہوئی صورتیں مانوس ہو کر پکارتی تھیں۔ کیسے کیسے صنم بسیرا کرتے تھے۔ وہ ان چوری چھپے کی خوشیوں کو خوب جانتی تھی..... اپنی سوچ کے راستے وہ قیصر کی خاموشی کو سمجھنے کی کوشش کرتی۔

اپنی اپنی علیحدگی کو راز بنائے ہوئے بھی ان کی باہمی زندگی شفقت اور احترام سے چل رہی تھی۔

"جلدی آیئے گا..... میں جانتی ہوں نجم بھائی سے آپ کی کمٹ منٹ ہے۔ پھر بھی جلدی آ جایئے گا..... کبھی کبھی مجھے ڈر لگتا ہے اگر جو..... اگر جو کہیں Pains شروع ہو گئیں تو....."

"تو استانی جی کو بلا لینا۔ میں ان سے ذکر کر چکا ہوں۔"

"میرا پین دیکھا ہے کہیں....."

قیصر آنے والے بچے کے متعلق بڑی نرمی اور دھیان سے سوچتا تھا۔

"جی ابھی لائی۔ آپ نے رات تکیے تلے رکھا تھا۔"

"اوہ ہاں..... بھلا تمہیں یہ ساری باتیں کیسے یاد رہ جاتی ہیں راحیلہ..... کم از کم بیس برس مجھ سے چھوٹی ہو ناں....."

شکستہ سی مسکراہٹ کے ساتھ قیصر کی ناک کے ارد گرد دو گہری لکیریں پڑ گئی تھیں اور ٹھوڑی کا گھراؤ اور بھی نمایاں ہو گیا تھا۔ راحیلہ نے قیصر کی مسکراہٹ کا جواب دیے بغیر بیڈ روم کا رخ کیا اور سیاہ پین لے آئی۔

"جیتی رہو۔" قیصر نے پین لیتے ہوئے بزرگوں کی طرح کہا اور راحیلہ کو غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اس کے دونوں کندھے پکڑ کر آہستہ سے کہا "جو مرد بڑھاپے میں محبت کرتا ہے اس کی محبت میں ایک عجیب قسم کی شدت ہوتی ہے..... ایسی شدت اور حدت جس کا ابھی تمہیں احساس نہیں ہو سکتا۔"

"بھلا آپ کدھر سے بوڑھے ہیں۔" راحیلہ نے اتراہٹ سے پوچھا۔

"یہ میرے سفید بال..... میرے کندھے کا خم میری روح کی بوسیدگی....." اس نے اس بڑھاپے کا ذکر نہ کیا جو اسے مسلم لیگ اور قائداعظم کے خواب نے عطا کیا تھا۔

"کنپٹی پر چند سفید بالوں کے یہ تو معنی نہیں کہ انسان بوڑھا ہو گیا ہے۔"

''لیکن تمہیں بڑھاپے پر اتنا اعتراض کیوں ہے راحیلہ۔ میں اس سال پورے سینتالیس برس کا ہو جاؤں گا..... پر.....ایک بات پوچھوں' کیا محبت صرف جوانی کے ورثے میں آئی ہے..... بوڑھے آدمی کو.....اس حق سے کون دستبردار کرتا ہے راحیلہ' کون؟''

''آپ اس قدر نہ سوچا کریں قیصر.....زیادہ سوچ بھی انسان کے لیے اچھی نہیں ہوتی.....آپ ہرگز ہرگز بوڑھے نہیں.....''

''تم تو کسی یونانی دیوتا کے قابل تھیں۔ پھر مجھے جیسے چینڈ نقش ونگار کے ساتھ.....نظر ہو سمجھ لو.....''

''پھر وہی بات' آپ بوڑھے نہیں ہیں.....''

''اگر.....ہم.....تو پھر تم مجھے تخلیے میں تُو کہہ کر مخاطب کیوں نہیں کرتیں؟''

''تو؟.....تو؟...'' راحیلہ نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں.....خواہش کے بھی کیا کیا عنوان تھے۔ اس شخص کے دل میں تُو کہلانے کی خواہش کیسے پیدا ہوئی؟

قیصر نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ پھر آہستہ سے راحیلہ کے کندھے سے دوشالہ سرکا کر ہنسلی کی ہڈی پر اپنے لب ٹکا دیے۔ راحیلہ کو محسوس ہوا گویا کسی ٹھنڈے مزار کا ٹکڑا اس کے جسم کو چھو رہا تھا۔ وہ آہستہ سے کسمسائی۔ قیصر نے ہونٹ اٹھا لیے' وہ ذرا پرے ہو گئی۔

قیصر نے سرد لہجے میں کہا ''تم میرے لیے بڑی لازمی ہو گئی ہو راحیلہ.....جیسے آکسیجن.....لہو.....نیند.....کبھی کبھی سوچتا ہوں تمہاری ضرورت جسمی ہے کہ روحانی.....اندرونی ہے کہ بیرونی۔''

یہ کہہ کر وہ جلدی سے مڑا اور بغیر کچھ کہے صحن میں چلا گیا۔

وہ شال ٹھیک کرتے ہوئے راحیلہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔

راحیلہ کے کانوں میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی.....''پھر تم مجھے تخلیے میں تُو کہہ کر مخاطب کیوں نہیں کرتیں؟''

اس کے دل میں کوئل کی سی کوک بن کر ایک کراہ اٹھی.....اور تُو کہاں ہے تُو؟.....تُو؟ اس نے سر کو تھام لیا اور اس خیال کو ذہن سے نکالنا چاہا.....

پتہ نہیں وہ اپنی وفا میں کہاں تک وفادار تھی.....

راحیلہ تو ایک ایسا پودا تھی جو تنہائی کی مسموم ہوا میں عشق کے پھول اُگانے پر مجبور تھی۔

اس کا وجود احساس کی لرزہ خیز تبدیلیوں سے زخمی ہو چکا تھا۔

وہ قیصر کو تو سمجھاتی تھی' پر وہ اپنا کیا کرے۔

وہ صبح شام سوچتی رہتی کہ اس کی نیت کیا ہے؟

کیا وہ قیصر کو چھوڑ جانا چاہتی ہے؟

کیا موقع ملنے پر وہ طاہر کے ساتھ چلی جائے گی.....

اپنے عمل کو وہ سچائی کے کس کھاتے میں ڈالے؟

چھان پھٹک 'منزل' کمتر ہونت کے یہ لمحے بہت لمبے ہو جاتے تو وہ بھاری قدموں سے نکل کر باہر صحن کے تخت پر جا لیٹتی۔ اس کی کمر آنے والے بچے کی وجہ سے دُکھنے لگتی اور اس کا دل آنے والے بچے کے لیے کبھی گداز ہو جاتا اور کبھی سخت۔ کبھی وہ بچے کو رحمت سمجھتی اور کبھی عذابِ الٰہی۔

یہ سارے عذاب کہاں سے آ رہے ہیں میرے رب؟ میں نے تو کسی کے لیے بھی فیصلہ نہیں کیا..... پھر میری نیت کے متعلق کیوں سوال کیا جائے گا..... ابھی راحیلہ یہ سوچ نہ پائی تھی کہ نیت ہمیشہ چھری کی دیکھی جاتی ہے پھل کی نیت کو نہیں جانچا جاتا۔ پھل کاٹ کر کسی مریض کو دیا..... کٹے پھل میں زہر ملا کر دشمن کے آگے رکھا۔ پھل دے کر کسی بچے کو اغوا کیا۔ محبوبہ کے آگے دھرا..... یہ سارے عمل چھری اور چھری والے ہاتھ کے ہیں پھل کے نہیں۔ مجبور کا عمل کچھ اور طور پر عمل صبر ہے یا جہاد.....

راحیلہ حیران تھی کہ قیصر اتنے تھوڑے عرصے میں اس کی زندگی میں کیسے گھل مل گیا۔ قیصر کے متعلق وہ اتنا کچھ جاننے لگی تھی کہ سالوں سال تسنیم اور اوما کے ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ سب کچھ نہ جانتی تھی۔ قیصر جب بھی سوتا ہے تو بائیں کروٹ پر ہی اسے نیند آتی ہے۔ جب بھی وہ پہلو بدلتا ہے تو اس کی ٹانگیں پیٹ تک ضرور آتی ہیں۔ صبح ناشتے کے وقت قیصر دانت برش نہیں کرتا' صرف کلی کر کے چائے پینے لگتا ہے۔ قیصر صبح خیز ہے۔ رات دیر تک جاگتا رہے تو بھی صبح جلدی ہی اٹھ جاتا ہے۔ قیصر بیسن سے منہ دھوتا ہے' صابن استعمال نہیں کرتا..... شلغم گوشت اسے پسند نہیں..... لکیروں والے کپڑے نہیں پہنتا..... عزلت نشین ہے..... ساری نمازیں نہیں پڑھتا..... لیکن ٹونے ٹوٹے میں نمازیں پڑھتا ہے.....

قیصر..... قیصر..... قیصر.....

کیا وظیفہ' قیصر نے مجھے اس سے دور کر دیا ہے کہ نزدیک؟

قیصر کو ہر اس چیز سے محبت ہو جاتی ہے جو قیصر منزل میں آ جاتی..... پھر وہ پرانی پیلے رنگ کی بلی کی طرح ہر چیز سے ایک رابطہ بنا لیتا۔ پرانی بوتلیں' ڈبے' ٹین ڈبے' تاریں' کھوکھے' صوفے' دریاں' کرسیاں' ٹاٹ' پیپے' ٹوکریاں اور سارا الم غلم جو ایک بار قیصر منزل میں داخل ہوا پھر نہیں نکلا۔ اس لیے اس گھر کے تین بہترین کمرے گودام بن چکے تھے۔ ان میں دھول اٹی رہتی۔ مکڑیوں نے جالے تان رکھے تھے۔ ان کے کونے کھدروں میں دوپہر کے وقت بھی جھینگروں کی آوازیں آتیں۔

ایک دن بابا فضل کی مدد سے ان کمروں کو صاف کرنے کی راحیلہ نے سعی کی تھی.....

"راحیلہ..... آخر ان چیزوں کو کیوں پھینکتی ہو؟ کسی دن کام آ جائیں گی....." قیصر نے اکھاڑ پچھاڑ نکال گھر کو دیکھ کر کہا۔

"لیکن..... لیکن قیصر اتنی ساری خالی بوتلیں' کھوکھے رکھ کر ہم کیا کریں گے؟"

"کبھی کام آ جائیں گی راحیلہ....." قیصر نے اخبار سے سر اٹھائے بغیر ترشروئی سے کہا۔

"تو اچھا پڑی رہیں....."

راحیلہ ٹلنے لگی۔

''تمہیں یہ انبار اچھا نہیں لگتا تو کیمپ بھیج دو ورنہ تو ہر چیز کی ضرورت ہے.....صرف ضائع نہ کرو.....''

''اچھا جی.....''

تیل' گرد اور میل سے اٹے سامان کے علاوہ ایک جانب کئی ٹرنک' سوٹ کیس' بخ والی پیٹیاں بھی پڑی تھیں۔ ابھی ان کو کھول کر دیکھنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ ایک ٹرنک کھولا تو اس میں ڈھیروں ڈھیر خط جمع تھے۔ راحیلہ نے خطوں پر توجہ نہ دی۔ وہ ان لوگوں سے ناواقف تھی جن کی اتنی ساری تحریریں تھیں۔ ان واقعات کا بھی علم نہ تھا جو ان خطوں میں مندرج تھے۔ اسے قیصر کے ماضی سے اتنی دلچسپی نہ تھی کہ پرانے کاغذ پھرولتی پھرتی۔ اسی انبار سے بزنس کے خطوط' رسیدیں' سرکاری خطوط' محبوباؤں کے محبت نامے' دوستوں کے رقعے علیحدہ کرتی۔ اس ٹرنک پر کوئی قفل نہ تھا۔ اندر خطوں میں کوئی ترتیب نہ تھی۔

قیصر نے بھی انہیں پھاڑنے' پڑھنے یا کھولنے کی زحمت نہ کی تھی۔ نسخے' بجلی کے بل' دواؤں کے پمفلٹ' ہسپتالوں کے مراسلے پڑھنے کی نوبت نہیں آئی تھی.....لیکن راحیلہ تو خود اپنے ماضی کو تھپکیاں دے کر سلا رہی تھی۔ وہ قیصر کے ماضی پر دستک کیسے دیتی؟

نجم جب ڈاکٹر قیصر کے کلینک پر گیا تو چھوٹے لڑکے کو ٹیکہ لگا کر ڈاکٹر قیصر نے روئی کا پھاہا ٹیکے والی جگہ پر دبا کر رکھ دیا۔ لڑکا سانولا ضرور تھا لیکن یونانی چہرہ رکھتا تھا۔ بھوبھلائے سنہری بال' گرے آنکھیں اور گہرا سانولا رنگ.....نہ جانے یہ کس قوم کا بچہ تھا.....سکندر اعظم کے جلو میں آنے والی فوج کے کسی سپاہی زادے کی اولاد در اولاد.....محمد بن قاسم کے ساتھ آنے والوں میں کسی کا بچہ جو درپچہ میں خون.....کسی ایرانی نژاد کی مقامی شادی کا نتیجہ.....یہ بچہ کتنا daybrid تھا اور کن کن کے لہو کراس میں بہتے تھے۔ اس کے ہمشکل ان گنت لوگ کیمپ میں گھوم پھر رہے تھے۔ قیصر نے نجم کے دفتر سے باہر نظر ڈالی۔

حماقت آمیز بے ترتیبی اور بدنظمی میں بھی لوگوں نے ٹکڑوں کی طرح ایک ترتیب پیدا کر لی تھی۔ ٹرک' تانگے' ریڑھے' دیگیں لانے والے انصار' ترتیب بے ترتیبی کے درمیان لوگوں سے دور کھڑے تھے۔ لوگوں کے گروہ در گروہ ہراساں' پراندہ ٹکڑیوں میں جگہ جگہ بکھرے تھے۔ وین پر گم شدہ رشتہ داروں کی اناؤنسمنٹ جاری تھی۔ روٹیاں بٹ رہی تھیں۔ پانی کی بالٹیاں ادھر اُدھر جاری تھیں.....لوگ گٹھڑیاں ٹرنک کھول بند کر رہے تھے.....ترتیب اور بے ترتیبی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟.....''

''میرا جی؟.....''

''نام تو مجھے پتہ نہیں جی۔ سب لالو لالو کہتے تھے۔''

''ماں باپ؟.....''

''باپ کا نام تو جی اسماعیل تھا اور ماں میری کا نام اں تھا زینب.....''

''تھا کیا؟.....کہاں ہیں وہ؟.....''

''وہ جی جب ہم گاؤں سے نکلے تو جی جتھہ پڑ گیا..... ماں پیو دونوں کو وڈ نک دیا۔ میری چھوٹی تھی جی داراں وہ بھی گواچ گئی.....''

''اور باقی رشتہ دار..... وہ سب.....''

''ڈاکٹر صیب جی جب..... ہم فتح پور چوڑیاں کے قریب تھے تاں تو جتھہ پڑ گیا..... بڑے بندے وڈ دیے جی..... باقی بھاگ گئے' کچھ لگ لکا گئے چری کے کھیت میں..... درختوں کے اوہلے..... پاس ایک گراں تھا جی سارے اُدھر کو بھاگے۔''

''اور..... اور تم اب کس کے ساتھ ہو.....''

''کسی کے ساتھ نہیں ڈاکٹر صیب جی..... میں تو کلم کلا آیا ہوں۔ ٹر دا ٹر دا۔ آگے چل کر ایک اور قافلہ مل گیا تھا۔''

''پھر.....''

قیصر نے منہ پرے کر لیا۔

یہ دس بارہ برس کا لڑکا کس کا تھا.....؟

سامنے پھیلے ہوئے ہجوم میں کہاں کہاں کے لوگ تھے..... یہ کس قدر ستائے ہوئے تھے کہ انہیں غربت کی راہ اختیار کرنا پڑی..... ان کے لیے آسمان دور اور زمین سخت کس قوم' کس شخص نے کر دی تھی۔ آریا النسل؟ عربی نژاد؟ یونانی لہو والے؟

قیصر نے لالو کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا..... ''وہاں کیا کرتے تھے..... اپنے..... پیچھے.....؟''

''وہاں تو جی آپاں..... ابا مزارعہ تھا چودھری جی کا۔ داؤی بیجی کرتا تھا جی..... اماں کپاہ چنتی تھی..... میں سبزیاں توڑتا تھا ڈنگر پشو دیکھتا تھا..... ڈاکٹر صیب جی! جب فصل اٹھا لیتے تاں کنک کی تو ڈھیر میں جھاڑو پھیر پھیر کر..... بڑی کنک جمع کر لیتا تھا.....''

یکدم اس کی گرے آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''کیا ہوا؟..... کیا یاد آ گیا؟''

''وہ جی ایک باری جی..... ایک باری..... میں نے کھیتوں سے بوجھ بانجھ کے جی دو بوریاں کنک کٹھی کر لی تھی..... پھر منشی آ گیا تھا جی اس نے ڈاکٹر جی..... اس نے جی دانے بھی لے لیے اور جی مجھے مارا جی بہت مارا..... ترے مہینے ڈاکٹر جی میں منجے پر پڑا رہا..... میری ماں کرلائے..... دانے لے لیتا میرے لالو کو نہ مارتا جی.....''

''دیکھو یہ اب تمہارا اپنا دیس ہے..... یہاں تمہیں مارنے والا کوئی نہیں..... ہم سب برابر ہیں..... جہاں سب ایک سے ہوں تاں وہاں مارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا..... لالو.....''

''اچھا ڈاکٹر جی! یہاں مارنے والا کوئی نہیں ہوگا.....''

''تو ہمارے نبیؐ نے جو کہا ہے.....''

''تو پھر تم بتاؤ جب سب برابر ہی ہو گئے تو کون کس کو مارے؟''

لالو پھر رونے لگا۔

"بھئی اب کیا ہو گیا؟....."

"جی میرا ابا کہا کرتا تھا لالو..... انسان مانتا نہیں..... تو ماننے والا بن جاتا کسی طرح..... ڈاکٹر صیب جی..... آپ کا کیا خیال ہے یہ جو اتنے سارے اجڑ منجڑ کر آئے..... اپنے کھیت بیلے وہاں چھوڑ کر ادھر آ گئے ہیں نا یہ..... یہ سارے نبی جی کی مان لیں..... ان میں سے تو زیادہ لوگ وہ ہیں ڈاکٹر صیب جی جن کو یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ کل وہاں کیوں تھے اور..... آج اتھے کیوں آئے بیٹھے ہیں؟"

اتنے چھوٹے لڑکے کے منہ سے اتنی بڑی بات سن کر ڈاکٹر قیصر چپ ہو گیا۔ کبھی کبھی مجموعی لاشعور کی دانشمندی کسی چھوٹے بچے' کسی جاہل چینڈو بوڑھی عورت کے منہ سے کشف کی طرح جاری ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

راحیلہ نے ایک لمبا سانس لیا اور سامنے صحن میں پھیلی ہوئی ان کرنوں کو دیکھا جو چند لمحے دبے پاؤں داخل ہوئی تھیں۔ ان منور کرنوں کے جلو میں حدت نہ تھی' صرف روشنی تھی کمزور..... بیماری ضیا۔

راحیلہ نے اس ٹین کے کنستر پر نظریں جمائیں جو ستون کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس کنستر میں ایک چھوٹی سی قلم لگی تھی جسے دیکھ کر احساس ہوتا گویا کوئی لمبی سی دانتن یہاں ٹھونس گیا ہو۔

راحیلہ کے پاس یادوں کے سہارے جینا آسان بھی تھا اور مشکل بھی۔ چھوٹی سی بات پر ماضی کے دریچے کھل جاتے' پرانے واقعات' چہرے نظر آنے لگتے۔ راحیلہ کو لگتا وہ بیک وقت دو زمانوں میں' دو کیفیتوں میں بڑی جانداری اور ہوش کے ساتھ زندہ ہے۔

کنستر میں لگی چنبیلی کی قلم سے ایک اور قلم دماغ کے پردے پر چلنے لگی۔ کالج کی اکیڈیمک بلڈنگ کے ساتھ ساتھ موتیا کی جھاڑیاں قطار میں لگی تھیں۔ ہر صبح ان پر ان گنت بادامی رنگ کی کلیاں لگ اٹھتیں۔ ہر وہ لڑکی جسے کالج کی کسی دوسری لڑکی سے مسرت کا خزانہ مل سکتا تھا' ان پھول کلیوں کو چنتی اور ان کے گجرے پروتی۔ ہر وہ لڑکی جس کی توجہ کا مرکز کوئی پروفیسر تھی' ان کلیوں کو پریت سے ہار بنتی' گجرے کی شکل میں پروتی..... پروفیسروں کے جوڑوں میں' لڑکیوں کے بالوں میں' کلائیوں پر' گردنوں پر یہ پھول مرجھاتے..... لیکن پھر ہر صبح جھاڑیاں لدی کی لدی نظر آتیں۔

کالج..... اس کے کشادہ لان' ہوسٹل' ڈائننگ ہال کا پُر رعب ڈھنگ..... ٹینس کے لان' پگڈنڈیاں' عالیشان اونچے گھنے درخت' پھولوں سے لدی کیاریاں' پانی سے کھلکھلاتا ٹیوب ویل کا چوبچہ..... اور ہری ہری درب پر ملاقاتیوں کی نیچی نواڑی کرسی پر بیٹھا ہوا شاہد..... افغانی رنگت' نارو تنکیان بال اولمپک کھلاڑیوں جیسا جسم' ایکٹروں کی آواز..... جنس مخالف کو توڑنے پھوڑنے کے لیے شاہد کے پاس بڑا اسلحہ تھا۔

ہنچ بیک آف ناٹرڈیم جیسے عشق عموماً زمین دوز کاریزوں کی طرح چلتے تھے لیکن شاہد جیسا حسن ہیروشیما پر گرنے والا بم تھا..... سب کچھ تہس نہس کرنے والا..... آسمان کی جانب غبار بھری فریاد کی چھتری بن کر ابھرنے والا.....

جس طرح حادثے سے پہلے ڈرائیور کار و ہیل جلدی سے گھماتا ہے اور اسے سیدھی پٹڑی سے اتارتا ہے ایسے

ہی راحیلہ نے اپنی سوچ کو موڑا..... قیصر کی جانب..... قیصر منزل کی طرف۔ اسے لگا جیسے کوئی کانچ بھی تھا ہی نہیں..... کوئی ابراہیم لاج نہ پہلے تھا نہ آئندہ ہوگا۔ اس کا وجود ٹھہرے پانیوں پر جامد کائی کی طرح متعفن تھا..... پھر اسے اُبکائی آنے لگی۔ دل نے سوچا اس سنسان صحن میں اسے خضر کی سی لمبی عمر کاٹنا ہوگی..... یہاں قیصر کی اچھائیوں کی لاٹھی ٹیکتی وہ کمروں میں خوشی تلاش کرتی پھرے گی۔ زینو اس کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی اور دوپٹے سے ہاتھ پونچھنے لگی۔

''لالو کو دودھ دے دیا.....''

''دے تو دیا ہے..... پر جی..... وہ بابا فضل کا تمبا کو بھی منگا دیا ہے پر جی.....''

''پر جی کیا؟.....''

''بی بی جی..... نہ سچ بیگم صاحب..... یہ صاحب جی نے تو گھر کو شاملات بنا دیا ہے.....''

''تم کو کیا زینو..... صاحب جانیں ان کے کام.....''

''وہ تو ٹھیک ہے بیگم صاب' پر صاب کی عادت ہے..... وہ پہلے تو آدمی کو اپنے ساتھ بلا لیتے ہیں' پھر چھوڑ دیتے ہیں اپنا بنا کر..... آپ نے گودام نہیں دیکھے ان کے..... سارا کاٹھ کباڑ سے بھرا ہے..... پہلے ایک لڑکا آیا کرتا تھا..... خادم..... اب بھی وہ کبھی کبھی باہر والی سیڑھیوں پر بیٹھ رہتا ہے..... بلی دیکھی ہے آپ نے نالی کے پاس بیٹھی رہتی تھی' اسے اندر اٹھا لائے۔ اب انہیں وقت ہی نہیں ملتا کہ کبھی ہاتھ ہی پھیر دیں اس پر.....''

''تم کو غرض..... جا کر اپنا کام کرو.....''

''ہاں جی مجھے کیا..... پال لیں بابا فضل کو..... رکھ لیں لالو کو..... آپی بن جائیں گے پرانے ٹین کنستر.....''

زینو غصے میں جلی باورچی خانے چلی گئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے کئی برتن خواہ مخواہ بجا ڈالے۔ راحیلہ اب تک قیصر منزل میں آنے جانے والوں سے بخوبی واقف ہوگئی تھی۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ قیصر کی شخصیت مجلسی نہ تھی' وہ کم گو شائستہ سا انسان تھا۔ اس کے پاس اتنا وافر وقت ہی نہیں تھا کہ وہ دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں صرف کرتا۔ اس کی محلے میں بھی واقفیت عام نہ تھی۔ جو بھی آتا گلی کے بڑے دروازے تک ہی آتا۔ بڑے پھاٹک کے ساتھ لگی گھنٹی کی آواز سنتے ہی ڈاکٹر خود باہر جاتا۔ آنے والے سے سرسری ملاقات کے بعد جلد ہی واپس آ جاتا۔

قیصر کا ایک بڑا تضاد یہ بھی تھا کہ وہ رحم کھا کر ترس میں بھیگ کر مدد تو کر سکتا تھا لیکن کسی طلبگار کی مسلسل ڈیمانڈ کو اپنے وجود میں کیل کی طرح ٹھونک نہیں سکتا تھا۔ اس کا رویہ ایک ایسے ڈاکٹر کا تھا جو مریض کے صحت مند ہو جانے پر اس کی زندگی کا حصہ نہیں رہتا۔ سائیکی ایڈسٹ کی طرح وہ مریض سے جذباتی وابستگی کو آسانی سے توڑ سکتا تھا۔ حالانکہ کئی بار تو نفسیاتی معالج بھی مریض کے جذباتی لگاؤ سے عہدہ برآ ہونے میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔

قیصر نے بڑی تفصیل سے خادم کے متعلق راحیلہ کو بتایا تھا۔ بھٹیارن کا چھوٹا سا سیاہ سانولا بچہ۔ خادم کی عمر سات سال کی ہوگی۔ سر پر استرا پھرا ہوا..... آم جامنوں کی بہار میں اس کی گنجی چندیا اور گدی پر ان گنت پھوڑے نکل آتے۔ پھر ان کے پکنے رسنے داغ چھوڑنے کا زمانہ رہتا۔

قیصر کی ملاقات خادم سے اچانک ہوئی۔ وہ اپنا سفید کوٹ پہنے' سٹیتھس کوپ گلے میں لٹکائے باہر نکلا تو اس نے

دیکھا پھٹی قمیض اور اس سے بھی پھٹی پھٹی آنکھوں والا میلا کچیلا بچہ پھاٹک کے ساتھ والی دیوار پر کوئلے سے لکیریں کھینچ رہا تھا۔ جب اچانک پھاٹک کھول کر قیصر برآمد ہوا تو بچے کی آنکھیں حلقوں سے باہر جمپ کرنے کو آئیں۔ وہ ہکلا کر بولا......

''باؤ جی...... وہ باؤ جی مجھے جھیما کہتی تھی...... جھیما پیچ پیچ گنڈیریاں کھیلتی ہے جی۔ میں تو نہیں کھیلتا جی......''

''سنو آئندہ لکیریں مت ڈالنا......''

آہستہ آہستہ خادم سیڑھیوں کی طرف سرکنے لگا۔

''جی باؤ جی جھیما بڑی سور ہے جی۔ آپ اسے منع کریں...... ساری گلی میں اس نے لکیریں ڈال دی ہیں جی۔ اسے ماریں آپ جی......''

''بھلا جھیما کون ہے......'' قیصر نے پوچھا۔

''جی جھیما میری ہے...... میری اپنی......''

اس سے جامع تعارف اور کیا ہو سکتا تھا؟

''اچھا وہ تمہاری ہے...... اور تم کون ہو جی؟'' قیصر نے سوال کیا۔

''میں جی خادم ہوں...... میرا باپ ویلڈر ہے۔ ہم خاں کے نال کے ساتھ رہتے ہیں۔'' خادم فخر سے بولا۔ اسی اثناء میں کہیں سے جھیماں آ گئی۔ وہ آتے ہی سیڑھیوں کے ساتھ لگے لوہے کے جنگلے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ گیارہ بارہ برس کی جھیماں چہرے سے ذہین لباس سے میلی اور ہونٹوں سے بڑبولی لگتی تھی۔ اس کے منگول چہرے پر تیتی ناک چپٹی تھی۔ گرد اور تیل کے باوجود اس کے چکٹ بال سر سے چپکے ہوئے نہیں تھے بلکہ جھاڑو بے کی طرح کھڑے تھے۔

بڑے دبدبے سے اس نے خادم کو حکم دیا...... ''چل خادم...... چل ناں...... یہاں کیوں کھڑا ہو گیا ہے ایویں۔''

''نہیں جاتا...... میری مرضی۔'' خادم بائیں پاؤں کی ایڑی فرش پر رگڑنے لگا۔

''چل ناں تیری ماں بلاتی ہے۔'' جھیماں اسے گھسیٹنے لگی۔

خادم دیوار سے چھپکلی سا چپک گیا اور رونی صورت بنا کر بولا...... ''میں گھر نہیں جاؤں گا...... مزدوری کر لوں گا' نوکر لگ جاؤں گا' گھر نہیں جاؤں گا...... پہلے بھی ماں نے مجھے کھانے کو بیر نہیں دیئے تھے۔ اکیلی ہی میرے سامنے بیٹھ کر کھا گئی تھی...... میں اس گھر نہیں جاؤں گا...... کیا پتہ وہ مجھے بھی بیچ کر بیر کھا جائے۔ ناں...... ناں۔''

''کیا بکواس لگائی ہے چل...... مجھے بھیجا ہے تیری ماں نے بلانے کو......'' جھیماں کی گرفت خادم کے بازو پر اور بھی سخت ہو گئی۔ لیکن جب خادم نے اپنے دانت اس کے ہاتھ پر رکھے تو جھیماں تلملا کر بھاگ گئی۔ جاتے ہوئے اس نے پتے دور ہو قسم کا ہاتھ اٹھایا اور چلا کر بولی...... ''پھٹے منہ پھٹے منہ پھٹے منہ......''

قیصر نے جیب سے اکنی نکال کر خادم کو دی اور آہستہ سے بولا...... ''خادم! اس اکنی کے بیر کھا لینا...... اب گھر جاؤ شاباش......''

اکنی کی دولت پا کر خادم اپنی جھیماں کے پیچھے پیچھے بھاگ گیا۔

اس کے بعد خادم تو اتر سے آنے لگا...... وہ اور جھیماں ڈاکٹر سے پیسے ٹھگنے لگے۔ رفتہ رفتہ خادم سیڑھیوں پر بیٹھا

رہتا لیکن قیصرا سے پیسے تو دے دیتا لیکن بات چیت ممکن نہ رہی۔ پھر بھی خادم کی طرف سے ناغہ پڑنے لگا۔ کبھی قیصر اس کے آنے سے پہلے نکل جانے کی کوشش کرتا۔ اس عدم توازن سے خادم بھی ان تین ڈبوں' کرسیوں کی طرح ہو گیا جو ملکیت کے اعتبار سے تو قیصر کے تھے لیکن جن کی موجودگی کا قیصر کو علم نہ تھا۔ راحیلہ نے جھرجھری لی۔

اور جو ایک روز اس کا بھی قیصر کے ہاتھوں یہی حشر ہوا تو؟

طاہر دور جا چکا ہو گا اور قیصر پاس ہوتے ہوئے بھی موجود نہ ہو گا۔

پھر.....اس وقت؟ کیا کرتا ہو گا۔ جینے کا کیا پربندھ کرتا ہو گا؟

راحیلہ کے آنے پر محلے کی عورتیں بلا روک ٹوک اس سے ملنے آتیں۔ انہیں اب قیصر منزل سے خوف نہیں آتا تھا۔ ان کی تواضع میں راحیلہ کی جانب سے کمی نہ ہوتی لیکن وہ غیبت میں شمولیت نہ کر سکتی۔ ابھی اس کی واقفیت اور عمر کم تھی کہ اس مشغلے سے لطف اندوز ہو سکتی۔ جب سے بابا فضل کے ساتھ لالو آ کر ٹھہرا تھا' استانی جی کا نزول قریباً تواتر سے ہونے لگا۔ وہ سبزی ترکاری گوشت کے پیسے راحیلہ کو پکڑا دیتی اور لالو ان کا سودا سلف لا دیتا۔ اس سے پہلے وہ جب بھی آتیں انہیں سکول کے مینا بازار' غریب لڑکیوں کی کتابوں کے لیے سالانہ جلسے کے لیے چندہ درکار ہوتا۔ وہ قیصر منزل کے قریب ہی ایک چھوٹے سے مکان میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہتی تھیں۔ راحیلہ نے انہیں کئی بار سکول آتے جاتے دیکھا تھا۔ صبح کے وقت استانی شائستہ کی ساڑھی کلف سے اکڑی ہوئی' بلاؤز کہنیوں تک استری شدہ' جوڑا کس کر گردن پر دھرا' چہرے پر نامعلوم سا میک اپ' ہلکی سی لپ سٹک' سر پر پھولدار چنری' ہاتھ میں پرس اور تھیلا ہوتا۔ ان کی چال میں کسی سپاہی کی سی تیز رفتاری اور چستی ہوتی۔ شام کو استانی جی کا حلیہ بالکل مختلف ہوتا۔ اس نچڑی' اڑی' بگڑے حلیے کی عورت کو دیکھ کر لگتا گویا یتیم خانے سے لوٹی ہو۔ وہ کسی زخمی کچھوے کی طرح رینگتی چلی آتیں۔ نہ کپڑوں کا خیال نہ بند چھتری کا۔ ان کے تھیلے میں اتنی کاپیاں ہوتیں کہ اس کے بوجھ سے بایاں کندھا لٹک جاتا۔ پرس اور بند چھتری دائیں گھٹنے سے لگی نظر آتی۔ استانی جی تکان' ناخوشی' بھوک سے نڈھال اپنے گھر میں داخل ہوتیں۔ اس کے بعد سکول کے کپڑے اتار کر گھریلو شلوار قمیض میں آ یا بن کر کھانا پکاتیں۔ دو چار نوالے زہر مار کرنے کے بعد دوسرے دن کے کپڑے استری کر کے ہینگر پر لٹکاتیں۔ پھر رات گئے تک لیمپ کی روشنی میں کھلی' ادھ کھلی آنکھوں سے بچوں کا ہوم ورک' رپورٹیں' امتحانوں کے پرچے' چارٹ بناتی رہتیں۔

استانی شائستہ کی زندگی مشینی تھی۔ اس میں حرکت تھی' ڈیزائن تھا' ترتیب تھی.....لیکن نہ دل تھا نہ فرصت۔ پہلی بار جب وہ قیصر منزل آئیں تو انہیں پناہ گزینوں کے لیے چندہ درکار تھا۔ یہ ملاقات راحیلہ کو نرم پا کر چار گھنٹوں پر پھیل گئی۔

''میرا آپ کیا پوچھتی ہیں مسز قیصر.....سید زادی ہوں.....رونا تو یہی ہے کہ سید زادی ہوں۔ اگر کسی معمولی ذات کی ہوتی تو زندگی کی خوشیاں سمیٹنے میں آزاد نہ ہوتی؟''

''تو کیا آپ اس نوکری سے خوش نہیں؟.....'' راحیلہ نے سوال کیا۔

''خوش؟.....خوش؟.....'' وہ کڑوی مسکراہٹ کے ساتھ بولی.....''سکول اصطبل کی طرح بچوں سے بھنبھناتا ہے.....گرد' شور' بے سروسامانی' استانیاں سٹاف روم میں بیٹھی چغلیاں کرتی رہتی ہیں۔ کئی بار ہیڈ مسٹریس نے رول بنایا۔ کوئی مس اپنے ساتھ سٹنگ نہیں لائے گی۔ پر استانیاں ساری سردیاں سویٹر بنتی ہیں۔ ہیڈ مسٹریس آفس میں فون پر باتیں

کرتی رہتی ہیں..... کوئی راؤنڈ نہیں' کوئی چیک نہیں۔ پچھلے سال سارے سکول میں ساڑھے تین سو بچے تھے۔ اب مہاجر آ گئے ہیں تو ہزار بچہ ہے..... دن بھر کا تھکا ہارا انسان جب گھر آتا ہے تو آرام کی تمنا ہوتی ہے..... یہاں پہلے چولہا جھونکو..... پھر کہیں پیٹ کا دوزخ بھرے..... نہ کوئی گھر نہ گھاٹ۔"

ذرا سا گھبرا کر راحیلہ نے پوچھا "تو..... آپ نے شادی نہیں کی؟"

"شادی کر لیتی..... کر لیتی ضرور۔ اگر گھر والے کرنے دیتے..... سیدزادی تھی ناں۔ سب کی ناک کو بٹہ لگتا تھا۔ دسویں میں ہوئی تو رشتے آنے لگے..... لیکن سید تھی' باہر کیسے رشتہ دیتے۔ سال بھر گھر بیٹھی رہی..... خواب دیکھتی رہی۔ پھر کالج میں داخلہ لے لیا۔ بھائیوں نے بڑی مخالفت کی لیکن اماں نے ساتھ دیا۔ جب بی اے کر لیا تو پڑھائی بھی حائل ہونے لگی۔ میں زیادہ پڑھ گئی تھی۔ رشتہ داروں' برادری میں دسویں پاس تھے۔ سوان کی آس چھوٹی' جب بی اے ہو گیا تو میرا اپنا معیار بدل گیا۔ پوزیشن والے لوگ اچھے لگنے لگے۔ پر وہ لوگ کہاں آتے ہمارے گھر؟ پھر نوکری کر لی۔ دھیرے دھیرے نوکری نے لپیٹ لیا..... نہ سیدزادے رہے نہ دوسرے..... صرف بھائی بھابھیوں کے ساتھ لڑائی جھگڑے رہ گئے..... ماں باپ کو لے کر اس مکان میں آ بسی..... وہ بھی ساتھ چھوڑ گئے....."

"تو اب کیا ہے؟..... اب....." راحیلہ نے دکھ سے کہا۔

"جوانی ساری جوانی لوک لاج کے لیے برباد کر دی تو اب..... بوڑھے منہ مہاسے لوگ کریں تماشے..... اس بڑھاپے میں کون جگ ہنسائی کروائے مسز قیصر..... اب تو یہی کرائے کا مکان ہے جس کو گھر سمجھنا پڑتا ہے۔ جہاں نہ بچے کھیلتے ہیں نہ دکھ سکھ کی باتیں ہوتی ہیں۔ انسان اپنے سائے سے ڈرتا ہے اور بدروحوں کی سی زندگی بسر کرتا ہے۔ آپ بتائیے مسز قیصر..... کیا انسان کا اپنی زندگی پر اختیار ہے کہ یونہی یہ بھی ایک تہمت ہے خود مختاری کی.....؟"

راحیلہ نے سر جھکا لیا..... اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

"بس جی یہ آپ کے دس روپے کی رسید۔"

"رسید کی کیا ضرورت ہے شائستہ باجی....."

"ناں ناں رسید لینی چاہیے۔ اس کے دو فائدے ہیں۔ آپ مجھ پر شک نہیں کریں گی اور میں سبکدوش ہو جاؤں گی اس کے بوجھ سے....."

پناہ گزینوں کے چندے کی رسید بڑے اہتمام سے پکڑاتے ہوئے استانی شائستہ بولیں..... "لو جی اب میں چلتی ہوں۔ ابھی مجھے جغرافیے کے پرچے بنانے ہیں..... بھلا جی یہ سمجھ نہیں آتی میری نیت ہمیشہ صاف ہوتی ہے..... پھر لوگ مجھ پر اعتبار کیوں نہیں کرتے۔ چور سا کیوں سمجھتے ہیں۔ یونین فنڈ میرے پاس ہے..... مینا بازار کا پیسہ میں رکھتی ہوں۔ ہر چندہ میں جمع کرتی ہوں۔ کبھی پائی کی بھی ہیرا پھیری نہیں کی۔ پھر بھی ہیڈ مسٹریس یوں دیکھتی ہے جیسے میں..... میں....."

وہ دلبرداشتہ سلام کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔

راحیلہ سوچنے لگی کاش نیت کو پلیٹ پر رکھ کر دکھایا جا سکتا..... یا پھر اس کا رنگ چہرے پر آ جایا کرتا..... لیکن یہ تو ایسی عجیب بھید بھری کیفیت تھی کہ کبھی کبھی اپنے سے بھی چوری چوری ارادے باندھ لیتی ہے۔ سراپا خواہش بن جاتی تھی۔

دور دور تک دعا بن کر پہنچ جاتی تھی۔

چاچا جی کی ملازمہ فاطمہ بھی باقاعدہ ملاقاتی تھی۔ وہ کسے کسائے جسم کی مضبوط صورت عورت تھی۔ درمیانی عمر' رنگین کپڑے' بڑھا ہوا پیٹ' پھٹی ہوئی بوائیاں' ہاتھوں پر برتن مانجھنے کی لکیریں' کھلے فاصلوں والے دانت' کس کے کی ہوئی چنیاں' لذیز چیز کھانے کی عادت...... رنگین مزاج' گفتگو کی رسیا.... تھوڑی سی میراثن' تھوڑی سی بیگم' کافی ساری چور اور بہت ساری خود غرض عورت تھی۔

''وہ بخش سلامت رہے' اللہ جوڑی قائم رکھے۔ نین پران کی خیر.....''

بھاماں دبے پاؤں صحن میں آ کر یوں بولی کہ راحیلہ کا سلسلۂ خیال ٹوٹ گیا۔

''آؤ فاطمہ آؤ..... کیسے آنا ہوا.....''

''بی بی جی..... یہ دیکھو.....'' اپنی پھٹی قمیض آگے ڈھلکا کر اس نے کہا.....''آپ کے چاچا جی کو کیا پرواہ پڑی فاطمہ ننگی ہو..... بڑے مسخرے بولیاں ماریں..... وہ باپ بیٹا تو اپنے میں مگن..... آنکھوں کا چانن سلامت رہے موئے شہدے پھبتیاں کستے ہیں..... سہاگ قائم رہے۔ ایک جوڑا تو دے دو..... تم سے نہیں مانگوں گی تو بھلا کس سے کہوں گی؟''

مائی بھاماں کے سامنے والے دو دانت ٹوٹ چکے تھے۔ ویسے بھی اس کے اوپر والے زرد ہونٹ اونچے تھے۔ ہر وقت نچلے ہونٹ پر چمچہ بنائے لگے رہتے۔ کمر میں بھی تھوڑا سا خم تھا۔ بال قریباً سفید تھے لیکن مہندی لگا لگا کر اس نے ان بالوں کو رسٹ ریڈ کر لیا تھا۔ عورت رنگین مزاج تھی' گلی سے گزرتی تو ہنسی مذاق سے باز نہ آتی۔ پھر لڑکے بالے چھیڑتے تو بے نقط سناتی' گالیاں بکتی۔ جو کوئی قابو آ جاتا تو ڈھول دھپا سے بھی باز نہ آتی۔

بھاماں کی آواز سن کر باورچی خانے سے زینو آ گئی اور عالیہ نے بھی صفائی چھوڑ کر چوری چوری باتیں سننے کو ترجیح دی۔

''آؤ ماں جی آؤ.....'' زینو نے جان بوجھ کر بھاماں کو ماں جی کہا۔

''ماں جی..... ہاں ماں جی..... لے میں ماں جی ہو گئی۔ مشٹنڈی رانڈ خضاب لگا لگا کر تو اپنا بھانا سیاہ رکھتی ہے..... عمر تو تیری بھی کم نہیں..... زیادہ سے زیادہ بہن جی کہہ لے' آپا جی کہہ لے..... ماں جی..... تو بہ تو بہ.....''

راحیلہ کو بھاماں کی بات پر ہنسی آ گئی۔

مائی بھاماں پچاس ساٹھ کے درمیان کہیں تھی۔ ہاتھی کی کھال کی مانند سنولائی ہوئی..... جھریوں والے چہرے پر عمر اور کام نے چھاپے مار دیے تھے۔

زینو نے سنی ان سنی کر دی۔

''ماں جی آج آپ چنے نہیں لائیں؟.....'' زینو نے شرارت سے پوچھا۔

''پھر ماں جی پھر ماں جی..... اوئے میں کوئی بھٹیارن ہوں۔ بی بی کے چاچا جی کے گھر ہانڈی روٹی کرتی ہوں..... چنے تو میں راستے میں خرید کر لاتی ہوں۔ ایسے کچے پکے دنوں میں اندر بچہ چنے مانگتا ہے..... آج بھٹیارن صغریٰ نے تندوری نہیں تپایا۔ ورنہ میں تو جم جم جی صدقے چنے لاتی.....''

"بہت دن لگا دیے اس بار....."

"بس جی بخار ہو گیا تھا بی بی جی..... یہ جو آج خلقت لگی چلی آ رہی ہے بیماری کا گھر ہے۔ رنگ رنگ کی بیماری پھیل رہی ہے۔ آپ ذرا دھیان سے رہیں راحیلہ بی بی۔"

"ہائے ہائے اس چھوٹی عمر میں بخار کیسے ہو گیا۔" زینو شرارت سے بولی۔

پھاماں پورا منہ کھول کر چلائی..... "چل خصم نوں کھانی باورچی خانے میں جا کر بیٹھ..... میری تو اب بھی کوئی نہ کوئی سار لیتا ہے..... تجھے تو رنڈی ہوئے چار سال گزر گئے۔ کسی نے کوڑے ڈھیر پر نظر بھی نہیں ڈالی....."

گھبرے بہناپے کے ساتھ پھاماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر رازداری سے زینو نے کہا.... "بچی پھاماں..... کوئی گر تو بتا مرد کو پھنسانے کا....."

"اے بی بی جی دیکھو ناں کھلتی جا رہی ہے۔ کھلتی جا رہی ہے۔ بھلا مجھ سے کیا پوچھتی ہے۔ میں کوئی کنجری بیسوا ہوں..... کوٹھے سے آئی ہوں....."

"ناں پھاماں ناں..... خفا نہ ہو..... کوئی بات تجھ میں ضرور ہے۔ سارے تجھ پر مرتے ہیں۔ ابھی کل کا ذکر ہے عصر کے وقت مجھے مولوی صاحب ملے تھے گلی میں..... کہنے لگے کہ خدانخواستہ اگر فاطمہ مر جائے تو آدمی لگی مجاور ہو کر پڑ رہے اس کی قبر پر....."

پھاماں کھی کھی کر کے ہنسنے لگی۔ پھر آدھا چہرہ دوپٹے میں چھپا کر گدلائی آنکھیں مٹکا کر بولی" لے وہ تو مولوی جی کی عادت ہے۔ فجر کے نام لائق ہیں۔ جب بھی ملتے ہیں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہمیشہ کہتے ہیں فاطمہ جی السلام علیکم..... سلام میں ہمیشہ پہل کرتے ہیں۔ کبھی غرور نہیں کیا بی بی جی بھلا ہم کیا ہیں؟"

راحیلہ کو بھی اس گپ بازی میں لطف آنے لگا..... "نہیں فاطمہ کوئی وجہ تو ہو گی وہ خواہ مخواہ تو مرعوب نہیں ہو سکتے..... آج کل تو نفسا نفسی کا عالم ہے کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔"

زینو قریب ہو کر پھاماں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ گئی۔ "لے بھین پھاماں سچ سچ بتا۔ وہ کون سا منتر ہے جو تو لوگوں کے کان میں پھونک دیتی ہے۔ سبھی نام جپتے ہیں تیرا۔"

"زبان..... یہ زبان..... لے پاگل دنیا میں اور چیز کیا ہے..... سب زبان کے غلام ہیں۔ جہاں جاتی ہوں لوگ آنکھیں بچھاتے ہیں۔ تیری عمر ہی کیا ہے؟ لیکن ہر ایک سے بگاڑ..... لڑائی گالی گلوچ..... خصماں جلی تُو تو ایسی ڈائن ہے کہ بات کر کے سب کا جی جلا دیتی ہے..... بی بی خدا قسم جوڑا دے دو۔ اب میں چاچی کا جوڑا تو پہننے سے رہی....."

ایک بار پھر پھاماں نے کھوچ لگی قمیض سینے پر ڈھالی۔

"لوگ چھیڑتے ہیں بی بی....."

"کون چھیڑتا ہے۔ میں سیدھا کر دوں گی۔ تو بتا تو سہی....." زینو نے دھونس سے کہا۔

"کس کس کا نام لوں جی؟..... چاچا جی کا چھوہر تو الفتہ ہے۔ الفتہ۔ تو پتہ ہے..... تو پہ....."

جب زینو کے کان میں جھک کر بھاماں نے کچھ کہا تو راحیلہ سوٹ لانے کے بہانے اندر چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اب بھاماں اور زینو کی گفتگو بہت آزاد ہو جائے گی.....

☆☆☆

نجم نے اپنے دونوں بازو پھیلا کر پرانی بیرکوں میں بنے دفتر سے باہر نظر ڈالی۔ روز قیامت کا سا منظر تھا۔ ایک ہجوم بیکراں سامنے تھا۔ یہ لوگ جزا و سزا کی کس سٹیج میں تھے۔ ان میں سے قافلہ در قافلہ تو خوف کی لپیٹ میں آئے ہوئے لوگ تھے۔ انہیں معلوم بھی نہیں تھا کہ بابا قائداعظم کا پاکستان کہاں ہے' کیوں ہے اور وہ وہاں کس لیے جا رہے ہیں۔ وہ تو جتھوں کی یلغاروں سے' دشمن کے شبخون سے' اچانک حملوں سے نہتے بے یار و مددگار اپنی جانیں بچانے کے لیے سمندر کی لہریں بن کر ساحل کی طرف بڑھے تھے۔ ان کا عمل کس حد تک جزا و سزا کے ترازو میں تل سکے گا؟

ان لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جو اس سرزمین میں اپنے حالیہ دکھوں کا علاج ڈھونڈنے آئے تھے۔ ان کے لیے مسلمانوں کی یہ سرزمین مواقعوں کی' تبدیلی کی نئے آغاز کی سرزمین تھی..... یہ موقع تازہ ایک خاص نیت سے یہاں آئے تھے۔ ان کے دماغوں میں مغل بادشاہت کے خواب' مسلمانوں کے درخشاں ماضی کی داستانیں' نعرے اور خود پرستی اور خودغرضی کے خواب تھے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے آگے چل کر الاٹمنٹ گھر بنایا۔ Evacuee پراپرٹی پر قبضے کیے' پیٹ بھر کھانے کے بعد باقی اثاثے چھپائے' ملک سے باہر بھیجے.....ان کی نیت نے بعد میں نئی سرزمین کا رنگ بدل لیا..... مساوات کی جگہ شخصی ترقی نے پاؤں پسارے اور مادیت کی دوڑ شروع ہو گئی۔

وہ لوگ بھی اس سمندر پر لہروں کی طرح تھے جو اپنے پلے سے بڑی امیدیں باندھ کر لائے تھے.....وہ قدم قدم پر قائداعظم کے خواب کی تعبیر بن جانا چاہتے۔ ان کی آرزوئیں تکلیفوں کے باوجود جواں تھیں۔ وہ ہیومن نیچر کو مکمل طور پر بھولے ہوئے تھے اور صرف آدرشوں سے وابستہ..... ایسے لوگوں کی نیت تو اچھی تھی اور وہ سزا و جزا کے ترازو میں اپنی کوشش کو تول بھی نہیں رہے تھے.....لیکن ایسے لوگ جنہوں نے پاکستان کا مطلب کیا سمجھانے کی کوشش کی تھی' بڑی امیدوں کے ساتھ ادھر آئے تھے اور سرخوشی کے عالم میں اپنا موروثی وطن چھوڑا تھا۔ ان کے مسائل آگے چل کر برساتی پتنگوں کی طرح بڑھنے والے تھے۔

راحیلہ نے لمبی سانس لے کر پلٹ کر دیکھا۔

☆☆☆

سامنے رجسٹروں میں ایک نوجوان جھکا جلدی جلدی ورق گردانی کر رہا تھا۔ نجم ابھی تھوڑی دیر پہلے ریڈیو سٹیشن سے لوٹا تھا جہاں اس نے ایک لمبی فہرست ان لاوارثوں کی پروڈیوسر کو دی تھی جو کیمپ میں بغیر کسی خاندان' والی وارث کے پہنچے تھے۔

''کیوں جی ملا کچھ اتا پتہ؟.....''

افغان رنگت' نارو نجیمن بال' اولمپک کھلاڑی جیسے جسم والا نوجوان اٹھ کھڑا ہوا.....

''مشکل ہے' میری والدہ بیمار ہیں۔ مجھے جلدی منٹگمری پہنچنا ہے ورنہ میں کچھ دیر اور تلاش کر لیتا.....''

''مجبوری ہے' کیسی شکل بتائی آپ نے لڑکی کی.....''

''بہت کچھ میرے جیسی..... میرا اس کا فرق صرف اتنا ہے کہ اس کے بال سیاہ ہیں.....''

''اور وہ آپ کی کیا لگتی ہیں؟.....''

''میری؟..... '' نوجوان مسکرایا..... ''دور پار کی کزن ہیں..... اور..... منگیتر ہیں میری..... جس روز بلوہ ہوا اس روز ہماری مہندی کی رات تھی.....''

''اچھا.....؟''

''اور..... کیا نام بتایا آپ نے اس کا؟.....''

''راحیلہ..... اس کے ابا اور دادا کو تو قتل کر دیا فسادیوں نے..... پتہ نہیں بھائی بھی بچا کہ نہیں.....'' شاہد نے زیرلب کہا۔

''میں نے تو سارے رجسٹر آپ کے سامنے رکھ دیے.....''

''اچھا جی' میں پھر آ ؤں گا..... پرابلم یہ ہے کہ ہم منٹگمری میں رہتے ہیں۔ بار بار میں لاہور نہیں آ سکتا..... مہاجر لوگوں کو Establish ہونے میں کچھ مسائل تو درپیش ہی رہتے ہیں ناں.....''

شاہد سر جھکتا چلا گیا۔ عجم نے اس پر نظر ڈالی۔ پھر رجسٹروں پر نظر کی جن میں مہاجرین کے کوائف درج تھے..... اسے وہ صفحہ بھی یاد تھا جس پر راحیلہ کے متعلق ساری انفرمیشن درج تھی لیکن اس کا بھی ایک مسئلہ تھا۔ وہ اس سچویشن کو پہلے سمجھنا اور پھر اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے راحیلہ والے رجسٹر پر کہنی ٹیکی اور پھر گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔

کیا پتھر اور وحات کے زمانے میں اتنے مسائل تھے اور پھر یہ کہ مسئلہ پیدا کس طرح ہوتا ہے۔ اب تک وہ جان گیا تھا کہ مسئلے کا تعلق صرف شعور سے ہے۔ جب تک انسان کا شعور بیدار نہیں ہوتا' اسے مسئلے کا احساس نہیں ہوتا۔ پرانا انسان اپنی جبلت کے سہارے زندہ تھا۔ تب بھی مسائل ابھرتے تھے' موسموں کا بدلنا' آندھیوں کا چلنا' زلزلے کا آنا..... موت' پیدائش' جدائی' محبت لیکن ہر مسئلہ انسان کی جبلت سے وابستہ تھا۔ قدرت خود اس کے حل پیش کرتی تھی۔ خواب' شگون' معجزہ' جھاڑ پھونک' تعویذ گنڈا ایسے ہی کئی تیر تھے جو مسئلے کے پیچھے اندھیرے میں چھوڑے جاتے تھے۔ پھر حل بھی اچانک کسی انجانی سمت سے قدرت کی طرف سے عطا ہو جاتا تھا۔ پرانا آدمی لاشعور کا ساتھی تھا۔ اس کے مسائل کے حل یا تو مجموعی لاشعوری فضا سے دریافت ہو جاتے تھے یا پھر اس کے لاشعور سے اس کی جبلت قدرتی حل تلاش کر لیتی تھی لیکن ہولے ہولے شعور نے دیکھنے' سمجھنے' سوچنے' Cause and Effect' منطق' حوالے' تجربے سے مسائل حل کرنے شروع کر دیے۔ جوں جوں شعوری کھڑکی بڑی ہوتی گئی اس میں دور بین' خوردبین جمادی گئیں۔ مسائل بڑھتے گئے۔ جس قدر شعور کے وسائل ہوں گے اس کی سوجھ بوجھ میں اضافہ ہوا۔ مسائل بڑھتے گئے۔ Know how بڑھنے پر یہ مسائل لاتعداد ہو گئے۔

کہتے ہیں کہ جب بابا آدم نے جنت میں پھل کھایا تو نہ وہ سیب تھا نہ گندم..... وہ تو آگہی کا پھل تھا۔ شجر ممنوعہ کھاتے ہی ان کا شعور لاشعور سے علیحدہ ہو گیا۔ شعوری آنکھ نے جبلتوں کا راستہ چھوڑ کر عقلی تجزیے اختیار کیے۔ بابا آدم نے جبلت اور قدرت کو چھوڑ کر ہر مسئلے کو لیبارٹری کیس میں لے جانا چاہا اور ان مسائل کو بھی عقلی طور پر سلجھانا چاہا جس کا پہلے حل جبلت اور قدرت میں موجود تھا۔ ایسے مسئلوں کا حل نہ عقل میں تھا نہ جبلت میں۔ یہ مسائل تو الہامی کتابوں کی رہنمائی

میں ہی حل ہو سکتے تھے۔ وہ اپنے مسئلے کو عقلی طور پر حل کرنے سے قاصر تھا۔ اس لیے نہیں کہ مجم میں کوئی آئی کیو کی کمی تھی بلکہ صرف اس لیے کہ اس کی طرف مسائل کے حل کے لیے تیسرا نسخہ تھا۔ وہ مذہب کی رہنمائی میں بھی کچھ حاصل کرنے کا اہل بنایا ہی نہ گیا تھا۔

مجم ایک ایسے کربل کربل کرتے غل غپاڑے والے گھر میں پیدا ہوا تھا جہاں اس کی تربیت، تعلیم، دیکھ ریکھ کے لیے کوئی رشتہ دار موجود نہ تھا۔ آٹھ بچوں کو پالنے والی ماں نیم پاگل' آدھی مجذوب اور بے حد مصروف عورت تھی..... اسے نہ اپنا ہوش تھا نہ بچوں کا' نہ شوہر کی خبر تھی نہ سسر کی۔ مجم کا باپ ویلڈ رتھا اور بلال گنج میں ایک ورکشاپ پر ملازم تھا۔ وہ جب بھی گھر آتا اس کی آنکھیں سرخ ہوتیں۔ وہ عموماً سر درد کی شکایت کرتا۔ تکان اس کے جسم کا حصہ تھی۔ خاص قسم کی نشست دیر تک اختیار کیے رہنے کی وجہ سے اس کا سارا جسم بائیں ہاتھ کی طرف جھکا سا نظر آتا تھا۔ ابا گھر کے سارے مسائل ایک ''اچھا جی'' کے کاغذ میں لپیٹ کر رکھ دیتا۔ وہ کما کما کر تھک گیا تھا لیکن پوری نہیں پڑتی تھی۔ یہ ایک روایتی نمائندہ گھرانہ تھا جہاں اولاد کی کثرت نے بچوں کو بے وقعت کر دیا تھا۔ مجم بچوں میں پانچواں تھا۔ بچپن سے وہ کسی شمار میں نہ تھا۔ نہ بڑوں میں نہ چھوٹوں میں۔ محبت اس کی جانب آتے ہی منقلب ہواؤں کی طرح راستے بدل لیتی۔ مجم بہت ذہین تھا۔ وہ ان لوگوں کے ذیل میں آتا جو سڑک پر بجلی کے کھمبے تلے پڑھتے پڑھتے اچانک ملک کے پرائم منسٹر بن جاتے ہیں۔ لاگ کیبن میں بائبل سے انگریزی اخذ کرتے کرتے ابراہیم لنکن کہلانے لگتے ہیں۔ مجم نہ ترقی کا خواہش مند تھا نہ تعلیم کا۔ اسے ایک دھونس والا رشتہ درکار تھا۔ ایسا مضبوط رابطہ جو اس کی کڑوی کسیلی سہہ جائے۔ وہ قتل کر کے آئے اور گلے سے لگایا جائے۔ چوری کرنے کے بعد اسے ملزم نہ گردانے.... اس کی خاطر سب کچھ برداشت کرنے والا' سر جھکا کر آمنا و صدقنا پکارنے والا......

کسی قربانی کو نہ دے کر خود ہر قربانی کا حقدار ٹھہرنے والا......

اس کی زندگی میں یہ دھونس والا محبتی رشتہ کہیں نہ تھا۔

اسے تو دادا نے پالا تھا۔ جو گھر بار سے نکالا' نارمل زندگی کو کنارے سے دیکھنے والا اپنی موت کا منتظر گھر کو پلیٹ فارم سمجھ کر وقت گزارتا تھا۔ دادا بھیکے وال سے پوسٹ ماسٹر ریٹائر ہو کر جب گھر آیا تو سارے گھر میں اسے صرف مجم ملا......

ان دونوں لاوارثوں کے درمیان ان کہا سا سمجھوتہ ہو گیا Dependency کا.....

بڈھے کو حکومت جب ریٹائر کر دیتی ہے تو اس کے سامنے ریٹائرمنٹ ایک سہانا خواب بن کر لہراتی ہے۔ زندگی کی سعی پیہم کا جبا اتار پھینکنے کے بعد آرام اور سکون کا وقفہ صحراؤں کے سفر کے بعد بڈھا سونا' کھانا' آرام کرنا ایک نئی گھریلو زندگی میں کارآمد ہونے کے خواب دیکھتا گھر کی دہلیز پر آ کھڑا ہوتا ہے..... یہاں سے اسے معاشرہ اور گھر والے ریٹائر کر دیتے ہیں۔ ساری عمر جن رشتہ داروں سے غافل رہا۔ ان کے گھر میں اجنبی بن کر جاتا ہے۔ موت' پیدائش' عیادت' شادی اس کے لیے نئی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔

دکانوں پر جا کر بیٹھنا اور دکاندار کی مصروف زندگی میں سوالات کر کے اسے اپنی جانب متوجہ کرنے سے بھی بات نہیں بنتی۔ اس کا لایا ہوا سودا بھی پسند نہیں کیا جاتا۔ اس کا مبلغ علم ناکافی ماحولیات کی سمجھ بوجھ پرانی انسانوں کی سمجھ بوجھ خلط ملط اور قدریں گھسی پٹی ہو جاتی تھیں۔ ایسے میں جب بوڑھوں کے مشورے' تجربے اور کہانیاں نئے عہد کے لیے

سنگریوں سے زیادہ نہیں رہتے۔ بوڑھے دین کی لاٹھی ٹیک کر چلنے لگتے ہیں۔ یوں کچھے لمبی عمر میں بوڑھے کو اوندھا کر دیا جاتا ہے۔ ہر گھر میں ایک بڈھا مصلح ہوتا۔ خود نماز کا پابند ہو کر وہ سارے میں دین کا جود و کرانے کھیلنے لگتا ہے۔ عورتوں کو شرم و حیا پر، بچوں کو کھیل کود و وقت کے زیاں پر، نوجوانوں کو مسجد میں پابندی سے نماز پڑھنے پر اور دیگر احکامات الٰہی کی پیروی پر لیکچر ملتے رہتے ہیں۔ کچھ بڈھے تو دیانتداری سے شاعذر کمینہ کے سلسلے میں روکتے ٹوکتے ہیں لیکن زیادہ بوڑھے توجہ حاصل کرنے کے لیے اپنی اہمیت جتانے کی خاطر اور لوگوں سے رابطہ بنانے کے لیے دین کو استعمال کرنے لگتے ہیں۔

ایسے بے خبرے بڈھوں کو گھریلو زندگی دل فریب گھونگھوں کی طرح ساحل حیات پر سوکھنے کے لیے پھینک دیتی ہے..... مڈل کلاس اور لوئر مڈل کلاس کے بیکار ریٹائرڈ بڈھے گلی میں اور صحن کے کسی کونے میں پلنگ پر کھانستے' ہو نگتے' بڑبڑاتے نظر آتے ہیں۔ دھریک کی چھاؤں' دیوار کا سایہ' چارپائی کی اوٹ ان کے لیے کافی سمجھی جاتی ہے۔ امیر گھرانوں کے بڈھے گولف کھیلنے جاتے ہیں۔ ان کا کیڈی ساتھ ساتھ چلتا ہے لیکن کھلاڑی گیم کے لیے نہیں ملتے..... لمبی ڈرائیو پر جاتے ہیں۔ بڑھیا کے مرنے کے بعد ڈرائیو پر کوئی ساتھ نہیں ہوتا۔ بار بار عینک کو ٹیشو سے صاف کرنے کی نوبت آتی ہے..... لمبی سیریں اور ورزش بھی ساتھ نہیں دیتی۔ ٹی وی کے پروگرام ڈسکس کرنے کو ساتھی نہیں ملتے۔ برج کے ساتھی یا مرکھپ جاتے ہیں یا پھر اور اطراف میں نکل جاتے ہیں۔ سفر پر جائیں تو گھر یاد آتا ہے۔ گھر پر رہیں تو تبدیلی کی خواہش در پے رہتی ہے۔ رفتہ رفتہ فلاحی اداروں کے چیئرمین' ممبر بنتے ہیں لیکن ان کے مشوروں پر عمل نہیں ہوتا۔ لڑکیاں اچھی لگتی ہیں لیکن ہاتھ پکڑنے' بات کرنے اور خوشامد کرنے سے زیادہ رابطہ آگے بڑھ نہیں سکتا۔ بسا اوقات دولت کی کنڈی لگا کر لڑکی پھنسا بھی لیتے ہیں لیکن شادی کی آڑ میں صرف خوشامد اور دولت سے ہی کام چلاتے ہیں۔ شطرنج کھیلیں تو چال بھول جاتی ہے۔ برج میں پتے یاد نہیں رہتے۔ نئی بزنس چلائیں تو لوگ لوٹتے ہیں..... ان کا حال بھی کسی طرح ان بابوں سے کم نہیں ہوتا جنہیں گھر والے گھر بدر کر دیتے ہیں۔ امیر بابا او بدا کر نئی فیکٹری لگاتا ہے' تازہ مرغی پھانس کر نئی شادی کرتا ہے۔ بچوں کو دولت کے Lasso میں گھیرتا ہے۔ زمینیں خرید کر انہیں بسانے میں جان کھپاتا ہے۔ فارن ٹورز کرنے' بار بار عمرہ کرنے جاتا ہے۔ پرانے دوست جو نئی سمتوں میں نکل گئے ہوتے ہیں' انہیں ملتا اور مایوس ہوتا ہے۔ پورنوگرافی کے رسالے' کتابیں پڑھتا ہے۔ ٹی وی پر جدید فلمیں دیکھ کر خوشی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے..... لیکن اس ساری ایکٹیویٹی کے باوجود وہ زندگی کے دھارے میں عین وسط میں بہہ نہیں سکتا۔ بچ بچتے پانیوں میں منجدھار کی طرف بڑھتا ہے۔ بوڑھا وسطی پانیوں کو چھوڑ کر کنارے کی طرف ہاتھ پاؤں مارتا ہے..... اسی لیے بوڑھے کے پاس پکڑنے' جکڑنے' اپنا بنانے' خوش رہنے کا کوئی پکا بندوبست نہیں ہوتا۔ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھے' کیسا بھی صحت مند کیوں نہ ہو زندگی اسے اگل کر دریا بدر کر کے رہتی ہے۔

جم بھی ایسے ہی ایک ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر کے ارد گرد پلا تھا۔ جب دادا اور جم اندر صحن میں ہوتے تو نیم کے درخت سے چڑیاں جھڑ جھڑ کر ان پر گرتیں۔ جب وہ سڑک پر ہوتے' کوٹھے سے اترنے والے پرنالے سے وقت بے وقت چھینٹے اڑ کر چارپائی پر پڑتے..... دادا کے ساتھ بھی جم کا رشتہ کچھ دھونس کا نہ تھا۔ جم دادا سے کوئی فرمائش کر دیتا تو دادا فوراً جھڑک کر پوسٹ ماسٹر بن جاتا۔ دادا کا اپنا کوئی کام ہوتا تو جم کو اذن کنٹرول جاتا۔ دادا کنجوس' کینہ پرور اور خود غرض تھا۔ وہ

نجم کے ہاتھ سے قلفی لے کر کھا جاتا۔ پاؤں دبواتا' بازار بھجواتا' جرابیں' بنیان ٹوپی دھلاتا' مسجد ساتھ لے جاتا' سختی سے نماز کا پابند بناتا اور مسجد سے واپسی پر ہر آدمی کی غیبت نجم سے کرتا۔ کسی رشتہ دار کے آ جانے پر نجم کو بھگا دیتا۔ ہر غلط فرمائش کے لیے نجم کو اندر اپنی بہو کے پاس بھیجتا۔ بیٹے سے قرض مانگنے کی صورت میں اتنا رو دیتا کہ نجم وکیل بن کر باپ سے جھگڑنے لگتا۔ کسی دعوت پر جاتا تو نجم کو ساتھ نہ لے جاتا۔ داتا دربار' مسجد' اردو بازار میں بھی نجم کو ساتھ رکھتا۔ سودا سلف اٹھانے کے لیے نجم سے بہتر کوئی نہ تھا لیکن مہنگی چیزیں دادا خود اٹھاتا۔ دکاندار سے ریزگاری اور وافر پیسے اپنی جیب میں ڈالتا۔ رسیدیں' کیش میمو نجم کو پکڑاتا جاتا۔ نئی رت کے پھل خود چکھتا' باسی سالن نجم کے آگے کر دیتا...... لیکن اس بدسلوکی چالاکی کے باوجود نجم نے کبھی دادا کے بغیر زندہ رہنے کا نہ سوچا...... باقی گھر والوں سے تو نہ مثبت تعلق تھا نہ منفی...... ان سب سے نجم کا آنکھ چرانے کا رشتہ تھا......

جب نجم نے ذرا ہوش سنبھالا اور حاضر غائب میں اپنے وجود کو سب کے سامنے پیش کرنے لگا۔ تب کسی نے اس کی چھوٹی چھوٹی پیاری باتوں کا نوٹس نہ لیا۔ وہ چارپائی کے ساتھ سہارا لے کر کہتا...... ''نجم آتا...... روٹی کھاتا...... نجم سوتا...... نجم سکول جاتا......'' اس نے کبھی مجھے' میں' میرا استعمال نہ کیا تھا لیکن اس عمر میں وہ مسائل سے دوچار نہ تھا۔ رینگ کر چل کر کہیں نہ کہیں اسے کونا کھدرا مل جاتا۔ پھر جب وہ بستہ لے کر سکول آنے جانے لگا تو اس نے دادا کو دریافت کر لیا۔ سن بلوغت تک وہ اس بات کو سمجھ گیا تھا کہ معاشرے کو صرف کامیاب لوگوں سے محبت ہوتی ہے۔ وہ ترقی' کامیابی' سرفرازی کے انعام تقسیم کرتی ہے۔ فرسٹ آنے والا بچہ' امیر رشتہ دار' صاحب حیثیت لوگ ہمیشہ افضل گردانے جاتے ہیں۔ لوگوں کو شخصیت' کردار' مکمل انسان کی پروا نہیں ہوتی۔ ان کے لیے عموماً مرنے کے بعد تالی بجا کرتی ہے اور کبھی کبھی اچھے انسان کی تعریف کرتا تب بھی لوگ بھول جاتے ہیں۔ سکول میں اس نے محنت کے سہارے جی کر ہر کلاس میں واہ پائی۔ فرسٹ آنا' سکالرشپ لانا' کلاس کا بہترین طالب علم قرار پانا اس کے Goal تھے لیکن سکول میں جو تعریف ہوتی جو تالی بجتی اس کا ارتعاش بھی گھر نہ پہنچتا۔ گھر میں ہر لمحے سرکس جاری تھا۔ منڈی کی سی کیفیت تھی۔ یہاں نجم کی رپورٹ کارڈ...... سکالرشپ سرٹیفکیٹ ضائع ہو جاتے۔ ابا ٹھیک ہے' ٹھیک ہے کہہ کر اسے دھتکار دیتا۔ ماں سر پر بوسہ دے کر کہیں چلی جاتی۔ بہن بھائی حسد اور کمینگی کا سہارا لے کر اسے چھیڑتے رہتے۔

یہ وہ وقت تھا جب اس کے شعور نے سکول میں کامیاب ہونے کے باوجود شخصیت کی ہار مان لی۔ اس کے کردار میں کچھ ایسی کمی پیدا ہونے لگی جس کا شعوری طور پر اسے احساس نہ تھا۔ سکول میں اسے Impersonal ہمدردی ملتی تھی...... وہ تعلق بھری قربت سے گرم اعتراف چاہتا تھا۔ دادا کے پاس جاتا تو وہ الٹا جھڑکنے لگتا...... ''بس...... صرف اتنے نمبر...... میں نے اس کلاس میں تم سے سو نمبر زیادہ لیے تھے۔ انگریز انسپکٹر آف سکولز مسٹر براؤن آیا تھا پرائز ڈسٹری بیوشن کے فنکشن پر...... اس نے میرے گلے میں ہار ڈالتے وقت کہا تھا ویل ہوائے وس از گریٹ...... ان نمبروں سے کچھ نہیں بنتا جو تم لے کر آئے ہو صاحبزادے۔ زندگی بڑی ٹف ہے...... بڑا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ہر وقت مکا تانے رکھو یوں......''

دادا عمر کے اس حصے میں تھا جہاں سورج غروب کے وقت ہوتا ہے۔ اس کی روشنی فقط اس کا اپنا وجود روشن کرنے کو کافی تھی...... لیکن دادا مصر تھا کہ وہ سارے ماحول کو روشنی بخش سکتا ہے...... دادا نے مستقبل

کے تصور سے خوفزدہ اور اپنی بیکار زندگی سے نالاں تھا۔ اسی لیے وہ سارا وقت یا تو اپنے بچپن کی بے فکری میں پناہ لیتا یا جوانی کے معرکوں کو بار بار سنا کر راحت حاصل کرتا..... نجم رہتا تو دادا کی چارپائی کے اردگرد بیٹھن ہولے ہولے اس نے دادا کی بارہا سنی گئی باتوں پر دھیان دینا شروع کر دیا۔

سن بلوغت کو پہنچ کر جب ماحول نے اس کے شعور کو جھنجھوڑنا شروع کیا اور جنسی خواہشات نے سر اٹھایا تو اصلی مسائل سے دوچار ہوا۔ بچپن میں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ صرف تکلیف تھی۔ وہ اس عہد میں مسئلوں سے آگاہ نہ تھا۔ اب فرسٹ ایئر میں پہنچ کر اردگرد کے لوگ' ماحول' پڑھائی اس کے اپنے وجود کی بڑھوتری تبدیلی ساری اردگرد پھیلی کائنات مسئلہ بن گئی۔ اصلی بات تو یہ تھی کہ اب تک اس کی شخصیت میں کچھ ایسے Dent پڑ گئے تھے جنہیں باقی عمر اس کے ساتھ رہنا تھا۔ شخصیت کے یہ سقم بنیادی تھے اور اس قدر لاشعور کے اندر دھنسے تھے کہ کبھی ان سے آنکھیں چار کر کے نجم سلجھا ہی نہیں سکتا تھا۔ اصلی مسئلے کی آگاہی نہ ہونے کی وجہ سے نجم عجیب قسم کی Tension کا شکار رہتا۔ اب اس کی پڑھائی بھی متاثر ہونے لگی۔ پہلے اس نے سائنس کے سبجیکٹ لیے اور یہیں پر قیصر سے ملاقات ہوئی۔ قیصر کے وجود میں اپنے آپ کو منوانے کی آگ سلگ رہی تھی۔ وہ گاؤں سے کچھ ثابت کرنے کی غرض سے لاہور آیا تھا۔ نجم اب کچھ ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا..... نہ اسے کسی سے ضد تھی نہ ہی وہ کسی سے اپنا لوہا منوانا چاہتا تھا۔ فرسٹ ایئر میں اس کے گریڈ کم ہونے لگے' پھر سالانہ امتحان میں وہ فیل ہوتے ہوتے بچا تو اس نے مضامین بدل لیے..... سائنس کے مضامین چھوڑ کر سائیکالوجی اور اکنامکس کی تبدیلی آ گئی..... اب قیصر سے ملاقات کم ہوتی لیکن کالج سے واپسی پر وہ عموماً ایک ہی بس سے اترتے اور گلی میں اکٹھے چل کر اپنے اپنے گھر جاتے۔

ایف اے کے امتحان کی تیاری کے دن تھے۔ جب اس کے بڑے بھائی کی شادی راحیلہ کی ہمشکل لڑکی سے ہو گئی..... افغانی رنگت' بنگالی بال اور ہسپانوی آنکھیں۔ نجم کے چہرے پر ابھی مونچھیں تازہ وارد تھیں۔ آنکھوں میں بچوں کی سی معصومیت تھی..... ابھی اس کا قد بڑھ رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں پوری جسامت کو نہ پہنچے تھے۔

وہ لچکیلا درخت تھا' ہواؤں کے بوجھ سے لہرانے والا' فضا سے خوشیاں اخذ کرنے والا..... بھابھی آمنہ جس روز بیاہ کر آئی تو اس کے کمرے میں بہن بھائی رشتہ دار سب کھچا کھچ بھرے تھے۔ سستی بروکیڈ کا سرخ غرارہ' قمیض اور گوٹے سے مڑھا سرخ دوپٹہ اوڑھے بھابھی بیٹھی تھی۔ لال سی کھنڈی عطر حنا' نائیلون کے کپڑوں سے اٹھنے والی پسینے کی بو' اگر بتی کی باس' بھابھی کے پاس دھرے پھلوں کی خوشبو سب نے مل کر فضا میں عجب قسم کی بوباس پھیلا دی تھی۔ نجم کو اس کا بڑا بھائی فخر کے ساتھ اپنی بیوی دکھانے لایا تھا۔

''اماں جی گھنڈ لاہ دیو.....'' بھائی نے اظہار ملکیت سے کہا۔

ماں نے گوٹے لدے دوپٹے کو اٹھا کر چاندی دولہن کا چہرہ اٹھا دیا۔ آمنہ نے اپنی ایکٹرسوں جیسی پلکیں رخساروں پر ٹکا رکھی تھیں۔ اس کے چہرے پر نامعلوم سی مسکراہٹ تھی۔ فاتح کی مسکراہٹ۔ گن وان کی مسکراہٹ..... وہ اپنے حسن کی قوت سے آگاہ تھی۔

''ایدھر ویکھ..... یہ تیرا دیور ہے..... ایف اے میں پڑھتا ہے۔ دیکھ..... سلام کر بھابھی کو.....''

آمنہ نے آہستہ آہستہ آنکھوں پر سے پپوٹے اٹھائے.....کھل جا سم سم..... اچانک اپنے وزن سے پیچھے سرکا' سامنے آبدار موتی.....سونا' جواہرات' اطلس وکمخواب بے ترتیب نظر آئے.....مجم کا بڑا بھائی تو علی بابا تھا.....وہ اس منظر پر قابض ہو گیا.....لیکن چھوٹے بھائی قاسم کی طرح حسد کی بھٹی میں گر گیا.....

یہ مجم کی زندگی کا پہلا سنجیدہ مسئلہ تھا جو کسی طور پر کسی کروٹ سلجھتا نہ تھا۔ جب تینوں بڑے بھائی کاموں پر نکل جاتے تو وہ پڑھائی چھوڑ کر کواڑوں کے پیچھے سے' چق کی اوٹ سے کھڑکی سے لگ کر آمنہ کو دیکھتا رہتا..... ہتھی والے نلکے سے پانی نکالتے' آٹا گوندھتے' ساس کے تیل لگاتے' کپڑے دھوتے' تار پر ڈالتے آمنہ ہزار منظر بن جاتی اور وہ حیرت کے سمندر میں ڈبکیاں مارتا رہتا.....اب پڑھائی کے بجائے وہ اپنی فعال قوت متخیلہ کو بروئے کار لاتا۔ دیر دیر تک اس کے خوابوں میں آمنہ کے ساتھ اکھاڑ پچھاڑ لگی رہتی۔ اس Day dreaming نے اسے بڑی مشکل سے اتنا وقت دیا کہ وہ جم کر پڑھ سکے۔ وہ بھائی بہن جنہوں نے اسے فرسٹ آنے اور آتے رہنے پر بھی تالی نہ بجائی تھی' اس کی تھرڈ ڈویژن پر بہت برافروختہ ہوئے۔ باپ نے گالیاں دیں' ماں نظر چرا کر چلی گئی.....بہن بھائیوں نے اٹھتے بیٹھتے ناطقہ بند کر دیا۔

وہ ایف اے کی کتابیں اردو بازار بیچنے کے لیے اکٹھی کر رہا تھا۔ ان کتابوں کو اس نے بار بار پڑھا تھا لیکن یادداشت نے دغا دی۔ لکھتے وقت آمنہ یاد رہی۔ جو کتابوں میں درج تھا' بھول گیا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ آسمان پر بادل تھے اور گہری شام لگ رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی' اسے لگا کوئی چڑیا دروازے پر چونچ سے ٹک ٹک کر رہی ہے۔

وہ چپ رہا۔

دستک پھر ہوئی۔

اس نے دبی آواز میں کہا.....''آ جاؤ جی.....یہاں کوئی پردہ نہیں' آ جاؤ.....''

آمنہ دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی کبوتری کی طرح قدم دھرتی اندر آئی۔

مجم کا سانس رکنے لگا.....ابھی تک وہ آمنہ سے کبھی تنہائی میں نہ ملا تھا۔

''ایک بات تھی جی.....''

''فرمایئے.....'' بمشکل تمام مجم کے حلق سے آواز نکلی۔

''وہ جی.....میں زیادہ پڑھی لکھی تو نہیں کہ سلیقے سے بات کر سکوں لیکن.....''

آمنہ نے تازہ تازہ بال دھوئے تھے اور اس کے بالوں سے رسنے والی بوندوں نے اس کے کندھے' کمر اور سینے کا کچھ حصہ گیلا کر رکھا تھا۔

''کہیے.....کہیے.....''

''وہ جی.....آپ کو مبارک ہو.....چلیے تھرڈ ڈویژن آئی ہے لیکن پاس تو ہو گئے ہیں ناں۔ فیل تو نہیں ہوئے ناں' میری بھی دسویں میں تھرڈ ڈویژن آئی تھی.....میں شادی کی تیاری کرتی کہ پڑھتی.....آپ کا کوئی قصور نہیں جی..... جب گھر میں شادی ہو تو کوئی کیسے پڑھ سکتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں جی.....سارے گھر والوں نے کھپ مچا رکھی ہے ایویں.....

مل جائے گا داخلہ یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔ باہر نکل کر نہیں دیکھتے مہاجرین کو کیا کیا مسئلے ہیں' بس داخلے کی فکر ہے.....مل جائے گا داخلہ....."

نجم کو گویا اچانک زلزلے نے آ لیا.....وہ اپنی جگہ سے مل کر کہیں بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔

"اچھاجی.....آپ فکر نہ کریں.....آپ کوئی لیل تھوڑے ہوئے ہیں.....مل جائے گا داخلہ....."

آمنہ چلی گئی تو نجم نے دروازہ بند کرلیا۔ گیلے پیروں کے نشان کالے سیمنٹ کے فرش پر تھے۔ نجم نے جھک کر انہیں ہاتھ لگایا' پھر دوزانو ہوکر انہیں چومنے لگا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس چومنے میں اس کی نیت کیا ہے۔

یہ چوری تھی کہ اعتراف؟

گناہ تھا کہ پاگل پن۔

لیکن جب وہ رات کے کھانے پر کمرے سے باہر نکلا تو احساسِ جرم سے بوجھل تھا۔ اسے یوں لگتا تھا گویا اس کے زمان بھائی تک بات پہنچ گئی ہے۔

اس کے بعد چار پانچ سال عجیب قلابازیوں میں گزرے۔ آمنہ بھابھی اور وہ کبھی کبھی اوپر تلے کے بچوں کی طرح بہت بے تکلف ہو جاتے۔ ہلکی ہلکی مار کٹائی' ڈھول دھپا' گالی گلوچ پر بھی منہ نہ بنتے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلفی اور قربت کے باوجود کسی قسم کے احساسِ جرم میں مبتلا نہ ہوتے.....پھر کوئی لمس' کوئی ذومعنی جملہ' چوری چھپے کی نظر توجہ کا بھیگا بھیگا انداز.....اور اچانک ساری بے تکلفی ختم ہو جاتی۔ دونوں کے منہ بن جاتے.....سخت اور پتھریلے چہرے..... چوری پکڑے جانے کے خوف سے زیادہ وقت قیصر کے ساتھ گزارتا۔ پڑھتا رہتا' گھر سے باہر رہتا۔ ان بنجر دنوں میں نجم کی نمازوں میں باقاعدگی آ جاتی.....وہ نیک ساہن کر سارے گھر والوں سے بھی کٹ جاتا۔

☆☆☆

راحیلہ واپسی پر صحن والے تخت پوش پر بیٹھ گئی۔

سردیوں کا سورج مغرب میں بڑی سرعت سے ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ چند الوداعی کرنیں صحن میں کہیں سے آ کر چھپ گئی تھیں۔ شفق کی لال پیلی روشنی کوٹھے کی دیواروں پر منعکس ہو رہی تھی اور جو بادل صحن سے اوپر نظر آ رہے تھے' لہو آمیز تھے۔ گویا مہاجروں کی خواہشوں کے خون میں بھیگے تھے۔ ہوا میں نمی اور ٹھنڈ تھی۔ راحیلہ سفید کشمیری شال میں بڑھے پیٹ کو چھپائے باورچی خانے کے باہر والے تخت پوش پر بیٹھی تھی۔ اس نے نجم سے توجہ ہٹانے کے لیے نیلے رنگ کی چھوٹی سی ٹوپی اٹھالی۔ کچھ تو روشنی کم تھی' پھر اس کی توجہ ٹوپی پر نہ تھی۔ ہر گھر اٹھانے پر اسے کتنا ہی وقت لگ جاتا۔ دھاگہ سلائی میں آگے جاتا ہاتھ رک جاتا' نگاہیں آسانی ٹوپی پر ہوتے ہوئے بھی کچھ اور ہی دیکھتیں۔ پھر معاً وہ توجہ واپس لاتی اور سلائی سے سلائی بجاتی ایک گھریوں اٹھاتی گویا کوئی بوجھ اٹھا رہی ہو.....اس کے پیرج ہو رہے تھے اور ابھی تک وہ فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ اسے بقیہ شام کیسے گزارنی چاہیے۔ خوابگاہ میں چلی جائے یا ان الوداعی ٹھنڈی شعاعوں میں بیٹھی رہے۔ پھر باورچی خانے کی آواز نے اسے متوجہ کرلیا۔ زینو سل بٹے پر قیمہ پیس رہی تھی.....باورچی خانہ بھی کیا عمدہ جگہ ہے' ذہن کو حال میں باندھے رکھنے کے لیے اس سے بہتر جگہ کوئی نہیں.....وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ زینو کی بانہیں گم ہوتی کرنوں میں مضبوط اور

چکتی نظر آ رہی تھیں۔

"اچھا ہو گیا بی بی جی..... ہاں بیچ بیگم صاحب۔ آپ آ گئیں۔ میں پوچھنا چاہ رہی تھی کہ شامی کباب بھرواں بنانے ہیں کہ پودینہ پیاز ملا دوں سارے قیمے میں....."

"بھرواں بنا دو..... ڈاکٹر صاحب پسند کرتے ہیں....."

پیڑھی کھینچ کر وہ زینو کے قریب بیٹھ گئی۔

زینو اسے گلی کی مختلف کہانیاں لگاتار سنانے لگی۔ ان کو سنے بغیر راحیلہ نے سننے والا چہرہ بنا لیا۔ اس کے سامنے قیصر کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ ابھی تک اسے قیصر کی پسند اور ناپسند کا کچھ بھی علم حاصل نہ ہو سکا تھا..... ایک شام جب اس نے قیصر کے بہت قریب ہونے کی خاطر نجم والا واقعہ بتایا تھا تو قیصر پر اس کی بات کا کچھ بھی ردِعمل نہ ہوا....."بس اسے معاف کر دو....."

"وہ تو میں نے کر دیا ہے....."

"وہ ایک خالی انسان ہے..... جب ایک ہی طرح کی تکلیف بہت دیر تک رہے ناں تو پھر طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے۔ مجھے تو یہ خوف ہے کہ اب شاید نجم کبھی خوش نہ ہو سکے..... بیچارہ بیمار رہتا ہے اندر اور باہر....."

وہ چپ ہو گئی....."وہ اب قیصر منزل کبھی نہیں آئے گا..... میری نیت سمجھتی ہو ناں..... یہ نہیں کہ میں تم پر بھروسہ نہیں کرتا..... بس میں نہیں چاہتا کہ دوبارہ وہ منحوس واقعہ تمہیں یاد آئے..... اور وہ بیچارہ بھی بھول جائے تو اس کے لیے بھی اچھا ہے۔"

راحیلہ نے دل سے نجم والے واقعے کو از سرِ نو نکال باہر کیا۔ پھر اس نے باورچی خانے پر نظر ڈالی۔ وہاں آگ سردیوں میں چکتی ہے گرم نہیں رہتی..... جس طرح ٹھنڈے ماحول میں دل کی حدت..... نور جہاں کے مقبرے پر کسی ملنگ بابا کا ناچ۔

یہ مجھے آخر ہوتا کیا جا رہا ہے..... ہر بات کے معنی..... ہر سوچ کا جواز؟ واقعہ در واقعہ ماضی تک زنجیر کی مانند..... مجھے نہ تو اس قدر سوچنا چاہیے نہ ہی زندگی کو اتنے بیکار معنی پہنانا چاہئیں۔ زندگی تو گزارنے کے لیے ہے گزر جائے گی۔

زینو نے لکڑیوں پر سے سرخ دہکتے کوئلے جھاڑ کر چولہے میں درست کیے....."اے بی بی جی نہ بیچ بیگم صاحب..... یہ جو اپنے چاچی جی ہیں ناں..... یعنی ڈاکٹر صاحب کے چاچا جی....."

"کیا ہوا انہیں....."

وہ گفتگو میں بڑا زور لگا کر داخل ہوئی۔

"وہ جی اپنی خاطر نہیں ہے ان کی نوکرانی پھاماں..... وہی جی جو آیا کرتی ہے لکڑی بڈھی۔"

"ہاں تو کیا ہوا اسے؟"

"سنا ہے چاچا جی نے اس پر چادر ڈال لی ہے....."

"کیا..... کیا..... کیا....." راحیلہ نے حیرانی سے پوچھا۔

زینو نے اخبار بن کر بڑی مسرت حاصل کی۔ "ہاں جی چاچا جی کے گھر پڑ گئی ہے چھاپاں....."

راحیلہ نے چہرہ پرے کر لیا اور ساجدہ وہاں کی طرح بولی۔ "چلو ہمیں ایسی باتوں سے کیا۔ تم اپنا کام کرو خاموشی سے۔"

زینو نے منہ تھتھا کر کہا..... "اور کیا جی..... ہمیں کیا..... چاچا جی ایک کریں چار کریں ہم سے غرض؟"

راحیلہ نے محسوس کیا کہ زینو کے لہجے میں ورشتی کچھ زیادہ ہی تھی اس لیے وہ مصالحت کے طور پر بولی۔

"لیکن تجھے یہ ساری بات بتائی کس نے؟....."

ٹاپک از سر نو جاری ہو جانے پر زینو نے بڑی مسرت محسوس کی۔ زندگی میں وہ صرف غیبت کے سہارے خوش رہنے کی عادی تھی..... "ہاں جی بیگم صاحب..... میں بتاؤں آپ کو....."

پھر اس نے پھکنی سے ایک لمبا سانس لکڑیوں پر چھوڑا..... "اے ہے کیسی گیلی لکڑیاں ہیں۔ نرا پانی..... پھر جو شکایت کرو تو خان الٹا جھڑکتا ہے..... ہاں تو بیگم صاحب..... بات یہ ہے۔"

چولہے میں سے خوب دھواں اٹھا۔ وہ بات بھول بھال کر لکڑیوں میں پھونکیں مارتی چلی گئی۔ اتنی پھونکوں سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور بکھرے بالوں پر راکھ اڑ کر یوں پڑ گئی جیسے بڑ کی جٹاؤں پر برف کے پہلے پہلے گالے۔

راحیلہ نے چوکی کو پیچھے گھسیٹتے ہوئے سوچا۔ یہ زینو چاچا جی کے متعلق کیا کہہ رہی ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی خادمہ سے نکاح پڑھوا لیا اور قیصر کو خبر تک نہ دی۔ پھر اس نے چاہا کہ زینو کو جھڑک دے۔ بھلا وہ کون ہوتی ہے ہمارے نجی معاملوں میں دخل دینے والی۔ لیکن غیرت کی ہلکی سی لہر کو تجسس نے روک لیا۔ وہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ چاچا جی نے یہ..... کیسے کر لیا۔ اتنے لمبے چوڑے محلے میں رہ کر انہوں نے اتنا بڑا قدم کیسے اٹھایا۔ لوک لاج کا گھونگھٹ کیسے اٹھایا؟

اب آگ لپک لپک کر دیگچی کے کناروں سے باہر نکل رہی تھی۔ یخنی کی بھاپ سے باورچی خانہ مہک اٹھا۔

"آئے ہے کیسی گیلی لکڑیاں ہیں بی بی....."

"ڈھکنا ٹھیک طرح سے بند کر زینو..... بھاپ نکل گئی تو خوشبو سب ختم ہو جائے گی۔"

زینو کو حکم ماننے سے چڑ تھی، وہ ذرا سی بات پر موڈ بدل لیتی تھی۔

"ٹھیک تو ہے بی بی جی....."

"دیکھتی نہیں ایک طرف سے کھسکا ہوا ہے..... ہاں تو جو تو کہہ رہی تھی کہ چاچا جی....."

زینو کا موڈ یکدم بدل گیا۔ وہ گھر کے اندرونی دائرے میں داخل ہو گئی..... "ہاں جی بی چاچا جی نے تو کمال ہی کر دیا..... کل جب دھوبی بشیرا آیا تھا جی تو وہ بھی کہہ رہا تھا۔ تم کیا جانو زینو....." راحیلہ کا جی چاہا کہ وہ زینو کو ڈانٹے لیکن وہ بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔

سورج کی آخری کرنیں بھی ایک جھپاکے سے معدوم ہو گئیں۔ اب باورچی خانے میں آگ کی روشنی کے علاوہ اور کوئی روشنی نہ تھی۔ کھڑکی کی سلاخیں شام کے دھندلکے میں نمایاں ہو گئی تھیں اور چنگل کے برتن ماند پڑنے لگے تھے۔

"اوری عالیہ..... سختی ہے کہ تمیں بتیاں جلا دے..... باہر پھاٹک والی بھی۔ دو وقت ملتے ہیں..... غافل نہ ہوا کر اس وقت۔"

عالیہ باہر برآمدے میں سیپارہ گھٹنوں پر دھرے اونگھ رہی تھی۔ اس کی گردن یوں جھول رہی تھی گویا ایک جھٹکے سے ٹوٹنا چاہتی ہے۔ آواز سن کر وہ گڑبڑا گئی۔ سیپارہ پھسل کر آگے جا پڑا۔ جلدی سے سیپارہ چوم کر عالیہ اٹھی تو زینو کی آواز باورچی خانے سے آئی..... "صحن والی بجلی بھی جلا دے..... جلدی ہو..... زوال کا وقت ہے۔"

عالیہ نے بتیاں جلا دیں۔ پھر پیڑھی کو ستون سے ٹیک کر سیپارہ پڑھنے لگی لیکن چند ہی منٹوں میں وہ پھر اونگھ رہی تھی۔

رازدارانہ سرگوشی میں زینو نے کہا..... "بی بی جی ناں سچ بیگم صاحب..... دیر ہوگئی ہے اس بات کو لیکن شیخ صاحب چھپاتے ہیں۔ مجھے ٹھیک پتہ ہے بات پکی ہے....."

راحیلہ نے اپنے تجسس کو معمولی پن میں چھپا کر کہا..... "لیکن فاطمہ سے اچھی عورتیں تو چاچا جی کو خاندان سے مل سکتی تھیں..... کیمپ میں اتنی بے سہارا عورتیں ہیں..... اور اور چاچی جی بھی تو ہیں۔ انہیں گاؤں سے لے آتے..... مجھے تو یہ جھوٹ لگتا ہے۔"

"ناں ناں جی..... رتی برابر جھوٹ نہیں اس میں۔ میرا تو آنا جانا رہتا ہے چاچا جی کے گھر۔ پھاں میری پرانی آشنا ہے۔ ہمیشہ جاتی ہوں۔ پہلے فاطمہ کی آنکھیں دریا بہاتی تھیں ہر وقت۔ اب جب میں جاتی ہوں' یہی کہتی ہے تمہارے شیخ صاحب نے چھ مہینے کی تنخواہ نہیں دی' اسی مارے نکی ہوئی ہوں۔ وہ آج تنخواہ دے دیں..... کل میں نمھا کھاؤں۔ پرسوں جب میں آپ سے چھٹی لے کر گئی تھی..... تو فاطمہ تخت پوش پر بیٹھی گاؤ تکیہ لگائے چھالیہ کتر رہی تھی..... صاف لٹھے کی شلوار' چنا ہوا دوپٹہ' پان کھا رہی تھی۔ چاچا جی پاس بیٹھے تھے' کنی کترا گئے۔ میں نے پھاں سے پوچھا تو ہوں ہاں کر کے رہ گئی..... منہ سے تنکی تک نہیں' پر اے سچ بی بی جی یہ باتیں کوئی چھپائے چھپتی ہیں۔"

"پر گھر بھرا ہے لڑکیوں کا....."

"ضرور گھر بھرا ہوگا بی بی جی..... پر جی اپنے خاندان کی لڑکی کس منہ سے مانگتے..... گاؤں میں تو چاچی بیٹھی ہے۔ پھر لوگ کہتے بوڑھے منہ مہاسے لوگ کریں تماشے..... اور بی بی کیمپ کی عورتوں سے تو خدا بچائے جی..... جو جولایا بے وچھتاتا ہے۔"

جملہ ختم کرنے سے پہلے زینو اچانک چپ ہوگئی۔

"کیوں ان کو کیا ہے کیمپ والیوں کو بیچاری بے آسرا اجڑ کر آئی تھیں۔"

"اجڑی تو ضرور تھیں۔ پر جی ان کیمپ والیوں کا کیا اعتبار؟..... آج یہاں کل وہاں..... ان کی وفاداری کوئی نہیں بیگم صاحب..... آپ کو کیا بتاؤں' کیمپوں میں کیا کچھ ہو رہا ہے..... لٹ پٹ کے ضرور آئی ہیں۔ پر چالاک بھی ہوگئی ہیں ساتھ کے ساتھ..... آپ گھر بسائی کو کہہ رہی ہیں۔ یہ تو ملازم رکھنے کے قابل بھی نہیں۔ ترس کھا کر رکھ لیں جی روٹی کپڑا دیں..... یہ صبح جوتی کپڑے سمیت چپت ہو جائیں..... گھر گھر جوتیاں چٹخاتی پھرتی ہیں' بے وفائیں..... نہ اگلوں کی نہ پچھلوں کی..... نہ ان کا دین نہ ایمان....."

قیصر کی دوسری بیوی راحیلہ دیوار کا سہارا لے کر اٹھی۔ نیم اندھیرا آنگن کراس کیا۔ ادھ موئی عالیہ کے پاس سے گزر کر اپنے بیڈروم میں چلی گئی..... زینو کے چھوٹے سے تبصرے نے اسے ازسرنو گنگ کر دیا تھا۔ اس محلے میں جانے کون کون اس کے متعلق کیا کچھ کہہ رہا تھا لیکن زینو نہیں جانتی تھی کہ وہ بھی کیمپ سے آئی ہے۔ کیا بابا فضل نے کیمپ کی رتی رتی بات زینو سے نہ کی ہوگی۔ جب بھی وہ اپنی چلم میں تازہ انگارے بھرنے آتا..... کافی دیر تک زینو سے گپ بازی کرتا رہتا! ڈاکٹر قیصر نے زینو کو اس کے متعلق کیا کچھ اور کتنا کچھ بتا رکھا تھا؟ اب وہ پہلے سے محتاط ہونے پر مجبوری نظر آ رہی تھی۔

زینو کے متعلق سوچنے کے بجائے رفتہ رفتہ اس نے کیمپ میں آئی عورتوں کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ ایسی عورتیں جن کے گھر والے یا تو بچھڑ گئے یا پھر فسادیوں نے مار ڈالے..... زمین کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ گری پڑی لاشیں، کھیتوں میں ادھ موئے مہاجر، گھروں میں گلتی سڑتی لاشیں..... اور ان لاشوں سے بچھڑی بے سہارا، تن تنہا، حیادار پردے دار عورتیں..... پودوں کو گاچی کر کے نیری یا پودے کی شکل میں نئی جگہ لگائیں تو کئی بار نئی مٹی کو پودا قبول نہیں کرتا۔ کبھی کبھی دیکھ ریکھ نہ کی جائے تو بھی نئی جگہ منتقل کرنے کے بعد نیا پودا سوکھ جاتا ہے لیکن کوئی نہیں سوچتا کہ یہ عورتیں کیوں ماری ماری پھرتی ہیں..... آخر ان کا دل کیوں نہیں لگتا..... یہ ایسا روڑا کیوں بن گئی ہیں جو کسی بنیاد میں بھی ڈالا نہیں جا سکتا..... کیا ایک گھر کا ملبہ کسی دوسرے گھر میں لگایا نہیں جاتا؟..... یہ جو ڈھیروں ڈھیر کوڑا لاہور کی تاراج گلیوں سے نکلا اسی سے تو لاہور کے ارد گرد کی سطح اونچی کی جا رہی تھی۔ آخر ملبہ کام آ سکتا تو کیا اجڑی عورتیں اتنی ہی گئی گزری ہیں۔ یہ جو بھی اپنے گھروں کی، جھونپڑوں کی رانیاں ہوں گی اب نوکرانیاں بننے کی بھی اہل نہیں رہیں؟

پھر سوچ نے ایک اور کروٹ لی۔ اس کے اندر نے سوال کیا..... آخر شاہ عالمی کا ملبہ زمین کی سطح اونچی کرنے کے لیے تو وجود میں نہ آیا تھا۔ وہ عمارتیں گھر بنانے کے لیے بنائی گئی ہوں گی۔ روندنے کے لیے نہیں۔ وہ بھی اگر بول سکتا تو ضرور صدائے احتجاج بلند کرتا۔ یہ عورتیں جن کے تن پر پھٹے پرانے کپڑے تھے۔ یہ عورتیں جو سڑکوں پر گلیوں میں بچوں کو جنم دے رہی تھیں، جو فقط زیست کو آگے دھکیلنے کے لیے اندھیری کوٹھڑیوں میں، بازوؤں کی آڑ میں، دھندلائی گلیوں میں عصمت بیچ رہی تھیں۔ ایسی عورتیں جن کے ہاتھ ہمیشہ کے لیے سوالی بن گئے تھے یا اس حیات کو برقرار رکھنے کا سوچ رہی تھیں جو موت سے بدتر تھی..... ان کے وہ سنہری اصول کہاں تھے جو یہ پالنے سے سیکھتی آئی تھیں۔ وہ اقدار کیا ہوئیں جن پر ان کی زندگی کی اساس تھی..... وہ آدرش کیا ہوئے جن کی لاٹھی ٹیک کر یہ چلتی تھیں۔

قیصر کی راحیلہ جا چکی تھی۔ اب اس کی دوسری بیوی راحیلہ نے چارپائی پر اپنا بوجھل وجود انڈیل دیا۔ "یا اللہ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ میں اس قدر کیوں سوچنے لگی ہوں۔ میرا ذہن افکار کا ابدی چکر کیوں بن گیا..... آخر کب تک تابکے؟ چھوڑو سب کچھ زندگی انجوائے کرو..... ماضی اور مستقبل کا جھنجھٹ چھوڑ کر فقط حال میں زندہ رہو..... لیکن یہ خنکی بھی دیر پا ثابت نہ ہوئی..... تھوڑی دیر بعد وہ پھر سوچنے لگی کہ ابھی تو مہاجر عورتوں پر ہی عذاب نازل ہو رہا ہے۔ پھر اغوا شدہ عورتیں آئیں گی۔ مغویہ عورتوں کا تبادلہ شروع ہوا تو جنون کی ایک اور لہر متلاطم پانیوں میں بھنور پیدا کر دے گی۔

میرے اللہ پھر کیا ہوگا۔

ہولے ہولے کسی نے اس کے دل سے پوچھا۔ کیا وہ بھی تو ایک اغوا شدہ عورت نہیں ہے..... وہ یہاں مطمئن

بے شاکر ہے قانع ہے لیکن جوان انسان کے لیے قانع رہنا تو زندگی کا مفہوم نہیں ہو سکتا۔ اس کی زندگی تو ان سنہری خوابوں سے بنتی ہے جس میں رنگ برنگی خواہشیں تتلیوں کی صورت اڑتی ہیں۔ ایسے ست رنگے خواب جو کھلی آنکھوں دیکھے جاتے ہیں۔ جن میں رنگ' خوشبو' نظارہ' لمس آپس میں گڈمڈ رہتے ہیں۔ اب تو اس نے کافی عرصہ سے دن کے وقت اپنی فینٹسی کی دنیا سے بھی منہ موڑ لیا ہے۔ وہ زبردستی اپنے آپ کو کاموں میں مشغول رکھتی' آنے والے بچے کے کپڑے سیتی۔ گرم سویٹریں بُنتی۔ یہ خواب اب اسے چوری' بے ایمانی اور غلط روی کا مشغلہ نظر آتے۔ مستقبل سے بے پروا ماضی سے آنکھیں چراتی وہ حال پر توجہ مرکوز رکھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے ماضی سے یوں کترانے لگی تھی گویا ہر یاد کوڑھ کے جراثیم سے پُر ہو۔ حال اس کی شہ رگ میں پھانس کی طرح اٹک کر رہ گیا تھا۔ بڑی احتیاط کے باوجود ماضی کے تصورات پوری آب و تاب سے اس کی نظروں کے آگے پھرنے لگتے اور وہ حسرت و بیچارگی سے اس پر نگاہیں مرکوز رکھتی جیسے کسی ملازم کا بچہ نعمت خانے میں بند مٹھائی کو تکتا رہتا ہے۔ پھر اپنے پیٹ کے بوجھ سے اسے ہوش آ جاتا۔ وہ اپنے آپ کو بچے اور قیصر کے وجود سے باندھنے لگتی اور اس سعیِ مسلسل سے تھک سی جاتی۔

ہاں وہ بھی ایک اغوا شدہ عورت تھی جسے سیاسی' معاشی' معاشرتی فیصلوں کا احساس نہ تھا۔ صرف اس کے معاملے میں اغوا اس کی اپنی مرضی سے ہوا تھا.....

دبے پاؤں زینو کمرے میں داخل ہوئی۔

''بی بی نہ بیگم صاحب! کن گہری سوچوں میں پڑی ہیں۔''

راحیلہ نے زینو کو اپنی سوچ کا حصہ نہ بنانا چاہا اور چپ رہی۔

''جی پودینہ بھی ڈالنا ہے کبابوں میں کہ نہیں.....''

''ضرور..... اچھا قیمہ خوب پس گیا ہے ناں؟''

''مالیدہ بن گیا ہے جی..... ملائی جیسا۔''

''اچھا.....''

''آپ تلیں گی کہ میں تل لوں کباب؟.....''

''تم ہی تل لو زینو..... میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔''

''میں پہلے ہی کہہ رہی تھی بیگم صاحب کی طبیعت آج ٹھیک نہیں..... اللہ کرے ڈاکٹر صاحب جلدی آ جائیں۔ بابے فضل کو بلانے بھیج دوں جی.....''

''نہیں نہیں ایسی ویسی کوئی بات نہیں.....''

''اچھا جی.....''

بیگم صاحب کو زینو بھی ٹھیک طور پر سمجھ نہ پائی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ بالکل قریب ہو جاتیں اور یوں ہنستی بولتیں گویا گہرا بہناپا ہو..... پھر کبھی ایسے لگتا کہ نام سے بھی واقف نہیں' جانتی ہی نہیں کہ زینو کون ہے۔ راحیلہ نے زینو کو بھیج کر سوچا..... یہ میری مصروفیت بھی غیر ضروری ہے۔ مجھے اور باورچی خانے کو اس قدر لازم و ملزوم نہیں ہونا چاہیے۔ میں بھی

ساجدہ ماں کی طرح ہر وقت برتنوں کے طواف کرتی رہتی ہوں..... کیا میری ماں نے بھی غیر ضروری مصروفیت کسی مجبوری کے تحت ایجاد کر رکھی تھی۔ کیا ابا اور اس کے درمیان پھیلے فاصلے اسی طرح پاٹے جا سکتے تھے..... مصروفیت کے سہارے؟

باہر نکل کر اس نے عالیہ کو آواز دی..... "عالیہ اٹھ کر تخت پوش پر لیٹ جا..... فرش سے سردی لگ جائے گی۔"

کہیں سے قیصر کی بلی آ کر عالیہ کے پاس لگ کر بیٹھ رہی تھی۔ راحیلہ کی آواز سن کر اٹھی۔ کمر کو کمان کی طرح اٹھائی اور پھر اس انگڑائی سے تازہ دم ہو کر کمرے میں چلی گئی..... لیکن عالیہ وہیں ٹھنڈے فرش پر لڑھکی ہوئی سوئی رہی۔ زینو باورچی خانے سے دھاڑی..... "او بے سنتی نہیں کیا کہہ رہی ہیں بی بی جی....."

پھر زینو دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی صحن میں آئی اور نارمل آواز میں بولی..... "جی صاحب؟"

"تخت پوش پر لیٹ جا بھی ماں کا کھیس اوڑھ کر..... سردی لگ جائے گی۔"

عالیہ بند آنکھوں سے اٹھی اور تخت پوش پر لیٹ گئی۔ زینب نے اسے اپنا گندا سا کھیس اوڑھا دیا۔ ایسی بے فکری کی نیند اب راحیلہ سے کوسوں دور تھی..... کیسی خوش قسمت ہے اپنی نیند سوتی ہے اور خوب سوتی ہے اور ایک میں ہوں کہ میری نیند پر میرے اپنے وسوسوں کے خوف و ملال کے پہرے ہیں۔ ہر خواب مجھے چونکا دیتا ہے۔ گویا میں کابوس کی مریض ہوں..... نیند کے کچھ لمحوں کے بدلے مجھے گھنٹوں کی بے خوابی ملتی ہے۔ پھر جب تکان اور غنودگی سے نڈھال ہو کر میری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تو وہی لمبے فاصلے' لٹے پٹے قافلے' ٹوٹی پھوٹی پگڈنڈیاں' ان دیکھے چہرے' انجانے گرد و پیش میرا گلا گھونٹنے لگتے ہیں اور میں پھر اٹھ بیٹھتی ہوں۔

بچے کو جب تک اپنے ارد گرد کا احساس نہیں ہوتا' اشیاء سے آگاہ نہیں ہوتا۔ کیسی بے پرواہی کی نیند سوتا ہے۔ ماحول کی شعوری آگاہی کیسے کیسے مسائل کو جنم دیتی ہے؟ نہ جاننے والوں پر رشک کرتی' وہ ڈرائنگ روم کی طرف چل دی۔ بھاری پردوں کی وجہ سے یہ بیٹھک نما ڈرائنگ روم نیم روشن تھی۔

راحیلہ نے بتی جلائی تو کمرے کا پرانا اور نیا فرنیچر نظر آنے لگا۔ یہاں کین سے بنا ہوا صوفہ بھی پڑا تھا اور جرمن سپرنگ والا گدی دار صوفہ اور اخروٹ کی لکڑی کی میزیں بھی تھیں جو کشمیری کاریگروں کی صناعی کا بڑا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ ویلوٹ کے نیلے پردے بھی تھے اور فرش پر پرانی مضبوط دری بھی تھی۔ دیواروں پر سلمٰی ستاروں سے جڑی تصویریں اور کیلنڈر بھی آویزاں تھے اور خان کوف کی دو تصویروں کے پرنٹ بھی لگے تھے۔ کونے میں پیک دان رکھا تھا اور تپائیوں پر شیشے کے ایش ٹرے بھی تھے۔ یہ کمرہ بھی قیصر کے مزاج کا آئینہ دار تھا۔ جو چیز جس وقت اس کمرے میں آ گھسی پھر باہر نہیں نکلی۔ جو وقت اس کمرے کی تاریخ بنا پھر یہاں سے رخصت نہیں ہوا۔ کونے میں جہاں تین ٹانگوں والی میز پر تاج محل کا چھوٹا سا ماڈل پڑا تھا' اس کے پیچھے دیوار پر انیس سو سینتالیس کا کیلنڈر بھی ٹنگا تھا جس میں ایک جاپانی لڑکی خوبصورت دستی پنکھے سے آدھا منہ ڈھانپے براجمان تھی۔ اسے یہاں سے جانے کی قیصر نے اجازت نہ دی تھی۔ راحیلہ خود اپنے ماضی میں ایسی الجھی ہوئی تھی کہ اس نے قیصر کے گھر کو اپ ٹو ڈیٹ کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ آہستہ آہستہ تاج محل کے پاس پہنچی۔ اپنے دوپٹے سے اس کے گنبد اور مینارے صاف کیے۔ انگلی پھیر کر اس کے وجود کو محسوس کیا اور پھر افکار کی دنیا میں کھو گئی۔

شاہجہاں کی محبت کا مدفن..... یا پھر..... اس کی محبت کی چلتی پھولتی زندگی کی آخری نشانی۔ خدا جانے اسے

ممتاز محل سے محبت تھی بھی کہ یہ محض فرصت کے لمحے گزارنے کا ایک گرینڈ طریقہ تھا۔ اوما کہا کرتی تھی' بھائی اس زمانے میں کوئی فیکٹریاں لگا کر بیکاری کے پھنکارتے ہوئے ناگ کو نہیں بھگایا جا سکتا تھا۔ تب ذہین بادشاہ اسی طرح باغ مقبرے قلعے تعمیر کر کے ہزاروں لاکھوں بیکاروں کو روزی مہیا کیا کرتے تھے..... ایک خلقت نے تاج محل کی وجہ سے پیٹ بھر کر روٹی کھائی ہوگی۔

کیا یہ نقطۂ نظر ٹھیک تھا؟ اوما ہمیشہ اپنی سوچ کو دنیاوی بنانے میں کیسے کامیاب ہو جاتی تھی؟ راحیلہ نے آگے بڑھ کر تاج محل کے چھوٹے سے گنبد پر اپنے لب رکھ دیے۔ سفید پتھر کی سردی اس کے ٹھنڈے ہونٹوں سے کچھ ایسی مختلف نہ تھی۔ صرف اس کے لبوں میں حرکت تھی۔ زندگی تھی اور مزار ایک ابدی سکوت کا ضامن تھا۔ یخ ہو رہا تھا..... نہیں اوما کی طرح سوچنا درست نہیں۔ یہ مزار ایک پائندہ مُہر ہے جو محبت کے لبوں پر ثبت کر دی گئی..... ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جنہوں نے اور کچھ نہیں تو اپنے دلوں میں محبتوں کے مقبرے تعمیر کیے اور انہیں آنسوؤں سے سینچا..... ہم جیسے تو محبت کی پرچھائیوں سے بھی ڈرتے ہیں۔ ہاں ایک عظیم الشان روح کی پُرعظمت محبت.....

مقبرہ؟..... مزار..... مدفن.....

سر جھٹکتے ہوئے وہ صوفے میں دھنس گئی۔ آخر یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ ذرا سی بات مجھے سوچ کی لمبی گلیوں میں دھکیل دیتی ہے۔ کیا میں پاگل ہو رہی ہوں؟ نیوراٹک ہو کر میری سوچ پر اسی لیے دھاوا بولتے ہیں..... یہ بیکار ذہنی ابال اس کے کس کام آئیں گے۔ اپنی شال کی جھالر میں گانٹھیں ڈالتے ہوئے اس نے یہ مصمم ارادہ کیا کہ وہ قیصر سے اپنی تنہائی کا ذکر ضرور کرے گی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ ماضی کے عفریت سے چھٹکارا پانے کے بعد بھی اسی عہد کا غیر شعوری طور پر انتظار کیے جا رہی ہے..... وہ ساری امید مٹا کر بھی آس کی چھوٹی چھوٹی پھلجھڑیاں جلانے سے اپنے آپ کو روک نہیں سکتی..... اس کی کوئی نہ کوئی کھڑکی اچانک اس کے ماضی میں کھل جاتی تھی..... ہاں وہ اس ماحول میں اپنی تقدیر میں پورے طور پر جذب نہ ہو پائی تھی۔ اس گھر میں وہ عبادت کر رہی تھی اور بدقسمتی سے عبادت میں اس کا انہماک پورے طور پر نہیں تھا۔ وہ کسی دیوداسی کی طرح بڑے حلم و انکساری سے آرتی اتارتی نظر آتی لیکن دیے پوری روشنی سے جلتے نہ تھے۔ اس کی خدمت گزاری میں ایک دل شکن سی بربادی تھی..... بھجن ہو کہ ترانہ ہمیشہ روح کی شگفتگی اور شگفتگی سے ہی گانے میں جان پڑتی ہے..... اس کی ہر حرکت' بات' سوچ مجسم سوال بنی موجودہ حالات سے راز و نیاز کرتی ہی رہتی..... غیر شعوری طور پر وہ ابھی تک اچانک شاہد کی راہ دیکھنے لگتی۔ اسے اپنی بے چینی کی اپنے انتظار کی سمجھ نہ آتی..... راحیلہ نے اپنا سر صوفے کی پشت سے لگایا اور لاکھ لگام کھینچنے کے باوجود اس کے خیال کا گھوڑا سرپٹ ابراہیم لاج میں جا پہنچا۔

چلچلاتی دھوپ ساری کوٹھی پر چھاؤنی ڈالے بیٹھی تھی۔ دوپہر کے سورج میں کرنیں تپ تپ کر کندن ہوئی جاتی تھیں۔ شہر کے بلوائی بھی گھروں میں چھپے بیٹھے تھے۔ گرم سڑکوں پر صرف گورکھا پولیس راؤنڈ کو نکلی تھی۔ کرنل وائٹ ہیڈ جو اپنی طبیعت کے باعث سخت گیر' منتظم اور معاف نہ کرنے والا مشہور تھا' اپنے دفتر میں دبکا بیٹھا تھا۔ چھت پر لگا بڑا سا کپڑے کا پنکھا کھینچنے والا برآمدے میں انگوٹھے سے رسی پھنسائے نیم بے ہوش حالت میں رسی کھینچنے اور چھوڑنے میں مشغول تھا۔

ابراہیم لاج میں سارے نواب اپنے اپنے کمروں میں کچھ سوئے کچھ جاگے پڑے تھے۔ ساجد والا ..... [illegible]

گیا دوپٹہ باندھ رکھا تھا اور پیروں پر دونوں میں مہندی کی جما کر انہیں اروی کے پتوں میں لپیٹ رکھا تھا تاکہ جابجا مہندی گر کر داغ نہ چھوڑ جائے۔ خس کی ٹٹی سے آنے والے معطر جھونکے گیلری کے اندھیرے میں عجب خنکی پیدا کر رہے تھے۔ فرش پر دری بچھا کر تسنیم آپا جب گہری نیند سو گئیں تو گوگو ان کے پاس سے اٹھا اور سرہانے تکیے سے قینچی نکال کر Illustrated Weekly کے صفحوں سے اپنی پسند کے کارٹون تصویریں کاٹنے لگا۔ راحیلہ تخت پر اوندھی لیٹی اپنی کاپی میں اپنی پسند کے شعر لکھنے لگتی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تسنیم آپا اور ساجدہ ماں کو چور نگاہوں سے دیکھ لیتی اور جب اسے اطمینان ہو جاتا کہ کوئی دیکھ نہیں رہا تو پھر وہ اپنی کاپی پر شاہد اور اپنا نام لکھ کر Love like hate نکالنے میں مشغول ہو جاتی۔ یہ اس سست رفتار دور میں لڑکیوں کا ایک پسندیدہ مشغلہ تھا۔ کاپی پر اوپر شاہد عباس کا پورا نام انگریزی میں لکھا جاتا۔ پھر لکیر ڈال کر نیچے راحیلہ مغل کا نام درج کرتی۔ پھر ان دونوں میں جو حروف کامن ہوتے انہیں کاٹ دیا جاتا اور مزے لے لے کر پتا لگایا جاتا کہ شاہد اور راحیلہ میں محبت کس درجے میں ہے؟ گو جواب ہر مرتبہ ایک ہی نکلتا لیکن اس مشغلے میں راحیلہ کی دلچسپی کم نہ ہوتی۔ کبھی کبھی وہ اپنا نام قیصر کے ساتھ لکھ کر عجیب قسم کی لذت سے آشنا ہوتی۔ اسے لگتا وہ موتیے کے گجرے پرو رہی ہے..... عجیب سی بات تھی لیکن نام کی وجہ سے فضا معطر محسوس ہوتی..... ابھی ٹیلی فون عام نہ ہوئے تھے اور لڑکیاں لمبے فون کر نہیں سکتی تھیں۔ ایسے ہی مشاغل سے وہ اپنے دل پشاوری کر لیا کرتیں اور محبت کے گلدستے پر یاد سے چھینٹے دے کر باسی پھولوں کو تر و تازہ رکھنے میں کامیاب ہو جاتیں۔

گوگو اور راحیلہ اپنے اپنے مشاغل میں مست تھے۔ کسی پھیری والے نے پھاٹک پر صدا لگائی..... "برف ملائی کی ٹھنڈی میٹھی قلفیاں....."

گوگو نے اخبار، قینچی چھوڑ دی اور حلق سے بغیر آواز نکالے بولا..... "خالہ جی..... برف ملائی کی۔"

دونوں نے اپنے اپنے لبوں پر انگلی رکھی۔ راحیلہ نے تنبیہاً آنکھیں کھول کر اسے باہر نکلنے کے لیے کہا۔ دونوں دبے پاؤں باہر نکلے۔ دروازے کے پاس ہی خس کی ٹٹی پر چھڑکنے کے لیے پانی سے بھری بالٹی پڑی تھی۔ احتیاط کے باوجود راحیلہ کا پاؤں نیم اندھیری گلی میں بالٹی سے جا ٹکرایا۔ اس ٹناٹن شور سے تسنیم کی آنکھ ذرا سی کھل گئی۔ اس نے بوجھل آواز میں کہا..... "راحیلہ..... گگو سو جاؤ..... کوئی شرارت نہ کرو شاباش۔"

دونوں گم سم کھڑے رہے۔ پھر تسنیم کروٹ لے کر سو رہی تو دونوں ننگے پاؤں گیلری میں سے گزرے اور دروازہ کھول کر برآمدے میں جا پہنچے۔

برآمدہ پار کر کے وہ پورچ کی سیڑھی پر آئے تو گگو نے کہا..... "خالہ جی آپ تو ننگے پاؤں ہیں اور باہر بجری تپ رہی ہے....."

"کوئی بات نہیں، میں تیرے ساتھ چلتی ہوں....."

"آپ سنبل کے درخت تلے میرا انتظار کریں..... میں اسے پکڑ کر لاتا ہوں....."

تھوڑی دور تپتی بجری پر بھاگنے کے بعد گوگو واپس آ گیا اور لمبا منہ بنا کر بولا..... "خالہ جی میرے پاس تو پیسے نہیں ہیں۔"

"پیسے تو میرے پاس بھی نہیں ہیں۔ ہم ادھار کر لیں گے۔ اب واپس نہ لوٹ آتا۔ جانے وہ کہاں نکل گیا ہوگا۔"

گکو تپتی بجری پر بھاگتا چلا گیا" میں اپنے لیے چار قلفیاں لاؤں گا جی....." دور سے گکو کی آواز آئی۔ راحیلہ سنبل کے درخت تلے جانے لگی تو بلبلا اٹھی۔ پورچ سے پھاٹک تک جو بجری سڑک پر بچھی تھی' دہکتے کوئلوں کی طرح گرم تھی۔ آرزو بھی کیا چیز ہے۔ گکو کیا آرام سے بھاگ گیا اور وہ سڑک کراس کر کے لان تک بڑی مشکل پہنچی۔ اگر ابا جی آ گئے تو..... اگر ماں ساجدہ جاگ گئیں پھر؟ ابھی وہ اس خوف سے چھوٹی ہی نہ تھی کہ اپنی توجہ ہٹانے کے لیے وہ پھاٹک پر پہنچی اور پھاٹک کے فریم پر چڑھ کر سلاخوں والے پھاٹک پر جھولنے لگی۔ یہاں نیم کے درخت کا سایہ تھا اور یوں پھاٹک پر جھولتے ہوئے اسے بہت لطف آ رہا تھا۔ پھر کہیں سے شاہد سائیکل پر گزرا' وہ پھاٹک کے سامنے سڑک پر آگے بڑھ گیا۔ شاید اس نے راحیلہ کو نہ دیکھا ہو۔ چند ثانیے بعد سائیکل مڑی اور شاہد آ کر پھاٹک کے قریب رک گیا۔

"یہ کس کا انتظار ہو رہا ہے اتنی گرمی میں....." شاہد نے سوال کیا۔

"کسی کا بھی نہیں.....وہ گکو ذرا.....قلفیاں لینے گیا ہے۔"

"تو آ جائے گا ناں....."

شاہد نے پھاٹک کے اندر آ کر سائیکل کھڑی کی اور پھر راحیلہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"سنا ہے اس دھوپ میں tan ہو جائے تو پھر رنگ صاف نہیں ہوتا....."

وہ دونوں لان سے برآمدے کی طرف چلنے لگا۔ راحیلہ نے قیصر کی گرفت سے ہاتھ چھڑانا چاہا لیکن اس کی انگلیاں اس کے ہاتھ سے چمٹ کر رہ گئیں۔ قیصر کا ہاتھ مضبوط ہونے کے باوجود عجیب طرح سے ملائم تھا۔ اس ہاتھ میں تحفظ تھا' اپنائیت تھی۔ کبھی نہ چھوڑنے کا عزم تھا۔ سنبل کے درخت تک دونوں ہاتھ سختی سے بھینچے ہوئے ہونٹوں کی طرح یکجان رہے۔ پھر گکو پھاٹک پر برآمد ہو گیا تو دونوں اپنے اپنے لمس کو اپنے اندر چھپا کر دور دور کھڑے ہو گئے۔

"راستہ بہت جلد کٹ گیا....." قیصر نے کہا۔

"جی....."

"دھوپ بھی آپ کے ساتھ اچھی لگی۔"

راحیلہ چپ رہی۔ اسے تو لگ رہا تھا چاندنی میں نہا کر آئی تھی۔

"کبھی آپ نے سوچا ہے کہ..... کہ اس شہر میں ایک ایسا دیوانہ بھی ہے جو..... رات کو سو سکتا ہے نہ گرم دوپہر میں....."

یہ قیصر کی شادی سے پہلے کا واقعہ ہے۔

"راحیلہ..... اگر تم..... شام کو ملنے کا وعدہ کرو تو....."

راحیلہ کے کان سنسنانے لگے۔

"چلو جھوٹا وعدہ سہی..... چند منٹ کے لیے..... ایسے ہی....."

ٹوٹو اور قلفی والا دونوں پھاٹک کے پاس آ کر رک گئے۔ پھر ٹوٹو دو قلفیاں ہاتھ میں پکڑ کر سنبل کے درخت تلے بھاگا آیا۔

''اوہو قیصر بھائی بھی ہیں...... میں ابھی اور لایا......'' چند قدم بھاگ کر وہ پھر لوٹ آیا...... ''قیصر بھائی آپ امی کو تو نہیں بتائیں گے ناں......''

''میں نہیں کھاؤں گی ٹوٹو......''

ابھی مرد کے سامنے عورت کسی قسم کی اشتہا کا ذکر کرنے کی عادی نہ تھی۔ ہر قسم کی بھوک از خود پوری ہو جائے تو ٹھیک تھا اور نہ لڑکیاں ابھی مارے حیا کے اپنی کسی ضرورت کو منہ سے ادا کرنے کی عادی نہ تھیں۔

قیصر نے تھوڑی سی قلفی چکھ کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا...... ''اب بھی نہ کھاؤ گی؟''

راحیلہ نے مسکرا کر قلفی پکڑی اور اتراہٹ سے بولی...... ''میں نے آج تک کوئی جھوٹی چیز کھائی نہیں لیکن خیر......'' راحیلہ ہولے ہولے پورچ کی جانب چلنے لگی۔

قیصر مسکرایا اور زیرِ لب بولا...... ''اور جب میرے ساتھ عمرہ کرنے جاؤ گی اور حرم شریف میں ایک ہی گلاس سے امتِ رسول آبِ زمزم پیتی نظر آئے گی وہاں کیا کرو گی اپنے Caste system کو۔ کہاں تک پیاسی رہو گی؟......''

قیصر اس کے ساتھ پورچ کی طرف نہ آیا بلکہ پھاٹک کی جانب مڑ گیا۔

راحیلہ بہت خوش تھی...... آج تو دو دعائیں پوری ہو گئیں...... بلکہ آج تو کئی دعائیں اچانک قوسِ قزح کی طرح فضا میں لہرا گئیں...... واپسی پر نہ تو اسے گھاس گرم لگی نہ تپتی ہوئی بجری...... اس نے چاہا کہ چپ چاپ اندر جا کر کسی اندھیرے گوشے میں دیر تک قلفی چاٹتی رہے لیکن قیصر کو چھوڑ کر بھی جانے کو جی نہ چاہا۔ وہ لمبے لمبے ستونوں والے برآمدے میں کھڑی رہ گئی۔ ٹوٹو اور شاہد قلفیاں کھاتے قریب پہنچے تو ٹوٹو نے آواز گرا کر کہا...... ''خالہ جی قیصر بھائی نے پیسے دیئے ہیں۔''

''تم نے کیوں ادا کرنے دیئے پیسے...... ادھار کر لیتے۔''

''خالہ جی...... قیصر بھائی کہتے تھے۔ اگر تم نہیں مانو گے تو میں باجی تسنیم کو بتا دوں گا...... دوپہر کے وقت تم اور راحیلہ کیا کرتے تھے......''

شاہد ابھی تک کھانے چاٹنے میں مشغول تھا۔ اب متوجہ ہو کر بولا...... ''او یار...... یہ کیا راز و نیاز چل رہا ہے' ہمیں بھی تو پتہ چلے......''

''آہستہ بولیے آہستہ......''

اس وقت دادا ابا جانی کا دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں آ گئے۔ انہوں نے سر پر گیلا تولیہ ڈال رکھا تھا۔ غالباً وہ کہیں جانے کی تیاری میں تھے۔

''بھائی اس وقت...... اتنی گرمی میں جب چیل بھی انڈا چھوڑ جاتی ہے تم تینوں کیا کر رہے ہو برآمدے میں؟''

''دادا ابا بڑی گرمی لگتی تھی جی...... قلفی کھانے نکلے تھے......''

راحیلہ اپنے منگیتر کی موجودگی میں یوں قلفی کھاتے ہوئے چوری محسوس کر رہی تھی۔

''دادا جی..... گرمی اتنی تھی..... اندر..... نیند نہیں آ رہی تھی.....''

دادا نے سچویشن کو نظر انداز کر دیا..... ''میں صندل کے شربت کی تلاش میں نکلنا چاہ رہا تھا لیکن قلفی تو اور بھی اچھا خیال ہے.....''

''آپ بھی کھائیں گے دادا ابا.....''

''ضرور ضرور..... لیکن بھائی ہم تو ملائی کی برف کے گاہک ہیں۔ گرم پنی میں لپٹی ہوئی سبز چکنے پتے پر رکھی ہوئی دھری.....''

''میں ابھی لاتا ہوں.....'' پیشتر اس کے کہ کوئی اسے کچھ بتاتا وہ تپتی بجری پر قدم مارتا بھاگ گیا۔

''میرے کمرے میں لے آنا گوگو شاباش.....''

دادا ابا آگے آگے اور وہ دونوں چوروں کی طرح پیچھے پیچھے چل دیے۔

دادا کے کمرے میں ایک بہت پرانا بھاری رائٹنگ میز تھا جس پر کتابیں' بوتلیں' پڑیاں' قلم' ٹوپیاں' جائے نماز' تسبیح' جرابیں' چاقو' قلم تراش جانے کتنا کچھ پڑا تھا۔ دادا ابا بڑے آرام سے اپنے مطلب کی چیز اس مچھلی بازار سے نکال لیتے تھے۔ اسی لیے کسی کو یہ میز صاف کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد کی لمبی کھڑکی دو صوفے اور ایک نواڑی پلنگ کے علاوہ ایک لمبی الماری دیوار میں لگی تھی۔ اس کے علاوہ دیواروں پر کھونٹیاں' کیل ٹھکے ہوئے تھے جن پر اچکنیں' شلواریں' قمیضیں ہمیشہ لدی رہتی تھیں۔ جب بہاری لال بریشا آتا تو ابا اپنے کپڑے خود دھلائی کے لیے دیتے۔ ساجدہ ماں کو حکم نہیں تھا کہ گندے کپڑے اتار کر دھوبی کو دے دے۔ صفائی والی لڑکی نہالو جھاڑو پھیر کر صرف بستر کی چادر میں سے سلوٹیں نکال دیتی' تکیہ اٹھانے کا اسے بھی حکم نہ تھا۔

دادا جی اپنے پلنگ پر کسی کو بیٹھنے نہ دیتے تھے۔ ان کی ایک کائنات تکیے کے تلے سیف کی طرح محفوظ تھی۔ پرانی چابیاں' کیش' میمو' لوگوں کے ایڈریس' نیل کٹر' سوئی دھاگہ' قینچی' چورن' چھوٹی چھوٹی ضرورت کی تمام چیزیں وہ تکیے تلے رکھتے تھے۔

چارپائی پر بیٹھ کر انہوں نے شاہد کو صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا..... راحیلہ چپ چاپ کھڑکی کی سل پر جا کر بیٹھ گئی۔

اپنی خفت مٹانے کے لیے شاہد بولا..... ''دادا جی! ابھی جب میں گھر سے نکلا تو چوکیدار کہہ رہا تھا کہ کرفیو لگنے کو ہے۔ آخر یہ کیا ہو رہا ہے دادا جی..... بنے گا کیا ہندوستان کا.....''

''بنے گا تو وہی جو ہندوستان کا ہندو چاہے گا..... اکثریت ہمیشہ دباؤ ڈالنے کی پوزیشن میں ہوتی ہے لیکن ہندو کی نیت ٹھیک نہیں۔ وہ اندر سے ہندو راج چاہتا ہے۔ وشال بھارت کے خواب دیکھ رہا ہے اور بظاہر گاندھی جیسے لیڈر مسلمانوں کو مغالطے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے سکھوں کو بھی سبز باغ دکھا رکھے ہیں۔ ہندو جاتی کے سامنے ایک ہی خواب ہے اور وہ ہے..... ہندو راج کا.....''

شاہد نے سر ہلا کر انکار کرتے ہوئے کہا..... "دادا جی! لیکن پاکستان کا نعرہ تو مسلمان لگا رہے ہیں۔ آگے تو ہم ہونا چاہتے ہیں..... باہر نکل کر تو دیکھیے کیسا کیسا جلوس نکل رہا ہے۔"

دادا نے گیلے تولیے کو سر سے اتارتے ہوئے کہا..... "یہی تو مشکل ہے کہ تم لوگوں کو سوچنے کی عادت نہیں۔ تم شروع سے مسئلے کو دیکھنے کے بجائے کہیں درمیان میں سے بات کو پکڑ لیتے ہو..... یہی وجہ تھی کہ مسلمان ہندو کی نیت کو شروع سے سمجھ نہیں پائے۔ ہم تو بھائی علی گڑھ کالج میں پڑھے۔ سر سید احمد خاں کے نظریات کی پیروی کی..... وہ بھی پہلے کانگریس کے دلدادہ تھے۔ پھر کیوں علیحدہ ہوئے..... سرحدی گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد اپنی تمام تر فراست کے باوجود کانگریس کا ساتھ ہی دیتے رہے۔ ہندو کی چالیں نہ سمجھ پائے..... ہاں پوری طرح سے جو کسی کی آنکھیں کھلیں تو وہ قائد اعظم ہے۔"

اس وقت قیصر کی موجودگی نے راحیلہ کو دادا ابا کی تقریر سے بے نیاز کر رکھا تھا لیکن صوفے میں دھنسے اسے دادا ابا کی ساری باتیں یاد آ رہی تھیں۔ یہ باتیں دادا اٹھتے بیٹھتے کیا کرتے تھے۔ گھر والوں کو ان کا متن بھی یاد ہو گیا تھا لیکن تب وہ نظریں جھکائے شاہد کے گھٹنے، تھمیں، ہاتھ اور بڑے بڑے جوتے دیکھتی رہی۔ پھر ٹوٹو ماتی کی برف جیسے جوتوں پر ڈلوا کر لے آیا۔ راحیلہ نے سوچا آج تو دعائیں قبول ہونے کا دن ہے۔ دادا جی کی لمبی باتیں بھی دعا کا ایک حصہ بن گئی تھیں۔ اُسے شاہد کے پاس یوں بیٹھنا کہاں نصیب ہوتا تھا۔

پھر راحیلہ نے زینتھ کے ریڈیو کا سوئچ انگلیوں میں پھرایا۔ سبز روشنی اندر سے نکلنے لگی۔

اب تو دعائیں مانگے بھی ایک عرصہ ہو گیا ہے..... تب تو بن مانگے دعا بھی قبول ہو جایا کرتی تھی۔ چند لمحے سوئی پھرتی رہی۔ پھر مہاجرین کے پیام سنائی دینے لگے..... راحیلہ نے ہاتھ ناب سے اٹھا لیا۔

"سرداراں دختر عمر دین درزی ساکن کرنال..... عمر اٹھارہ سال رنگ گندمی..... کاسنی قمیض پہنے ہوئے۔ اس فون نمبر پر اطلاع دیں۔ 283511"

راحیلہ نے جلدی سے سوئچ بند کر دیا اور زیر لب بڑبڑائی۔

"پیام..... پیام..... پیام....."

اور کہاں تھے..... ساجدہ ماں، دادا جان..... ابی..... تسنیم آپا، ٹوٹو اور..... اور

وہ ان مہاجروں کے پیام سن کر تھک گئی تھی اور یہ پیام گویا اب اس کا تمسخر اڑاتے تھے..... کون جانے یہ سب کس انجام کو پہنچے..... شاید تسنیم اغوا ہو گئی ہو؟..... ہو سکتا ہے شاہد زخموں سے چور کسی ہسپتال میں دم توڑ گیا ہو۔ شوکت بھائی کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور اب وہ بیساکھی کے سہارے چلتے ہیں؟ ساجدہ ماں..... ابو..... دادا جی..... کون؟ کہاں..... کب تک اب ان لاشوں کے کیا پیام آئیں؟ اگر وہ زندہ بھی بچ گئے تو کیا اندر ثابت و سالم ہوں گے۔ اتنے تکلیف دہ تجربے سے نکل کر کیا کوئی شخص اپنی اصلیت باقی رکھ سکتا ہے؟

راحیلہ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر سوچا کہ مجھے اب کسی کام وام کے لیے باہر جانا چاہیے ورنہ یوں سوچتے سوچتے میں پاگل ہو جاؤں گی؟ پھر اس نے گودی میں بڑھے پیٹ کو دیکھ کر اپنے سے کہا "اب ایسی حالت میں تو پھاٹک پار بھی جایا نہیں جا سکتا..... پھر اب کیا کیا جائے..... کیسے ان خیالات سے پیچھا چھڑایا جائے جو ہر لمحہ [illegible]

کی طرح دھادا بولتے رہتے ہیں۔

قیصر دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"کیا بن رہا ہے بیگم صاحب..... ناں سچ بی بی جی....."

وہ دونوں ہنس دیئے۔

"طبیعت کیسی ہے؟" قیصر اس کے پاس ذرا دور ہو کر بیٹھ گیا۔

"آج میں نے اپنے نام ایک دکان الاٹ کرائی ہے۔ بہت لمبا چوڑا اسٹاک اندر موجود ہے۔ انشاء اللہ جلد چابی مل جائے گی۔"

راحیلہ نے سن رکھا تھا کہ پراپرٹی Evacuee صرف مہاجرین کے نام الاٹ کی جائے گی۔ سب چلتا ہے۔ اس نے دل میں سوچا سب کچھ ہوتا ہے..... اچھے آدمی کا برا سفر..... برے آدمی کا اچھا فعل..... انسان اپنے عمل کے ردعمل کو روک نہیں سکتا..... اور دکھ کی یہ بات تھی کہ بسا اوقات اچھے آدمی کا نیک عمل برائی کے دہانے پر لے جاتا۔ دکان کی الاٹمنٹ قیصر نے فقط راحیلہ کو خوش کرنے کے لیے کرائی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ دنیا بھر کی نعمتیں جائز و ناجائز راحیلہ کے قدموں میں ڈھیر کر دے۔

"راحیلہ....."

"جی....."

"بڑی خاموش ہو آج۔"

"نہیں جی..... میں سن رہی تھی....."

"خیر چھوڑ اس قصے کو..... دکان تو میں نے اس نیت سے الاٹ کرائی کہ اگر میں کہیں..... میں بوڑھا آدمی ہوں ناں..... تمہاری سکیورٹی کا انتظام پورا ہونا چاہیے۔ میں رہوں نہ رہوں....."

"آپ ایسی باتیں کیوں سوچتے ہیں....."

"مجھے سمجھنے کے لیے تمہیں نہ صرف مجھے سمجھنا پڑے گا بلکہ میرے سارے ماضی کو بھی جاننا پڑے گا جس پر تمہاری نظر نہیں رہی....."

"میں کوشش کر رہی ہوں....."

"مجھے اعتراف ہے..... کہ..... کہ تم نے ایک نئے وطن میں قدم دھرا ہے..... تم دو محبتوں میں گرفتار ہو..... اس دیس کی ہوائیں جہاں تمہارا بچپن گزرا..... یہ محبت نیچرل تھی۔ انسان کبھی اپنے بچپن سے سبکدوش نہیں ہوتا..... اور یہ Nostalgia اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ بڑھاپے میں پھر عود کر آتا ہے۔ آدمی بچہ بن کر ماضی میں لوٹ جاتا ہے....."

راحیلہ نے جھرجھری لی.....

"لیکن ایک وطن یہ بھی ہے جس نے تمہیں پناہ دی..... آزادی بخشی..... اس کی محبت شاید ابھی پیدا نہ ہوئی ہو لیکن رفتہ رفتہ..... تمہیں اس سکیورٹی سے بڑا پیار ہو جائے گا..... شاید ہندوستان کی ہندو اکثریت میں تمہاری ذات گم ہو

جاتی..... تم بڑے چھتنارے درخت کے تلے بڑھ نہ سکنے والی پنیری کی موت مر جاتیں..... اگر تم نے اس وطن اور مجھے دل سے قبول کر لیا تو..... ہم تمہارے بڑے کام آئیں گے....."

"آپ تو بہت سنجیدہ ہو گئے قیصر؟....."

"اچھا چھوڑو کوئی اور بات کرتے ہیں۔"

"آپ اتنی دیر سے نہ آیا کریں..... میں جانتی ہوں دوسروں کے دکھ درد میں شامل رہنا چاہیے..... لیکن....."

"سنو راحیلہ۔ میں تو سارا دن تمہارے پاس رہنا چاہتا ہوں لیکن مجھے اپنی محبت سے ڈر لگتا ہے..... کافی سارا..... سنا ہے مرد کی محبت سے عورت ناجائز فائدہ اٹھاتی ہے....."

"تو کیا مرد عورت کی محبت سے فائدہ نہیں اٹھاتا؟ کیا جائز' کیا ناجائز؟"

"آہا..... جب تم یوں کڑک کر بولتی ہو تو بہت اچھی لگتی ہو راحیلہ....."

راحیلہ نے نگاہیں جھکا لیں۔

"تم میں دوئی ہے' تم ابھی پچھلے وطن اور نئے وطن میں فیصلہ نہیں کر پائیں..... لیکن میں نے پوری آزادی سے اپنے سارے وجود کے ساتھ تمہیں قبول کیا ہے۔ میں بھی مدینے کی خوش اطوار عورتوں کی طرح دف بجا کر تمہارے اردگرد چکر لگا کر اونچی آواز میں کہنا چاہتا ہوں کہ تم اچانک نکل آنے والا چاند ہو..... تم نے ہم جیسے مردہ لوگوں کو یکدم اپنی روح کی نیکی سے آشنا کر دیا ہے..... اگر تم نے اس خطہ زمین کو قبول کر لیا تو ہم تمہارے قدموں میں اپنا سب کچھ نچھاور کر دیں گے..... گھر..... بار..... دولت..... جسم' روح..... لیکن اگر وقت گزر جانے پر مہاجر ہی رہیں تو شاید ہماری کھلی بانہیں دیر تک تمہاری راہ نہ دیکھ سکیں۔"

راحیلہ نے حیران نظروں سے قیصر کو تکنا شروع کر دیا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ راحیلہ نے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ اس کا جی چاہا کہ اتنا روئے کہ سارا ماضی ان آنسوؤں میں بہہ جائے۔ وہ قیصر کا سہارا یہ سمجھ کر نہ اپنائے کہ وہ اس کا شوہر ہے بلکہ ایک نیک انسان جو دل سے ہمدرد ہے' اس Exodus نے اس کے لاشعور سے جو ہمدردی جگائی ہے' اس کی معترف ہو۔

"اور..... اور..... وہ بچہ جو..... تمہارا نہیں....."

قیصر نے اس کا سر تھپکتے ہوئے سانسوں میں کہا..... "جب میں نے تمہارا علاج شروع کیا تھا..... کیمپ میں تبھی مجھے یقین تھا کہ آنے والی سائیکی اپنا مقام بنا چکی ہے۔ پھر بلڈ رپورٹ سے شبہ جاتا رہا..... پہلے میرا خیال تھا کہ بچے سے تمہیں آزاد کر دیا جائے۔ میں نے لیڈی ڈاکٹر سے طے بھی کر لیا تھا..... لیکن پتہ نہیں کیوں میرا دل نہ مانا..... بچہ تو اسی کا ہے..... راحیلہ جس کے پلنگ پر وہ پیدا ہوتا ہے..... پھر جھگڑا کیسا ہے؟ ارسلان قیصر..... تو میرا بیٹا ہے..... میرے پلنگ کی زینت..... جانتی ہو ناں..... مال اور بیٹا دنیا کی زینت ہیں..... میں چھوٹا آدمی ہوں' اس زینت کو اپنے ہاتھ سے کیسے گنوا سکتا ہوں....."

آنسو راحیلہ کی آنکھوں سے بہنے لگے..... یہ کیسا آدمی تھا..... وہ تو ابھی تک بچے کی آمد پر مسرت محسوس نہ کر سکی

تھی۔ماں ہو کر بھی اس نے ماں کے دل سے نہ سوچا تھا۔

"تمہاری محبت میں ایک خاص قسم کی تشنگی ہے۔میں پورے طور پر تمہیں اپنا نہیں کہہ سکتا.....لیکن ارسلان تو میرا ہوگا سارے کا سارا.....میں یہ سوچنا نہیں چاہتا کہ تمہیں پا کر میں نے کیا کھویا کیا پایا....."

قیصر بولے جا رہا تھا اور راحیلہ سوچ رہی تھی کہ کاش کہنے سننے سے لوگ ایک دوسرے کے ہو سکتے۔اگر یوں ممکن ہوتا تو کتنی الجھنیں کم ہوتیں.....کاش محبت ملاقاتوں کی مرہون منت ہوتی.....کاش محبت گفتگو کے بغیر سانس نہ لے سکتی.....اگر ایسا ہو سکتا تو ان کے وعدے اتنے مبہم اور غیر واضح ہونے کے باوجود اتنے مضبوط نہ ہوتے!.....محبت کا شعوری ادراک تو بڑی معمولی چیز تھی۔یہ تو کہیں لاشعور میں جنم لیتی ہوگی اور وہیں گپت انداز میں پروان چڑھتی ہوں گی۔ شعوری طریقوں سے تو اسے زندہ کرنا اور بچانا بیکار تھا بلکہ شعوری ہتھکنڈوں سے نہ یہ پیدا ہوتی تھی نہ مرتی تھی۔

زینو نے پردے علیحدہ کر کے اونچی آواز میں کہا....."بیگم صاحب! ناچ بی بی جی۔کھانا تیار ہے۔"

راحیلہ نے جلدی سے قیصر کے کندھے سے سر اٹھایا اور اپنی شال ٹھیک کرنے لگی۔

"کیوں قیصر جی! کیا خیال ہے کھانا کھائیں پھر؟"

"جیسی تمہاری مرضی.....چلو چلتے ہیں۔"

"چلو اچھو کھانا ہم آ رہے ہیں....."

جاتے جاتے زینو نے پردے سے تھوڑے ہاتھ بھی پونچھ لیے۔

"ارے! ایک بات تو میں بھول ہی گیا.....ارے بھئی کچھ کھلاؤ تو تمہیں ایک بات بتائیں۔"

"جی؟....."

"کوئی مٹھائی وٹھائی....."قیصر جلدی سے بولا۔

"آخر کیا بات ہے؟"راحیلہ سر وائیں بائیں ہلا کر بولی۔گول گول رنگ اس کے کانوں میں ملنے لگے۔

"ابھی پہلے مٹھائی....."قیصر بولا۔بظاہر وہ بشاش نظر آتا تھا لیکن اس کی آواز میں تشویش کی آمیزش تھی۔

"ضرور کھلاؤں گی مٹھائی پر آپ بتایئے تو سہی....."

خوف کا Hynas اس کے دل میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"پہلے وعدہ کرو....."

"وعدہ رہا....."

"پکا وعدہ ناں....."

"جی پکا وعدہ۔"

"تو پھر لاؤ ہاتھ....."

قیصر نے آگے ہاتھ بڑھا کر راحیلہ کے ہاتھ کو گرفت میں لے لیا.....راحیلہ مجسم استفسار بن کر اس کا چہرہ تکتی رہی۔

''آج مجھے ایک بہت ہی پیارا شخص ملا۔ دراز قد سرخ و سپید سنہری بال پورا گریک شہزادہ۔ وہ..... نجم کے دفتر میں بیٹھا تھا۔''

''کیمپ میں.....؟''

''نجم کہیں گیا ہوا تھا.....''

''شوکت مغل؟.....''

''نہیں اس نے اپنا نام کچھ اور بتایا تھا۔ میں بھول گیا..... زاہد عباس شاید..... عباس لازمی حصہ تھا اس کے نام کا..... وہ لوگ منٹگمری میں اقامت پذیر ہیں۔ باتوں میں پتہ چلا کہ وہ تو تمہارا دور پار سے رشتہ دار بھی ہے..... میں نے اس سے کہا کہ تم سے ضرور ملے..... بڑی لمبی باتیں ہوئیں..... وہ آئے گا کسی دن تم سے ملنے۔ آج تو وہ واپس جارہا تھا منٹگمری لیکن اگلے چکر پر ضرور آئے گا..... ہاں یاد آیا۔ اس کا نام شاہد عباس ہے۔ کیا حسن اتفاق ہے۔ اگر میں چند لمحے اور نہ جاتا وہاں تو اس سے ملاقات ہی نہ ہو سکتی۔''

راحیلہ نے منہ پرے کرلیا۔ اب اسے اپنے آنسوؤں پر اتنا بھی تو اختیار نہ تھا۔

لالو نے جیب سے چھوٹی سی بیڑی نکالی اسے سلگایا اور مردوں کی طرح چنگی میں پکڑ کر لذت سے پینے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ بابا فضل چلم کے انگار لینے نیچے باورچی خانے میں چلا گیا ہے۔ لالو کو اپنی خوش قسمتی پر بڑی خوشی تھی۔ دس برس کا لڑکا جب چک چھ بٹا گیارہ سے نکلا تھا تو اسے پتہ نہیں تھا کہ اسے کہاں جانا ہے' کیوں جانا ہے؟ اس کا چاچا' چاچی اور بچے چند دن ہوئے اچانک کہیں نکل گئے تھے۔ وہ چھوٹے سے گھر میں اکیلا سوتا رہ گیا تھا۔ جب صبح اٹھ کر اس نے لوگوں سے پوچھا تو لوگ گاؤں چھوڑ کر جانے کے لیے کچے راستے پر آگے پیچھے تیار کھڑے تھے۔ عورتوں نے سر پر گٹھڑیاں' کمر پر بچے اور دل میں بڑے بھاری جدائی کے غم اٹھا رکھے تھے۔ مرد پرعزم نظر آتے تھے اور پلٹ پلٹ کر اپنے کھیتوں کی جانب دیکھتے تھے..... وہ گھریلو سامان اٹھانے کے باوجود خالی ہاتھ نظر آتے تھے۔ بوڑھے آدمی بوڑھی ہڈیوں کو کسی حفاظت والی جگہ پہنچا کر کسی کھاٹ پر پڑ رہنا چاہتے تھے۔ کچھ بوڑھے بوڑھیاں گاؤں میں ہی رہ گئے تھے۔ کچھ جوانوں نے بھی اس دھرتی کو اس لیے نہ چھوڑا کہ ان کے نزدیک یہ بے وفائی تھی۔ گاؤں والے صدیوں سے رہٹ تھے غلام تھے۔ انہوں نے آزادی کا سکھ اور خوشی خواب میں بھی نہ دیکھی تھی۔ اسی لیے وہ زنجیر پا رہنے پر مجبور تھے۔ گاؤں کے کتے اور لالو چودری سے قافلے میں شامل ہوئے۔ چند کتوں نے تو مالکوں کا ساتھ دیا باقی سارا راستہ چلنے کو تیار نہ تھے لوٹ گئے..... لالو ہاتھ میں لمبی چھڑی پکڑے درختوں کے تنے کاٹتا' شاخوں کے پتے جھاڑتا قافلے سے کچھ پیچھے چلتا گیا۔

لالو دس برس کا لڑکا تھا۔ اس کا رنگ ہر موسم میں بدل جاتا۔ برسات میں سیاہ' خزاں میں گندمی' سردیوں میں سرخی مائل سفید۔ بال بھورے تھے ناک نیولے کی سی۔ وہ چھوٹی سی عمر میں حالات کے ہاتھوں سیانا ہو چکا تھا۔ والدین کے مرنے کے بعد وہ چاچا کی نگرانی میں چلا گیا۔ چاچا کے گھر میں اس کی عجیب سی پوزیشن تھی۔ نہ اسے یتیم سمجھ کر کوئی ترس کھاتا۔ نہ ہی سوتیلوں کی طرح اس پر ظلم ہوتا..... نہ اس سے کوئی امید لگائی گئی نہ ہی اسے کوئی ایسی توفیق ملی تھی کہ وہ گھر میں اپنی جگہ بنا سکتا۔ وہ ایک ایسی چارپائی تھا جس کی ادوائن نکال دی گئی ہو۔ نہ بچھانے کے قابل نہ نکال دینے جوگی..... چھوٹی

عمر میں وہ بھینسوں کو نہلاتا' چارہ کاٹتا' گوتاوا کرتا' چھڑی لے کر اجڑ کو نہر تک لے جانے کا بھی عادی ہو گیا تھا۔ چاچی نہ اس سے پیار کرتی تھی نہ جھڑکتی تھی۔ اس کے چچازاد بہن بھائی نہ اس کے ساتھ بولتے نہ کھیلتے۔ وہ سات برس کا تھا جب اس نے نہر کو جانے والے راستے پر سے اٹھا اٹھا کر سگریٹ پینا شروع کر دیا تھا۔ ایک دن اس کے چاچا نے اسے سگریٹ پیتے دیکھ لیا تو نہ اسے مارا نہ ہی جھڑکیاں دیں..... پاس بلا کر چارپائی پر بٹھایا۔ بڑی دیر تک چاچا سگریٹ پیتا رہا' پھر بولا.....

''لال دین..... یہ دیکھ سگریٹ پی پی کر میری انگلیاں کیسری ہو گئی ہیں..... یہ دیکھ میرے دانت دھوئیں سے کالے ہیں۔ پر اللہ کی قدرت ہے۔ میرے دونوں بیٹے سگریٹ نہیں پیتے..... وجہ میں جانتا ہوں۔''

''کیا وجہ ہے چاچا جی؟.....''

''بس وجہ اتنی ہے کہ جو لوگ اکلاپے کو بہت زیادہ دل کو لگاتے ہیں ناں وہ سگریٹ کو دوست بنا لیتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ..... تجھے گھر تو مل گیا لیکن یہاں تیرا کوئی اپنا ہے نہیں..... تیرا تو تکیہ بھی اپنا نہیں..... ہو سکے تو لالو..... اس چندری سگریٹ کو ہاتھ نہ لگانا۔ ایک بار یہ لت لگ جائے تو پھر چھوٹتی نہیں.....'' پھر چاچے نے اپنی سگریٹ کی ڈبیا اس کو دے کر کہا.....'' اور جو دل نہ مانے تو یہ کچھ سگریٹیں ہیں دیے کو بیلے کے لیے..... لے۔''

چاچے کی اس چھوٹی سی نوازش نے لالو کے دل میں جگہ بنالی لیکن اس واقعے کے بعد وہ ایک دوسرے سے کبھی نہ بولے۔ نہ تخلیے میں نہ سب کے سامنے..... کبھی کبھی لالو کو لگتا وہ گونگا ہے۔ اس کے دل میں کئی قسم کے خیالات اٹھتے۔ وہ اپنے والدین کی باتیں کسی سے کرنا چاہتا تھا لیکن گھر والے اس ٹاپک پر چپ تھے۔ جس طرح انھوں نے لالو کے باپ کی زمین میں چپ چاپ ہل چلانا شروع کر دیا تھا' ایسے ہی وہ بلا اعتراف لالو کے ضامن تھے۔

لالو ذہین لڑکا تھا۔ جب اسے بولنے سے محروم کر دیا گیا تو وہ سننے میں ماہر ہو گیا۔ وہ بڑی جلدی اور دور کی آواز بھی صاف سن لیتا۔ اپنی طرز کے نتائج برآمد کر لیتا اور سنے ہوئے مواد سے اپنے راستے نکال لیتا۔ جب لالو قافلے کے ساتھ رینگتا' روٹی مانگتا' سگریٹ کے ٹوٹے پیتا والٹن کے کیمپ میں پہنچا تو اس پر واضح ہو چکا تھا کہ وہ اللہ میاں کی مرضی سے اس خطۂ زمین پر جان بچا کر آ گیا ہے ورنہ چک چھ بٹا گیارہ میں تو اب تک جتھوں میں سارے گاؤں والوں کو قتل کر دیا تھا۔ سارے قافلے میں گھوم پھر کر لالو نے چاچے کو تلاش کیا۔ غالباً چاچا بہت پہلے نکل گیا اور اب اسے تلاش کرنا بیکار تھا۔ ویسے بھی لالو نہ اپنے ماں باپ کی قبروں پر جایا کرتا تھا نہ ہی کبھی اس کے دل میں چاچے کو تلاش کرنے کا خیال آیا۔ وہ اپنے ہی رحم و کرم پر اپنی ہی ذہانت کے سہارے کیمپ میں دن رات بسر کرنے لگا۔

قیصر منزل میں پہنچ کر ایک بار پھر وہ اکیلا تھا۔ ڈاکٹر قیصر اسے کیمپ سے واگزار کر کے لے آیا تھا لیکن گھر میں اس کا کیا مصرف ہو گا اور اس کی اندر کی ضرورتیں کیسے پوری کی جائیں گی۔ اس کے متعلق قیصر نے نہ سوچا۔ اس کے تین گودام سامان سے بھرے تھے۔ بابا فضل..... لالو..... شاید راحیلہ بھی اس سامان میں اضافہ تھا۔ قیصر کو معلوم نہ تھا کہ انسان تو ہر لحظہ توجہ کا طالب ہے..... اگر انسان کی توجہ نہ ملے تو پھر وہ اللہ سے توجہ مانگنے لگتا ہے..... لیکن سورج بغیر یہ سورج مکھی پھلتا پھولتا نہیں۔

لالو صوفے پر بیٹھا بیڑی پینے میں مشغول تھا۔ جب بابا فضل اچانک غسل خانے سے برآمد ہوا.....

"اوئے سو بار تجھے کہا ہے کہ سگریٹ نہ پی نہ پی.....تو باز ہی نہیں آتا کنجرا۔"

"کیوں بابا جی.....آپ نے جوانی میں سگریٹ نہیں پیئے....."

"نہیں....."

"تو آپ سکھ ہیں؟"

"نہیں....."

"ہماری چاچی بتایا کرتی تھی کہ سکھ لوگ بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ کوئی سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگاتا۔"

"میں تو لالو بیٹا! سکھ نہیں ہوں' سکھ لوگوں کا دوست ہوں۔ ان کا دین دار ہوں۔ جب یہ الٹ سیدھ ہوئی ناں تو میں نے گوردوارے میں پناہ لی تھی.....بڑے مان دیئے گرنتھی نے مجھے۔ خود واہگہ بارڈر چھوڑ کر گئے.....میرے ساتھ دو اور بھی تھے۔ بابا نانک کے مہمان تھے ہم تینوں۔"

"کبھی آپ کہتے ہیں آپ اور بی بی راحیلہ اکٹھے آئے تھے گورداسپور سے.....سیدھے والٹن کیمپ سے۔ کبھی آپ کہتے ہیں آپ کو گرنتھی جی چھوڑ گئے واہگہ بارڈر پر....."

"لے کڈھ بھر تیرا قد نہیں اور گتھیاں کیسی نکالتا ہے؟ اوئے آدمی چل کے واہگے سے والٹن نہیں پہنچ سکتا کبھی؟"

"بی بی راحیلہ بھی ساتھ چلتی گئی تیرے۔ وہ تو اتنی بیمار تھی' اتنی بیمار تھی۔ زینو ماسی کہتی ہے چارپائی پر ڈال کر لائے تھے ڈاکٹر صاحب....."

"ہے نا وکیل کہیں کا.....جب ہم دھی پیو واہگہ پہنچے تب راحیلہ تگڑی تھی' سنڈے جیسی۔ کوئی بیماری شماری نہیں تھی اسے۔"

جب سے بابا فضل نے وکیل کو اوکی جگہ اپنا انگوٹھا لگایا' تب سے وہ چوبارے کے اس آراستہ کمرے میں جہاں راحیلہ نکاح سے پہلے رہتی تھی' مستقل طور پر رہنے لگا۔ وہ سچ مچ اپنے آپ کو راحیلہ کا والد سمجھنے لگا تھا۔ پہلے ڈاکٹر قیصر والٹن کیمپ سے واپسی پر کچھ دیر کے لیے اس کے پاس آ کر بیٹھتا' اس کے تجربات سنتا۔ رفتہ رفتہ ان ملاقاتوں میں ناغے ہونے لگے اور اس کے بعد وہ بھی گودام کے بھولے بسرے سامان میں سے ایک ہو گیا۔ راحیلہ بالائی منزل تک نہ آتی تھی۔ جب بھی بابا فضل روٹی لینے یا چلم میں انگارے بھرنے باورچی خانے میں جاتا' اس کی ملاقات شاذ ہی راحیلہ سے ہوتی۔ جب بھی بابا راحیلہ سے ملنے کی کوشش کرتا' زینو ٹال دیتی.....اس گھر میں وہ بھی بھولی بسری یاد کی طرح بھٹکتا پھرتا۔ اب ڈاکٹر قیصر کیمپ سے لالو کو پکڑ لایا تھا جو چہرے سے فرشتوں کی طرح معصوم اور اندر سے ریچھ کی طرح پکا اور چالاک تھا.....

زینو کی زبانی لالو معلوم کر چکا تھا کہ راحیلہ اصل میں بابا فضل کی بیٹی نہ تھی۔ اس نے موقع ملتے ہی جرح شروع کر دی۔

"بابا جی.....آپ کی بیٹی اچھی ہے۔ کوئی آپ کا خیال نہیں۔ آپ اوپر پڑے رہتے ہیں۔ وہ نیچے عیش کرتی ہے۔"

''اوئے زمانہ بدل گیا..... نہ پہلے موسم..... نہ پہلی دھرتی نہ پہلے لوگ..... نہ پہلے جیسے ماں باپ کے ادب..... اتنا کچھ بدل گیا تو بیٹی سے کیا پوچھیں لالوجی..... کیا پوچھیں جی؟''

''اچھا..... بابا فضل تیری ذات کیا ہے؟..... میں تو کانجو ہوں..... تیری کیا ذات ہے؟''

''میں..... راجپوت بڑی اجت والا..... میری مونچھیں نہیں دیکھیں تو نے.....''

''نہ تیرا مہاندرا ملے باجی سے نہ ذات..... وہ مغل تُو راجپوت پھر بھی تو کہتا جائے میں باپ ہوں باجی کا.....''

اب بابا فضل ہارا ہوا محسوس کرنے لگا۔ اسے لگا واقعی اس کا اس نئے گھر پر نہ کوئی حق ہے نہ دعویٰ۔ وہ ایسے ہی بدو بدی مان نہ مان میں تیرا مہمان بنا ہوا ہے۔ اس احساسِ شکست کے باوجود وہ بالشت بھر لڑکے سے ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔

''یار یہ ہمارا نیا وطن ہے ناں۔ پچھلے رشتے ناطے ٹنگ منگا ہوئے۔ یہاں آ کر نئے سنگی ساتھی بنے ہیں۔ نئے ماں پیو نئے سنگی ساتھی۔ میرے پاس آ کر بات سن۔ بابا قائداعظم ہمیں کس لیے گھسیٹ کر یہاں لائے؟ یہاں کوئی ذات پات نہیں ہوتی' سب برابر ہوتے ہیں۔ سارے مسلمان۔ مدینے کے مالکؐ نے کہہ دیا تھا..... کالے گورے سب برابر..... کوئی عجم کا ہو کوئی عرب کا..... سب ایک جیسے۔ آج کے بعد تو نے بھی کسی کو یہ نہیں بتانا تو کس ضلع سے آیا ہے..... تیری کون سی ذات ہے۔ بابے قائداعظم نے یہی تو ایک کام کیا ہے۔ ساری مخلوق رلا ملا دی ہے..... سب کو ایک ساتھ مل پھیر کر بتا دیا ہے کہ اس دیس میں اونچ نیچ نہیں ہوتی..... یہاں راجپوت مغل کچھ نہیں رہتا..... ہم ہندو رسم و رواج پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ ہم نے ذات پات کے ہاتھوں بڑی مار کھائی ہے۔ ملیچھ دلت' اچھوت کہلائے ہیں۔ اب اس پاک وطن میں سب نے برابر ہونا ہے' برابری دینی ہے اور لینی ہے.....''

''اوئے کملیا بابا..... میرا چاچا کہتا تھا..... کبھی کسی گورے نے بھی کالے سے پیار کیا؟ کبھی کسی امیر نے بھی کسی غریب کو اپنے برابر سمجھا؟..... کبھی کسی پڑھے لکھے نے بھی ان پڑھ کو اپنے جیسا سمجھا؟ میں نے تو اتنی عمر میں سب سارا سبق پڑھ لیا' تیرے چہرے پر اتنی لکیریں پڑ گئیں اور تو اتنی بات نہیں سمجھا کہ ادھر اس دھرتی پر سب کچھ مل جاتا ہے' برابری نہیں ملتی..... راجپوت نے راجپوت رہنا..... سید مغل پٹھان نے یہی کچھ رہنا ہے..... مہاجر نے اپنا آپ مہاجر بنائے رکھنا ہے۔ دیس والوں کو اپنی آکڑ نہیں بھولنی..... آگے چل کر تو دیکھ لینا بابا فضل..... سارا کچھ ہو جاتا ہے پر برابری نہیں ہوتی.....''

چھوٹے سے لڑکے کے منہ سے یہ باتیں سن کر بابا فضل چکرا گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر اتنا چھوٹا بچہ ایسی گہری بات سمجھ گیا ہے تو پھر وہ ابھی تک یہ کیوں نہیں سمجھ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ کیمپ میں باجی کے سر پر پہرہ دینے کے عوض واقعی وہ باجی کی زندگی میں کوئی اہم مقام حاصل کر چکا ہے۔ وہ انسانی سائیکی سے ناواقف تھا۔ بندہ تو رب کا دیر تک شکر گزار نہیں رہ سکتا تو بندے کے احسانات بھلانے میں کونسی دیر لگتی ہے۔ بابا فضل عجیب طرح کے غصے اور کینے سے بھرتا چلا جا رہا تھا۔

''لے بھئی لالو..... یہ لے پانچ روپے اور جا کر میرے لیے تمبا کو لے آ..... دیکھ سوکھا تمبا کو لانا..... گیلی گئی نہ پکڑ لانا..... جا شاباش۔''

''اور میں اپنے لیے ایک ڈبی سگریٹ کی بھی لے آؤں بابا.....''

''چل لے آ..... پوری ڈبی نہیں آدھی.....''

"اچھا چل آدھی سہی تو بڑا کنجوس ہے بابا فضل....."

جب لالو تمبا کو لینے چلا گیا تو بابے نے الماری کھول کر ایک بڑی چادر اٹھائی۔ اس میں جو کچھ بھی اسے قابل استعمال یا قابل سرقہ نظر آیا اس نے گٹھڑی میں ڈالا۔ درازوں میں سے قینچی' نیل کٹر' روئی کا نیا' دوائیاں' نقدی اور جو بھی نظر پڑا اس نے گٹھڑی میں باندھ کر ایک مضبوط گانٹھ باندھی۔ پھر گلی میں کھلنے والی کھڑکی میں سے اس گٹھڑی کو نیچے پھینک دیا۔ اسے یقین تھا کہ اس وقت گھر کے پچھواڑے زیادہ آمد و رفت نہیں ہوتی۔ پھر بابا فضل نے آرام سے اپنا چھوٹا سا حقہ اٹھایا اور نیچے اتر گیا۔

"آج بڑی دیر لگا دی۔ چلم دھرنے نہیں آئے بابا جی....."

"بس کچھ دیر ہی ہو گئی....."

"میں تو سمجھی سو رہے ہیں....."

"بس سوتا ہی رہ گیا....."

"آج تو لالو بھی ناشتے کے لیے نہیں اترا....."

"بھائی مرضی کا مالک ہے.....لا چمٹا پکڑا۔"

کچھ دیر بابا فضل چولہے میں سے انگارے جھاڑ جھاڑ کر چلم پر دھرتا رہا۔ پھر آواز گرا کر بولا۔ "بی بی کو اگر فرصت ہو تو بتاؤ میں ملنا چاہتا ہوں۔" آخری بار کو اس نے منہ میں ہی روک لیا۔

"لے ابھی تو مشکل سے بی بی کی آنکھ لگی ہے۔"

جب بھی راحیلہ بابے فضل سے ملتی' وہ اسے کچھ پیسے ضرور دیتی۔ لمبی باتیں کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی لیکن کفالت وہ خوشی سے کرتی تھی۔ جو بھی روپیہ پیسہ زینو کے سامنے کسی دوسرے کو دیا جاتا' زینو کو اس کی تکلیف دیر تک ہوتی۔ اس کا جی چاہتا بی بی جب بھی کچھ گھر سے نکالے اس کا جائز حق دار صرف زینو کو سمجھے۔ اس وقت بھی اس کی منشا یہی تھی کہ نہ فضل بابا بیگم صاحب سے ملے نہ ہی کچھ رقم اس تک پہنچے۔

"نیند کا کیا ہے' پھر آ جائے گی۔ تم دیکھو تو سہی....."

اس وقت پھاٹک کی گھنٹی بجی تو زینو اٹھ کر ادھر چلی گئی۔ غالباً دودھ والا آیا تھا۔ بابے فضل نے زینو کو دیگچی اٹھا کر باہر نکلتے دیکھا۔ پھر صحن سے ہو کر وہ اندر والے برآمدے میں گیا۔ ڈاکٹر قیصر کے بیڈ روم کا دروازہ کھلا تھا۔

"بی بی جی.....راحیلہ بیٹا.....بیگم صاب....."

اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔۔ بابا فضل چق اٹھا کر اندر چلا گیا۔ غسل خانے کا دروازہ بند تھا اور اندر کسی کے نہانے کی آواز آ رہی تھی۔ ابھی تک بابا فضل نہ جانتا تھا کہ وہ اندر کس لیے آیا اور وہ کیا کرنے والا تھا۔ کپڑوں والی الماری کھلی تھی۔ بابا چپکے چپکے اس کی طرف بڑھا.....چھوٹا دراز کھولا.....اس میں جتنی نقدی تھی اسے اپنی دھوتی میں اڑس لیا' پھر ایک چھوٹی سی گٹھڑی اٹھائی اور اسے اپنی جیب میں ڈال لیا.....چھوٹے پھاٹک سے باہر نکل کر وہ گلی میں پچھواڑے گیا اور گٹھڑی اٹھا کر شاہراہ کی جانب چل دیا۔

وہ غصے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھ رہا تھا۔ کل کی لونڈیا اور میرا اتنا فائدہ اٹھایا۔ کیمپ میں سارا وقت اس کے سرہانے بیٹھ کر پہرے دیئے۔ کھانے جوڑ کر لایا' اسے کھلایا اور خود بھوکا رہا اور یہ شکر گزاری دکھائی۔ کام کے نکلتے ہی ملازم سمجھنے لگی..... چلو ملازم تو ہوتے ہی چور ہیں۔ میں نے چوری کر لی تو کونسی بڑی بات کی..... ہم تو ہوئے ہی کم ذات..... ہم تو پیدا ہی نیچ کاموں کے لیے ہوتے ہیں۔ میرا خدا جانتا ہے۔ میری نیت نیک تھی۔ جب میں نے راحیلہ کی مدد کی..... میں تو دو روٹیوں کا طالب تھا۔ گلی میں میری چارپائی ڈال دیتی لیکن باپ سمجھتی.....

بابا تلاوت الوجود میں جتنا گٹھڑی سر پر اٹھائے بڑی سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ ابھی اسے یہ بھی علم نہ تھا کہ اس کی ڈب میں کتنے پیسے ہیں اور زنانہ گٹھڑی کی کیا قیمت لگے گی..... ابھی تو وہ یہی سوچتا جا رہا تھا کہ یہاں پہنچ کر بھی اسے سب نے نیچ سمجھا حالانکہ اس کی نیت اچھی تھی..... اس کے ذہن میں ایک پرانا واقعہ گھوم گیا۔

☆☆☆

راحیلہ کے لیے قیصر منزل میں رہنا ہمہ وقت لرزاں رہنے کے مصداق تھا۔ پہلے وہ ماضی اور حال میں اگلی یادوں کے سہارے زندہ تھی۔ اب اسے ہر لحظہ یہ فکر رہتا کہ اگر شاہد یہاں آ گیا تو پھر کیا ہوگا؟..... اگر قیصر گھر پر نہ ہوئے تو وہ شاہد سے منہ در منہ کیسے بات کر سکے گی؟..... لیڈی ڈاکٹر نے اسے آرام کرنے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ شام کے وقت اس کے پاؤں سوج جاتے اور بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا۔ اگر محلے کی عورتیں مارے تجسس کے اس کا گھر پھیرا نورانہ رکھتیں تو شاید وہ اپنے خیالوں کی نذر ہو جاتی۔ اخباروں میں مہاجروں کے مسائل' الاٹمنٹ کے چکر' ہمسایہ ملک کا سوتیلا پن درج ہوتا..... ریڈیو سننے بیٹھتی تو عجیب ہوک سی اٹھتی۔ جوتھیکا رائے' پنکج ملک' سہگل' کانن بالا' خورشید کے گانے سن کر توسلجیا گلا گھونٹنے لگتا۔ نیو تھیٹرز کی فلموں نے اس عہد کے نوجوانوں کو اپنی اپنی طرز کے دیوداس بنا دیا تھا..... یہ فلمیں کردار ساز تھیں اور پورے عہد پر بروا جمنا' سیتا دیوی' دیوکا رانی کا گہرا اثر تھا۔ ان فلموں میں مرد اور عورت کا رابطہ جنس پر مبنی نہ تھا بلکہ شراب کی طرح نشہ سا بن کر حواس پر طاری رہتا تھا۔ خیال کی دنیا قوی تر تھی اور لس کا بازار ابھی گرم نہ ہوا تھا۔ نوجوان ابھی عشق کی سرشاری میں بھیگے' خواب کی دنیا آباد کر کے تنہائیوں کے خواہش مند تھے۔ ایثار' قربانی بے معنی الفاظ نہ تھے..... لٹریچر پر ابھی فرائیڈ' اینجلز' کارل مارکس کا اثر نہ ہوا تھا۔ ابھی صحت مند لوگ اور ابنارمل ہیومن بینگز کے راستے علیحدہ تھے۔ ایسے دانشور موجود نہ تھے جو محبت کو فقط سیکس کا ایک دبا ہوا جذبہ سمجھ کر بیمار ذہنوں سے تازہ دم بنی نوع انسان کی شخصیت کے پڑتے لگاتے..... گیت' چاندنی' محبت' بڑے بامعنی الفاظ تھے اور لاشعور میں مذہب' تخلیق' خدا کے نایاب سہارے ہر خواص کے ہاتھ آ جاتے تھے..... ابھی لاشعور زندہ تھا۔ اس کے سہارے تخلیقی عمل اور مذہب جاندار تھے اور شعوری زندگی سطحی تھی..... راحیلہ کی طرح لاکھوں رفیوجی اپنے ساتھ یادوں کے جستی ٹرنک' گٹھڑیاں' سوٹ کیس باندھ کر لائے تھے۔ اس اسباب کو ٹھکانے لگاتے لگاتے وہ الاٹ منٹ کی نذر ہو رہے تھے..... جب کبھی ذہن بیمار ہوتا ہے' اس کا علاج روح کرتی ہے اور جب کبھی روح پژمردہ' مضمحل اور بے چین رہتی ہے' جسم اسے کھلونوں میں مصروف کر کے سب کچھ بھولنے پر مجبور کر دیتا ہے..... یہاں پہنچ کر لوگ کوٹھیاں' آئس فیکٹریاں' مربعے' سرکاری زمین' بسیں' لاریاں الاٹ کروا کر رہے تھے..... اپنے آپ کو نئے کھلونوں سے پرچانے کی کوشش میں جتلا تھے تاکہ اغوا شدہ بہنیں' اعضاء کٹے بھائی' مٹی اور لہو میں نہلائے ماں' ننگے سر ماتم رہا دے

اتر جائیں..... جسم اپنی حرص سے ان مردہ لوگوں کو زندہ رکھ رہا تھا۔ جسم حواس کو جگا کر نئی جگمگاہٹ سے روح کو حیرت میں لا رہا تھا۔ زندہ کرنے اور زندہ رہنے کا معجزہ روح میں کر رہی تھی۔ یہ معجزہ جسم کے حوالے سے حواس کی مدد لے کر ہو رہا تھا۔ کوٹھیوں کے سامان بک رہے تھے۔ نیلام ہو رہے تھے لیکن کچھ لوگ پانے کے باوجود بھول نہیں پا رہے تھے۔ جیسے تاش کے کچھ کھلاڑی ہمیشہ پرانی چالیں یاد رکھتے ہیں۔ شکاری کو اپنا پچھلا شکار اس کے کارنامے نہیں بھولتے۔ عورت کو مائکہ گھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں ستاتی ہیں۔ راحیلہ ایک جھولے پر سوار تھی۔ آگے جاتی تو جھونٹے میں سورگ کا مزہ ہوتا۔ جھولا پیچھے جاتا تو قدم زمین تلاش کرنے لگتے۔

ایسے وقتوں میں جب راحیلہ پر گہری سوچ کا اثر ہوتا۔ کوئی نہ کوئی گلی میں سے ضرور ملنے آ جاتا اور سلسلہ خیال کا تواتر ٹوٹ جاتا۔

بیگم زیدی کا قیصر منزل میں یہ پہلا پھیرا تھا۔

بیگم زیدی میرٹھ سے آئی تھیں۔ ان کا خاندان ابھی وہیں تھا۔ چونکہ میاں سرکاری افسر تھے اور انہوں نے پاکستان کے لیے opt کر رکھا تھا۔ اس لیے بیگم زیدی اپنے یونٹ کے ہمراہ ہائی ایئر یہاں آ گئی تھیں۔ ان کے میاں انکم ٹیکس کے محکمے میں تھے۔ انتہائی دیانتدار شریف اور کم گو تھے۔ بیگم زیدی اپنے کلچر اور زبان کی شیدائی تھیں۔ جہاں بیٹھتیں سروتا نکال کر چھالیہ کترنے میں مشغول ہو جاتیں۔ ساتھ انہیں گپ شپ کا بڑا شوق تھا۔ دوسروں کی ہمدرد ہر دم کام کرنے کو تیار۔ لوگوں کو معاف کر دینے کی شوقین۔ میلے ٹھیلے کی تمنائی اچھے کپڑے لتے کی عاشق' محض رونق اور دل لگانے کے لیے غیبت کرتے رہنا ان کی ہابی تھی۔ جس طرح وہ پان بڑے سلیقے سے بناتی تھیں' ایسے ہی غیبت بھی کسی داستان گو کی طرح پھول پتی سنوار کر کرتیں۔

قیصر منزل میں بیگم زیدی کا یہ پہلا پھیرا تھا۔

راحیلہ اپنے کمرے میں تھی۔ زینو نے بیگم زیدی کو ڈرائنگ روم میں بٹھانا چاہا لیکن وہ بڑے طمطراق سے صحن میں آئی اور جیسے مدتوں کا بہناپا ہو اور گھر سے خوب واقفیت ہو اندر پہنچ گئیں۔

''لو جی یہ تمہاری ماما ہمیں باہر روک رہی تھیں..... میں نے کہا بھائی سارے گھر ایک سے ہیں۔ اس گلی میں بلکہ میں تو کہوں ساری گلیوں سے..... یہی ہو گا تمہاری بیگم کا کمرہ ہے نا؟.....''

بیگم زیدی سفید لٹھے کا غرارہ پکڑ کا تیں اندر چلی گئیں۔ راحیلہ سے اپنا ہلکا سا تعارف کرایا۔ پھر چوکڑی مار کر پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ سامنے چھوٹا سا پاندان ہاتھ میں سروتا اور سپاریاں۔ اب وہ مسلسل بولے گئیں۔ بیگم نادرہ زیدی اپنی آواز کی خود عاشق تھیں۔ بات کر کے انہیں بڑا لطف آتا..... ''اے بیوی! میں تو کراچی میں تھی جب ڈاکٹر قیصر کا بیاہ ہوا..... میں اپنے ہاتھ سے تمہارے لیے غرارہ سیتی..... تمہارے میاں تو فجر کے نام لائق ہیں..... بس اس گلی کی عورتوں کو تم کیا جانو؟..... بھانت بھانت کی مچھلی اکٹھی ہو گئی ہے۔ ہم تو میرٹھ سے آئے ہیں۔ میرا تو مائکہ گھر سارے کا سارا وہیں ہے..... ان کے دو بھائی کراچی میں settle ہو گئے ہیں۔ میرا بھی جی یہی چاہتا ہے کہ کراچی چل بسیں۔ پر ان کو لاہور پسند آ گیا ہے۔ تم ان عورتوں سے اجتناب کرنا..... کوئی لدھیانے سے آئی ہے' کوئی رہتک سے..... شرم لحاظ تو خاندان کی وجہ

سے ہوا کرتا ہے..... ان کو کیسی لاج..... ناحق ہی ناحق کنسوئیاں لیتی پھرتی ہیں گھر گھر..... اب یہ جو گھر پر چودھرائن بستی ہے..... کیا نام ہے اس کا چاند بہو.....''

راحیلہ نے دل میں سوچا بھائی پہلی ملاقات میں ہی چاند بہو بنا دیا..... خوب۔

''شاید آپ فاخرہ ہے.....''

''ہاں فاخرہ..... لو جی جب میں نے سنا تمہارے گھر آئی ہے تو میرا ماتھا ٹھنکا..... میں تو اسی لیے سمجھ گئی کہ اب چودھرائن دھاندلی مچائے گی..... دل میں سوچا ڈاکٹر کی بیوی نوعمر نا تجربہ کار بھولی جا کر کچھ سمجھا آؤں۔ ایک ہی جلے پاؤں کی بلی ہے۔ جس گھر میں قدم رکھا میاں بیوی میں پھوٹ ڈلوا کر رکھی..... بڑی حرافہ ہے.....''

''اچھا جی چہرے سے تو ایسی نہیں لگتی۔'' راحیلہ حیران ہو کر بولی۔

''واہ تم بھی سدھ سادھو ہو چاند بہو..... آخر فاخرہ اپنے چہرے کو تالیپ پوت کر کیوں رکھتی ہے جی؟ بس حال اس کا یہی ہے۔ جس میں چٹکی ڈال بھا لو دور کھڑی..... مجھ سے تو رشیدہ نے کہا..... رشیدہ بھی جن کے میاں کسیرے بازار میں کام کرتے ہیں۔ پرانے برتن خریدتے ہیں۔ بڑی دکان ہے اس کے میاں کی..... میرا ان کا گھر پاس پاس ہے۔ اسی نے بتایا مجھے۔ چاند بہو کے گھر بہت آنا جانا ہے چودھرائن کا..... سمجھ گئی کہ ہم عمری کی دوستی نہیں چھچھورے پن کی وجہ سے فاخرہ کم عمر لگتی ہے ورنہ بیاہ ہے تو ایک مدت ہو گئی..... ہائے بیٹی ایسی عورتوں سے بچ کر رہنا..... تمہاری اماں کہاں ہیں؟ وہ ہی کچھ سمجھائیں.....''

راحیلہ نے سر جھکا لیا..... ''میں تو مہاجر ہوں جی' گورداسپور سے آئی ہوں..... لگتا ہے گھر والے سارے مارے گئے.....''

بیگم زیدی نے کانوں کو ہاتھ لگایا..... ''ہائے ہائے..... ہائے ہائے..... کیا کیا گھرانے تباہ ہوئے۔ کیسے کیسے لوگ بچھڑے اپنوں سے..... اچھا جو اللہ کو منظور..... میں تو خود میرٹھ سے آئی ہوں بھئی..... اب تم اس چودھرائن سے محفوظ رہنا۔ مجھ سے رشیدہ کہہ رہی تھی ایک ہی حرفت باز ہے۔ اس کے چلتر سارے محلے میں کون نہیں جانتا..... رشیدہ پر اس کی وجہ سے ایک قیامت بیت گئی ہے۔ بیچاری جالندھر سے لٹی پٹی آئی اور اس اچھال چھکا نے رشیدہ کے خاوند پر ہی ڈورے ڈالنا شروع کر دیے۔ مانا تم چاند کا ٹکڑا ہو۔ پر مرد ذات سے کالے سر کی ایک نہیں بچتی..... ذرا دھیان سے راہ و رسم پیدا کرنا.....''

راحیلہ نے سوچا یہاں اتنا وقت ہی کس کے پاس ہے کہ راہ و رسم پیدا کرے۔

''آپ کا حسن ظن ہے..... ورنہ میں تو بڑی درمیانی شکل کی لڑکی ہوں۔''

''لو لو لو..... حوریں تمہارے آنچل پر نماز پڑھیں' فرشتے بلائیں لیں..... حسن ظن واہ چاند بہو حسن ظن۔'' پھر زنگ آلود سے دانت دکھا کر بولیں..... ''اپنی ایڑی دیکھ کر تھوک ڈالو چاند بہو' کہیں نظر نہ لگ جائے۔ یہ بڑھا ہوا پیٹ اور اتنا روپ..... بیٹا ہو گا خیر سے۔''

راحیلہ نے مسکرا کر آہستہ سے کہا..... ''شکریہ.....''

"اب یہ بتائیں چاند بہو! کسی کو معلوم تھا کہ یوں خلقت دھوئی جائے گی..... ٹھیک ہے شور شرابا ڈال رکھا تھا مسلم لیگ نے..... ہم تو سمجھتے تھے کہ جداگانہ انتخاب پر ہندو مان جائیں گے' پر یہ موا ہندو..... کیا ہوا تھا وہ نہرو رپورٹ۔ اس میں صاف مکر گیا..... کہ ہم کو تو جداگانہ انتخاب نہیں چاہیے۔ حالانکہ کانگریس پہلے مان گئی تھی....."

راحیلہ کو لگا جیسے کہیں سے دادا ابا کی آواز آئی۔

"مسلمان کب علیحدگی مانگ رہے تھے' کب ہم نے الگ ملک مانگا..... چاند بہو! یہ سارے رستے قائداعظم کو کانگریس نے سجھائے۔ ہائے بیچارے سوکھے سڑے اتنے سال کانگریس کا ساتھ دیا۔ گاندھی' گوکھلے' نہرو سے بھائی پر وہ تو مانیں پر نہ مانیں..... قائد بیچارے بار بار کہیں ہمیں بس اتنی گارنٹی دے دو کہ جہاں مسلم اکثریت ہے' وہاں علیحدہ مسلمانوں کی انتخاب رائے سے دوٹیں دی جائیں گی..... ہندو کو تو چاند بہو! ایک وشال بھارت کا خواب ستا رہا تھا۔ چاند بہو تم ڈر کر رہا کرو..... سارے محلے کی عورتوں سے' ان میں ایسی دیدہ دلیری ہے کہ توبہ ہی بھلی..... اوپر سے تمہارے میاں صاحب بالکل سیدھے۔ اللہ کرے زمین کا پیوند ہو جائے' وہ شوہر جو اپنی معصوم دلہن سے فریب کرے....."

"جی..... جی قیصر تو ایسے نہیں ہیں جی۔" راحیلہ نے شرمندگی سے کہا۔

بیگم زیدی نے ہاتھ بڑھا کر روک دیا اور خود بڑے طمطراق سے بولیں..... "اے چاند بہو! میری دادی کہا کرتی تھیں مرد ذات کا کیا اعتبار..... کالے سر کی جو ایک بھی ان سے بچتی ہو..... جب میرے میاں نے گھونگھٹ اٹھایا تو سو جان سے فریفتہ ہو گئے۔ میں غسل خانے جاؤں تو خود لوٹا بھر کر رکھیں۔ سیر پر جائیں تو دوپٹہ اٹھا کر چلیں..... سونے لگوں تو بازو پر سلائیں۔ کھانے بیٹھیں تو ایک رکابی سے کھانے پر اصرار..... سب کے سامنے منہ میں نوالے دے رہیں۔ میں جھینپ جایا کرتی۔ پھر دن ایسے پھرے نصیب ایسے پھوٹے کہ اب روز کہتی ہوں میاں کراچی چلے چلو..... وہاں کی تبدیلی کروالو..... سنتے ہی نہیں۔ دفتر میں کوئی مسز فاروقی ہیں۔ سارا دن ان کی باتیں کرتے رہتے..... ایک تو بھئی تمہارے علاقے کی عورتیں ہی بڑی دیدہ دلیر ہیں۔ پڑھ لکھ کیا گئی ہیں۔ مردوں کے شانہ بشانہ رہنے لگی ہیں۔ ہر وقت دفتر' بازار..... گھر ہر جگہ حملہ آور۔ بھئی میری عمر کی گرہستن کیا ڈھال تلوار لے کر نکلے ان کے مقابلے کو؟ مجھ کو نظر آ رہا ہے' کہیں طلاق ہی نہ ہو جائے چاند بہو....."

راحیلہ گھبرا کر بولی..... "نہیں جی آپ فکر نہ کریں..... ایسے ہی لوگ لٹے پٹے آئے ہیں۔ ایک دوسرے سے ہمدردی بٹورتے پھرتے ہیں۔ سب کے پاس کہانیاں ہیں۔ سننے والے کی تلاش میں رہتے ہیں۔"

اب بیگم زیدی کی آنکھیں بھیگ گئیں..... "لو چاند بہو! عورتوں کو چاہیے کہ عورتوں سے دکھ سکھ کریں' یہ گن وان مردوں کے دل کھینچ پھرتی ہیں۔ اُدھر مرد کے دل پر اثر ہوا' اِدھر بیوی دل سے اتر گئی..... پہلا ردعمل ہی دوسری عورت کا یہ ہوتا ہے۔ بیوی کی خوبی بھی خرابی میں بدل جاتی ہے۔ عورت کی آزادی کا سب سے بڑا نقصان بھی عورت ہی کو ہوتا ہے چاند بہو..... پہلے صرف بازاری عورت آزاد ہوا کرتی تھی..... اس تک پہنچنے کے لیے مرد کو اپنی نیک نامی سے ہاتھ دھونے پڑتے تھے' اب تو رسائی ہی آسان ہو گئی..... ہر طرف دندناتی پھرتی ہیں۔ یہ ڈاکٹر قیصر پر توجہ رکھو' تم لاکھ چاند کا ٹکڑا سہی پر جب آفت آتی ہے تو سیاہ و جشن بھی ڈس جاتی ہے....."

راحیلہ نے قیصر کے متعلق سوچنا چاہا۔ رات گئے آنا اور پھر آ کر چپ پڑ رہنا..... کہیں کیمپ میں تو کوئی گل نہیں کھل رہا۔ شک بھی کیا چیز ہے..... لوبان کی دھونی بنکر سارے میں پھیل جاتی ہے۔ بیگم زیدی نے نئی گلوری بنائی۔ اسے کلے تلے دبایا اور بڑی نرمل آواز میں بولیں..... ''دنیا کا کوئی اعتبار نہیں..... آج تمہاری باتوں میں دل بہل گیا..... ورنہ ہر لمحے وسوسے اندیشے..... گھر لٹنے کا کسے افسوس نہیں ہوتا؟ گھر بھی ہر دن عید رات شب برات..... ایک بار پہلے بھی میرٹھ میں ایک واقعہ ہوا تھا..... تب میری عمر کم تھی' صرف پہلوٹھی کا مجید پیدا ہوا تھا۔ میں اپنی اماں کے گھر تھی..... ساتھ میں کوئی نئے کرائے دار آ کر ٹکے تھے۔ لڑکی تھی ان کی..... شکل صورت تو ایسے ہی ماٹھی تھی پر ہارمونیم بجاتی تھی..... کرائے داروں کے مکان کی دیوار سے دیوار ملی تھی۔ نچی منڈیر صبح صبح ہارمونیم کی آواز..... ریاض کیا کرتی تھی..... سارے گاما..... میں بھی منڈیر کے ساتھ لگ کر باتیں کرنے لگی۔ خوب میل تھا ان دنوں..... گانے سناتی..... مزے مزے کی باتیں کرتی..... ایسی چنچل' اچھال چھکا..... خوب گھل مل گئی..... چاند بہو! ہر وقت کنگھی چوٹی..... ہر وقت بناؤ سنگھار..... اب بھی ان دنوں کو یاد کر کے جی جلتا ہے.....''

بیگم زیدی نے لمبی سانس بھری۔ اپنے غرارے کو درست کیا۔ پیروں میں ابھی تک پازیبیں چھنکتی تھیں۔ کچھ دیر ان کی درستگی میں لگے۔ پھر سسک کر بولیں..... ''ان دنوں کا کیا ذکر کروں بیوی..... میں بھی ابھی ناکردہ کار بے' اسے ایسی باتوں کی کیا خبر..... پر ہولے ہولے وہ تو ہمارے گھر میں گھس آئی۔ مجید کو گود لے کر کھلانے لگی..... ہر لمحے چنچل بازی' ہر لمحے دل لگی۔ کچھ دن تو ہمارے میاں متوجہ نہ ہوئے۔ پر پھر ان کا بھی دماغ پھرنے لگا..... جنازہ نکلے اس بدذات کا' چندا' جنم جنم پھیکا رہے۔ پہلے تو کانا سا پردہ کرتی رہی۔ پھر مجید کو گود لینے کے بہانے یہ بھی اسے جگہ بے جگہ چھونے لگے..... پچھی جوتی کی طرح ہر وقت مسکراہٹ..... چاند بہو چاند بہو! میں تو دیکھتی رہ گئی..... کبھی مجید ان کی گود میں..... کبھی اس کی گود میں..... بچہ لینے پکڑنے میں وارے نیارے ہو رہے۔ سارا دن گھسی رہتی..... کہاں تو میں ہی میں تھی' کہاں طعنے اُلہانے..... اٹھتے جوتی بیٹھتے لات۔ مجھ پر تو شاید بات نہ کھلتی۔ پر میری بھاوج نے ایک روز کہا..... بہن تم نے اچھے گھر بیعانہ دیا..... ادھر یاروں کی ہنڈیا چڑھی ہے۔ تمہارے فرشتے خاں کو بھی خبر نہیں کہ دیوار پار کیا بنتا ہے..... تو میری' کبھی میاں سے پوچھ ہی لو کہ دفتر سے واپسی پر وہ پہلے کہاں جاتا ہے؟.....''

نادرہ بیگم زیدی کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ جسم دبلا' چٹا رنگت سیاہی مائل اور سر کے سارے بال سیاہ تھے۔ چہرہ لمبا اور گالوں کی ہڈیاں ذرا سی اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ فراخ ماتھا سلوٹوں سے اٹا پڑا تھا اور ستواں ناک پر دائیں جانب ایک بڑا سا تل تھا جو چہرے میں بڑی جاذبیت کا باعث تھا۔ بانہوں میں چاندی کی چوڑیاں' پیروں میں پازیبیں اور ہاتھوں میں نقلی انگوٹھیاں تھیں۔ کانوں میں البتہ سونے کے آویزے تھے۔ سفید غرارے پر کسیری کریپ کی قمیض اور سر پر جارجٹ کا دوپٹہ تھا۔ گیگی مائل ہونٹوں پر پان کی سرخی لپ سٹک میں گھل مل گئی تھی..... بیگم زیدی میں ایک نمایاں ٹھاٹھ تھا۔ ان کی گفتگو میں احساسِ برتری کی آنچ آتی تھی۔ جب وہ انگلیوں کو لچکا کر بات کرتیں تو نرت کا سماں پیدا ہو جاتا۔ پھر اس نرت میں آنکھیں شامل ہو جاتیں اور جملوں کی بانٹ میں گردن کچھ ایسے حتمی جھٹکے لگاتی کہ گفتگو بے حد مؤثر بن جاتی اور سننے والا واقعی مرعوب ہو جاتا..... راحیلہ پر بیگم زیدی نے جادو سا کر دیا۔

''ہاں چاند بہو..... میں تم سے کہتی ہوں بڑوں کا تجربہ بڑے کام کا ہوتا ہے۔ اپنی بھاوج کی زبانی سارا کچا چٹھا سنا تو میں نے تو سر پیٹ لیا۔ جونہی کمرے میں گھسے میں نے تو سارے وعدے یاد دلائے..... میں بھی پھر خوب بولی کہ ایسا کیا شہر شملہ ہے کہ تم میری نہ سنو گے۔ آخر کو اور کچھ نہ سہی تمہارے مجید کی اماں ہوں۔ آخر تم مجھ سے ایسا کرو تو کیوں؟..... بھائی ہمارے میاں تو ایک کائیاں منہ سے مینکتے تک نہیں۔ میں نے بھی فیصلے کی ٹھانی۔ منڈیر پر چڑھ کر جمیلہ کو آواز دی۔ وہ سنگو دیوار سے لگی سب سن رہی تھی۔ پر سردرد کا بہانہ کر کے اندر چلی گئی..... ہائے ہائے جوں جوں میں اونچا بولوں میاں ہاتھ جوڑیں..... کبھی پاؤں پر ہاتھ کبھی منہ پر..... بڑی منتوں سے مانی میں بھی..... فوراً سامان باندھ سال بھر سے اماں کے گھر بیٹھی کنڑی میں سسرال جا پہنچی..... میاں نے تو گھر سے نکلنا ہی بند کر دیا..... دفتر سے گھر' گھر سے دفتر..... شطرنج کا شوق تھا وہ بھی جاتا رہا۔ جب اکیلے میں پایا ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ تم دھیان رکھنا اس محلے میں بھانت بھانت کی بولی بولنے والیاں جمع ہو گئی ہیں۔ آنکھوں کا سرمہ چرا لے جائیں چاند بہو..... ایک تو مرد ذات کو ہمارے اللہ میاں جی نے ہی ایسا بنا دیا..... اوپر سے عورت کو بھی چین کہاں؟ باوا آدم کی نسل پر کون اعتبار کرے۔ لو جی تمہاری باتیں ایسی موہنی تھیں کہ دل لگ گیا ورنہ مجھے تو کسی جگہ قرار ہی نہیں۔ بہت کہتی ہوں میاں کراچی کا تبادلہ کرا لو..... چار ہم وطن مل جائیں گے' پر کیا کروں مسز فاروقی کا..... اچھا یہ بتاؤ قیصر کا محلے میں کہیں آنا جانا تو نہیں؟.....''

سہم کر راحیلہ بولی..... ''جی نہیں تو.....''

''لو پھر اللہ حافظ..... لو بھئی تم بھی کہو گی کہ دعویٰ بے دلیل مہمل ہوتا ہے..... لیکن تمہاری ہمسائی سے سنا تھا' ڈاکٹر رات کو دیر سے آتے ہیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا' وہ تو سچ ہے کہ آنکھوں سے گھٹنے دور ہوتے ہیں لیکن بھئی میں تمہاری دشمن تھوڑا ہوں۔ بس جی اول اول روک تھام کرو گی تو بات نہیں بڑھے گی..... سمندر کا پانی کشتی میں آنے لگے تو کون روکے..... اچھا بھئی اب چلتی ہوں۔ تمہاری باتوں میں دل لگ گیا ورنہ جہیں تو میر تھ کی یاد ہی لے ڈوبی..... لو جی السلام علیکم خدا حافظ.....''

جس بے تکلفی سے بیگم زیدی وارد ہوئی تھیں اسی بے اعتنائی سے پازیبیں چھنکاتی غرارہ پھڑکاتی صحن میں چلی گئیں..... ابراہیم لاج سے بچھڑ کر راحیلہ نے خوف و ملال کے جہنم میں دن گزارے تھے۔ اب ایک وسوسہ ٹائم بم کی طرح اس جہنم میں اور دب کر رہ گیا..... اگر شاہد آ گیا تو' اور قیصر چلا گیا تو؟

بابا فضل کے جانے کے بعد وہ کبھی کبھی کوٹھے پر جا کر نیچے گلی میں جھانکا کرتی۔ سڑک پر آنے جانے والے بچے جب سکول سے لوٹتے تو بھرپور زندگی ان کے ساتھ ہوتی۔ اپنے بستوں سے ایک دوسرے کو مارتے تختیوں کو جھلاتے' ان کے ساتھ بہنے والی جھلملاتی مسرت ہوتی۔ اس خوشی کا کسی عمل' کسی خواہش کے ساتھ تعلق نہ تھا۔ یہ زندگی کا عمل تھا۔ جینے کی ایک صورت تھی جیسے سانس آتی جاتی محسوس نہیں ہوتی۔ پر ان باہر سے نہ جانے کہاں سے خوشی کا سندیسہ لے کر سپنوں میں داخل ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی راحیلہ نچلے کمروں میں جھاڑ پونچھ کرتی مائی کو دیکھتی' وہ اپنے آپ میں خوش تھی۔ اس کے قدموں میں جیسے پہیے سے لگے تھے۔ کبھی کبھی وہ رک کر گنگنانے لگتی۔ کبھی آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر مگن ہو جاتی..... ایسی خوشی اب راحیلہ کے امکان میں نہ تھی..... اسے کسی ایسے سہارے کو تلاش کرتا تھا جو اس کے اندر خوف و ملال کے حصار کو مسمار کر دے۔ کسی ایسے چشمے کو پھوڑ کر نکالے جو امید کے فوارے سے سارے وجود کو بھگو دے..... اب وہ

مفلوج حالت میں اپنے پیروں پر کھڑی نہ ہو سکتی تھی۔ راحیلہ کو بیساکھیوں کی ضرورت تھی۔ بیگم زیدی نے ان بیساکھیوں کی مضبوطی کو مخدوش کر دیا تھا۔ بات بھی اگر وثوق سے کی جائے اور اس میں ادائیگی کا بانکپن بھی ہو تو بہت جلد سننے والے کا اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔

ابھی تک راحیلہ کو پورا اعتبار تھا کہ قیصر کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ اور ارسلان قیصر کم از کم حیات دنیا میں بے سہارا نہ ہوں گے..... اب ایک اور چکر چل پڑا' وہ سوچنے لگی..... اگر قیصر اسے چھوڑ گیا تو.....؟ اگر شاہد عباس آ گیا تو' ایک بڑا خوف اس کی جانب بڑھنے لگا..... ''اور اگر قیصر اسے چھوڑ گیا تو؟.....''

جب بیگم زیدی کو پچھلے دروازے سے باہر جاتے دیکھ کر زینو نے پوری تسلی کر لی تو دبے پاؤں وہ راحیلہ کے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں آلو اور دوسرے میں چھری تھی۔ راحیلہ کے پاس آ کر رازدارانہ انداز میں اس نے کہا..... ''بی بی جی ذرا بچ بیگم صاب..... یہ آپ نے زیدی صاحب کی بیگم دیکھی ہے..... آئے ہائے جوان لڑکیاں ہیں جی آپ کی عمر کی..... پر جی عقل پھرتے دیر نہیں لگتی۔ سنا ہے پہلے شوہر کو میرٹھ میں چھوڑ آئی ہے۔ خلع لے لیا ہے اس سے اور یہ انکم ٹیکس والا یہاں آ کر پکڑا ہے۔ پچھلا شوہر چوڑیاں بنانے کا کام کرتا تھا۔ آمدنی کم تھی بیچارے کی..... سنا ہے جس روز اسے گھر سے نکالا جلتی لکڑی چولہے سے نکال اسے زینے سے دھکیلتی جاتی تھی..... اب زیدی صاحب سے نکاح پڑھوا لیا ہے..... جوان بیٹیاں ہیں جی آپ اس سے راہ و رسم نہ رکھیں۔''

''ہمیں کسی کی ذاتی زندگی سے کیا زینو..... اپنا کام کرو.....''

''ہاں جی ہمیں کیا بھلا..... ہم کیوں کسی کے پھڈے میں ٹانگ اڑائیں۔ پر بیگم صاحب۔ ہشیار رہنا چاہیے..... صحبت کا اثر ہو جاتا ہے..... آپ کی ابھی عمر ہی کیا اوپر سے بھولی طبیعت.....''

''خیر ہے زینو.....''

''ہاں جی خیر ہی خیر ہے..... ہمیں کیا۔'' زینو کا موڈ آف ہو گیا۔ وہ اپنے آپ پر لعن طعن کرتی رخصت ہو گئی۔

راحیلہ نے آسمانی رنگ کی جرسی اٹھائی اور ہولے ہولے سلائیاں نکالنے لگی۔

یہ پرانا عہد تھا جب عورتیں اپنے آپ کو تلاش کرنے کے لیے باہر نکلی تھیں..... ابھی عورتوں کو معلوم نہ تھا کہ بچے اور گھر کے علاوہ بھی ان کی کوئی شناخت ہو سکتی ہے۔ اگر وہ دنیاوی کاموں میں مشغول ہونے کے لیے باہر نکلتیں تو اپنا گھر اور بچہ اپنے وجود میں چھپا کر ساتھ لے جاتیں۔ ابھی عورت نے اپنی نیت کو ٹٹول کر نہ دیکھا تھا کہ وہ زندگی سے بچے کے علاوہ بھی کسی چیز کی متمنی ہے۔ عورت ابھی مرد کا مدمقابل بن کر سامنے نہ آئی تھی۔ سوئے ہوئے گر مچھ کی طرح وہ اپنی ازدواجی زندگی میں مگن تھی۔ ستائی گئی تو رو لیا..... خوش ہوئی تو ہنس دیا۔ عورتیں بدگوئی' غیبت' لگائی بجھائی میں طاق و مشاق تھیں۔ انہوں نے اپنی نیت کو ٹٹول کر کبھی یہ بھی نہ سوچا تھا کہ وہ دوسروں کی برائی سے کیونکر اپنے آپ کو ارفع و اعلیٰ ثابت کر سکتی تھیں۔ کبھی ان کے دماغ میں سے بھی یہ بات نہ گزری تھی کہ وہ مردوں کے شانہ بشانہ چل کر ان کو نیچا بھی دکھا سکتی ہیں۔ اس عہد تک مرد اور عورت کی ایک دوسرے کی جنس کے لیے نیت صاف تھی۔ وہ کسی کسی انسان کے خاص طور پر ازدواجی بندھن میں شوہر بیوی کا اور بیوی شوہر سے شاکی ہو سکتی تھی۔

لیکن من حیث المجموعی ساری جنس سے مایوس نہ تھیں.....

تھوڑی دیر کے بعد زینو پھر وارد ہو گئی۔

"اچھا جی..... بیگم صاحب۔ میں اور عالیہ گھر جا رہے ہیں۔ لالو فلم دیکھنے گیا ہے اور باہر فتح خان چوکیدار بڑے پھاٹک کے باہر چارپائی ڈال کر بیٹھا ہے....."

"ٹھیک ہے..... وعلیکم السلام۔"

"صحن والی کنڈی میں نے لگا دی ہے....."

اس رات پہلی بار راحیلہ کو اس نوعیت کا خوف آیا۔ جب تک بابا فضل کوٹھے پر رہتا تھا اُسے یہ احساس کبھی نہ ہوا کہ وہ گھر کے اندر بالکل اکیلی ہے۔ لالو کو گھومنے پھرنے کا شوق تھا۔ وہ بلاوجہ چھٹی لے کر سیر سپاٹے کو نکل جاتا اور راحیل بھی اسے اسی لیے جانے دیتی کہ اسے اب تنہائی پسند آ گئی تھی۔

اچانک اسے قیصر منزل کے کمروں سے ڈر آنے لگا۔ وہ کمروں میں پھرنے لگی.....اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی..... کیمپ میں ملنے والا شاہد اسی شہر میں ہے..... شاہد؟ وہ انہونی' ان کہی باتوں کے کابوس کندھوں پر اٹھائے پھرنے لگی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کسی سے ان خیالات کا ذکر کرے جو ٹھیک طرح سے اس کے ذہن میں بھی تشکیل نہیں پا رہے تھے..... اتنا وہ ضرور جان گئی تھی کہ نیت کی صفائی سے خوف وملال کے حصار سے نکلا جا سکتا ہے لیکن دو پٹڑیوں پر چلنے والے اپنی نیت میں یکسوئی کیسے پیدا کر سکتے تھے۔

گھر سنسان تھا۔

وہ اپنے ذہن کے ساتھ گتھم گتھا گہری شام کو رات میں بدلتے دیکھ رہی تھی۔ اس کا دماغ شہد کے چھتے کی طرح بھنا رہا تھا۔ زینو کھانا نعمت خانے میں رکھ کر جا چکی تھی..... اپنے خیالوں سے بچنے کے لیے اس نے اپنے بیڈروم کی چیزیں جھاڑنا شروع کر دیں۔ ترتیب سے لگے ہوئے کپڑے پھر ترتیب وار سجائے۔ آنے والے بچے کے کپڑے دیکھے۔ چھوٹی چھوٹی بچھونیاں' فراک' بب..... لیکن ان چیزوں نے اسے دیر تک متوجہ نہ کیا۔

بڑے پھاٹک کی چھوٹی کھڑکی کھول کر باہر گلی میں دیکھا۔ گلی اندھیری تھی لیکن چوکیدار فتح خان چارپائی پر بیٹھا صاف نظر آ رہا تھا۔ فتح خان دوسری جنگ عظیم میں حوالدار رہ چکا تھا۔ اس کی ہر حرکت میں سپاہیانہ تیزی اور تیکھا پن تھا۔ اس کا قد چھ فٹ سے ذرا اونچا تھا لیکن محاذ جنگ پر اس کی بائیں ٹانگ پر ایسا زخم تھا کہ زخم ٹھیک ہونے پر بھی ٹانگ کا لنگڑا پن نہ گیا۔ اسی وجہ سے اس کا قد درمیانہ سا لگتا۔ جہلم کا رہنے والا تھا۔ لمبے لمبے پٹے اس کی گردن کو چھوتے تھے۔ سفید بالوں میں مہندی کی آگ سلگتی رہتی۔ نیلی آنکھوں میں سیاہ سرمہ دھوم مچاتا۔ بابا فضل کے رخصت ہو جانے کے بعد قیصر نے اسے چوکیداری کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ حالانکہ گھر ماچس کی ڈبیا سا بند ہو جاتا اور فتح خان کا تعلق صرف بڑے پھاٹک تک ہی تھا۔ فتح خان بڑی جی داری سے چوکیداری کرتا۔ اس کی آواز میں ایسی گھن گرج تھی کہ محلے والے سوتے سے جاگ اٹھتے۔ فتح خان کے پیروں کی آواز کے ساتھ ساتھ بلم کی ٹھکا ٹھک بڑی رعب دار سنائی پڑتی۔ کمیٹی کا چوکیدار فتح خان کے آنے پر ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ وہ لمبی تان کر کسی بے جان درخت کی مانند چارپائی پر گرا رہتا۔

بڑے پھاٹک میں چھوٹی کھڑکی سے جھانک کر اس نے قیصر کی راہ دیکھی اور پھر کھڑکی بند کر کے اندر قیصر منزل میں گشت کرنے لگی۔ کہیں شاہد اس گھر میں نہ چھپا بیٹھا ہو۔ کسی پردے کے پیچھے سانس لے رہا ہو۔ اسے لحہ بہ لحہ دیکھ رہا ہو۔ یکدم اسے لگا کہ ڈرائنگ روم کے پردے کے پیچھے دو بھوری آنکھیں اسے گھور رہی ہیں۔ ایسی آنکھیں جو راحیلہ کو قتل کرنے کا عزم رکھتی ہیں۔ اس نے تمام کمروں کی بتیاں جلا دیں۔ قیصر اسی وقت واشن کیمپ سے لوٹتا تھا لیکن اب راحیلہ کو لگا کہ رات کے دس نہیں بلکہ صبح کا ذب ہونے والی ہے..... اب قیصر کبھی نہیں آئے گا اور شاہد اسے چھپ چھپ کر دیکھتا چلا جائے گا۔ قیصر کی راہ دیکھتی وہ بوڑھی ہو جائے گی۔ صحن میں اس کے بوٹوں کی مدھم چاپ کبھی سنائی نہ دے گی۔ اس نے صحن کی بتی بھی جلا دی اور پھر بڑے پھاٹک تک گئی۔ چھوٹی کھڑکی کا کنڈا کھولا اور باہر آواز دی..... "فتح خان..... فتح خان۔"

"جی صاب آیا....."

فتح خان سیڑھیاں چڑھ کر کھڑکی کے پاس آ گیا۔

"جی صاب....."

"تمہیں معلوم ہے صاحب اس وقت کہاں ہوں گے؟"

"ام کو پتہ تو نئیں ہے پر ہم جج صاب کے گھر سے معلوم کر آتا ہے جی۔"

"نہیں نہیں..... اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم کہیں مت جانا..... اور شام کو لالو کو باہر نہ جانے دیا کرو۔ اس بے حیا کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ میں اس وقت اکیلی ہوتی ہوں۔"

"او تم فکر نہ کرو صاحب جی ام ادھر اے..... کسی پدر سوختہ کا مجال نہیں جو قدم اندر رکھے....."

فتح خان کی آواز سے ہمت پکڑ کر وہ بہادری سے لوٹی لیکن یکدم اسے لگا کہ بیڈ روم کے جالی والے دروازے کے پیچھے کوئی کھڑا ہے..... پھر خوابگاہ کا پردہ ہلا اور ساکت ہو گیا۔ وہ جلدی سے بڑے پھاٹک کے بغلی دروازے تک گئی۔ اسے کھولا اور آواز دی۔

"فتح خان ذرا اندر آنا۔"

راحیلہ اپنے خوف سے کانپ رہی تھی۔

سر جھکا کر کندھے کی بندوق سنبھالتا فتح خان اندر آ گیا۔

"جی صاب....."

"ابھی اس جالی والے دروازے کے پیچھے کوئی تھا..... پھر جب میں نے تمہیں بلانے کا ارادہ کیا تو..... تو....."

"او میرا جی تم فکر نہیں کرو..... ام ابھی دیکھتا ہے....."

پھر بندوق کو سنبھالتا وہ ہر کمرے کی کنسوئی لیتا پھرا۔ پردوں کے پیچھے' غسلخانوں میں' باورچی خانے میں' الماریوں کی آڑ میں' سیڑھیوں کے نیچے' گوداموں کے کواڑ کھول کر' پھر سارے کونے کھدرے دیکھ کر وہ حیران پریشان کھڑا ہو گیا۔

"صاب ادھر تو کچھ نہیں..... ام نے سارا دیکھا ہے۔"

''میرا خیال ہے چھت پر..... وہاں کوئی نہ ہو.....''

''او تم ادھر ٹھہرو ام ابھی دیکھتا ہے۔''

جلدی سے فتح خان سیڑھیاں چڑھ گیا۔ راحیلہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ آنسو اس کی آنکھیں دھندلا رہے تھے اور اس کا سارا جسم کپکپا رہا تھا۔ اس نے دھندلی آنکھوں سے بھوری آنکھوں والے کو تلاش کیا۔ اسے خوابگاہ کے پردے پھر سرسراتے نظر آئے۔ فتح خان نے تمام بتیاں روشن کر دی تھیں اور اب قیصر منزل کسی شوکیس کی طرح جگمگا رہا تھا اور کوئی مبہم سایہ بھی باقی نہ رہا تھا۔

جس سرعت سے فتح خان سیڑھیاں چڑھا ویسے ہی تیزی سے پلٹ آیا۔

''اوپر کا تینوں کمرہ سنسان پڑا ہے صاب۔''

''شاید میرا وہم ہو گا.....''

''وہم..... ہو سکتا ہے لیکن سر آپ سیف ضرور دیکھ لے..... یہ جو ریفوجی ادھر آ رہا ہے' وہ بڑا چور اے..... کوٹھیاں لوٹتا ہے..... تالے توڑتا اے..... پتہ نہیں کدھر کا خلقت آ رہا ہے خدا خیر..... سب چور اُچکا پدرسوختہ چلا آ رہا ہے..... سب نعرہ لگاتا ہے پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ۔ سب سوچتا کدھر ہاتھ مارے' کس کو لوٹے۔''

''اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ۔''

''بتیاں بجھا دے ام؟.....''

''نہیں رہنے دو..... روشنی اچھی لگتی ہے.....''

پھاٹک کے بغلی دروازے سے فتح خان باہر چلا گیا۔ راحیلہ اپنے بیڈروم میں جانے سے ڈرتی تھی..... چپکے سے وہ صحن میں بچھے تخت پوش پر بیٹھ گئی۔ چوکیدار ٹھیک کہتا تھا' پناہ گزین ڈاکے ڈالتے پھرتے تھے۔ ریفوجی اس دولت کی تلاش میں تھے جو وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ غم و غصے نے ان کی قدریں گڈمڈ کر دی تھیں۔

وہ بھی بھول گیا ہو گا کہ اب راحیلہ ڈاکٹر قیصر کی بیوی ہے..... وہ بھی تو ریفوجی تھا۔ اس شہر میں اقامت پذیر تھا۔ شاید بھوری آنکھوں والا اپنی دولت چرانے آ جائے تو پھر؟..... کیا اولین حق رکھنے والا اس حق شفع کے معاملے میں حق بجانب بھی ہو گا؟

اندر سے وسوسوں سے جنگ کرتی بالآخر راحیلہ سونے کو تو سو گئی لیکن یہ نیند زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ گھڑی بھر بعد وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے سارے کپڑے پسینے میں بھیگ رہے تھے اور اسے اپنی جان نکلتی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے لحاف پرے پھینک دیا اور لرزتے ہاتھوں سے بیڈ لیمپ جلایا۔ سارے کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ اس روشنی میں راحیلہ کا چہرہ اور بھی ہلدی مائل نظر آنے لگا۔ اس کی آنکھوں تلے سیاہی مائل حلقے دکھائی دینے لگے جو بے خوابی اور بے جا فکر نے وہاں پھیلائے تھے۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا سا چھا رہا تھا اور ٹانگوں میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ اس نے دائرے میں پھیلی بیڈ لیمپ کی روشنی پر نظر ڈالی اور بڑے عزم کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

رات کافی جا چکی تھی اور ابھی قیصر واٹسن کیمپ سے نہیں لوٹا تھا۔ راحیلہ نے قیصر کی قمیض کھونٹی سے اتاری.....

دامن میں سے قیصر کی باس آ رہی تھی۔ یہ خوشبو اتنی زندہ تھی کہ راحیلہ کو احساس ہوا کہ قیصر بھی یہیں کہیں موجود ہے۔ راحیلہ نے قمیض کو چہرے تک لا کر واپس کھونٹی پر لٹکا دیا۔ پھر اس نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی اور تحفظ کی خاطر اپنی قمیض کو اتارا اور دوبارہ قمیض اتار کر اسے پہن لیا۔ اس مردانہ قمیض میں اس کا جسم جھول رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بانہوں میں سمیٹ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اب اس قمیض کے خول میں وہ اپنا آپ محفوظ کر چکی تھی۔ پھر اس نے پسینے سے تر ماتھا پونچھا۔ بتی بجھا دی اور سونے کی تیاری کرنے لگی۔

یکدم اسے وہ دن یاد آنے لگے۔ جب اباجی کو دنوں دن نیند نہ آتی تھی۔ سول ہسپتال کی ایمرجنسی میں لوگ روز کٹے پھٹے، زخموں سے چُور آتے تھے۔ فسادات کی نذر ہو جانے والے لوگوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی۔ بے خوابی، تھکن اور پریشانی سے آنکھیں بوجھل اور سرخ رہتی تھیں..... رات کو نیند کو پکارنے کی خاطر کیا کیا جتن نہ کیے تھے..... اماں کہتیں..... "ڈاکٹر صاحب! یہ تو ساری خلقت کے ساتھ ہے۔ آپ خود ہی تو بتایا کرتے تھے ویول صاحب (Wavell) نے پلان بنایا تھا کہ آبادی کو بہت آرام سے اپنے اپنے مقام پر پہنچایا جائے گا۔ پہلے بچے اور عورتیں جائیں گی پھر فوج کی نگرانی میں مردوں کو پاکستان منتقل کیا جائے گا..... اب نہیں چلنے دی اس کی، واپس بلا لیا۔ ماؤنٹ بیٹن کے بس کا یہ روگ نہیں، وہ تو شہزادہ ہے شہزادہ..... آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں..... ہولے ہولے سوئیں گے آپ ہی نیند آ جائے گی....."
تھوڑی دیر بعد ابا کہتے..... "لو ایک ہزار گن چکنے کے بعد..... نیند آئی گئی ہوگی....."

ساجدہ ماں سر دباتے ہوئے کہتیں..... "پہلے سورۃ الناس پڑھیے..... سارے وسوسے دل سے بھاگیں تو درود شریف پڑھیے..... نیند آپ ہی آ جائے گی....."

لیکن اباجی ہسپتال میں پڑے زخمی مریضوں کے دکھوں کے متعلق سوچتے رہتے اور نیند سے کوسوں دور رہتے..... ان دنوں خوف کچھ ایسا دامن گیر تھا کہ دادا ابا اور اباجی بھی کوٹھے پر سویا کرتے تھے اور رات گئے تک ہل جل ہوتی رہتی تھی۔ جب پڑھنے گننے سے نیند نہ آتی تو پھر کہانیاں کہی جاتیں، پہیلیاں بجھوائی جاتیں، پیروں میں کدو کا تیل، سر میں برف ملے تیل کی مالش ہوتی۔ باقی سب تو سو رہتے لیکن تسنیم آپا اور ساجدہ ماں انہیں دباتی رہتیں اور ابا ہولے ہولے ہونکتے رہتے، گویا خود زخموں سے چُور ہوں۔

راحیلہ نے سر جھٹک کر ان دنوں کو بھلانے کی کوشش کی اور پھر نیند کو پکارنے لگی۔ پھر بڑی دیر تک وہ درود شریف پڑھتی رہی..... لیکن نیند نہ آئی۔ کئی ہزاروں گن ڈالے لیکن لمحہ بہ لمحہ اس کا شک یقین میں بدل رہا تھا کہ کمرے میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ وہ بھوری چمکتی آنکھیں موم بتی کی طرح کبھی پردے کے پیچھے کبھی الماری کے ساتھ جل رہی تھیں۔ راحیلہ لحاف میں گچھا مچھا ہو گئی۔ اس کی نبض بڑی تیزی سے چلنے لگی۔ قیصر کی قمیض پسینے میں بھیگنے لگی۔ اس کے اپنے بازوؤں کی گرفت اپنے جسم کے اردگرد سخت ہوتی چلی گئی۔ وہ مکمل طور پر لحاف کے اندر ہو گئی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کوئی بستر پر جھکا ہوا مِس مِس کر کچھ کہہ رہا ہو۔ وہ کیا کہہ رہا ہے، اس کے متعلق وہ کچھ تصفیہ نہ کر سکی۔ اس کے بالوں میں آہستہ آہستہ پسینے کے قطرے دوڑنے لگے اور سانس میں دھونکنی کا شور اٹھا۔ اس میں اتنی ہمت نہ رہی کہ رضائی پرے کر کے باہر دیکھ سکتی۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا لیکن وہ دم سادھے پڑی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اگر اس کا سانس بھی اس کے وجود کا سراغ دے

گیا تو وہ مر جائے گی..... بھوری آنکھیں..... طنز میں ڈوبی مسکراہٹ..... شاہد اس کی نیت کو سمجھ نہ سکتا تھا۔ وہ یہ بات کب سمجھ سکتا تھا کہ جسم کا تحفظ بھی کبھی کبھی بہت بڑی ضرورت بن جاتا ہے۔ جسم کی خاطر روح کی پائی پائی خرچ کرنا پڑتی ہے.....

اسی شہر میں؟

چاندی کرنیں اس کے مسکن پر بھی جھلملا رہی ہوں گی..... آسمان کے وہی تارے اسے بھی نظر آتے ہوں گے جو قیصر منزل کے آسمان پر پلکیں جھپکا رہے ہیں..... شاید اسے بھی بیڈ لیمپ کی روشنی نظر آ رہی ہو..... میں نے شاہد کا سواگت کیسے کیا؟ میں شاہد ہی سے خوفزدہ ہو گئی.....؟ شاہد کا استقبال اور چوکیدار فتح خان کی لاٹھی..... وہی شاہد جس کی آمد پر دیگیں چڑھی تھیں۔ شہنائیاں بجی تھیں۔ مٹھیوں میں مہندی بھر گئی تھی..... آرزو چوکس ہو کر وجود کے ہر بُن مُو سے برسنے لگی تھی..... شاید چند ساعتیں پہلے وہ آیا ہو؟..... میرے گھر میں ایک اجنبی بن کر..... نامحرم..... قطعی نامحرم؟

کیا ایک ہی شخص کے لیے دل میں محبت اور اس درجہ خوف تنگ کر سکتا ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی سے اپنا حال کہے' ایک ایک اندیشہ وسوسہ بیان کرے۔ اسے لگتا تھا کہ اگر تھوڑی دیر اور اسے کوئی رازداں نہ ملا تو اس کا سر ایک دھماکے سے پھٹ جائے گا اور دکتی بھوری آنکھیں اسے اپنے جادو میں کس لیں گی۔ اسے ان آنکھوں سے ڈر لگ رہا تھا۔ بڑی ہمت سے اس نے لحاف اتارا..... سلیپر پہنے اور بڑے پھاٹک کی طرف چل دی۔ اس نے چھوٹی سی کھڑکی کھول کر فتح خان کو دیکھا' وہ بڑا چوکس بیٹھا تھا..... راحیلہ کو بڑی راحت محسوس ہوئی۔ اسے لگا گویا اس لمبے چوڑے قبرستان میں وہ اکیلی نہیں ہے بلکہ ایک فتح خان اور بھی سانس لے رہا ہے۔ اگر وہ چیخ مارے گی تو کوئی نہ کوئی ضرور اس کی امداد کو پہنچے گا..... اس نے فتح خان کو آواز دے کر ہشیار کرنا چاہا لیکن پھر کھڑکی بند کر کے بیڈ روم میں لوٹ آئی۔ ساری بتیاں بجھا کر وہ پھر لحاف میں دبک گئی۔ ہمت پھر جواب دے رہی ہے۔

اس وقت بڑی احتیاط سے دروازہ کھول کر قیصر اندر داخل ہوا۔ بارہا وہ اسی طرح دبے پاؤں آیا تھا۔ عموماً راحیلہ اسے سوئی ہوئی ملتی۔ آہستہ آہستہ وہ آگے بڑھتا' اس نے آرام سے ٹٹول کر بتی جلائی۔ راحیلہ رضائی کے اندر گھسی تھوڑی بنی ہوئی تھی۔ قیصر تکلف سے پٹی تک پہنچا اور پرت سے رضائی اتارنے لگا لیکن جونہی اس کا ہاتھ لحاف پر پڑا۔ راحیلہ چیخ کر اٹھی اور بلک کر چلائی..... ''فتح خان..... فتح خان۔''

''راحیلہ..... راحیلہ..... ہوش میں آؤ.....''

قیصر متعجب ہو کر بولا۔

''تم..... تم قیصر..... تم یا تم.....'' راحیلہ نے خدا جانے کیا کہنا چاہا لیکن اس کے سارے الفاظ سسکیوں میں ڈوب گئے۔ قیصر نے بڑے دلار سے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا اور اسے تھپک تھپک کر یوں دلاسے دینے لگا گویا وہ اس کی اپنی بچی ہو!

''حوصلہ کرو..... راحیلہ..... سنو تو..... کیا بات ہے آخر..... سردیوں میں تمہیں اتنا پسینہ کیسے آ گیا رانی..... دیکھو..... دیکھو..... بھئی یوں نہیں..... ہاں..... سنو تو ذرا.....''

راحیلہ بلکتی جا رہی تھی' اس کا سارا خوف آنسوؤں میں بہہ بہہ کر قیصر کی قمیض بھگو رہا تھا اور وہ کسی بچے کی طرح

ہچکیاں لے رہی تھی۔

قیصر نے راحیلہ کا چہرہ مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیا اور سختی سے بولا..... ''آخر کیا بات ہے؟''

''بات.....؟ بات؟'' راحیلہ ہچکیوں کے درمیانی وقفوں میں بولی..... ''بات یہ ہے کہ تم روز دیر سے آتے ہو.....اور مجھے ڈر لگتا ہے.....ڈر..... مجھے.....''

قیصر زیر لب مسکرایا اور اس کی مانگ چوم کر بولا..... ''لو اب کبھی دیر سے نہ آؤں گا۔ بس بھئی بس وعدہ رہا.....لو اب اچھی بچی چپ کرو بھی رونا نہیں.....''

''آپ ہر روز یہی کہتے ہیں.....''

''اب کبھی دیر نہ ہوگی۔'' قیصر نے آنکھیں سکوڑ کر کہا۔

''اچھا چھا.....''

''میں کیمپ سے جلد ہی چل پڑتا ہوں راحیلہ..... لیکن عموماً راہ میں بہت دیر ہو جاتی ہے..... قیامت سے کم منظر سامنے نہیں ہوتا۔ ہر قسم کی دلدوز کہانی ہر طرح کا زخم..... آج میں کیمپ سے باہر نکلا تو ایک مہاجر پوری قوت سے دوڑتا میری طرف آیا۔ اس کی کٹی ہوئی بانہہ لٹک رہی تھی۔ اسے اپنے قمیص میں اس نے تھم ہو کر کے لپیٹ رکھا ہے..... کہیں راستے میں جب وہ پہنچنے والے تھے ایک جتھہ حملہ آور ہو گیا..... پورا کا نواۓ تباہ حال زخمی حالت میں یہاں پہنچا۔ میں اسے لے کر میو ہسپتال گیا۔ بازو تو جاتا رہا لیکن شکر ہے جان بچ گئی.....اسی لیے دیر ہو گئی راحیلہ..... پتہ نہیں اس کی نابینا ماں کہاں ڈھونڈتی پھرتی ہوگی؟.....''

''کوئی بات نہیں قیصر جی..... میں تو ایسے ہی وسوسوں میں گھر گئی ہوں۔ خیالوں نے مجھے گھیر رکھا ہے۔ میرا سکون تباہ کر دیا ہے.....''

بیگم زیدی سے ملنے کے بعد وسوسہ اور بڑھ گیا تھا..... اگر شاہد آ گیا.....اور قیصر جاتا رہا تو؟..... کہیں چپکے چپکے اس کا دل یہ بھی پوچھ رہا تھا..... اب اگر ہندوستان واپس لوٹ جاؤں اور پاکستان کی تازہ آزاد ہوا چھن جائے تو؟..... کیا ایک بار جب بلے کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ دنیا دیکھ پاتا ہے تو کیا ماں کے بطن میں واپس جا سکتا ہے؟ آگہی کی منزل کیا لاشعور کی عافیت میں واپس جانے کی اجازت دیتی ہے؟ سوال ریشمی دھاگوں کی طرح آپس میں الجھے ہوئے تھے..... ایک سرا کھینچنے سے کئی گانٹھیں الجھاؤ دھاگے خود بخود کھنچے چلے آتے تھے..... جب تک وہ قیصر سے نہ ملی تھی جانتی ہی نہ تھی کہ عافیت سکون آزادی کے کیا معنی ہیں؟..... جب تک اس نے شاہد کو نہ پایا تھا اسے معلوم ہی نہ تھا از خود اگنے والی گھاس میں کیسی ٹھنڈک ہوتی ہے؟

وہ خود بھی نہ جانتی تھی کہ اپنے لیے وہ کیا خواہش کرے؟ اس کی اصل نیت کیفیات کے اندھیرے میں اتنی روشنی پیدا نہ کر سکتی تھی کہ اسے صحیح راستہ نظر آ جاتا۔ بڑی دیر بعد اس نے اپنے آپ کو مجتمع کر کے پوچھا۔ ''کھانا کھا لیجیے.....'' وہ پلنگ سے نکل کر بولی۔

''ناں ناں..... ناں بھئی تمہیں سردی لگ جائے گی..... بس میں ابھی آتا ہوں..... ویسے بھی مجھے کچھ

ابھی بھوک نہیں ہے......"

"میں ساتھ چلتی ہوں......"

"تمہارے آنے سے پہلے بھی میں کھانا کھایا کرتا تھا راحیلہ......" چند لمحے دروازے کی جانب چل کر وہ پھر رک گیا...... "میری غیر موجودگی میں ڈرتو نہیں لگے گا......"

راحیلہ یہ جملہ سن کر پتھر کی مورت بن گئی۔ یہ الفاظ گویا اس کے ماضی کو پکار پکار کر بلا رہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جس شاہد کے تصور سے وہ خوفزدہ تھی۔ اب وہی تصور خوش آئند وتقویت بخشنے والا تھا...... کسی پردے کے پیچھے وہ مسکراتی بھوری آنکھیں...... اس کے ذہن میں اس تصویر کی گونج پھیلنے لگی جیسے کسی وادی میں گرجے گھر کا گھنٹہ! پتہ نہیں آواز کا تصور بڑا تھا کہ تصویر کا بہر کیف جب ٹھنڈا کھانا کھا کر قیصر سونے کی تیاری کرنے لگا تو وہ اس قدر تھک چکا تھا کہ بغیر کپڑے تبدیل کیے لحاف میں گھس گیا۔ پھر اس نے راحیلہ کے سر کو بچوں کی طرح تھپتھپانے کی کوشش کی اور چند لمحوں میں خود گہری نیند سو گیا...... اب راحیلہ کو پردے کے پیچھے بھوری آنکھوں کا خوف نہ تھا۔ وہ کہنی کے بل ہو کر قیصر کا چہرہ دیکھنے لگی...... ان پچھلے پانچ مہینوں میں قیصر کے بال بے تحاشا سفید ہو گئے تھے۔ ماتھے کی سلوٹیں گہری ناک کا بانس بہت تیکھا ہو گیا تھا۔ وہ بیمار نظر آتا تھا۔ قیصر نے کروٹ لی اور بچوں کی طرح بے سدھ سو گیا۔

راحیلہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے جگانا چاہا لیکن پھر وہ آہستہ آہستہ کچھ اپنے آپ سے کچھ قیصر سے بولی...... "قیصر تم نہیں جانتے...... میں نے جاگتی آنکھوں سے بڑے بھیانک خواب دیکھے ہیں۔ بھلا جب نیند مجھ سے کوسوں دور ہے تو تم کیوں آرام سے سوتے ہو؟...... پتہ ہے ابھی میں نے کھلی آنکھوں خواب دیکھا...... مجھے نظر آیا میں تمہارے گھر میں نہیں ہوں...... تمہارے ملک میں بھی نہیں ہوں...... وہاں ہوں...... جمیلہ اور اس کی سہیلیاں مجھے گھیرے ہوئے ہیں...... میری جوتی کا جوڑا کھو گیا ہے سنو...... میں وہ سینڈل تلاش کرتی ہوں ہر جگہ...... ہر جگہ...... ہر جگہ...... مجھے خواب میں بھی معلوم تھا کہ وہ سینڈل پہن کر مجھے پاکستان آنا ہے...... یہاں وہی پہن کر تمہاری تلاش کرنا ہے...... میں جانتی ہوں کہ وہ جوتیاں یہاں پہنچ کر مجھے میرے پیروں پر کھڑی کر دیں گی...... لیکن کوئی نہیں بتاتا کہ وہ کہاں ہیں۔ سنو میں عابدہ سے پوچھتی ہوں...... وہ جواب نہیں دیتی...... جمیلہ سے سوال کرتی ہوں وہ منہ پھیر لیتی ہے۔ تم تسنیم باجی کو نہیں جانتے ناں لیکن وہ تو ہمیشہ جواب دیتی تھیں...... وہ بھی خاموش ہو جاتی ہیں۔ سنو قیصر! سو ؤ نہیں...... میری بات سنو...... میں ایک ہسپتال میں...... جوتے تلاش کرتی ہوئی پہنچ جاتی ہوں...... پھر ایک نرس سے کہتی ہوں سسٹر...... آپ نے میرے سینڈل دیکھے ہیں۔ ان کے بغیر میں زیادہ دیر چل نہیں سکتی اور سفر لمبا ہے......" قیصر سن نہیں رہا تھا لیکن راحیلہ سانسوں میں بولے جا رہی تھی۔ قیصر کے خراٹے اونچے ہو رہے تھے اور وہ بوڑھے آدمی کی نیند سو رہا تھا۔

"قیصر...... جب میں نرس سے بات کرتی ہوں تو وہ ایک دروازہ کھول دیتی ہے خاموشی کے ساتھ...... جیسے اس کی نظریں دروازہ کھولنے کی اہل ہوں...... میں اندر جاتی ہوں...... قیصر...... لوہے کے بیڈ پر لال کمبل اوڑھے شاہد پڑا ہے۔ اس کے ماتھے سے لہو جاری ہے...... اس کی آنکھیں پتھرا رہی ہیں...... میں اس سے پوچھتی ہوں...... قیصر...... سوال کرتی ہوں کہ میری جوتیاں کہاں ہیں؟...... مجھے لمبے سفر پر جانا ہے...... وہ کہتا ہے میں تم سے بھی لمبے سفر پر جا رہا

ہوں..... تمہارے جوتے اس لیے چرائے ہیں کہ تم میرے پیچھے پیچھے ان کی تلاش میں آ سکو..... بھلا بتاؤ..... یہ جوتے کیا ہیں قیصر؟ ان کی اتنی ضرورت کیوں ہے؟ کیا جوتوں کے بغیر انسان اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا..... بتاؤ قیصر..... ان جوتوں کی تعبیر کیا ہے؟"

یکدم قیصر نے کروٹ لی اور اس کے سر کو تھپتھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے سانس میں سے Pencillin کی خوشبو آ رہی تھی..... راحیلہ نے اپنا چہرہ تکیے میں چھپا لیا اور ایک بار پھر درود شریف پڑھنے میں مشغول ہوگئی۔

صبح جب پردوں کی جھری سے سورج کی کرنوں نے پلنگ پر روشنی کی ایک لمبی لکیر ڈالی اور زینو نے باورچی خانے میں برتن کھنکھنائے تو راحیلہ کی آنکھ کھل گئی۔ اپنے بھاری پپوٹے کھول کر اس نے ارد گرد نظر دوڑائی۔ قیصر نہایا دھویا پینٹ قمیض میں ملبوس نیلے کوٹ کو پہننے کے عمل میں تھا۔ اس کا چہرہ بیمار لگتا تھا۔ شاید راحیلہ کے سو جانے کے بعد وہ جاگتا رہا۔ قیصر کو دیکھ کر راحیلہ کو لگا جیسے وہ بھی چپکے چپکے بغیر جوتوں کے لمبی مسافت سے لوٹا ہے۔

راحیلہ ابھی تک قیصر کی قمیض میں ملبوس تھی۔ اس نے لحاف کندھوں تک لا کر قیصر سے پوچھا..... "آپ مجھ سے خفا ہیں؟....."

"میں.....؟ نہیں تو....."

"تو پھر آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں....."

"بس آج کام بہت ہے..... دو آپریشن ہیں آج....."

"کام تو ہمیشہ ہی بہت ہوتا ہے قیصر؟..... کوئی دن ایسا بھی ہوتا ہے جب کام نہ ہو؟"

قیصر کوٹ درست کرتا ہوا پلنگ پر آ بیٹھا..... "اگر تم مجھے قیام پاکستان سے پہلے ملی ہوتیں تو ایک مختلف قیصر سے ملاقات ہوتی۔ اب پاکستان کے مسائل میرے مسائل ہیں..... تین طرف جنگ ہے راحیلہ..... ہندوستان..... مسئلہ ریفیوجیز..... اور ہم خود..... سب سے بڑا مسئلہ ہماری اپنی ذات کا ہے۔ زیادہ تر لوگ پاکستان میں اپنے فیصلے سے نہیں آئے دھکیلے گئے ہیں۔ بہت سے وہاں کی معاشی تنگدستی سے گھبرائے ہوئے ادھر آئے۔ کچھ نے اپنی عزت کو بچانے کی خاطر ادھر کا سفر کیا۔ وہ اب اکثریت کے ہاتھوں ملیچھ بد ذات 'تھرڈ ریٹ' نہیں کہلانا چاہتے تھے..... کچھ نے سوچا ہی نہیں اور دوسروں کی نقل میں آ گئے..... یہی بنیادی مسئلہ ہے اور سب سے بڑا ہے۔ ہم اپنی ذات سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں پر پوچھ نہیں سکتے کہ اس نئے وطن کو اپنانے کی میری اصل وجہ کیا ہے؟ کیا واقعی میں یہ سمجھتا ہوں کہ پاکستان کا مطلب لا الہ الا اللہ ہے؟..... سنو راحیلہ! جب کسی کو اصلی وجہ سمجھ میں آ جاتی ہے تو پھر ہجرت اس کے لیے کامیابی کا زینہ بن جاتی ہے۔ جب بنیادی طور پر کوئی یہی نہ سمجھ پائے کہ وہ کوئی عمل کیوں کر رہا ہے تو پھر آگے چل کر مشکلات کا مقابلہ کیسے کرے گا۔ مقابلہ کرتا وہی شخص جانتا ہے جس کو خود علم ہو کہ اس کی نیت کیا ہے؟....."

راحیلہ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے..... وہ بھی تو پورے طور پر نہ جانتی تھی کہ قیصر منزل میں پناہ لینے کی اصل وجہ کیا تھی؟

"تمہیں کس بات کا خوف ہے؟..... ہم ارسلان قیصر کے لیے وہ سب کچھ کریں گے راحیلہ جو والدین کرتے

ہیں۔ میں ابھی تمہیں کافی وقت نہیں دے سکا لیکن انشاء اللہ جلد یہ مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے تو وقت بچنے لگے گا۔ ابھی تو کیمپ بھرے ہیں۔ تشدد کے مارے لوگ پناہ لینے آتے جا رہے ہیں۔ ابھی تو کسی کو سوچنے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ تمہارے سارے خوف..... چھوٹے بڑے میں اپنے کندھوں پر اٹھاؤں گا راحیلہ..... یہ تمہارا گھر ہے۔ ایک بار تم اس پر قابض ہو کر تو دیکھو..... اسے اپنا کر تو دیکھو.....''

''میں ہمیشہ سے ڈرتی چلی آئی ہوں..... میرا بچپن پہاڑوں میں گزرا قیصر..... وہاں برسات کے دنوں میں جب بادل ترائی سے چڑھ کر اوپر گھروں میں آتے تھے تو مجھے لگتا تھا کہ ہم سب تہہ سمندر میں چلے جائیں گے اور پھر کبھی باہر نہ نکلیں گے۔ دادا بابا نے ایک تعویذ لکھ کر دیا تھا۔ اماں ساجدہ خود اسے چاندی کے غلاف میں مڑھا کر لائی تھیں..... لیکن ایک دن میں نے اسے غسل خانے کے طاق پر رکھ دیا۔ جانے کوئی جن اٹھا کر لے گیا یا کسی نے چاندی کے لالچ میں اٹھا لیا..... اب پھر خوف آنے لگا ہے..... جب تک تم گھر پر ہوتے ہو سب ٹھیک رہتا ہے..... آپ کب اٹھے تھے؟''

''چار بجے.....''

''اور آپ نے مجھے جگایا نہیں..... یہ اچھی بات نہیں ہے.....''

''تمہاری نیند مجھے بڑی پیاری ہے راحیلہ.....''

''آپ مرجھائے ہوئے سے ہیں کیوں.....''

''نہیں کوئی خاص بات نہیں۔''

یکدم لحاف اتار کر راحیلہ اٹھ بیٹھی.....''آپ مجھے کچھ بتاتے نہیں قیصر! اپنے متعلق..... آپ مجھے اپنا نہیں سمجھتے.....''

قیصر اٹھ کر اپنا بریف کیس صاف کرنے لگا۔ وہ راحیلہ کو بتانا چاہتا تھا کہ آج تک اس نے اپنے متعلق کسی کو بھی تو کچھ نہ بتایا تھا۔ وہ تو اپنی ماں کے قریب نہ ہو سکا۔ بہن بھائیوں اور اس کے درمیان بھی کئی پردے حائل تھے۔ جم جو اس گھر میں کئی سال تو اترے آتا رہا اور جس نے اپنی زندگی کے سارے ورق قیصر کو پڑھائے اور کوئی طاق دریچہ کوٹھڑی ایسی نہ تھی جس پر روشنی ڈال کر جم نے قیصر کو اپنی شناخت نہ کرائی۔ قیصر کے سارے گودام سیل بند رہے اس نے کوئی نمبروں والا تالا کھول کر نارچ جتنی روشنی ڈال کر اپنے اندھیرے کمروں کو اجالا نہ بخشا..... قیصر کا سب کچھ اتنا ہی تھا جس قدر نظر آتا تھا اور بظاہر وہ بیار زوز حا اور بڑا ہی پر سکون شخص تھا۔

زینو سلیپروں کو بجاتی عالیہ کو آوازیں دیتی بیڈ روم میں آئی۔ اس نے چائے کا ٹرے اٹھا رکھا تھا۔

''توسٹ لے ابھی آ عالیہ..... راستے میں ہی مرجاتی ہے کہیں۔''

''زینو..... آج سے تم رات یہاں ہی رہو گی..... اوپر لالو سے بھی کہو کہ وہ ساتھ والے کمرے میں سو جایا کرے۔''

''اچھا جی سو جایا کروں گی.....'' منہ بنا کر زینو نے کہا.....''اپنی بات تو پکی ہے لیکن لالو نول بے نول..... اس کی گارنٹی نہیں لے سکتی.....''

"فتح خان سے کہنا' وہ لالو کی کار نئی لے گا....."

زینو اپنے طور پر بھی کہ شاید بچے کا وقت قریب ہے اور ڈاکٹر صاحب اس لیے یہاں رہنے کو کہہ رہے ہیں۔ اس نے طوعاً و کرہاً رات گزارنے کی حامی بھری۔

قیصر اگلی رات بھی بہت دیر سے پہنچا۔ ہمیشہ کی طرح کیمپ میں لاہور والے چاہے کتنی ہی دیگیں پکا کر لاتے' وہ کم ہی پڑتیں اور جتنے ڈاکٹر بھی رضاکار طور پر کام کرتے رہتے' زخمیوں اور مریضوں کی دیکھ بھال کم ہی پڑتی۔ فتح خان ڈاکٹر صاحب کے آنے تک گھر کے چکر ہی لگاتا رہا۔ زینو بھی صحن کے ساتھ والے برآمدے میں سوتی۔ لالو بھی ساتھ والے کمرے میں گانے گاتا گھوک سو گیا لیکن ڈر کا جال پھیلتا ہی گیا۔ اب وہ بیٹھے بٹھائے قیصر کی صحت کے متعلق پریشان ہو گئی۔ ذیابیطس کی بیماری نے کوزہ دق' دل کا عارضہ اور جانے کیا کیا روپ دھار لیے۔ معمولی جوڑوں کا درد ہمیشہ کے اپاہج پن میں بدل گیا..... ہر طرف تابوت ہی تابوت نظر آنے لگے۔ یہ تصوری دنیا کے دکھ کچھ محدود نہ رہے۔ تخیل انہیں رنگوں سے سجاتا چلا گیا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ ہر تابوت پر ایک ہی چہرہ مسکرا رہا ہے۔ وہ بھوری آنکھیں..... طنز سے اٹھے ہوئے ابرو' مسکراہٹ میں ڈوبے ہونٹ..... آخر میں راحیلہ اس قدر پریشان ہوئی کہ اس کے آنسو تکیے میں جذب ہونے لگے..... "چلے جاؤ شاہد چلے جاؤ..... قدرتی محبتوں کا عہد گزر چکا..... اب اختیاری وابستگی کا عہد ہے..... مجھے اپنے فیصلوں پر سسکنے کے لیے نہ چھوڑو..... جس طرح ابراہیم لاج..... ساجدہ ماں..... اباجی..... دادا..... حتیٰ کہ تسنیم آپا نے مجھے آزاد کر دیا..... تم بھی میرا تعاقب چھوڑ دو..... وہ مجھے میکے گھر سے سسرال رخصت کر چکے..... اب مجھے بسنے دو شاہد..... اپنا گھر بسانے دو..... مجھے اپنی محبت سے اپاہج نہ کرو شاہد' اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جانے کی اجازت دو.....!"

رات گئے جب قیصر آیا تو راحیلہ کمرے میں گھوم رہی تھی۔ قیصر نے اسے کندھوں سے پکڑ کر دلاسہ دینا چاہا تو وہ پھٹ پڑی..... "قیصر جی..... ڈاکٹر صاحب یہ بڑا منحوس گھر ہے۔ یہاں میں اندر سے ٹھیک نہیں رہتی..... ان کمروں میں مجھے نیند نہیں آتی۔ میرا دم گھٹنے لگا ہے یہاں..... ہم کسی کھلی جگہ چلے جائیں..... میں دراصل کبھی کسی گلی میں رہی نہیں..... مجھے نہ یہاں کے آداب آتے ہیں نہ یہاں بسنے والوں کی سمجھ آتی ہے....."

"ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے' ہم وارث روڈ کی کوٹھی میں چلے جائیں گے..... اس کے سامنے کشادہ لان ہے..... بڑے بڑے درخت ہیں۔"

"بالکل بالکل ابراہیم لاج کی طرح........ پہاڑوں کی طرح....."

"میں تمہارے لیے بڑے بڑے باغات بناؤں گا..... لیکن تم میرا ساتھ تو دو..... ایک بار میرے کندھے پر..... اپنے پیروں پر اپنا پورا وزن تول کر یہ تو کہو..... کہ ہم..... اکٹھے ہیں اور ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں..... لیکن تم تو ایسی دولہن ہو راحیلہ جو اپنی یادوں کی ڈولی سے نکلتی ہی نہیں ہو..... میں تمہیں اپنے حجلۂ عروسی میں کیسے لے جاؤں راحیلہ؟"

یہ پہلی اور آخری بار تھی جب قیصر نے راحیلہ سے کوئی گلہ کیا۔ اس کے بعد وہ بالکل نارمل ہو گیا اور بڑی التجا سے بولا..... "ذرا پانی گرم کرو..... یہ گھٹنا بہت سوج گیا ہے..... تم ٹھیک کہتی ہو پہلے مجھے اپنی اور اپنے گھر بار کی فکر کرنی چاہیے

ورنہ کسی دن اچانک پڑ رہوں گا....."

قیصر منزل میں پہلی بار رات سرعت سے بھاگنے لگی۔ آسمان پر سردیوں کا بہکا ہوا چاند چپو چلاتا ہوا رواں ہو گیا۔ راحیلہ سو گئی تو قیصر جاگتا رہا.....اسے اچانک اپنی صحت کے متعلق بڑی تشویش ہو گئی تھی۔

☆☆☆

وسط دسمبر سے لاہور کی فضا عموماً ابر آلود رہتی ہے.....یہ ابر نہ تو کھلتا ہے نہ برستا ہے اور گو ہوائیں نہیں چلتیں لیکن سرسراتی سردی ریڑھ کی ہڈی میں اترتی چلی جاتی ہے۔ صبح سویرے دھند سڑکوں پر تیرتی نظر آتی ہے۔ اس میں شہر کے مناظر یوں نظر آتے ہیں جیسے جامد پانی میں سیاہی گھلی مل جا رہی ہو۔ سورج چھدرے گھرے بادلوں کو چیر کر اپنی حدت لوگوں تک پہنچانے کی سعی تو کرتا ہے لیکن نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ ایک افسردہ سی روشنی شہر کی عمارتوں پر پھیل جاتی۔ شام کو لاہور کے باسی بھاری کوٹ پہنے سینما ہالوں کے طواف کاٹتے نظر آتے۔ ابھی سینما گھر شہر کی سب سے بڑی تفریح تھی۔ ان لوگوں کو دیکھ کر احساس ہوتا کہ جو حدت اور گرمی تاریک گلیوں' ٹھنڈے صحنوں' سیلی لانوں میں نہ ملی وہ شاید ایک دوسرے کی لاتعلق صحبت میں اس ہال کے اندر ملنے والی تھی۔ شہر ابھی تانگوں سے آباد تھا۔ سائیکلیں بافراط نظر آتی تھیں اور رکشہ غلطی سے بھی دکھائی نہ پڑتا تھا۔ نہر کے پار آبادی نام کو تھی اور شہر ایک طور پر یہاں ختم ہو جاتا تھا۔ سکول کالج گنتی کے تھے۔ اساتذہ ابھی ٹیوشن نہ پڑھاتے تھے اور شہر کے معزز لوگوں میں ان کی بہت عزت تھی۔ برف خانے اور فلور ملز سب سے بڑی انڈسٹری تھی۔ ابھی پرائیویٹ سیکٹر سردیوں کی شام بن کر سویا ہوا تھا۔ لوگ اپنے ارد گرد کے ماحولیات سے زیادہ واقفیت نہ رکھتے تھے۔ ابھی پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا انگڑائیاں لے رہے تھے.....ریڈیو کے اناؤنسر' آرٹسٹ' ڈرامے گھروں میں گفتگو کی زینت تھے.....زندگی کی رفتار تمام مسائل کے باوجود پاؤں پیدل چل رہی تھی۔ ابھی نوجوان عشق کو اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے تھے۔ ان کے شب و روز ابھی خوشبودار لفافوں کے سہارے گزر رہے تھے۔ ٹیلی فون کا رواج نہ تھا۔ ٹیلی ویژن کا ذکر بھی کہیں نہ تھا۔ ابھی لوگ مادی ترقی کے متعلق کھلم کھلا باتیں نہ کرتے۔ رشتے ناطے زندہ تھے اور ابھی انسان کو انسان کی مدد' دشمنی' محبت' نفرت ساری کیفیات درکار تھیں۔ وقت سستا تھا' دوستی مضبوط تھی۔ گھریلو زندگی زندہ اور محبت تعاقب کرنے والی تھی۔ لوگ قدروں کو پالنے پوسنے اور روایات کو قلفہ سونگھانے میں وقت صرف کرتے تھے۔ کلچر واضح تھے۔ ان پر مغربی یلغار ابھی شروع نہ ہوئی تھی۔ لوگ اپنی شناخت کے لیے کلچر یا دولت کو استعمال کرنے کے عادی نہ تھے۔ اندر اندر گھس بیٹھو سرنگ مارنے لوگوں کے وسائل کو لوٹنے کے درپے تھے۔ الاٹمنٹ کے چکر چل رہے تھے لیکن عام انسان حال میں زندہ تھا اور نئی تبدیلی کے باعث ٹھٹھرا ٹھٹھرا تھا۔ لوگ کولہو کے بیل کی زندگی پسند کرتے تھے۔ صبح و شام کی یکسانیت کو منانے کے لیے ان کے پاس ایٹم بم' کمپیوٹر' فیکس' ہوائی سفر' نت نئی گاڑیاں نہ تھیں.....اسی لیے وہ برسوں ایک ہی کیفیت' ایک ہی محبت' ایک سے لباس گھر اختیار کرنے کو زندگی کی معراج سمجھتے تھے.....وفا ان کے لیے ایک جیتی جاگتی دیوی تھی جس سے منہ موڑنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ استقامت تھی تو اسی بات میں کہ انسان بوڑھے انسان' کلچر' زبان' مسلک سے روگردانی نہ کرے۔

راحیلہ بھی ابھی تک وفا کے چکر سے نہ نکلی تھی!

وفا کا یہ اصرار ایسے ہی تھا گویا بچپن سے نکل کر کوئی جوان تو ہو گیا ہو لیکن بچہ رہنے پر مصر ہو۔ بڑھاپے میں

نوجوان بنے رہنے کو اہمیت دے۔ سردیوں میں گرمی کا وطیرہ اختیار کرے اور شام کو صبح میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ تبدیلی انسانی زندگی کی بڑھوتری کے لیے ویسے ہی اہم تھی جیسے استقامت..... بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ خیر و شر تبدیلی و استقامت بہادری اور بزدلی محبت و نفرت ایک ہی سکے کے دو اطراف تھے۔ انسان جو بدی اور اچھائی کا سانجھا مرقع تھا ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے تضاد کو مکمل طور پر حل کرنے پر قادر نہ تھا۔ وہ گھڑی کے پنڈولم کی طرح ایک انتہا سے دوسری انتہا میں چکر لگاتا تھا لیکن اپنے آپ کو کہیں وسط میں رکھنا اور تضاد کا بنیادی تصور رکھ کر اپنے آپ کو وسط میں رکھنا کہ زندگی کا وقت درست پڑے اور منٹ سیکنڈ اور گھنٹوں کی سوئیاں حساب سے چلیں بڑی سوجھ بوجھ سے آتا تھا..... راحیلہ بھی ابھی تک اپنے تضاد کا درست حل تلاش نہ کر پائی تھی۔

قیصر منزل میں یہ ایک ٹھنڈی افسردہ صبح تھی۔ صبح کے دس بج چکے تھے لیکن سورج کی نامکمل ضیاء بادلوں میں ایسی گم تھی کہ ابھی ہر طرف سویرا لگتا تھا۔ راحیلہ نے گھڑی پر نگاہ دوڑا کر اٹھنے کا قصد کیا ہی تھا اور اپنے آنکس کو اتار پھینکنے کا ارادہ باندھا ہی تھا لیکن پلنگ کی پشت سے تکیوں کے سہارے بیٹھے رہنے میں جو لطف تھا وہ ٹھنڈے کمروں صحن اور اونچی دیواروں میں کہاں تھا۔ اس نے تپائی پر دھری قیصر کی جرسی اٹھائی اور اسے بننے کا ارادہ کیا لیکن اس کا دل سلائیوں کی نکا تک میں نہ تھا۔ جوں جوں آگے جاتا اس کے تصورات کو الجھاتا ہی جاتا۔ اس نیم تاریک کمرے میں جہاں مکمل سکوت تھا اس طرح آنکھیں بند کیے وہ ایسی شہزادی لگ رہی تھی جسے ایک بانکے شہزادے نے سو سالہ نیند سے جگایا۔ پلکوں کی گھنیری صف رخساروں پر ایک غیر واضح سایہ ڈال رہی تھی۔ یہ سایہ خیالات کے بوجھ سے لرزاں تھا۔ لب ذرا سے کھلے تھے اور دانتوں کی سفیدی باریک لکیر کی شکل میں نظر آ رہی تھی۔ کان کا گول بالا رات بھر کے الجھے بالوں میں یوں گم تھا جیسے پہلی کا چاند ٹہنیوں میں کھویا ہوا ہو..... راحیلہ نہ سویٹر سے آگاہ تھی نہ اپنے حسن سے۔ وہ تو اپنے ماضی سے جان چھڑاتے ہوئے بھی اسی کے سہارے جی رہی تھی۔ ہر لمحے وہ اپنے تخیل کے زور پر کسی تصور کو دیکھنے میں کامیاب ہو جاتی۔ پھر یہ رنگین چڑیا اپنی ہی اڑان لے کر او جھل ہو جاتی۔ راحیلہ ماضی کے اس nostalgia سے بچنا چاہتی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ حال سے بے وفائی کر رہی ہے لیکن پرانی ملاقاتیں ابھر رہی تھیں..... مانوس چہرے دکھائی دے رہے تھے۔

اس افسردہ سی سردیوں کی صبح میں اسے وہ دن یاد آ رہا تھا جب پہلی بار اسے بہار کے موسم کا احساس ہوا تھا..... اچانک اس کے لہو میں موسم کا جلترنگ بجا تھا۔ گلاب کے پھول دھڑا دھڑ کھلے تھے۔ آڑو بادام اور آلوچے کے درختوں میں شگوفوں نے دھنکی ہوئی روئی ایسے گالے بکھیر رکھے تھے۔ ہری گھاس تر و تازگی میں بے نظیر تھی اور اس ہری بھری دھوپ میں جا بجا ننھے ننھے پیلے اور کاسنی پھول یوں سر اٹھا رہے تھے جیسے بڑوں کی محفل میں بچے اپنی جگہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ چڑیوں کی چہکار ایسی خوش کن تھی کہ احساس ہوتا انسان بھی فقط ایک نغمہ ہے جو ازل سے ابد تک وقت کی لہروں میں ڈوبتا ابھرتا چلا جاتا ہے۔ ہری گھاس نوشگفتہ شگوفوں کے اوپر ابریشمی بادل جو چلے نیلے آسمان پر ڈولتے پھرتے اور بہکتی چڑیوں میں انسان کا سنگیت جو زیر و بم میں ڈوب ڈوب کر ابھرتا ہے اور ابھر ابھر کر ڈوب جاتا ہے..... انسان بہار کے موسم میں فطرت کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ کسی اور موسم میں یہ وابستگی اتنی نیچرل نہیں ہوتی۔ راحیلہ کو بھی ایسا ہی بھرپور احساس ابراہیم لاج کے اندر بیٹھنے نہ دیتا تھا۔ وہ ہوا بھولا ؛ نغمے میں تحلیل ہو جانا چاہتی

تھی۔ فضا میں تتلیوں کی ہم رنگ خوشیاں تیرتی پھرتی تھیں.....

یہی خوشبو میں بسے دن تھے جب بیٹھے بٹھائے' چلتے چلتے اچانک اس کی نگاہوں کے سامنے شاہد کا چہرہ آ کر رک جاتا۔ پھر سورج کی آخری کرن جب بہار کو خدا حافظ کہتی اور شاہد گھر آتا تو راحیلہ کی تنہائیاں اداس ہو جاتیں۔ خواہ مخواہ آنکھوں میں تارے سے جھلملانے لگتے اور جی میں ناقابل برداشت بوجھ سا جم کر رہ جاتا۔ ہاں اس رُت کا نشہ اور احساس کبھی کبھی رات کو اسے جگا دیتا اور شاہد مسکرا کر اس کے تصور میں جھول جاتا۔ کوئی چھوٹی سی بات' معمولی سی حرکت' کیفیت چشم آواز کا زیرو بم اسے رہ رہ کر یاد آتے اور وہ کروٹیں بدلنے لگتی.....راحیلہ بہار کے نئے احساس سے مضطرب بھی رہتی تھی اور مضطرب کر بھی دیتی تھی۔

لیکن ایک عجیب بات تھی۔ ان بہار یہ دنوں میں اسے سب اچھے لگتے تھے.....ساجدہ ماں' ابا.....دادا ابا.....تسنیم' ٹوٹو.....سب ہی اچھے تھے۔ سب ہی پیارے تھے حتیٰ کہ اسے عابدہ بھی ان دنوں میں بری نہیں لگتی تھی۔ ان ہی دھنک سپنوں کے دنوں میں ایک روز وہ تسنیم آپا کے ساتھ لان پر ٹہل رہی تھی۔ اسے گہرا احساس تھا کہ اس دلفریب شام کو مکمل بنانے کے لیے تسنیم آپا کا وجود کافی نہیں۔ یہ سارے پھول' مہک' رنگوں میں لپٹے درخت' نیل میں رنگا ہوا آسمان' خنکی میں لپٹی ہوئی ہواؤں کا تاثر ادھورا ہے.....

کچھ تو ہے جو نہیں ہے.....اور کچھ تو ایسا بھی ہے جو اس فضا کے لیے بے انتہا ضروری ہے اور موجود نہیں اور پہلی بار اس نے چوری چوری دعا مانگی کہ بہار کی کمان سے نکلا ہوا تیر شاہد کے روپ میں آئے اور اس کے سینے سے آر پار ہو جائے.....وہ بھی عجیب بہار تھی۔ ادھر تمنا کی دعا ہوئی اور شگوفہ پھول بن کر کھل اٹھا۔ اس وقت بھی راحیلہ نے دو چکر بھی نہ لگائے تھے کہ بازہ تاپ کر شاہد بہار کا پیامی بن کر آ گیا۔ زندگی پہلی بار راحیلہ کے اندر فوارہ بن کر اچھلی۔

راحیلہ نے جھرجھری لی۔ لمبی سانس لیتے ہوئے قیصر کے تکیے پر نگاہ کی.....قیصر کے طرف کی چادر گدلی تھی لیکن قیصر گھر پر نہیں تھا۔ ہمیشہ کی طرح قیصر صبح چار بجے اٹھا تھا۔ نہایت گربہ پائی سے وہ الماری تک پہنچا۔ اپنا اوورکوٹ نکالا۔ کوٹ پہن کر بالوں میں انگلیاں پھیرتا وہ راحیلہ والی سائیڈ پر آیا۔ زیرو کا بلب روشن تھا اور اس میں راحیلہ سو سالہ سوئی ہوئی شہزادی کی مانند بے سدھ پڑی تھی۔ قیصر اس کے ماتھے پر جھکا اور پھر دبے پاؤں دھرتا باہر نکل گیا.....اس کے معمول سے فتح خان بخوبی واقف تھا۔

گلی سنسان تھی۔ ٹھٹھرے ہوئے کتے کسی کسی دروازے کے ساتھ چھپا چھپا سے پڑے تھے۔ فضا کہر آلود تھی۔ سرکلر روڈ پر ادھوری سی روشنی تھی۔ نکڑ پر دودھ والے کا ریڑھا کھڑا تھا اور اس نیم اندھیرے میں اس کی پیتل کی گاگریں چمک رہی تھیں۔ دور کسی سڑک پر گھوڑے کی ٹاپیں اور گھونگھروؤں کی جھنکار سحر زدہ شور بن کر چلی آتی تھیں۔ آدھے سوئے آدھے جاگے شہر سے قیصر بخوبی واقف تھا۔ وہ ہر روز اسی طرح کوٹ کے کالر اٹھائے سردیوں میں بھی سیر کے لیے جاتا تھا۔ مینار پاکستان تک اس کی Beat تھی۔ پتہ نہیں کیوں وہ اس جگہ پہنچ کر اپنے آپ کو کسی منزل' آدرش کسی خواب کا حصہ محسوس کرتا۔ شادی کے اولین دنوں میں اس نے راحیلہ سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ بھی صبح سویرے اس کے ساتھ سیر کے لیے جائے لیکن وہ رات گئے تک جاگتی رہتی تھی۔ صبح اٹھنا اس کے لیے زبردست مہم سر کرنے سے کم نہ تھا۔ قیصر نے بھی راحیلہ

کے ماضی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہ کی تھی لیکن ایک دن اس نے صبح راحیلہ کا کندھا تھپتھپا کر اٹھایا تو وہ ڈر گئی اور ہڑبڑا کر بولی...... ''برات آ گئی..... آ گئی برات؟..... دولہا کیوں نہیں آیا؟''

قیصر نے خواب میں جاگی راحیلہ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا...... ''سو جاؤ...... سو جاؤ۔ ابھی بہت صبح ہے......''

راحیلہ نے قیصر کی جانب ایسے دیکھا جیسے پہچان نہ رہی ہو...... پھر وہ علیحدہ ہو کر سارے کمرے کو اجنبی نظروں سے دیکھنے لگی۔

قیصر نے اس کے دونوں ہاتھ بڑی محبت سے پکڑے اور دلار سے بولا...... ''یاد ہے تم نے سیر پر جانے کا وعدہ کیا تھا...... میں تمہیں اسی لیے جگا رہا تھا......''

''ہاں سیر کے لیے...... میں...... جانا چاہتی ہوں...... ہمیں تو سیر کے لیے جانا ہے...... وعدہ کیا تھا میں نے......''

قیصر نے اس کا سر تکیے پر ٹکاتے ہوئے کہا...... ''تم ابھی سو رہی ہو راحیلہ...... میں اکیلا چلا جاؤں گا...... سو رہو پلیز۔''

راحیلہ کچھ سوئی کچھ جاگی خاموش ہو گئی۔ وہ اس کے قریب تب تک بیٹھا رہا جب تک اس کی سانسوں میں نیند کی تھکن نہ آ گئی اور اس کے نتھنے بڑی ہمواری سے لرزنے نہیں لگے...... پھر وہ اٹھا اور باہر جا کر صحن میں بیٹھ گیا...... وہ چھوٹے چھوٹے جملوں سے راحیلہ کی نشست و برخاست سے کبھی کبھی جوش میں آ کر جو باتیں وہ بتا دیتی ان سب کو ملا کر ایک جگہ سو پزل تعمیر کرتا رہتا۔ راحیلہ کو جاننے کی خواہش مکمل طور پر گرفت میں لینے کی آرزو کم نہ ہوتی۔ اسی طرح سیر کرنے کا مشغلہ نہ بدلا اور نہ ہی وہ سوچ بدل پائی جو نکاح کے دن سے اس کے ساتھ تھی۔

وہ پھر مینار پاکستان کی طرف بڑھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا شاید یہ مینار مہاجرین کا دل جیتنے کے لیے کافی نہ تھا۔ ان کے دلوں میں کچھ اور برجیاں لاٹ دریچے بھی کھلے تھے۔ راحیلہ کے اندر بھی کوئی ایسی کیفیت یا خلش تھی جسے وہ جیت نہ پایا تھا۔ اسے راحیلہ سے صرف محبت ہی نہ تھی بلکہ وہ اسی کے سہارے زندہ تھا۔ ماضی کی ساری تلخیوں کو اس اخوان پوش نے ڈھانپ لیا تھا۔

قیصر اور راحیلہ......

قیصر اور انسولین کے ٹیکے......

قیصر کی بے معنویت اور کیمپ......

قیصر کی تنہائی اور غم...... وہ کئی لاٹھیوں کے سہارے زندہ تھا۔

قیصر کی اپنی زندگی ایک ایسے خطے کی طرح تھی جو بسنے والوں کی آس میں جیتی ہے...... جو کبھی بارش کی راہ دیکھتی ہے۔ کبھی ہل کی...... کبھی بیج کی منتظر ہوتی ہے کبھی کٹائی کی...... اس کی زندگی مسلسل انتظار تھی۔ ذیابیطس اور محبت نے اسے بے وقت گھیر لیا تھا۔ اسے اندیشہ لگا رہتا کہ عمر اسے ان دونوں سے نپٹنے کی مہلت نہ دے گی۔ یوں تو اس نے کئی ادھوری مجبوریاں کافی نبھتیں کی تھیں لیکن یہ چاہت اسے زیر آب کر گئی تھی۔ وہ راحیلہ کو مدنظر رکھ کر ہر شے کے متعلق سوچتا۔ راحیلہ اس کے جینے کی اساس خوشیوں کا ترازو تھی۔

وہ سڑک پر بے مقصد چلتا ہوا سوچ رہا تھا کہ راحیلہ ایسی عورت ہے جس پر کوئی مرد بھی تمام تر قابض نہیں ہو سکتا۔ وہ آغوش میں ہوتے ہوئے بھی کہیں دور دیس میں قرار حاصل کر سکتی ہے اور کہیں بہت دور رہتے ہوئے بھی رگِ جاں میں اترنے کا طریقہ جانتی ہے۔ وہ اس گریز پا چمک کو دیکھنے کا متمنی تھا جو ہر اس عورت کی آنکھوں میں لہراتی ہے۔ جب وہ اپنی مرضی سے مکمل سپردگی میں بدل جاتی ہے لیکن جب بھی قیصر غور سے راحیلہ کی آنکھوں میں دیکھتا وہ نگاہیں جھکا لیتی۔ اس کی مسکراہٹ ایسی چیستاں میں بدل جاتی جس کو آسانی سے سلجھانا قیصر کے بس میں نہ تھا..... اسی تفتیش نے اسی تلاش نے اسے گم گشتہ تو سیب زدہ جھلکڑ قیصر بن جانے میں مدد دے رکھی تھی۔

قیصر کو سرسری سا شاہد کے متعلق علم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر فسادات نہ ہوتے تو راحیلہ اور شاہد کی شادی ہو جاتی۔ وہ شاید یہ بھی جانتا تھا کہ راحیلہ اور شاہد ایک دوسرے میں دلچسپی لیتے تھے۔ شاہد سے مل چکنے کے بعد وہ کچھ مطمئن سا ہو گیا تھا۔ شاہد کے حسن و جوانی سے وہ خم ضرور کھا گیا لیکن آخر اس کے پاس یہ دولت بھی تو نہ تھی..... اگر شاہد کا حسن اسے بے طور تنگ کرتا تو وہ اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے کہتا..... "تو کیا ہمارے معاشرے کی عورت اپنے شوہر کی نہیں ہوتی کیا ہمارا معیار یہ نہیں کہ تن من و حسن سے عورت صرف شوہر کو چاہے؟"

اس لگاؤ کی گہرائی کو وہ غیر شعوری طور پر محسوس بھی کرتا تھا لیکن پھر کچھ شکوک ابھرتے۔ وہ سوچتا جب میں راحیلہ کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیتا ہوں تو کیا اس وقت راحیلہ کا جسم میرے اس والہانہ رویے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر دیتا ہے۔ ایسے لمحات میں اس کا دل پکار پکار کر یہی کہتا ہے کہ کاش وہ شاہد کی آغوش میں ہوتی۔ پھر اس کے اندر سے آواز آتی اگر ایسا ہوتا تو وہ میرا انتظار نہ کیا کرتی۔ وہ میری ان چھوٹی چھوٹی ضروریات کا خیال نہ رکھتی جو خود مجھے بھی بھول جاتی ہیں۔ میری پسند کے کھانے نہ پکاتی..... اس کا رویہ مختلف ہوتا قطعی مختلف!

ازدواجی زندگی کا یہ وقفہ ننھی ننھی خوشیوں سے آراستہ اس کے دل پر دستک دیے جاتا اور وہ سیر کرنے میں مشغول رہتا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں، کہی ان کہی کہانیاں، چھوٹی موٹی حرکات اس کے ذہن میں چیونٹیوں کی قطار بن کر رینگتی رہتیں۔ وہ راحیلہ کے متعلق کسی اہم نتیجے پر پہنچنا چاہتا لیکن ہر روز مقدمے کی تاریخ اگلے دن پر جا پڑتی اور کچھ فیصلہ نہ ہو پاتا۔ بالآخر وہ مینارِ پاکستان کے سامنے ایسی جگہ جا بیٹھا جہاں سے سارا منظر واضح تھا۔

وہ تھک گیا تھا۔ بیماری نے اس کا بھرکس نکال دیا تھا۔ اب تو انسولین کے ٹیکے بھی بیکار ثابت ہونے لگے تھے۔ اس نے فیصلہ کرنے کے قطعی انداز میں سوچا۔ راحیلہ عورتوں کی اس قبیل سے ہے جو جادوگرنی تو ہوتی ہے، پر کوئی اس پر شبہ نہیں کر سکتا۔ جو بظاہر بے اعتنائی برتتی ہے اور جس کی یہ بے پروائی دیکھ کر احساس گزرتا ہے کہ اسے کچھ بھی درکار نہیں۔ وہ بھی اپنی حاجت مندی کی ہتھکڑی میں بندھی ہے۔ وہ بھی بظاہر بے نیاز لیکن حقیقتاً ایک حاجت مند گداگر ہے۔ وہ بھی اپنے سحر کے سہارے زندہ تھی۔

کچھ دیر بعد اس نتیجے سے بھی اس کی تسلی نہ ہو پائی..... کہیں اندر ہی اندر تختی میں بل پڑ گئے..... اس نے نگاہیں اٹھا کر مینار کی جانب دیکھا اور سوچنے لگا کہ اب ہمیں من حیث القوم اور کیا درکار تھا؟ مجھے بطور فرد راحیلہ کے بعد اور کس چیز کی طلب تھی؟ لیکن اس نئی محبت سے قیصر کو عجیب قسم کا ذہنی رنگ رہا تھا۔ اس ماں کی طرح جو قیمتی کانچ کا گلاس بچے

کے ہاتھ میں تھما کر بھی رہتی ہے.....راحیلہ کے قدموں میں اتنی نازک محبت پیش کر کے اس کا دل لرزنے لگا۔ ہاں راحیلہ ایک معمہ ہے ایک کھلا معمہ..... میں اس کے سارے وجود کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکتا۔ یہاں پہنچ کر اس کی شخصیت سب سے بڑی شکست سے آشنا ہوتی۔ ایسی شکست جس میں جیت کا کوئی پہلو نہ نکلتا!

مینار کی جانب دیکھتے ہوئے یکدم اسے قائد اعظم پر بڑا ترس آیا.....وہ ایک عورت کا دل جیت لینے سے قاصر تھا تو قائد انبوہ در انبوہ' گروہ در گروہ..... بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے بوسیدہ گٹھڑوں کی گٹھڑیاں سر پر دھرے' مذہب کو رسم و رواج کے بستر بندوں میں باندھے ہوئے شکلاً' عقلاً' تعلیماً.....اتنے مختلف لوگوں کو کیسے ایک قوم' ایک ملت کی شکل دے سکے گا؟ ہندوستان اگر وشال بھارت کا خواب دیکھ کر احساس کمتری کو طاقت کا ٹیکہ لگانا چاہتا تھا تو قائد اس سے بڑا خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ جغرافیائی طور پر مختلف علاقوں کو یکجان نہیں بنانا چاہتے تھے.....وہ لوگوں کو اسلام کی مساوات پسندی کی رسی میں باندھ کر ایک ایسی طاقت بنانا چاہتے تھے جسے کوئی پامال نہ کر سکے.....اکیلی اکیلی لکڑی توڑنا آسان تھی' وہ اس مجموعی طاقت کو ناقابل تسخیر بنانا چاہتے تھے جو اللہ کے سوا اور کسی شے سے نہ ڈرتی ہو......

لیکن یہ لوگ کوئی قربانی دے کر اس نئے وطن میں نہ آئے تھے.....انہیں تو دشمن کے ظلم نے ادھر دھکیل دیا تھا۔ اس نئے وطن کے متعلق ان کے کوئی عزائم نہ تھے۔ اسے سنوارنے' بہتر بنانے' محبت سے اپنانے کے متعلق انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ کوئی جنگ جیت کر' قربانی اور ایثار خود بہ رضا و رغبت دے کر انہوں نے اس خطہ زمین کی نعمت نہ پائی تھی..... وہ اس آزادی' عافیت اور سکون کی قدر و منزلت سے نا آشنا تھے۔ انہیں ایک مرد صدق و صفا نے اعمال کا پاسپورٹ بنائے بغیر جنت کا ویزا دلا دیا تھا۔

بڑی دیر بنچ پر بیٹھے رہنے کے بعد وہ گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ اب اس کے گھٹنوں میں ہلکا سا درد اٹھنے لگا تھا۔ اپنے گھٹنے کو سہلاتے ہوئے اُس نے سوچا..... ''شکست کے یہ معنی نہیں ہوتے ڈاکٹر قیصر کہ انسان مایوسی تک پہنچ جائے..... کون جانے..... کس طرح..... کیسے حالات سے گزر کر یہی بھانت بھانت کے پنچھی برخود غلط ہجرت زدہ کسی ایک منزل کو اپنانے میں کامیاب ہو جائیں۔''

راحیلہ صحن میں بیٹھی تھی.....ابھی کچھ دیر پہلے چاچا جی اس کے پاس بیٹھے قیصر کے ماضی پر رواں تبصرہ کر کے اٹھے تھے۔ ان کی چائے کی پیالی پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی تھی اور اس پر دودھ کی ہلکی سی تہہ پر ایک مکھی گرفتار ہونے کے بعد نکلنے کے شغل میں تھی.....راحیلہ نے تخت پوش پر اپنے آپ کو ڈال دیا.....اس نے چند لمحے قیصر کے متعلق سوچنا چاہا لیکن اس خیال کا کرنٹ جلد ہی فیوز ہو گیا اور دل نے مسرت سے دھڑک دھڑک کر کہنا شروع کر دیا.....شاہد بچ گیا ہے' وہ اسی شہر میں ہے.....وہ بھی پاکستان میں مقیم ہے.....اسی فضا میں سانس لے رہا ہے..... یہ خیال مسرت بن کر اس کے وجود پر چھا جاتا......

عالیہ جھاڑن ہاتھ میں لے کر کھڑکیاں جھاڑنے کے عمل میں مصروف تھی۔ اس کی توجہ کہیں اور تھی اور وہ بار بار ایک ہی جگہ کو پنانے کی طرح جھاڑن پھڑکاتے ہوئے جھاڑے جا رہی تھی۔ پھر زینو کہیں سے دوپٹہ نچوڑتے ہوئے آ گئی..... ''بیگم صاحب جی! شلغم گوشت تو خیر سے میں نے پکا لیے ہیں۔ پر بی بی صاحب تو شلغم نہیں کھاتے شوق سے۔''

''اچھا تو پھر مسٹر قیمہ بھی تیار کرلو.....''

''قیمہ بھی تھوڑا ہے جی.....''

''چلو کچھ بھی پکا لو زینو.....یہ بھی کیا مصیبت ہے.....ہر روز مجھے ہی بتانا پڑتا ہے.....''

''گاجر مٹر آلو پکا لیتی ہوں جی.....''

''چلو یہی سہی.....''

چند قدم باورچی خانے کی طرف مڑ کر زینو بولی.....''تاں بی بی.....جی.....وہ ایک صاحب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔''

''تو بتانا تھا کہ صاحب گھر پر نہیں.....''

''بی بی جی.....نہ بیگم صاحب! وہ آپ سے ملنے آئے ہیں۔میں نے ڈاکٹر صاحب کا بتایا تھا۔''

''اچھا.....''

راحیلہ کو لگا کہ ساری کائنات اس لمحے اپنے محور پر گھوم گئی۔

شاہد ڈرائنگ روم نما بیٹھک میں صوفہ سنبھالے بیٹھا تھا۔اسے یہاں آئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی لیکن اسے لگتا تھا گویا وہ ازل سے یہیں قید تھا۔اس نے کمرے کی ہر چیز کو بغور دیکھ لیا۔درون خانہ سے کوئی آواز نہ اٹھی۔اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی قبر کے کنارے برسوں سے چلہ کاٹ رہا ہے.....تاج محل کے ماڈل پر ہلکی سی گرد کی تہہ جمی تھی۔اسے انگشت شہادت سے صاف کرتے ہوئے اس نے کمرے پر ایک گہری نظر ڈالی۔یہ کمرہ تقریباً سولہ فٹ لمبا اور چودہ فٹ چوڑا تھا۔ جس دروازے سے وہ اندر داخل ہوا وہ گلی میں کھلتا تھا۔گرمیوں میں یہ کافی ٹھنڈا رہتا ہوگا کیونکہ اس کی چھت خاصی اونچی تھی..... پردے' پرانا فرنیچر' کاغذی پھول' مٹی کے روغنی گلدان' قالین' تصویریں سارا کمرہ اداس تھا۔جو کمرے لوگوں کے منتظر رہتے ہیں' ان میں انتظار کی پژمردگی سائیں سائیں کرتی رہتی.....مجموعی تاثر یہی تھا کہ یہ کمرہ استعمال میں نہ تھا اور اس کے پروردہ مر چکے ہیں.....کمرے کی دیواریں صاف تھیں کہیں جالے نہ تھے..... ہر چیز شفاف تھی لیکن زندگی کے آثار مفقود تھے.....کیا ان صوفوں پر قیصر اور راحیلہ پاس پاس نہ بیٹھے ہوں گے.....اس قالین پر ایک دوسرے کی جانب نہ بڑھے ہوں گے۔مہمانوں کے قہقہے' عورتوں کی سرگوشیاں' کھانے پینے کی اشیاء سے لدی ٹرالیاں.....کسی چیز نے کوئی سراغ نہ چھوڑا تھا.....شاید قیصر اور راحیلہ زیادہ وقت خوابگاہ میں گزارتے ہوں.....خوابگاہ.....بیڈ روم.....ڈبل بیڈ.....شاہد کا ذہن گھوم سا گیا۔

بھلا راحیلہ کو کیا حق پہنچتا تھا کہ ذرا سی مشکل پڑتے ہی وہ کسی اور کی آغوش اختیار کر لیتی۔کیا اس کے جیتے جی راحیلہ کا کوئی اور بھی مالک ہو سکتا تھا؟ ان دونوں میں متعدد ایسے کیے ان کہے وعدے استوار تھے۔اس وقت شاہد راحیلہ کے خلاف پوری جنس لطیف کے خلاف مجسم احتجاج بن گیا تھا۔وہ راحیلہ کے منہ پر تھوک کر اس ویس سے ہی نکل جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔یہی نہیں وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح قیصر کے بھی چھکے لگائے۔پھر ان پر نمک چھڑکے.....لیکن حالات کے سامنے وہ صرف تلملا کر رہ گیا.....بھلا کوئی مظلوم کسی فاتح کے منہ کیسے آ سکتا ہے۔تھک کر اس نے سر جھکا لیا اور واپس منگمری

جانے کے ارادے سے اٹھا۔ شاید وہ چلا بھی جاتا اگر ایک جانا پہچانا نسوانی ہاتھ پردہ الگ کرتا نظر نہ آ جاتا۔ راحیلہ کمرے میں آ کر ٹھٹک گئی۔ اگر پردہ اس کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو شاید وہ لڑھک جاتی۔ حمل سے بھاری بھرکم راحیلہ کو دیکھ کر شاہد کو اپنے اندر بھڑکتا غصہ سرد ہوتا معلوم ہوا۔ راحیلہ کے پیٹ میں درد لہر کی صورت اٹھا۔

''آئیے.....آئیے ناں.....شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟'' شاہد بولا۔

راحیلہ خاموش رہی۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ اپنے آپ کو شاہد کے قدموں میں دیکھ رہی تھی۔ شاہد کو اپنے اندر لاوا ابلتا محسوس ہوا۔ غصہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔

وہ لفظوں کو چبا چبا کر بولا.....''میں تو تمہیں مبارک دینے آیا تھا.....دوہری مبارک..... کتنی جلدی تم نے سب کچھ زندگی سے جھپٹ لیا.....شوہر.....اولاد.....تم نے تو.....اپنا یونٹ مکمل کرنے میں دو چار سال بھی انتظار کی صعوبت نہیں اٹھائی.....تمہیں برا لگ رہا ہے کہ میں تمہاری خوشیوں کا منہ چڑانے کہاں سے آ گیا ہوں.....دیکھو.....میں بھوت نہیں ہوں.....یہ خواب بھی نہیں ہے.....دیکھو میں تمہارا جیتا جاگتا شاہد ہوں.....''

شاہد نے زبردستی راحیلہ کا ہاتھ اپنے بازو پر چسپاں کر لیا۔ راحیلہ خاموش رہی۔ اس نے نہ تو ہاتھ چھڑانے کی سعی کی اور نہ ہی شاہد کی طرف دیکھا.....وہ اندر ہی اندر سوچ رہی تھی کہ اپنے دفاع میں کیا کہے؟.....شاہد کو کیسے بتائے کہ آنے والا ارسلان قیصر کون تھا اور اس بچے نے فیصلوں میں کتنی زبردستی کر دی تھی؟

وہ شاہد کو کیا بتاتی؟ جب خود اسے اچھی طرح معلوم نہ تھا کہ بچہ کہاں سے آیا؟ اسے تو اتنا یاد تھا کہ ابھی وہ ہندوستان کے ایک ریفوجی کیمپ میں تھی' جب اسے بخار نے گھیر لیا تھا۔ وہاں ایک نوجوان اسے مشروبات' قہوہ پلایا کرتا تھا۔ اس کا چہرہ بھی راحیلہ کو اچھی طرح یاد نہ تھا لیکن ایک دن اس نے راحیلہ کو گلاس میں کچھ گھول کر پلایا تھا۔ اس کی خوشبو عجیب سی تھی اور پھر رات گئے تک اسے اپنے جسم پر وحشیانہ بوجھ محسوس ہوتے رہے تھے.....لیکن بے ہوشی اتنی زیادہ تھی کہ وہ خوابوں سے جاگ نہ سکی.....شاید ابھی تک وہ کسی خواب' لاشعور کے کسی کرتب کا حصہ تھی۔ اس کے زرد کپڑوں پر لہو کے دھبے تھے۔ گویا رات کو کسی نے اسے چھری سے قتل کرنے کا ارادہ کیا ہو.....اب وہ جانتی تھی کہ اسی رات کسی انسانیت دشمن نے اسے واقعی قتل کر دیا تھا.....اس دن کے بعد اس نے شربت' قہوہ پلانے والے کو نہ دیکھا اور وہ ماسی کے ساتھ کانوائے میں نہ جانے کون سے راستوں سے والٹن کیمپ پہنچی.....کبھی کبھی وہ سوچتی اگر جاگتے میں بھی ایسا وحشیانہ واقعہ ہو گزرتا تو وہ کیا کر سکتی تھی؟

جنگ' ہجرت' فساد' بلوے' مار دھاڑ میں ایسے واقعات تو ہوا ہی کرتے ہیں۔ مرد اس دیوانگی میں کب نارمل طریقے سے سوچ سکتا ہے؟

خاموشی!.....خاموشی.....ملزم کا بہترین حربہ.....ظالم عورت کے پاس احساسِ جرم جگانے کا بہترین جادو.....

خاموشی.....مظلوم بن کر ترس حاصل کرنے کا ہتھیار.....

شاہد قہقہے لگانے لگا.....بلند و بالا.....اس کے قہقہوں سے کمرے میں حدت پیدا ہو گئی۔ اس شور کو سن کر زینو کمرے میں آ گئی اور شاہد خاموش ہو گیا۔ زینو نے گھورتے ہوئے اجنبی کی جانب دیکھا۔ شاہد خاموش

صاف کرنے میں مشغول ہو گیا۔

زینو نے اپنے بے جا تجسس کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا..... ''آپ نے بلایا بیگم صاحب..... ناں جی بی بی جی.....''

''لالو کے ہاتھ چائے بھجوا دو زینو.....'' راحیلہ کی آواز گویا قبر سے آئی۔

''لالو تو بیگم صاحب اصبح سے سٹیشن گیا ہوا ہے.....''

''کس سے پوچھ کر گیا ہے؟''

''ڈاکٹر صاحب سے پوچھا تھا جی۔ کہتا ہے شاید کوئی پنڈ والے سٹیشن پر آئے بیٹھے ہوں.....''

''اچھا عالیہ سے کہنا وہ چائے لے آئے گی.....''

زینو حیران کن نظروں سے ان دونوں کو دیکھتی ہوئی رخصت ہوئی۔ اس کی چھٹی حس سطح سے نیچے جان لینے کی خواہش مند تھی۔

''تم جو قیامت تک میرا انتظار کر سکتی تھیں' تم نے اتنی جلدی ارادہ بدل لیا..... تم عورتیں' لڑکیاں جنس لطیف' اصولوں کا اقتدار کا..... مذہب کی حدوں کا اتنا پرچار کیوں کرتی ہو جب پریکٹیکل زندگی میں تم مردوں کی طرح کمزور' بے اصول اور مذہب شکن ہو..... صرف اپنی سکیورٹی کی خاطر..... صرف اپنے آپ کو بچانے کی خاطر..... تم نے عافیت کا راستہ چن لیا..... اچھا رہن سہن اتنا ضروری تو نہیں ہوتا راحیلہ؟''

راحیلہ صوفے میں دھنس گئی..... ''مجھے تکلیف نہ دو پلیز..... میں اب اور کرب برداشت نہیں کر سکتی..... میں بہت کوئی چھنی چھنی گئی ہوں.....''

''تمہیں تکلیف نہ دوں؟ تمہیں تکلیف نہ دوں جس کا چہرہ فرشتے کا اور روح شیطان کی ہے۔ جو اوپر سے مظلوم اور اندر سے ظالم ہے..... تم جیسے بدنیت لوگ دوسروں کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں۔ تم جیسے لوگوں کی نیت کا فتور پوری قوم کو لے ڈوبتا ہے..... تم جیسی عورتیں جو نہ کبھی سسرال کی ہوتی ہیں نہ میکہ گھر کی..... تمہیں تکلیف نہ دوں..... تم جیسی بدنیت عورت کو تکلیف نہ دوں جو کسی کی وفادار نہیں..... کسی جگہ جوابدہ نہیں؟ کسی قیامت کا انہیں خوف نہیں..... تم جیسی عورت کو علم ہی نہیں کہ سارے اعمال نیت کے ڈانڈے پر تولے جائیں گے..... تم جیسی عورتوں نے اچھے اچھے جواز پیش کر کے بازارِ حسن آباد کر رکھا ہے..... تم جیسی ہیلن آف ٹرائے عورتوں نے..... اب کیا کہوں' کہاں تک کہتا چلا جاؤں؟.....''

شاہد کی آنکھیں یکدم سرخ ہو گئیں اور جھرنے کی طرح آنسو اس کے گالوں پر بہنے لگے۔ وہ دھم سے صوفے پر بیٹھ گیا..... راحیلہ دل میں کہہ رہی تھی..... ''تم ان سیاہ روح' سیاہ بخت لوگوں کو نہیں سمجھ سکتے شاہد! جو دو راستوں پر مسلسل چلتے ہیں۔ دو محبتیں' دو وطن' دو یادیں' دو کلچرز' دو زبانیں..... ان کا سب کچھ توام ہوتا ہے شاہد! حتیٰ کہ ان کی نیت بھی کیکڑے کی طرح دو طرف چلتی ہے۔ کبھی آگے کبھی پیچھے..... ایسے لوگوں کا کسی چیز پر اختیار نہیں ہوتا شاہد۔ جس طرح وہ اپنے قلب میں گندے اور صاف لہو کو گزرنے سے نہیں روک سکتے' اسی طرح اسی قلب میں وہ ایک نیت کا میٹرفٹ نہیں کر سکتے..... ان کے لہو میں جو بھی کرنٹ چلتا ہے' مثبت اور منفی کے ملاپ سے چلتا ہے۔ میں تو خود بھی سمجھ نہیں پائی تو تمہیں کیا سمجھا سکتی

ہوں.....میں زمان و مکان میں کہاں معلق ہوں۔ اس کی مجھے خود خبر نہیں تو میں تمہیں کیا بتاؤں.....کہ میں کہیں ہوں بھی کہ نہیں؟"

"تم مجھے احمق سمجھ رہی ہو.....اسی لیے اتنی خاموش ہو.....جب سے میں نے تمہیں دیکھا' میں اسی وہم میں مبتلا تھا کہ عورت قابلِ پرستش ہے اور مرد کو اس کی کفالت کا حکم یونہی نہیں دیا گیا.....اس کا ایک ہی روپ ہے دیوی کا.....ماں کا.....اقدار میں لپٹی' ہمدردی' محبت' قربانی اور ایثار کا آئیڈیل.....ہر مرد جسمانی طور پر طاقتور ہونے کے باوجود یہی سمجھتا ہے کہ عورت اس سے بھی مضبوط تر ہے.....اسے بھول جاتا ہے کہ عورت کا ایک اور روپ بھی ہے.....طوائف کا روپ.....مرد کو احمق بنانے والی کا جاندار وجود.....موقع سے فائدہ اٹھانے والی کا.....ہیولا.....ٹیڑھی انگلی سے گھی نکالنے کی تکنیک جاننے والی کا وجود....."

"تم نہیں سمجھ سکتے شاہد.....نہیں سمجھ سکتے.....اس کے لیے ابھی بہت عرصہ انتظار کرنا پڑے گا۔ شاید صدیوں.....اس کا فیصلہ وہی کر سکے گا جس نے انسان کے اندر دو راستے بنائے ہیں۔"

لیکن یہ جملہ بھی اس نے ایسے ادا کیا کہ شاہد کے کانوں تک اس کی آواز نہ جا سکی۔

یکدم شاہد اٹھ کھڑا ہوا.....مرد کی ازلی کمزوری اس میں عود کر آئی۔ اب غصے کی جگہ التجا تھی۔ آنسوؤں سے بھیگی' سانسوں میں دم توڑنے والی التجا۔

"یہ تم نے کیا کر ڈالا راحیلہ.....ابھی کچھ نہیں گیا.....ہم دونوں زندہ ہیں' نوجوان ہیں' ہم نے بڑے مشکل حالات کا مقابلہ کیا ہے۔ ہم اور بھی مشکلات سے نپٹ لیں گے.....چلو یہاں سے بھاگ چلیں۔ تم میری ہو.....تم ہمیشہ میری رہو گی.....قیصر اچھا آدمی ہے۔ میں اس سے مل چکا ہوں.....وہ.....جب اسے پتہ چلا کہ ہماری محبت ازلی ہے.....کتنی صدیوں پرانی ہے تو وہ تمہیں آسانی سے چھوڑ دے گا.....وہ %100 Decent آدمی ہے....."

"نہیں شاہد.....مجبوری ہے' دل شکن مجبوری....."

شاہد نے ہاتھ جوڑ لیے اور بہت آہستہ آہستہ بولا..... "تمہیں میرے ساتھ چلے جانا ہوگا.....ایک نہ ایک دن تم خود چل کر میرے پاس آؤ گی راحیلہ.....میرا جذبہ اتنا کمزور نہیں کہ وہ تمہیں بھی کھینچ نہ سکے.....تمہارے لیے میں نے بڑے چلّے کاٹے ہیں.....ہر راحت سے منہ موڑا ہے....."

"اب یوں نہیں ہو سکتا شاہد.....بھول جاؤ سب کچھ۔"

"اس وقت کا انتظار نہ کرو راحیلہ! جب میں تمہارے لیے تڑپ تڑپ کر تھک جاؤں اور مجھے تمہاری ضرورت نہ رہے.....ابھی چلو.....ابھی جب حیات کا نظام تمہارے بغیر نامکمل ہے....."

"تم نہیں جانتے شاہد.....قیصر میرا محسن ہے.....وہ تباہ ہو جائے گا....." وہ نگاہیں جھکا کر بولی۔

"تمہیں اس کی بہت پرواہ ہے.....مجھ سے بھی زیادہ.....بولو جواب دو....." راحیلہ کو جھنجھوڑ کر شاہد نے کہا۔

"تم نہیں جانتے میرے چلے جانے سے وہ کبھی سنبھل نہ سکے گا۔"

"یوں کہو تمہیں اپنی سکیورٹی کا خیال ہے۔ دولت اور عورت شاید ویسے بھی ہم قافیہ ہیں.....ایک معمولی بیکار'

بیروزگار مہاجر سے ایک Established ڈاکٹر کا کیا مقابلہ؟.....درست فیصلہ ہے.....آخر ڈاکٹر قیصر کے مقابلے میں تمہیں میں دے بھی کیا سکتا ہوں....."

راحیلہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"اگر تم مجھے ذلیل کرنے آئے تھے تو.....اگر یہی دل شکن باتیں بطور تحفہ لائے تھے تو چلے جاؤ.....میں تمہارے تصور کو بگاڑنا نہیں چاہتی.....جاؤ شاہد چلے جاؤ پلیز.....زندگی پہلے ہی جینے کے قابل نہیں۔"

"چلا جاؤں گا.....چلا جاتا ہوں بیگم صاحب.....اگر میں نہ گیا تو تم باہر بیٹھے چوکیدار سے مجھے نکلوا دینا....."

"خدا کے لئے شاہد....."

"خدا کے لیے؟..... باتیں نہ کروں کہ چلا جاؤں.....لیکن اگر تنہائی کے لمحوں میں تمہیں اپنے رونے سے گلہ ہوا تو.....اگر.....سوچو تو تم اپنے شاہد کو گھر سے نکال رہی ہو....."

راحیلہ دھیرے دھیرے سسکیاں بھرنے لگی۔

شاہد اب غصے سے بہت دور تھا۔ اس کا احساسِ محرومیت گہرے دکھ میں ڈوب گیا۔

"راحیلہ.....مت روؤ میری جان.....میں تمہارے آنسو ساتھ لے جانا نہیں چاہتا.....خدا کے لیے مت روؤ میں چلا جاؤں گا.....اس گلی سے شہر سے.....میں یہ ملک ہی چھوڑ دوں گا جہاں کبھی کسی وقت ہماری مڈھ بھیڑ ہو سکتی ہے.....تم فکر نہ کرو.....میں کہیں بہت دور چلا جاؤں گا.....ایک اور ہجرت سہی.....تمہاری خاطر تو میں اس جیتی جاگتی زندگی سے بھی.....اگر.....تمہیں کچھ فائدہ ہو تو؟"

وہ آہستہ آہستہ باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھا اور پھر پردوں کے پاس رک کر بولا....."صرف ایک بات بتادو راحیلہ.....تمہیں مجھ سے محبت ہے؟.....تھوڑی سی.....؟....."

راحیلہ چپ رہی۔

"اچھا خدا حافظ.....اس سوال کا جواب بھی اب کیا معنی رکھتا ہے....."

شاہد کمرے میں سے نکل کر باہر آ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے یہ ملک چھوڑنا ہی پڑے گا.....کون جانے کب کن حالات میں راحیلہ پھر مل جائے؟

راحیلہ کے سامنے ایک خط پڑا تھا۔ وہ اس لکھائی کو اچھی طرح سے پہچانتی تھی۔ کیا وہ شاہد کا خط قیصر کو پکڑا دے.....کیا اسے کھول کر پڑھے اور نئی دبدا میں شامل ہو جائے؟ خط اٹھا کر وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتی چھت پر چلی گئی۔ جب سے الاٹمنٹ سے واپس نہ آیا تمام کمرے ویران پڑے تھے۔ جب قیصر منزل شانتی بھون کے روپ میں تعمیر ہوئی تھی تو ارد گرد کوئی مکان نہ تھا۔ اب اس کے ہر جانب مکانات چھت لیے گئے تھے اور سب چھتیں قیصر منزل سے اونچی تھیں۔ دس بارہ کمروں کی قیصر منزل دلہن کی طرح آراستہ لیکن بیوہ کی مانند اجاڑ تھی۔ بس ان کمروں میں گھرا ایک صحن تھا جس میں کچھ آبادی کے آثار تھے۔ صحن کی حیثیت سیاسی لیڈر کی سی تھی جو ملت میں گھرا ہوا بلاوجہ اپنی اہمیت جتاتا رہتا ہے۔ جو کچھ ہوتا تھا عموماً یہ صحن ہی اس کا وقوعہ ہوا کرتا تھا۔ یہیں بوسیدہ تخت پوش تھا جس پر گلی کی خواتین راحیلہ سے ملنے

آتیں۔ یہیں باورچی خانے کا جالی دار دروازہ کھول کر زینو کنسوئیاں لیتی.....اسی صحن میں ہتھی نلکا تھا جس کا ہینڈل اوپر نیچے جاتا تو آواز نکالتا لیکن پانی نکالنے کا نام نہ لیتا.....عالیہ بھی موڑھے پر بیٹھ کر یہیں سیپارہ پڑھتی۔ گندم چھٹکنے کے لیے بھی اس سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی۔ صحن میں نسوانی ہاتھوں کے باعث ایک جان سی آ گئی تھی۔ جب یہ خالی پڑا ہوتا تو اس سے کسی جی دار کے تنفس کی حرارت ملتی لیکن صحن سے نظریں بچا کر راحیلہ کوٹھے پر چلی گئی.....وہ کسی کم آباد جگہ میں پناہ لے کر شاہد کا خط پڑھنا چاہتی تھی.....لیکن اوپر پہنچ کر بھی اسے بے پردگی کا خیال ہی آیا۔ اسے لگا جیسے کوئی اس کے تعاقب میں چلا آرہا ہے اور خط کے بارے میں قیصر سے مخبری کرنے والا ہے!.....ایک طرف بلا کا تجسس تھا' وہ جاننا چاہتی تھی کہ شاہد نے اس سے بچھڑ کر کیا سوچا؟ کیسے تلملایا؟ اپنے اور اس کے بارے میں کیا اندازے لگائے؟ دوسری طرف وہ سوچنے پر مجبور تھی کہ خط پڑھ لینے کے بعد کیا وہ قیصر کو خط دکھا سکے گی؟ اس کے نفسِ مضمون میں اگر کوئی بات قابلِ اعتراض ہوئی تو؟ ابھی تک اس کا ماضی اتنا واضح ہو کر قیصر کے سامنے نہ آیا تھا۔ خط دیکھنے کے بعد اگر قیصر نے اس سے شاہد کے متعلق کچھ پوچھنا چاہا تو..... بالفرض قیصر کو چپ سی لگ گئی تو پھر وہ کیا کرے گی.....قیصر اسے بتایا کرتا کہ شانتی بھون سے قیصر منزل بنانے میں اس نے کیسے کیسے جتن کیے۔ جب باورچی خانے کے سامنے بورنگ کرا کے ہتھی نلکا لگوایا تو صحن کیسے جوہڑ بن گیا تھا۔ قیصر اسے دیواریں چھو کر دروازوں کو کھول کر قیصر منزل کی تاریخ بتاتا تھا.....شانتی بھون سے قیصر منزل تک تو قیصر کی مہم تھی۔ آگے قیصر منزل راحیلہ کی معیت میں ڈیڈ لیٹر ہاؤس بن گیا۔ اس کی داستان راحیلہ بھی بیان نہ کر سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ گھر کے گرد سہانے چینے ڈیرے نہ ڈالیں تو زندگی پیدا نہیں ہوتی..... محلے کے باسی ایسے نہ تھے کہ راحیلہ ان سے گہرے رشتے قائم کر لیتی۔ صفائی ہو چکتی' کھانا پک جاتا تو بمشکل گیارہ بجے ہوتے.....راحیلہ نے افسانے لکھے' شعر کہے' کتابیں پڑھیں' آنے والے بچے کے کپڑے تیار کیے.....قیصر کا انتظار کیا لیکن ہر سلسلہ خود بخود ٹوٹ گیا۔

خط آنے تک وہ بار بار یہی سوچتی رہی تھی کہ شاہد اس کے بیمار تخیل کی تخلیق تھی۔ گوشت پوست کا شاہد تو کبھی آیا ہی نہیں تھا لیکن اب خط آ جانے پر تو ایسے شبہات حقیقت میں بدل گئے تھے.....بڑی دیر خط کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے بغیر پڑھے اسے پرزہ پرزہ کر ڈالا اور پچھلی گلی کی منڈیر سے نیچے پھینک دیا۔ وہ بہت زیادہ بیمار قیصر کو تکلیف نہ دینا چاہتی تھی.....خط کے پرزوں میں وہ نظم بھی پارہ پارہ ہو گئی جو کراچی ایئر پورٹ پر شاہد کو اچانک یاد آ گئی تھی۔

شاہد کراچی ایئر پورٹ پر کھڑا تھا۔ اس کے دل میں ایک خواہش تھی کہ وطن چھوڑنے سے پہلے وہ ایک بار پھر راحیلہ سے مل لے لیکن کوئی خیال اسے بتا رہا تھا کہ دوسری ملاقات کچھ ایسے نتائج لائے گی جس پر وہ ساری زندگی پچھتاتا رہے گا۔ اسے وقت گزارنے کے لیے ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے؟

☆☆☆

قیصر جلتا سگریٹ ہاتھ میں تھامے راحیلہ کو سنگار میز کے آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ راحیلہ اپنے خوبصورت بالوں میں مستعدی سے برش چلا رہی تھی۔ اس کے منہ میں دو پنیں تھیں۔ جب بھی وہ بالوں کی گرہیں توڑ کر سیدھی کرتی تو درد بالوں کے بجائے دانتوں میں محسوس ہوتا۔ یکدم راحیلہ نے محسوس کیا کہ صوفے میں دھنسا قیصر بڑے غور سے اسے دیکھ رہا ہے۔ قیصر نے آج اپنی نظروں کے دروازے اچھی طرح سے بند نہ کیے تھے.....

کیا قیصر کو خط کے متعلق کچھ معلومات تھیں؟

گھبرا کر راحیلہ نے برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا اور جا کر صوفے پر قیصر کے پاس بیٹھ گئی۔

''قیصر جی.....کیا دیکھتے ہیں آپ؟'' راحیلہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

کیا وہ خط کے بارے میں کچھ جانتا ہے؟

''تمہیں دیکھتا ہوں.....''

''تمہیں کچھ شک گزر رہا ہے.....کیا؟''

''اتنا رنگ روپ ایک ہی وجود میں.....شک گزر رہا ہے کہ تم انسان نہیں ہو.....''

خطرہ ٹل گیا۔ راحیلہ ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔

''ایسا گھمبیر چہرہ کیوں بنا رکھا ہے.....ڈراؤنا سا؟ خوفناک لگتے ہیں آپ۔''

''بس یونہی.....''

شک پھر پلٹ آیا.....شاید زینو نے خط کا ذکر کر دیا ہو.....فتح خان نے ذکر نہ کیا ہو۔

''کچھ میں نے کیا ہے؟.....'' راحیلہ اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''نہیں.....نہیں.....''

پھر قیصر نے سگریٹ کی راکھ قالین پر جھاڑی اور سیدھی نگاہ راحیلہ پر جما دی۔ ان آنکھوں میں شک و شبہ کی چنگاریاں تھیں۔ ظلم کے خلاف احتجاج تھا۔ ان گنت سوال تھے۔

''کیا سوچ رہے ہیں آپ؟'' راحیلہ نے پوچھا۔

''اور تم کیا سوچتی رہتی ہو.....سنو راحیلہ.....جب تک میں زندہ ہوں' تم کچھ نہ سوچا کرو۔ میرے بعد تمہارا مستقبل روپے سے خالی نہ ہوگا.....بھلا اور کیا چاہیے تمہیں؟.....پوری سکیورٹی ملے گی۔''

''میں تو یہ نہیں چاہتی قیصر.....''

''پھر اور کیا درکار ہے تمہیں؟.....کچھ تو چاہیے جس کا ذکر تم مجھ سے کر نہیں پاتیں۔''

اس جملے کو سن کر راحیلہ رونے لگی۔ قیصر نے ان گنت ڈالر کے جملوں میں اس حقیقت کو ڈبو دیا.....کہ قیصر اور اس کی قیصر منزل راحیلہ کے لیے کافی نہ تھے!

راحیلہ نے بڑی ہمدرد بیوی کا رول اپنا کر پوچھا.....''آپ میو ہسپتال گئے تھے؟''

''جی سر گیا تھا.....''

''پھر کیا کہا ڈاکٹر عباس نے؟''

''وہ جو ہمیشہ کہا کرتے ہیں.....کھانے سے پہلے بلڈ ٹیسٹ.....انسولین کا ٹیکہ.....چینی کا استعمال موقوف.....چاول بند.....''

''لیں یہ باتیں تو وہ پہلے بھی بتا چکے ہیں۔''

قیصر کھسک کر صوفے پر دراز ہو گیا اور اپنا سر راحیلہ کی گود میں رکھ دیا۔ مارے نقاہت کے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ راحیلہ بہت کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی۔ مبہم سوالات۔ وہ ان سوالوں کو واضح الفاظ میں ڈھالنا چاہ رہی تھی۔

"آج شاید میں واشن کیمپ نہ جا سکوں..... سارا جسم درد کر رہا ہے۔ قے سی آ رہی ہے۔" قیصر نے سختی سے اپنے لب بھینچ لیے۔

"سر دبا دوں؟"

"نہیں..... یہ دبانے سے دبنے والا درد نہیں ہے۔"

"آپ لیٹ جائیں ناں..... پلنگ پر....."

لمبی سانس بھر کر قیصر بولا..... "مجھے ڈر ہے ایک بار میں لیٹ گیا تو پھر اٹھ نہ سکوں گا۔"

"تم..... گئی تھیں..... ہسپتال؟....."

"جی گئی تھی....."

"پھر.....؟"

"پھر سب کچھ نارمل ہے' گھبرانے کی کوئی بات نہیں....."

"شکر ہے....." قیصر نے خاموشی اختیار کر لی۔

اسے ہسپتال یاد آ گیا۔ نہر کنارے کالج کی عمارت میں ہسپتال تھا۔ اس میں ایک سیکشن میں زچہ بچہ کا ڈیپارٹمنٹ بھی تھا جس میں ایک امریکن ڈاکٹرنی خصوصی طور پر عورت کو کھانے پینے کے چارٹ' روزمرہ کے معمولات' احتیاط' بچے کے کپڑوں کے متعلق ہدایات دیا کرتی۔ یہیں بنچ پر بیٹھے بیٹھے راحیلہ نے سوچا تھا کہ اگر وہ ڈلیوری کے دوران فوت ہو جائے تو سارے جھنجھٹوں سے رہائی مل جائے گی۔ وہ اپنے مر جانے کے رومانی سین کو ذہن میں ڈائریکٹ کر رہی تھی۔ جب ایک غریب سی عورت اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ وہ پڑنو اسی لگتی تھی یا پھر ریلوے لائنوں پر سے کوئلہ چننے والی۔ اس کے پاس بیٹھنے سے مر جانے کا خواب فوت ہو گیا۔

"ماں کو کسی نے بتا رکھا تھا کہ ادھر علاج مفت ہوئے رہا....."

"ہاں مفت ہی ہے پر جی ہنوانا پڑتی ہے....." راحیلہ نے گفتگو سے بچنا چاہا لیکن پوربی عورت نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا..... "اور آپا جی! اب تین چند اور چڑھے ناں' تب میرا چند چڑھے گا۔ پا جیبیں ہنوا بھی لیاں جی ماں نے۔ ادھر ہسپتال کا تو ماں کو رستہ بھی نہ آوے رہا' پوچھ پوچھ آئی۔" راحیلہ نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔

"تمہارا شوہر نہیں آیا ساتھ؟"

"زیمل تو آیا رہا ساتھ..... باہر بیٹھا ہووے۔ میں تو اپنے چند کی بتلا واں ہاں جی..... چٹی ڈاکٹرنی بولے رہی بس تین چند او..... راہ دیکھ..... تو ڈاکٹرنی کو کیا پتہ۔ وہ تو جگ جگ میرے سنگ ہووے آپاں جی..... کوئی اب تھوڑا ملا حال کو..... ایہاں ایہاں..... ہولے ہولے ہاتھ پیر مارے جیہاں تتلی پھڑ کے..... ماں کے ساتھ تو اس کا ساتھ تب بھی تھا جب میں ادھر نیں آئی تھی اس دنیا میں۔" اس نے راحیلہ کا ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھ لیا اور بڑے فخر سے مسکرانے لگی..... "میرا

چندو تو ٹھک ٹھک کرے اماں..... اماں..... دیکھ کون آیا؟..... دروجہ کھول۔"

اسے وہ پوربی عورت یاد آ گئی جس کے لیے بچہ چاند تھا۔ نوید مسرت تھی جو تتلی کے لمس سے اس کے جسم میں کہیں روح پر دستک دیتا تھا۔ راحیلہ نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ شاید میں عورت نہیں ہوں..... مجھ میں کوئی کسر ہے۔ میں ایک معمولی عورت کی طرح ایسی باتیں کیوں نہیں سوچ سکتی؟ میرے ذہن پر غبار سا کیوں چھایا رہتا ہے؟ وہ مسرت کہاں ہے جو ایک عورت کا ازلی حق ہے؟..... تخلیق کا حق..... تخلیق کی مسرت کا حق۔ وہ بچے بھی کتنے بدنصیب ہوتے ہیں جو غیر متوقع طور پر اس جہاں میں آ جاتے ہیں..... کسی کی غلطی سے کسی کی بے رحمی سے..... ان کا کوئی انتظار نہیں کرتا..... وہ چوروں کی طرح گھروں میں وارد کرتے ہیں اور ساری عمر ایسے ملزم کی زندگی بسر کرتے ہیں جو پکڑا نہ جائے..... راحیلہ نے سوچا مجھ پر واقعات یوں کیوں آ دھمکتے ہیں؟ ان کا نزول کچھ یوں ہوتا ہے کہ خوشی اور غم دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے.....

اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دل میں راحیلہ نے کہا..... "سوری چاند..... مجھے کچھ نہیں آتی، تمہیں خوش آمدید کہوں کہ تمہارے لوٹ جانے کی تمنا کروں....."

قیصر گھٹنے کو سہلاتا ہوا یکدم اٹھا اور سیدھا غسلخانے کی طرف بھاگا۔ دیر تک وہ سنک پر جھکا قے کرتا رہا۔ راحیلہ بھی بھاگ کر پیچھے گئی لیکن پتہ نہیں کیوں دروازے کے پاس ہی رک گئی۔ واپس نکل کر وہ تکیے میں سر ٹھونسے آنکھیں بند کیے کتنی ہی دیر پڑا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا..... "چاچا جی کو اطلاع کر دو..... ہارٹ اٹیک ہے..... دیر نہ کریں..... جلدی..... جلدی۔ میرے کچھ کپڑے پیک کر دو..... میں ہسپتال جا رہا ہوں..... پتہ نہیں اپنے محبوب کی گود میں سر رکھ کر دم توڑنا مشکل ہے کہ اس سے دور کسی اجاڑ بستی میں جان دینا مشکل ہے....."

راحیلہ نے سامان جمع کرتے ہوئے سوچا بھلا اتنی جلدی قیصر کی طبیعت کیسے خراب ہو سکتی ہے۔ کیا اسے خط کا علم ہو گیا ہے؟ کیا شاہد نے اس کے دل میں شک کا بیج بو دیا؟ قیصر بستر سے اٹھ کیوں نہیں سکتے.....؟ ہارٹ اٹیک کی اصلی وجہ کیا تھی؟

یہ قیصر کا پہلا ہارٹ اٹیک تھا۔

وہ سی سی یو کے یونٹ میں قریب قریب بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے سرہانے ای سی جی کی مشین اس کے دل کو مسلسل مانیٹر کر رہی تھی۔ دائیں ہاتھ میں گلوکوز لگا تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور ہونٹوں پر نیلاہٹ واضح ہو گئی تھی۔ کچھ دیر سے قیصر کی طبیعت بتدریج گرتی چلی جا رہی تھی۔ برسوں کی کڑی محنت نے ذیابیطس کی بیماری نے اس کے جسم کے انگ جوڑ ڈھیلے کر دیے تھے۔ اس کا وزن پہلے سے بہت کم ہو گیا تھا۔ وہ کسی پرانی استعمال شدہ سلائی مشین کی طرح ہو گیا تھا۔ جس کا ایک دن ہینڈل ٹوٹ جاتا ہے تو دوسرے دن شٹل بگڑ جاتا ہے۔ کبھی دھاگہ بار بار ٹوٹتا ہے تو کبھی ٹانکا درست نہیں آتا۔ قیصر کو ایک دن بخار گھیرتا..... دوسرے دن جوڑوں کے درد جھنجھوڑ کر رکھ دیتے۔ کبھی زکام خطرناک صورت اختیار کر لیتا کبھی ناک سے نکسیر نہ رکتی..... صحت کی اونچ نیچ سے راحیلہ پوری طرح واقف تھی لیکن اس ہارٹ اٹیک نے اسے بوکھلا دیا تھا۔ کچھ دن تو قیصر منزل میں گلی والوں نے تانتا لگائے رکھا لیکن ہسپتال میں چونکہ ملنے کی اجازت نہ تھی اس لیے ان کی اہمیت کم ہو جانے کی وجہ سے آہستہ آہستہ رش کم ہو گیا۔ صرف چاچا جی راحیلہ کا واحد سہارا رہ گئے۔ پہلے لگتا تھا کہ چاچا جی کسی

پناوڑی کا ریڈیو ہیں جن کی مسلسل گفتگو سے چھٹکارا ممکن نہیں.....لیکن اب وہ چپ چاپ سی سی یو میں یوں آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہتے گویا بدھ مت کے پیروگیان دھیان کی آخری منزلیں طے کر رہے ہیں۔ یونٹ سے باہر ہی وہ اپنے بوٹ اتار دیتے اور سارا دن ننگے پاؤں نرسوں کے تعاقب میں ڈاکٹروں کے چکروں میں رہتے۔

جب قیصر صحت مند تھا تو اسے چاچا جی کی صحبت سے وحشت ہوتی تھی۔ چاچا جی اسے گاؤں کی یاد دلاتے۔ وہ ان کا پھٹا پرانا حلیہ، براؤن فلیٹ فٹ دیکھ کر خاموش تو رہتا لیکن اندر ہی اندر کڑھتا رہتا۔ چاچا جی کا میسنا پن اور کمینگی اس سے برداشت نہ ہوتی۔ قیصر اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اس کے والدین معمولی لوگ تھے۔ دادا کی تھوڑی زمین پر کاشت کرتے کرتے وہ غریب تر ہوتے گئے۔ قیصر مسجد میں مولوی صاحب کے خیراتی مکتب میں پڑھتا تھا۔ اسی غریبی کا ذائقہ بدلنے کے لیے اپنی عزت نفس بحال کرنے کے لیے وہ ڈاکٹر بنا تھا اور اسے یہاں تک پہنچنے میں جتنی مشکلات پیش آئی تھیں، ان کا وجود بھی اس نے لاشعور میں بند کر دیا تھا لیکن چاچا جی جب بھی قیصر منزل میں آتے وہ راحیلہ کو بٹھا کر پچھلی باتیں دوہرائے جاتے.....کبھی بہنوں کے قصے، کبھی ماں کی عادتیں، کبھی کھیتی باڑی کے طریقے.....ان کی انفرمیشن اتنی زیادہ تھی کہ گھنٹوں باتیں کرتے رہتے اور ختم نہ ہوتیں.....ایسے میں قیصر کمرے بدلتا رہتا، کمروں کے دروازے پٹاختے رہتے۔ سگریٹوں کی ڈبیاں خالی ہو جاتیں۔

لیکن جونہی قیصر ہسپتال آیا۔ چاچا جی کا رویہ یکسر بدل گیا۔ راحیلہ کو دیکھ کر انہیں اپنی جوان بیٹی یاد آ جاتی جو پہلے بچے کی پیدائش کے وقت فوت ہو گئی تھی۔ چاچا جی کو راحیلہ کا چہرہ دیکھ کر خوف آنے لگتا اور وہ مدہم سرگوشیوں میں باتیں کرتے۔ قیصر کی ہر طرح سے خدمت کرتے۔ ہسپتال کے کچن میں جا کر خود چائے بنا کر لاتے۔ ای سی جی کو نہ سمجھتے ہوئے بھی اسے دیکھتے رہتے۔ دوائیاں خود پلانے پر اصرار کرتے۔ اپنی قلیل آمدنی میں سے پھل لاتے اور معمولی خدمت گاروں کی طرح خوشامدی سے بنے رہتے..... بڑے اصرار سے راحیلہ کو گھر بھیجتے اور خود ساری رات کرسی میں دونوں ٹانگیں اوپر رکھ کر جاگتے بسر کرتے۔

راحیلہ ان کے پھل کے لفافے دیکھ کر سوچتی کہ اگر پہلے جیسے دن ہوتے تو ان لفافوں کو دیکھ کر اسے وحشت ہوتی۔ جہاں پہلے ہی افراط ہو وہاں یہ چھوٹے موٹے پھلوں کے تحفے دلوں میں سرنگ نہیں لگا سکتے.....ان کی نیک نیتی پر اب راحیلہ کو شرمندگی سی محسوس ہوتی۔ پتہ نہیں بابا فضل کہاں تھے؟

اب نہ تو راحیلہ کو ان کے لباس پر شرمندگی ہوتی نہ ہی ان کی گفتگو بری لگتی.....قیصر نے جو فاصلہ اپنے ماضی اور حال کے درمیان بنا رکھا تھا، وہ اب بھی قائم تھا لیکن راحیلہ کا رویہ قریب قریب بدل چکا تھا۔ اس کے رویے میں بے تکلفی اور گرمی آ گئی۔

''تم گھر چلی جاؤ راحیلہ.....اور اب نہ آنا بی بی.....میں جو ہوں.....''

''نہیں چاچا جی.....مجھے گھر پر آرام نہیں ملتا.....''

''میں چوری چوری ہومیوپیتھک دوائی دے رہا ہوں۔ اللہ کی برکت سے ٹھیک ہو جائے گا۔''

آنکھوں کی جھری سے قیصر دیکھ کر کہتا..... ''کچھ ٹھیک نہیں ہو گا چاچا جی.....سب علاج بیکار ہے۔''

چا چا جی ایک عام باپ کی دلیری کے ساتھ جھگڑنے لگتے..... ''پھر وہی باتیں..... پھر وہی باتیں..... لڑکی کا تمہارے متعلق سوچ سوچ کر دم نکلا جاتا ہے..... تم اپنی مایوسی کا پیچھا نہیں چھوڑتے..... اچھے بھلے ہو..... آٹھ دس دن میں گھر چلے جائیں گے..... قیصر بیٹا! کیا تقدیر کو تدبیر سے سنوارا نہیں جاتا؟..... اللہ نے تو کہا ہے سعی کرو..... کوشش کرو..... کوئی ایویں تو نہیں کہا اللہ نے.....''

قیصر سعادت مند بیٹے کی طرح چپ ہو جاتا.....

''دیکھیے ناں قیصر..... آپ واقعی صحت مند ہو جائیں۔ میرے ابا جی کہا کرتے تھے مریض ہمت نہ ہارے تو انفکشن بھی کوئی چیز نہیں۔ ہارٹ اٹیک بھی معنی نہیں رکھتا۔ مریض میں تندرست ہونے کی خواہش ہونی چاہیے۔''

''تم کیا جانو..... مجھ میں عام آدمی کی طرح زندہ رہنے کی کتنی خواہش ہے راحیلہ..... تم نے منہ کیوں بنا رکھا ہے.....؟''

جب سے قیصر کی بیماری نے تشویشناک موڑ کاٹا تھا، چا چا جی کی نیند کے اوقات بھی بدل گئے تھے۔ اب وہ ساری ساری رات جاگتے اور دن کے وقت کبھی کرسی پر کبھی بینچ پر ٹکڑوں میں نیند پوری کرتے۔ کبھی کبھی جب قیصر کی آنکھ لگ جاتی تو چا چا جی اور راحیلہ ہولے ہولے باتیں کرنے لگتے۔ ایسے ہی ایک دن اچانک راحیلہ اونگھ سے جاگ کر بولی..... ''چا چا جی..... برا سا خواب دیکھا میں نے.....''

''لے پل بھر میں خواب بھی دیکھ لیا..... ہے نا کملی.....'' اب وہ لاڈ پیار سے اسے کملی، کھوتی، بے وقوف بھی کہنے لگے تھے۔

''عورتیں خواب زیادہ دیکھتی ہیں۔ اور رہو ہسپتال میں..... کہیں کوئی اور نقصان نہ کروا لینا۔ شاباش گھر جا کر آرام کرو.....''

''اب میں نے نیند کر لی ہے، میں ٹھیک ہوں چا چا۔''

چا چا جی نے چند ہومیو پیتھک گولیاں صاف سفید ٹشو پیپر پر اتاریں اور اہتمام سے قیصر کی طرف بڑھا کر بولے..... ''یہ تمہاری ایلوپیتھک دوائیاں سب بیکار تھیں۔ پیتے ہی ابکائیاں آنے لگتی ہیں۔ جناب ڈاکٹر صاحب! دوا وہ جو زبان کو بھی اچھی لگے اور روح کو بھی..... جراحی وہی بہترین جس کا علم مریض کو نہ ہو۔ ملکہ نور جہاں کے پاؤں میں ایک مرتبہ پھوڑا نکل آیا تھا۔ ملکہ نشتروں سے ڈرتی تھی۔ کسی طور آمادہ نہ ہوتی کہ چیرا دیا جائے۔ جہانگیر بڑا پریشان، بڑے بڑے طبیبوں سے مشورہ کیا۔ پھر ایک خواجہ سرا نے مشورہ دیا۔ دوسرے دن ملکہ کو سلیم چشتی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر ننگے پاؤں جانے کی تلقین کی گئی تو میاں قیصر جب ملکہ نے پہلا قدم محل سے باہر رکھا..... پھوڑا پھٹ گیا..... سن رہے ہو قیصر۔ بھلا یہ کیسے ہوا قیصر..... راحیلہ تو کیا بوجھی ہوگی.....''

''کیسے چا چا جی.....'' راحیلہ نے تجسس سے پوچھا۔

''بس تم نہیں سمجھیں۔ محل سے آگے ریت بچھی تھی ریت میں نشتر چھپے تھے..... ہی ہی ہی..... لو کھاؤ دوائی.....''

قیصر نے منہ بنایا تو راحیلہ بولی..... ''چلیے میری خاطر سہی۔''

چند گولیاں ابھی حلق کے نیچے بھی نہ گئی تھیں کہ پھرتے ہوگئی۔ چاچا بوا مجیدہ منہ بنا کر ڈاکٹر سے مشورہ کرنے چلے گئے۔

☆☆☆

قیصر نے نیم بے ہوشی کے عالم میں راحیلہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا..... "بڑھاپے میں انسان کتنی آسانی سے زندگی کے مختلف Interests سے جدا ہو جاتا ہے..... ماں باپ کا رشتہ نہیں رہتا..... دوست اپنے اپنے کاموں میں الجھ جاتے ہیں..... بہن بھائی آپ کے یونٹ کا حصہ نہیں رہتے۔ ان کے محور بدل جاتے ہیں۔ جوانی کے کاروبار..... دلچسپیاں آنکھ مچولی کھیلنے لگتی ہیں....."

"آپ بوڑھے نہیں ہیں قیصر....."

"مجھے اس ذیابیطس نے بوڑھا کر دیا ہے..... مجھ میں جو زندگی کی حرارت ہے وہ صرف تمہاری وجہ سے ہے ورنہ اس شوگر نے مجھ سے جینے کی تمنا بھی چھین لی ہے....."

"آپ چاہتے ہیں میں گھر چلی جاؤں....."

"تو اب میں بات بھی نہ کروں، کوئی اندر کی بات....."

راحیلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"نہیں نہیں ضرور کریں....."

"میں اپنی ہر خواہش سے رخصت ہو چکا ہوں راحیلہ..... لیکن..... اتنے دنوں سے جب میں نیم غنودگی، نیم بے ہوشی کا شکار تھا..... تو میں سوچتا رہا ہوں کہ میں تمہاری آرزو سے آزاد کیوں نہ ہو سکا۔ میں بظاہر بہت نیک ہوں لیکن اندر سے بہت ہی کمینہ رذیل ہوں..... مجھے مرنے پر اعتراض نہیں راحیلہ..... بس میری ایک ہی خواہش ہے کہ تم میرے ساتھ مر جاؤ۔ کسی ہندو عورت کی طرح میرے ساتھ ہی ستی ہو جاؤ..... سنو راحیلہ..... میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد تم زندہ رہو..... اور اگر زندہ رہو تو خوش رہو....."

راحیلہ کی آنکھوں میں خوف اور وسوسے جاگ اٹھے تھے۔ اس نے چلا چلا کر کہنا چاہا۔ قیصر آؤ آج ہم ان کھلونوں کو ایک دوسرے کے سامنے کر دیں جن سے ہم چوری چوری کھیلتے رہے ہیں۔ جن سے ہم نے علیحدگی میں محبت کی ہے..... میرے متعلق تمہارے شکوک اور میرے ماضی کے صنم..... آؤ قیصر آج ہم سمجھوتہ کریں جس میں کوئی بھی ثالث نہ ہو..... نہ میرا نہ تمہارا.....

قیصر نے راحیلہ کو کچھ بھی کہنے کی مہلت نہ دی۔ وہ بڑی مدہم آواز میں بولتا چلا گیا۔ "میں جو زندگی میں تمہاری ہر خوشی کو اپنی مسرت پر ترجیح دیتا رہا ہوں..... اپنی موت کے بعد تمہیں خوش دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں اتنا فراخ دل نہیں ہوں راحیلہ کہ موت کی آخری ہچکی کے ساتھ اپنا اور تمہارا ہر رشتہ منقطع کر لوں..... میں تو تمہاری روح کے ساتھ گھن بن کر لپٹ جانا چاہتا ہوں..... میں تمہاری زندگی میں آنسو بن کر پچھتاوے کی صورت زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں تم سے ایک وعدہ لینے کے لیے زندہ ہوں..... ورنہ....."

راحیلہ نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے منہ پرے کر لیا..... "بس اب میں چلی ہی جاؤں گی۔"

قیصر نے اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں قید کر لیا..... ''تم نہیں جانتیں' مرد خالی ہاتھ آتا ہے اور ایسے ہی بے نیل ومرام واپس جاتا ہے..... اس کے پاس دنیا میں کچھ بھی نہیں۔ وہ جو دنیا بھر میں اپنی طاقت کے مظاہرے کرتا پھرتا ہے' یہ سب اس کی خود فریبیاں ہیں۔ وہ خالی ہاتھ آتا ہے اور خالی ہاتھ چلا جاتا ہے۔ باقی سب اس کے بھلاوے ہیں..... لیکن عورت تخلیق کرتی ہے' جب وہ مر بھی جاتی ہے تو بھی زندہ رہتی ہے۔ اس وقت بھی تمہارے جسم میں تمہارا ہی وجود ابدیت پا رہا ہے..... تم مر کر بھی زندہ رہو گی..... میں اپنی آخری سانس کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاؤں گا..... لیکن اب مجھے..... اس لمحے ایک امید کی شکل دکھائی دی ہے..... اگر تم چاہو تو میں..... میں امر ہو سکتا ہوں..... تمہارے وعدے کے سہارے میں بے امید موت مر سکتا ہوں۔''

''خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو قیصر.....''

''میں ہذیان نہیں بک رہا..... یقین کرو میرے حواس قائم ہیں..... تم بڑی نادان ہو راحیلہ..... کمزور ہمیشہ نادان ہوتا ہے۔ وہ اپنے مہرے چھپا کر کھیلنا چاہتا ہے..... عورت بھی اپنی چالیں مرد سے چھپانا چاہتی ہے۔ وہ مرد سے کہتی ہے میری آنکھوں میں مت دیکھو' میاں میں نے کچھ راز تم سے چھپا رکھے ہیں۔''

راحیلہ نے چاچا جی کو آواز دینا چاہی تو قیصر نے کہا..... ''کبھی کبھی ہمیں دوسروں کا سہارا لیے بغیر بھی ایک پہچان پیدا کرنی چاہیے..... ہمیں بالکل تنہا ہو کر ایک دوسرے کو Face کرنے کی ضرورت ہے..... کوئی تیسرا ہماری ازدواجی زندگی کی ضروری کڑی نہیں.....''

راحیلہ کا سانس تیز تیز چلنے لگا..... اسے شک گزرا کہ خلوت کی دیواریں ٹوٹ گئی تھیں۔ دروپدی کی ساڑھی ختم ہو گئی ہے اور اب اندر سے راحیلہ پوری طرح برہنہ برآمد ہونے والی ہے۔

قیصر نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پر رکھ دیا اور چوڑیوں کو بلا ارادہ گننے کے انداز میں پھرانے لگا۔

''میں تم سے وعدہ چاہتا تھا کہ میرے مرنے کے بعد..... تم کسی سے..... رابطہ نہیں رکھو گی..... لیکن بھلا تم اتنا بڑا وعدہ کیسے کر سکتی ہو..... ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے بھلا؟..... میں تو مذاق کر رہا تھا.....''

راحیلہ سسکیاں بھرنے لگی..... گلے کے ساتھ ساتھ قیصر کی نیلی رگیں ابھر آئیں جیسے عمارتوں کے پچھواڑے فلش اور گندے پانی کی نالیاں!

''آنسو نہ بہاؤ راحیلہ..... وقت کم ہے..... میری رذالت کی بھی حد ہو گئی..... میں جانتا ہوں وقت کم ہے' اسی لیے کسی شخص سے لپٹ کر زندہ رہنے کی کیننگی کر رہا ہوں..... میں تو تمہیں بھی رلانے لگ گیا ہوں..... تا کہ تم مشتعل ہو کر کوئی دعویٰ' کوئی وعدہ کر بیٹھو..... کوئی ابدی وعدہ اور پھر میں سکون کی موت مر جاؤں..... تمہاری یاد میں امر ہو کر مجھے ایک اور زندگی مل جائے۔ تم نے اپنے ہندو دوستوں سے مہارانی سیتا کی کہانی سنی ہی ہو گی..... جب وہ راون دیس سے آئی تو مہاراج رام نے اس کی نیک نیتی پر شبہ کیا..... راجہ رام کو شبہ تھا کہ رانی اتنی دیر لنکا میں رہ کر کیسے اپنی نیت صاف رکھ سکتی ہے۔ پھر ایک چتا جلائی گئی اور رانی سیتا..... اپنی پاکبازی اپنی نیک نیتی کو ظاہر کرنے کے لیے آگ پر کود گئی اور آگ نے اسے کچھ نہ کہا..... لیکن ہر انسان اپنی نیت کی سچائی کے لیے اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتا..... آگ کا فیصلہ تو بہت سخت ہوتا ہے راحیلہ.....

کس کی سچائی اتنی کھری ہوتی ہے.....کس کی نیت اتنی صاف ہوتی ہے کہ وہ آگ میں کود جائے.....کون؟''

اب راحیلہ کو یقین ہو گیا تھا کہ قیصر اس کے دل کی گہرائیوں سے بخوبی واقف ہے اور سزا دینے کی خاطر ایسی باتیں کر رہا ہے.....

''یہ رونا ختم کرو پلیز راحیلہ.....میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ یہ آنسو اس ہمت کو ڈبو رہے ہیں جو میں نے مہینوں میں پیدا کی ہے.....سنو محبت کرنے والی میری روح کو کبھی تم پر اعتبار نہیں آیا۔ تمہاری خدمت میں ایک الگ تھلگ بے تعلقی تھی راحیلہ.....تمہاری جسمانی سپردگی میں ایک قسم کی سرد مہری تھی جو میری روح کے بجز کتے جذبے کو سرد کر دیتی تھی.....تمہاری روحانی نیاز مندی میں اجنبی پن تھا.....'' یکدم قیصر آدھا بیٹھ گیا' وہ کہیں دور جا چکا تھا۔

''کہیں مجھے علم ہے کہ یہ تمام باتیں میرے بیمار ذہن کی پیداوار تھیں۔ میں انسولین کے ٹیکے لگواتا بلڈ ٹیسٹ دیتا دیتا تھک گیا ہوں.....سنو راحیلہ! اگر میں کسی پاگل پن کے لمحے میں تمہاری نیت کا ٹیسٹ لینا چاہوں.....اگر میں تم سے وعدہ لینا چاہوں کہ میرے بعد کسی سے شادی نہ کرنا تو مجھے اپنی نیت کا یقین دلانے کے لیے یہ وعدہ نہ کر بیٹھنا.....میں کمینہ ہوتا جا رہا ہوں۔ کوئی شخص کسی دوسرے کی نیت کو پرکھنے کا مجاز نہیں.....اس کے لیے راحیلہ روز قیامت کا تعین ہو چکا ہے۔ دراصل میری روح زندگی میں جو تسخیر نہیں کر سکی' وہ تمہیں اس طرح پابند کر کے.....تم کو جیت لینا چاہتی ہے.....میں تمہارا قیصر یہ نہیں چاہتا لیکن ہر انسان کے اندر ایک کم ظرف چھپا ہوتا ہے۔ وہی بدنیت تمہاری خوشیوں کی بھینٹ چاہتا ہے.....تمہارا قیصر تو.....اپنے لیے مرنے کی دعا مانگ رہا ہے.....وہ تو چاہتا تھا کہ تم کسی طرح اپنی خوشیوں تک پہنچ جاؤ.....اب جی چاہتا ہے کہ ہم دونوں ارسلان قیصر کے لیے زندہ رہیں.....وہ نہ جانے کس کی آس پر اس دنیا میں آ رہا ہے۔ جبکہ کوئی بھی اس کا منتظر نہیں.....''

یکدم راحیلہ کو لگا کہ قیصر کے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے.....راحیلہ کو معلوم نہ تھا کہ فیصلے کبھی آپ ہی آپ ہو جاتے ہیں۔ زبان خود بخود سارے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ وہ قیصر پر جھک کر بولی.....''قیصر.....اگر میں اپنی خوشی سے اپنے فیصلے سے ساری مسرتوں کا گلا گھونٹ کر بھی تمہیں شاد کر سکوں تو میں سمجھوں گی کہ بڑا سستا سودا مل گیا.....یقین کرنا قیصر.....کوئی طاقت مجھے نئے ساتھی کی تلاش پر آمادہ نہ کر سکے گی.....میں نے اس دھرتی کو اپنی مرضی سے اپنا گھر بنا لیا ہے.....کبھی نہ چھوڑنے کے لیے..... قیصر.....تمہاری التجا نہیں ہے' میری اپنی خوشی ہے.....'' قیصر کے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

چاچا جی دروازے میں کھانس کر داخل ہوئے اور پھر وہیں رک گئے تو راحیلہ گھبرا کر ان تک پہنچی.....

''وہ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا تھا.....وہ کہتے ہیں۔''

''جی جی کیا کہتے ہیں ڈاکٹر الیاس.....''

''ان کا مشورہ ہے کہ میں گاؤں میں اطلاع دے دوں.....''

''لیکن.....اب وہ ٹھیک ہو جائیں گے چاچا.....وہ.....باتیں کر رہے تھے.....پُرامید ہو گئے قیصر.....وہ ٹھیک ہیں جی.....''

''پھر بھی میں بیٹے سے کہوں گا وہ گاؤں چلا جائے۔''

''کہاں ہیں ڈاکٹر الیاس' میں خود ان سے بات کرتی ہوں.....''

وہ جلدی سے باہر نکلی۔ چاچا جی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ ابھی وہ چند قدم ہی گئی تھی کہ بنچ پر بیٹھ گئی۔

''اب مجھ سے چلا نہیں جاتا چاچا جی.....ڈرائیور بلائیں میں.....گھر جانا چاہتی ہوں.....''

''میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ تمہاری اپنی حالت ٹھیک نہیں لیکن آج کل کون کسی کی مانتا ہے۔ خواہ مخواہ کوئی اور نقصان ہو گیا تو؟.....'' بکتے جھکتے چاچا برآمدے میں چلتے گئے۔

☆☆☆

نرس نے چاچا جی کو کچن میں جا لیا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے خالی تھا۔

''آپ کو چائے کی پڑی ہے۔ پیشنٹ کی طبیعت ٹھیک نہیں' آپ سی سی یو میں چلیں پلیز.....''

چاچا جی نے چائے کو چولہے پر پکنے کے لیے چھوڑ دیا اور ہسپتال کا کچن چھوڑ کر سی سی یو کی طرف بھاگنے لگے۔ صبح کاذب کا وقت تھا۔ سارے ہسپتال میں خاموشی تھی۔ صرف وارڈوں میں بتیاں جل رہی تھیں۔ چلتے چلتے چاچا جی نے سوچا ابھی رات ہی کو تو ڈاکٹر الیاس کہہ رہا تھا کہ قیصر دو چار دن میں پرائیویٹ کمرے میں چلا جائے گا۔ اس کی شوگر نارمل تھی۔ جوڑوں کی درد بھی کم ہو گئی تھی۔ ای سی جی بھی نارمل تھی.....پھر اب کیا ہوا؟

جب وہ پلنگ کے پاس پہنچا تو قیصر پسینے میں نہایا پڑا تھا۔ اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ نرس بھی ان کے ساتھ ساتھ آ رہی تھی.....''میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں' آپ ذرا پیشنٹ کے کپڑے بدل لیں.....''

نرس فون پر ڈاکٹر الیاس سے رابطہ قائم کرنے میں مشغول ہو گئی اور ہاؤس جو بر ڈاکٹر چاچا جی کے ساتھ ساتھ ہو لیا۔ نوجوان ڈاکٹر نے حال ہی میں ایم بی بی ایس کیا تھا اور ابھی اس کی چال ڈھال میں معتبر ڈاکٹروں کی خوش اعتمادی نہ تھی۔ قیصر کے بیڈ کے عین پیچھے ایک بڑی کھڑکی تھی جس سے آسمان پر مدھم پڑتے ستارے نظر آ رہے تھے۔ چھوٹا ڈاکٹر سٹیتھو سکوپ لگا کر نبض اور دل دیکھنے لگا۔

''میرے قریب آئیے چاچا جی.....'' قیصر نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

''اور قریب.....اور قریب.....میں نے اپنی قیصر منزل' گاؤں کی جائیداد.....چھاؤنی والا گھر سب کچھ آنے والے بچے کے نام کر دی ہے.....کان اور قریب لائیں.....میرے سرہانے تلے میرا وصیت نامہ ہے۔ جب تک بچہ بالغ نہیں ہوتا.....سب کچھ راحیلہ کا ہے۔''

یکدم قیصر چپ ہو گیا۔ اس کا سانس رکنے لگا۔

''کچھ دکھائی نہیں دیتا.....کچھ دکھائی نہیں دیتا.....اندھیرا سا کیوں ہے.....''

قیصر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ہاؤس جو بر نے کہا.....''صبح صادق اور کاذب کے درمیان ایسا عجیب سا وقفہ ہوا کرتا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ ابھی صبح ہو جائے گی تو سب کچھ نظر آنے لگے گا۔''

قیصر نے دانت کٹکٹا کر چیخ موڑ لی۔ اس کی آنکھوں کی روشنی پتھرا گئی اور کرب نما مسکراہٹ نے لبوں کو گھیر لیا۔

قیصر نے جسم پر پڑے کمبل کا کونا اپنی گرفت میں لے لیا جیسے زندگی کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ای سی جی پر آنے والی لکیر جو ابھی آدھ گھنٹہ پہلے بھی اوپر بھی نیچے آ رہی تھی' ہولے ہولے سیدھی ہو گئی..... چاچا جی کو قیصر کے جانے کا اتنا فکر نہ تھا جس قدر وہ اس بات پر پریشان تھے کہ وہ راحیلہ کو کیسے زندہ رہنے پر آمادہ کریں گے۔

☆☆☆

جب راحیلہ ہسپتال سے لوٹی تو قیصر کو وفات کے تیسرا دن تھا۔

☆☆☆

صحن برآمدے کمرے دیہاتی لوگوں سے بھرے تھے۔ فرشوں پر سفید چادریں اور درمیان میں کھجوری گٹھلیوں کے ڈھیر' عورتیں چادروں کے کناروں پر بیٹھی گٹھلیاں اور سیپارے پڑھنے میں مشغول تھیں۔ بچے بھاگنے' کھیلنے اور ماؤں سے شکایتیں کرنے میں محو تھے۔ جو عورتیں پڑھنے میں مصروف نہ تھیں' وہ آپس میں گفتگو کر کے بڑی اہم لگ رہی تھیں۔ تکیے کے پاس انگیٹھی جلا کر زینو نے ہرمل اور لوبان کی دھونی دے رکھی تھی' جس کا کسیلا دھواں باہر گلی میں جا رہا تھا۔ گلی کی سڑک شامیانے سے بند کر کے اس پر دریاں بچھا کر سفید چادروں سے ڈھانپا گیا تھا۔ مولوی حضرات بڑے زور و شور سے قرآن ختم کرنے میں مشغول تھے۔

راحیلہ کو آج پھر بخار تھا اور وہ ارسلان کے پاس ڈبل بیڈ پر لیٹی تھی۔

راحیلہ کو لگا جیسے ارسلان بالکل قیصر کا ہمشکل تھا۔ اس نے کھلے دروازے سے باہر نگاہ ڈالی۔ اس کی منجھلی نند سفید چادر پر بیٹھی سیپارہ پڑھ رہی تھی۔ راحیلہ سوچنے لگی یہ چہرہ قیصر سے کس قدر مختلف ہے اور پھر مشابہ بھی اس قدر ہے کہ دیکھنے والا فوراً پہچان جائے کہ یہ قیصر کی بہن ہے..... اس کی تینوں نندوں کی شخصیت ایک سی تھی..... ویسی ہی شخصیت جیسی قیصر کی تھی۔ بڑی عارفہ کا چہرہ بیضوی' منجھلی کا گول اور چھوٹی سعیدہ کا پچکا سا چہرہ تھا لیکن عارفہ' زبیدہ اور سعیدہ کی روح ایک سی تھی۔ ان کو دیکھ کر احساس ہوتا کہ یہ ایسے گہرے سمندر ہیں جن کی اتھاہ کسی کو نہیں مل سکتی۔ اوپر کے پانی جامد اور نیچے پانیوں میں طوفان تھے..... کوئی منچلا اگر ہمت سے کام لے تو ان پانیوں سے بے شمار موتی نکال سکتا ہے۔ اہرام مصر کی طرح خاموش' کہانیوں سے پر' آباؤاجداد سے جڑے ہوئے یہ چہرے بڑے پراسرار تھے لیکن آنکھیں بڑے تیکھے افسانے کہا کرتی تھیں۔ عارفہ' زبیدہ سے اور زبیدہ سعیدہ سے یہ کہانیاں چھپائے پھرتی تھیں۔

سعیدہ نے ارسلان کے کپڑے تبدیل کرتے ہوئے کہا "بھابھی جی! آپ کو فلٹ کی بو بری لگتی ہے۔"

"کوئی خاص نہیں....." راحیلہ نے جواب دیا۔

"ربا ان مچھروں نے تو توڑ کر کھا لیا' سارے پنڈے پر دھبے پڑ گئے....." راحیلہ اس کسیلے خوشبودار دھوئیں سے پریشان تھی لیکن اس نے باہر ہونے والے مشاغل میں کوئی شرکت کی' نہ مشورہ دیا۔

عارفہ بڑی شد و مد سے گاؤں جانے کے پروگرام بنا رہی تھی۔ قیصر کی والدہ بھی لوٹ جانا چاہتی تھیں لیکن ابھی وہ فیصلہ نہ کر پائی تھیں کہ واپسی کب ہوگی۔ وہ اپنی جٹھانی اور دیورانی کے ساتھ کانفرنس میں مشغول تھی۔

"ہائے اپنی جوان بہنوں کے متعلق کچھ نہ سوچا..... تو بہ توبہ ساری جائیداد بھورا پنے بچے کے نام لکھ دی....."

گھر لوٹ کر سب سے پہلے راحیلہ اپنی ساس کے ڈھیلے ڈھالے جسم سے لپٹ کر روئی تھی۔ اسے لگا کہ قیصر نے ایک نیا جنم لے لیا ہے..... اسے معلوم ہی نہ تھا کہ قیصر کب اچانک رخصت ہو گیا۔ اسے تنہا چھوڑ کر جانے کا قصد اس نے کیوں کیا؟ اور اب واپس آنے میں کیا شے مانع تھی..... ارسلان کے سر پہ ہاتھ پھیر کر راحیلہ بولی۔

''بس..... فکر کی کوئی بات نہیں۔ آپ کے ابی دور گئے ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے بھلا کیا کہتے تھے ابو..... سنو ارسلان۔ مجھے تو اتنی ساری باتیں ابھی سے بھول گئی ہیں۔ مجھ میں آشوب غم کا حوصلہ نہیں ہے۔ میں تو ہر مشکل مقام پہ بے ہوش ہو جاتی ہوں۔ پتہ نہیں تمہارے ابی کب لوٹیں گے..... بھلا کب آئیں گے۔ قیصرا تم ہی بتاؤ تمہیں تو ابھی خبر ہو گی۔''

سعیدہ نے راحیلہ کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے لیکن انتہائی کرب سے ایک عجیب قسم کی دیوانی چمک ان میں پیدا ہو گئی تھی۔ راحیلہ نے سعیدہ کی چپ حیرانی کو بھانپ کر خاموشی اختیار کر لی۔

''بھابی..... تم یوں سنا سنا کر ارسلان سے باتیں نہ کیا کرو جانے والے کی روح کو دکھ پہنچتا ہے.....''

''اچھا.....'' راحیلہ نے سعیدہ کی گود میں سونے والے ارسلان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یہ زیادتی ہے بھابی..... ایسے بین کرو گی تو ہم بہنوں کا کیا حال ہو گا.....''

''ہاں..... ہاں..... قیصر کو ان باتوں سے ہمیشہ دکھ ہوتا تھا..... وہ تو خوش رہنے کا فارمولا مجھ سے پوچھا کرتے تھے.....'' فضا میں ہرمل اور لوبان کی خوشبو تھی اور کچھ ہلکا سا دھواں بھی کمرے میں در آیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں راحیلہ کی آنکھوں سے جل دھارا بہہ نکلی.....

''کھڑکیاں کھول دو سعیدہ..... پردے ہٹا دو..... یہ دھواں سا کیسا ہے؟ میرا دم گھٹ رہا ہے.....'' سعیدہ نے دیکھا راحیلہ پسینے میں نہا گئی تھی۔ آہستہ سے اٹھ کر اس نے کھڑکیاں کھولنا شروع کر دیں۔

کھاتا کھلتے ہی باہر ایک دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ چاچا جی انتظامی امور سنبھالے ہوئے بڑے معتبر بنے دکھائی دے رہے تھے۔ تھوڑا سا کھنکار کر انہوں نے قیصر کے کمرے میں قدم رکھا۔ راحیلہ پلنگ پر نیم دراز تھی۔ وہ پاس آئے اور اس کے پاس صوفے پر بیٹھ کر بولے..... ''تم فکر نہ کرو بیٹیا.....''

''جی.....''

''تم یوں کمرے میں پڑی رہتی ہو یہ بری بات ہے بیٹیا..... جو کچھ ہوا اس میں کچھ بہتری ہو گی۔ ہمیں اللہ کے کاموں پر راضی رہنا چاہیے۔''

''جی بالکل.....'' آنکھ کے کونے میں ایک آنسو سورج کی آخری کرن بن کر جھلملا رہا تھا۔

چاچا جی نے کان میں ماچس کی تیلی پھراتے ہوئے لجاجت سے کہا..... ''وہ تم اپنی ساس سے ناخوش تو نہیں ہو راحیلہ..... یعنی؟''

''جی؟.....''

''وہ لوگ گاؤں واپس جانا چاہتے ہیں۔ تم نے اس بات کا برا تو نہیں منایا؟.....''

''جی.....؟ جی نہیں تو.....''

''تم کوئی اکیلی تھوڑی ہو۔ تمہارے پاس تو قیصر کی نشانی ہے۔ تمہارا بچہ ہے..... قیصر نے ساری جائیداد تمہارے نام ہبہ کر دی ہے لیکن ہبہ شرط العوض ہے یعنی فی الحال تو تمام دولت' یہ گھر..... ملتان کے مربعے لیکن فی الحال یہ دولت تمہاری ہے' تمہارے لعل کی ہوئی تو تمہاری ہی ہوئی.....''

''مجھے دولت نہیں چاہیے چاچاجی.....''

''ہاں اچھے لوگوں کو دولت درکار نہیں ہوتی..... لیکن ضرورت ان کو بھی پڑتی ہے۔ جو یہ کمبخت نہ ہو تو ہاتھ پھیلانے پڑتے ہیں دوسروں کے آگے..... عزت بھی جاتی ہے اور توکل بھی..... اپنی ساس کی باتوں کا برا نہ ماننا..... عورت اپنے لیے حریص نہیں ہوتی لیکن بدقسمتی سے اولاد کے معاملے میں حریص بھی بن جاتی ہے..... اور بے انصاف بھی..... مامتا ہے ہی بڑا امتحان..... کڑی آزمائش ہے مال اور اولاد کی..... اگر کوئی بات سن لی ہو تو معاف کر دینا۔ بوڑھی عورت ہے..... اور قیصر کی ماں ہے۔''

راحیلہ کو یوں چپ چاپ دیکھ کر چاچاجی پگھل جاتے۔ انہیں اپنی بیٹی یاد آ جاتی۔ قیصر کی ماں سے بھی چاچاجی کو گلہ تھا کہ قیصر کی ماں نے راحیلہ بہو کی دلجوئی کرنے کے بجائے جائیداد کا قصہ یوں چلایا گویا ساری ذمہ داری بہو کی تھی۔ اسی نے اپنے چلتر سے جائیداد اپنے نام منتقل کرائی ہو۔

''کھانا کھایا تم نے؟.....''

''بھوک نہیں ہے چاچاجی.....''

''لو اگر کھاؤ گی نہیں تو طاقت کیسے پکڑو گی۔ اپنا ارسلان کیسے موٹا ہو گا.....'' دروازے تک جا کر انہوں نے منجھلی نند کے کان میں کچھ کہا..... اور واپسی پر بھول بھی گئے کہ راحیلہ نے کھانا نہیں کھایا۔ جس شدت سے وہ اصرار کرتے اسی سرعت سے بھول جاتے کہ وہ کس بات پر مصر تھے۔

''اچھا تم فکر نہ کرنا۔ ذرا یہ گراہیں ٹولہ دو چار دن میں رخصت ہو جائے تو میں وصیت نامہ تمہیں لا دوں گا۔ کہیں یہ کوئی اور پاکھنڈ نہ کریں.....'' قریب سے سرگوشی کر کے چاچاجی باہر جانے لگے۔

''ذرا میں مولوی حضرات کو رخصت کر آؤں.....''

چاچاجی باہر چلے گئے تو راحیلہ نے سوئے ہوئے ارسلان پر نظر ڈالی۔ یہ مظلوم روح بھی کون تھی؟ کس لیے اس نے اس گھر کو منتخب کر لیا تھا جہاں میزبان بھی موجود نہ تھا..... سارا گھر اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں بالکل اجاڑ تھا..... ڈریسنگ ٹیبل پر اب سینٹ کی بوتلوں کے ساتھ ساتھ ارسلان کی بوتلیں' بے بی پاؤڈر' چوسنی' جھنجھنے نظر آ رہے تھے۔ کھونٹیوں پر ابھی قیصر کے کپڑے ٹنگے تھے..... اب اس گھر کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ اسے لگا جیسے اس کے ساتھ قیصر منزل بھی کسی کا انتظار کر رہی ہے۔ جس روز وہ پہلے دن ہسپتال سے لوٹی تھی تو مغرب کے وقت اسے قیصر نلکے کے پاس دانت صاف کرتا نظر آیا تھا۔ قیصر کی عادت تھی کہ برش پر منجن لگا کر دانت صاف کرتا..... پھر وہ احتیاط سے برش دھو کر گلاس میں رکھتا اور اس گلاس کو تخت پوش پر رکھ دیتا۔ ایک دن راحیلہ نے کہا تھا..... ''آپ برش کے معاملے میں اس قدر اہتمام کیوں کرتے ہیں قیصر.....''

''دھوپ میں جراثیم مر جاتے ہیں۔''

"کیسے جراثیم قیصر؟....."

"ہوتے ہیں ایک خاص قسم کے....."

قیصر نے اپنے کانوں کے ساتھ دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا تھا.....اسے وہ برش بھی نظر آ رہا تھا جو مہینوں سے بدلا نہیں گیا تھا.....قیصر ہمیشہ کی طرح پرانی چیزوں سے وابستگی کا شکار تھا۔ خالی بوتلیں، ٹین، کنستر، پیکنگ کے ڈبے، کئی کمروں میں سے ایسے ہی سامان کو شاید نکال کر پھینکنا پڑے پھر؟.....قیصر جس کی زندگی احتیاط سے خمیر تھی، جو ڈاکٹر تھا اور جراثیموں سے بچتا رہتا تھا، مر چکا تھا اور راحیلہ جس نے کبھی کوئی احتیاط نہ کی تھی۔ جو گندی سڑی چیزیں بازار سے منگوا کر کھا لیتی تھی، آج زندہ تھی اور پتہ نہیں اب اسے اور کتنی دیر زندہ رہنا تھا۔

یکدم راحیلہ کو لگا قیصر ڈریسنگ ٹیبل کے قریب کھڑا ہے۔ اس کے چہرے پر عجیب قسم کا تناؤ تھا۔ ناک کے اردگرد کی لکیریں چاقو سے تراشی گئی تھیں۔ وہ راحیلہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کہنی کا سہارا لے کر راحیلہ نے آئینے کی طرف دیکھا۔ قیصر کی پشت آئینے میں عکس بن کر کھڑی تھی۔ شام کا دھندلکا اس کی آنکھوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا کہ واقعی قیصر اپنی طنز بھری مسکراہٹ کے ساتھ کھڑا تھا۔ راحیلہ نے خوف کو دل سے نکال دینا چاہا لیکن خیال منہ زور ندی کے سیلاب زدہ پانی کی طرح بڑھتا گیا۔

قیصر اس کی جانب بڑھنے لگا "دیکھو راحیلہ میں نے تمہارے لیے کتنی دولت چھوڑی ہے۔ تمہیں قیصر سے اور کیا چاہیے تھا؟ اب تو خوش ہونا.....اب.....اور کیا چاہیے.....کیوں پریشان ہو بولو....."

راحیلہ نے ذرا سا سر اٹھایا اور آیت الکرسی پڑھنے لگی۔ اسے لگ رہا تھا وہ تکیے سے سر اٹھائے گی تو قیصر صوفے پر بیٹھا اپنے لیے دوا انڈیل رہا ہوگا اور زیر لب کہے گا....."جان قیصر! تم نے تو شاید ہر روز میری موت کی دعا کی ہے.....تو پھر اب یہ پریشانی کیسی؟"

اسے پہلی بار قیصر سے خوف آنے لگا.....اس نے سر تک رضائی کر لی اور اسے ہلکا ہلکا پسینہ آنے لگا۔

"بی بی جی.....دودھ پی لو....."

زینو سامنے دودھ کا گلاس لیے کھڑی تھی۔ راحیلہ نے بڑی توجہ لگا کر اس آواز کو پہچانا اور پھر رضائی سے سر نکال کر دیکھا۔ زینو نے پسینے میں تر چہرہ اور حیران آنکھیں دیکھیں تو اسے لگا جیسے بی بی دیوانی ہو چکی ہے یا پھر وہ کسی کا خون کر چکی ہے اور اب راز کھولنا اس کے لیے مشکل ہے لیکن پھر اپنے اس خیال پر لعنت بھیجتی زینو پلنگ کے قریب دوزانو بیٹھ گئی اور راحیلہ کا چہرہ پونچھتے ہوئے بولی....."بی بی جی۔ غم نہ کرو.....غم نہ کرو۔ ایسے دودھ خشک ہو جائے گا.....اللہ کو ایسے ہی منظور تھا۔ کوئی لڑ تھوڑی سکتا ہے اللہ میاں سے....."

"نہیں نہیں، میں غم تو نہیں کرتی.....بس مجھے ڈر لگتا ہے۔ ذرا ارسلان کو میرے پاس ڈال دو....."

زینو نے کوٹ میں سے بچہ اٹھا کر اس کے پاس ڈال دیا اور دودھ رکھ کر واپس چلی گئی۔ بچہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اسے خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے، کہاں آ گیا ہے۔ راحیلہ پلنگ سے اٹھی اور سامنے لٹکے ہوئے کپڑوں کی طرف بڑھنے لگی۔ قیصر کے مرنے کا کلی احساس اسے ان کپڑوں کو دیکھ کر ہوا۔ ان کپڑوں کو پہننے والا کبھی کا جا چکا تھا۔ کھونٹی سے ایک قمیض اٹھا کر

اس نے اپنا چہرہ اس میں چھپا لیا۔ یوں تجدید وفا کرنے سے اسے تھوڑی سی تسلی ہوئی اور آنسو بے تحاشا نکلنے لگے۔ اس کے نتھنوں میں قیصر کی مخصوص خوشبو آنے لگی جیسے باسی چنبیلی میں تمبا کو ملا دیا ہو۔ ایک روز اس نے قیصر سے کہا تھا۔ ''آپ سے عجیب سی خوشبو آتی ہے۔''

''اچھی یا بری.....'' قیصر نے پوچھا تھا۔

''پتہ نہیں۔ میں تجزیہ نہیں کر سکتی۔ اگر آنکھیں بند کرلوں تو لگتا ہے یہ خوشبو کسی بوڑھی عورت کی ہے جس نے ساری عمر چنبیلی کے پھولوں کا استعمال کیا ہے.....''

''یعنی بوڑھی نسوانی باس.....''

''اگر کبھی رات کو خوشبو آئے تو لگتا ہے جنگل کے درختوں میں آگ لگی ہے.....''

اس خوشبو کی وساطت سے اس نے قیصر کا وجود واپس لانا چاہا۔ اس کی محبت کو اپنے اوپر طاری کرنا چاہا.....لیکن دور کہیں ایک گھنٹی خطرے کی بج رہی تھی۔ کوئی جیسے پوچھ رہا تھا' کیا یہ وفا غلط نہیں۔ یہ کوشش بیکار اور لا حاصل نہیں.....قیصر تو جا چکا ہے' دور بہت دور.....اور اب کبھی پلٹ کر نہیں آئے گا۔ اگر وہ لوٹ بھی آیا تو اس کا وجود اتنا ہی بیکار ہوگا جتنا شاہد کا تھا۔ اس نے قمیض کو واپس کھونٹی پر لٹکا دیا۔

ایک واہمہ اسے گھیرنے لگا۔

وہ دو زانو بیٹھی ہے۔ شاہد قالین پر نیم دراز ہے۔ دروازے کا پٹ ذرا سا کھلا ہے اور سورج کی کرنیں اس کے چہرے کو سینڈھوری بنا رہی ہیں۔ اس کی مسکراہٹ میں زہر ملا ہوا تھا۔

''بتاؤ.....بتاؤ تمہیں قیصر سے محبت تھی یا مجھ سے.....؟ ہاں اب تم قیصر کی ہو تم نے اس سے وعدہ وفا کر لیا ہے۔ مجھے چاہنے کا تو محض ڈھونگ تھا.....تم میری بیوی نہیں قیصر کی بیوہ ہو.....تمہیں اپنا پچھلا وطن' والدین' بھائی' شاہد سب کچھ بھول گیا ہے۔ اب تم اس دھرتی کی ہو.....تم نے ایک اٹل فیصلہ کر لیا ہے راحیلہ.....''

پھر شاہد نے جیب سے سگریٹ لائٹر نکالا۔ ''پتہ ہے اس میں آگ دفن رہتی.....ہے..... یاد بھی ایسی ہی چیز ہے۔ راحیلہ کبھی کبھی ساری زندگی میں شعلے بھر دیتی ہے.....کبھی تمہیں ناسٹلجیا نے گھیرا ہے؟''

''ہاں.....سرد اور بے جان چیزوں کے اندر شعلے ہوتے ہیں شاہد۔''

خوف سے اس نے اپنا گریبان پکڑا تو سیفٹی پنوں سے اس کی انگلیاں ٹکرا گئیں.....واہموں سے نکل کر اسے ارسلان کی حقیقت نے چھو لیا.....دور کہیں شاہد اب بھی بول رہا تھا لیکن یہ نغمہ اب معنوں سے عاری تھا۔ شاہد کی شکل بدل چکی تھی۔ ان ہونٹوں پر طنز تھا' بے رحمی تھی۔ اس کے بال پہلے کی طرح گھنے نہیں تھے۔ اب شاہد کے چہرے پر معصومیت بھی نہیں تھی.....ارسلان کی جانب بڑھتے ہوئے راحیلہ نے سوچا جو شاہد باہر سے اس قدر بدل گیا ہے' کیا اندر سے نہ بدلا ہوگا۔ یقیناً وہ ذہنی قلبی روحانی طور پر کئی کروٹیں بدل چکا ہوگا۔

ارسلان رو رہا تھا۔

اس نے گود میں بچے کو اٹھا کر اپنے آپ سے کہا..... ''ولیری سیکھو راحیلہ.....دو راستوں پر چلنے والے کہیں

نہیں پہنچتے..... یقیناً شاہد اور میری طبیعت میں بڑے فاصلے پیدا ہو گئے جنہیں عبور کرنا ممکن نہیں۔''

بچہ اس کی گود میں آتے ہی چپ ہو گیا۔

زینو ہاتھ میں کفگیر لیے برآمد ہوئی..... ''وہ بی بی جی! ایک صاب جی ڈرائنگ روم میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ افسوس کرنے آئے ہیں۔''

''کون ہیں.....''

لیکن زینو یہ کہتے ہوئے جلدی سے لوٹ گئی کہ ہانڈی سڑ جائے گی۔

سامنے فوجیوں کی وردی پہنے نجم کھڑا تھا۔

''مجھے بڑا افسوس ہے بھابھی.....'' دھتکارے جانے کے باوجود وہ بڑی عاجزی سے کھڑا تھا۔

''جی.....''

''آپ مجھے بیٹھنے کو نہیں کہیں گی..... شاید آپ نے مجھے معاف نہیں کیا..... صدق دل سے.....''

''آپ کی بے جان زندگی پر مجھے بڑا ترس آ رہا ہے.....''

''شکریہ نجم بھائی۔ اگر آپ میرے معاملات میں دخل نہ دیں تو نوازش ہوگی۔''

ابھی چند لمحے پہلے اس کا خیال تھا کہ ڈرائنگ روم میں شاہد آیا ہوگا۔ وہ قیصر کی امانت میں خیانت کر کے ایک نیا خواب دیکھنا چاہتی تھی۔ آتش بازی کا سا خواب..... قیصر منزل سے دور ایک بھٹکا سا خواب.....

''جی اس ہمدردی کا شکریہ.....''

''میں آپ کی زندگی میں ہمیشہ غلط لمحے میں آیا ہوں۔'' نجم صوفے پر بیٹھا بہت سا لگ رہا تھا۔

''چائے پئیں گے نجم بھائی۔''

''شکریہ.....'' وہ جیب سے رومال نکال کر جوتے صاف کرنے لگا۔

راحیلہ نے دل میں سوچا کہ اب مجھ سے کون سی غلطی سرزد ہو گئی ہے جس کی پاداش میں نجم آیا بیٹھا ہے۔ یہ وہ مقام تھا جہاں وفا اور بے وفائی دونوں کا سوال بے معنی ہو گیا۔ اسے اپنی اور تسنیم کی راہیں جدا ہوتی نظر آ رہی تھیں۔

''میں..... کچھ اپنے متعلق' کچھ اپنے ارادوں کے بارے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں..... اجازت ہے.....''

راحیلہ خاموش رہی.....

''میں اور قیصر..... ایک عجیب قسم کی Understanding رکھتے تھے۔ ہمیں آپس میں بڑا پیار تھا۔ ہم ایک آنگن میں تو نہ کھیلے تھے لیکن آپس میں ایسی کھینچ تھی جو ایک گھر کے بچوں کو ہوتی ہے..... ہم کئی بار ان کہی لمبی لمبی باتیں ایک دوسرے سے کر لینے پر حاوی تھے..... پھر آپ آ گئیں..... ہماری دوستی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی..... ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے..... میں..... نے قیصر کی ضرورت کو بہت محسوس کیا..... کبھی کبھی میں اپنے آپ سے کہتا قیصر میں بہت تنہا ہوں اور ذہنی طور پر بیمار ہوں..... جلد آ جاؤ..... لیکن آنے کے بجائے وہ چلا ہی گیا.....''

''جی..... کیا کیا جا سکتا ہے نجم بھائی.....''

"میں بڑا کم ظرف ہوں' رذیل ہوں..... لیکن ایک بڑا ہی دکھی انسان ہوں..... میں نے کامیابی کی کوئی شکل کبھی نہیں دیکھی....."

"آپ کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کرلیں' وہ آپ کو کامیابی سے آشنا کر دے گی۔"

"میں سایوں سے محبت نہیں کرنا چاہتا بھابھی..... ہر انسان ایسا نہیں ہوتا کہ وہ اندھیرے سے بھی اتنی ہی محبت کرے جتنی روشنی سے کرتا ہے۔"

سامنے کھڑا وجود نجم ہونے کی تصدیق کر رہا تھا لیکن اس کی آواز بدل چکی تھی۔ اس میں پٹھانوں کی سی تندی نہ تھی بلکہ بڑی انکساری' بے بسی اور عاجزی تھی..... کیا زندگی' حالات یا غیبی طاقتیں اس قدر مقلب القلوب تھیں؟ راحیلہ کو نجم کا یہ نیا وجود قابل ترس لگا۔ اس جذبے پر بھی اسے شرمساری سی محسوس ہوئی جیسے وہ قیصر سے دانستہ طور پر بے وفائی کر رہی ہو۔ پتہ نہیں کیوں وہ تجسس اور ولاسے کی سیج سے نہیں نکل پائی تھی۔ قیصر منزل کے کونے کھدرے میں قیصر کا وجود تھا..... خدا جانے کیوں وہ قیصر منزل سے دور بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن اس کے بھاگتے ہوئے ذہنی قدم بڑے پشیمان تھے اور قیصر سے معافی مانگتے ہوئے کہہ رہے تھے..... "نجم ٹھیک کہتا ہے۔ سایوں سے محبت کرنا بڑی کٹھن بات ہے قیصر..... میں تسنیم آپا نہیں ہوں..... اور تم اچھو بھائی بھی نہیں ہو قیصر..... اگر تم قیصر..... اچھو بھائی بھی ہوتے تو بھی..... میں یادوں کے سہارے جی نہیں سکتی۔ ہر انسان میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ فقط ماضی کے سہارے حال کو تباہ حال کر دے۔"

"آپ کیا سوچ رہی ہیں....."

"کچھ نہیں نجم بھائی..... قیصر تو اتنی یادیں چھوڑ گئے ہیں کہ باقی ساری عمر کے لیے کافی ہیں....."

"میری زندگی میں بڑی تھکن ہے راحیلہ..... یہ تھکن میرے ناآسودہ انتظار نے پیدا کی ہے۔ میں انتظار کرتا رہتا ہوں حالات کے بدلنے کا لیکن آخری لمحے..... مجھ سے برداشت نہیں ہوتے۔ میں نتائج پر حاوی ہونے کے بجائے بھاگ جاتا ہوں۔"

"نجم بھائی ماضی سے بے نیاز ہو کر کچھ پلان بنائیں مستقبل کے لیے۔"

نجم فوجی وردی میں پیارا لگ رہا تھا جیسے کسی ڈرامہ میں پارٹ کر رہا ہو۔

"میرے ماضی نے میری ساری خوشیاں سمیٹ لی ہیں..... میں سمجھتا ہوں..... بلکہ سمجھتا تھا کہ میں نے کسی کی زندگی تباہ کر دی ہے..... لیکن..... انسان جب کسی کو تباہ کرتا ہے تو خود تباہی سے بچ نہیں سکتا..... ہر عمل کا ردعمل ضرور ہوتا ہے..... میں آپ کے پاس ایک خاص درخواست لے کر آیا ہوں..... میں جانتا ہوں آپ ایک پُروقار مشرقی عورت ہیں لیکن انسان ہمیشہ کسی اعلیٰ چوکھٹ پر ہی سر جھکا سکتا ہے۔ میں اپنے ضمیر کو لوریاں دے کر سلانا چاہتا ہوں..... لیکن مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی دوسرے کی مدد کے بغیر میں اپنی دلدل سے نکل نہیں سکتا..... میں اپنا ماضی کسی کے ساتھ شیئر کیے بغیر ذہنی صحت نہیں پا سکتا۔ اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکتا۔"

راحیلہ کو ایک بار پھر خوف آنے لگا۔ ہمیشہ کی طرح وہ آشوبِ غم کے مقابلے سے گھبرا گئی۔ اس کا ذہن ماؤف ہو گیا اور قوت ادراک جواب دینے لگی۔ پتھر کی مورت بنی ٹکر ٹکر نجم کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اسے لگا جیسے وہ بے ہوش ہونے والی ہے۔

"مجھے قیصر نے یہاں آنے سے منع نہیں کیا تھا لیکن میرا حسد مانع ہوتا تھا۔ ہم دونوں لفنڑ سے تھے۔ ہر طرف خلا ہی خلا تھا..... پھر قیصر آپ کی پناہ میں بھرتا گیا..... اور میں غبارے کی طرح خالی اپنے ٹوٹنے کے خوف سے آوارہ رہا..... مرد کو عورت کی تسلی درکار ہوتی ہے..... اگر قیصر کو آپ نہ ملی ہوتیں تو وہ بھی..... مرد آوارہ ذرے سے آفتاب بن جاتا ہے۔ صرف عورت کا ہاتھ اس کے کندھے پر ہونا چاہیے..... میں بڑی امید لے کر آپ کے پاس آیا ہوں....."

ہر محبت نے اسے بڑے دکھ دیئے تھے۔ ہر انسان اپنی اپنی جگہ اس سے بے وفائی اور وفا کی توقع رکھتا تھا۔ اس غلط منطق کے چکر میں پھنس کر اس کا سر گھومنے لگا تھا.....

"میں..... جانتا ہوں..... آپ ابھی گہرے غم میں ہیں..... میں بھی ایک نئی منزل کی تلاش میں ہوں۔ یوں سمجھئے میں..... اپنے اندرونی وجود کو شانت کرنے کے لیے میں نے ایک نیا راستہ چن لیا۔ میں اپنے وجود کو اپنے ہی لہو کا وضو کرانا چاہتا ہوں....."

"میں آپ کی باتیں سمجھ نہیں سکی....." راحیلہ بولی۔

"یہ وردی آپ دیکھ رہی ہیں..... یہ وردی میں نے اپنے ایک دوست سے ادھار لی ہے..... میں نے اس میں اپنا ناپاک جسم چھپایا ہے اور اب میں کشمیر جا رہا ہوں..... اگر بچ رہا تو شہید..... لوٹ آیا تو غازی..... میں ساری عمر ایک ڈھونس کا رشتہ تلاش کرتا رہا۔ ایسے رشتہ پر مان کرنا میری ضرورت تھی..... لیکن میں اپنی ذات سے اس کی ضرورتوں' آرزوؤں سے کچھ اوپر اٹھ کر دیکھنے کے قابل ہو گیا ہوں..... میں کشمیر جا رہا ہوں راحیلہ..... میں اپنی پیاس کو صاف محبت کا پاک پانی پلاؤں گا..... ایک بڑے cause سے منسلک ہو کر بھول جاؤں گا کہ میں کتنا چھوٹا تھا....."

دیر تک وہ ریڈ کلف کی باؤنڈری لائن' گورداسپور کو ہندوستان کا حصہ بنانے کی سازش' کانگریس کی منافقانہ پالیسی اور کشمیر کی حالت زار پر لیکچر دیتا رہا۔ وہ کشمیر کے لیے تن من دھن کی بازی لگانے کو ایک اوٹی ایثار سمجھ رہا تھا۔

"آپ سمجھ نہیں سکتیں اپنے آپ کو بھول کر کسی اور منزل میں گم ہو جانا کتنی بڑی راحت ہے....."

"آپ کو مبارک ہو نجم بھائی! آپ اتنی بڑی قربانی دے رہے ہیں....."

"تت تت تت..... یہ قربانی نہیں ہے..... بالیدگی ہے میں نالی کا کیچوا پرندہ بن گیا ہوں..... پتنگ کی طرح اڑ رہا ہوں اوپر ہی اوپر..... مجھے آج کسی کی پروا نہیں..... آج میں سمجھ پایا ہوں جب قیصر والٹن کیمپ آیا کرتا تھا۔ والنٹری خدمت کو اختیار کیا تھا تو وہ..... وہ مجھ سے اوپر اٹھ گیا تھا..... وہ آپ سے مل کر مجھ سے جدا نہیں ہوا' وہ تو پہلے ہی ایک اور فضا میں سانس لینے لگا تھا..... آپ مجھے دعا نہیں دیں گی....."

دعا دینے کے لیے راحیلہ کی عمر ابھی چھوٹی تھی' وہ جھینپ گئی۔

"جی میں ضرور دعا کروں گی کہ آپ کشمیر سے غازی بن کر لوٹیں....."

"اور پھر؟....." نجم نے سوال کیا۔

"اور پھر؟....."

"اگر جب تک آپ نے مجھے معاف کر دیا تو..... تو آپ آخر یوں بے جان سی زندگی کب تک گزاریں گی راحیلہ؟" نجم نے سوال کیا۔

راحیلہ نے یہ تو سوچا ہی نہ تھا کہ عمر لمبی بھی ہو سکتی ہے۔

''دیکھیے نجم صاحب..... میں بہت سے ناگوار حالات سے گزر کر یہاں پہنچی ہوں..... آپ پہلے بھی ایک بار دخل در معقولات کر چکے ہیں۔ میں بڑی مشکور ہوں گی اگر آپ میرے معاملات میں اب دخل نہ دیں.....''

''مشکل یہ ہے کہ تم مرد نہیں ہو راحیلہ..... تمہیں معلوم نہیں مرد کہاں تک عورت کی توجہ کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا مرد جو اپنی بھاوجہ کی محبت میں گم تھا۔ پھر اچانک اسے ایک ایسی لڑکی نظر آ گئی جو عین مین اس کی بھاوجہ جیسی تھی..... بتایئے اگر آپ وہ مرد ہوتیں تو آپ کیا کرتیں بھلا؟''

''میں بھی اس کی زندگی تلخ نہ کرتی.....''

''میں بھی یہی سوچ کر کشمیر جا رہا ہوں..... لیکن اگر میری واپسی تک آپ کی رائے بدل جائے تو مجھے اپنے ارادے کی اطلاع دے دیتا.....''

''شکریہ.....''

''خدا حافظ.....''

نجم نے اپنی ٹوپی اتاری اور مسخرہ بن کر راحیلہ کو سلیوٹ کیا لیکن وہ مسخرہ نہیں لگ رہا تھا۔ اس میں کچھ بدل چکا تھا جس کی راحیلہ کو سمجھ نہ تھی۔ تبدیلیاں بغیر کسی واقعے کے موسموں کی مانند آ جاتی ہیں۔ اس کا تجربہ اس کے لیے انوکھا تھا۔

ارسلان ڈبل بیڈ پر کمبل ٹوپی پہنے سو رہا تھا۔ ارسلان کو معلوم نہ تھا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ وہ مکمل طور پر اپنی ماں کے رحم و کرم پر تھا..... راحیلہ چلتی ہوئی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی.....

وہ قیصر اور شاہد سے بہت آگے نکل آئی تھی۔

اس نے اردگرد نظر دوڑائی۔ ان دھوئی' دھوئی دودھ کی بوتلیں' ان گنت فراک' چادریں' خوبصورت سی بچے کی کوٹ' اس کے ساتھ لٹکے کھلونے غبارے.....

وہ وفا اور بے وفائی کی سرحدیں پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

شاہد اور قیصر کہیں ماضی کے بت تھے جن کی پوجا اب ممکن نہ رہی تھی۔

عورت اور خدا دونوں کا جھگڑا ختم ہو گیا تھا..... دونوں اپنی اپنی تخلیق میں گم تھے..... پہلی بار راحیلہ نے محسوس کیا کہ تخلیق سب سے بڑی رہائی ہے..... اپنے چکر سے نکل کر کسی اور چکر میں داخل ہو جانے کا نسخہ..... تخلیق سب زنجیریں کاٹتی ہے اور آزاد کرتی ہے۔ خدا اسی سے آزاد و بے نیاز ہے' اسے کچھ درکار نہیں..... وہ نعمتیں بناتا ہے لیکن اپنے لیے نہیں رکھتا..... تخلیق فنونِ لطیفہ کا راستہ اختیار کرے یا بچے کی شکل میں تخلیق نیا ملک بنائے کہ نئے مسلک کے نزول کی شکل اختیار کرے..... تخلیق کرنے والا..... انسان کے لیے اوپر اٹھنے' آزاد ہونے' اپنے آپ سے رہائی پانے کا ایک بہت ہی کارآمد نسخہ ہے.....

راحیلہ نے ارسلان کے کمبل پر پہلی بار محبت سے ہاتھ رکھ کر سوچا..... اپنے متعلق نہیں اپنے بچے کے بارے میں..... پہلی بار وہ اپنے آپ سے آزاد ہو گئی تھی۔

●○●○●○

اشفاق احمد

بابا صاحبا، زاویہ 1، زاویہ 2، زاویہ 3، گڈریا، ایک محبت
سہانے فسانے، توتا کہانی، بندگلی، طلسم ہوش افزا، اور ڈرا
سفر در سفر، اُچے بُرج لاہور دے، ناطل تھلے، حسرت تعمیر، جنگ بجنگ، سفر مینا، ایک محبت سو ڈرامے، حیرت کدہ،
شاہلا کوٹ، کھیل تماشا، گلدان، کھٹیا وٹیا، دھینگا مشتی، شورا شوری، ڈھنڈورا، عرضِ مصنف، شہر آرزو

بانو قدسیہ

راجہ گدھ، شہر بے مثال، توجہ کی طالب، چہار چمن، سدھراں، آسے پاسے، دوسرا قدم، آدھی بات،
دست بستہ، حوا کے نام، سورج مکھی، پیا نام کا دیا، آتش زیر پا، امربیل، بازگشت، مرد ابریشم، سامانِ وجود،
ایک دن، پروا، موم کی گلیاں، لگن اپنی اپنی، تماثیل، فٹ پاتھ کی گھاس، دوسرا دروازہ، ناقابل ذکر،
کچھ اور نہیں، حاصل گھاٹ، پھر اچانک یوں ہوا،

www.sang-e-meel.com

ISBN-10 969-35-2443-1
ISBN-13 978-969-35-2441-3
9 789693 524413

www.sang-e-meel.net